زمانہ

جلد ۸۴ — جنوری ۱۹۴۵ء — نمبر ۱

ظہیر الدین محمد بابر میرزا بانی دولت مغلیہ

سنہ ۹۰۹ھ ۱۵۰۴ء لغایت ۹۳۷ھ ۱۵۳۰ء

(از مولوی عبدالرزاق صاحب کانپوری مؤلف البرامکہ و نظام الملک طوسی)

بابر کا نسب نامہ بابر جو صاحبقراں امیر تیمور کی پانچویں پشت میں تھا، عمر شیخ میرزا کا بلند اقبال بیٹا تھا۔ اس کی حکومت ماورا النہر کے صوبہ فرغانہ میں تھی اور اندجان دار السلطنت تھا۔

بابر کی تخت نشینی بابر ہنوز دوازدہ سالہ [۱۲] تھا کہ باپ اچانک مرگیا ع عمر شیخ از بام (کبوتر خانہ) افتاد و مرد۔ اقبال خدمت کے لئے کمربستہ ہوگیا، شاہی مسند نے پاؤں چومے، تاج اور چتر نے سر پر سایہ ڈالا، او رتاریخ پنجم رمضان المبارک سنہ ۹۰۹ھ مطابق فروری سنہ ۱۵۰۴ء مساجد میں بابر کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور سکہ جاری ہوا۔

خانہ جنگی بارہ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے، یہ یتیم بچہ بابر حکومت کو اٹھا نہ سکا، گرد پیش از سر تا پا چھا گئی۔ نامہربان بھائی اور سفاک ماموں، خاندانی سلطنت کے دعویدار ہوکر آندھی کی طرح اٹھے، تلواریں میان سے نکل آئیں اور بابر سے چھری کٹاری ہوگئی۔ وفادار امرا نے بابر کا ساتھ دیا، اور فوج نے بھی حق نمک ادا کیا لیکن پھر بھی گھر والوں کی شورش سے باہر والے بھی آمادۂ بغاوت ہوگئے۔ مگر بابر کے بازوؤں میں ہمت کا زور تھا، سب سے سینہ سپر ہوکر لڑتا رہا۔ اور اس خانہ جنگی میں مسلسل گیارہ برس گزر گئے۔ کبھی میدان مار لیا اور کبھی ہار گیا لیکن جب شیبانی خاں (اوزبک) دشت قبچاق سے ٹڈی دل لشکر کے ساتھ [illegible] کی طرف بڑھا اور طوفانی بادلوں کی طرح چھا [illegible] مجبور کرکے ماورا النہر کے علاقوں پر [illegible]

لہ یہ مضمون لکھتے وقت تزک بابری اور ہمایوں نامہ مصنفہ گلبدن بیگم بنت بابر میرزا بھی پیش نظر تھا۔

وطن سے رخصت جب یہاں تک نوبت پہونچی تو بابر کی آس ٹوٹ گئی اور کمر سے تلوار کھل گئی، اس کے بعد جو کہانی شروع ہوتی ہے وہ انتہائی غمناک ہے۔ بابر کو جب یقین ہو گیا کہ میں ان صحرائی درندوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا ہوں تو میدان جنگ سے نکل کر دشت غربت میں قدم رکھا، اور توکلت علی اللہ، ایک ہی منزل ختم ہوئی تھی۔ راستہ کے پہاڑ اور جنگل دیکھکر بابر کچھ سہم سا گیا غیب سے آواز آئی "بابر! خبردار! ہمت نہ ہارنا، دل قوی رکھ اور شبانہ روز دشت و جبل کو سمیٹتا ہوا منزل مقصود کی طرف چلا جا، ہندوستان تیرا انتظار کر رہا ہے، اور مشیت الٰہی امداد کے لئے آمادہ ہے"

سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے

ہزارہا، شجر سایہ دار، راہ میں ہے،

بابر کا آغاز شباب سلاطین چغتائیہ، تیموریہ اور خان اوزبک سے لڑائیوں میں ختم ہو گیا۔ چنانچہ مغلوں کی ابتدائی تاریخ میں یہ عہد عدیم النظیر اور اقبال و ادبار کا مرقع سمجھا جاتا ہے۔ اور گلبدن بیگم کے یہ الفاظ بلاشبہ صحیح معلوم ہوتے ہیں:-

"درمدت یازدہ سال، حضرت بادشاہ بابام (پدر من) چناں ترددات نمودہ اند کہ زبان قلم از شرح تعداد آں عاجز است، و آں قدر سخت محنت و مہالک کہ در باب جہاں گیری بحضرت ما روئے نمود کم کس را روئے نمودہ باشند"

بابر کو آخر شکست کیوں ہوئی؟ بیگم کی رائے ہے کہ:-

سلطان حسین میرزا بایقرا، عموی ایشاں در خراسان بودہ اند و بایشاں کومک نہ فرستادند۔

حالانکہ یہ چچا بھتیجہ پر مہربان تھے لیکن مصیبت کے وقت اعانت سے گریز کیا۔

مصائب سفر، کل کی بات ہے کہ بابر ہزاروں سوار و پیادوں کی قیادت کر رہا تھا، اور آج صرف ۲۰ سواروں کے ساتھ وطن سے نکل کر صحرانوردی میں مصروف ہے اور مصیبت کا ہر ہر قدم پر سامنا ہے۔ ہنوز چوبیس گھنٹے نہیں گزرے تھے کہ ایک سمت سے غبار بلند ہوا، اور دشمن کے سوار گھوڑوں کو مہمیز کرتے ہوئے نظر آئے۔ بابر نے ان کو دیکھا اور اپنے سواروں کے ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا لیکن جب کچھ وقفہ کے بعد مڑ کر دیکھا تو غبار کی طرح سوار رواں نظر آتے تھے۔ تیز رفتاری سے بابر اور سواروں کے گھوڑے بھی دم توڑ رہے تھے۔ چنانچہ بابر نے جب اخیر جائزہ لیا تو صرف دو سوار ہمراہ تھے، اور دودھ شریک بھائی (کوکہ) بھی اسی جگہ سے واپس گیا۔ جس کو بابر نے بخوشی اجازت دی غمزدہ بابر نے جب یاس و حسرت سے دیکھا تو دشمن کے دو سوار تعاقب میں تھے اب سوائے اس کے اور کوئی تدبیر نہ تھی کہ پہاڑ پر چڑھ کر جان بچائے اور تیروں سے کام لے۔ ہنوز اس تدبیر پر عمل نہ ہوا تھا کہ آفتاب غروب ہو گیا۔ اور ایک سوار نے قریب آکر آواز دی "شاہزادۂ عالم بسم اللہ دھوکا

اندھیری بڑھتی جا رہی ہے، اور پہاڑ کی چوٹی ہنوز دُور ہے، ایسی حالت میں حضور کہاں جائیں گے؟ بہتر ہے کہ اسی جگہ ٹھہر جائیے! غلام خدمت کے لئے حاضر ہیں۔" مجبوراً بابر گھوڑے سے اُترا، سپاہیانہ انداز سے نیزے کو زمین میں گاڑ کر سوار کی طرف متوجہ ہوا، اور دریافت کیا کہ کیا خبر لائے ہو؟ سوار نے دست بستہ عرض کیا کہ سرکار کے بھائی تو گرفتار ہو چکے ہیں، اور ایک دستۂ فوج تعاقب میں اس طرف بھی آ رہا ہے۔ مصلحتِ وقت یہی ہے کہ واپس چلئے، ممکن ہے کہ غیب سے کوئی سامان ہو جائے، اور تخت و تاج نصیب ہو!"

یہ خبر سُن کر بابر حیرت زدہ رہ گیا، اور مستقل مزاجی سے سوار کی طرف متوجہ ہوا۔ سوار نے بھی بابر کے تیور دیکھکر اپنی تقریر کا رُخ پلٹا اور عاجزانہ لہجہ سے عرض کیا کہ ہماری جماعت حضور کے ہم رکاب ہے، ہم نہایت آرام و حفاظت سے اندجان تک پہونچا دیں گے۔ بابر خوب جانتا تھا کہ یہ دشمن کے دغاباز سوار ہیں۔ لہذا ذرا بگڑ کر کہا کہ کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں آ سکتا ہے، اگر تم آمادۂ خدمت ہو تو مجھے ایسے راستہ پر ڈالدو کہ میں خراسان اپنے ایک شفیق ماموں کے پاس پہونچ جاؤں۔ اور اگر یہ نہیں تو تم بھی رخصت ہو"۔

سوار نے عرض کیا کہ تن بہ تقدیر، اب ہم آپ کے ہمراہ ہیں، اور یہ آئین نمک خواری کے خلاف ہے کہ جنگل اور بیابان میں آپ کو تنہا چھوڑ کر چلے جائیں۔ بابر یہ جانتا تھا کہ یہ بھی عیاری کی گفتگو ہے، تاہم اُن کی درخواست منظور کی اور گھوڑوں کو آگے بڑھایا۔ اِن دغابازوں نے پہلی شرارت یہ کی کہ خراسان کا راستہ چھوڑ کر پہاڑوں میں چلنا شروع کیا، تمام رات مصیبت کا مارا مسافر پہاڑوں سے ٹکراتا رہا۔ لیکن خدا کی تائید شامل حال تھی کہ سپیدۂ سحر نمودار ہوتے ہی ایک آباد گاؤں میں پہونچ گئے۔ اور تینوں سوار ایک ویران مقام میں جاکر ٹھہر گئے۔ ایک سوار دانہ گھاس کی تلاش میں گیا، جب دن چڑھے واپس آیا تو تین روٹیاں بھی لایا اور ایک ایک روٹی تقسیم ہو گئی۔ اس کے بعد ویرانے سے نکل کر ایک پشتہ کی آڑ میں جا چھپے، گھوڑے سبزہ زار میں چھوڑ دیئے گئے اور دو سوار بابر کی نگرانی کے لئے بدستور پشتہ پر موجود رہے۔

جب سورج ڈوب گیا تو میدان سے نکل کر ایک ویران باغ میں جاکر مقیم ہوئے، سردی ناقابل برداشت تھی، ایک سوار پوستین اور کھانے کی فکر میں روانہ ہوا، رات گئے واپس آیا اور ایک کہنہ پوستین لایا اس پوستین کو بابر نے اوڑھ لیا، اس کے بعد ایک ایک پیالہ نمکین حریرہ چینا[1] کا ملا۔ یہ حریرہ ذائقہ میں تلخ تھا بابر لکھتا ہے کہ پوستین اور گرما گرم آش نے بڑا لطف دیا اور سارے جسم کو گرما دیا، اور آگ جلاکر تاپنے کا بھی سامان کیا گیا، کچھ دیر کے بعد جب دونوں رقیب (پاسبان)" رہ گئے تو بابر باغ کی دیوار پھاند کر خراسان کی سمت روانہ ہوا۔ بابر کا یہ سفر نہایت خطرناک تھا۔ جاڑے کی شدت، رات اندھیری، برف کی بارش تھی، چاروں طرف پہاڑ و جنگل

[1] ارزن یعنی ساوان اور کودوں کے ایک ادنیٰ درجہ کا غلہ ہے، ایران میں یہ کبوتروں کا دانہ ہے۔

درندوں کا خوف اور پیادہ پائی اُس پر مستزاد تھی۔ تاہم بابر نے عام راستہ کو چھوڑ کر پگڈنڈی سے سفر شروع کیا۔ کل صبح کو جو ایک روٹی حصہ میں آئی تھی پہلی منزل میں وہ کام آئی، بلکہ یہ کہنا چاہئیے کہ اُس نے جان بچائی قدرتی چشمہ کا پانی پیا، اور خدا کا شکر ادا کر کے آگے بڑھا۔ دوسرے دن جنگل کی پیداوار سے پیٹ بھرا، اور چوتھے دن ایک گاؤں میں زندہ سلامت پہونچ گیا۔ حُسن اتفاق سے بابر کو یہاں اس کے چند قدیم سپاہی مل گئے۔ بابر نے ان رفیقوں کو بہت ہی غنیمت سمجھا، انھوں نے بھی آقا کے قدم لئے۔ جب گاؤں والوں کو خبر ہوئی تو وفادار پہاڑی جمع ہو گئے، اور حسب حیثیت بابر کی مہمانداری میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ آج بابر نے اطمینان سے غسل کیا، جو کپڑے پہنے ہوئے تھا اُن کو دھلایا۔ خط سے چہرہ کی اصلاح ہوئی اور تزک میں گزشتہ واقعات کو قلمبند کیا۔ جب بابر اطمینان سے بیٹھا تو چاروں طرف قاصد دوڑائے کہ آوارہ وطن سپاہی جہاں ملیں وہ جمع کئے جائیں، اور اسی عالمِ غربت میں خدا نے یہ احسان کیا کہ مصیبت کی ماری ماں بھی جو بیٹے کی جستجو میں گھر سے نکلی تھی مگر وہ بھی ایک مختصر جماعت کے ساتھ اسی گاؤں میں موجود تھی۔ ماں نے جوش محبت سے بیٹے کو گلے لگایا اور دونوں مل کر اس طرح روئے جس طرح ساون بھادوں ملتے ہیں۔ چند روز میں جب دو سو سے زیادہ سوار و پیادے جمع ہو گئے اور اس گاؤں میں قیام کی گنجائش نہ رہی تو قسمت آزمائی کے لئے جیحون عبور کر کے آگے بڑھا۔ گلبدن بیگم نے اس سفر کے متعلق یہ مختصر جملہ لکھا ہے:-

"بایں طور حال بے یراق، توکل بہ حضرت حق سبحانہ کردہ، متوجہ بدخشانات و کابل شدہ۔"

اب بابر دشمن کے نرغہ سے نکل چکا ہے، اور وہ تنہا بھی نہیں ہے، شفیق ماں ہم سفر ہے اور کم و بیش دو سو کی جمعیت ہے لیکن اس پہاڑی بھیڑ کا فوج میں شمار نہیں ہے، جن کے پاس نہ اسلحہ ہیں، نہ سواری کے لئے گھوڑے نہ پاؤں میں جوتہ ہے نہ موزہ، کندھوں پر لاٹھیاں رکھے چلے جاتے ہیں، اور سامانِ امارت میں بھی محض خدا کا نام ہے کیونکہ دو پھٹے پرانے خیمے تھے۔ جب منزل پر اُترتے تو ایک میں ماں کا قیام ہوتا اور دوسرے میں خود آرام کرتا۔ دن میں اور رات میں برف کی ہوائیں انتہائی تکلیف دہ تھیں

بابر حدود بدخشاں میں اور خسرو کا قاصد دربار میں

چنانچہ اسی قلندرانہ شان سے مضافات بدخشاں تک پہونچ گیا اور حدود کابل تک بجلی کی طرح یہ خبر بھی پھیل گئی کہ وارثِ تخت و تاج آگیا۔ اور جاسوس خبر لایا کہ خسرو نمک حرام جو کبھی وزیر تھا، اب وہ خسرو شاہ بن کر کابل میں حکومت کر رہا ہے، لیکن حضور کے اقبال سے درباری امرا خدمت ہو رہے ہیں، اور خسرو مرعوب ہو چکا ہے عنقریب حاضر ہو کر کورنش بجا لائیگا۔" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اول خسرو کا قاصد حاضر ہوا اور اُس کی جانب سے یہ پیام پہونچایا کہ

"تمام ملک حضور کے بزرگوں کا ہے اور فقیر بھی پروردۂ نعمت ہے لہذا عفوِ قصور ہو کر جاں بخشی ہو اور اس قدر زاد راہ ... کہ سفر میں تکلیف نہ ہو، اور تخت کابل پابوسی کا منتظر ہے۔"

بابر نے اس واقعہ کو مبارک فال سمجھا، قاصد کو رخصت کیا، اور خسرو کی درخواست منظور ہوئی۔ کچھ وقفہ کے بعد ہی اطلاع ہوئی کہ خسرو بھی سلام کے لئے حاضر ہے۔ بے ملک بادشاہ کے پاس ایک بارگاہ بھی نہ تھی جس میں دربار سجایا جاتا، خبر سنتے ہی اپنے خیمہ سے نکلا اور ایک چنار کے سایہ میں آ کر بیٹھ گیا، دو چار رفیق بھی ساتھ تھے، اب خسرو کو حاضری کی اجازت ہوئی، وہ حد سے زیادہ خوفزدہ تھا، ادب سے سر نیاز جھکا کر کورنش بجا لایا، اور نذرانہ پیش کر کے دست بستہ عرض کیا کہ "غلام گنہگار ہے، جاں بخشی چاہتا ہے"۔

بابر نے باغی سرکش کا قصور معاف کیا، وہ آداب و تسلیم بجا لا کر رخصت ہوا۔ گلبدن بیگم نے اس واقعہ کو ذرا تفصیل سے لکھا ہے:-

"در تھندز (کھمن دژ) و بدخشانات، لشکر و مردم خسرو شاہ بودند، آمدہ حضرت بادشاہ بابام را ملازمت کردہ، باوجود گناہان کہ او کردہ، مانند بایسنقر میرزا را شہید کردہ و سلطان مسعود میرزا را میل کشیدہ بودند و ایں ہر دو میرزا عموزادہ بادشاہ بابام بودہ اند...... حضرت بادشاہ کہ مفہوم مردی و مروت بودہ اند اصلاً و قطعاً در مقام انتقام آں نشدند و فرمودند کہ از جواہر و نقد و آلات ہر چند کہ دلش خواہد بردارد۔ و پنج و شش قطار شتر و پنج و شش اشتر بار ہمراہ بردہ، بصحت و سلامت رخصت یافتہ بخراساں رفتہ و حضرت بادشاہ متوجہ کابل شدند"۔

بابر کی اس وقت جو شان تھی وہ آپ پڑھ چکے ہیں، مگر اس مفلسی میں بھی شاہانہ تیموری جھلک باقی ہے۔ علاوہ جاں بخشی کے خسرو کو مال و دولت سے نہال کر دیا، چنانچہ ایسے ہی بلند حوصلہ لوگوں کی شان میں کسی شاعر نے کہا ہے

"گدائی بھی کریں تو لے کے کاسہ ماہِ کامل کا"

افسوس ہے کہ خسرو نے بابر کی موجودہ حالت کا بھی کچھ خیال نہ کیا اور قلعۂ کابل سے کل خزانہ لے کر فرار ہو گیا۔ البتہ خسرو سے جو اشرفیاں نذر کی تھیں وہ بابر کے کام آئیں اور کابل کے قبضہ کو بابر نے تاراج شدہ خزانہ سے زیادہ قیمتی سمجھا۔

بابر کا قلعۂ کابل پر قبضہ قلعۂ کابل میں داخلہ کے وقت فی الحقیقت بابر بادشاہ تھا، کل ملک اور فوج اس کے زیرنگیں تھی اور توپخانہ سلامی ادا کر رہا تھا، اور قسمت اب اس کی کنیز تھی۔ بیگم نے ہمایوں نامہ میں لکھا ہے کہ خسرو کی غیر حاضری میں قلعۂ کابل پر محمد مقیم بن امیر ذوالنون نے قبضہ کر لیا تھا، محمد مقیم نے بابر کو دو چار دن الجھائے رکھا، پھر معاہدہ کر کے قلعہ پر قبضہ دے دیا۔ لیکن ہمایوں نامہ کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ محمد مقیم نے الغ بیگ میرزا کی وفات پر عبد الرزاق میرزا سے کابل لے لیا تھا، اور یہ شاہزادہ بھی بابر کا چچازاد بھائی تھا، اور خسرو نے کسی تدبیر سے الغ بیگ کو کابل سے بید خل کر دیا ہوگا۔ مختصر یہ ہے کہ اخیر ربیع الثانی سنہ ۹۱۰ھ ۱۵۰۴ء میں بابر داخل قلعہ ہوا تھا۔

قلعۂ کابل میں بابر کا دربار قلعۂ معلیٰ میں داخل ہونے کے بعد بابر نے ایک شاندار دربار کیا، ارکانِ دولت، سرداران فوج اور شیوخ قبائل نے نذریں پیش کیں، لیکن بابر کا خزانہ اور توشک خانہ خالی تھا، یہ انعام میں کیا دیتا، سب کو

دلاسا دیا، حاضرین نے اطاعت کا حلف اٹھایا، اور نئے سر سے بادشاہی قائم ہوئی، تقدیر کا پانسہ پلٹ گیا۔ اس غیر معمولی مسرت کے بعد بابر کی والدہ کا ۶ یوم کے بخار میں انتقال ہوگیا، باغ نوروزی میں دفن ہوئیں، یہ صدمہ عظیم تھا مگر بابر استقلال سے حکومت کرتا رہا۔

بابر کی زندگی کا دور جدید حکومت ملتے ہی بابر نے سلطنت کے کارخانے جمائے اور اطمینان کا سانس لیا، اور دو سال کے مصائب کے بعد خانہ بدوش بادشاہ کو کابل میں آرام کرنا نصیب ہوا۔ بابر کے لئے جس طرح وطن مغلوں اور ترکوں سے باعث آلام تھا ویسے ہی کابل میں افغانوں اور ہزاروں سے خطرہ تھا، اور کبھی کبھی تلوار بھی چل جاتی تھی، بابر کی مستقل مزاجی نے ہر جگہ ساتھ دیا۔ جنگ و جدال کے باوجود کابل کے پہاڑوں، چشموں، وادیوں اور باغات کا گشت کیا۔

تزک کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بابر نے کابل کا پورا دورہ کرکے چپہ چپہ زمین کو دیکھا، اور ہر حصہ ملک کی پیداوار پھل، پھول اور چرند و پرند کے حالات تزک میں درج کئے، جس کو کابل کا جغرافیہ طبعی سمجھنا چاہیے۔ بابر کو باغات سے غیر معمولی دلچسپی تھی، شاید ہی کوئی ایسا باغ ہو جہاں بابر کے قدم نہ گئے ہوں، سبزے کے زمردیں فرش پر لیٹنا، دن کو چنار کے سایہ میں آرام کرنا، اور رات[1] میں چناروں کی آتش بازی کی بہار دیکھنا، ندیم و مصاحب ہر صحبت میں موجود رہتے تھے۔ عالم آب کی دلچسپیاں اس کے علاوہ تھیں، نہروں میں کشتیوں پر بیٹھ کر سیر آب کرتا۔ اس وقت مطرب رباب چھیڑتے اور ترکی ترانے سنتا، اور مادری زبان میں غزلیں لکھتا، اسی زمانے میں متعدد باغ لگائے، مگر خاص اراسغنت اور ایک پہاڑ کے دامن میں ایسا باغ لگایا جس کی نظیر آج تک نہ ہوسکی۔ ہندوستان کا شالامار اسی باغ کا ایک مختصر خاکہ تھا۔ اصول ریاضی کے مطابق باغ کا کل رقبہ ۹ طبقات میں تقسیم تھا اور ہر حصہ فردوس بریں کا ایک ٹکڑا تھا، ہر خیابان خاص پھولوں کے لئے مخصوص تھی، اور نہروں کا جال روش روش پر پھیلا ہوا تھا۔ سب سے آخری طبقہ پر ایوان خاص یا جھروکہ درشن تھا، یہاں سے تمام کابل کا نظارہ ہوتا تھا اور بابر کا یہ دل پسند نشیمن تھا۔

اسی زمانے میں سلطان حسین بایسنقر شاہ خراسان نے بھتیجے کو یاد کیا۔ گلبدن بیگم لکھتی ہیں کہ :-

"درین اثنا فرمان ہائے سلطان حسین میرزا بتاکید آمد کہ ما خیال جنگ با اوزبک داریم اگر شما ہم بیائید بسیار خوب است۔ حضرت این معنی را از خدا می طلبید، مرعا قبت الامر بسوئے خراسان روانہ گشتند، در اثنائے طے طریق خبر آمد کہ سلطان حسین میرزا استغفار شدند۔"

---

[1] چنار کا درخت جب پر سال کا ہو جاتا ہے تو اس کی نازک ڈالیوں اور پتوں سے چنگاریاں نکلتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ گویا انار چھوٹ رہے ہیں۔ تمیہ کے اس شعر میں اسی واقعہ کی تصویر ہے۔

برسوں پائے چنار رہے ہم نگاہ ... مدت گزری وطن سے نکلے مشتق نے خانہ جنسرانی کی

تکمیر یہ ہے

چچا کی موت کی خبر سے بابر کے دل پر ایک بجلی گری، کیونکہ وہ شیبانی خاں سے آمادۂ پیکار ہونا چاہتا تھا لیکن یہ حسرت دل میں رہ گئی۔ امرا نے مشورہ دیا کہ اب کابل واپس چلئے۔ بابر نے جواب دیا کہ اب خراسان سامنے ہے یہی مناسب ہے کہ بھائیوں سے مرحوم چچا کی تعزیت کروں۔ چنانچہ آگے بڑھا میرزا مرحوم کے بارہ بیٹے موجود تھے اُنھوں نے بابر کا شاندار استقبال کیا اور بچھڑے ہوئے بھائی کو اپنے ہمراہ لے گئے۔ میرزا مرحوم نے برسوں کی محنت میں ہرات کو باغ فردوس بنا دیا تھا لہذا بابر نے ہرات ہی میں قیام کیا، اور برفباری کی وجہ سے میرزایان نے بھی مناسب سمجھا اور بعد ختم موسم سرما ازبک سے جنگ چھیڑنا قرار پایا۔

بابر کو بھائیوں کی قوت کا اندازہ ہوگیا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ ہرات کچھ دنوں کا مہمان ہے لہذا واپسی کابل پر آمادہ ہوگیا۔ برف باری کا زمانہ تھا چنانچہ بابر اسی موسم میں روانہ ہوگیا، راستہ میں انتہائی تکلیف اُٹھائی، برف کے تودوں نے راستوں کے نشان مٹا دیئے تھے، گھوڑوں کے سُم زمین میں دھنس جاتے تھے، لہذا سواری سے اُترنا پڑتا تھا، اس لئے بابر نے خود ہی کدال لے کر راستہ صاف کرنا شروع کیا، سوار و پیادے جو ہم رکاب تھے وہ بھی مددگار بن گئے، اب راستہ کھلا اور قافلہ آگے بڑھا، لیکن نئی مصیبت یہ ہوئی کہ رہنما راستہ بھول گیا، اور کابل کے راستہ سے ہٹ گیا یہ غوربند (بامیان) کا علاقہ تھا، یہ رات انتہائی سرد تھی اور زمین سے آسمان تک برف ہی برف نظر آتی تھی، سپاہی چاروں طرف دوڑائے گئے اور اُنھوں نے ایک غار کا پتہ لگایا جس میں چالیس آدمیوں کی گنجائش تھی، چنانچہ بابر اپنے رفقا، کے ہمراہ غار میں داخل ہوگیا، سپاہیوں نے خورجیوں سے خشک گوشت نکالکر ایک دیگ چڑھا دی، سب نے دو دو پیالے شوربے کے پیئے اور گرم ہوکر بستروں پر سو گئے۔ صبح نمودار ہوئی تو شاہی فوجیں بھی استقبال کو پہونچ چکی تھیں، ہزارہ جرگہ نے جو باغی تھے بابر کا مقابلہ کیا اور ہزیمت اُٹھا کر فرار ہوگئے مال غنیمت میں ہزارہا بکریاں، بھیڑیں اور دُنبے ہاتھ آئے جنھوں نے باورچی خانہ کو گرم کیا

اب کابل کا حال سُنئے کہ بابر کی غیر حاضری میں میرزا خاں اور میرزا محمد حسین خاں گورگانی نے دارالسلطنت پر قبضہ کرلیا تھا، اور ملک میں یہ خبر اُڑا دی تھی کہ بابر ہرات میں قید ہوگیا ہے۔

یہ خبریں سُن کر بابر نے اُمرائے کابل کو مخفی فرمان روانہ کئے اور نوازشات کا اُمیدوار کیا، اور یہ بھی حُسن اتفاق تھا کہ کابل کا دوسرا قلعہ بالا حصار ہنوز قلعدار کے قبضہ میں تھا۔ چنانچہ بابر نے اسی وقت قلعہ دار کے نام یہ حکم بھیجا، گلبدن بیگم تحریر کرتی ہیں:۔

حضرت بادشاہ فرمان ہائے دلداری ودلاسا نوشتند کہ مردانہ باشید، ما ہم آمدیم، در کوہ بی بی آتش خواہیم انداخت شما ہم در بالائے خزانہ خانہ آتش اندازید تا دانیم کہ از آمدن ما خبردار شدہ آید۔ وقت از آں جانب شما و ازیں جانب ما بمقابلۂ غنیم خواہیم شد۔"

اس شورش پر امرا اور قلعدار نے عمل کیا اور کابل ایک معمولی مقابلہ کے بعد فتح ہوگیا، باغی بھائی فرار ہوکر ادھر
اُدھر روپوش ہوگئے۔

میرزا خاں اپنی والدہ کے محل میں (بابر کی حقیقی خالہ) جا چھپے بیگم صاحبہ صاحبزادہ کو اپنے ہمراہ لائیں، میرزا
نے معذرت کی بابر نے قصور معاف کیا۔

دوسرے بھائی محمد حسین میرزا کو بھی اُن کی والدہ (بابر کی چھوٹی خالہ) نے لاکر قدموں پر ڈالا، بابر نے فراخ دلی سے
اُن کا بھی قصور معاف کیا، اور دونوں کو گلے لگایا، شربت کے گلاس آگئے، اور ایک ایک گھونٹ پی کر بھائیوں کو پلایا
کہ زہر کا شبہ جاتا رہے۔ اور دونوں کو جاگیریں عطا کرکے اپنی خالاؤں کو مطمئن کردیا۔

بابر کی عیش پرستی

خانگی جھگڑوں سے مطمئن ہوکر بابر نے حسب دستور عیش کی زندگی شروع کی، ہرات میں بھائیوں نے
شراب کی مجلسیں سجائیں مگر بابر وہاں شرماتا رہا، لیکن کابل میں دل کھول کر خوب پی، اور برسوں کی کسر نکل گئی، قلعہ کا
کوئی ایسا ایوان نہ تھا جہاں بیٹھکر شراب نوشی نہ کی گئی ہو۔

ہندوستان کے سیہ مستوں نے شراب کی ابتدا جام (ساغر) سے کی تھی، کیونکہ جام صراحی سے بھرا جاتا تھا
اور صراحی خُم سے لبریز کی جاتی تھی۔ شاد عظیم آبادیؒ کا ارشاد ہے:۔

کہاں سے لاؤں صبرِ حضرتِ ایوب اے ساقی ؟
خُم آئے گا، صراحی آئے گی، تب جام آئے گا !

لیکن رنگین مزاج بابر نے خُم سے صراحی بھرنے کو تنگ ظرفی سمجھا اور باغ نوبہار میں سنگ مرمر کا ایک حوض (ایک گز مربع)
بنوایا اس میں انگوری شراب بھری جاتی تھی اور ساقی (غلام) کو حکم تھا کہ

"اے لب کشتیٔ مے تا خطِ بغداد بیار"

یعنی پورا گلاس بھر بھر کر پلائے جا۔ بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ ندیموں کو اپنے ہاتھ سے پیالے پیش کرتا تھا۔ حوض
کے حاشیہ پر سنگ اسود کی پچی کاری سے یہ شعر منقش تھا۔ ؎

نوروز و نوبہار و مے و دلربا خوش است
بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

الغرض اسی شان اور عیش و طرب سے بابر نے مسلسل ۲۲ سال تک کابل میں حکومت کی۔

گلبدن بیگم نے لکھا ہے کہ باباجان کو کابل کی فتح بہت مبارک ہوئی۔ ہنوز کوئی اولاد نہ تھی اور ہر وقت دعا
تھی کہ وارث تاج و تخت پیدا ہو، چنانچہ یہ دعا قبول ہوئی اور مختلف بیگمات سے کابل میں حسب ذیل اولاد پیدا ہوئی

بابر کی ازدواجی زندگی اور آل و اولاد

(الف) عائشہ سلطان بیگم (دختر سلطان احمد میرزا) :- فتح کابل سے قبل ۱۸ سال کی عمر

دختر پیدا ہوئی اور تین مہینہ میں فوت ہوگئی ۔ اور ۲۷ سال کی عمر میں فتح کابل کے بعد ۹ بیٹے اور ۸ بیٹیاں پیدا ہوئیں۔

(ب) ماہم بیگم :- حضرت ہمایوں میرزا (شب سہ شنبہ ۴۔ ذی قعدہ ۹۱۳ھ (مارچ ۱۵۰۸ء) آفتاب برج حوت میں تھا۔

باربول میرزا ۔ مہرجان بیگم (حمل ولادت خوست) دولت بیگم ۔ فاروق میرزا

(ج) معصومہ سلطان بیگم (دختر سلطان احمد میرزا) :- بیگم کا وضع حمل کے وقت انتقال ہوگیا، لڑکی پیدا ہوئی، اس کا نام بھی ماں کی یادگار میں معصومہ سلطان رکھا گیا۔

(د) گل رخ بیگم :- کامران مرزا ۔ عسکری میرزا ۔ شاہ رخ میرزا ۔ سلطان احمد میرزا ۔ گل عذار بیگم۔

(ہ) دلدار بیگم :- گل رنگ بیگم (حمل ولادت خوست) گل چہرہ بیگم ۔ ہندال میرزا (روانگی ہندوستان کے وقت پیدا ہوا تھا، بطور تفاول ہندال نام قرار پایا) گلبدن بیگم ۔ الور میرزا

ہمایوں (ولیعہدِ سلطنت) کی ولادت کو بابر نے بہت ہی مبارک سمجھا تھا، اور اُس کا زائچہ بھی بہت ہی اُمید افزا تھا لہذا ملک محروسہ میں یہ فرمان جاری ہوا :-

"درہاں سال حضرت خود را فرمودند، بہ امراء و سائر الناس کہ مرا باہم بادشاہ گویند، و الا قبل از تولد حضرت ہمایوں بادشاہ، میرزا بابر موسوم و مرسوم بودند، وہمہ بادشاہزادہائے را میرزا میگفتند، و در سال تولد ایشاں خود را بادشاہ گویانیدند۔"

مختصر یہ ہے کہ بابر کے عہد سے مغل فرمانروا بادشاہ کہلائے، اور خطاب میرزا ختم ہوگیا ۔ اور یہ شاہی سکہ سراج الدین ابوظفر تک چلتا رہا۔

<u>مہم سمرقند</u> جب بابر عیش اُٹھا چکا ، اور خدانے بیٹوں اور بیٹیوں سے گھر بھر دیا تو دماغ میں میدان جنگ کی ہوا سمائی ، اسی اثناء میں خبر آئی کہ سمرقند میں شاہی بیگ خاں نے بغاوت کی ، موروثی ملک کی حفاظت بھی فرض تھی لہذا کابل میں ناصر میرزا کو قائم مقام کیا، اور شاہزادہ ہمایوں ، باربول میرزا ، کامران میرزا ، اور شاہزادی مہرجاں بیگم ، معصومہ سلطان بیگم کو ہمراہ لیکر سمرقند روانہ ہوگیا ، اور شاہ اسمٰعیل صفوی (فرمانروائے ایران) کی اعانت سے شاہی بیگ کو قتل کردیا اور تھوڑے کی مدت میں ماوراء النہر کو فتح کرلیا ، اور شیبانی خاں کا بھی خاتمہ ہوگیا ۔ مگر بھائیوں نے پھر بغاوت کی اور سلمانوں میں یہ ہوائی اُڑادی کہ بابر شیعوں کی مدد لے کر آیا ہے لہذا اُس کی شیعیت کا خاتمہ کردیا جائے ۔ یہ بغاوت آندھی بن کر اُٹھی ۔ مجبوراً بابر فرار ہوا ۔ قسمت میں سیب سمرقندی اور بخارا کی شراب لکھی ہی نہ تھی ، کابل میں آکر دم لیا ، اور ماوراء النہر کا خیال ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا۔

<u>تسخیر ہندوستان</u> بابر قلعۂ کابل میں روزانہ ہندوستان کے حالات سنا کرتا تھا ، اور ملکی حاجتمندوں سے

بابر کو یقین تھا کہ اگر ایسے میں فوج کشی کی جائے تو کامیابی یقینی ہے۔ یہ خیال کرکے شیر کچار سے نکلا اور جرار فوج کے ساتھ ہندوستان روانہ ہوگیا۔

ابتدائی منزلوں میں باجوروالوں نے بغاوت کی اور مقابلہ پر آئے۔ بابر نے قتل عام کا حکم دیا اور باجور پر قبضہ کرلیا، آگے بڑھا تو قبیلۂ یوسف زئی کا سردار ملک منصور سلام کے لئے حاضر ہوا اور سر نیاز خم کرکے آداب و کورنش بجالایا، اور کامل اطاعت کا اظہار کرتے ہوئے اپنی نوزنظر غاجہ خانم کا ڈولہ پیش کیا، بابر نے اس خانزادی سے نکاح کیا کچھ دن عیش کرکے اور امیر کو اسپ وخلعت انعام دے کر ہند کی طرف بڑھا۔ سکندر لودی کی وفات (۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء) پر اس کا نامور بیٹا ابراہیم تخت نشین ہوچکا تھا کہ اسی زمانہ میں بابر داخل ہندوستان ہوا، اور لاہور و دیپالپور میں قتل و آتشزدگی کرکے سرہند پہونچا۔ اور بغیر جنگ و جدال کے کابل واپس گیا۔ چنانچہ مسلسل چار مرتبہ آیا اور کام کیا پانچویں مرتبہ جب ابراہیم کے گورنر (لاہور) دولت خاں نے بغاوت کی اور بابر کو اپنی مدد کے لئے بلایا۔ یہ خوش خبری سنتے ہی بابر بکمال سرعت داخل لاہور ہوا۔ جاسوس نے خبر دی کہ ابراہیم نے پانی پت کو محاذ جنگ بنایا ہے، لہذا بابر بھی دہلی کو روانہ ہوا۔

پانی پت کا خونیں میدان یہ جنگی میدان جناب مسیح علیہ السلام کے عہد سے قوموں کا جولاں گاہ اور مقتل رہا ہے۔ چنانچہ تاریخی واقعات کے لحاظ سے یہ چھٹا معرکہ تھا۔ بابر کو پانی پت پہونچکر معلوم ہوا کہ ابراہیم لودی ایک لاکھ فوج اور ایک ہزار ہاتھیوں سے آچکا ہے، اور میدان کے بہترین حصہ میں فوج آراستہ ہورہی ہے اور کامل چھ کوس کے رقبہ میں فوج کا قیام ہے۔ بابر نے گھوڑے پر سوار ہوکر اول پورے میدان کا چکر لگایا اور ایک ایک گوشے کو دیکھکر گھوڑے سے اترا اور ایک میدان میں نیزہ گاڑ دیا۔ اور سرداران فوج کو جگہیں تقسیم کرکے اپنے خاص خیمہ میں ٹھہر گیا۔ دوسرے دن جب صبح کو خواب راحت سے بیدار ہوا تو چنگیزی دستور کے مطابق فوج کا کمان سے جائزہ لیا تو کل بارہ ہزار سوار اور پندرہ ہزار پیادے تھے۔ سرداروں کو جمع کرکے ایک ایک طوغ (فوجی علم) عطا کیا۔ اور ایک طوغ خود لے لیا چنانچہ اس طریقہ سے گویا دس ڈویژن میدان جنگ میں قائم کئے۔

رجب ۹۳۲ھ (۲۱۔اپریل ۱۵۲۶ء یوم چہارشنبہ) سے جنگ شروع ہوئی۔ تاتاریوں نے منتر جنتر پڑھکر میان سے تلواریں نکالیں، جب تلواریں ہاتھ سے چھوٹیں تو تیروں سے کام لیا، بابر کی فوج کے لئے یہ موت و حیات کا مسئلہ تھا ابراہیمی لشکر دریا کی طرح بڑھتا چلا آتا تھا، اور بابر کی فوج کو حلقہ میں لے لیا تھا، کل فوج کی قیادت بابر کے ہاتھ میں تھی اب اس نے شاہ قلی میر آتش (افسر توپ خانہ) کو حکم دیا، اس نے توپوں کا زنجیرہ باندھ کر چمڑے کی رسیوں سے جکڑدیا تھا کہ کوئی توپ اپنی جگہ سے حرکت نہ کرسکے۔ چنانچہ بجائی گولوں کی بھرمار نے ابراہیمی فوج کا ستھراؤ کردیا، اور دوپہر تک چالیس ہزار لودی میدان میں کھیت رہے۔ سلطان مع اپنے امراء اور راجاؤں کے مارا گیا۔ بابر کے لشکر میں فتح کا

نقارہ بجایا گیا اور خود بابر نے گھوڑے پر سوار ہو کر میدان کا گشت کیا جب ابراہیم کے سرہانے پہنچا تو حیرت زدہ ہو کر آسمان کو دیکھنے لگا۔ تاجدار ہندوستان بے تاج و کلاہ خون میں لتھڑا ہوا اور زخموں سے چور زمین پر پڑا ہوا تھا۔
اس وقت بابر کی زبان سے بے ساختہ یہ شعر نکلا ؎

ز بیژن فزوں بود، ہوماں بزور
ہنر عیب گردد چو برگشت ہور (فردوسی)

یہ وہی پانی پت کا میدان تھا جس میں صبح کو بازار رکھلے ہوئے تھے، لین دین کا بازار گرم تھا، بادشاہ ندیم اور راجاؤں کی سیکڑوں بارگاہیں سجی ہوئی تھیں، زریں پردے اور خیموں کی طلائی برجیاں نظروں کو خیرہ کر رہی تھیں یا دوپہر کو ہو کا عالم تھا۔ افسروں کے قتل ہونے سے سپاہی جان بچا کر فرار ہوگئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بابر کی فتح توپ خانہ سے ہوئی تھی، اور افغانی، ترکی اور ماوراءالنہری، پہاڑی سپاہی بھی جان پر کھیل کے لڑے تھے، اور ان کا ہر حملہ قیامت خیز تھا۔ نماز عصر کے بعد بابر نے فوج کو کوچ کا حکم دیا کیونکہ اب ایک سپاہی بھی مقابلہ کے لئے موجود نہ تھا
روانگی سے قبل بابر نے شاہزادہ ہمایوں کو چند سرداروں کے ساتھ آگرہ روانہ کیا کہ وہ قلعہ پر قبضہ کرے کیونکہ ابراہیم کے اہل و عیال اور خزانہ قلعہ میں تھا، اور خود دہلی روانہ ہوا۔

بابر کی روانگی دہلی | بابر فتح کا شادیانہ بجاتا ہوا مع فوج دہلی کو روانہ ہوا، اور سب سے پہلے یہ کام کیا کہ بزرگان دین کے مزارات پر فاتحہ پڑھا اور قدیم عمارات کی سیر کی۔ اور تزک میں واقعات تحریر کئے۔ اس جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی حکومت پٹھانوں کے قبضہ سے نکل کر مغلوں میں چلی گئی، اور بابر دولت مغلیہ کا بانی قرار پایا۔

ہمایوں قلعۂ آگرہ میں | نصیرالدین ہمایوں جاہ و حشم کے ساتھ بہ کمال عجلت قلعۂ آگرہ میں داخل ہوا، اور آتے ہی دروازہ اور کارخانوں پر پہرہ چوکی قائم کیا۔ محافظ خزانہ مہاراجہ گوالیار تھے مگر وہ میدان پانی پت میں حق رفاقت اور نمک حلالی ادا کر چکے تھے۔ افسران قلعہ نے خزانہ، جواہر خانہ، توشک خانہ اور جس قدر شاہی کارخانے تھے سب کی کنجیاں پیش کر کے مورد انعام ہوئے۔

سلطان ابراہیم مقتول کی ضعیف والدہ نے جب یہ خبر سنی تو وہ آسمان کو دیکھتی رہ گئی، اور انتہائی صبر و استقلال سے کام لیا، ضعیفہ کو برقعہ کی ضرورت نہ تھی صرف شرم و حیا کی چادر اوڑھی، وہ خواجہ سراؤں کو حکم دیا کہ آگے چلیں اور اپنے پیچھے بیواؤں اور یتیم بچوں کو لیا، انقلاب عالم کا یہ حیرت انگیز مرقع تھا، لاوارث اور وہ عورتیں اشکبار تھیں، مگر زبان پر مہر خموشی تھی۔ چنانچہ ضعیفہ اپنے لٹے ہوئے قافلہ کے ہمراہ ہمایوں کے سامنے آئی اور مخاطب کر کے کہا کہ اے بابر کے بلند اقبال پوت! ہندوستان کی شہنشاہی مبارک ہو، اور مجھ داغ سحری کی دعائیں لے، اور فتحمند باپ کے صدقہ میں ان بیواؤں اور یتیموں کی جان بخشی کر دے۔

بڑھیا کی کپکپاتی آواز نے ہمایوں کو لرزہ براندام کر دیا۔ اور وہ بے اختیار اشکبار ہو گیا۔ جب قدرے سکون ہوا تو بولا "اے مادر مہربان! آپ کی مستعار شبیں منظور ہیں" اور خواجہ سراؤں کو حکم دیا کہ بیگمات کو حرم سرا میں لیجاؤ رخصت کے وقت ضعیفہ نے اپنی چادر سے ہاتھ نکالا اور ایک صندل کی ڈبیا ہمایوں کے نذر کر کے بولی: "نور چشم! اس ڈبیا کے اندر وہ گوہر شب چراغ ہے جس کی شہرت تمام ہندوستان میں ہے۔ راجہ بکرماجیت کے خزانہ سے نکل کر یہ شاہان اسلام کے قبضہ میں آیا۔ سب سے پہلے علاؤ الدین خلجی کے خزانہ میں آیا اور تین پشت تک ہم نے حفاظت کی، اب یہ بابر کا حق ہے۔ میرا یہ ہدیہ اپنے باپ کے سامنے پیش کر دینا اور دعائیں دے کر رخصت ہوئی۔

بابر قلعہ آگرہ میں | بابر دہلی کی سیر کر کے فوراً داخل آگرہ ہوا۔ ہمایوں نے وہ گراں بہا الماس نذرانہ میں پیش کیا اور ابراہیم کی والدہ کا قصہ سنایا۔ بابر نے وہ الماس ہمایوں کو عنایت کیا۔ مصنف جامع التواریخ لکھتا ہے "بابر بادشاہ در دہلی رسیدہ بتخت نشست، و والدہ و فرزندان سلطان را بشمول عواطف نمود و ہشت لک روپیہ برائے والدۂ سلطان مقرر کرد۔" بابر کی اس شاہانہ فیاضی نے ضعیفہ کو از سر نو زندہ کر دیا اور ابراہیم کی اولاد عرصہ تک فارغ البال زندگی بسر کرتی رہی۔

آگرہ میں ابراہیم کا خزانہ معمور تھا، ہر ایک بیٹے کو لاکھوں روپیہ نقد اور تحائف دیئے، اور افسران فوج کو بھی صلہ و انعام سے نہال کر دیا، اور وطن کے پیرزادوں اور کابل کے ہر فرد کو ایک ایک شاہرخی (نقرئی سکہ ۷ رقیمت کا) انعام دی۔ اس عظیم الشان فتح کے بعد بابر چار سال زندہ رہا، اور اپنی اولاد کے لئے ہندوستان کی حکومت چھوڑ گیا۔ بابر نے ۶۔ جمادی الثانی ۹۳۷ھ (دسمبر ۱۵۳۰ء) کو انتقال کیا "بہشت روزی باد" تاریخ وفات ہے۔ تاریخ ہندوستان میں فردوس مکانی لقب ہے، اور تقریباً ۵۲ سال کی عمر پائی۔

بابر کی موت | بابر ہنوز ہندوستان کی فتوحات میں مصروف تھا کہ ہمایوں بیمار ہو گیا۔ جب حکیموں کی حکمت کام نہ آئی تو مشائخ اور علماء مشورہ کے لئے طلب ہوئے انہوں نے عرض کیا کہ بادشاہ کی نظر میں جو شئے انمول ہو وہ شاہزادہ پر نثار کی جائے کہ جان پر آئی ہوئی بلا ٹل جائے۔ یہ سنتے ہی بابر نے ایک قہقہہ لگایا اور خیال کیا کہ یہ کوہ نور ہیرے کی طرف اشارہ ہے اور ملا وصل کو جواب دیا کہ "پتھر کیا مال ہے میں تو نقد جان تصدق کرتا ہوں" یہ کہہ کر اٹھا اور ہمایوں کی مسہری کے گرد تین چکر لگائے اور عجز و انکسار سے کہا "خداوندا! میں نے اس کی بلا کو اپنی جان پر لے لیا (تین مرتبہ دہرایا) پھر سجدہ میں گرا، اور دیر تک مصروف دعا رہا۔"

لہ جامع التواریخ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۳۶ء حالات ظہیر الدین محمد بابر

خدا کی قدرت دیکھیے کہ بابر بستر مرگ پر گرا اور ہمایوں اُٹھا۔ چند ماہ کے بعد ہمایوں کو تختِ ہندوستان اور بابر کو تختۂ تابوت نصیب ہوا۔ مورخین نے اس واقعہ کو بابر کی دعا یا کرامت پر محمول کیا ہے۔ اور یہ کسی نے نہیں لکھا کہ بابر کس دن بیمار پڑا اور ہمایوں کا کب غسلِ صحت ہوا۔ ورنہ بابر کی موت کا صحیح تعین ہو جاتا اور سب اُلجھنیں مٹ جاتیں۔

۱۔ علامہ ابوالفضل کی رائے دربارِ اکبری کے نامور مورخ شیخ ابوالفضل نے اکبر نامہ میں اس موضوع پر جس قدر لکھا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے:۔

"جب ہمایوں بابر کے حکم سے اپنی جاگیر سنبھل (سنبھل مراد آباد) سے بہ حالتِ مرض آگرہ میں طلب ہوا تو مشاہیر اطبا علاج پر مامور ہوئے لیکن کچھ نفع نہ ہوا۔

اس کے بعد تحریر کرتے ہیں:۔

"چوں مرض فرمن گشت، روزے درآں طرف آبِ جون (آگرہ جمنا کے کنارے) نشستہ، باتفاق دانایانِ عصر اندیشہ معالجہ می فرمودند۔
میر ابوالبقا (صوفی و عالم) کہ از اعاظم افاضل آں روزگار بود عرض رسانیدند کہ از بزرگ پیرداں پیشیں چناں رسیدہ کہ در امثال ایں امور کہ اطبائے صوری از معالجۂ آں عاجز شوند چارۂ کار چنیں دیدہ اند کہ بہترین اشیار را تصدق نمودہ، صحت از درگاہِ الٰہی مسئلت نمایند"
حضرت گیتی ستاں (بابر) فرمودند کہ بہترین چیزہا نزدیک ہمایوں منم۔ و بہترین و شریف تر از من ہمایوں چیزے ندارد۔ من خود را فدائے او سازم، ایزد جہاں آفریں قبول کناد۔"

یہ واقعہ ہے کہ بابر کی زبان سے ہمایوں کے جوشِ محبت میں یہ فقرہ نکلا تھا کہ "خود را فدائے او سازم" کیونکہ بابر کو ہمایوں سب بیٹوں سے زیادہ عزیز تھا اور یہی ولیعہد بھی تھا (جس کی تفصیل ہمایوں نامہ میں ہے) جب ارکانِ مشورہ نے دیکھا کہ بابر بیٹے پر قربان ہو رہا ہے تو انھوں نے تقریر کا رخ پلٹا اور عرض کیا:۔

"خواجہ خلیفہ و دیگر مقربانِ بساط والا، بعرضِ اشرف رسانیدند کہ ایشاں بہ عنایتِ الٰہی صحت حاصل خواہند یافت و در سایۂ دولت آنحضرت بہ عمرِ طبعی خواہند پیوست۔ ایں حرف چرا بر زبانِ اقدس مے گزرانند۔ مقصود آنچہ از بزرگان پیشیں نقل افتادہ آن است کہ بہترین مالِ دنیا تصدق نمایند (اس کے بعد کھلے ہوئے الفاظ میں عرض کیا) پس ہماں الماس بے بہا کہ از مواہبِ غیبی در جنگِ ابراہیم بدست افتادہ

لہ ہمایوں تقریباً جمادی الاول ۹۳۵ھ / جنوری ۱۵۲۹ء میں سنبھل روانہ ہوا تھا، اور وہاں ۶ ماہ قیام رہا تھا، اس کے بعد بیمار ہوا اور شوال ۹۳۵ھ / جون ۱۵۲۹ء میں آگرہ واپس آیا۔

وآں را بدلیشاں (ہمایوں) عنایت فرمودند تصدق باید کرد"

بابر نے اس کے جواب میں یہی کہا کہ خود را فدائے او سازم۔ بابر ہمایوں کی تکلیف کو کسی طرح نہ دیکھ سکتا تھا لہذا وہ خلوت میں جاکر سر بسجود ہو گیا۔ اس کے بعد ابو الفضل لکھتے ہیں:۔

"سہ بار (برگرد) حضرت جانبانی (بابر) جنت آشیانی (ہمایوں) گشتند۔ چوں دعوتِ ایشاں بعز اجابت پیوستہ بود اثر گرانی در خود یافتہ فرمودند۔ برداشتیم، برداشتیم (بلا اپنی جان پر لے لی) فی الفور حرارت غریبہ عارض بدن آنحضرت شد و در حضرت جہانبانی خفیفے طاری گشت، چنانچہ در اندک فرصتے صحت کامل روئے نمود۔"

بجز اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ابو الفضل کو قبولیتِ دعا کا الہام ہوا، اور جو ہونا تھا وہ آنِ واحد میں ہو گیا۔ بہرحال یہ مورخ کی ذاتی رائے ہے۔

۲۔ ہمایوں نامہ کی روایت ابو الفضل کے بعد اب گھر والوں کی روایت بھی سن لیجئے جس میں قبولیتِ دعا کا ایک مجرب عمل بھی بتایا گیا ہے جو ہنوز مشائخ میں جاری ہے، اور توشہ شاہ عبد الحق رودولوی اور دعوتِ اصحاب کہف کے بعد یہ عمل اخیر علاج ہے۔ گلبدن بیگم لکھتی ہیں:۔

دریں اثنا و ضد داشت مولانا محمد فرغونی (باشندۂ فرغانہ) از دہلی آمد، نوشتہ بود کہ ہمایوں میرزا بیمار اند دعائے عجیب دارند، بہ شنیدن ایں خبر حضرت بیگم (دلدار بیگم والدۂ ہمایوں) زود زود متوجہ دہلی شدند کہ میرزا بسیار بے طاقتی می کنند۔ بمجرد شنیدن ایں حضرت آکلم (والدۂ من) بے طاقتی کردہ، مانند تشنہ کہ بیجور آب باشد، بجانب دہلی متوجہ شدند، در متھرا رسیدند، چنانچہ شنیدہ بودند ازاں دہ چند ضعوف و مجهول بہ چشم جہاں بین خویش دیدم۔ ازاں جا ہر دو (مادر و پسر) مانند عیسیٰ و مریم متوجہ آگرہ شدند ..... وقتے کہ ایشاں بیمار بودند حضرت روزہ (مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ) نگاہ داشتند (یہ مشائخ کا عمل ہنوز جاری ہے) آں روزہ از چہارشنبہ نگاہ میدارند ایشاں از اضطراب و بے طاقتی از روز سہ شنبہ نگاہ داشتند (معمول کے خلاف حالتِ اضطراب میں ایک دن پہلے ہی روزہ رکھا) در روزہ مذکور دعا خواستند کہ خدایا اگر بعوض جانِ جان من میدل غود من کہ بابرم عمر و جان خود را بہ ہمایوں بخشیدم سدرہاں روز حضرت را تشویش شدہ۔ ہمایوں بر سر خود آب ریختند (غسل کیا) و بیروں آمدہ بار دادند۔ حضرت پادشاہ بابام را از جہت تشویش درون حرم مرا کے اندرا بردند۔"

اس روایت سے بھی ظاہر ہے کہ دعا کا اثر اس دن سے شروع ہوا لیکن بابر کب تک بیمار رہا کوئی صراحت نہیں ہے۔ صرف روزہ کی روایت زیادہ ہے، لیکن تاریخی تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بابر متواتر بیمار رہا

اور ہمایوں غسلِ صحت کر چکا تھا کیونکہ اس کو مہم کالنجر کی تسخیر کا حکم مل چکا تھا۔ یہ واقعہ ربیع الاول سنہ ۹۳۶ھ (نومبر سنہ ۱۵۲۹ء) کا ہے، چنانچہ ہمایوں تقریباً چھ مہینے کالنجر میں رہا اور جب دوبارہ بیمار ہوا ہے تو شعبان سنہ ۹۳۷ھ میں آگرہ لایا گیا ہے، اور وہ تندرست تھا لیکن بابر بدستور علیل رہا، اور چونکہ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا تھا لہذا اُس نے ہمایوں کو اپنی حیات میں تخت و تاج سپرد کر دیا، چنانچہ ابو الفضل کے الفاظ ذیل قابل توجہ ہیں:-

"ذاتِ معلیٰ صفات، حضرت گیتی ستاں فردوس مکانی زمان زمان گراں تری شد تا بحدے رسید کہ اختلال درخراج تزاید و تضاعف گرفت و امارات رحلت و انتقال از دوخیات حال ہویدا گشت تا آنکہ بادلِ بیدار و باطنِ حقیقت بیں، ارکان دولت و اعیان مملکت را احضار فرمودہ دستِ بیعت خلافت را بر دست ہمایونی نہادہ بجانشینی و ولی عہدی خود نصب فرمودند و بر تخت خلافت جلوس دادہ خود و بپایۂ سریرِ خلافت مصیر صاحب فراش گشتند۔"[1]

۲۔ ہمایوں کی تخت نشینی کے بعد بابر نے اپنی دو شاہزادیوں گلرنگ بیگم اور گل چہرہ بیگم کی بھی حکم دیا

درحین بیماری حکم کردند یہ آکام کہ گلرنگ و گل چہرہ بیگم را کدخدا باید کرد (ہمایوں نامہ)

جب یہ فرض ادا ہو چکے تو بابر نے بتاریخ ششم جمادی الاول سنہ ۹۳۷ھ (۲۵۔ دسمبر سنہ ۱۵۳۰ء) یوم دوشنبہ بمقام آگرہ (چار باغ) میں انتقال کیا

غزل جناب دانش لکھنوی

چشم قدرے پر آب ہے پیارے — کس کی حالت خراب ہے پیارے
مسکرا کر نہیں نہیں کرنا — کتنا پیارا جواب ہے پیارے
جس کو دیوانگی کہا جائے — وہ تمہارا شباب ہے پیارے
اچھا جاؤ وفا نہیں نہ سہی — ظلم کا کچھ حساب ہے پیارے
ٹھہرو ٹھہرو نہ ٹوٹ جائے کہیں — دل بھی نازک حباب ہے پیارے
تم سے سرزد گناہ ہو، توبہ! — عشق خانہ خراب ہے پیارے
رہروِ عشق وصل کا وعدہ — ایک دلکش سراب ہے پیارے
پی کے دیکھو تو ناصحِ مشفق — کتنی میٹھی شراب ہے پیارے
واقعی ہے نہ وہ روبرو دانش! — باہر آنا ہی خواب ہے پیارے

---

[1] اکبر نامہ ابو الفضل حالات علالت ہمایوں

غزل

(از حضرت آثر لکھنوی)

اہلِ ہوس سے ہوش کی منزلیں طے ہوئیں نہیں
ورنہ وہ چشمِ مست کب میکدہ آفریں نہیں

نیم نگہ کا واسطہ، دیکھ لے ایک بار پھر
جس کا سبب نہ کھل سکے، ایسی خلش نہیں نہیں

جھوم کبھی، تڑپ کبھی، ورنہ سکوت ہی بھلا
نالہ ہجومِ شوق میں لائقِ آفریں نہیں

ہائے وہ لذتیں جو ہیں عشق کے التہاب میں
اور یہ جانتے ہوئے زہر ہے انگبیں نہیں

ایسے بھی لمحے گزرے ہیں حیرتِ جمال پر
جلوہ نظر کے سامنے، دل کو مگر یقیں نہیں

گریہ حریفِ شوق ہے، شوق حریفِ آرزو
لیجئے دم تو کس جگہ، منزلِ دل کہیں نہیں

میری نماز اور ہے، میرا مقام اور ہے
عشق کی اصطلاح میں سجدہ تو ہے جبیں نہیں

گوہرِ آبدار ہے حسن سے تیرے ہمکنار
جس پہ ہو ثبت نقشِ غیر، دل کا مرے نگیں نہیں

شبنمِ لالہ زار دیکھ، صبحِ ستارہ بار دیکھ
حیف وہ اشک جو اثر نازشِ آستیں نہیں

خواب گاہِ شاہجہاں

(از جناب فاروق محشر بدایونی)

اللہ! میں یہ تاج محل دیکھ رہا ہوں
یا پہلوئے جمنا میں کنول دیکھ رہا ہوں

یہ شام کی زلفوں سے اُلجھتے ہوئے انوار
فردوس نظر تاج محل کے در و دیوار

افلاک سے یہ کاہکشاں ٹوٹ پڑی ہے
یا کوئی حسینہ ہے کہ جنگل میں کھڑی ہے

آغوشِ تجلی میں نظر سوئی ہوئی ہے
یا شام کے زانو پہ سحر سوئی ہوئی ہے

گلدستۂ رنگیں کفِ صحرا پہ دھرا ہے
بلّور کا ساغر ہے کہ صہبا سے بھرا ہے

اس خاک سے پھوٹی ہے زلیخا کی جوانی
یا چاہ سے نکلا ہے کوئی یوسفِ ثانی

ٹھہری ہوئی یا حسن کے مرکز پہ نظر ہے
یا وقت کے ہاتھوں میں گریبانِ سحر ہے

یا بر لبِ جمنا کوئی دوشیزہ نہا کر
بیٹھی ہے تکلّف سے اداؤں کو چُرا کر

کوئی بتِ سیمیں ہے کلیسائے وطن میں
یا تازہ شگوفہ کوئی چٹکا ہے چمن میں

یا کوئی بطِ مست ہے جو تیر چکی ہے
آکر ابھی دریا کے کنارے پہ رُکی ہے

یا حسن کے اقبال کا چمکا ہے ستارا
نکھری ہوئی چاندی ہے کہ ٹھہرا ہوا پارا

مرمر کا پیالہ لبِ جُو اُلٹ پڑا ہے
یا قاز کا جوڑا ہے کہ پر جوڑے کھڑا ہے

یا تاج قرینے سے ابھی رکھ کے زمیں پر
سویا ہے کوئی بادشہِ وقت یہیں پر

تصویر لئے لیتا ہے ہر حوض کا پانی
گویا کہ جوانی کے مقابل ہے جوانی

حوضوں کے کنارے ہیں کہ گھیرے سے پڑے ہیں
پہرے پہ نگہبان ہیں یا سرو کھڑے ہیں

اک نور کا ٹیکا ہے بیاباں کی جبیں پر
یا عالمِ بالا اُتر آیا ہے زمیں پر

یہ تاج نہیں منظرِ عبرت ہے وطن میں
دو روزہ مسرت کا جنازہ ہے کفن میں

قدرت نے اسے آج دیا خاک پہ لا کے
یہ ایک ہی موتی تھا خزانے میں خدا کے

ہے تخت تو تیار سلیماں کی کمی ہے
واللہ کہ اس عرش پہ یزداں کی کمی ہے

یہ تاج جوابِ معبرۂ شاہجہاں ہے
جنّت اسی تصویر کے پردہ میں نہاں ہے

یہ گل کدہ کہئیے جیسے فردوس کا خاکا
ہے دفن یہیں خاک میں سرمایہ وفا کا

گوشے میں اسی قصر کے دو دل ہیں ہم آغوش
شعلے ہیں مگر مصلحت وقت سے خاموش

صورت کی نہ زیبائش و زینت کی کشش ہے
جو کچھ بھی ہے اس گھر میں محبت کی کشش ہے

ان ٹوٹے مکانات کے پیچھے کسے معلوم
کس شان سے آباد ہے اِک جنتِ معصوم

نظروں میں ابھی تک وہی دلچسپ سماں ہے
آنکھوں میں مری خوابِ گذشتہ ہی جہاں ہے

"نہ پوچھو"

(از حضرت آتش رحمانی رامپوری)

تمنائے اظہارِ حسرت نہ پوچھو
نہ پوچھو مرے دل کی حالت نہ پوچھو

مآلِ خرابِ محبّت نہ پوچھو
تم اب حالتِ صیدِ غفلت نہ پوچھو

عجب چیز ہے دولتِ دردِ الفت
یہ جس کو ملے اُس کی قیمت نہ پوچھو

نہ زخموں پہ چھڑکو نمک مسکرا کر
مزاج خرابِ محبت نہ پوچھو

تمہارے غم و درد کا پوچھنا کیا
جو ان زحمتوں میں ہے راحت نہ پوچھو

تمہیں یاد رکھنا بہر حال مجھکو
مرا انہماکِ محبت نہ پوچھو

سزاوارِ جرمِ محبت سمجھ کر
مجھی سے سزائے محبت نہ پوچھو

تم اپنی توجہ کا محتاج کر کے
خرابِ محبّت کی حالت نہ پوچھو

تم اپنی اداؤں کا بسمل بنا کے
مآلِ شکارِ محبت نہ پوچھو

تمہارا ستم بھی تمہارا کرم ہے
تم اپنے ستم کی ضرورت نہ پوچھو

یہ جنسِ محبت گراں مایہ نکلی
تم اس جنس کی قدر و قیمت نہ پوچھو

آتش اُن سے عرضِ تمنا کی بابت
کبھی بے محل، بے ضرورت نہ پوچھو

قیامِ امنِ عالم کی تدبیریں

(از مولانا محمد یعقوب خاں کلام بی۔اے)

یورپ کے مشرقی (روسی) مغربی (بلجیم وغیرہ) اور جنوبی (اطالیہ) تینوں محاذاتِ جنگ پر اتحادیوں کو اس قدر اہم فتوحات حاصل ہوئی ہیں، اور جرمنی ہر طرف سے اس بُری طرح نرغہ میں آگیا ہے کہ اب موجودہ منحوس جنگ کے خاتمہ کا آغاز سامنے آگیا ہے، اور اب وہ دن بہت ہی قریب ہے جبکہ جرمنی میں ہٹلر اور اُس کی ہٹلریت کا تختہ ہمیشہ کیلئے اُلٹ دیا جائے گا، اور جرمنی کے بعد مشرق اقصیٰ میں جاپان کا نمبر آئے گا۔ اور اس سرزمین خاور کا آفتاب اقبال بھی بہت جلد غروب ہو جائیگا۔

اِس منحوس جنگ میں جس قدر جانیں ضائع ہو چکی ہیں، اور ابھی ہونگی، اور جس قدر دولت کا اتلاف ہو چکا ہے، وہ ما وشما کے تخمینہ واندازہ سے باہر ہے، دنیا اس قدر تباہ و برباد ہو چکی ہے کہ اگر جنگ آج ہی ختم ہو جائے، تو دنیا اقتصادی اعتبار سے کم از کم ایک چوتھائی صدی تک نہیں سنبھل سکے گی۔ ضرورت ہے کہ فتح کے بعد جو امر یقینی ہے۔ ایسی مؤثر تدابیر عمل میں لائی جائیں کہ آئندہ جنگ کا امکان باقی نہ رہے، اور دنیا پھر تباہی کے گڑھے میں نہ جا پڑے۔ اسی بات کے پیش نظر آج کل دنیا کے بڑے بڑے مفکرین کی پرواز خیال اس بات کا احاطہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے کہ جنگ کے بعد دنیا کا کیا حال ہوگا، اور اتحادی اقوام نے، جن کی فتح یقینی ہے، اپنے جو اغراض و مقاصد بیان کئے ہیں انھیں عملی جامہ پہنانے کے لئے کیا تدابیر عمل میں لائی جائیں۔ بعض مفکرین کا خیال ہے کہ دنیا کی تمام سلطنتوں کا ایک عالمگیر وفاق قائم کیا جائے۔ مگر بعض کے نزدیک یہ بات ناممکن العمل ہے۔ دوسرے حضرات کا خیال یہ ہے کہ دولت مشترکہ برطانیہ، امریکہ، روس اور چین (اب چین کا نام نہیں لیا جاتا، بلکہ فرانس کو سمجھنا چاہیئے) میں زیادہ گہرا ارتباط پیدا کیا جائے تاکہ دنیا بھر کے تنازعات کو یہی فیصل کریں۔

اتحادی اقوام کے اغراض و مقاصد کیا ہیں یا کیا تھے؟ اسے معلوم کرنے کے لئے ہمیں مسٹر چرچل اور پریسیڈنٹ روزولیٹ کے اس اعلان کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، جو انھوں نے بحر اوقیانوس میں پہلی ملاقات کرنے کے بعد شائع کیا تھا جسے عرف عام میں "اوقیانوسی سند اعظم" (Atlantic Charter) کہتے ہیں (اگرچہ جس کے وجود سے اب پریسیڈنٹ روزولیٹ نے انکار کر دیا ہے) اس سندِ اعظم میں پریسیڈنٹ روزولیٹ اور مسٹر چرچل نے امریکہ اور برطانیہ کے ترجمانوں کی حیثیت سے اپنے اپنے ملکوں کی پالیسی کے بعض مشترکہ اُصول کا اعلان کیا تھا

اور اُمید ظاہر کی تھی کہ اگر ان اُصولوں پر عمل کیا گیا، تو مستقبل کی دنیا جنت ہوگی۔

دونوں بزرگوں نے اعلان کیا تھا کہ:۔

۱۔ انھیں تمام اقوام عالم کا یہ حق تسلیم ہے کہ جس قسم کے نظام حکومت کے ماتحت وہ رہنا چاہیں اپنے لئے منتخب کریں

۲۔ وہ چاہتے ہیں کہ جو اقوام اختیارات فرمانروائی اور حکومت خود اختیاری سے جبراً محروم کردی گئی ہیں انھیں وہ اختیارات وحقوق پھر حاصل ہوجائیں

۳۔ انھیں امید ہے کہ جب نازی جرمنی کے ظلم وستم کا خاتمہ کردیا جائے گا، تو دنیا میں ایسے امن وامان کا دَور دورہ ہوگا جس میں جملہ اقوام کو اپنے اپنے حدود میں خیر وعافیت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا موقع ملے گا، اور تمام ملک میں تمام آدمی خوف واحتیاج سے آزاد ہوکر زندگی گذاریں گے۔

۴۔ اس کے لئے دنیا کی جملہ اقوام کو مادی وروحانی اسباب کی بنا پر طاقت واسلحہ کا استعمال ترک کردینا ہوگا۔

یہ ہیں وہ اُصول جو تمام دنیا کی عوامیت پسند (ڈیموکریٹک) اقوام کے وسیع وعمیق مطامح نظر پر حاوی ہیں لاکھوں نفوس انھیں مطامح نظر کے حصول کی خاطر اپنی جانیں قربان کررہے ہیں

۱۹۱۸ء کی جنگ عظیم کے بعد پریسیڈنٹ ولسن کے قائم کردہ اُصولوں کی بنا پر مجلس اقوام (لیگ آف نیشنز) کی بنیاد رکھی گئی تھی، مگر وہ ناکارہ ثابت ہوئی اور دنیا میں جنگ وجدال کے انسداد میں قطعی ناکام رہی تھی۔ اس لئے اب مجلس اقوام کے قیام کا تو خیال بھی کوئی دل میں نہیں لاتا مجلس مذکور کی ناکامی کے وجوہ سب کو معلوم ہیں اس مجلس کی بنیاد بھی اس اُصول پر قائم کی گئی تھی کہ تمام دنیا کی اقوام کو "قومی اقتدار فرمانروائی (نیشنل ساورنٹی) حاصل ہونا چاہئیے۔ تمام فرمانروا اقوام آزاد وخود مختار ہونگی، لیکن اقرار صالح کے ذریعہ سے اس امر کی پابند ہونگی کہ اگر جنگ چھڑ جانے کا خطرہ ہو تو سب مل کر اس کے انسداد کی تدابیر اختیار کریں، اور جن شکایات کے جنگ کی صورت میں منتج ہونے کا اندیشہ ہوگا انھیں مصالحانہ گفت وشنید کے ذریعہ سے رفع کردیا جائے گا۔ مجلس اقوام کا بنیادی نقص یہ تھا کہ جب تک اس کے تمام ممبر باتفاق رائے کوئی فیصلہ نہ کریں اس وقت تک اس کی کوئی کارروائی پابندی کے قابل نہیں سمجھی جاتی تھی، اور یہ ظاہر ہے کہ کسی ایک بات پر اکثریت کو متفق ہوسکتی ہے، لیکن سب کا متفق ہوجانا محال نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ اس کے علاوہ مجلس اقوام کے ناکام ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جنگ کے بعد حیات انسانی کی پیچیدگیوں میں کچھ اس قدر اضافہ ہوتا گیا کہ قومی حکومتیں خود اپنی ہی ناک چوٹی میں گرفتار ہوکر رہ گئیں، اور انھیں عالمگیر یا دوسری اقوام کے معاملات کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہ ملی۔ کیونکہ ان تمام قومی حکومتوں کی ایک ہی جماعت کو اپنا بھی اور بین الاقوامی معاملہ بھی دیکھنا پڑتا تھا۔ بایں ہمہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جن اصولوں پر مجلس اقوام کی بنیادیں رکھی گئی تھیں وہ نظری اعتبار سے قابل تعریف ضرور تھیں۔

قیام و بقائے امن عالم کا خیال دنیا میں پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے، اور اس بارہ میں متعدد مدبرین و مفکرین کے نظریے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ بعض برطانوی مدبرین کا نظریہ تھا کہ جس طرح برطانوی دولت مشترکہ دنیا کے امن و امان اور تحفظ کی علمبردار آج ہے اُسی طرح کل وہ بڑے پیمانہ پر اتحاد عالم کی علمبردار بن سکتی ہے۔ واضح ہو کہ دولت مشترکہ برطانیہ میں جملہ ارکان کے دفاع (ڈیفنس) کا تمام بار سلطنت متحدہ برطانیہ و شمالی آئرلینڈ کے دوش پر ہے۔ اگرچہ تمام برطانوی مقبوضات آزاد و خود مختار (ڈومینین) کو از روئے اعلان بالفور سلطنت متحدہ کے برابر مرتبہ حاصل ہے لیکن جہاں تک تدابیر دفاع کا تعلق ہے، وہ سلطنت متحدہ کے دامن عاطفت و حفاظت کے زیر سایہ رہنے پر قانع ہیں اور اس کے وجوہ صاف ہیں لیکن اعلان بالفور اور آئین ویسٹ منسٹر کی رو سے تمام ڈومینین، اپنی جداگانہ حکومتوں مجالس قانون ساز اور حلقہ ہائے انتخاب کی مالک ہیں، اور یہ ٹھیک ہے کہ جنگ و صلح کی اُلجھنوں میں پڑنا ایک فضول سی بات بھی ہے۔ الغرض برطانوی مقبوضات نے صرف اپنے خانگی اور اندرونی معاملات سے تعلق رکھنا مناسب سمجھا۔ اور اپنے نیز تمام مقبوضات آزاد کے دفاع کا انتظام مکمل طور پر سلطنت متحدہ کے ہاتھ میں ہے لیکن اتنی عظیم و وسیع سلطنت کے دفاع کا کام بہت بڑا تھا۔ لہذا دولت مشترکہ برطانیہ گذشتہ و موجودہ عالمگیر جنگوں کو روکنے سے قاصر رہی۔

بہرحال برطانوی مدبرین و سیاست داں کسی نہ کسی طرح سے جنگ روکنے کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اور ۱۹۴۲ء میں یہ بھی خیال پیدا ہوا کہ یورپ کی تعمیر بعد از جنگ کا فرض بھی برطانیہ کے ذمہ ہوگا۔ حالانکہ یہ ایک منطقی مغالطہ ہے۔ کیونکہ یورپ کی باز تعمیر کا کام یورپ ہی تک محدود نہیں ہوگا، یہ ایک عالمگیر مسئلہ ہے علاوہ ازیں امریکہ و روس کو بھی اس معاملہ سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔

الغرض دولت مشترکہ برطانیہ کے تمام سیاست دانوں کا بنیادی نظریہ یہی تھا جو اوپر بیان کیا گیا، باہمہ دنیا کی یہ تمنا برابر جاری تھی کہ کوئی ایسی صورت نکالی جائے، جس میں دنیا کے تمام افراد و اقوام اتفاق و اتحاد باہمی اور امن و امان کے ساتھ رہ سکیں۔ یہ نظریہ مسترد ہو گیا ہے کہ لڑنا جھگڑنا فطرت انسانی میں داخل ہے۔

بہرحال جب مجلس اقوام کا جنازہ نکل گیا، تو دولت مشترکہ برطانیہ کے ممبروں کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ جنگ و صلح کا بار تنہا سلطنت متحدہ پر نہ ڈالا جائے۔ بلکہ دولت مشترکہ کے تمام ممبر انسداد جنگ کے لئے رضاکارانہ تعاون کریں۔ ایسی صورت میں ممکن ہے کہ دنیا سے جنگ کا نام و نشان مٹ جائے۔ لیکن واقعات نے اس نظریہ کو بھی غلط ثابت کر دیا۔ اور آزاد و مساوی المرتبت اقوام کا تعاون بھی ۱۹۱۴ء میں اور اب ۱۹۳۹ء میں جنگ کو نہ روک سکا۔ اور "تعاون باہمی" و اجتماعی تحفظ امن عالم کی دونوں اصطلاحیں حرف غلط ثابت ہوئیں۔ مساوی المرتبت اقوام کے رضاکارانہ تعاون کے ذریعہ امن عالم کے قیام کا خیال بھی ایک خوش فہمی ثابت ہوئی۔ دونوں

عالمگیر جنگوں نے ثابت کر دیا ہے کہ قیامِ امن عالم کے لئے کسی قدر جبر و طاقت کی سخت ضرورت ہے۔ بعض سیاست دانوں کا قول تھا کہ جنگ روکنے کے لئے "اثر" سے کام لیا جائے، مگر ان کو امریکہ کے مشہور پریسیڈنٹ واشنگٹن کا یہ قول غالباً یاد نہیں ہے کہ "اثر کے معنی حکومت نہیں ہیں" الغرض "تعاون باہمی" ہو یا "رضا کارانہ اشتراکِ عمل" یا "اثر" ان سے دنیا کا امن و امان قائم نہیں رہ سکتا، تا وقتیکہ ان کی پشت پر متحدہ اقوام کی مرکزی حکومت کی طاقت کا عنصر بھی کارفرما نہ ہو۔

لارڈ لوتھین نے ۱۹۳۵ء میں اپنے لکچر میں فرمایا تھا:-

"لڑائیوں کا خاتمہ اور دنیا میں امن و امان قائم کرنے کی ایک اور صرف ایک صورت ہے، اور وہ یہ ہے کہ بین الاقوامی حلقۂ عمل میں اسٹیٹ (ریاست) کا اصول داخل کیا جائے، یعنی اقوام عالم کا ایک وفاق قائم کیا جائے جس کی ایسی حکومت ہو کہ ٹیکس لگا کے، انتظامی قانون سازی اور عدالتی کاموں کو سنبھال سکے اور جہاں تک مافوق القومیت امور کا تعلق ہو افراد اس کے مطیع و منقاد ہوں۔"

لارڈ لوتھین کے اس قول پر لائنل کرٹس نے بھی صاد کر دیا تھا، اور دنیا کی تمام عوامیہ حکومتیں (ڈیماکریسیاں) بھی آمنا و صدقنا کہہ اٹھی تھیں، کیونکہ طریقہ معقول معلوم ہوتا تھا لارڈ لوتھین کا قول ہے کہ ہمارے تمام آلام و مصائب کا اصلی سبب یہ ہے کہ جہاں تک تعلقات باہمی کا تعلق ہے، دنیا کی تمام قوتیں "نراجی" جذبات رکھتی ہیں، مجلس اقوام کا میثاق ہے وہ "نراج" پر پردہ تو ڈال دیتا ہے مگر خاتمہ نہیں کرتا، کیونکہ وہ اس ملعون و مردود چیز کی جڑیں بغیر کاٹے چھوڑ دیتا ہے، بالفاظِ دیگر وہ "قومی فرمانروائی" کے جذبات کی بیخ کنی نہیں کرتا۔ "قومی فرمانروائی" کا ہی وہ جذبہ ہے جو سب سے پہلے اپنے مفاد کو دیکھتا ہے۔ الغرض اسی جذبہ کے پوشیدہ ہاتھ نے مجلس اقوام کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ قومی حکومت کے ممبروں کو دوسری باتوں سے اتنا تعلق خاطر نہیں ہوتا جتنا اپنے قومی مفاد سے ہوتا ہے۔ مسٹر کرٹس کا قول ہے کہ یہ نقص اس وقت تک رفع نہیں ہو سکتا جب تک کہ تمام انسانی معاشرہ کی تنظیم بین الاقوامی دولت مشترکہ کی بنیاد پر نہ کی جائے۔ نیشنل گورنمنٹ سے انٹرنیشنل گورنمنٹ تک پہونچنے کے لئے ایک عبوری دور ہونا چاہئے جس کی بنیاد نیشنل حکومتوں کی مرضی پر قائم ہونی چاہئے اور ان حکومتوں کو خاص حقوق و فرائض تفویض کئے جائیں۔

اسٹریٹ، ڈاکٹر جیننگ، مسٹر میکائے، اور سر ولیم بیورج نے بھی بعض "وفاقی" تجاویز پیش کی ہیں جو بعض کے نزدیک نا قابل عمل ہیں، لیکن یہ بات اب صاف طور پر ظاہر ہو گئی ہے کہ اب قومی ریاستوں کا زمانہ نہیں رہا ہے اور اب ضرورت ہے کہ تمام ریاستیں مل کر جملہ امور کے متعلق ایک بین الاقوامی اتحاد قائم کریں، لیکن اسی کے ساتھ قومی ریاستیں ان فرائض کو جن کا تعلق معاملات انسانی سے مستقل اور ضروری ہے انجام دیتی رہیں، کیونکہ ایک ایسے معاشرہ کو وجود میں لانا محال ہے، جس میں طرز زندگی میں یکسانیت پیدا کرنے کے لئے تمام نسلی و قومی عناصر کو ایک جگہ

کرکے ایک معجون مرکب بنا دیا جائے۔ انسانی سوسائٹی کو اتحاد کی جس معراج کمال تک پہونچنا چاہیئے، وہ یہ ہے کہ اتحاد اقوام کے جدا اجزاء ترکیبی اپنی اپنی تشکیل اور اپنے اپنے نظام ترکیبی میں ایک دوسرے سے قطعی جداگانہ ہوں، لیکن اس میں جو سب سے بڑی رکاوٹ ہے وہ یہی ہے کہ ہر قوم دوسرے سے رقابت کرتی ہے۔ اس وقت دنیا میں تقریباً ساٹھ آزاد و خود مختار فرمانروا ریاستیں ہیں، جن میں کسی نہ کسی حد تک رقابت کے جذبات موجود ہیں، اور یہی جذبات ہیں جو کسی نہ کسی وقت مشتعل ہو کر ایک عالمگیر جنگ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی قسم کی گورنمنٹ کے خلاف یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جن حالات کے ماتحت قومی تشکیلات و نظامات وجود میں آتے ہیں، اُن پر کنٹرول رکھنے کی نہ تو اُسے فرصت ہوگی اور نہ ان کا مفصل علم حاصل ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ فی زمانہ ہر قومی ریاست کا کابینۂ وزارت کام میں اس قدر دبا ہوا ہے کہ وہ سر تک نہیں اُٹھا سکتا، کیونکہ اُسے تعلقات خارجیہ، امور داخلیہ اور قومی دفاع کا ہر وقت کام لگا رہتا ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں کرٹس کی رائے یہ ہے کہ ریاستوں کی حکومتیں تو قائم رکھی جائیں مگر جملہ فرائض کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ معاشری معاملات کا کنٹرول وسیع ترین حد تک ان کے ہاتھوں میں رہنے دیا جائے، اور جن باتوں کا تعلق امن و امان اور اُمور متعلقہ سے ہے، وہ بین الاقوامی حکومت کے ہاتھ میں رکھی جائیں۔ تمام قومی ریاستوں کا فرض ہوگا کہ قیام امن و صلح اور انسداد جنگ کے لئے وہ اپنے تمام قومی وسائل سے بین الاقوامی گورنمنٹ کی مدد کریں، تمام خود مختار ممالک جن میں حکومت عوامیہ قائم ہے، امن و صلح اور دفاع کے معاملات میں برطانیہ سے متحد ہو جائیں، اور پھر یہ سب ملکر مندرجۂ بالا قسم کی ایک بین الاقوامی گورنمنٹ قائم کر لیں۔ سب ریاستوں کی سیاست خارجیہ، دفاعی پالیسی اور مصارف دفاعیہ کا بجٹ مشترکہ ہو۔ جس میں ہر ممبر سلطنت حسب قرار داد اپنا اپنا حصہ داخل کرے۔ نیز ان ریاستوں کی ایک مشترکہ مجلس قانون ساز بھی ہونی چاہیئے، جو صرف مسائل دفاع کا فیصلہ کرے، خارجی صورت حالات پر غور و خوض کرے، جن باتوں سے جنگ کا خطرہ ہو اُن کو زیر بحث لائے، دفاع کی ضروری تدابیر اختیار کرے۔ اور یہ بھی طے کرے کہ ہر قومی ریاست اپنی اپنی آمدنی میں سے کتنی کتنی رقم مصارف دفاع کے لئے ادا کرے اس کے علاوہ ایک مشترکہ اگزیکٹو کونسل بھی ہونی چاہیئے جس کا تعلق صرف مسائل دفاع سے ہو۔ اس کونسل کا فرض ہوگا کہ وہ مصارف دفاع کا بجٹ مرتب کر کے مجلس قانون ساز کے سامنے پیش کرے۔ ان مشترکہ مجلس قانون ساز اور مشترکہ اگزیکٹو کونسل کو اس بارے میں کافی اختیارات تفویض کئے جائیں کہ وہ دفاع اور سلامتی کے معاملہ میں ہر سلطنت پر جو بین الاقوامی اتحاد کی رکن ہو زیادہ سے زیادہ بار ڈالیں، اور قومی حکومتیں اپنی طرف سے یہ بوجھ بحصہ رسدی اپنے ٹیکس دہندگان پر تقسیم کر دیں۔ اس بین الاقوامی مجلس قانون ساز کا وقتاً فوقتاً ہر ریاست میں انتخاب کیا جائے۔ بعض مفکرین کی رائے یہ ہے کہ اس بین الاقوامی اتحاد میں نہ صرف دولت مشترکہ تمام شامل ہوں بلکہ اس میں یورپ کے ملک عوامیہ جیسے بلجیم، ہالینڈ، ڈنمارک، اور ناروے بھی شامل کئے جائیں، بین الاقوامی مجلس قانون ساز میں ہر ممبر ریاست

اتنی نمایندگی دی جائے، جتنی اس میں ٹیکس لگانے کی حیثیت ہے۔ البتہ چھوٹی چھوٹی قوموں کو رائے دینے (ووٹنگ) کے معاملہ میں کسی قدر پاسنگ دیا جائے۔

مندرجہ بالا اسکیم کی رو سے تمام داخلی وخانگی معاملات کا تعلق جن میں ٹیکس لگانا بھی شامل ہے، ہر ممبر ریاست کی قومی مجلس قانون ساز سے ہوگا۔ یونین لیجسلیچر صرف اس بات کا فیصلہ کرے گا کہ دفاع پر مجموعی طور پر کتنی رقم خرچ کی جائے تاکہ تمام یونین مستقبل کی جنگوں کے خطرات سے محفوظ رہے۔ اور ہر ممبر ریاست کو اپنی اپنی حفاظت وسلامتی کا اطمینان رہے۔ کیونکہ اس کے بغیر کوئی ریاست اطمینان کے ساتھ اپنے خانگی معاملات کا انتظام نہیں کر سکتی۔ یونین لیجسلیچر کے لئے ہر ممبر ریاست اپنے اپنے نمایندے منتخب کرے جتنے مناسب کے ساتھ اُس کے حصہ میں آئیں۔

یہ اسکیمیں اور تجویزیں جو اوپر بیان کی گئیں، جنگ سے پیشتر کی تھیں، اب جوں جوں جنگ کا خاتمہ قریب آتا جاتا ہے مفکرین عالم کی توجہات پھر اس طرف رجوع ہو رہی ہیں اور سوچا جا رہا ہے کہ ایسی کیا تدابیر اختیار کی جائیں کہ موجودہ جنگ کے بعد کوئی نئی جنگ دنیا کو آلام ومصائب میں مبتلا نہ کرے۔ چنانچہ پچھلے دنوں امریکہ کے مقام "ڈمبارٹن اوکس" میں ایک کانفرنس اسی مقصد سے منعقد ہوئی، جس میں برطانیہ عظمیٰ، ریاستہائے متحدہ امریکہ، اتحاد جماہیر شورائیہ روس اور چین کے نمایندوں نے شرکت کی۔ اور مستقبل میں انسداد جنگ کے لئے ایک مفصل اسکیم مرتب کی۔ اسکیم مذکور کی موٹی موٹی باتیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ایک جدید بین الاقوامی ادارہ یا لیگ "متحدہ اقوام" (یونائیٹڈ نیشنز) کے نام سے قائم کیا جائے، جس کے گیارہ ممبر حسب ذیل ہونگے:۔ (۱) برطانیہ عظمیٰ (۲) ریاستہائے متحدہ امریکہ (۳) اتحاد جماہیر شورائیہ روس۔ (۴) چین۔ (۵) فرانس۔ اور چھ دوسری سلطنتیں۔

(۲) ادارۂ مذکور میں امن وسلامتی کی ایک پنچایت یعنی سیکوریٹی کونسل ہوگی۔

(۳) ایک جنرل اسمبلی ہوگی جس میں "متحدہ اقوام" کی ممبر ہر سلطنت کو ایک ایک ووٹ دینے کا حق ہوگا۔

(۴) ایک بین الاقوامی عدالت انصاف۔

(۵) ایک دفتر سیکریٹریٹ ہوگا، جو ایک سکریٹری جنرل کے ماتحت کام کرے گا

جنرل اسمبلی کا کام یہ ہوگا کہ وہ بجٹ پر غور کرے، جدید ممبروں کا تقرر عمل میں لائے سماجی واقتصادی کونسل کے ممبروں کو منتخب کرے، اور ان تمام شعبہ جات کے متعلقہ امور کا مطالعہ کرے یا کرائے۔ مگر ان تمام باتوں سے زیادہ اہم کام جنرل اسمبلی کا یہ ہوگا کہ وہ سیکیوریٹی کونسل کے غیر مستقل ممبروں کا انتخاب عمل میں لائے۔

قیام امن وسلامتی کی ذمہ دار سیکیوریٹی کونسل ہوگی اور متحدہ اقوام کی ممبر تمام سلطنتوں کا فرض ہوگا کہ وہ اپنے تنازعات بغرض تصفیہ کونسل مذکور کے سامنے پیش کریں۔ کونسل کو اختیار حاصل ہوگا کہ وہ قیام وبقائے امن

وسلامتی کے لئے نہ صرف ڈپلومیٹک اور اقتصادی ذرائع سے کام لے سکیگا اگر ضرورت پڑے تو جبر واکراہ یعنی فوجی ذرائع سے بھی کام لے سکے گی۔ متحدہ اقوام کی مسلح فوجیں اور ملٹری اسٹاف ایک کمیٹی کے زیر کمان ہونگے جس کے ارکان سیکیوریٹی کونسل کے مستقل ممبروں کے نمایندے ہونگے۔

سیکیوریٹی کونسل کا ہر فیصلہ اس وقت مؤثر اور واجب العمل ہوگا جب اسے کونسل مذکور کے دو تہائی یا اس سے زیادہ ممبروں کی تائید وحمایت حاصل ہوگی، اس کونسل کے مستقل ممبر برطانیہ عظمیٰ، ریاستہائے متحدہ امریکہ، اتحاد جماہیر شوروئیہ روس اور چین ہونگے۔ اگرچہ کونسل میں غیر مستقل ممبروں کی اکثریت ہوگی لیکن اس شرط کی وجہ سے کہ ایک اہم فیصلہ کے لئے کونسل کے دو تہائی ممبروں کے ووٹ حاصل ہونا ضروری ہے، ہمیشہ تین چار بڑی سلطنتوں کی ہی رائے غالب رہیگی، گویا تمام دنیا پر چار بڑی سلطنتیں ہی حکومت کریں گی، اور متحدہ اقوام کی فوجی طاقت انھیں بڑی سلطنتوں کی مٹھی میں رہیگی، اور دنیا کے مستقبل کا امن وامان اس بات پر منحصر ہوگا کہ یہ بڑی بڑی سلطنتیں کس حد تک اشتراک عمل کرتی ہیں۔

بعض اغراض ومقاصد کے لئے منطقہ وار بند وبست بھی رکھا جائے گا، تاکہ بین الاقوامی اقتصادی اور انسانی فلاح وبہبود کے معاملات کی تکمیل میں سہولت رہے اور حقوق انسانی وآزادی وحریت کے احترام وتقدیس میں ترقی ہو گویا دنیا کی آئندہ تنظیم میں منطقہ واری اصول بھی کارفرما ہوگا۔

اسکیم مذکور کا جو خاکہ تیار کیا گیا ہے، اس سے یہ بات صاف طور پر واضح نہیں ہوتی کہ منطقہ وار کونسل کا جنرل اسمبلی اور سیکیوریٹی کونسل سے کیا تعلق ہوگا؟ سیکیوریٹی کونسل کے فرائض میں یہ بات بھی داخل ہے کہ وہ مقامی تنازعات کا تصفیہ منطقہ وار کونسل یا ایجنسی کے ذریعہ کرائے۔ اور خود کو منطقہ وار کونسلوں کی کارگذاریوں اور سرگرمیوں سے آگاہ رکھے، اور دیکھتی رہے کہ وہ بین الاقوامی امن وسلامتی کے قیام وبقا کے لئے کیا خدمات انجام دے رہی ہیں

اگر دنیا کو مختلف منطقوں میں تقسیم کر دیا گیا تو امن وصلح کی صورت اسی وقت تک نظر آسکے گی جب تک بڑی بڑی سلطنتیں اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر واقتدار سے تجاوز کرنے کا اقدام نہیں کریں گی۔ فوری ضرورت کے لئے جو مسلح فوجیں سیکیوریٹی کونسل کے ماتحت ہونگی ان کا انتظام بڑی بڑی سلطنتیں آپس میں سمجھوتہ کرکے کرینگی۔ یہ بھی طے کیا جائیگا کہ اگر ضرورت آپڑے تو کتنی فوج کام میں لائی جائے، اور اس فوج کو کس قسم کی سہولتیں بہم پہونچائی جائیں۔

جب تک سیکیوریٹی کونسل وجود میں آئے، اس وقت تک قیام امن وامان کی تمام ذمہ داری برطانیہ، امریکہ، روس وچین پر رہے گی، اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کی تمام چھوٹی اور کمزور سلطنتیں آئندہ ایک قسم کی ادنیٰ یا ماتحت پوزیشن میں رہیں گی، کیونکہ قیام امن وامان کی ذمہ دار صرف بڑی بڑی سلطنتیں ہونگی۔

دفتر سکریٹریٹ کے سکریٹری جنرل کا فرض ہوگا کہ اگر کسی معاملہ کی نسبت اس کو یہ اندیشہ ہو کہ اس میں بات

بڑھتے بڑھتے تنگڑ بن جائیگی اور جھگڑا زیادہ بڑھ جائیگا تو وہ اس معاملہ کی طرف سیکیوریٹی کونسل کو فوراً توجہ دلائیگا۔

بین الاقوامی عدالت انصاف جو قائم ہوگی اُس کے آئین میں کسی قسم کا بین الاقوامی تغیر و تبدل نہیں ہوگا

مطلب یہ ہے کہ "متحدہ اقوام" میں جو ریاستیں شامل ہونگی وہ اپنے اختیارات فرمانروائی کے کسی حصہ سے بھی دست بردار نہیں ہوں گی۔ جہاں تک سیاسی اقتدار کے حصول کا تعلق ہے، اس کے لئے ایک دوسری جماعت قائم کی جائیگی جس کی طاقت دربارۂ قیام امن وسلامتی کا انحصار اس امر پر ہوگا کہ بڑی بڑی طاقتیں اپنی قومی خواہشات کو کس حد تک قربان کرکے آپس میں اشتراک عمل کریں گی۔

مندرجۂ بالا اسکیم کی جزویات وتفصیلات ابھی طے نہیں ہوئی ہیں جو باتیں ابھی کھلی چھوڑ دی گئی ہیں، اُن کے بارہ میں برطانیہ عظمیٰ، ریاستہائے متحدہ امریکہ، روس اور چین، اپنی اپنی جانب سے مکمل تجاویز پیش کریں گے جن پر متحدہ اقوام کی کانفرنس میں بحث وتمحیص کرکے جملہ امور کا فیصلہ کیا جائے گا۔

مجوزہ اسکیم کے خاکہ سے ظاہر ہے کہ اس میں اور مجلس اقوام مرحومہ کے میثاق میں بہت فرق ہے، اور اس اسکیم میں اس امر کی مصمم کوشش کی گئی ہے کہ قیام امن وسلامتی کے مسئلہ کو بین الاقوامی تعاون کے دیگر پہلوؤں سے بالکل الگ کردیا جائے اور دفاع کے لئے زیادہ عمدہ اور ٹھوس امکانات بہم پہونچائے جائیں۔ اس صورت میں مجوزہ اسکیم مسٹر کرٹس کی تجاویز سے متفق ہے۔ اس میں ان تجاویز کو زیادہ درست بنیاد پر رکھا گیا ہے، جن پر عمل کرکے متحدہ اقوام حملہ آور قوتوں سے اپنی رائے منوا سکیں گی۔

مجوزہ اسکیم زیادہ سادہ، محدود اور قابل عمل بھی ہے۔ اس میں ایک ایسی بین الاقوامی گورنمنٹ وجود میں لائی جائیگی جس کے فرائض صرف قیام امن اور دفاع تک محدود ہونگے۔

اسکیم مذکور کے سلسلہ میں بعض حضرات نے کچھ تجاویز بھی پیش کی ہیں، مثلاً

(۱) خبر رساں ایجنسیوں کے ذریعہ سے اسکیم مذکور کے خاکہ کی جو تفصیلات معلوم ہوئی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ برطانیہ سیکیوریٹی کونسل کا ایک مستقل ممبر ہوگا۔ اس سے یہ بات صاف ظاہر نہیں ہوتی کہ برطانیہ سے محض برطانیہ عظمیٰ مراد ہے، یا اس میں "برطانوی دولت مشترکۂ اقوام" کے ممبر بھی شامل ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ سیکیوریٹی کونسل میں نہ صرف برطانیہ عظمیٰ کو بلکہ برطانوی ڈومینینوں اور ہندوستان کو بھی نشست ملنی چاہیئے۔

(۲) غالباً یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ پہلے "متحدہ اقوام" کی تعمیر چھوٹے پیمانہ پر کی جائے، اور اس میں صرف دولت مشترکہ برطانیہ کے ممبر، ہندوستان، ریاستہائے متحدہ امریکہ، اتحاد جماہیر شوروائیہ روس، چین، اور یورپ کے چھوٹے چھوٹے عوامیہ ممالک جیسے بلجیم۔ ہالینڈ۔ ناروے وغیرہ شامل ہوں۔ اس کے بعد جدید لیگ کے ممبروں کی فہرست پر پانچ یا دس برس کے بعد پھر نظر ثانی کرلی جائے۔

(۳) بہتر ہوگا کہ ایسی محوری حکومتوں کو بھی جیسے بلغاریہ، رومانیہ و فنلینڈ ہیں۔ جنھوں نے محوری طاقتوں کو عملاً اور
سرگرمی کے ساتھ مددی تھی مگر اب تائب ہوکر جرمنی کے خلاف اور اتحادیوں کے موافق ہوگئی ہیں، جدید لیگ میں
شامل کرلیا جائے۔ مگر دس برس بعد جدید لیگ کی جنرل اسمبلی کے ممبروں کی فہرست پر پھر نظر ثانی کرنا ضروری ہوگا۔
کیونکہ محوری طاقتوں اور اُن کی حاشیہ نشین ریاستوں کے رگ و ریشہ میں مخالف عوامیہ ہٹلری اُصول جاری و ساری
ہیں، اور ان کے دلوں سے مطلق العنانیہ و آمرانہ ذہنیت دُور ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔

(۴) بعض حلقوں میں اسکیم مذکور اس بنا پر قابل اعتراض ٹھہرائی جاسکتی ہے کہ اس میں تمام سیاہ و سفید بڑی بڑی
طاقتوں ہی کے ہاتھ میں ہوگا۔ لیکن یہ اعتراض قابل پذیرائی نہیں، ایسا ہی ہونا بھی چاہیئے، کیونکہ قیام و بقائے
امن عالم کا تمام بار بوجھ انھیں کے شانوں پر پڑے گا۔ اس کے علاوہ جو بڑی بڑی طاقتیں سیکیوریٹی کونسل کی مستقل
ممبر ہونگی وہ سر سے پیر تک عوامیہ ہیں۔ موجودہ جنگ کی پریشانیوں نے ان کے جملہ اختلافات دُور کرکے سب کو
ایک ہی سانچہ میں ڈھال دیا ہے۔ ان بڑی بڑی طاقتوں کی نسبت یہ خیال پیدا نہیں ہوسکتا کہ وہ آپس میں متحد ہوکر
دوش بدوش لڑنے کے بعد خود بھی کسی دوسری سلطنت پر حملہ کر بیٹھیں گی۔ برطانوی دولت مشترکہ اقوام قطعی امن
پسند صلح جو اور ڈیموکریٹک ملک ہیں۔ ان کی نسبت یہ سوئے ظن نہیں ہوسکتا کہ وہ کسی دوسری ریاست کا علاقہ
چھین لینے کے درپے ہونگے۔ یہی خیال روس اور چین کے بارہ میں ہوسکتا ہے۔

(۵) اسکیم کے خاکہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سیکیوریٹی کونسل کا اُصول خالص برطانوی ہے اور بین الاقوامی
گورنمنٹ کا نظریہ کرٹس کا ہے جس کا فرض قیام و بقائے امن ہے۔ لیکن خاکہ سے اس مسئلہ کا حل معلوم نہیں ہوتا
کہ سیکیوریٹی کونسل پر جو مالی بوجھ پڑے گا اُس سے وہ کیونکر عہدہ برآ ہوگی۔ یہ مانا کہ سیکیوریٹی کونسل بجٹ مرتب کرے گی
لیکن اس بجٹ کی رقم کے وصول ہونے کی صورت کیا ہوگی، اور اسے کون وصول کرے گا؟ اس سلسلہ میں کرٹس
کی یہ تجویز مناسب ہے کہ سیکیوریٹی کونسل بجٹ مرتب کرے۔ جنرل اسمبلی اسے پاس کرے اور متحدہ اقوام کی تمام
ممبر ریاستیں بحصہ رسدی اپنی اپنی رقم ادا کریں۔

(۶) خاکہ سے یہ بات صاف طور پر واضح نہیں ہوتی کہ جو سلطنتیں سیکیوریٹی کونسل کی ممبر ہونگی ان کے نمایندوں
کا انتخاب کیونکر عمل میں لایا جائے گا۔ کرٹس کی تجویز یہ ہے کہ تمام ممبر ریاستوں میں اس کے لئے وقتاً فوقتاً جنرل
الکشن ہوا کرے، اس کے علاوہ جو ممبر ریاستیں سیکیوریٹی کونسل کے اجزا ترکیبی ہیں، ان کو ان کی آبادی کے تناسب
نہیں بلکہ ان کی اہمیت کے اعتبار سے نمایندگی دی جائے۔

(۷) یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ کرٹس کے نظریہ کے مطابق سیکیوریٹی کونسل اگزیکٹو اور لیجسلیٹو دونوں جماعتوں
کا مجموعہ ہوگی۔

(۸) بعض مفکرین کے نزدیک مجوزہ اسکیم میں یہ خامی ہے کہ جنرل اسمبلی کے ممبروں کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ حسب الطلب اور آپس میں طے شدہ تعداد میں سیکیورٹی کونسل کو مسلح فوجیں بہم پہونچائیں گے، اور جن سہولتوں اور دیگر باتوں کے قیام و بقائے امن کے لئے ضرورت ہوگی اُن کے بہم پہونچانے میں دریغ نہ کریں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ مسلح فوجیں اپنی اپنی نیشنل گورنمنٹ کے ماتحت اور انھیں کے کنٹرول میں رہیں گی۔ لیکن یہ طریقہ باہمی ہم آہنگی کے لئے مدد معاون ثابت نہیں ہوگا، اور کام میں بھی خواہ مخواہ دیر لگے گی، کیونکہ فوجوں پر کسی ایک جماعت کا کنٹرول نہیں ہوگا۔ اسکے علاوہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ متحدہ اقوام کے تمام اجزائے ترکیبی ریاستوں کو اپنی مسلح فوجوں کی تعداد رکھنا اور اس کی نگہداشت اور اسلحہ بندی کا بار گراں برداشت کرنا پڑے گا۔ اس سے زیادہ بہتر کرٹس کی تجویز ہے۔ جو یہ ہے کہ بین الاقوامی گورنمنٹ قیام امن و دفاع کے مصارف کا بجٹ مرتب کرے اور تمام ممبر ریاستیں اپنے اپنے حصّہ کی رقم ادا کریں، اور جس قدر مسلح فوج بین الاقوامی گورنمنٹ قیام امن و دفاع کے لئے ضروری سمجھے، اُسے وہ خود بھرتی کرکے براہ راست اپنے کنٹرول میں رکھے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ ممبر ریاستوں کو اتنی فوج رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی جو داخلی طور پر امن و امان رکھنے کی ضرورت سے زیادہ ہو۔ اس اسکیم میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ جتنی کم مسلح فوج کسی نیشنل گورنمنٹ کے پاس ہوگی۔ اتنا ہی اسے اپنی کسی حریف ریاست پر حملہ کرنے کا کم موقع ملے گا۔ اور جب نیشنل ریاستوں کے پاس لڑنے بھڑنے کے لئے مسلح فوجیں ہی نہ ہونگی تو اُن کے دل میں نقض امن کا خیال قدرتاً پیدا ہی نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کے برعکس وہ اپنی داخلی تعمیر و درستی میں مصروف رہیں گی۔ امن پسندی، صلح جوئی اور اخوت و محبت کے جذبات کا دنیا میں دور دورہ ہوگا۔ اگر کرٹس کی تجویز کردہ اسکیم پر عمل کیا گیا تو ادارہ "متحدہ اقوام" کی ہر ممبر ریاست بڑی حد تک اس بار گراں سے بچ جائیگی۔ جو ایک بڑی مسلح فوج رکھنے، اسے اسلحہ بند کرنے اور اس کے لئے ہر قسم کا ساز و سامان فراہم کرنے میں اسے برداشت کرنا پڑے گا۔ علاوہ ازیں کرٹس کی اسکیم پر عمل کرنے سے بحر اوقیانوس کی سند اعظم (اٹلانٹک چارٹر) کی دفعہ ہشتم کا مقصد بھی پورا ہو جائے گا۔ جو یہ ہے کہ تخفیف اسلحہ بندی عام ہونی چاہئیے۔ امن پسند و صلح جو فوجیں رکھنے اور اسلحہ بندی کے حوصلہ شکن مصارف سے بھی بچ جائیں گی۔

(۹) ڈمبارٹن اوکس اسکیم کی یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ادارہ "متحدہ اقوام" کی جنرل اسمبلی اس اصول پر کاربند ہوگی کہ ادارہ مذکور تمام امن پسند و صلح جو ریاستوں کی مساوات کے اصول پر قائم ہے۔ لیکن جس طرح قدرتاً تمام آدمی قد و قامت اور رنگ و روپ اور عادات و خصائل میں برابر نہیں ہوتے، اسی طرح تمام قومیں بھی برابر نہیں ہوتیں۔ بعض اوقات یہ بات بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ "ہر کہ بقامت کہتر بقیمت بہتر" ہوتا ہے لہذا مرتبہ کو کسی قوم کی وسعت یا کثرت سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئیے۔ مختلف ریاستوں کا سیاسی مرتبہ برابر ہو سکتا ہے

جیسے کہ آئین ویسٹ منسٹر کی رو سے کناڈا، جنوبی افریقہ، آسٹریلیا و نیوزی لینڈ وغیرہ کا ہے۔ لیکن جنوبی افریقہ اور نیوزی لینڈ وسعت میں کناڈا اور آسٹریلیا کی برابری نہیں کر سکتے۔ لہذا یہ توقع نہ رکھنا چاہیئے کہ جو وزن یا قدر و قیمت اتحاد مجالس شورائیہ روس کی ہوگی وہی قدر و قیمت امریکہ کی ریاست پناما یا پیرو کی بھی ہوگی یا ہسپانیہ و سویڈن بھی ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے ہم پلہ ہوں گے۔ الغرض کوئی بھی ایسا آئین خیال میں نہیں آسکتا جو بڑی بڑی طاقتوں کے اثر و اقتدار کو محدود کر دے۔

بہر حال ڈمبارٹن اوکس میں جو اسکیم تیار کی گئی ہے، اُس کے اندر یہ خیال کارفرما ہے کہ دنیا میں ایک ایسا عالمگیر ادارہ یا اسٹیٹ قائم کی جائے جسے آئندہ جنگ روک دینے کی طاقت حاصل ہو۔ یہ ایک مبارک اقدام ہے اس جانب کہ دنیا کی امن پسند اور صلح جو قومیں امن و امان کی زندگی بسر کریں۔ آزادی و حریت کا دور دورہ ہو اور دنیا خوف و احتیاج سے دور رہے۔

ہندوستان کو بھی سکیورٹی کونسل میں بحیثیت ایک مستقل ممبر کے نمائندگی ملنا چاہیئے۔ گذشتہ اور موجودہ عالمگیر جنگوں میں حریت و آزادی کے مقاصد کی جو خدمات ہندوستان انجام دے چکا ہے اور دے رہا ہے اس کے صلہ میں یقیناً ہندوستان اس نمائندگی کا مستحق ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے ذرائع و وسائل، اس کی محفوظ قدرتی دولت، اس کا قدیم تمدن و تہذیب، اس کی وسعت و عظمت اور اپنے جغرافیائی محل وقوع کے اعتبار سے اس کی عالمگیر اہمیت ضرور اس بات کے متقاضی ہیں کہ سکیورٹی کونسل میں ہندوستان کو بھی ایک مستقل نشست ملنا چاہیئے۔

غزل

(جناب گوبند پرشاد صاحب سب رجسٹرار سلون)

پوچھو کچھ کہ میں بھی ہوں دل تپاں لئے ہوئے　　نظر میں اپنی ذوقِ حسنِ دلستاں لیئے ہوئے

صدائے عشق بھر گئی ہے زندگی کے ساز میں　　سکوتِ قلبِ زار بھی ہے اک فغاں لئے ہوئے

راہی لطف عام ہے وگرنہ ایسی دلکشی　　لطافتِ جہاں تو ہے ترا نشاں لئے ہوئے

کی شاہراہ میں ہجوم اہلِ زیست ہے　　حیات اپنی رَو میں ہے یہ کارواں لئے ہوئے

لِ خراب کے لئے یہی تو جائے شکر ہے　　کہ اس کا ذرہ ذرہ ہے غمِ نہاں لئے ہوئے

سوزشِ نہاں دل کی انتہا کا فیض ہے　　کہ ہر ادائے حسن ہے تجلیاں لئے ہوئے

بھی تو برق و شعلہ بن کبھی ہجوم ابر بن　　کہ اہلِ عشق آئے ہیں ہزار جاں لئے ہوئے

کوئی گلہ نہیں مگر کچھ آپ کا بھی فرض تھا　　میں جا رہا ہوں اپنی بدنصیبیاں لئے ہوئے

سنہ ۱۹۴۵ء

(شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی)

ہر شخص سے پوچھتا ہوں کس سے پوچھوں
ہر لب پہ ہے حرف ہائے کس سے پوچھوں
کچھ دور سے اس عالم آب و گل میں
ہر چیز یہ کہتی ہے اداس کس سے پوچھوں

ہستی ہی نہیں نور شبستاں بھی ہے بار
کیا شانۂ نیلاں گل خنداں بھی ہے بار
یوں آج تھکا ہوا ہے سینے میں دل
یعنی نفس و جنبش مژگاں بھی ہے بار

بھاتا ہی نہیں کوئی تماشا ہم کو — دنیا ہی پسند ہے نہ عقبیٰ ہم کو
کہتے ہیں جسے دولتِ قربِ جاناں — اُس شئے کی بھی اب نہیں تمنا ہم کو

"اُردو میں غلط لفظوں کا اِستعمال"

(از جناب قمر نعمانی سہسرامی)

"زمانہ" اگست ۱۹۴۲ء میں جناب سید اختر علی تلہری صاحب کا ایک مضمون مندرجہ بالا عنوان سے شائع ہوا ہے لیکن آپ کا اعتراض صرف الفاظ ہی پر نہیں بلکہ محاورات پر بھی ہے' اور وہ الفاظ و محاورات حضرت ساغر نظامی کے مجموعۂ کلام "بادۂ مشرق" سے انتخاب کئے گئے ہیں. حضرت ساغر کا شعر ہے:-

نئی شراب سے دامن کو لالہ زار کریں　　　سرورِ تازہ سے پھر مقدمِ بہار کریں

حضرت اختر کا اعتراض ہے کہ "محاورہ میں" خیر مقدم "کرنا رائج ہے' خیر کا اس مقام سے حذف صحیح نہیں' یاد پڑتا ہے کہ جوش نے بھی کسی نظم میں مقدم خیر کے حذف کے بعد استعمال کیا ہے' جوش سے بھی محاورہ میں فروگذاشت ہوئی ہے" میرے خیال میں خیر اور مقدم لازم و ملزوم نہیں ہیں' "مقدم" کے معنی ہیں سفر یا کسی جگہ سے تشریف آوری' ورود' رونق افروزی' قدم رنجہ فرمائی' قدم رکھنے کا وقت' قدم رکھنے کی جگہ" مقدم تنہا اس مفہوم کا حامل ہے تو پھر کیا ضروری ہے کہ محاورہ ہی کے طور پر استعمال کیا جائے؟ اس سے انکار نہیں کہ کچھ قباحت ضرور ہے۔

اے علم بردارِ مذہب اے دماغِ منتشر　　　تو نے مذہب پر کبھی ڈالی بھی ہے گہری نظر

حضرت اختر نے لفظ "منتشر" بفتح شین کے غلط ہونے پر بہت زور دیا ہے اور حقیقتاً آپ کے اس مقالہ کا مقصد ہی اس لفظ کو بفتح شین غلط قرار دینا ہے باقی اعتراضات ضمنی ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں حضرت اختر نے رسالہ "نگار" میں حضرت جگر مرادآبادی کے اس شعر پر:-

نگاہِ اہلِ دل بھی رہ گئی زیر و زبر ہو کر　　　کہاں پہونچے مرے اجزائے ہستی منتشر ہو کر

یہ اعتراض کیا تھا "انتشار" مصدر لازم ہے اس کا اسم مفعول نہیں بن سکتا."

اس کے جواب میں ایک صاحب نے حضرت احسن مارہروی مرحوم و حضرت سیماب اکبرآبادی کے اشعار پیش کئے تھے:-

چلیں گی آندھیاں بغض و حسد کی ہند میں کب تک　　　ہم اوراقِ پریشاں بن کے کب تک منتشر ہونگے　(احسن)

کمزور ہے خیال' تصور ہے منتشر　　　ہو منتشر نہ سلسلۂ حسن و عشق اگر

نالے براہِ راست تجھی پر اثر کریں　(سیماب اکبرآبادی)

اس کے بعد جناب پروفیسر عندلیب شادانی نے حضرت جگر کے کلام پر "ساقی" میں تنقید کی اور اپنے مضمون

انداز میں اسی شعر

نگاہِ اہلِ دل بھی رہ گئی زیر و زبر ہو کر   کہاں پہونچے مرے اجزائے ہستی منتشر ہو کر

پر یہ اعتراض فرمایا: "جگر صاحب کی جدتوں سے فقط اہلِ ہند ہی نہیں بلکہ عرب والے بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں منتشر بروزن مختصران کے یہاں موجود نہیں جگر صاحب نے مفعول کا نیا صیغہ ایجاد کیا ہے مانا کہ از روئے قواعد عربی منتشر (بفتح شین) غلط ہے، مگر اس غلطی سے زبان میں وسعت اور شعرا کے لئے سہولت پیدا ہو گئی ہے، مختصر کا قافیہ تو پہلے سے موجود ہے، اب جگر کے لئے منتشر کا قافیہ بھی نکل آیا، اس قسم کی غلطیاں وسعتِ زبان کے لئے نہایت ضروری ہیں" (ساقی دسمبر ۱۹۴۲ء)

پروفیسر صاحب کا جواب بھی انھیں حضرت نے لکھا جنھوں نے اختر صاحب کا جواب لکھا تھا، دوسری بار جواب تو ایک شعر اور سند میں زیادہ کر دیا :-

روزِ روشن میں پڑھی کل میں نے اِک شاعر کی نظم   اس کو نثری سے بھی پایا میں نے پڑھ کر منتشر (نظم)

اس سلسلہ میں میں نے بھی "[illegible] شعلۂ طور پر ایک نظر" کے عنوان سے شاعر (آگرہ مارچ۔ اپریل ۱۹۳۹ء) میں اس لفظ پر تفصیل سے بحث کی تھی۔ اس کے بعد خان بہادر جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے پروفیسر عندلیب کے اعتراض اور ان کے مجیب کے جواب پر محاکمہ فرمایا، محاکمہ میں منتشر بفتح شین کو غلط ٹھہرایا، پھر جناب کوکب شاہجہانپوری نے محاکمہ پر محاکمہ کیا تو یہ لکھا کہ "انتشار" باب انفعال سے نہیں باب افتعال سے ہے اس لئے منتشر بفتح شین بے شک و ریب صحیح ہے۔"

چونکہ کوکب صاحب سے پہلے میں "شاعر" میں لکھ چکا تھا، جناب کوکب نے صرف باب افتعال سے لکھ کر فیصلہ کر دیا کہ بفتح شین صحیح ہے۔ مجھے یہ شک یوں ہوا کہ پروفیسر شادانی نے حضرت جگر کے اس شعر پر:-

"یہ چیخی ہے کس انداز سے کس کرب و بلا سے"

یہ اعتراض کیا تھا کہ "کرب" کا استعمال تو اس موقع پر صحیح ہے لیکن "بلا" کا اضافہ غلط ہے۔ ان کا جواب دینے والے نے یہ جواب دیا کہ "کرب و بلا" کا استعمال ویسا ہی ہے جیسے رنج و غم" وغیرہ، محاکمہ کرتے ہوئے میں نے شیرازی کے دو شعر پیش کئے تھے کہ جواب صحیح دیا گیا ہے :-

یک قطرۂ خوں بیش نہ باشد دلِ غمگیں   از کرب و بلا یاد کند چوں زشہ دیں

حکایت کنم از زمینِ بلا   ز کرب و بلا ہائے کرب و بلا

اور جناب کوکب نے بھی جواب کی موافقت کرتے ہوئے یہ کہا کہ صرف مثال کی ضرورت ہے وہ حاضر ہے، اور دو شعر مثال میں پیش کر دیئے جو میں لکھ چکا تھا چونکہ خرم شیرازی کا دیوان [illegible] اور اس [illegible]

اس میں اکثر جگہ "کرب وبلا" استعمال کیا گیا ہے، میں نے سمجھا کہ کوکب صاحب نے وہیں سے نقل کر دیا ہے، ورنہ یہ کیا ضرور تھا کہ سارے دیوان سے اُن کو یہی دو مثالیں ملیں؟

اب آٹھ سال کے بعد جناب اختر نے ساغر صاحب کا شعر لے کر اپنا وہی اعتراض دُہرایا ہے، لیکن اس مرتبہ "منتشر" کو غلط ثابت کرنے میں زیادہ کاوش کی ہے، اختر صاحب کی عبارت اگرچہ طویل ہے لیکن اسے نقل کر دینا ضروری سمجھتا ہوں:-

"انتشار عربی مصدر ہے جس کے معنے پھیلنے کے ہیں، پھیلنا لازم ہے، پھیلانا البتہ متعدی ہے، اس کے لیے عربی میں لفظ "نشر" ہے، مصدر لازم کا اسم مفعول نہیں بنتا، "منتشر" شین کے زیر کے ساتھ اسم مفعول ہی ہو سکتا ہے، اسم ظرف کا کوئی محل نہیں، لیکن جب کہ لفظ "انتشار" عربی لغات کی تشریح کے بموجب مصدر لازم ہے تو پھر اس کے اسم مفعول کے معنی ہی کیا ہوئے "منتشر" شین کے زیر کے ساتھ اسم فاعل ہے اور صحیح ہے مگر وہ نظر کا قافیہ نہیں بن سکتا، یقیناً باب افتعال اپنی خاصیت کے لحاظ سے لازم نہیں ہے اور انتشار باب افتعال ہی سے ہے لیکن بہت سے وہ لفظ جن کے "ف" کلمہ کی جگہ "ن" ہے اور ہم مصدر لازم کے معنی پیدا کرنے کے لئے باب انفعال کی شکل میں انھیں لانا چاہتے ہیں جو بالخاصہ لازم ہے مگر "ف" کلمہ کی جگہ "ن" ہونے کی وجہ سے "نون" دو جمع ہو جاتے ہیں ایسی حالت میں ثقل دُور کرنے کے لئے باب انفعال کا کام افتعال سے لیتے ہیں، اس طریقہ سے باب افتعال کے بھیس میں آنے والے مصدر مصدر لازم ہی رہتے ہیں، "منتہی الارب" وغیرہ میں "نشر" مادہ کے ذیل میں لفظ "انتشار" سے بحث کرتے ہوئے اس کی خاص طور پر تشریح کر دی گئی ہے علمائے لغت کی تصریح کے بعد انتشار کے متعدی ہو سکنے کا احتمال پیدا کرنا بالکل ہی بیکار ہے، مختصر یہ ہے کہ جہاں تک عربی لغت کا تعلق ہے "منتشر" بفتح الشین اسم مفعول کے صیغہ کی حیثیت سے قطعاً صحیح نہیں ہے"

حضرت مولانا نے عربی قواعد سے تو یہ بحث ختم ہی کر دی کہ "منتشر" بفتح شین بالکل غلط ہے لیکن اس سے انکار نہیں ہے کہ "انتشار" باب افتعال سے نہیں اور اس سے لازم و متعدی دونوں صیغے آتے ہیں، تو پھر معنی لازمی کو براہ راست اس سے ادا کر سکتے ہیں اس کی کیا ضرورت ہے کہ باب انفعال سے مدد طلب کی جائے اور "دو" "ن" سے مجبور ہو کر باب افتعال پر بھیس بدل کر رجوع کیا جائے؟ پھر یہ کیا ضروری ہے کہ بھیس بدلنے کے بعد بھی وہ مصدر لازم ہی رہے۔ "انتشار" کی طرح "انتظار" بھی ہے اور یہاں بھی "دو" "ن" کی دشواری درپیش ہے لیکن اس میں تو یہ نسخہ کارآمد ثابت نہیں ہو سکتا یہاں تو بھیس بدلنے کے بعد بھی یہ متعدی رہتا ہے اور مادہ تو "انتظار" و "انتشار" دونوں کا متعدی ہے مال عربی کے چند اشعار بھی پیش کئے دیتا ہوں:-

لقد عجزت من لا یعتذر سوف اکیس بعدھا واستمر

(والبتہ عاجز ہوا میں مثل اُس شخص کے جو اعتذار نہیں رکھتا عنقریب میں ہوشیار ہو جاؤں گا اس کے بعد اس پر ثابت رہوں گا)

ارفع من ذیلی ما کان یجر قد یجمع الامر الشتیت المنتشر

(اٹھاؤں گا اپنے دامن کا وہ حصہ جو کھینچا جاتا ہے کبھی جمع کیا جاتا ہے امر پراگندہ بکھرنے والا)

یہاں پہلے شعر میں "یعتذر" کا قافیہ "واستمر" اور دوسرے شعر میں "یجرّ" مجہول بفتح جیم ہے اس کی مناسبت سے "منتشر" بفتح شین صیغہ اسم مفعول ہونا چاہیے نیز "المشتت"، "المفرق" اسم مفعول کے معنی میں ہے اس کی مناسبت بھی "منتشر" بفتح شین ہونے کا ایک قرینہ ہے لیکن ترکیب میں اسم فاعل واقع ہوا ہے شاید اختلاف حرکت قوافی میں کلام عرب میں جائز ہے۔

للہ درّ لاصحاب الحدیث وقد شادوا الاصول بلا خوف ولا خطر

اللہ ہی کے لئے ہے خوبی حدیث کی اس لئے تحقیق کہ بلند کیا اِن حضرات نے اُصول کو بے خوف وخطر

وعرّفونا صحاحًا من ذوی سقم ونسّقوا فی نظام کل منتشر

(اور ان حضرات نے احادیث صحاح کو غیر صحاح سے ممتاز کر دیا اور ہر منتشر مضامین کو سلک میں مُنتظم کر دیا)

یہاں صرف "خطر" کا قافیہ ہی "منتشر" واقع نہیں ہوا ہے بلکہ اسم مفعول بھی ہے۔

یا ایّھا المکوھاۃ سائر ھومۃ ارجع فان الزود منک منتظر

اے بے وقوف جنگل میں پھرنے والے لوٹ آ کیونکہ تیری ملاقات کا سب کو انتظار ہے

ما مضمضت عین بنوم لیلۃ مذ غبت فی الاکباد حرٌّ منتشر

کوئی آنکھ کسی رات نہیں لگی جب سے تو غائب ہوا کلیجوں میں آگ پھیلی ہے

یہاں بھی باعتبار قافیہ اور صیغہ منتشر بفتح شین نظم ہوا ہے، ایک مثال اور ملاحظہ ہو:-

قم لیس فی عمل ضرٌّ ولا ضرر الناس فی طلب والرزق منتشر

اُٹھ کہ عمل میں کوئی نقصان نہیں ہے لوگ طلب میں مشغول ہیں اور روزی (جہان میں) منتشر ہے

اس شعر میں بھی "منتشر" اسم مفعول بفتح شین اور "ضرر" کا قافیہ واقع ہوا ہے۔

اُوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے عربی قواعد سے متعلق ہے، اب اُردو سے بحث رہ جاتی ہے، اس حیثیت سے بھی اختر صاحب نے "منتشر" بفتح شین کو غلط ٹھہرانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا ہے فرماتے ہیں:-

"اب بحث یہ ہے کہ "منتشر" شین کے زبر کے ساتھ اُردو کے تصرفات میں سے ہو تو یہ بھی صحیح نہیں ہے عام طور سے اُردو میں یہ لفظ شین کے زبر کے ساتھ استعمال نہیں ہوتا ہے چند افراد کے استعمال سے اُردو

کا تصرف ثابت نہیں ہوتا، موجودہ تنزل میں اس لفظ کے استعمال کو غلط قرار دینا ناگزیر ہے، اس مقام پر ضمناً اس کا تذکرہ بھی کر دیا جائے کہ اس قسم کے غلط الفاظ کے جواز استعمال کی سند میں اُردو یا فارسی کے پُرانے دیوانوں (دو دو ادیبں) سے دو ایک شعر پیش کرنا کوئی فائدہ نہیں پہونچا سکتا، جس طرح موجودہ اساتذہ سے غلطی استعمال میں ہوئی ہے اسی طرح ان پُرانے اساتذہ سے بھی غلطی ہوگئی ہے ان کی غلطی سے اس غلطی کو حق بجانب نہیں ثابت کیا جا سکتا اگر کسی دَور کے تمام با سواد ممتاز شعرا کے یہاں سے کسی غلط لفظ کا استعمال ثابت کر دیا جائے تو پھر اسے اس زبان کے تصرفات میں شمار کیا جا سکتا ہے، اس کی مناسب مثال فارسی میں کا فرؔ ہے عجمی شعرا نے "ف" کے زیر کو زبر سے بدل لیا ہے۔"

جناب اخترؔ کی اس عبارت سے یہ فیصلہ ہوگیا کہ "منتشر" بفتح شین اُردو کے تصرف کی حیثیت سے بھی صحیح نہیں۔ یہاں میں حضرت شوقؔ قدوائی کے دو خطوط نقل کر دینا مناسب سمجھتا ہوں اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اعتراض نہ تو جناب اخترؔ نے پہلی بار کیا ہے اور نہ پروفیسر عندلیب شادانی نے۔ اور پروفیسر عندلیب نے جتنے اعتراض اس قسم کے کئے ہیں مثلاً "عرصہ" یعنی "مدت" ترکیب کے ساتھ لکھنا غلط ہے وغیرہ ان اعتراضات کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے جب "قاموس الاغلاط" کو سامنے رکھکر دیکھے جائیں، پروفیسر صاحب کے ان اعتراضات نے دُنیائے شاعری میں جو ہلچل پیدا کر دیا تھا۔ بہرحال یہاں اس سے بحث نہیں کہ وہ اعتراض کس اہمیت کے حامل تھے، حضرت شوقؔ کا خط ملاحظہ ہو: ۔

۱۲۔ فروری ۱۹۱۳ء بنام حضرت محوی لکھنوی

استاد امیرؔ مرحوم منتشر کو بفتح شین فرما گئے ہیں، ایک تاریخ کے قافیہ میں خدا جانے کہاں سے فرما گئے ہیں، باب انفعال کے مصادر لازمی کا صیغہ مفعول نظم میں کہیں نہیں ملتا۔ انوری، خاقانی، قاآنی، اور بہت سے اساتذہ کے قصیدے اس قافیہ کے میں نے چھان ڈالے سوا شین مکسور کے مفتوح کسی نے نہیں کہا ہے (شوقؔ قدوائی)

رامپور - ۷۔ اپریل ۱۹۱۳ء

"منتشر" کا لفظ میری تلاش میں بفتح شین نہیں ملا عربی میں شاید اس کا مفعول نہیں آیا ہے منشی امیر احمد مرحوم کی تلاش میں بفتح یہ لفظ نہیں ملا تھا مگر استاد امیرؔ مرحوم نے ایک تاریخ کے قافیہ میں بفتح شین فرمایا ہے (شوقؔ قدوائی) (اقتباس از مرقع ادبیات)

یہ دونوں خطوط میں نے اس بحث کے سلسلہ میں "شاعر" (آگرہ۔ مشترک نمبر مارچ۔ اپریل ۱۹۶۶ء) میں نقل کرنے کے بعد لفظ "منتشر" سے بحث کی تھی لیکن چونکہ اخترؔ صاحب اس لفظ کے غلط ہونے پر مُصر ہیں اور یہ

فرماتے ہیں کہ "اردو کا تصرف اسی وقت ثابت ہو سکتا ہے جب تمام باسواد شعرا کے یہاں "منتشر" بفتح شین پایا جاتا"
اس لئے میں اس غلط فہمی کو بھی دور کر دینا چاہتا ہوں، اختر صاحب کا تو یہ حال ہے

گہے بر طارم اعلےٰ نشینم　　گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

کیا حضرت احسن مارہروی، حضرت سیماب اکبرآبادی، حضرت یاس یگانہ عظیم آبادی، مولانا ظفر علی خاں، حضرت امیر مرحوم، حضرت جگر مرادآبادی، حضرت ساغر نظامی یہ سب باسواد شعرا نہیں ہیں؟ کیا آپ ان کو ساقط الاعتبار سمجھتے ہیں۔

اگر حضرت اختر کی نظریں صرف دنیائے نظم میں ٹھوکریں نہ کھاتیں تو ان کو اتنی زحمت نہ ہوتی، یہ کیا ضروری ہے کہ کسی لفظ کی صحت و عدم صحت کی مثال صرف کلام منظوم ہی میں دیکھی جائے۔

حضرت اثر لکھنوی بھی اس اعتراض میں حضرت اختر کے ہم نوا ہیں، اُن کے دو شعر پیش کرتا ہوں جن میں اسم مفعول کے معنی میں "منتشر" نظم ہوا ہے۔

بے نور جتنے خاک کے ذرّے تھے "منتشر"　　عبرت نے ان کو دیدۂ بیدار کر دیا

"منتشر" تھیں جلوہ آرائے ازل کی قوتیں　　شوقِ خود بینی میں یکجا ہو کے انساں ہو گئیں (اثر ساد)

کیا ان اشعار میں منتشر اسم فاعل کے معنی دے رہا ہے؟ یا اعتساب اُسی وقت کیا جائیگا جب اثر، نظر وغیرہ کے قوافی میں "منتشر" نظم کیا جائے۔

اب چند نمونے نثر سے بھی ملاحظہ فرما لیجئے:-

"ان کی زندگی کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ ایک عظیم الشان کتب خانہ نادر قلمی کتابوں کا جمع کیا تھا، جو ان کے بعد اُن کے خلف اکبر مرزا مظفر حسین خاں کو ملا افسوس کہ ایام غدر میں اس کتب خانہ کا بڑا حصہ برباد ہو گیا، بقیہ کتابیں بھی "منتشر" ہو گئیں　　(عزیز لکھنوی مقدمہ)

"پھر انیسویں صدی میں نپولین نے سلطنت روما کے ان "منتشر" اجزا کو ایک ہی رشتہ سے وابستہ کرنے کی جتنی کوششیں کیں وہ بھی مخفی نہیں۔"　　ملاحظات "نگار" دسمبر ۱۹۳۶ء

"یورپ میں اس وقت جتنی حکومتیں پائی جاتی ہیں وہ حقیقتاً سب قدیم سلطنت روما کے اجزائے منتشر ہیں۔"
(ملاحظات "نگار" دسمبر ۱۹۳۶ء

"نظر و فکر فلسفی کا وہ مخصوص عمل ہے جس سے وہ کائنات کی بظاہر "منتشر" اور غیر مرتبہ اشیاء کو ربط و تعلق کی ایک کڑی میں پروتا رہتا ہے۔"　　(محمد احمد سبزواری ایم اے۔ نگار۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء

اگر اختر صاحب نثر کی طرف متوجہ ہوتے تو وہ یہ کبھی نہ فرماتے کہ یہ لفظ اردو میں داخل نہیں ہوا۔ اس قسم کی نثر کے دفتر پیش کئے جا سکتے ہیں، اگر اختر صاحب قبول نہ فرمائیں تو اردو اُن کے قبول نہ فرمانے کی وجہ

متاثر نہیں ہو سکتی۔

"طمانیت سے خالی تھی کنارِ آرزو جن کی"

اختر صاحب کا اعتراض ہے "صحیح لفظ طمانینت دو "نون" کے ساتھ ہے، اس کی جب تصغیر بنائی جاتی ہے تو ایک نون حذف کر دیا جاتا ہے اور "طمین" کہا جاتا ہے، یہ طمانیت "کہاں سے حدود اُردو میں داخل ہو گئی، جہاں تک میں سمجھتا ہوں اُردو نے "طمانینت" کو "طمانیت" کی شکل میں ابتک اپنایا بھی نہیں ہے" اطمینان کے ہوتے ہوئے اس کی ضرورت بھی غالباً نہیں ہے۔ یہ ضرور سچ ہے کہ اگر اس لفظ کے استعمال کی ضرورت ہو ہی جائے تو پھر جہاں تک اُردو کے مزاج کا تعلق ہے "طمانیت" "طمانینت" سے زیادہ سبک ہے۔"

حضرت اختر نے یہ اعتراض ذرا ہلکے الفاظ میں کیا ہے اور یہ اعتراف بھی ہے کہ اگر اس لفظ کی اُردو میں ضرورت ہو تو "طمانیت" ہی سبک ہے، یہ تو مجھے تجاہل عارفانہ معلوم ہوتا ہے، اس لئے میں بھی دو ایک ہی مثال پر اس کی بحث ختم کرتا ہوں۔ حضرت جوش ملیح آبادی نے "کلیم" دسمبر ۱۹۳۶ء "اشارات" میں اُردو کے ان الفاظ کا ذکر کیا ہے جو اپنی اصل زبان میں کچھ اور طرح ہیں اور اُردو میں کچھ اور۔ اس میں لفظ "طمانینت" کی اصلی صورت "طمانینت" اور اُردو میں "طمانیت" لکھی ہے۔ جوش صاحب شاید اصلی صورت سے واقف ہی نہیں ورنہ "طمانینت" لکھتے۔ ایک لغت افسران تعلیم اور دیگر اہل الرائے کے مشورہ سے مرتب ہوا ہے۔ اس میں "طمانینت" اور "طمانیت" دونوں طرح لکھا ہے اس لغت کا نام "جدید اُردو لغت" ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اُردو میں "طمانیت" ہی مستعمل ہے۔

ان اعتراض و جواب کے بعد جناب اختر سے کچھ اور عرض کرنا چاہتا ہوں، ناظرین نے اختر صاحب کی تحریر سے یہ اندازہ تو لگا ہی لیا ہوگا کہ وہ اُردو کو اغلاط سے پاک رکھنے کے کتنے متمنی ہیں، اور شعرا پر کس سختی سے نکتہ چینی فرماتے ہیں، اس صورت میں وہ جتنے محتاط ہو سکتے ہیں وہ ظاہر ہے۔

آپ کا ایک مقالہ رسالہ "عالمگیر" اکتوبر ۱۹۴۲ء میں "نئے ادیبوں پر مُداوا" کا ردِ عمل" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ چونکہ یہ مقالہ نئے ادیبوں کے خلاف ہے اس لئے حضرت اختر نے نئے نئے الفاظ اور محاورے بھی استعمال کئے ہیں مثلاً ایک لفظ ہے "خصوصۃ" جو کئی جگہ لکھا گیا ہے یہ لفظ اُردو کیلئے یقیناً نیا ہے اور صرف نیا ہی نہیں بلکہ اس قدر بھیانک کہ غریب اُردو لرزہ براندام نظر آنے لگی۔ ایک لفظ ہے "تہیجی" "میری سمجھ میں تو خاک نہیں آیا کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے "تہیج" سے "تہیجی" ٹھیک ہے لیکن "تی" کا اضافہ کس معنی کا حامل ہے یہ لفظ بھی کئی جگہ لکھا گیا ہے۔ ایک لفظ ہے "نظامات" "نظم" و "نظام" تو جانتا ہوں لیکن "نظامات" سے ابھی تک نا آشنا ہوں۔

اختر صاحب کے اسی مقالہ کی ایک عبارت ہے "اب سے کچھ پیشتر نیا ادب اور ترقی پسند ادب مترادف الفاظ جانتے تھے پیشتر سے پہلے کچھ "مہمل ہے" ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں "حیدرآباد میں جو اُردو کا تعلق کچھ دن پیشتر

منعقد ہوئی تھی"۔ اس عبارت میں بھی "کچھ عرصہ" کے ساتھ "پیشتر" مہمل ہے۔ ایک جگہ ایک نیا محاورہ بھی نظر آیا: آپ خواہ ارادہ، لہجہ، فضا، مزاج اور شعر کا "پس منظر" کتنا ہی سمجھ ڈالیں"۔ "یہ "سمجھ ڈالیں" اُردو کا محاورہ کب ایجاد ہوا؟ یہ بات کتنی عبرت خیز ہے کہ جو زیرِ زبر کا اتنا خیال کرتا ہے کہ کسی طرح اور کسی حالت میں اُصول کے خلاف ہونا جائز ہی نہیں سمجھتا، مگر تمام قیود دوسروں ہی کے لئے ضروری سمجھے اور خود آزاد ہو۔

حضرت ساغر نظامی کا یہ مجموعۂ کلام پانسو صفحات کا ہے، اس میں اختر صاحب نے چند الفاظ و محاورات غلط دیکھے تو رہا نہ گیا اور اُردو کے لئے نقصان دہ سمجھتے ہوئے مضمون لکھ ڈالا اور خود ...... اپنی حالت سے اتنے بے خبر ہو جائے حیرت ہے ساغر صاحب کا مجموعہ منظوم ہے اور آپ کا مقالہ منثور، ساغر صاحب پر جتنی پابندیاں عائد ہیں اس کے پاسنگ بھی آپ کے لئے نہیں ہیں، "نقد تبہ"!

(حضرت نیساں اکبرآبادی)

میں تجھ کو بھلانے کی کوشش کرتا ہوں تو جی گھبراتا ہے
اے بھولنے والے مجھ کو بتا کس طرح بھلایا جاتا ہے

کیا جانئے کیا یاد آیا ہے آنسو ہیں کہ اُمڈے آتے ہیں
نبضیں ہیں کہ چھوٹی جاتی ہیں، اور دل ہے کہ ڈوبا جاتا ہے

جب جی کچھ کچھ گھبراتا ہے، میں تیرا تصور کرتا ہوں
یوں مجھ کو سکوں ملنے سے رہا ہاں دھیان ذرا بٹ جاتا ہے

محرومیِ قسمت کیا کہئے، مجبوریِ فطرت کیا کہئے
جب درد کی شدت ہوتی ہے، اشک آنکھوں میں آہی جاتا ہے

مانا وہ جفائیں کرتے ہیں، پر لب پہ شکایت کیوں آئے
وہ دیکھ نگاہیں جھکتی ہیں، وہ دیکھ کوئی شرماتا ہے

بیکار سہی وہ اشک مرا، جو خاک پہ گر کر کھو جائے
جو دامنِ حسن پہ گرتا ہے وہ حاصلِ غم بن جاتا ہے

یہ کس نے چمن کو لے نیساں اس سحر نگاہی سے دیکھا
ہر پھول کے لب پر آئی ہنسی غنچہ ہے کہ کھلا جاتا ہے

(افسانہ)

(از کشمیری لال ذاکر)

اُس نے فونٹین پن کو ایک دفعہ پھر جھٹکا، سیاہی کی ایک پتلی سی بوند پن کی نب پر آکر اٹک گئی۔ مُردہ پن میں دوبارہ جان آگئی تھی، اُس نے پھر لکھنا شروع کردیا —— کئی سال سے وہ اِسی پن سے کام چلاتا آرہا تھا، یہ پن اُس نے کالج میں پڑھتے وقت بارہ آنے میں خریدا تھا، محض موٹی موٹی کتابوں کے مختصر نوٹ لکھنے کے لئے، اُسے یہ خیال بھی نہ تھا کہ کبھی اس پن سے وہ افسانے لکھے گا...... بے شمار نوٹ، امتحان کے پرچے اور پھر کئی مکمل اور ادھورے افسانے لکھ لکھ کر اب پن تھک گیا تھا، اُس بچارے نے بھی نہ جانے کتنا فاصلہ طے کیا تھا، اب اُس کے ہر حصے میں تھکاوٹ کے آثار جھلکتے تھے۔ کاپی کی چند ہی متوازی لکیروں پر رینگنے سے اُس کا دم پھول جاتا، وہ ہانپنے لگتا اور اُس کے لب بالکل خشک ہو جاتے، موہن پھر اُسے جھٹکا دیتا، پھر اُس میں کچھ زندگی کے آثار نظر آتے، پھر وہ کچھ اور فاصلہ طے کر ڈالتا...... موہن اپنے اس ساتھی سے اُکتا گیا تھا بجائے اس کے کہ وہ موہن کی مدد کرے، جلدی جلدی صفحوں پر صفحے اُلٹتا جائے، اُس کے خیالات کو روانی دے اور اُس کی کہانیاں فوراً تکمیل تک پہونچ جائیں، اور اُن میں کہیں کوئی خامی نہ رہنے پائے اُسے اپنے لنگڑے، تھکے ہوئے کمزور ساتھی کے ساتھ قدم ملاکر چلنا پڑتا تھا۔ جوں ہی کوئی اچھوتا خیال یا نئی تشبیہ اُس کے ذہن میں آتی، اُس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا پن اپنی معذوری کا اظہار کرتا اور اُسے منانے میں موہن کو اپنے اچھوتے خیالوں اور نئی تشبیہوں کی بھینٹ دینا پڑتی...... بعض دفعہ وہ جھنجھلا اُٹھتا اور اُس کا جی چاہتا کہ وہ اس ردی پن کو کھڑکی سے باہر گلی میں پھینک دے۔ لیکن فوراً ہی اُسے اپنے کوٹ کی خالی جیبوں کے میلے میلے تھیلے نظر آجاتے۔ اور اُس کی جھنجھلاہٹ ذہن کی میلی میلی موٹی تہوں کے نیچے دبک جاتی۔ اُس کے افسانے کے پلاٹ میں کوئی اور پلاٹ آہستہ آہستہ مدغم ہونے لگتا...... اُس کے افسانے اِسی طرح لکھے جاتے تھے... بعض اوقات میز پر پڑے ہوئے پن کو دیکھتا تو اُسے اپنی زندگی بھی اُس تھکے ہوئے، بار بار رُکتے ہوئے، ہنو کھتے ہوئے پن کی طرح معلوم ہوتی۔ اُسے بھی حادثات کبھی کبھی جھٹک کر اُس میں زندگی اور حرکت کے آثار پیدا کردیا کرتے تھے۔ حادثوں کا مضبوط ہاتھ اپنا افسانہ ختم کرکے ہی اُسے چھوڑے گا۔ اُس کے بعد اُسے پھینک دیا جائے گا جیسے ہر نکمی اور فضول شئے کو پھینک دیا جاتا ہے۔ لیکن جب تک اُس کا افسانہ ختم نہیں ہوتا وہ اُسے ہر ٹھوکر اور ہر تازیانے لگائیں گے۔ اُس کی ہڈیاں چرچرا اُٹھیں گی لیکن وہ پھر بھی اپنا سفر طے کرتا جائے گا...... ایک دفعہ اُسے میز پر رکھا ہوا پُرانا پن اپنی تازہ جوان زندگی سے زیادہ ......

اُس کا دماغ آخر ہر وقت تو افسانوں کے پلاٹ نہیں سوچا کرتا۔ پن کو ہر وقت ہی تو کام نہیں کرنا ہوتا، اُسے آرام بھی ملتا ہے، کبھی کبھی اُس کی ٹیوب، نب اور خول کو دھویا بھی جاتا ہے، اُسے صاف کیا جاتا ہے۔ لیکن جس فن کار کے ہاتھ اُس کی زندگی کا پن ہے وہ شاید کبھی اپنے دماغ کو آرام نہیں دیتا... وہ ہر وقت سوچتا رہتا ہے، ہر لمحہ افسانے لکھتا رہتا ہے، اور نکمے ہو چکے ہوئے پن کو کبھی سکون کی ایک گھڑی بھی نصیب نہیں ہوتی.. اُسے صبح و شام جھٹکوں سے واسطہ ہے، شدید جھٹکوں سے جس سے اُس کا سارا جسم تھرتھرا اُٹھتا ہے اور بعض دفعہ سیاہی زیادہ نکل آنے کی وجہ سے کاغذ پر دھبّہ پڑ جاتا ہے...... وہ دھبّہ پھیلتا جاتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ سارے افسانے پر پھیل جائے اور افسانہ نگار کا لکھا ہوا ایک لفظ بھی نہ پڑھا جا سکے۔ —— لیکن ——

موہن نے افسانے کا ایک تہائی حصہ لکھ لیا تھا، اس دوران میں نہ جانے کتنی بار پن کی نب اٹکی تھی۔ کتنی بار سیاہی سوکھی تھی، اور نہ جانے کتنی مرتبہ اُس نے پن کو جھٹکا تھا۔ ہر جھٹکے کے ساتھ اُسے اپنے کتنے ہی اچھوتے خیالوں کی بھینٹ چڑھانا پڑی تھی.... بہرحال وہ افسانہ مکمل کر رہا تھا۔

" زندگی کی لامحدود وسعتوں میں چکّر کاٹتے ہوئے آخر ہم تھک جاتے ہیں لیکن رُک نہیں سکتے۔ غبارے کی طرح اچانک رُک جانا فنا ہو جانا ہے۔ پرندہ بھی اُڑتے اُڑتے فوراً نہیں رُکتا، آہستہ آہستہ اپنی اُڑان کے زور کو گھٹاتا ہے اور پھر جہاں اُسے بیٹھنا ہو آرام سے بیٹھ جاتا ہے...... انسان بھی یک لخت ٹھہر جانا چاہتا ہے لیکن انجام کے خیال سے فوراً کانپ اُٹھتا ہے اور پھر چکّر کاٹنے لگتا ہے — اور یہ چکّر ——" وہ یہاں تک ہی لکھ پایا تھا —

افسانے کو محض دل بہلاوے کا سامان سمجھنا اُسے پسند نہیں تھا۔ اُس کے نزدیک کامیاب افسانہ وہی ہوتا جو زندگی کو بالکل قریب سے دیکھتا اور اُس میں کسی نہ کسی اُلجھن کے اساسی پہلو کو اُجاگر کیا جاتا..... اسی لئے اُس کے افسانوں کو عوام نہ سمجھ سکتے تھے۔ بعینہٖ اسی طرح جیسے اُس کی اپنی زندگی کو سمجھنا مشکل تھا.... اُس کا ہر دوست اور شناسا اُس کے متعلق مختلف رائے رکھتا تھا، اُس کے گھر والے تو اُسے بالکل ہی نہ سمجھ سکتے تھے —— بڑا بھائی تھا، اُس بچارے کو دفتر کا اتنا کام ہوتا کہ دن رات ایک کر دینے پر بھی اُسے اپنے فرض سے سبکدوشی حاصل نہ ہوتی۔ وہ تو ہر انسان کو گوشت اور ہڈیوں کا ڈھانچہ سمجھتا تھا جس کا مقصد دفتروں میں مخصوص انداز سے حرکت کرنے، اُس کا نامعقول حد لینے، گھر لوٹ کر بیوی بچوں پر برسنے، رات کو افسروں کی خوشنودی کے خواب دیکھنے اور صبح سویرے اپنے گھسے ہوئے بے پالش بوٹوں کو پہن کر پھر دفتر چلے جانے کے سوائے اور کچھ نہیں۔ جب کبھی وہ خوش ہو کر ایک آدھ بات کرتا بھی تو موہن کے نکمے پھرنے پر افسوس کے رنگ میں ڈوبی ہوئی..... ادب کو دماغی عیاشی کے نام سے پکارنا اُس کا تکیہ کلام تھا۔ موہن نے اپنے بھائی کی عزت ضرور کی، لیکن وہ اُسے اس طرح پیار نہ کر سکا جیسے اپنے بھائی کو کیا جاتا ہے..... عزت اور پیار دو مختلف چیزیں ہیں، بعض دفعہ وہ مشکل نظر آتی ہیں مگر اصل میں ایسا ہوتا نہیں ——

موہن نے کئی دفعہ چاہا بھی کہ وہ اپنے بھائی کو پیار کرے لیکن ہر بار وہ اس میں ناکامیاب رہا۔ بڑے بھائی کے بعد آنگی بھابی، ایک کلرک کی بیوی جو موہن کو کچھ کچھ سمجھنے کی کوشش کرتی لیکن زیادہ تعلیم یافتہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ بھی اپنی کوششوں میں کامیاب نہ ہو سکتی —— وہ اُس کی صحت کا خیال رکھتی، اُسے کھانے اور سونے کے اوقات مقرر کرنے کو جتاتی رہتی۔ مگر افسانے لکھنا اُسے بھی کسی طرح صورت میں پسند نہ تھا۔ اُسے یہ کبھی اچھا نہ لگتا تھا کہ موہن اپنے کمرے کے اندر بیٹھے ہوئے خیالوں کے جال بُنتا رہے، تصوّر کی مدد سے کہانیاں لکھتا رہے اور حقیقی دنیا سے بے خبر ہو کر محض سپنوں میں اپنا وقت کھوئے۔ جب کبھی وہ اُسے قلم ہاتھ میں لئے کاپی کے صفحوں پر جھکے ہوئے دیکھتی تو شفقت میں ڈوبی ہوئی ناراضگی کا اظہار کرتی "تم سیر نہیں کرتے، ورزش نہیں کرتے، راتوں کو فضول جاگتے رہتے ہو.......۔" اُسے ان الفاظ سے بڑی چڑ تھی، ہر روز یہی الفاظ سن سن کر اُس کے کان پک گئے تھے، کاش اُس کی بھابی پڑھی لکھی ہوتی، اور اُس کے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کرتی۔ وہ اگر یہی باتیں روز کہتی لیکن کہنے کے سلیقے اور الفاظ کی بندش میں سلجھاؤ تو ہوتا۔ پھر اُسے اتنی کوفت نہ ہوتی جتنی وہ اب محسوس کرتا تھا...... اُس کے نکمّے قلم کی طرح ہر لحہ ساتھ رہنے والی بڑے بھائی کی بیوی بھی اکثر اُس کے خیالات کے تار توڑ دیتی تھی اُس کے نہ جانے کتنے ہی اچھوتے خیالات اور نادر تشبیہات یوں ہی ضائع ہو جاتی تھیں.......

اسی لئے وہ گھر کی کسی بھی چیز کو پیار نہ کر سکا تھا۔

اور یہ چکر —— "نہ جانے اُس کے دماغ میں کیا خیال آیا تھا، کس اُلجھن کا اساسی پہلو دکھلانا تھا اُسے۔ اس کا قلم رُک گیا۔ اُس نے آہستہ آہستہ جھٹکا اور پھر لکھنا چاہا۔ لیکن تب نے ایک لکیر تک بھی صفحے پر نہ ڈالی، وہ جھنجھلا گیا۔ نچلی منزل میں اُس کے تینوں بھتیجوں نے شور مچا رکھا تھا، چیخوں اور گالیوں کی ملی جلی آوازیں گونج رہی تھیں۔ ادھر رسوئی گھر سے اُس کی بھابی چلّا رہی تھی —— اُنھیں کیا معلوم کہ بالائی منزل میں موہن افسانہ لکھ رہا ہے۔ وہ عام افسانے نہیں لکھتا، اُس کے افسانے ایک خاص طبقے کے لئے ہیں۔ آوازیں زیادہ اونچی ہوتی جا رہی تھیں، ادھر اس کا قلم بھی کسی زبردست جھٹکے کا متلاشی تھا۔ ایک ایسے جھٹکے کا جو اُس کے مُردہ قدمے جسم میں حرکت پیدا کر دے اور اُس کے ساتھ ہی ساتھ اپنے فن کار کے دماغ میں بندھے ہوئے خیالات کا سلسلہ توڑ دے۔ اُس نے چاہا تھا کہ وہ قلم کو توڑ کر کھڑکی سے باہر پھینک دے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا —— اُس نے قلم کو پھر زور سے جھٹکا۔ اتنی دیر کی رُکی ہوئی سیاہی یک لخت بہہ نکلی جیسے کسی نے رُکے ہوئے پانی کا بند توڑ دیا ہو۔ سیاہی کی ایک موٹی سی بوند کاپی کے صفحے پر گر پڑی۔ سفید کاغذ —— اُس بوند نے پھیلنا شروع کیا۔ ہلکی ہلکی نامعلوم سی لہریں غیر محسوس طور پر اپنی حدود کو بڑھانے لگیں۔ گویا ساکن پانی کے پھیلاؤ میں کسی نے اچانک کوئی ہلکا سا کنکر پھینک دیا تھا۔ اُس نے سیاہی چوس کے ٹکڑے کو سیاہی کے اس دھبے پر نہیں رکھا، وہ اُس

دھبّے کو بڑھتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ رف کاغذ کی سطح پر نظر آتے ہوئے ننھے ننھے ریشے اُسے پھیلنے میں مدد دے رہے تھے۔ اُس کی کئی سطروں کے کئی الفاظ خراب ہو رہے تھے لیکن وہ پھر بھی اُسی دھبّے کو بغور دیکھ رہا تھا ـــــ اُسے یوں محسوس ہوا کہ اُس کے اپنے فنکار کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بوسیدہ قلم نے بھی زور کا جھٹکا برداشت نہ کرتے ہوئے سیاہی کا ایک بڑا سا دھبّہ اُگل دیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نچلی منزل میں آوازیں اور زیادہ اونچی ہوگئی تھیں، چھوٹے ستیش کے ریڈیو کا غبارہ بڑے بھائی نے پھاڑ دیا تھا۔ ستیش نے اُسے کاٹ کھایا تھا اور ماں اُن دونوں پر برس رہی تھی۔ ۔ ۔ ۔ وہ اُسی طرح چلاتی ہوئی اُوپر کی منزل پر آگئی۔ آج اُس نے موہن کو محبت میں ڈوبے ہوئے غصّے کے الفاظ نہیں کہے۔ آج اُس کے الفاظ معمول کی روش سے ہٹ گئے تھے۔ آج اُن میں دِل کی حقیقی کیفیت نظر آرہی تھی۔

"آخر تنہا بیٹھکر کہانیاں لکھتے رہنا کہاں تک برداشت کیا جا سکتا ہے موہن۔" وہ کچھ اور بھی کہتی رہی، موہن نے صفحے پر گرے ہوئے سیاہی کے دھبّے سے ایک لمحہ کے لئے نگاہیں ہٹا کر اپنی بھابھی کی طرف دیکھا اُس کے چہرے پر نہ جانے کونسا جذبہ جھلک رہا تھا وہ اُسے زیادہ دیر نہ دیکھ سکا ـــــ پھر اُس کی نظر اُسی پھیلے ہوئے دھبّے پر گڑ گئی ـــــ اور آہستہ آہستہ اُس کی آنکھوں کے سامنے صرف سیاہی کا بڑا سا پھیلتا ہوا دھبّہ ہی رہ گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دنیا کی ہر شئے اُس میں غرق ہوگئی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

جذباتِ خضر

(از جناب خضر لکھنوی)

نگاہوں میں سما جا پیکرِ تصویر بن بن کر
مری ہستی پہ چھا جا نازشِ تسخیر بن بن کر

نقوشِ آب جیسے خود ہی بنتے خود ہی مٹتے ہیں
بگڑتی ہے اسی صورت مری تصویر بن بن کر

وہ نظریں جن پہ کل معصومیت کا مجھ کو دھوکا تھا
انھیں نظروں نے چھیدا آج دل کو تیر بن بن کر

نہ بھولیں گے کبھی اللہ رے رحم و کرم اُن کا
مٹائی ہیں ہماری گردشیں تدبیر بن بن کر

جفاؤں کا اثر ہے ورنہ یہ ممکن نہ تھا اے خضر
نکلتی ہے مری ہر آہ اک تاثیر بن بن کر

غزل

(از جناب صدر الاسلام صاحب صدر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کانپور)

بناتے جاتے ہو ہنس ہنس کے مجھکو دیوانہ — خطا ہوئی جو کہا سن لو غم کا افسانہ

فنا کے بعد ملا ہے لحد کا ویرانہ — خدا کرے مجھے راس آئے میرا کاشانہ

جہان بھر کے غم اتنی خوشی پہ صدقے ہیں — کہ لوگ کہتے ہیں مجھکو تمہارا دیوانہ

اجاڑ ہونے پہ بھی سو فراغتیں ہیں نصیب — ہمیں بہشت سے بڑھکر ہے اپنا غم خانہ

مزاج یار کی صورت ہے نازکی اس کی — نفس کی ٹھیس میں ٹوٹے گا دل کا پیمانہ

خموشیوں کے سوا کوئی بھی جواب نہیں — کس آرزو پہ سناؤں کسی کو افسانہ

جنون ہو گیا یہ خواب دیکھکر جو اٹھا — پلا رہا ہے مجھے کوئی جیسے پیمانہ

ہزار جانیں کرامات عشق پر صدقے — زبانیں لاکھوں ہیں اور ایک ہی ہے افسانہ

قیامت آئے تو آنے دو خوف ہی کیا ہے — سنو سنو کہ یہ ہے ابتدائے افسانہ

ضیائے شمع میں دیکھی ہیں دہری تاثیریں — یہی ہے موت یہی ہے حیات پروانہ

خیال توبہ جوانی میں خاک ہو اے صدر
یہ ابر اور یہ آب و ہوائے میخانہ

سنجوگ

(از جناب سلیمان ادیب)

ہم ہندو ہوں یا مسلم ہوں آپس میں بھائی بھائی ہیں

یہ پورب کیا، یہ پچھم کیا، ہم ایک وطن میں رہتے ہیں
اک پھول میں ہم ہیں اک بلبل ہم ایک چمن میں رہتے ہیں
ہم ساتھ خوشی میں اور ہیں ہم رنج و محن میں رہتے ہیں
ہم ہندو ہوں یا مسلم ہوں آپس میں بھائی بھائی ہیں

گوتم بھی ہمارے اپنے ہیں، چشتی بھی ہمارے اپنے ہیں
یہ پوجا گاہیں کس کی ہیں، یہ مسجد و معبد کس کے ہیں
ہم خاکِ وطن کے ہر ذرّے کو دل سے لگا لیں، ایسے ہیں
ہم ہندو ہوں یا مسلم ہوں آپس میں بھائی بھائی ہیں

ہم دل کے زخموں کو اپنے الفت کی نظر سے سیتے ہیں
ہم "پھوٹ" کے ساغر توڑ چکے، "ایکے" کی شرابیں پیتے ہیں
ہم مرتے تھے لڑ لڑ کے کبھی اب گھل مل کر ہم جیتے ہیں
ہم ہندو ہوں یا مسلم ہوں آپس میں بھائی بھائی ہیں

دشمن نے ہمیں سمجھا ہی نہیں، غیروں نے ہمیں جانا ہی نہیں
ہم لاکھ لڑیں موجوں کی طرح دریا سے جدا ہونگے بھی کہیں
ہم خاک جلا کر دیں گے، آئے نہ کوئی خرمن کے قریں
ہم ہندو ہوں یا مسلم ہوں آپس میں بھائی بھائی ہیں

ہم اپنا حقِ آزادی، دنیا کو جتا کر چھوڑیں گے
ہم نام غلامی بھارت کے ماتھے سے مٹا کر چھوڑیں گے
ارجن کی قسم، ٹیپو کی طرح جاں اپنی گنوا کر چھوڑیں گے
ہم ہندو ہوں یا مسلم ہوں آپس میں بھائی بھائی ہیں

تنقید کتب

"تلخیاں"

رشید احمد صاحب اختر ندوی کا یہ دلچسپ اور سبق آموز ناول ہے۔ اس ناول میں دکھایا گیا ہے کہ امیروں کی دنیا میں حسن معصوم کا شکار کس طرح کھیلا جاتا ہے۔ والیان ریاست، زمیندار اور سرمایہ دار طبقہ غریب و نادار طبقہ کی معصوم عورتوں کو اپنی خواہشات نفسانی کی بھینٹ کس طرح چڑھاتے ہیں۔ اور صوفیان ریاکار اور خانقاہ نشینان مکار اپنے آبائی تقدس کی آڑ میں بھولی بھالی اور غریب لڑکیوں کو کس طرح شکار کر کے ان کی زندگی کس طرح تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ اس کتاب میں یہ بھی دکھلایا گیا ہے کہ عورت کی نظرت کتنی بلند ہو سکتی ہے اور یہ کہ جب کوئی شخص اصلاح پر کمر بستہ ہوتا ہے تو سماج کے ٹھیکیداران زبانی جمع خرچ کرنے والے زمتی اخلاق کے علمبردار اس شخص کی راہ میں کس طرح روڑے اٹکاتے ہیں۔ فاضل مصنف کی زبان عام فہم، اسلوب نگارش سادہ مگر دلپذیر اور موثر ہے۔ بعض بعض الفاظ غلط استعمال بھی ہو گیا ہے۔ مثلاً صفحہ ۴۳ پر کتے کا تلازمہ ہے۔ جس میں یہ فقرہ بھی ہے "مگر ان کے گلے میں پھندا کون ڈالے گا" کتے کے گلے میں "پھندا" نہیں ڈالا جاتا بلکہ "پٹہ" ڈالا جاتا ہے۔ اسی طرح صفحہ ۲۱۱ پر ایک جگہ لکھا ہے کہ "پاؤں کی ہتھیلیوں میں کدو کا تیل ملوانے کی خدمت لی"۔ یہ "پاؤں کی ہتھیلیاں" بالکل نئی چیز ہیں۔ "تلوے" ہونا چاہیئے۔ بہرحال اُمید کی جاتی ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں یہ خامیاں دور کر دی جائیں گی۔

لکھائی چھپائی، کاغذ سب عمدہ۔ جلد انگریزی، ٹائیٹل رنگین مصور اور دیدہ زیب۔ ضخامت ۲۵۲ صفحات۔ قیمت تین روپیہ

ملنے کا پتہ:۔ نگارستان ایجنسی۔ اردو بازار۔ دہلی۔

"دل کے آنسو"

یہ چھوٹی سی کتاب رئیس احمد صاحب جعفری کے چھ دلچسپ فسانوں کا دلپذیر مجموعہ ہے سب سے بڑی خوبی ان فسانوں کی یہ ہے کہ ان کی زبان نہایت پیاری اور اسلوب بیان نہایت موثر اور دلپذیر ہے۔ فاضل مصنف نے ان فسانوں میں ہماری بیہودہ سوسائٹی کا نہایت ہی دلفریب مرقع پیش کیا ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ رسمی، جلد انگریزی۔ گرد پوش نظر فریب حجم چھ جزو قیمت ۱۲؎۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ سلطانی۔ بھنڈی بازار بمبئی ۳۔

"بیل بوٹے"

یہ کتاب جناب منظر حسین صاحب شمیم کے پچیس مختلف مضامین کا دلچسپ مجموعہ ہے جو انھوں نے ہندوستان کے مختلف جرائد رسالوں میں شائع کئے تھے۔ ان میں علمی و ادبی، تنقیدی، تاریخی، فکاہیہ اور اصلاحی سبھی قسم کے مضامین ہیں۔ چند مضامین

ایسے بھی ہیں، جو بعض مشہور بزرگوں اور ادیبوں کے سوانح حیات سے تعلق رکھتے ہیں، جیسے نظیر اکبرآبادی، غالب، چکبست، مولانا شبلی نعمانی وغیرہ۔ مجموعہ میں چند دلچسپ افسانے بھی ہیں۔

لکھائی، چھپائی، کاغذ رسمی۔ جلد انگریزی۔ گرد پوش رنگین و مصور، ضخامت نو جزو۔ قیمت دو روپیہ ۶؍

ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ سلطانی۔ بھنڈی بازار بمبئی نمبر ۳

جامِ عرفاں

یہ کتاب مولانا منظور الحق کلیم عباسی قادری، چشتی، سلیمانی، ساکن بی بی پور ضلع اعظم گڑھ، مدرس فارسی گورنمنٹ ہائی اسکول ہنگولہ کی ۱۴۱۹ رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ ان رباعیات کی شان نزول یہ ہے کہ شیخ احمد بن محمد ابن عطا نے جن کا انتقال ۷۰۹ھ میں بمقام قرافہ متصل قاہرہ (مصر) ہوا تھا۔ ایک کتاب "الحکم" کے نام سے عربی زبان میں لکھی تھی۔ جسے بعد کو شیخ علی متقی نے موضوعات کے اعتبار سے مختلف ابواب میں تقسیم کرکے "تبویب الحکم" نام رکھا۔ اس کتاب کا مولانا حاجی خلیل احمد صاحب نے اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا نام "اتمام النعم" رکھا۔ بعد ازاں مولانا عبد اللہ گنگوہی نے اس کی شرح لکھی اور اس کا نام "اکمال الشیم" رکھا۔ یہی کتاب "اکمال الشیم" جناب مولانا منظور الحق کلیم کی نظر سے گذری، اور موصوف کو کتاب مذکور کے مضامین و مطالب اس قدر پسند آئے کہ انھوں نے ان کو رباعیات کی صورت میں نظم کر دیا۔ واقعی بڑی محنت کی۔ رباعیاں بطور نمونہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں جن کے مطالعہ سے ناظرین اس مجموعہ کے متعلق خود رائے قائم کرسکیں گے۔

ہے علم وہی کہ جس سے دل ہو پُر نور	اوہام و شکوک کی سیاہی کا فور
وہ علم ہے جس کے ساتھ ہو خوفِ خدا	گر اس کے خلاف ہو تو سمجھو دیجور

ناداں ہوں، وہ مہرباں ہے تا ہم مجھ پہ	بدفعل ہوں، پھر بھی ہے ترحم کی نظر
گو لائقِ صد عتاب ہیں میرے گناہ	لیکن نہیں بند اس کی عنایات کا در

آخری رباعی میں لفظ "ترحم" "محض رحم" کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ "ترحم" کے معنی رحم نہیں ہیں، بلکہ رحم طلب کرنا ہیں۔ بعض لوگ "بنظر ترحم" یا "ترحم کی نظر" لکھتے اور بولتے ہیں، مگر یہ صحیح نہیں ہے۔

لکھائی چھپائی کاغذ رسمی۔ ضخامت ۲۴۴ صفحات۔ قیمت دو روپیہ ؏، ملنے کا پتہ:۔ سلطان پریس ہنگولہ

جنگ اور غذا کا مسئلہ

موجودہ جنگ کی وجہ سے ہندوستان میں اجناس خوراک کی حالت اس قدر تشویش انگیز بلکہ نازک ہوگئی ہے کہ خود گورنمنٹ کو بھی اس طرف متوجہ ہونا پڑا۔ چنانچہ اس بارہ میں ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی گئی تھی جس کے صدر حکومت ہند کے مشیر مسٹر تھیوڈور گریگوری تھے۔ اگرچہ کمیٹی مذکور میں سرکاری آدمیوں کی کثرت تھی پھر بھی اس نے تمام امور متعلقہ کی تحقیقات کرنے کے ایک ایسی رپورٹ پیش کی جو ہندوستان کے قومی نقطۂ نگاہ سے ہمدردانہ کہی جاسکتی ہے۔ شفیق الرحمٰن صاحب (عثمانیہ) نے آ

گریگوری کمیٹی کی رپورٹ کو پیش نظر رکھکر ہندوستان کے غذائی مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس چھوٹی سی پر از معلومات کتاب میں بتایا گیا ہے کہ ہندوستان میں کون کون سے غلے کتنی کتنی مقدار میں سالانہ پیدا ہوتے ہیں اور کتنا اجناس بیرونجات سے منگائے جاتے تھے جن کی درآمد جاپان کے جنگ میں کود پڑنے سے یکایک بند ہوگئی ہے۔ اس کتاب میں اجناس خوراک کے متعلق مختلف گوشوارے اور نقشے دیکر ناظرین کو پوری پوری معلومات بہم پہونچائی گئی ہے۔ الغرض ہندوستان کے مسئلہ خوراکیات پر پوری طرح بحث کرنے کے بعد فاضل مصنف اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ ہندوستان کا موجودہ غذائی مسئلہ نہایت نازک شکل اختیار کر چکا ہے۔ اگر اسے حل کرنے کیلئے فوری اور موثر تدابیر اختیار نہ کی گئیں تو بلا شبہ ملک کو ایسی شدید تباہیوں کا سامنا کرنا پڑے گا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملے گی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلومات میں کافی اضافہ ہوگا۔

لکھائی چھپائی، کاغذ عمدہ۔ ضخامت چار جزو۔ قیمت بارہ آنہ ۱۲ ملنے کا پتہ: سانڈ یا بک ہاؤس، عابد روڈ حیدرآباد دکن

ہندوستان کی معاشی ترقی کے لئے ایک لائحہ عمل

ہندوستان جو کسی زمانہ میں جنت نشان کہا جاتا تھا۔ اب دنیا بھر میں سب سے زیادہ فلاکت زدہ اور خستہ حال ملک ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں سالانہ آمدنی کا فی کس اوسط ایک ہزار چار سو چھ روپیہ اور برطانیہ میں بھی فی کس اوسط نو سو اسی روپیہ ہے ان کے مقابلہ میں ہندوستان میں سالانہ آمدنی کا اوسط فی کس تریسٹھ روپیہ ہے۔ ہندوستان کی اس مفلسی و ناداری اور اس پستی و زبوں حالی کو دیکھ دیکھکر ملک و قوم کے بہی خواہوں کا دل کڑھنا ایک قدرتی امر ہے چنانچہ ہندوستان کے چوٹی کے آٹھ کاروباری حضرات یعنی (۱) سر پرشوتم داس ٹھاکر داس (۲) جے۔ آر۔ ڈی۔ ٹاٹا (۳) جی۔ ڈی۔ برلا (۴) سر اردشیر دلال (۵) سر شری رام (۶) کستور بھائی لال بھائی (۷) اے۔ ڈی شراف اور (۸) جان متھائی نے ایک پندرہ سالہ اسکیم ایسی سوچی ہے جس کے بروئے کار آجانے پر ہندوستانی کی سالانہ آمدنی اوسطاً دگنی تگنی ہو جائیگی۔ مجوزہ اسکیم پر ایک کھرب روپیہ خرچ ہوگا۔ اسکیم مذکور پر ملک کے اخبارات اور متعدد ماہرین معاشیات مخالفانہ و موافقانہ تنقیدیں کر چکے ہیں اسی اسکیم کا ترجمہ اردو زبان میں سعید احمد صاحب بہمانی بی۔ اے (عثمانیہ) نے دلپذیر کتاب کی صورت میں کیا ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ سب عمدہ۔ ضخامت پانچ جزو قیمت بارہ آنہ۔ ملنے کا پتہ انڈیا بک ہاؤس عابد روڈ حیدرآباد دکن۔

زارینہ

یہ کتاب جس کا تیسرا ایڈیشن پیش نظر ہے پہلے دو مرتبہ انقلاب روس کے نام سے منظر عام پر آ چکی ہے۔ یہ ناول جسے محمد رحیم صاحب دہلوی نے اردو کا لباس پہنایا ہے روس کی جرمن ملکہ الیگزینڈرا کے حالات ایک جرمن نواب زادی نے جو اس کی بچپن سے سہیلی تھی تفصیل کے ساتھ درج کئے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے روس کے مظالم، راسپوٹین سے ساز باز اور انقلاب روس کے حالات سے آگہی ہوتی ہے۔

لکھائی چھپائی کاغذ سب عمدہ۔ انگریزی جلد گرد پوش دیدہ زیب حجم ۱۷۰ صفحات قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ: نیا کتاب گھر، اردو بازار دہلی۔

۱۹۴۴ء

۳۱۔ دسمبر کو ۱۹۴۴ء کا سال ہم سے رخصت ہوا اور دنیا نے ۱۹۴۵ء میں قدم رکھا۔ یوں تو ہر شے آتی جاتی ہے لیکن دنیا میں کوئی واقعہ ایسا نہیں ہوتا جو اپنا کچھ نہ کچھ نشان نہ چھوڑ جاتا ہو۔ چنانچہ ۱۹۴۴ء کا دامن بھی بعض اہم واقعات سے خالی نہیں تھا جن کے تاثرات تاریخ عالم کے اوراق پر عرصہ تک باقی رہیں گے۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں جو منحوس جنگ شروع ہوئی تھی اُس کا سلسلہ اسی ہولناکی، اُسی خونریزی اور اسی تباہ کاری کے ساتھ بدستور ۱۹۴۴ء میں بھی جاری رہا۔ بارہ مہینے گذرے کہ جنگ کے خاتمہ، اتحادیوں کی مکمل فتح، محوریوں کی شکست فاش، اور دُنیا کے لئے ایک جدید دورِ خرمی و شادمانی کی پیشگوئیاں کی جاتی تھیں اور پورے وثوق سے اظہار امید کیا جاتا تھا کہ دنیا کا مستقبل نہایت روشن ہوگا، لیکن یہ پیشگوئیاں غلط ثابت ہوئیں، اور تمام روشن توقعات پر پانی پھر گیا جنگ کے دیوتا مریخ کا پرچم آج بھی دنیا میں لہرا رہا ہے۔ کیا یہ جنگ ۱۹۴۵ء میں ختم ہو جائے گی؟ یہ سوال ہر امن پسند کے دل میں پیدا ہوتا ہے، لیکن بظاہر جنگ ختم ہونے کے کوئی آثار فی الحال نظر نہیں آتے۔

جہاں تک جنگ کا تعلق ہے ۱۹۴۴ء کا اہم ترین واقعہ یہ تھا کہ اتحادیوں نے تمام جزوکل پر پوری طرح غور و خوض کے بعد مغرب و جنوب کی سمت سے ہٹلر کے مفتوحہ یورپ پر زبردست حملہ کر دیا جو کامیاب ہوا، اور جب سے اتحادیوں نے سرزمین فرانس پر قدم رکھا ہے اُس وقت سے وہ جرمنوں کو پیچھے ڈھکیلتے ہوئے برابر بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اول اول تو پیش قدمی کی رفتار کسی قدر سست تھی، لیکن چند ہفتوں کے بعد پیش قدمی کی رفتار میں اس قدر ترقی ہوئی کہ خود اتحادی ہائی کمانڈ کو بھی اس کی توقع نہیں تھی۔ الغرض ہٹلر کے تمام مفتوحہ علاقے یکے بعد دیگرے ہاتھ سے نکلتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ جس قدر جرمن فوجیں فرانس۔ لکسمبرگ۔ بلجیم اور ہالینڈ میں تھیں ان سب کو جرمن حدود میں ڈھکیل دیا گیا۔

عین اُس وقت جبکہ جرمن فوجیں بُری طرح پسپا ہو رہی تھیں بعض جرمن افسروں نے ہٹلر اور اُس کی ہٹلریت کا تختہ اُلٹنے کی سازش کی۔ مقصد یہ تھا کہ ہٹلر کو فنا کے گھاٹ اُتار کر نازی حکومت کا خاتمہ کر دیا جائے۔ ہٹلر پر بم پھینک کر اُس کے قتل کا اقدام بھی کیا گیا مگر وہ بال بال بچ گیا بہرحال اس سازش کو بہت جلد کچل دیا گیا، اور جن سازش کنندگان کو خفیہ پولیس نے گرفتار کیا تھا اُنھیں عبرت ناک سزائیں دی گئیں۔ اس وقت جرمنی کی یہ حالت تھی کہ وہ شکست کے کنارے پہونچ گیا تھا، اور یہ بات خود ڈاکٹر گوئبلز نے جو ہٹلر کا بازو ہے تسلیم کر لی تھی۔ لیکن جرمنی کسی نہ کسی طرح بچ گیا۔ البتہ جرمن جنرلوں میں کچھ تغیر و تبدل ضرور ہوا۔

مغربی محاذ پر گرمیوں کے زمانہ میں تو اتحادی فوجیں خوب بڑھتی چلی گئی تھیں لیکن جب جاڑوں کا موسم شروع ہوا تو

کی رفتار سست پڑ گئی۔ اور جب شدت کی سردی پڑنے لگی تو جرمن سرحد کے سامنے پہونچکر اتحادی پیش قدمی بالکل رک گئی۔ اس وقت جرمن جنرل مارشل رنسٹیڈ نے اپنی فوجوں کی از سرِ نو تنظیم کرکے اس قدر سخت جوابی حملہ کیا کہ امریکن لشکر کی فوجوں کو ساٹھ ستر میل پیچھے ہٹنا پڑا۔ اور بلجیم کے متعدد شہروں اور قصبوں پر جرمنوں کا پھر قبضہ ہوگیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ جرمنی کا یہ جوابی حملہ آخری پانسہ ہے جو اُس نے اپنا سب کچھ داؤں پر لگا کر پھینکا ہے۔ بہرحال اگر اس جوابی حملہ میں جرمنوں کو کچھ اچھی خاصی کامیابی حاصل ہوگئی تو جنگ کی میعاد بڑھ جائیگی ورنہ جرمنی کی شکست قریب تر ہو جائیگی۔

جنگ یورپ کا نمایاں اور قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ وہی جرمنی جو کل تقریباً تمام براعظم یورپ پر چھا کر کوس لمن الملک بجا رہا تھا، آج اُسے اتحادیوں نے مشرق و مغرب کی طرف سے دبا کر اس کے اصلی حدود میں ڈھکیل دیا ہے۔ یورپ کی وہ چھوٹی چھوٹی سلطنتیں جو کل لالچ کی وجہ سے یا جرمن فتوحات سے مرعوب ہوکر اتحادیوں کے خلاف جرمنی کا عملاً ساتھ دے رہی تھیں، اب وہ ایک ایک کرکے نہ صرف جرمنی سے علیحدہ ہوگئی ہیں بلکہ اُنھوں نے اپنے پرانے دوست کے خلاف اعلان جنگ بھی کر دیا ہے۔ اب صرف ایک ہنگری باقی رہ گیا ہے جو جرمنی کا ساتھ دے رہا ہے، لیکن اس کی بھی جان عذاب میں ہے، کیونکہ اب روسی فوجیں دندناتی ہوئیں ہنگری کے دارالحکومت بوڈاپسٹ تک پہونچ گئی ہیں جہاں گلیوں اور کوچوں میں دست بدست جنگ کرکے روسیوں نے تین چوتھائی شہر پر قبضہ کر لیا ہے۔ ہنگری کی گورنمنٹ پہلے ہی شہر سے فرار ہوگئی تھی۔ اس کے علاوہ اب ہنگری میں بھی پھوٹ پڑ گئی ہے، وہاں اتحادیوں سے سازباز کرکے اب کرنل مکلوس نے بحیثیت وزیر اعظم ایک نئی عارضی حکومت قائم کر لی ہے۔

اٹلی میں جنگ کی رفتار بہت سست رہی اور اب بھی سست ہے۔ اگرچہ برطانوی لشکر نے کسی قدر پیش قدمی کی ہے اور وہ دریائے سینیو تک پہونچ گیا ہے۔

تمام بلقان جرمن فوجوں سے خالی ہوگیا ہے۔ اگرچہ حکومت کی تشکیل پر یونان میں انگریزوں کے خلاف شورش برپا ہوئی اور زبردست کشت و خون تک نوبت پہونچی۔ اہل یونان اپنے بادشاہ جارج کو واپس بلانا نہیں چاہتے، اور برطانیہ کی پالیسی بادشاہ کے موافق ہے۔ یہی حال یوگوسلافیہ میں ہے۔ وہاں کے قوم پرست بھی اپنے بادشاہ پیٹر اور اُس کی گورنمنٹ کے خلاف ہیں۔

ٹرکی نے برطانیہ و امریکہ کے کہنے سننے سے جرمنی اور جاپان سے اپنے سیاسی تعلقات منقطع کر لئے ہیں۔

سنہ ۱۹۴۴ء میں جنگ کا ایشیائی پہلو بھی بعض نمایاں اور قابل ذکر واقعات سے خالی نہیں رہا۔ اوائل سنہ ۱۹۴۴ء میں جاپانیوں نے پوری طرح تیاریاں کرکے ہندوستان پر حملہ کر دیا تھا اور وہ آسام کی ریاست منی پور میں داخل بھی ہوگئے تھے۔ اگرچہ اتحادیوں نے جاپانی حملہ کو محض برائے نام تصور کیا تھا لیکن واقعات سے ظاہر ہوگیا کہ جاپانیوں کا حملہ برائے نام نہیں بلکہ واقعی تھا جس کے لئے جاپانیوں نے خوب سوچ سمجھ کر تیاریاں کر لی تھیں، لیکن وہ اپنے مقصد میں

بُری طرح ناکام رہے، اور ذلت کے ساتھ مار کر بھگا دیے گئے، اور سرزمین ہند کو ان کے منحوس قدموں سے پاک کر دیا گیا۔
اور اب وہ برما میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ لیکن اتحادی فوجوں نے ان کو یہاں بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا، انھوں نے مشرقی سمت حملے کر کے ایک طرف اراکان جاپانیوں سے خالی کرا لیا ہے۔ اور اکیاب پر جو برما میں تیسرے نمبر کا شہر ہے اور خلیج بنگال کی ایک اہم بندرگاہ ہے قبضہ کر لیا ہے، جس سے نہ صرف بنگال بلکہ ہندوستان کا مشرقی ساحل بھی محفوظ ہو گیا ہے۔ دوسری طرف برطانوی لشکر نے پیش قدمی کر کے شہر شویبو پر قبضہ کر لیا ہے، جہاں سے مانڈلے جو برما کا ۲ شہر ہے صرف پچاس میل دور رہ گیا ہے۔ تیسری طرف شمالی برما میں چینی فوجوں نے شہر بھامو پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور اب برما و چین کے درمیان سڑک کھلنے میں صرف چند دنوں کی دیر ہے۔ انھیں شکستوں کی وجہ سے جنرل توجو کی گورنمنٹ کو زوال ہوا جو تین سال سے جاپان پر مطلق العنانہ حکومت کر رہا تھا۔

بحر الکاہل اور مشرق اقصیٰ کا اہم ترین واقعہ ۱۹۴۴ء میں یہ ہوا کہ امریکہ کی فوجیں مجمع الجزائر فلپائن کے جزائر لیتہ، منڈورو اور لیوزان میں اُتر گئیں اور بہت دُور تک قبضہ کر لیا۔

اسی سلسلہ میں اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جس قدر علاقہ جنوب مشرقی ایشیا میں اتحادیوں نے جاپانیوں سے چھینا ہے اُس سے کہیں زیادہ علاقہ وہ چین میں لے چکے ہیں۔ جاپانی فوجوں نے کوئیانگ کی طرف نہایت خطرناک پیش قدمی کی تھی، دو طرف سے جاپانی فوجوں نے یلغاریں کی تھیں، اگر اس ڈبل پیش قدمی کو بر وقت روک نہ دیا جاتا تو ایک طرف کُنمنگ اور دوسری طرف دار الحکومت چونگکنگ کو زبردست خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔

خاص سرزمین جاپان پر اتحادی ہوائی جہازوں کی بمباری کا سلسلہ برابر جاری رہا، اور اب اُمید کی جاتی ہے کہ ۱۹۴۵ء میں جاپان کے خلاف خشکی، تری اور ہوا سے وسیع پیمانہ پر جنگی کارروائیاں کی جائیں گی اور یہ کارروائیاں برما، چین اور بحر الکاہل میں سب جگہ ہوں گی۔ خود شہنشاہ جاپان میکاڈو ہیرو ہیٹو صورت حال کو تشویش انگیز تسلیم کر رہے ہیں پھر بھی بقول امریکن امیر البحر ارنسٹ جے۔ کنگ "اگر یورپ کی جنگ ختم بھی ہو گئی تو بھی بحر الکاہل میں فتح پانے کی کوئی آسان صورت نہیں ہے۔"

چین و جاپان کی جنگ جولائی ۱۹۳۷ء میں شروع ہوئی تھی اور اسی وقت سے بہادر اور جفاکش چینی اپنے لیڈر مارشل چیانگ کائی شیک کے ماتحت اپنے خونخوار اور نہایت طاقتور دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے ہیں۔ سالہا سال تک تو وہ تن تنہا بے یار و مددگار لڑتے رہے جس استقلال و پامردی سے چینیوں نے اپنے زبردست دشمن کا مقابلہ کیا اُس کی وجہ سے امریکہ اور یورپ کی نظروں میں چین کی وقعت نہایت بڑھ گئی تھی اور برطانیہ و امریکہ نے چین کو بہت کافی مدد دی تھی۔ لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چین امریکہ و برطانیہ کی نظروں سے گر گیا ہے۔ ۱۹۴۴ء میں جنرل چیانگ کائی شیک کے کہنے سے امریکہ نے اپنے جنرل اسٹلویل کو واپس بلا لیا تھا۔ اس وقت سے اب تک چین اور جنرل چیانگ کے خلاف زبردست پروپیگنڈا

کیا جا رہا ہے۔

چین کے خلاف امریکہ نے جو الزامات عائد کئے ہیں وہ یہ ہیں:- (۱) مرکزی گورنمنٹ کی فوجیں جنگ سے تقریباً کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔ (۲) چینی اپنی جن کامیابیوں اور فتوحات کا ڈھول پیٹتے ہیں وہ تقریباً فرضی ہیں، ان میں سے اکثر واقع ہی نہیں ہوئی ہیں (۳) چیانگ کائی شیک اور اُن کی کومنتانگ جماعت تہ دل سے جاپانیوں کی دشمن نہیں ہیں (۴) چین میں جو کچھ ہے وہ کمیونسٹ جماعت ہے (۵) چین کے افسروں میں بددیانتی اور رشوت خواری پھیل گئی ہے وغیرہ وغیرہ۔ غرضکہ پروپیگنڈا کی مدد سے چین کو متحدہ اقوام میں جو درجہ حاصل ہو گیا تھا اُسے چھین کر اب فرانس کو دیا جا رہا ہے۔

بہرحال چین کی حالت بیحد نازک ہے اور یہی باعث ہے کہ جاپانیوں نے چین کے تقریباً تمام اہم مقامات پر قبضہ کر لیا ہے جہاں وہ اپنی پوزیشن مضبوط بنا رہے ہیں۔ اسی بات سے خیال گذرتا ہے کہ مغربی جنگ سے مشرقی جنگ زیادہ مدت تک جاری رہیگی۔

اب دیگر واقعات پر نظر ڈالی جاتی ہے:۔

اس وقت ریاستہائے متحدہ امریکہ دنیا کا سب سے بڑا ساہوکار، سب سے بڑا تاجر اور سب سے بڑا جنگجو ملک ہے اسکی موجودہ طاقت بہت بڑی ہے، تمام بنکوں پر امریکہ کا کنٹرول ہے، تمام ساز و سامان سب کو وہی سپلائی کر رہا ہے اور سب سے زیادہ سامان جنگ اور دیگر ضروریات وہی تیار کر رہا ہے۔

نومبر ۱۹۴۴ء میں امریکہ کے پریسیڈنٹ کا انتخاب ہوا، جس میں مسٹر روزویلٹ ہی پھر منتخب ہوگئے، حالانکہ وہ گذشتہ لمبے سال سے برسرِ حکومت تھے۔ امریکہ میں بہت سی مالی کانفرنسیں ہوئیں جس میں کسی نہ کسی طرح ہندوستان نے بھی نمائندگی کی۔ ان کانفرنسوں پر ہم "آئندہ ہندوستان" کے ماتحت روشنی ڈالیں گے۔ اس کے علاوہ امریکہ کے مشہور مقالہ نگار ڈریو پیرسن نے جو راز ہائے سربستہ فاش کئے تھے اُن کا بھی ذکر کریں گے۔

۱۹۴۴ء میں پریسیڈنٹ روزویلٹ اور مسٹر چرچل کی پھر ملاقات کوبک میں ہوئی تھی ۱۹۴۴ء کے آخری ہفتوں میں پریسیڈنٹ روزویلٹ نے ایک حیرت انگیز انکشاف کیا یعنی اٹلانٹک چارٹر کا کوئی وجود نہیں ہے، اور نہ اس پر کسی نے دستخط کئے تھے یہ ایک مسودہ سا تھا جس میں جگہ جگہ ترمیم و تصحیح کی گئی تھی۔ اس اہم اور حیرت انگیز انکشاف کے بعد دنیا کو یہ خیال کرنے سے کون روک سکتا ہے کہ بڑی بڑی طاقتیں دنیا کو آپس میں تقسیم کر لینا چاہتی ہیں، اور اگر بڑی بڑی طاقتوں کی یہ نیت ہے تو دنیا میں بہت جلد ایک تیسری عالمگیر جنگ رونما ہوگی جو پچھلی دونوں جنگوں سے بھی زیادہ ہولناک ہوگی۔

کناڈا ابھی تک برطانوی دولت مشترکہ میں شامل چلا آ رہا ہے ۱۹۴۴ء میں کناڈا کے وزیر اعظم مسٹر کنگ کو برٹش پارلیمنٹ تقریر کرنے کا فخر بھی حاصل ہوا تھا۔ کناڈا کی فوجیں مغربی اور جنوبی یورپ کے تمام محاذات پر حصہ لے رہی ہیں۔ نومبر ۱۹۴۴ء میں جبری فوجی بھرتی کا مسئلہ چھڑا تھا جس سے ملک میں ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ حکومت کے خلاف پبلک نے مظاہرے بھی کئے تھے

اب امن و سکون ہے۔

آئرلینڈ کے انتخابات پارلیمنٹ میں پھر مسٹر ڈی ولیرا اور اُن کی پارٹی غلبۂ اکثریت سے کامیاب ہوئی۔ اوائل ۱۹۴۲ء میں آئرلینڈ سے امریکہ و برطانیہ نے کہا تھا کہ وہ اپنے یہاں سے محوری سلطنتوں کے عملہ ہائے سفارت خانہ کو نکال دے لیکن ڈی ولیرا نے یہ درخواست منظور نہیں کی تھی۔ اب آئرلینڈ کی عجیب حالت ہے کہ وہ برطانوی دولت مشترکہ میں شریک ہے اور جنگ میں غیر جانبدار بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ کے خاتمہ پر جو صلح کانفرنس ہوگی اُس میں آئرلینڈ کو شریک نہیں کیا جائے گا۔

برطانیہ عظمیٰ جنگ اور سیاسیات عالم کا کلید بردار درحقیقت برطانیہ عظمیٰ ہے۔ اس کے وزیر اعظم مسٹر چرچل صاف لفظوں میں کہہ چکے ہیں کہ اُن کی وزارت میں سلطنت برطانیہ کا شیرازہ درہم برہم نہیں ہوگا۔ اُنھوں نے گورنمنٹ برطانیہ کے نمایندہ کی حیثیت سے پریسیڈنٹ روزویلٹ اور مارشل اسٹالین سے ملاقاتیں کی تھیں، اور اطالیہ، یونان بھی تشریف لے گئے تھے، جہاں وہ ایک یونانی کی گولی سے بال بال بچے۔

مارچ ۱۹۴۴ء میں مسٹر چرچل کی گورنمنٹ کو ایک ووٹ سے شکست ہو گئی تھی مگر اُن کی وزارت بدستور قائم رہی۔ ۱۹۴۴ء کے آخری ایام میں یونان کے معاملہ پر بھی مسٹر چرچل کو بہت پریشان کیا گیا تھا، لیکن مسٹر چرچل ہی کی جیت رہی۔ لیکن یونان کے بارہ میں جو پالیسی اُنھوں نے اختیار کر رکھی ہے اُس پر تمام دنیا نکتہ چینی کر رہی ہے کیونکہ یونان میں مسٹر چرچل نے اپنے مطلب کی حکومت قائم کرا دی ہے۔

برطانیہ میں ۱۹۴۲ء کا ایک اہم واقعہ یہ بھی ہوا کہ جو ہندوستانی کانگریسی وہاں مقیم ہیں اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ خواہ قید و بند میں ڈال دیئے جائیں لیکن وہ برطانیہ کی مساعی جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیں گے۔ چنانچہ مسٹر سرکش، بیدیا نے انکار کر دیا جن کا کنٹربری میں کورٹ مارشل کیا گیا۔ اور سزا دیکر قید کر دیا گیا۔ اب وہ سزا بھگت کر چھوٹ آئے ہیں۔ مسٹر وبیدیا نے وردی پہنکر قواعد پریڈ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

دسمبر ۱۹۴۲ء میں برطانیہ کے اندر ایک اور دلچسپ واقعہ ہوا۔ یعنی لیبر پارٹی نے اپنی اگزیکٹو جماعت کے فیصلہ کو ٹھکرا کر ایک ریزولیوشن پاس کر دیا جس میں ہندوستانی لیڈروں کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا گیا تاکہ موجودہ سیاسی جمود دُور کرنے کے لئے گفت و شنید کرنے میں سہولت ہو۔

لارڈ ٹمپلوڈ (سابق سر سیمول ہور) پانچ سال تک اسپین میں سفیر رہ کر واپس آگئے ہیں۔ یہ بھی افواہیں اُڑی تھیں کہ جنرل فرانکو اسپین سے بھاگ رہا ہے لیکن غلط ثابت ہوئیں۔

روس روس اس وقت سب سے زیادہ طاقتور سلطنت ہے جس نے جرمنی کو کچل کر اتحادیوں کا کام آسان کر دیا ہے۔ بہادر روسیوں نے ہٹلر کے خواب کو بے تعبیر کر دیا۔ اور وہ اپنے بہادر لیڈر مارشل اسٹالین کے ماتحت متحدہ عزیمت کا جشن

بلند کئے ہوئے ہیں۔ روسی فوجیں بڑی کامیابی کے ساتھ بڑھتی چلی جارہی ہیں۔ اُنھوں نے جرمنوں کے پنجہ سے نہ صرف اپنے ملک عزیز کو آزاد کرالیا ہے بلکہ رومانیہ و تمام بلقان کو محوریوں کی گرفت سے نجات دی ہے۔ انقلاب روس کی سالگرہ کے موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے مارشل اسٹالین نے جاپان کو بھی حملہ آور اقوام میں شمار کیا تھا مگر ابھی تک جاپان اور روس برسر جنگ نہیں ہیں لیکن نہیں کہا جاسکتا کہ یہ صلح اور یہ غیر جانبداری کب تک قائم رہیگی۔

مصر | مصر میں نحاس پاشا کے کابینۂ وزارت کو شاہ فاروق نے اپنے فرمان کے ذریعہ سے توڑ دیا ہے، اور اب وہاں احمد ماہر پاشا وزیر اعظم نے نئی وزارت قائم کی ہے۔ عام خیال ہے کہ چونکہ نحاس پاشا مصر کے لئے مکمل آزادی و خود مختاری کا مطالبہ کرتے تھے، اس لئے وہ برطانیہ کی آنکھوں میں کھٹکتے تھے، کیونکہ مصر کے معاملات پر درپردہ برطانیہ ہی کا کنٹرول ہے۔ مصر میں لارڈ موئین برطانوی وزیر متعینہ مشرق وسطیٰ کو دو یہودیوں نے قتل کردیا جس سے برطانیہ و مصر میں بڑی سنسنی پھیلی تھی، دونوں یہودی نوجوان جو قاتل تھے گرفتار کرلئے گئے جن پر مقدمہ چل رہا ہے۔

حبش | ملک حبش جس پر اطالیہ نے غاصبانہ قبضہ کرلیا تھا، برطانیہ کی امداد و اعانت سے اب آزاد ہوگیا ہے، مگر ابھی تک وہاں انگریزی فوجوں کا تسلط تھا۔ بالآخر ۱۹۴۴ء میں برطانیہ و شہنشاہ حبش میں ایک معاہدہ ہوگیا جس کی رو سے انگریزی فوجیں حبش کے دیگر مقامات سے تو ہٹ گئی ہیں لیکن اوغادین اور حرر دونوں مشرقی صوبوں پر جو برطانوی علاقہ اور صومال سے ملحق ہیں، برطانوی قبضہ قائم رکھا گیا ہے۔ شہنشاہ حبش نے اس کی شکایت پریسیڈنٹ روزویلٹ سے کی تھی جس کا مانچسٹر گارڈین نے یہ جواب دیا کہ ابھی تک حبش میں شہنشاہ کا پورا کنٹرول نہیں ہوا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ بعض مقامی امرا بہت سی باتوں میں شہنشاہ کے خلاف ہیں گویا حبش کے دو مشرقی صوبوں میں امن و قانون کے قیام کی ذمہ داری بھی برطانیہ کے سر ہے۔

جنوبی افریقہ | جنوبی افریقہ اور اُس کے یورپین باشندے ہندوستان کے لئے ایک سوہان روح مسئلہ ہے۔ جنوبی افریقہ کی حکومت وہاں کے ہندوستانی باشندوں کے خلاف ظالمانہ قوانین وضع کرتی ہے۔ اگرچہ فی الحال آرڈر دربارہ سکونتی جائداد واپس لے لیا گیا ہے مگر ہندوستانیوں کے خلاف جو کالا قانون وضع کیا گیا تھا اور جو میثاق پریٹوریہ مرتب کیا گیا تھا وہ ابھی کار فرما ہیں۔

مشرق وسطیٰ | سب سے پہلے ٹرکی کو لیجئے، یہ اب تک جنگ میں غیر جانبدار رہا۔ باوجودیکہ امریکہ و برطانیہ نے ٹرکی پر جنگ میں شامل ہونے کے لئے بہت کچھ دباؤ ڈالا تھا لیکن ٹرکی بدستور اپنی غیر جانبداری پر قائم رہا۔ مئی ۱۹۴۴ء میں مسائل خارجیہ پر دار العوام میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر چرچل نے کہا تھا کہ ٹرکی کے جنگ میں شامل ہونے کی کوئی اُمید نہیں ہے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

۱۹۴۴ء تمام ممالک عرب اور اُن کے ہمسایہ ملکوں میں قومیت و آزادی کے جذبات موجزن ہیں، فلسطین کا معاملہ جیسا پہلے تھا ویسا ہی اب بھی رہا۔ عربوں اور یہودیوں کے نسلی جذبات بُری طرح بھڑک رہے ہیں۔

ایران کا حصہ سیاسیات عالم میں زیادہ نمایاں رہا ہے، ایک تو ایران کا جغرافیائی محل وقوع جنگی نقطۂ نظر سے خاص اہمیت رکھتا ہے، دوسرے ایران میں تیل بکثرت موجود ہے اور یہی دونوں باتیں ایران کے لئے ایک قومی مصیبت بنی ہوئی ہیں، اور ہر طاقتور قوم ایران سے جلب منفعت کرنے پر کمر بستہ ہے۔ نومبر ۱۹۴۴ء میں ایران کے وزیر اعظم محمد سعید اور اُن کے کابینۂ وزارت نے شاہ کی خدمت

میں اپنے استعفے پیش کردیے تھے، جس کی وجہ یہ تھی کہ روس نے شمالی ایران میں تیل کے مراعات دیے جانے کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کے بعد ایران میں مرتضیٰ بیات کے ماتحت جو وزارت قائم ہوئی اُس نے پارلیمنٹ سے اس مطلب کا قانون پاس کرادیا کہ ایران کسی غیر ملکی گورنمنٹ یا کمپنی کو تیل کا اجارہ نہیں دیگا۔ بعض مبصرین کا خیال ہے کہ کہیں ایران کا تیل ایسا چٹان نہ ثابت ہو جس سے ٹکرا کر اتحادیوں کی ہم آہنگی اور تعاون کی کشتی ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے۔

ہندوستان | ہندوستان کی حالت ۱۹۴۴ء میں بھی ایسی ہی غیر مطمئن رہی جیسی پہلے تھی۔ سیاسی جمود بدستور قائم رہا۔ اور بیکاری، افلاس، بیماری، جہالت کا ملک پر غلبہ ہے۔ ۱۹۴۳ء نے بنگال میں قحط ڈال کر قیامت برپا کردی تھی تو ۱۹۴۴ء نے صوبہ بہار میں وبائی امراض پھیلا کر لاکھوں کا صفایا کردیا۔ اپریل ۴۴ء میں بمبئی کی بندرگاہ میں ہولناک دھماکے اور آتشزدگیاں ہوئیں جن سے اربوں روپیہ کا نقصان مال و جائداد اور سیکڑوں جانوں کا اتلاف ہوا۔ اور تقریباً دو ہزار آدمی مجروح ہوئے۔

ہندوستان میں اہم ترین واقعہ یہ ہوا کہ ۶ مئی ۱۹۴۴ء کو حکومت نے صحت کی بنا پر مہاتما گاندھی کو رہا کردیا تھا، جس سے تمام ہندوستان میں مسرت کی لہریں دوڑ گئی تھیں۔ رہائی کے وقت مہاتما جی کی حالت بہت تشویش انگیز تھی۔ وہ نہایت ضعیف و ناتواں ہوگئے تھے۔ مگر شکر ہے کہ رفتہ رفتہ اُن کی صحت بحال ہوتی گئی اور وہ ٹھیک دو سال بعد اپنے سیوا گرام میں آکر براجمان ہوگئے۔

مرکزی اسمبلی | حسب معمول فروری ۱۹۴۴ء میں مرکزی اسمبلی کا بجٹ اجلاس میں پیش ہوا، جس میں منتخب شدہ ممبروں نے فنانس بل کو نامنظور کردیا۔ لیکن وائسرائے نے اختیارات سے کام لیکر اسے پاس کردیا۔ مرکزی اسمبلی میں حکومت کو بہت مرتبہ شکستوں کا منہ دیکھنا پڑا، مگر نتیجہ کیا ہوا؟ دوسرے ملکوں میں اگر حکومت کو شکست ہوجاتی تو حکومت فوراً بدل جاتی مگر ہندوستان کی شکست خوردہ حکومت بدستور قائم رہی

نومبر ۱۹۴۴ء میں برطانیہ و امریکہ کی رائے عامہ نے پنڈت جواہر لال نہرو کی رہائی کا مطالبہ کیا، مگر وہ آوازِ صدا بصحرا ثابت ہوئی۔

مرکزی اسمبلی کے اجلاس خزاں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس میں چار سال بعد کانگریسی ممبر شریک ہوئے تھے، اسمبلی نے جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں پر مظالم کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک انتقامی ریزولیوشن پاس کیا تھا، مگر آج تک اس پر کوئی عمل درآمد نہیں ہوا۔ ممکن ہے کہ یہ کارروائی برٹش گورنمنٹ کو پسند آئی ہو۔

صوبہ سرحد شمال مغربی، پنجاب، سندھ، بنگال اور آسام میں اسمبلیاں کام کررہی ہیں۔ صوبہ سرحدی میں عدم اعتماد کے ووٹ سے ڈر کر اسمبلی کا اجلاس طلب نہیں کیا جاتا۔ پنجاب میں مسلم لیگ نے کانگریس سے مل کر اپوزیشن قائم کرلیا ہے۔ پنجاب میں کانگریسی ممبروں کی تعداد ۳۳ ہے جن میں سے آٹھ قید میں ہیں بارہ کو اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہونے کی اجازت ہے مگر تیرہ کو نہیں ہے

مسلم لیگ | ۱۹۴۴ء میں مسلم لیگ کی پوزیشن کافی نمایاں رہی۔ لیکن اپریل ۱۹۴۴ء میں مسٹر جناح کو پنجاب میں شکست فاش کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ جہاں اُنھوں نے پنجاب کی وزارت سے "یونینسٹ پارٹی" کا نام ترک کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔ مسٹر جناح اور ملک خضر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب میں گفت و شنید ہوئی۔ لیکن ملک صاحب نے مسٹر جناح کے مطالبہ کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ دوسری اہم بات

پنجاب میں یہ ہوئی تھی کہ گورنر نے سردار شوکت حیات خاں کو جو مسلم لیگ کے سرگرم ممبر تھے وزارت سے برخاست کر دیا تھا۔

ستمبر ۱۹۴۴ء میں ایک بہت بڑا واقعہ گذرا جو تاریخی اہمیت بھی رکھتا ہے یعنی بمبئی میں مسٹر جناح اور مہاتما گاندھی میں تقریباً تین ہفتہ تک بالمواجہ گفت و شنید نیز خط و کتابت ہوتی رہی۔ مگر جو فارمولا مہاتما جی نے مسٹر جناح کے سامنے پیش کیا تھا اُسے اُنھوں نے منظور نہ کیا، وہ فارمولا حسب ذیل تھا۔

(۱) ہندوستان اور پاکستان کی حد بندی کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے منظور شدہ کمیشن کے ذریعہ سے کرائی جائے اور دونوں علاقوں کے بالغ باشندوں سے ووٹ لیکر اُن کی خواہش معلوم کی جائے۔

(۲) اگر اکثریت کی رائے یہ ہو کہ دونوں علاقوں میں جدا جدا ریاستیں قائم ہونی چاہیئے تو جب ہندوستان غیر ملکی اقتدار سے آزاد ہوگا تو اس پر بہت جلد عملدرآمد ہوگا۔

(۳) دونوں ریاستوں میں ایک علیحدگی کا معاہدہ کیا جائیگا، جو اُمور خارجیہ، دفاع، سلسلۂ مواصلات، کسٹم، تجارت وغیرہ اُمور پر بھی حاوی ہوگا کیونکہ یہ معاملات دونوں ریاستوں کے مشترکہ معاملات رہیں گے۔

(۴) مندرجہ بالا معاہدہ میں دونوں ریاستوں کے اندر اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کا بھی انتظام کیا جائیگا۔

(۵) اس معاہدہ کو کانگریس اور مسلم لیگ کے منظور کرنے کے بعد فوراً دونوں جماعتیں آزادیٔ ہند کے لئے جدوجہد کرنے میں مصروف ہو جائیں گی۔

(۶) لیگ کو اختیار ہوگا کہ اگر کانگریس کوئی کارروائی براہ راست کرے تو اس میں شریک ہو یا نہ ہو۔

الغرض تین ہفتہ کے بعد یہ گفت و شنید ناکامی کے ساتھ ختم ہوگئی اور تمام ملک پھر مایوسی کے آغوش میں آگیا۔

مسلم مجلس | ایسے مسلمانوں کی تعداد بھی بہت کافی ہے جو مسلم لیگ سے متفق نہیں ہیں۔ ان مسلمانوں نے مسلم لیگ کے مقابلہ میں ایک آل انڈیا مسلم مجلس قائم کی ہے جس کے پریسیڈنٹ خواجہ عبدالمجید ہیں۔ مسلم مجلس کا مقصد مسلمانانِ ہند میں صحیح مسلم جذبات و روح کو بیدار کرنا اور ان کے مطابق عمل کرانا ہے۔ اس مجلس کا عمل تعمیری ہوگا تخریبی نہیں۔ یہ مجلس صرف اونچے طبقات کے لئے نہیں بلکہ عوام کے لئے کام کرے گی۔ مسلم مجلس کی شاخیں ملک کے ہر مقام میں کھولی جا رہی ہیں۔

دو نئی لیگیں | مسٹر جناح اور خضر حیات خاں کی گفت و شنید ختم ہونے کے بعد مسلم لیگ کا مقابلہ کرنے کی غرض سے پنجاب کے وزیروں نے اپنے یہاں ایک نئی لیگ قائم کی جس کا نام "زمیندارہ لیگ" رکھا گیا، اور اس کا مقصد بھی تمام ہندوستان کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا بتایا گیا ہے۔ حالانکہ جن وزیروں کی سرپرستی میں یہ لیگ قائم ہوئی ہے وہ ہندوستان میں غیر ملکی حکومت کے سب سے بڑے حامی ہیں۔

جب مسٹر جناح اور مہاتما گاندھی میں سمجھوتہ کے لئے گفت و شنید ہونے والی تھی، تو عوام کا خیال یہ تھا کہ بہت ممکن ہے کہ یہ گفت و شنید کامیاب ہو جائے۔ عین اس وقت ہز ایکسلنسی وائسرائے نے یہ بیان دیا کہ اگر مسلم لیگ اور کانگریس میں سمجھوتہ ہو بھی گیا تب بھی ان کو اختیارات نظم و نسق منتقل نہیں کئے جا سکتے۔ کیونکہ مسلم لیگ اور کانگریس کے علاوہ ہندوستان کی قومی زندگی میں اور بھی بہت سے طبقات موجود ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد ہی مسٹر فرینک انتھونی اور سر ولیم رابرٹس نے "متحدہ لیگ" کی بنیاد ڈالی۔ اس لیگ میں یورپین۔ اینگلو انڈین۔ ہندوستانی عیسائی اور اچھوت قومیں شامل ہونگی اور اگر ممکن ہوا تو اس میں سکھوں اور پارسیوں کو بھی شامل کر لیا جائے گا۔ اس نئی لیگ کی نسبت مسٹر انتھونی نے یہ کہا تھا کہ "اس کا رجحان عمل ہندو مسلم کی ایکتی ترقی میں رکاوٹ نہیں بلکہ ممد و معاون ثابت ہوگا۔ یہ لیگ بعض بنیادی امور پر یقیناً ایک مشترکہ پلیٹ فارم قائم کر سکتی ہے مثلاً ہندوستان کی تقسیم کا مسئلہ جداگانہ حق نیابت" اور اقلیتوں کے حقوق کے لئے تحفظات وغیرہ" اور سر ولیم رابرٹس نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ "ہماری پارٹی کا بنیادی اصول یہ ہونا چاہیئے کہ بہترین ہندو مسلم دماغوں سے اپیل کی جائے اور میں یقین کرتا ہوں کہ ایک دن وہ آئیگا کہ ہندوستان کی فلاح و بہبود کے لئے ہماری پارٹی ایک موثر اور زبردست قوت محرکہ بن جائیگی"

سندھ | سندھ کے سابق وزیر اعظم کو مئی سنہ ۱۹۴۳ء میں قتل کر دیا گیا تھا۔ سنہ ۱۹۴۴ء میں بسلسلۂ قتل بعض آدمیوں کو گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ جن میں ایک ملزم سندھ کے سابق وزیر محاصل مسٹر کھوڑو بھی ہیں۔ مقدمہ ابھی چل رہا ہے اور سنہ ۱۹۴۵ء میں نتیجہ معلوم ہوگا۔ بہر حال جب مسٹر کھوڑو گرفتار ہو گئے تو سندھ کے وزیر اعظم کی وزارت میں، جو مسلم لیگی ہے ایک یورپین وزیر بھی داخل کر لیا گیا جس پر نکتہ چینی ہوئی اور مسٹر جناح کی مداخلت پر وہ یورپین وزیر علیحدہ کر دیئے گئے۔ اگرچہ وہ گورنر سندھ کے غیر سرکاری مشیر اب بھی ہیں۔

سندھ کی مسلم لیگی وزارت نے آریہ سماج کی مشہور کتاب ستیارتھ پرکاش کے چودھویں باب کو بھی ممنوع قرار دے دیا، جس پر تمام ہند برافروختہ ہو گئی۔ اگر سنہ ۱۹۴۵ء میں یہ حکم امتناعی واپس نہ لیا گیا تو سندھ وزارت کے خلاف ہندو تحریک جاری ہو جائیگی۔

والیان ریاست | ہندوستان کے والیان ریاست عموماً خاموشی پسند اور دنیا سے الگ تھلگ رہنے کے عادی ہیں مگر سنہ ۱۹۴۴ء میں انہوں نے بھی کروٹ بدلی خواہ وہ عارضی طور پر سہی۔ یعنی والیان ریاست کی اسٹینڈنگ کمیٹی نے ایک ساتھ استعفا دے دیا ہے اور اسی وجہ سے دسمبر سنہ ۱۹۴۴ء میں "نریندر منڈل دہلی" کا سالانہ اجلاس نہ ہو سکا۔

غیر ملکی کانفرنسیں | سنہ ۱۹۴۴ء میں ہندوستان سے باہر بہت سی غیر ملکی کانفرنسیں بھی ہوئیں۔ ایک کانفرنس سلطنت برطانیہ کے وزرائے اعظم کی ہوئی جس میں ہندوستان کو بھی وہی جگہ دیگئی جو جنوبی رہوڈیشیا (افریقہ) کو دی گئی تھی۔ یہ بات قابل غور ہے کہ کہاں ہندوستان جو اپنے طول و عرض کی وجہ سے ایک براعظم ہے اور کہاں افریقہ کی ایک چھوٹی سی ریاست رہوڈیشیا۔

متحدہ اقوام کی امداد و تعمیر جدید ایڈمنسٹریشن کے اجلاس میں شریک ہونے کے لئے مرکزی اسمبلی نے ایک بل پاس کیا تھا جس میں بعض شرطیں بھی لگا دی گئی تھیں لیکن برٹش گورنمنٹ اس معاملہ میں بھی ہندوستان کو اپنی ہی مرضی کے مطابق چلانا چاہتی ہے۔ انگلستان کے ذمہ ہندوستان کا بارہ ارب ڈالر قرضہ ہے جسے انگلستان اپنی مرضی اور اپنی سہولت کے مطابق ادا کرنا چاہتا

جس سے ہندوستان کی تجارت اور صنعت و حرفت کو نقصان پہونچنے کا احتمال ہے۔ برٹین ووڈس میں دنیا کی جو مالی کانفرنس ہوئی تھی، اُس میں ہندوستان کے نمایندوں نے اپنا جو نقطۂ نظر پیش کیا تھا اُس کی پوری طرح تائید و حمایت نہیں ہوئی۔
مقام سائی بس جو بین الاقوامی بزنس کانفرنس ہوئی تھی۔ اُس میں ہندوستان کے نمایندوں نے نہایت وضاحت اور صفائی سے بیان دیا لیکن ان طاقتوں نے جو ویسٹ ... اور سیروپ اس بیان کو پسند نہیں کیا اور یہ کہا کہ یہ سہولت سے خالی ہے۔
شکاگو میں سول ہوائی کانفرنس ہوئی جس کی کونسل میں جنوبی امریکہ کی چھوٹی چھوٹی غیر اہم ریاستوں کو تو جگہ دی گئی تھی لیکن ہندوستان کو محروم رکھا گیا تھا۔ لیکن بعد میں
ہندوستان کے سائنسدانوں کا بھی ایک وفد ۱۹۴۴ء میں انگلینڈ گیا تھا جو آجکل امریکہ میں ہے۔
ایک بین الاقوامی کانفرنس امریکہ کے مقام "ڈمبارٹن اوکس" میں بھی ہوئی تھی جس کے متعلق ناظرین کرام اسی پرچہ میں ایک مفصل مضمون ملاحظہ فرمائیں گے۔

تعمیر بعد از جنگ | ہندوستان کے سرکاری حلقوں میں ملک کی تعمیر بعد از جنگ کے سلسلہ میں بہت بلند بانگ دعوے کئے جا رہے ہیں۔ ہز اکسلنسی وائسرائے کی اگزیکیٹو کونسل میں ایک پلاننگ ممبر کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ جو حسن اتفاق سے اُن لوگوں میں شامل ہیں جنھوں نے بمبئی پلان مرتب کیا ہے۔ بمبئی کے پلان کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ ہندوستان کے مالکان مل اور بڑے تاجروں کی ایک کوشش ہے۔ اگر یہ پلان عملی صورت اختیار کرنے میں کامیاب ہو گیا تو ہر شخص کے لئے کھانے، پہننے، رہنے سہنے اور لکھنے پڑھنے کا معقول و مناسب بندوبست ہو جائیگا۔ ہر گاؤں میں ایک اسکول، ایک شفاخانہ قائم ہو جائیگا جس میں ایک سند یافتہ ڈاکٹر اور دو نرسیں ہونگی۔ اس کے علاوہ ہر شخص کی آمدنی سہ گنا ہو جائیگی۔ لیکن سر پرشوتم داس ٹھاکر داس کے اس ریمارک نے کہ "اس کے لئے نیشنل گورنمنٹ کی ضرورت ہے" تمام خواب شیریں کو بے تعبیر کر دیا ہے۔

اس کے علاوہ سرکاری تنخواہ دار ریڈیکل پارٹی نے بھی تعمیر بعد از جنگ کی ایک اسکیم مرتب کی ہے۔ الغرض اس وقت تعمیر بعد از جنگ کے بارہ میں بہت سی اسکیمیں اور کمیٹیاں موجود ہیں، جن میں مختلف صوبجاتی حکومتوں کی بھی ہیں اور مرکزی گورنمنٹ کی بھی ہے۔ ایک اسکیم اسی قسم کی مہاتما گاندھی سے بھی منسوب ہے جسے شریمان نرائن داوال نے مرتب کیا ہے۔

ماہرین فن کی "درآمد" | ۱۹۴۴ء کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ گورنمنٹ ہند نے بہت سے ماہرین فن باہر سے "درآمد" کئے تھے، یہ ماہرین ہندوستان آکر تحقیقات کرتے ہیں اور پھر کچھ دنوں بعد گورنمنٹ کو اپنی رپورٹ پیش کر دیتے ہیں۔ لیکن معلوم نہیں ان کی رپورٹوں کا کیا حشر ہوتا ہے۔ یہی حال تحقیقاتی کمیشنوں کا ہے۔ ایک تحقیقاتی کمیشن نے بمبئی کے دھماکوں اور آتشزدگی سے نقصانات کی تحقیقات کر کے اپنی رپورٹ پیش کی، اور حکومت کے ملازموں کی غفلت کا ایسا افسوسناک راز فاش کیا جس پر حکومت کو پسینہ آ جانا چاہئے تھا۔ بنگال میں جو ہولناک قحط پڑا تھا، اُس کی تحقیقات بھی ایک کمیشن نے کی تھی لیکن ابھی تک اس کی رپورٹ منظر عام پر نہیں لائی گئی ہے۔ لیکن سنا گیا ہے کہ بنگال کے قحط کی کسی قدر ذمہ داری وہاں کی حکومت پر بھی عائد کی گئی ہے۔

مشن | سنہ ۱۹۴۲ء میں بعض غیر ملکی مشن بھی ہندوستان آئے تھے "جیسے" افغان طبی مشن" اور "ایران کلچرل مشن"۔ ایرانی وفد نے گورنمنٹ کے کہنے سے بہت سی یونیورسٹیوں کی سیر کی تھی۔ اور بنارس یونیورسٹی میں تو اس مشن نے یہ ارادہ بھی ظاہر کیا تھا کہ وہ زراعتی انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ایرانی طلبا کو بنارس بھیجے گا۔ برطانیہ کے سائنس دانوں کی طرف سے بھی ایک "مشن" بھیجا گیا تھا جو صرف ایک شخص واحد یعنی "سر ڈاکٹر اے وی ہل" پر مشتمل تھا۔ یہ سائنس داں کسی قدر ماہر سیاسیات" بھی معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ انھوں نے انگلینڈ سے اپنا قرضہ وصول کرنے کی یہ ترکیب ہندوستان کو بتائی ہے کہ ہندوستانی طلبا کی زیادہ سے زیادہ تعداد تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلینڈ بھیجی جائے اور جو خرچ ان کی تعلیم پہ ہو وہ رقم قرضہ میں سے وضع کر لی جائے۔

بعض امریکن انکشافات | سنہ ۱۹۴۲ء میں اہل امریکہ نے بعض رازہائے سربستہ کا انکشاف کیا تھا مثلاً پریسیڈنٹ روزویلٹ کے ایلچی مسٹر فلپس نے ہندوستان سے جا کر جو رپورٹ پیش کی تھی اس سے امریکہ ہندوستان اور برطانیہ میں بڑی سنسنی پیدا ہو گئی تھی اس رپورٹ کے منظر عام پر آنے سے گورنمنٹ برطانیہ اور اس کی ماتحت حکومت ہند دونوں حیران و ششدر رہ گئی تھیں کیونکہ انھیں اس قسم کے انکشاف کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ امریکن اخباروں نے وہ تار بھی شائع کر دیا تھا جو حکومت ہند کے ہوم ممبر نے لندن بھیجا تھا جس سے بقول مسٹر ڈریو پیرسن برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر چرچل اور وزیر خارجیہ مسٹر ایڈن سخت پریشان ہوئے تھے۔ اس کے بعد جب مسٹر فلپس کا وہ خط شائع ہوا جو انھوں نے پریسیڈنٹ روزویلٹ کو لکھا تھا تو بڑی ہلچل مچی۔ اس خط میں مسٹر فلپس نے ہندوستانی فوج کو "کرایہ کا ٹٹو" بتایا تھا۔ ریپبلکن پارٹی کے نمایندے مسٹر کاوین ڈی جانسن نے امریکہ کے دارالعوام میں اس مطلب کا ریزولیوشن پیش کیا کہ چونکہ سر رونلڈ کیمبل اور حکومت ہند کے ایجنٹ جنرل سر گرجا شنکر باجپئی امریکن رائے عامہ کو برطانوی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں، اس لئے حکومت امریکہ ان دونوں کو "اشخاص نامطلوب" قرار دے۔

کانگریس | سیاسی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو سنہ ۱۹۴۲ء میں بھی ہندوستان وہیں رہا جہاں پہلے تھا بلکہ بقول مسٹر ہیرلڈ لاسکی ہندوستان ایک "وسیع قید خانہ" ہے جہاں ہزاروں آدمی نظر بند ہیں۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں میں سے صرف ایک یعنی سید محمود رہا کئے گئے ورنہ سب بدستور نظر بند رہے موجودہ سیاسی جمود کو دور کرنے کی غرض سے مہاتما گاندھی نے وائسرائے سے خط و کتابت بھی کی تھی مگر انھوں نے مہاتما جی کی پیشکش کو نامنظور کر دیا۔ اس کے بعد سر تیج بہادر سپرو نے کوشش شروع کی جنھوں نے ایک مصالحتی کمیٹی بھی بنائی ہے۔ ایک خاص بات سنہ ۱۹۴۲ء میں ضرور ہوئی ہے یعنی کانگریس میں نئی زندگی پیدا ہو گئی ہے۔ ہر صوبہ میں کانگریس اسمبلی اور ہر ضلع میں اس کی شاخیں کام کرنے لگی ہیں۔ اور یہ بات مہاتما جی کی رہائی سے ہوئی ہے ہر جگہ کانگریسی جماعتیں پھر سے کام کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ گاندھی جی ایک لاکھ وفادار و جاں نثار ورکروں کی ایک فوج بھرتی کر رہے ہیں جنھیں دیہات میں بھیجا جائے گا یہ لوگ دیہات والوں کو تعلیم و تربیت دینگے۔ ان کی تعلیم و تربیت پر جو روپیہ خرچ ہوگا وہ ماتا کستوربا فنڈ سے دیا جائیگا۔

خاتمہ | ۲۸ دسمبر سنہ ۱۹۴۲ء کو مسٹر آصف علی نے اسٹوڈنٹس فیڈریشن کانفرنس کلکتہ کے سالانہ اجلاس میں تقریر کی اور فرمایا کہ ہندوستان کو "ہندوستان چھوڑ دو" کے "نعرے" اور "ستیہ گرہ کی گولیوں" سے کوئی نفع نہیں ہوگا بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ ہندوستان کیلئے یہ کافی نہیں ہے، تازہ ہوا اور میدان میں کام کرنے سے ہندوستان کو فائدہ ہو جائیگا مسلم لیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسٹر آصف علی نے فرمایا کہ ہندوستان کی آزادی جیسے کسی قسم کی جماعت کی فرقہ بندی نہیں ہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ہندوستان برطانیہ کے ملک کا دل ہے۔ اس کے بعد مسٹر آصف علی نے ہندوستانی گورنمنٹ کے مطالبہ پر بھی بحث کی۔ سر سلطان احمد کونسل کو بھی

فہرست مضامین زمانہ جلد ۸۲ و ۸۳ بابتہ ماہ جنوری تا دسمبر ۱۹۴۴ء

(حصۂ نثر)

حصۂ نظم

تصحیح

زمانہ بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۴۲ء میں جناب اختر تلہری کا جو مضمون اقبال کے متعلق شائع ہوا ہے اس میں کتابت کی بعض غلطیاں رہ گئی ہیں قارئین اس میں حسب ذیل تصحیح کر لیں:۔ صفحہ ۲۵۰ کی چودھویں سطر میں "غائبانہ عقیدت" شائع ہو گیا ہے "غائبانہ" کی جگہ "غالبانہ" بنا لیا جائے۔ اسی صفحہ کی سولھویں سطر کے آغاز میں "یہ خیال" کے بعد یہ عبارت "اسی وقت درست ہو سکتا ہے جبکہ" لکھنے سے رہ گئی ہے۔ اسے بڑھا لیا جائے۔ اسی صفحہ ۲۵۰ پر جو حاشیہ دیا گیا ہے اس کی چوتھی سطر میں "تفریق" کے بعد "غائب" لکھنے سے رہ گیا ہے۔ اسے بڑھا لیا جائے۔ صفحہ ۲۵۱ پر آٹھویں سطر میں "اغوائے شیطان اور" کے بعد "اسی" حذف ہو گیا ہے بنا لیا جائے۔ صفحہ ۲۵۴ کی بیسویں سطر میں "ہوا جاتا ہے، یہ" کے بعد "مقام" حذف ہو گیا ہے، صفحہ ۲۵۵ کی چودھویں سطر میں "رواداری" کے بجائے "رواروی"۔ انیسویں سطر میں "ظن مزاج" کے بجائے "ظلی مزاج" بنا لیا جائے، صفحہ ۲۵۶ کی چودھویں سطر میں "ذوق مزدور جھومتا ہے" کی جگہ "ذوق مزدور جھومتا ہے" بنا لیا جائے۔

نیا سال

اس نمبر سے زمانہ کی زندگی کا چوالیسواں سال شروع ہوتا ہے۔ ۱۹۴۲ء جس طرح تمام دنیا کے لئے منحوس ثابت ہوا اسی طرح زمانہ اور اس کے کارکنوں کیلئے بھی بڑا صبر آزما نکلا کاغذ کی نایابی اور گرانی نے ہمارے لئے خاص مشکلات پیدا کر دیں لیکن خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ زمانہ کی اشاعت میں کوئی فرق نہیں آنے پایا، ہمیں امید ہے کہ آئندہ سال قدردانان رسالہ کی توجہ سے زمانہ کے مستقبل کے متعلق ان کو کسی قسم کے تردد کی ضرورت باقی نہ رہیگی اور ہمارے قدرشناس زمانہ کی توسیع اشاعت میں پہلے سے زیادہ عملی دلچسپی لیں گے۔
خدا کرے نیا سال زمانہ اور ناظرین زمانہ کو مبارک ہو!

نیازمند مہتمم زمانہ

زمانہ

بیادگار منشی دیانرائن صاحب نگم مرحوم

جلد ۸۴ — فروری سنہ ۱۹۴۵ء — نمبر ۲

فہرست

[illegible] کانپور سے شایع ہوا

ہمارے آشرم کی یہ لاجواب پیٹنٹ دوا ہر شخص کو لازمی طور پر فائدہ پہنچاتی ہے۔ چونکہ ہمارے آشرم کا مقصد آیورویدک کی تبلیغ و اشاعت کرنا ہے اس لئے ہم بے نظیر دوا بنانے کی ترکیب ذیل میں درج کرتے ہیں تاکہ ہر شخص خود بنا کر فائدہ اٹھائے۔

کلپ لتاوٹی بنانے کا نسخہ:۔ تمھارا۔ عاقر قرحا۔ ایک ایک تولہ۔ ترپھلا ۱۲ تولہ۔ ترکٹہ۔ دس تولہ ان کا سفوف اور ہرتال سے بنی ہوئی بنگ بھسم۔ کانتی سار۔ ابرک بھسم۔ زعفران ۶-۶ ماشہ۔ سلاجیت صاف کیا ہوا دس تولہ۔ گوگل صاف کیا ہوا دو تولہ۔ مشک نیپالی ڈیڑھ ماشہ۔ روغن صندل ۱/۲ پونڈ۔ روغن تیل چینی ۱/۵ پونڈ روغن بیروزہ ۱/۴ پونڈ۔ روغن ہلدی ۱/۴ پونڈ ملاکر برہمی اور ستاور کے تازہ رس سے ۲۴ گھنٹے گھوٹ کر ۲-۲ رتی کی گولیاں بنا کر سورن بنگ سے لیپٹ کر سایہ میں سکھالیں صبح و شام ایک ایک گولی کھائیں دودھ کے ساتھ۔ ہاضمہ کی شکایت حافظہ کی کمزوری سر میں چکر آنا پیشاب کے ساتھ کسی قسم کا مادہ خارج ہونا۔ خراب ہونا۔ نیز دل و دماغ یا اور کسی قسم کی کمزوری ہر بات کی تیر بہدف دوا ہے ضرورت مند حضرات اس دوا کو بنا کر کم از کم چالیس دن ضرور استعمال کریں اس سے طاقت۔ منی۔ خون چہرے کی سرخی بڑھ کر بدن خوبصورت سڈول اور امنگ سے بھرپور ہو جاتا ہے طاقت کی یہ سب سے بہترین دوا ہے بغیر کسی شکایت کے بھی اس کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ آشرم کے پرچار کیلئے بہت بڑے پیمانہ پر اس دوا کو بنا کر آشرم اپنی اصلی لاگت پر دیتا ہے اور گھر پر بنانے میں بھی یہی لاگت آتی ہے جو صاحب نہ بنا سکیں وہ منگا سکتے ہیں قیمت۔ ۴۰ دن کی دوا پورا کورس ۸۰ گولیاں چھ روپیہ آٹھ آنہ بیس دن کی دوا آدھا کورس تین روپیہ آٹھ آنہ 3/8/- علاوہ محصول ڈاک۔

خوبصورتی کیلئے آشرم کا "روپ سدھار" لگائیے:۔

اس کے لگانے سے چہرے کی جھائیں۔ مہاسے۔ جھری۔ چیچک کے کالے و ہر قسم کے بھدے داغ دور ہو کر چہرہ مانند گلاب کے دلربا ہو جاتا ہے ساتھ ہی ازحد خوشبودار ہے:۔ قیمت فی ڈبہ ۱/۲ تین ڈبہ ۱/۴ چھ ڈبہ ۸ روپیہ علاوہ محصول ڈاک:۔ آیوروید کے متعلق ہر طرح کی خدمت اور دوائیوں کے لئے ہمارا پتہ یاد رکھیئے:۔

پتہ:۔ آیوروید سیوا آشرم نمبر ۲ فیل خانہ کالا...

زمانہ

جلد ۸۴ — فروری ۱۹۴۵ء — نمبر ۲

نصیر الدین ہمایوں بادشاہ

(از جناب مولوی محمد عبد الرزاق صاحب کانپوری مؤلف البرامکہ و نظام الملک طوسی)

بابر کے فوت ہونے اور ایام سوگ کے بعد ہمایوں نے اپنی تخت نشینی کا جشن منایا۔ ابراہیم لودی کا خزانہ فیاضیوں کے لئے موجود تھا، اور دل کا بھی سخی تھا۔ مخالف بھائیوں نے جو صوبے طلب کئے وہ ان کو دیدیئے ارکانِ دولت افسران فوج اور تمام متوسلین کو کشتیاں بھر بھر کر خلعت، زر و جواہر سے نہال کر دیا، شعراء بھی محروم نہیں رہے۔ مؤرخین نے تخت نشینی کا مادّہ "کشتیِ زر" نکالا، جو واقعات کے مطابق تھا۔

آغازِ حکومت میں ہمایوں کو بھی انتظامِ سلطنت میں مشکلات کا سامنا ہوا، مگر ہمت و اقبال نے مہمات میں کامیاب کیا، لیکن ہم اِن فتوحات کو دُہرانا نہیں چاہتے ہیں، صرف شیر شاہ کی معرکہ آرائیاں اور ہمایوں کے سفر ایران پر اس مضمون کو ختم کردیں گے۔

<u>ہمایوں اور شیر شاہ</u> شیر شاہ کا نام فرید خاں تھا، یہ افغان کسی ملک کا نواب بھی نہ تھا لیکن فطری بہادری اور عزم و استقلال نے اس کو ہندوستان کا ایک نامور تاجدار بنا دیا۔ یہ حسن خاں کا بیٹا اور ابراہیم خاں کا پوتا تھا۔

ابتدائی تاریخ یہ[1] ہے کہ ابراہیم گھوڑوں کی تجارت کرتا تھا۔ پھر سوداگری چھوڑ کر جمال خاں حاکم جونپور کی فوج میں ملازم ہو گیا۔ جب یہ مر گیا تو اس کا بیٹا حسن خاں باپ کا قائم مقام ہوا۔ یہ پورا سپاہی زادہ تھا، اس نے معرکوں میں وہ کار گزاریاں دکھائیں کہ سہسرام اور ٹانڈہ کا جاگیردار مقرر ہوا اور پانسو سواروں کی افسری ملی۔ اور جب حسن خاں فوت ہوا تو فرید خاں نے سلطان محمد شاہ بہار کی فوجی خدمت میں قبول کر لی، اور شیر کے شکار پر شیر خاں کا خطاب ملا

---

[1] حاشیہ التواریخ [illegible] مطبوعہ کلکتہ

زمانہ فریدی ۱۵۲۵ء

اور تاج خاں قلعدار چنار گڑھ کی بیوہ سے نکاح کر کے قلعہ پر قبضہ کیا۔ اور سہسرام کی جاگیر بھی بدستور رہی۔ اس زمانہ میں
سلطان محمد بن سلطان سکندر لودی پٹنہ پر قابض تھا۔ فرید خاں نے شاہ کی اطاعت قبول کی اور اپنی قوت بڑھاتا
رہا۔ جب سلطان فوت ہو گیا تو پٹنہ پر قبضہ کر لیا۔ چنانچہ شیر خاں کی سلطنت کا آغاز پٹنہ سے ہوا۔ الغرض جب بنگالہ
میں فرید خاں کی قوت مستحکم ہو گئی تو ہمایوں سے معرکہ آرائی شروع کی۔ چنانچہ مقابلہ بنگالہ (کوہستان چہار کھنڈ) میں ہوا۔
اول ہمایوں کو شکست ہوئی اور وہ فرار ہو کر گوڑ (قدیم دار الحکومت بنگالہ) میں مقیم ہوا۔ اور بارش شروع ہو جانے سے
میدان جنگ کو چھوڑ کر شبستان عیش میں رہنے لگا۔ اور گوڑ کو جنت آباد کا خطاب دیا۔ اور بنگال کی مرطوب ہوا نے
انسان و حیوان سب کو بستر علالت پر گرا دیا۔ برساتی نالوں کا اس قدر چڑھاؤ ہوا کہ ڈاک بند ہو گئی۔ دو حقیقی
بھائی (ہندال و کامران) بھی ملک گیری کے خیال سے اٹھے اس کو لکھا کہ جو ملک والد مرحوم نے خون جگر پی کر فتح کیا تھا
پہلے اس کو دشمن سے بچاؤ، اور خانگی نزاعوں کو ملتوی کرو۔ لیکن اس تحریر کا کچھ اثر نہ ہوا۔

ہمایوں پہ فتح پا کر شیر خاں شیر شاہ بن گیا۔ ہمایوں کو جب شیر شاہ کے حالات معلوم ہوئے تو آگرہ کی
فکر ہوئی، راستے ناقابل گذر تھے اور فوج شکستہ دل، تاہم اسی حال میں روانہ ہو گیا۔ شیر خاں بھی اپنے ماند سے
نکل کر ہمایوں کے تعاقب میں چلا اور بنارس فتح کر کے جونپور کا محاصرہ کیا، ہمایوں آگرہ پہونچا، فوج کا کثیر حصہ
راستہ سے فرار ہو گیا تھا اور جو آگرہ آیا وہ بھی خستہ و بیمار تھا۔"

ہمایوں جمنا عبور کر کے قلعہ میں داخل ہونے والا تھا کہ تھکے ہوئے رفیق گھوڑے نے بھی دم توڑ دیا۔ قریب
تھا کہ ہمایوں ڈوب جائے سامنے ایک فوجی سقہ نظر آیا جو مشک پر تیرتا آ رہا تھا، ہمایوں نے زور سے آواز دی کہ "
" اور رحمت کے فرشتے "میری خبر لے"۔ دریاب اے مسیح کہ مردم در انتظار، سقہ کا نام نظام تھا، یہ آواز
پر تیر کی طرح آیا، ہمایوں نے کہا کہ مجھے گھاٹ تک پہونچا دے اور اس صلہ میں جو مانگنا ہے مانگ لے"۔ نظام نے
عرض کیا "دو پہر کی بادشاہت" عرض قبول ہوئی۔ سقہ نے ہمایوں کو مشک پر بٹھایا اور کاندھے کا سہارا دیتا ہوا
جمنا کے کنارے پہونچا دیا۔ ہمایوں نے سجدۂ شکر ادا کیا اور آگرہ پہونچکر وعدہ وفا کیا۔ نظام نے سب سے پہلے
خواجہ خضر کے فاتحہ خوانوں (قومی جماعت) کو بلایا، اور مشکوں کو روپیہ اور اشرفیوں سے بھر دیا اور بعد دو پہر نظامی سکہ
جاری ہو گیا۔ چرمی مشکوں کو باریک کتروا کر چھوٹی چھوٹی ٹکلیاں بنوائیں، اور ان پر نقرئی اور طلائی کیلیں (بمقدار مالیت)
جڑی گئیں جو بعض عجائب خانوں میں ہنوز محفوظ ہیں۔ "نظام نے چام کے دام چلائے"[1] (یہ مثل ہنوز مشہور ہے)
اس سکہ نے ایک پہر کی عمر پائی اور فنا ہو گیا۔ یہ واقعہ ۹۴۶ھ / ۱۵۳۹ء کا ہے۔

---

[1] دام ایک مسی سکہ بھی تھا جو عہد اکبری میں جاری ہوا اور عہد محمد شاہ تک جاری رہا، چالیس دام کی قیمت ایک روپیہ تھی
(آئین اکبری تصحیح کردہ سر سید احمد خاں بہادر مطبوعہ دہلی قدیم)

ہمایوں نے قلعہ آگرہ میں دم لیا، لیکن شیرشاہ بھی تعاقب میں ساتھ ہی ساتھ رہا۔ قلعہ میں امرا اور بھائیوں سے مشورہ ہوا، نشیب و فراز سمجھایا، مگر بھائیوں نے کچھ خیال نہ کیا۔ میرزایان کو شیرشاہ نے اس فریب میں ڈال دیا تھا کہ تم ہمایوں سے الگ ہو جاؤ تو پھر پنجاب کی حکومت تمہارے لئے ہے۔ حقیقت میں

یہ وہ نشہ نہ تھا جسے ترشی اُتار دے

یہ دونوں ہمایوں کو تنہا چھوڑ کر پنجاب چلے گئے، اور نتیجہ کے منتظر رہے۔ اور ہمایوں کامران کی امداد سے مایوس ہو کر چھ مہینہ کے وقفہ کے بعد شیرشاہ سے صف آرا ہوا۔ شیرشاہ کے سوار ۱۵ ہزار اور ہمایوں کا لشکر ایک لاکھ تھا۔ اور قنوج میں گنگا کے کنارے یہ جنگ ہوئی، ہمایوں ناکام رہا۔ اور ہاتھی پر سوار ہو کر چلا۔ گنگا چڑھاؤ پر تھی۔ ہاتھی پانی میں غوطے کھاتا ہوا ایسی جگہ ٹھہرا جہاں کراڑہ (کنارہ) بہت اونچا تھا۔ دو امیروں نے دیکھا، کمر سے پٹکے کھول کر رسی بٹی اور بادشاہ کو اوپر کھینچ لائے۔ اور بمشکل آگرہ داخل ہوا۔ اور بارش کے آغاز نے پچھلے سال کا سماں یاد دلا دیا، اور ہمایوں بمشکل زندہ بچا۔ یہ زبردست فتح تھی جس نے شیرخاں کو شیرشاہ بنا دیا تھا۔ مجبوراً ہمایوں لاہور آیا۔ بھائیوں نے ٹکا سا جواب دیا اور بولے ہم تو کابل جاتے ہیں۔ آپ کو ہندوستان مبارک رہے۔ جب معلوم ہوا کہ شیرشاہ تعاقب میں ہے تو ہمایوں نے سندھ کا رُخ کیا۔

یہ سفر حقیقت میں صورتِ سقر تھا۔ رجواڑوں سے مدد مانگی۔ مگر کس اُمید میں مدد ملتی، جو بادشاہ خود مبتلائے افلاس ہو اُس سے اُمید فلاح نہ تھی۔ جب کسی قسم کا سہارا نہ ملا تو جودھپور کا راستہ لیا۔ یہاں کا راجہ ہنوز وفادار تھا۔ راستہ ویران، اونٹ کی سواری، رات کا سفر، راستے ناپید، تمام دن آسمان سے آگ برستی تھی، اس مصیبت پر پانی نایاب تھا۔ الغرض بیکانیر کے ویران راستہ سے لڑتا بھڑتا نواح جودھپور میں پہونچا۔ شہر میں ایک مخفی جاسوس بھیجا وہ خبر لایا کہ راجہ ضرور ہمدرد تھا اور اس نے طلبی کے خطوط بھی لکھے تھے۔ مگر جب شیرشاہ کے قاصد دربار تک پہونچے تو راجہ نے خوفزدہ ہو کر ہمایوں کی اعانت سے انکار کر دیا۔ بلکہ یہاں تک معلوم ہوا کہ اگر ہمایوں جودھپور تک پہونچا تو گرفتار کر کے شیرشاہ کے پاس پہونچا دیا جائیگا۔ یہ خبر سُن کر ہمایوں اُلٹے پاؤں پھرا۔ حمیدہ بیگم (والدہ اکبرشاہ) حاملہ تھی اور سواری میں گھوڑا تھا، وہ بھی ظالم سوار نے واپس لے لیا۔ بمشکل ایک اونٹ ملا۔ اس پر بیگم کو سوار کیا۔ اس سفر میں پانی کی نایابی قہر آلہی تھا کتنے ہی ہمسفر پیاس سے مر گئے۔ پن گھٹ پر جو ہنگامہ ہوتا تھا وہ میدان جنگ سے کم نہ تھا۔ پانی چاہات میں صبح کا ستارہ معلوم ہوتا تھا۔ سو گز سے بھی زیادہ رسی لگتی تھی تب ایک ڈول پانی ملتا تھا۔

چنانچہ ہمایوں جودھپور کے خطرناک مصائب جھیلتا ہوا امرکوٹ میں داخل ہوا۔ راجہ عزت و احترام سے پیش آیا کچھ روز آرام کر کے آگے بڑھا۔ دو یوم کی قطع مسافت پر ہمایوں کے یہاں وہ بلند اقبال بیٹا پیدا ہوا جس کی

لے تاریخ ہندنامہ رشید پرشاد ستارہ ہند واقعات ہمایوں اور جنگ قنوج۔ مطبوعہ الہ آباد ۱۸۶۲ء

اقبال مندی ضرب المثل ہے، وہ اکبر تھا جس کی ذات سے ہندوستان میں مغلوں کی حکومت مستحکم ہوئی۔ اس وقت ہمایوں کے قافلہ میں کل سات رفیق تھے۔ انھوں نے ہمایوں کو مبارکباد کے پیام دیئے۔ خورجی میں دیکھا تو ایک مشک نافہ ملا۔ اس کو توڑ کر ایک ایک ٹکیہ مشک تقسیم کیا اور اس کو نیک فال سمجھا۔ ہمایوں کا خیال تھا کہ مشک نافہ کی خوشبو کی طرح میرے بیٹے کی شہرت بھی عام ہوگی۔

ہمایوں کے لئے یہ سخت نازک موقع تھا اُس کو یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل تھا کہ اب کہاں جائے؛ ناچار یاد وطن نے مجبور کیا اور قندھار کا سفر کیا۔ جب ہمایوں کڑی منزلیں طے کرتا ہوا قندھار کے قریب پہونچا تو ایک سوار آیا، اور اُس نے بیرم خاں سے عرض کیا کہ میرزا عسکری (گورنر قندھار منجانب کامران) کو ہمایوں کے حالات کی خبر مل گئی ہے وہ گرفتاری کو آرہا ہے، مجبوراً ہمایوں بہ عزم ترکستان روانہ ہوگیا۔ اور اکبر کو ایک خیمہ میں چھوڑ کر خدا کے سپرد کیا جب دشمن کا خطرہ دُور ہوگیا تو بیرم خاں نے عرض کیا کہ فردوس مکانی کو وطن سے کیا ملا ہے جو آپ کو ملے گا؟ ہما مٹی میں بوئے وفا نہیں ہے، اب صرف دو راستے ہیں یا مکۂ معظمہ کا قصد کیجئے یا ایران کا؛ صفویہ خاندان مہمان نواز ہے جس نے بابر کی دُو مرتبہ شاہانہ مہمانی کی ہے وہ آپ کو بھی آنکھوں پر بٹھائے گا۔ چنانچہ ہمایوں نے اس مشورہ پر عمل کیا، اور اپنے بائیس[۲۲] رفیقوں کے ہمراہ ایران کو روانہ ہوگیا۔ جب عسکری میرزا آیا تو ہمایوں جاچکا تھا، چولھے کی راکھ کے سوا میدان میں کچھ نہ تھا۔ دُنیاداری برتی، بھتیجے کو آغوش میں لیا اور دایہ کے ہمراہ قندھار لے گیا۔ یہ واقعہ سنہ ۹۴۹-۹۵۰ھ / ۱۵۴۲-۴۳ء کا ہے

ہمایوں کا سفر ایران

ہمایوں امرکوٹ سے بڑی مصیبت میں نکلا تھا، اور سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ کوئی راہ نما ساتھ نہ تھا۔ پہلی منزل تھی کہ خدا نے غیب سے ایک بلوچی کو بھیج دیا، چنانچہ اُس کی رہنمائی سے یہ مختصر قافلہ سیستان پہونچا۔ یہاں پہونچکر بیرم خاں نے حق سفارت ادا کیا۔ وہ شاہ طہماسپ کے حضور میں پہونچا، ہمایوں کا خط دیا، اور مسرت افزا جواب لایا۔ شاہ ایران نے عمال اور والیوں کے نام مہمانداری کے احکام صادر کئے، ہمایوں جہاں گیا، سرحد پر حکام نے فوج و حشم کے ساتھ استقبال کیا، اور نذر پیش کی، چنانچہ اسی آئین سے ہرات تک پہونچا، ہرات سے مشہد مقدس (طوس) تک گورنر ہرات کا انتظام رہا، اور مشہد سے اصفہان (دارالسلطنت) تک دوسرا گورنر تعینات کیا گیا۔

اب ہم ایران کے ایک جدید جغرافیہ سے شاہ طہماسپ کے آئین مہمانداری کا وہ فرمان نقل کرتے ہیں جو گورنر ہرات کے نام موصول ہوا تھا۔ یہ گورنر صفویہ خاندان کا ایک شاہزادہ تھا۔ چنانچہ اس ہدایت کے مطابق اصفہان تک ہمایوں کا استقبال اور مہمانداری ہوتی رہی۔ فرمان کا مختصر ترجمہ حسب ذیل ہے جو ناظرین زمانہ کے لئے ایک قیمتی تحفہ ہے:

انتخاب از جغرافیۂ گنج دانش | (۱) اس عہد میں ہرات کا گورنر شاہزادہ محمد خاں شرف الدین اغلی تکلو تھا جس کو شاہ

فرزندِ ارجمند کے خطاب سے یاد کیا ہے۔

(۲) تمہاری واجب العرض فدیۂ کمال الدین شاہ قلی...... مورخہ ۱۲۔ ذی الحجہ ۹۴۹ھ (مارچ ۱۵۴۲ء) نظر اشرف سے گذری۔ جملہ مضامین اول سے اخیر تک واضح ہوئے۔ آپ نے تشریف آوریِ شاہ ہندوستان کی جو اطلاع دی ہے، میں نہیں کہہ سکتا ہوں کہ اس اطلاع سے مجھ کو کس درجہ مسرت ہوئی ہے۔

شاہ ہندوستان کو نام کے بعد جن شاہانہ الفاظ سے یاد کیا ہے وہ اصل الفاظ ملاحظہ فرمائیے:۔

"نواب کامیاب، سپہر رکاب، خورشید احتجاب، دُرِ دریائے سلطنت و اجلال، سرفراز جویبارِ ابہت و اقبال۔ شجرۂ طیبہ گلستان شوکت و عظمت، وغنچۂ ثمرۂ خلافت و نصفت، بادشاہ بزین و بحرین نیّرِ عالم تاب، سپہر کامرانی، بدرِ بلند قدر اوجِ خلافت و جہاں بانی، قدوہ و قبلہ سلاطین عدالت آئین، مہتر و بہتر خواقین و صاحب تمکین، شہریار عالی نسب، دارائے تاج و نگیں، بادشاہِ والا حسب فلک تمکیں، جہاں بان با اورنگ و تخت، صاحبقران، عالم اقبال و بخت، نورِ چشم سلاطینِ روزگار، تاج فرقِ خواقین نامدار، المؤید عند اللہ نصیر الدین محمد بادشاہ خلد اللہ تعالیٰ

مژدہ اے پیکِ صبا کز خبرِ مقدمِ دوست
خبرت راست بود، اے ہمہ جا محرمِ دوست
باشد امروز کہ در بزمِ وصالش گیرم
بنشینم بہ مرادِ دلِ خود ہمدمِ دوست

(۳) ہمایوں کی تشریف آوری کو غنیمت جاننا چاہیئے، انتظاماً　　ایں جانب نے بہ سلسلہ مہمان فرشتہ خصال، ولایت اسفرائن (متصل مشہد و مضافات نیشاپور) کو بھی تمہارے زیرِ انتظام رکھا ہے، لہٰذا اپنے وزیر اور داروغہ کو فوراً اسفرائن روانہ کرو کہ وہ سالانہ خراج (وجوہاتِ دیوانی) وصول کرے اور یہ رقم فوج اور دیگر ضروریات مہمانداری میں مطابق صراحتِ فرمان خرچ کی جائے۔ خبردار! حکم جہاں مطاع میں خلاف ورزی نہ ہو، اور مزید احکام حسبِ ذیل ہیں:۔

(۴) پانسو تجربہ کار اور سمجھدار اصحاب کو انتخاب کر کے ایک جماعت برائے استقبال تیار کرو۔ ان میں سے ہر ایک کو سواری کے لئے ایک گھوڑا (با ساز و یراق) اور باربرداری کے لئے ایک اونٹ دیا جائے۔ یہ منتخبہ جماعت سرحدِ

لہ فرمان شاہ طہماسپ ایران بنام گورنر ہرات متعلق انتظام مہمانداری ہمایوں شاہ ہندوستان، تعین منازل و قیام گاہ و اہتمام ماکول و مشروب و لباس وغیرہ۔ سے انتظام استقبال۔ منقول از جغرافیۂ ایران حکیم محمد تقی خاں موسومہ گنج دانش "مطبوعہ اصفہان ۱۳۰۵ھ۔ حالات چہار بلخ ہرات صفحہ ۳۵"

ایران سے شاہ ہم جاہ کا استقبال کرے گی۔ علاوہ بریں شاہی اصطبل (پایگاہ) سے تین راس گھوڑے، جن کے زین مطلا اور میناکار ہیں، حسب الحکم روانہ کئے گئے ہیں لیکن تم اپنے طویلہ خاصہ سے بھی دو خوش رنگ، خوبصورت قوی اور شائستہ گھوڑے انتخاب کرو۔ ان کے زین لاجوردی ہونگے، اور یہ پانچ راس صرف شاہ کی سواری کے لئے مخصوص ہیں۔ زین پوش زر دوز اور راسیں (عنان) زربفت کی ہونگی۔ ہر ایک گھوڑے کی خدمت کیلئے دو سائیس مقرر کئے جائیں

(۵) اسلحہ خانۂ شاہی سے ایک خنجر آبدار، جو شاہ بابا (بانیٔ خاندان صفویہ) انار اللہ برہانہ کی یادگار ہے، ایک مرصع شمشیر و کمر بند (ٹپکا طلائی) بھی روانہ کیا جاتا ہے، بطور شگون فتح و نصرت یہ اسلحہ شاہ کے زیب کمر ہونگے۔

(۶) پانسو جوڑے مخمل یزدی اور اطلس فرنگی کے کشتیوں میں سجا کر جداگانہ ارسال کئے گئے ہیں، ان میں سے ایک سو بیس[۱۴۰] جوڑے اعلیٰحضرت شاہ کے لئے مخصوص ہیں اور بقیہ امراء و ندماء کے لئے ہیں۔

(۷) مسند شاہی کے لئے ایک قالیچہ خورد اور تکیہ مخملی اور تین جوڑ بڑے قالین ایرانی دوازدہ ذرعی (۱۲ گز والے) خوشرنگ و خوبصورت ہیں، اور بارہ چادریں قرمزی، ابنفش، اور سفید رنگ کی قالین کے علاوہ ہیں

(۸) طعام روزمرہ، متعدد اقسام اور نہایت خوش ذائقہ ہونگے، اور نان سفید (تنوری روٹی) جو مکھن اور دودھ میں خمیر کرکے پکائی جائیگی۔ اس پر آزیانہ (سونف) اور خشخاش چھڑکی جائیگی۔ آنحضرت کے سامنے ہر وقت پیش کی جائیگی (یہ ایرانیوں کی مرغوب غذا ہے)

(۹) ہر منزل (فرودگاہ) پر موکب ہمایوں کی آمد سے قبل حسب ذیل کارخانوں کو مع سامان پہونچ جانا چاہیئے۔

(الف) بارگاہیں (خوابگاہ۔ بڑے خیمے) مسہریاں، منقش سفید چادریں۔ اطلس و مخمل کے چھوٹے شامیانے

ب) "آبدار خانہ" تشریف آوری پر سب سے پہلے شربت (برف و گلاب آمیختہ و عرق لیمو افشردہ) کی کشتیاں پیش کی جائینگی (گرمی کا موسم تھا۔ صراحیاں آسمانی برف سے چھلی جاتی تھیں)

شربت و آبنوشی کے بعد ہی سیب کا مربّہ (مشکانی و مشہدی) اور اس کے بعد پلیٹ[۵۱] میں ہندوانہ (تربوز) کی قاشیں سجائی جائیں گی۔ جب یہ کشتیاں ہٹائی جائیں تو حلوے کی تشتریاں اور اس کے بعد پالودہ (قند و نبات) کے جام نان ختائیاں (قند۔ گلاب۔ عنبر (شہد آمیز) پیش ہونگی۔ اور میوہ خوری کے بعد دستر خوان بچھایا جائیگا

(۱۰) دونوں وقت تورہ[۵۲] بندی کے خوان بہ تعداد پانسو پیش ہونگے

---

[۵۱] تذکرۂ صائب میں ہے کہ وہ اصفہان میں مقیم تھا کہ گلی میں ایک خوانچہ والے نے آواز لگائی سہ من قاش فردش دل صد پارہ خویم نخستے برد ہر کس اگر زر دہر کہ زمیشم + گرمی کا موسم تھا۔ صائب نے پیٹ بھر کر تربوز کھایا، اور بڑی قیمت دیکر یہ شعر خرید کر لیا۔ اور اقرار لے لیا کہ آج سے یہ شعر زبان پر نہ لانا۔

[۵۲] ایک تورہ پانچ یا سات کھانوں کا ہوتا ہے یہ چنگیز خاں کی ایجاد ہے اور اسکا سیاسی قانون بھی تورۂ چنگیزی کہلاتا ہے۔

(۱۱) گلاب و عنبر بقدر ضرورت صرف کیا جائے گا۔ اس میں ہرگز کمی نہ ہوگی۔
(۱۲) قازق (کاسک) کے سوار ہوں گے جن کی قیادت جعفر سلطان ماژندرانی کرے گا۔ یہ سوار شمار میں ڈیڑھ ہزار ہوں گے اور یہ پہلی استقبالی جمعیت ہوگی۔ اور تیسرے دن یہ دستے تبدیل کر دیئے جائیں گے، اور دوسری خوبصورت وردی والی فوج ان کی قائم مقام ہوگی۔ سرداروں کے گھوڑے عربی ہوں گے (ہیچ زینت سپاہی را بہتر از اسپ نیست) وردیاں رنگین اور صاف ستھری ہونگی۔
(۱۳) جب شاہ کی سواری منزل پر پہونچ جائیگی تو تمام بنام یہ آرائیش ہونگے۔ اور ان کا تعارف کرایا جائے گا۔
(۱۴) انتہائی ہوشیاری سے کام لیا جائے کہ ملازمانِ آنحضرت اور خدام ایران میں بدمزگی نہ پیدا ہو۔ اور معزز مہمان کے خلاف ایک لفظ بھی کسی کی زبان پر نہ آئے۔
(۱۵) ایرانی فوج منزل بہ منزل تمام خدمات انجام دیگی، اور قیام گاہ پر شاہی خیمہ کی حفاظت اُمرائے دولت کے سپرد ہوگی۔ اور وہ یہ سمجھ کر خدمت مفوضہ انجام دیں گے کہ ہم گویا اپنے آقا کی خدمت کر رہے ہیں۔
(۱۶) ملک محروسہ کی سرحدات کی تبدیلی سے اس ملک کا گورنر اہتمام مہمانداری کا ذمہ دار ہوگا۔ اور اب باورچی خانہ سے پندرہ سو (۱۵۰۰) خوان پیش ہوں گے۔ ہنگام پیشی طعام روزانہ ایک امیر منتظم باورچی خانہ ہوگا، اور سواری کے لئے روزانہ اب نو راس گھوڑے حاضر رہیں گے۔ فرمانِ عالی کے مطابق تعمیل کی جائے، اس میں سرمو فرق نہ ہو۔ مشہدِ مقدس پہونچکر آپ کا اہتمام و انتظام ختم ہو جائیگا۔
(۱۷) شاہی قافلہ کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا جائے گا؟ شاہ طہماسپ کے الفاظ ملاحظہ ہوں:—
"خاطر آں جماعت را کہ از گردشِ روزگار ناہموار قدرے غبار دارد۔ بہ نوعِ دلداری و غمخوارگی کہ دریں نوع اوقات لایق و خوش نماست مسرور گردانیدہ۔ ایں دستور بہ وقت منظور باشد تا بہ حضور برسند۔"
(۱۸) ہرات سے بارہ (۱۲) فرسنگ (۴۲ میل) پر رسم استقبال ادا ہوگی آقایان ہیماق (قبائلی جرگہ) سے ایک سردار بطور سر اول آگے ہوگا۔ اور فرزند عزیز (گورنر ہرات) تیس ہزار فوج سے استقبال کریں گے۔ اس تعداد میں کمی نہ ہونا چاہیئے۔ ایرانی سرداروں کے خیمے اور بارگاہیں خوب سجائی جائیں اور اصطبل بھی، ممکن ہے کہ یہ شاہ کی نظر سے گزر جائیں۔
(۱۹) استقبال و سلام کے بعد سب سے پہلے اینجانب کی طرف سے مہمان عزیز کو دعائیں پہونچا نا (شاہ طہماسپ بادشاہ بھی ہے۔ پیرزادہ بھی ہے اور ہمایوں سے عمر میں بڑا ہے) پھر سر نیاز جھکا کر اپنے جانب سے عرض کرنا کہ

بندگان شاہ کا ہرات میں تین یوم قیام ہونا چاہیئے، اور اپنی طرف سے قبولِ دعوت کا اظہار کرنا۔ شاہ ہند کے لشکر میں جس قدر خدم و حشم ہوں اُن کو خلعت فاخرہ، اطلس و کمخواب یزدی اور دارائے مشہدی کا پیش کرنا۔ شاگرد پیشہ کو فی نفر دو تومان (نقرئی سکہ) تبریزی بطریق بخشش ادا کرنا۔ کیمپ کی آرائش ایسی کرنا کہ مجلس ملوکانہ ثابت ہو۔

(۲۰) شاہ کے ہمراہ کس قدر فوج ہے، اس کی اسم نویسی روانہ کرو۔ ہرات کے بیت المال خزانہ سے پچیس ہزار تومان بیآمد کر کے مد مہانداری میں صرف کرنا۔ زمانۂ قیام میں اُمرا کے لڑکے مثل خدام کے ہر وقت کمربستہ رہیں گے۔ شاہ کی ذات کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ خدا کی طرف سے ہمارے لئے ایک قیمتی ہدیہ ہے۔ عیدگاہ یا کسی باغ میں شاہی خیمہ نصب ہوگا، جس کے لئے بہترین جگہ کا انتخاب کرنا۔ راستہ میں شاہ کی سواری کے ساتھ رہنا اور اوّل سے اخیر تک دلچسپ گفتگو جاری رہے۔

(۲۱) فرزند عزیز ارشد علی الصباح استقبال کو روانہ ہو جائے گا۔ سال گذشتہ میں تقریب نوروز پر جو سراپا (خلعت) اُس کو عنایت ہوا ہے پہن کر جانا چاہیئے۔ شہر کی حفاظت اولیاق تکلو کے سفید ریش (چودھری یا مکھیا) کے سپرد رہیگی۔ حتی الوسع شاہ کو گھوڑے سے اُترنا نہ چاہیئے، اور اگر اُتر آئیں تو تم رکاب کو بوسہ دے کر ہمراہ ہو جانا۔

(۲۲) تمہاری طرف سے جو دعوت ہوگی اُس میں تین سو خوان نعمت ہوں گے، جملہ ظروف طلائی، نقرئی اور چینی ہونگے، اور اُن کے سرپوش بھی طلائی و نقرئی ہونگے۔ بعد نمازِ ظہر و قریب عصر یہ خوان پیش کئے جائیں۔ داخلہ شہر پر علما بسواری اسپ استقبال کریں گے۔

(۲۲) فراغِ طعام کے بعد محفل طرب مرتب کی جائے گی۔ اور ہرات کے نامور اور ماہر فن مغنی شاہ کو گانا سنائیں گے۔ اس محفل میں رؤسائے شہر کو اپنی طرف سے دعوتی خطوط بھیج کر شریک کرنا۔

(۲۳) شنقار، باشہ، شاہین اور اعلیٰ قسم کے شکاری باز فراہم کر کے شاہ کے حضور میں نذر کرنا۔ مغل بادشاہ ان سے شکار کھیلتے ہیں۔

(۲۴) امرا کو حسب حیثیت خلعت پہنانا، یہ شاہوں کا قدیم دستور ہے، اور ہر خلعت کے ساتھ تین سو تومان کی ایک سر بمہر تھیلی ہوگی، اور ہر لشکری (سپاہی) کو فی نفر تین تومان انعام دینا۔

(۲۵) چوتھے دن (ہرات سے روانگی کے دن) تین ہزار خوان میوہ کے نذر کرنا، یہ علاوہ طعام خاصہ کے ہونگے۔

(۲۶) بزمانۂ قیام ہرات روزانہ چار باغ (ہرات کا شاہی باغ) کی سیر کرائی جائے، اور باغ کے ایک ایک خیابان (کیاری) کی پہلے سے قطع برید اور صفائی ہوگی۔

(۲۷) ہرات کے نامور مشاہیر (علما و شعرا وغیرہ) روزانہ شاہ کے حضور میں پیش ہوا کریں گے۔ شاعروں کو خوش سخن اور خوش طبع ہونا چاہیئے۔

(۲۸) چوتھے دن ہرات کا بڑا بازار (خیابان) اور گلی گلی کوچے آراستہ کئے جائیں گے، اور خیابان میں شہر کی رقاصائیں اور مغنیاں اپنے رقص و سرود کے کمالات شاہ کو دکھلائیں گی۔ جو باعث فرحت ہوگا۔ اول شہر کی آئینہ بندی کا ملاحظہ کرنا، اس کے بعد دست بستہ عرض کرکے شہر میں شاہانہ جلوس نکالنا، اور پھر شہر سے چار باغ لے جانا۔ وہاں حمام بھی گرم رہیں گے۔

(۲۹) ایک ایک دن کا روزنامچہ خوشنویس سے لکھوا کر اینجانب کے ملاحظہ کے لئے روانہ کرنا، اور ہرات تک اینجانب کے ضابطہ کے مطابق عملدرآمد کرنا۔

فرمان آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ شاہ طہماسپ کی ہدایات کے مطابق ہمایوں سیستان سے مشہد مقدس تک پہونچ گیا۔ عمال اور والیان ملک سرحد پر موجود ہوتے ہر صوبہ کا حاکم رکاب پکڑکر ساتھ ہو لیتا، ہر سوال کا جواب دیتا، اور جب سرحد ختم ہوتی تو رکاب کو بوسہ دیکر رخصت ہو جاتا، ہر منزل پر شاہانہ استقبال اور مہمانداری کی بہار قابل دید تھی۔ چنانچہ اسی شان و شکوہ سے ہمایوں اصفہان پہونچ گیا۔[1]

شاہ طہماسپ اور نصیر الدین ہمایوں

شاہ کج کلاہ ایران اور شاہ ہندوستان کی یہ تاریخی ملاقات ہے، آپ قیاس کرسکتے ہیں کہ جہاں شاہ صفی جانشین میزبان اور امیر تیمور صاحبقران کا پوتا مہمان ہو۔ اس ضیافت کی دھوم دھام کی کیا شان ہوگی؟ مورخین ایران نے جس قدر لکھا ہے اس کی سیکڑوں روایتیں لوگوں کو زبانی یاد ہیں اور صفحات تاریخ بھی مزین ہیں۔ ابتدائی ملاقاتیں بہت پر جوش ہوئیں اور شاہ طہماسپ نے ہمایوں کے غم غلط کرنے کا جو سامان مہیا کیا تھا وہ ہمیشہ یادگار رہیگا۔ ایوان شاہی میں رات کے کھانے کے بعد ارباب نشاط اپنا اپنا کمال دکھاتے تھے۔ صرف ایک واقعہ سناتا ہوں کہ پہلے دن کے جلسہ میں ساز پر یہ غزل گائی گئی:۔

ہمایوں، منزلے کاں خانہ را ماہے چنیں باشد
مبارک کشورے، کاں عرصہ را شاہے چنیں باشد

یہ مطلع حسب حال تھا اور ہمایوں منزل کی ترکیب ایسی واقع ہوئی تھی کہ اہل محفل پھڑک اٹھے۔ مگر جب اس غزل کا دوسرا شعر گایا گیا۔

ز رنج و راحتے گیتی مشو خنداں، مرنجاں دل
کہ آئین جہاں گاہے چناں، گاہے چنیں باشد

اس شعر کا مضمون حسرت انگیز تھا، ارباب محفل پر سکوت طاری ہوگیا، اور ہمایوں اس قدر متاثر ہوا کہ آنسو بہنے لگے۔ شاہ ایران بھی بے قرار ہوگیا، اور فوراً دوسری چیز کی حاضر ہوئی جس نے طرب انگیز نغمات سے پاس

[1] افسوس ہے کہ خاص دار السلطنت اصفہان کے انتظامات مورخ نے نہیں لکھے، وہاں کی بہار تو قابل دید ہوگی۔

کو امید و مسرت سے تبدیل کر دیا۔ اور شاہ طہماسپ نے تفریح کے دوسرے سامان بھی کئے تاکہ شاہ ہند گذشتہ واقعات کو بھول جائے۔

شکار جرگہ رقص و سرود کے علاوہ کئی بار ہمایوں کو شکار جرگہ کی بھی دعوت دی گئی جس میں بیرم خاں بھی شریک تھا۔ ایرانیوں میں قدیم زمانہ سے یہ شکار جاری ہے۔ اس کی شکل یہ ہے کہ وسیع جنگل میں سے پچاس ساٹھ کوس کا ایک رقبہ محدود کر دیا جاتا ہے، آمد و رفت کے لئے صرف دو دروازے مخصوص ہوتے ہیں، اور بقیہ جنگل کے شگاف اور پگڈنڈی راستوں پر شکاری بیٹھ جاتے ہیں جو جانوروں کو نکلنے نہیں دیتے ہیں، اور جس رقبہ میں شکار کھیلا جاتا ہے اس میں ہر قسم کے جانور جمع کر دیئے جاتے ہیں اور نہایت اطمینان سے شکار کیا جاتا ہے۔ آثار قدیمہ ایران میں اس شکار کے نقشے پتھروں پر کھینچے گئے ہیں، جس میں تخت رواں پر شاہ با نو بیگم مع مصاحبات کے دکھائی گئی ہیں، اور ناچ ہو رہا ہے شاہزادے گھوڑوں پر سوار ہیں، ہاتھ میں نیزہ ہے گلے میں تلوار حائل ہے اور جانوروں کے غول ہر طرف بدحواس پھر رہے ہیں۔

بھوپال کے جنگلوں میں جب اعلیٰحضرت فرمانروائے بھوپال خلد اللہ ملکہ بڑے پیمانہ پر شکار کا انتظام فرماتے ہیں تو چھوٹے پیمانہ پر شکار جرگہ کا نظارہ پیش نظر ہوتا ہے۔ حلال جانوروں (ہرن چیتل نیل گائے بارہ سنگھا وغیرہ) کے علاوہ اس ہانکہ (فراہمی جانوران) میں دو چار شیر تیندوے اور ریچھ ضرور ہوتے ہیں۔ معزز ترین مہمانوں کی آمد پر یہ شکارگاہیں اور ان کا اہتمام قابل دید ہوتا ہے۔

ہمایوں کا سفر اصفہان سے آردبیل تک اصفہان میں ہمایوں کے دربار میں علماء مجتہدین مذہب اور شعراء کے جمگھٹ رہتے تھے، اور مجتہد صاحب شیعہ مذہب کے فضائل اور خلافت کا فلسفہ سنایا کرتے تھے، اور مشہور ہے کہ ہمایوں تبدیل مذہب پر آمادہ ہو گیا تھا۔

آئینہ تاریخ نما مصنفہ[1] راجہ شیو پرشاد ستارۂ ہند کی روایت ہے کہ ہمایوں کو شیعہ مذہب اختیار کرنے کے بڑے بڑے لالچ دکھائے اور دھمکی بھی دی۔ ہمایوں کو یہ بات ناگوار گذری مگر یا کیجئے عالم مجبوری تھا۔ صاحب منتخب التواریخ[2] لکھتا ہے کہ ہمایوں علانیہ شیعہ ہو گیا تھا اور نماز بھی اسی طریق کی پڑھنے لگا تھا۔ راجہ صاحب لکھتے ہیں "مگر ہم از راہ تحقیق اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ شیخ صفی کی جسے شاہ صفی بھی کہتے ہیں (بانی دولت صفویہ) درگاہ کی زیارت کو اردبیل الد گیا تھا جو خلاف طریقہ پکے سنیوں کے ہے"۔

اردبیل کا مختصر جغرافیہ صوبہ آذربائجان کا سب سے مشہور شہر ہے۔ اور قبل فتوحات اسلام یہی مقام صدر حکومت تھا

---

[1] جلد اول مطبوعہ گورنمنٹ پریس الہ آباد ۱۸۷۴ء تذکرۂ ہمایوں

[2] منتخب التواریخ اس وقت میرے سامنے نہیں ہے، شائقین ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

زمین زرخیز ہے اور نہروں کی افراط ہے، اور کوہ سیلان کے قرب سے موسم سرد رہتا ہے۔ ابن حوقل عرب سیاح کے قول کے مطابق شہر زنجان سے آردبیل کا فاصلہ پانچ منزل اور خوئے سے آذر بائجان کا آخری شہر ۲۷ فرسنگ ہے۔ چنانچہ شاہ صفی کا مزار اسی جگہ ہے، اور ایرانی آردبیل کو مقدس جانتے ہیں۔ کسی مسلمان یا ارمنی عیسائی کی یہ طاقت نہیں ہے کہ حرم اردبیل میں شراب نوشی کر سکے۔ ضریح مبارک طلائی و نقرئی ہے اور مقبرہ کا دروازہ بھی نقرئی ہے۔ اور اطراف میں شاندار مساجد و مدارس ہیں۔ چھت میں طلائی قندیل آویزاں ہے۔[۱]

سفر ایران سے ہمایوں کی واپسی ہندوستان

ہمایوں اور اُس کے ہمراہی تقریباً چار سال تک اصفہان میں مقیم رہے۔ اور جب شاہی مہمانداری سے طبیعت سیر ہو گئی تو ہمایوں نے شاہ سے واپسی کی اجازت چاہی۔ شاہ طہماسپ نے چودہ ہزار قزلباش سوار ہمراہ کئے جن کا سپہ سالار شاہزادہ مراد میرزا تھا۔ اور ہمایوں نے وعدہ کیا کہ بعد فتح قندھار ملک محروسہ ایران میں ضم کر دیا جائے گا۔ چنانچہ ہمایوں شان و شکوہ سے محرم ۹۵۲ھ (مطابق مارچ ۱۵۴۵ء) میں اصفہان سے روانہ ہوا۔ سرحد کابل پر ہندال میرزا نے بھائی کا استقبال کیا۔ پانچ ماہ کے محاصرہ کے بعد میرزا عسکری جو قندھار میں حکومت کر رہا تھا ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اس مرتبہ عسکری قید کر دیا گیا۔ اور قندھار ایرانیوں کے سپرد ہوا۔ قندھار سے چل کر کابل پر قبضہ کیا۔ کامران مرزا نے اول مقابلہ کیا پھر سندھ فرار ہو گیا۔ کابل میں رعایا نے جشن منایا، ہر گھر میں عید ہو گئی، فتحیاب لشکر شہر میں داخل ہوا، چنانچہ ہمایوں عسکری میرزا کی عسکریت اور کامران مرزا کی کامرانی کا خاتمہ کر کے ہندوستان روانہ ہوا۔ اس مرتبہ کامران کمحول[۲] کیا گیا اور مکہ معظمہ روانہ ہوا۔ اور ۹۶۲ھ ۱۵۵۴ء میں شاہزادہ محمد اکبر اور بیگمات کو کابل سے ہمراہ لیکر داخل لاہور ہوا اور بغیر جنگ و جدال لاہور پر قبضہ ہو گیا۔

اب ہندوستان کی حالت ملاحظہ فرمائیے کہ افغانوں نے مختلف اقطاع ہند پر قبضہ کر لیا تھا اور ہندوستان پانچ حکومتوں پر تقسیم تھا۔

شیر شاہ کا بیٹا جلال خاں معروف بہ سلیم شاہ (ملقب اسلام شاہ) اپنے باپ کا جانشین ہو چکا تھا اور آئین حکمرانی میں بھی مرحوم کا مقلد تھا۔ نو سال حکومت کر کے سنہ ۹۶۲ھ میں فوت ہوا، اور اُس کا بیٹا فیروز شاہ نابالغ (دہ سالہ) تخت نشین کیا گیا۔ جس کو تین یوم کے بعد مبارز خاں (برادر شیر شاہ) ملقب بہ عادل شاہ نے قتل کرا دیا اور خود حکومت شروع کی۔ عدلی (دوسرا لقب ہے) نے ہیموں بقال (ڈھوسر) کو قلمدان وزارت سپرد کیا۔ اور راجہ بکرماجیت کا خطاب دیا۔ ہیموں پستہ قامت، کریہہ منظر اور بھینگا تھا۔ شیر شاہ کے عہد میں

---

[۱] مرآۃ البلدان ناصری از صفحہ ۱۶ تا ۱۷۔ مطبوعہ اصفہان سنہ ۱۲۹۴ھ

[۲] آنکھ میں جلتی ہوئی سلائی پھیر دی جاتی تھی جس سے بصارت جاتی رہتی تھی، اس کو کمحول کرنا کہتے ہیں، کامران کو یہ اخیر سزا دی گئی تھی۔

شاہی باورچی خانہ میں جنس کا ٹھیکیدار تھا، لیکن اپنی ذہانت اور فراست سے بہت جلد عدلی کا معتمد علیہ بن گیا۔ عہدِ اکبری میں (بمقام پانی پت) اپنے ہاتھی ہوسومہ ہوائی پر بیٹھا ہوا فوج کو لڑا رہا تھا کہ قضا کا تیر ہودج سے نکل کر ہیموں کی آنکھ میں ترازو ہو گیا۔ ایک ترک نے گرفتار کر کے بیرم خاں خانخاناں کے روبرو پیش کیا۔ بیرم نے اکبر سے عرض کیا کہ "پہلا شکار ہے اس کو اپنے ہاتھ سے قتل کیجئے، یہ بھی جہادِ اکبر ہے"۔ اکبر نے صرف اس قدر کہا کہ خان بابا! شکستہ حال قیدی پر؟" لہذا بیرم خاں نے ایک ہی ہاتھ میں سر اڑا دیا۔ اور یہ سر قلعہ بالا حصار (کابل) پر آویزاں کیا گیا۔ ہیموں حقِ نمک ادا کر کے فوت ہوا۔ ذات کا بقال تھا۔ مگر بقول ایک ظریف کے عقل کا ٹوکرا تھا۔ افغانوں کو متعدد شکستیں دے چکا تھا لیکن اکبر کے اقبال نے پہلی ہی مہم میں موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ یہ ایک جملۂ معترضہ تھا، خلاصہ یہ ہے کہ ہمایوں نہایت آسانی سے دلّی پر قابض ہو گیا۔ افغانوں کے مقابلہ میں رعایا نے ہمایوں کو غنیمت سمجھا اور ہندوستان اس کا مطیع ہو گیا۔ مگر یہ دوبارہ حکومت ہمایوں کو سزاوار نہ ہوئی، در دہ نو (دس مہینے) کے اندر فوت ہو گیا۔

ہمایوں کو نجوم اور علمِ ہیئت سے بہت شوق تھا، چنانچہ سبعہ سیاروں کے نام پر قلعہ کے اندر اُس نے سات محل بنوائے تھے اور اُن کے خواص کے مطابق ان محلات میں ہر روز دربار ہوتے تھے (مطابق اسمائے یوم ہفتہ)

شیر منڈل میں کتب خانہ تھا۔ شام کو زہرہ طلوع ہونے والا تھا، اُس کے دیکھنے کو منڈل کی چھت پر چڑھا اور مغرب کے وقت واپس ہوا۔ پہلے زینہ پر اذان کی آواز سنی، احتراماً اُسی جگہ بیٹھ گیا۔ جب اذان ختم ہوئی تو دوسرے زینے پر قدم رکھا۔ اتفاق سے عصا جو ہاتھ میں تھا وہ زینہ پر پھسل گیا۔ بہت کوشش کی مگر سنبھل نہ سکا جب زمین پر گرا تو تمام جسم کے جوڑ کھل گئے تھے، اور ضربِ شدید سے سارا پنڈا چور چور ہو گیا تھا۔ اور اس صدمہ سے غشی ایسی طاری ہوئی کہ پھر ہوش نہ آیا اور چوتھے دن ۱۰۔ ربیع الاول ۹۶۲ھ (جنوری ۱۵۵۵ء) کو پچاس سال کی عمر میں فوت ہوا۔ دلّی میں مقبرہ ہمایوں ہنوز زیارت گاہِ خلائق ہے۔ تاریخ وفات کا یہ قطعہ مشہور ہے:-

ہمایوں بادشہ، آں شاہ عادل — کہ فیضِ خاص او، بر عام اُفتاد
بنائے دولتش چوں یافت رفعت — اساسِ عمرش از انجام اُفتاد
چو خورشید جہاں تاب از بلندی — بہ پایانِ نمازِ شام اُفتاد
جہاں تاریک شد از چشمِ مردم — خلل در کارِ خاص و عام اُفتاد

قضا از بہر تاریخش رقم کرد
ہمایوں بادشاہ از بام اُفتاد
۹۶۲ھ

خودپرستی

(شاعر انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

یہ عشق ہے آسودہ نگاہی کے لئے
یہ راست روی ہے، کج کلاہی کیلئے
تمکو اپنے سے بڑھ کے رکھتا ہوں عزیز
لیکن اپنی ہی خیرخواہی کے لئے

اے تو کہ ہے تیغ خودپرستی کا غلاف
ہرچند ترا نور ہے صاف وشفاف
رقصِ پروانہ پر نہ اترا اے شمع
یہ اپنی ہی ذات کا ہے دراصل طواف

ہر یارِ جفاجو کو نبھایا میں نے
سمجھا ہر زخمِ دل کو پھاہا میں نے
لیکن اپنے سے بڑھ کے ابتک واللہ
دُنیا میں کسی کو نہیں چاہا میں نے

ہستی ہی نہیں عیش کی بستی کے سوا
عالم ہی نہیں، عالمِ ہستی کے سوا
قربانی وایثار وشہادت، واللہ
کچھ بھی نہیں ذوقِ خودپرستی کے سوا

جذباتِ اثرؔ

از خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی وزیرِ ریاست کشمیر

نہ کر ذکر، کیا فائدہ ہم نشیں
پلٹتے ہیں بیتے ہوئے دن کہیں ؟

چلیں انقلابوں کی جب آندھیاں
نہ عشرت کدے تھے نہ اُن کے مکیں

عزائم کی پرواز تیز، اور تیز
ستاروں کی جھکنے لگی ہے جبیں

کبھی اُن مقامات کی سیر کر
جہاں کم ہے ذرے سے مہرِ مبیں

اثرؔ حُسن بھی مست و سرشار ہو
یہاں تک تو ہو عشق کیف آفریں

نظیر — اکبر آبادی یا دہلوی؟

(از مسٹر سلیم جعفر)

کتنا مضحکہ خیز سوال ہے کہ (ولی محمد نظیر کا وطن) کونسا ہے؟ کون ہے جو ان کے نام کے جزو لاینفک "اکبر آبادی" سے ناواقف ہے؟ اگر وہ اکبر آباد (آگرہ) کے نہیں تو کہاں کے ہیں؟ لیکن سوال بے وجہ اور بے معنی نہیں۔ آرائے ادبا نے ایک صورت پیدا کر دی ہے جو اس کو عرصۂ وجود میں لانے کی ذمہ دار ہے۔

میر و غالب کا ذکر کرتے ہوئے جناب مولوی سید علی حیدر طباطبائی صاحب نظم مرحوم فرماتے ہیں۔

"غالب اور میر دونوں بزرگ اکبر آبادی ہیں۔ یعنی زبان آنے کی عمر دار السلطنۃ اکبر آباد میں گذری۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ۔ غالب مرحوم کو لکھتے ہیں" سابقاً مستقر الخلافۃ اکبر آباد از استقرارش سرگرم کبر و ناز بود ..... "اب اگر غالب کو دہلوی کہو تو میر کو لکھنوی کہنا ضرور ہے۔ مگر ان دونوں استادوں کی زبان یہ کہہ رہی ہے کہ نہ وہ دہلوی ہیں اور نہ یہ دہلوی ہیں ..... انصاف یہ ہے کہ یہ دونوں بزرگ زبان اکبر آباد کے لیے مایۂ فخر و ناز ہیں۔"

شرح دیوان اردوئے غالب صفحہ ۹۲ مطبوعہ انوار المطابع لکھنؤ۔

نظم مرحوم نے ان استادوں کو اسی شہر سے منسلک کیا ہے جہاں وہ پیدا ہوئے ہیں اور جہاں انھوں نے تربیت پائی۔ ان کا نظریہ ہے کہ ہر شخص اسی جگہ کی زبان لکھتا اور بولتا ہے جہاں اس کی عمر کا زمانہ تربیت گزرا ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں "زبان آنے کی عمر دار السلطنۃ اکبر آباد میں گذری ... یہ دونوں بزرگ اکبر آباد کے لئے مایہ فخر و ناز ہیں"۔ ان کی نظروں میں جائے پیدائش کی اہمیت بہت ہے۔ زبان کا اس واسطے خصوصیت سے ذکر کیا ہے کہ ہر ادیب کے مخلوقات فکر اس جگہ کے روزمرّہ کی آئینہ داری کرتے ہیں جہاں اس نے اوائل عمر میں زبان سیکھی۔ وہ زبان سے وطن دریافت کرنے کا کام لیتے ہیں۔

حال ہی میں جناب علی اختر صاحب۔ اختر کے حالات لکھتے ہوئے مدیر شاعر نے ارقام فرمایا ہے:-

"اس دور میں نظریۂ وطنیت بدلتا جا رہا ہے اور وطنی نسبت کی حکبندیوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے۔ ایک عالمگیر رشتہ کو دنیا محسوس کر رہی ہے۔ اس میں شک

نہیں کہ نظریہ وطنیت ہماری زندگی اور ہمارے تعلقات کو ایک محدود ماحول میں لاکر کھڑا کر دیتا ہے۔ لیکن یہ بھی تو ہونا چاہیئے کہ شمال سے تعلق ہو تو جنوب بتایا جائے اور جنوب کے پروردہ لوگوں کو شمال سے منسوب کیا جائے۔ یا تو وطنی نسبت قطعاً ہونی ہی نہیں چاہیئے اور اگر کوئی اسے روا رکھے تو وہ تاریخی اعتبار سے صحیح ہو۔ ہندوستان کے ادبی حلقوں نے مدتوں غالب کو دہلوی اور میر کو لکھنوی لکھا۔ لیکن اب اس تاریخی غلطی کا احساس ہوتا جا رہا ہے اور ان دونوں شعراء کو اکبرآبادی لکھا جانے لگا ہے۔۔۔ اس قسم کی غلطی اور بھی بہت سے شعرا کی وطنی نسبت میں ملے گی۔"

"علی اختر۔ اختر۔ کا وطن علی گڈھ ہے اور جائے پیدائش رام پور۔ ۱۳۱۲ھ میں ولادت ہوئی پرورش علیگڈھ میں ہوئی اور کچھ دن وہیں تعلیم پائی۔ اس کے بعد ننہال کے تعلق سے سینٹ جانس کالج آگرہ میں بھی زیر تعلیم رہے۔ گویا ان کا مامن و ملجا اور ان کی تعلیم گاہیں "یو۔ پی" ہی میں رہی ہیں۔ یعنی وہ پروان چڑھے اور یہیں سے ۱۹۱۱ء میں بہ سلسلۂ ملازمت حیدرآباد گئے۔"

شاعر۔ بابت ماہ مئی ۱۹۴۴ء صفحہ ۳

"میری معروضات کا مقصد صرف اتنا ہے کہ یا تو وطنی نسبت کو بالکل اڑا دیا جائے یا پھر صحت و دیانت سے کام لیا جائے۔۔۔۔ مگر نہ جانے کیوں مجھے غلط وطنی نسبت سے تکلیف ہوتی ہے۔"

شاعر۔ بابت ماہ ہائے جولائی۔ اگست ۱۹۴۴ء صفحہ ۶۵-۶۶

یہ اقتباس بھی اسکو ظاہر کرتے ہیں کہ جناب اعجاز صدیقی صاحب بھی جناب نظم مرحوم کے نظریئے سے ایک حد تک متفق ہیں ورنہ شاید اختر صاحب کو (علیگ) نہ لکھتے۔ اس نظریے کو تسلیم کرنے کے بعد وطن نظیر کا مسئلہ خود بہ خود معرض بحث میں آجاتا ہے۔ کیونکہ ان کے سوانح نگار کہتے ہیں۔

"نظیر۔ دہلی میں ۱۷۳۵ء مطابق ۱۱۴۸ھ پیدا ہوئے۔۔۔۔ ان کے پیدا ہونے کے بعد ہی دہلی مصیبتوں کی آماجگاہ بن گئی۔۔۔۔ اس لئے نظیر اپنی ماں اور نانی کے ساتھ ۲۲-۲۳ سال کی عمر میں دہلی سے نکلے اور اکبرآباد (آگرہ) میں جاکر دم لیا۔"

[عہ۔ صرف ایک تذکرے میں لکھا ہے کہ یہ آگرہ میں پیدا ہوئے۔ لیکن اس کی تردید بقیہ تمام تذکروں سے ہوتی ہے۔] ۔ دیوان نظیر اکبرآبادی۔ مرتبہ جناب فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی (جون ۱۹۴۲ء)

"نظیر اکبرآبادی جن کا نام ولی محمد تھا ۱۱۴۸ھ مطابق ۱۷۳۵ء میں بہ مقام دہلی پیدا ہوئے۔۔ جب ۱۷۵۷ء میں احمد شاہ ابدالی نے پڑھائی کی تو نظیر اپنی ماں اور نانی کو لے کر اکبرآباد چلے گئے۔"

اقتباسات بالا شاہد ہیں کہ نظیر دہلی میں پیدا ہوئے، وہیں تربیت پائی اور زبان سیکھی، اور اس لحاظ سے انھیں، اکبر آبادی نہیں، دہلوی کہنا چاہیئے۔ اگر اب ان دونوں شعرا (میر و غالب) کو اکبر آبادی لکھا جانے لگا ہے تو نظیر کی نسبت جو "تاریخی غلطی" آج تک چلی آتی ہے۔ وہ بھی کیوں نہ رفع کر دی جائے۔ اور انھیں کیوں نہ دہلوی لکھا جائے۔

جناب محمور نے نظیر کے وطن سے بحث نہیں کی۔ مگر انھیں اکبر آباد سے یہ کہہ کر وابستہ کیا ہے:۔

"نظیر کی زبان اکبر آبادی خالص قدیم زبان ہے اور یہی ٹکسالی اُردو ہے۔۔۔۔ نظیر کی زبان کو لکھنؤ دہلی کی زبان سے کوئی علاقہ نہیں اور وہ کسی ضرورت میں ان مقامات کی زبان کی دست نگر ہے۔" روح نظیر صفحہ ۲۲ از جناب سید محمد محمود رضوی محمور اکبر آبادی۔ جون ۱۹۲۲ء

اگر نظم مرحوم اور جناب اعجاز صاحب کا خیال درست ہے تو نظیر ضرور دہلوی ہیں اور جناب محمور صاحب کا نظریہ صحیح ہے جو محض زبان سے غرض رکھتا اور شاعر کے مقام پیدائش و تربیت کو نظر انداز کرتا ہے۔ تو بیشک نظیر کے کلام سے چند ایسے محاورات و الفاظ نکال کر بتائے جائیں جو اکبر آباد میں اس وقت بولے جاتے تھے۔ اور دہلوی اور لکھنوی زبانوں کا جزو نہ تھے۔ (محمور صاحب نے اس کی تکلیف گوارا نہیں فرمائی۔ کیونکہ جناب نظم مرحوم نے میر و غالب کو اکبرابادی ثابت کرنے کے لیے چند لفظ ایسے بتائے ہیں جو آگرہ سے مخصوص تھے۔ اور دہلوی و لکھنوی زبان میں نہیں پائے جاتے تھے۔ نظیر اکبر آبادی اور میر و غالب دہلوی کیونکہ یہ دونوں زبان دہلی کا اتباع کرتے تھے۔

میر کے حالات میں پروفیسر محمد حسین صاحب آزاد لکھتے ہیں۔

"آخر ان لوگوں [لکھنؤ کے چند عمائد و ارکین] نے گرانِ خاطر ہو کر کہا کہ حضرت! انوری، خاقانی کا کلام سمجھتے ہیں۔ آپ کا ارشاد کیوں نہ سمجھینگے۔ میر صاحب نے کہا کہ یہ درست ہے۔ مگر ان کی شرحیں، مصطلحات اور فرہنگیں موجود ہیں اور میرے کلام کے لیے فقط محاورہ اہل اُردو ہے یا جامع مسجد کی سیڑھیاں۔ اور اس سے آپ محروم۔" آبحیات صفحہ ۲۱۹ مطبوعہ رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور ۱۹۰۷ء

اس عبارت میں جامع مسجد کی سیڑھیاں" خاص طور سے قابل غور اور اس پر دال ہے کہ میر لکھنؤ میں رہتے مگر دہلی کی زبان لکھتے تھے۔ دہلوی ہونے یا بننے پر انھیں ناز تھا۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

اس زمانہ کا فیشن ہی یہ تھا۔ وہ ڈہچام کے زبردست شاعر مصحفی کو بھی اسی پر ناز تھا۔ چنانچہ انشا وغیرہ سے

چل گئی تو ایک حلقہ کہتے ہیں۔

بعضوں کا گماں ہے یہ کہ ہم اہل زباں ہیں دلّی نہیں دیکھی یہ زباں دان کہاں ہیں

اگرچہ اس وقت حوالہ دے کر تاسیس دعوے سے معذور ہوں مگر غالب بھی دہلی ہی کی زبان لکھتے تھے۔

اس وقت ہمارے سامنے دو معیار ہیں۔ ایک وطن جہاں شاعر پیدا ہوا، تربیت پائی اور زبان سیکھی دوسرا زبان یعنی اس کا کلام جس سے مراد یہ ہے کہ اپنا کلام وہ کس حلقہ کی زبان میں پیش کرتا ہے۔ اگر زبان سے قطع نظر کر کے بھی جائے پیدایش و تربیت کا لحاظ کیا جائے تو جس وجہ سے میر و غالب اکبرآبادی ہیں اسی باعث سے نظیر دہلوی ہیں اور اگر محض زبان پر فیصلہ ہے تو میر و غالب ہی کیا لکھنوی زبان کے معیاری مانے جانے سے پہلے کے جتنے شاعر ہیں سب کو دہلوی تسلیم کرنا چاہیئے کیونکہ وہ زبان دہلی کا تتبع کرتے تھے۔ لکھنؤ کی زبان ناسخ و آتش وغیرہ کے زمانے سے بحد بدل گئی ہے۔ پروفیسر آزاد مرحوم لکھتے ہیں:۔

"لکھنؤ دارالسلطنت ہوگیا اور اسکے ضمن میں زبان بھی دلّی کی اطاعت سے آزاد ہوگئی۔ اس آزادی کی ناسخ۔ آتش۔ ضمیر۔ خلیق وغیرہ اہل کمال نے بنیاد ڈالی اور انیس۔ دبیر۔ رند۔ خواجہ وزیر اور سرور نے خاتمہ کردیا۔" آب حیات۔ صفحہ ۶۶۔ مطبوعہ رفاہ عام اسٹیم پریس ۱۹۱۳ء

چونکہ نظیر کی عمر آب حیات کے ادوار سوم و چہارم پر محتوی ہے جو ڈاکٹر گریہم بیلی کے مطابق ۱۷۳۰ء سے ۱۸۳۰ء تک کا زمانہ ہے اور اس وقت تک زبان لکھنؤ کی ہستی تسلیم نہیں کی گئی تھی اور سب دہلی کے پیرو تھے۔ اس لیے نظیر اس زمرے سے خارج نہیں کئے جا سکتے۔ وہ بھی دہلوی ہیں اور کسی نہ کسی حد تک زبان دہلی کے ضرور پابند تھے۔ اور نہ تھے، ان کی شاعری سرگشتۂ خمار رسوم و قیود نہ تھی، تو عنصر زبان خارج از بحث ہو کر جائے پیدایش و تربیت ہی قول فیصل کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہے اور ان کے دہلوی ہونے میں شک نہیں رہتا اس صورت میں انھیں نظیر دہلوی لکھنا حقیقت یا صحت تاریخی سے قرین تر ہوگا۔ صرف ایک ہی طرح وہ اکبرآبادی سمجھے جا سکتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ مذکورہ نظریوں کو رد کر کے ایک نیا نظریہ قایم کیا جائے جو اُن کے اکبرابادی ہونے کو بے تردید ثابت کر دے۔ انھوں نے کنھیا جی کے جنم وغیرہ اور اکثر نظموں میں ایسی زبان برتی ہے جس میں ہندی کے لفظوں کی بھرمار ہے۔ اگر اس کو اس قسم کی تصنیف سمجھنا چاہیئے۔ جس میں مصنف کسی جماعت کے خیالات ادا کرنے کے لیے اسی کی زبان سے کام لیتا ہے۔ اس طرح کا کلام بہ لحاظ زبان اصل نہیں نقل ہوا کرتا ہے۔ اگر یہ رائے غلط ہے تو بتایا جائے کہ یہ کس دور کی اُردو ہے۔

یہ لیلا ہے اُس نند للن من موہن جسمت چھیّا کی
رکھ دھیان سنو ڈنڈوت کرو جے بولو کشن کنھیّا کی

اے پرت پال دیو دت مدہ مست کال بھیروں
تیری سرن گہی ہے کر تو نہال بھیروں
جب آسا استاد در ہوئی اور آئی گت سنتو کھ بھری
سب چین ہوئے آنند ہوئے بم شنکر بولو ہری ہری

یہ زبان نظیرؔ کو اکبر ابادی ثابت نہیں کر سکتی۔ ہاں اگر انہیں برج باشی ثابت کرنا ہو تو اس سے استدلال کیا جا سکتا ہے۔

جذبات سلیمؔ

(از حضرت تسلیم۔ ناطقی کانپوری)

شراب کھینچ کے گُل تر میں آئی جاتی ہے
بہار توڑی تو بہ پہ چھائی جاتی ہے

گرائی جاتی ہے چلمن اُٹھائی جاتی ہے
اک آگ ہے کہ لگائی بجھائی جاتی ہے

مرے اُٹھانے کو محفل لگائی جاتی ہے
مجھی کو میری کہانی سنائی جاتی ہے

دل و دماغ پہ بجلی گرائی جاتی ہے
کس اہتمام سے صورت دکھائی جاتی ہے

یہ میکدہ ہے متاعِ خرد تو کیا ناصح
بڑے بڑوں کی یہاں پارسائی جاتی ہے

میں اس ادائے توجہ پہ جان و دل سے نثار
مگر جو شان تغافل میں پائی جاتی ہے

دکھا رہے ہیں جھلک اپنی غنچہ و گل میں
قدم قدم پہ نظر آزمائی جاتی ہے

بہاؤ پہ ہے چلی جا رہی ہے کشتیِ دل
رواں دواں ہے مگر ڈگمگائی جاتی ہے

ہٹا دے شیشہ و ساغر ہٹا دے دیوانہ
نگاہ سے بھی تو ساقی پلائی جاتی ہے

کسی نظر سے حیات ابد بھی بخشیں گے
ابھی تو دوزخ و جنت بنائی جاتی ہے

بہت برا ہے محبت میں اس کا اجر سلیمؔ
ہنسی خوشی سے جو دولت لٹائی جاتی ہے

پجارن

(از جناب بابو رادھے رمن صاحب شوق اٹاوی)

ہے عجب وجد آفریں یہ شام کا رنگیں سماں   جنبشِ موجِ ہوا سے رقص میں ہیں بدلیاں
ابر کے پردے میں ہیں خورشید کی کرنیں نہاں   خاک میں ہے دفن گویا آتشِ شعلہ فشاں
تیرگی سی چھا رہی ہے ہر طرف اشجار پر
دھوپ کروٹ لے رہی ہے سبزۂ کہسار پر

جا بجا رنگِ شفق سے آسماں ہے لالہ فام   بادۂ گلرنگ سے لبریز ہے مینائے شام
تیرگی بزمِ فلک کا کر رہی ہے اہتمام   مہرِ تاباں بھی ہے سوئے غرب سرگرمِ خرام
دور پر تاریک ٹیلے دل کو سہمانے لگے
گیسوئے شب چہرۂ گیتی پہ لہرانے لگے

جا رہا ہے سامنے کہسار پر اک راستا   گھومتا، اک ناگ کی مانند بل کھاتا ہوا
شور سا گونجا ہوا ہے نغمۂ ناقوس کا   آ رہی ہے دور سے مندر کے گھنٹے کی صدا
جا رہی ہے اک پجارن ناز فرماتی ہوئی
لحن بن کر منظرِ کہسار پر چھاتی ہوئی

جسمِ نازک میں شرر انگیز ہے عہدِ شباب   چشمِ تر ہے ترجمانِ جذبۂ شوق و حجاب
عارضِ تاباں پہ زلفیں کھا رہی ہیں پیچ و تاب   یا خدا ناکردہ آیا ہے گہن میں ماہتاب
ہاتھ میں پھولوں کی تھالی لب پہ شیریں ارتعاش
جنبشِ مژگاں کی رو میں دامنِ گل پاش پاش

چمپئی ساری سے ہے اندامِ نازک پر بہار   ہے ابھی باقی جوانی میں لڑکپن کا خمار
یہ تبسم یہ ترنم یہ نگاہِ شرمسار   یہ ادائے ناز پرور یہ جوانی کا نکھار
گنگناتی جا رہی ہے اک عجب انداز میں
شوق ہے جلوہ فگن چشمِ فسوں پرداز میں

اے پجارن اے جہانِ حسن اے رنگیں نوا   درس تجھ سے لے رہا ہے شاعرِ نغمہ سرا
مظہرِ شانِ حقیقت ہیں ترے ناز و ادا   وقفِ زیبائش نہیں تیری بہارِ جاں فزا
شمعِ خود بینی سے تابندہ تری محفل نہیں
حسن ہے لیکن شرارِ حسن کا حاصل نہیں

رومین رولینڈ

(ازادارہ)

رومین رولینڈ فرانس کے مشہور و معروف اہل قلم و مصنف جنوری ۱۹۴۵ء میں داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ مگر سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس ادیب شہیر کا انتقال جرمن اسیری کی حالت میں ہوا۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کے بعد رولینڈ کا دنیا سے اٹھ جانا نہایت ہی المناک بات ہے۔ کیونکہ مغربی دنیا میں آپ ہندوستان کے سب سے بڑے اور پُرخلوص ترجمان تھے۔ رڈیارڈ کپلنگ کا قول یہ تھا کہ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب، لہذا دونوں کا باہم ملنا محال ہے" لیکن مرحوم رولینڈ نے مشرق و مغرب دونوں کو ایک کر دکھایا تھا۔ مرحوم پہلے مصنف تھے جنھوں نے مغربی دنیا کو مہاتما گاندھی کی حقیقت سے آشنا کیا تھا، اور وہ خود بھی مہاتما گاندھی کی طرح ہمیشہ جویائے حق رہتے تھے، جب اتحاد جماہیر شورائیہ روس کی ہر طرف خدمت کی جا رہی تھی، اس وقت مرحوم رولینڈ ہی نے روس کی طرف دوستی کا ہاتھ سب سے پہلے بڑھایا تھا۔ اور جب علمبرداران عوامیت (ڈیماکریسی) ہسپانیہ میں عوامیت کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑ چکے تھے، اس وقت مرحوم رولینڈ ہی جمہوری ہسپانیہ کی موافقت میں سب سے زیادہ بلند بانگ تھے۔ مرحوم امتیاز رنگ و نسل سے بالا و برتر تھے۔ وہ حق و انصاف کے دلدادہ اور حقیقت اور صداقت کے شیدا تھے۔ وہ دوسروں کے آلام و مصائب دیکھ کر خون کے آنسو روتے تھے۔ اور اپنے انھیں اعلیٰ و رفیع مطامح نظر کی وجہ سے مرحوم کو یہ دن دیکھنا پڑا کہ جرمنوں کے قید و بند میں اپنی زندگی کے آخری لمحات گذارے۔ گو رومین رولینڈ ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے، لیکن ان کا عالمگیر اخوت کا تخیل دنیا میں زندہ اور موجود ہے، اور یہ وہ چیز ہے جس کے دامن تک رد و بدل یا تغیر و تبدل کا ہاتھ نہیں پہونچ سکتا۔ شکر ہے کہ وہ اپنی زندگی ہی میں اپنے وطن فرانس کو اغیار و اجانب کی غلامی سے آزاد دیکھ گئے۔ مگر افسوس کہ ہندوستان جو مرحوم کو اتنا عزیز تھا ابھی تک پابند سلاسل چلا جا رہا ہے اور افسوس کہ ہندوستان کا ایک سچا شفیق، ایک سچا دوست اور ایک سچا سرپرست دنیا سے اٹھ گیا۔

رومین رولینڈ[1] ۲۹ جنوری ۱۸۶۶ء کو پرانی برگنڈی[2] کے مقام کلامیسی[3] میں پیدا ہوئے تھے۔ ایکولے نارمل[4] سپیریر میں تعلیم پائی تھی۔ پہلے وہ نارمل اسکول میں موسیقی کی تاریخ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ بعد ازاں وہ ۱۹۰۳ء میں ساربون[5] میں چلے گئے تھے۔ رولینڈ نے ایک تحقیقی مضمون "تھیٹر میں جدید گیتوں کے ماخذ"[6] کے موضوع پر لکھا تھا جس کی فرانسیسی اکیڈمی نے بجید

Ecole Normale ٤ Clamacey ٣ Burgundy ٢ Romain Rolland ١
Origines du Theatre lyrlque ٦ Sawoonne ٥ Supriouve
Modern

تعریف کی تھی۔ مرحوم کی عمر عزیز کا زیادہ حصہ تصنیف و تالیف کے شغل میں بسر ہوا تھا۔ اور انھوں نے متعدد ڈرامے، سوانح عمریاں اور تنقیدی کتب لکھی تھیں۔ مرحوم کی مشہور تصانیف حسب ذیل ہیں:۔

(۱) Le triomphe la Raion ۱۸۹۸ء (۲) Danton ۱۹۰۱ء (۳) Le 14 Juillet ۱۹۰۲ء (۴) Beethoven ۱۹۰۳ء (۵) Vie de Michel Ange ۱۹۰۷ء (۶) Musciens d'ajourd'hui ۱۹۰۸ء (۷) Le Theatre de la Revolution ۱۹۰۸ء (۸) Musiciens dautrefois ۱۹۰۵ء (۹) Heroique Humourico ۱۹۱۲ء وغیرہ وغیرہ

اگرچہ ۱۹۱۴ء کی جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی رولینڈ اپنی تصانیف کی بدولت معراج عزت و شہرت حاصل کر چکے تھے۔ لیکن ۲۲ ستمبر ۱۹۱۴ء کو جب جنگ کے متعلق ان کا ایک مضمون "ژورنال دی جینوا"[1] میں شائع ہوا تو تمام فرانس میں سنسنی پھیل گئی۔ ۱۹۱۵ء میں رولینڈ کو لٹریچر کا نوبل پرائز ملا۔ ۱۹۲۴ء میں مرحوم کی کتاب "مہاتما گاندھی" شائع ہوئی۔ جس میں مرحوم نے مہاتما جی سے اپنی زبردست عقیدت و ارادت کا اظہار کیا تھا۔ ۱۹۳۱ء میں ان کی کتاب Goethe of Beethoven شائع ہوئی تھی۔

اگرچہ جغرافیائی اعتبار سے فرانس ایک ہے لیکن ادبی لحاظ سے فرانس دو ہیں۔ ایک فرانس راسین[2] اور دوسرے ادیبوں کا قائل ہے۔ اور دوسرا فرانس روشو[3] کا مقلد ہے۔ رومین رولینڈ موخر الذکر طبقہ کے لوگوں میں تھے۔ مرحوم اس بلند تخیل کے علمبردار تھے، جس کے باعث فرانس دنیا کے بعض عظیم الشان انقلابات کا گہوارہ بن چکا ہے۔ رولینڈ کی ابتدائی مشاہیر پرستی کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ انقلاب فرانس کے علمبرداروں کے پرخلوص عقیدت مند تھے، جن کی جگہ مرحوم کی لافانی محبت میں ہمیشہ نمایاں رہی تھی۔ اور اس کے شاہد عادل مرحوم کے وہ ڈرامے ہیں، جو انہوں نے شروع میں لکھے تھے۔ انقلاب فرانس کے خیالات رولینڈ کے دل سے کبھی محو نہیں ہوئے تھے، اور جوں جوں وہ پختہ عمر کو پہونچتے گئے، وہ خیالات اور بھی زیادہ مضبوط ہوتے گئے تھے۔

ایک ادبی آرٹسٹ کی حیثیت سے رولینڈ کو انیسویں صدی کے روایتی فرانسیسی ادب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس پرانے ادب میں بے تصد اور مبہم فطرت نگاری کی جھلک زیادہ نمایاں تھی۔ انھوں نے راحت طلب ادبی حسن کاری سے منہ موڑ کر حیات انسانی کا عمیق مطالعہ کیا تھا۔ انہوں نے جزئیات میں جستجوئے حیات کی۔ اور وہ باتیں معلوم کرنے کی کوشش کی جو زندگی میں استقلال پیدا کر دیتی ہیں۔ وہ فطرت نگاری جو دامن حیات کو محض چھو کر گذر جاتی ہے، وہ نشیبی زمینوں

---

[1] Journal de Geneve [2] Racine [3] Rosseaxe

یا دلدلوں میں پیدا ہوتی ہے، اور اس سے کسی مستقل یا پائدار روشن دماغی کا اظہار نہیں ہوتا۔ رولینڈ ہمیشہ اس نور کے متلاشی رہتے تھے جو کبھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہوا اور جو رُوح کی عمیق ترین گہرائیوں سے جلوہ نما ہو۔ نزاکت خیال اور لطافت دانش وخرد، جو فرانسیسی دماغ کی خصوصیات ہیں، نہ رولینڈ کا مشغلہ تھیں اور نہ منزل مقصود۔ ادبی نزاکتوں اور نازک خیالیوں کو وہ اوائل عمر ہی میں خیرباد کہہ چکے تھے۔ جس چیز نے ان کے دل و دماغ کو ہمیشہ منور رکھا، وہ رُوح کی روانی تھی، خواہ وہ زندگی کے گوناگوں شعب میں ہو یا ادبی شاہکاروں میں۔ وہ گستاف فلابرٹ[۱] کی طرح کبھی ایسا نہیں کرتے تھے کہ دن بھر سر پکڑے بیٹھے رہیں، اور کسی اچھے اور مناسب لفظ کی تلاش میں دماغ کھپاتے رہیں، کیونکہ الفاظ خودبخود سرچشمۂ فطرت سے ابل کر ان کے ذہن میں آتے تھے۔ اور ہر لفظ پوری روحانی قوت اور شدید جوش کا حامل ہوتا تھا۔ رولینڈ کا ادبی رجحان فرانسیسی لٹریچر کی طرف اتنا نہیں تھا جتنا کہ روسی لٹریچر کی طرف تھا، کیونکہ روس کا ملک ہی وہ ملک اور روس کے مقاصد ہی وہ مقاصد تھے، جنھوں نے رولینڈ کی تخیل کو چمکا رکھا تھا، روس کی طرف سے مرحوم کے دل میں نہایت روشن توقعات تھیں، اور وہ ان کا ذکر بار بار کرنے سے کبھی نہیں گھبراتے تھے۔

ایک ادیب کی حیثیت سے رولینڈ کی پوزیشن مسلمہ اور عالمگیر ہے۔ مرحوم کے ناول جان کرسٹوفر[۲] کے بارے میں مشہور نقاد ایڈمنڈ گوسے[۳] نے یہ کہا تھا کہ "یہ بیسویں صدی کا بہترین ناول ہے"۔ اس ناول میں رولینڈ نے بٹلر[۴] اور ڈکنس[۵] کی طرح سوانح عمری کا ڈھنگ اختیار کیا ہے۔ اگرچہ اس میں ادبی نقطۂ نظر سے وہ ترتیب اور ربط موجود نہیں ہے۔ جو فرانسیسی ناولوں کا طرۂ امتیاز ہے مگر اس قسم کے ناولوں سے ادب جدید بہت زیادہ اثر پذیر ہوا ہے۔ اس ناول کا ہیرو کرسٹوفر اپنے آفرینندہ رولینڈ کی طرح ہر وقت اپنی خیالی دنیا میں مگن رہتا تھا۔ اس نے خلوص اور صداقت کی زندگی بسر کرنے کا عہد کر لیا تھا، حالانکہ یہ چیزیں اس کے ماحول میں مفقود تھیں۔ یہ ناول ہیرو کی خود نوشت سوانح عمری ہے، جس میں درپردہ عہد جدید کی اخلاقی و دماغی سرگرمیوں سے بحث کی گئی ہے۔ کرسٹوفر، مصنف کی طرح غریب الوطن ہو کر سوئزرلینڈ میں جا بسا تھا۔ جو بین الاقوامی جائے پناہ ہے۔ طاقت، عسکریت اور جنگ کے متعلق جن خیالات کا اظہار اس ناول میں کیا گیا ہے، وہ رولینڈ کے ذاتی خیالات ہیں۔ کرسٹوفر کی طرح اور بھی بہت سے جویائے حق وہاں موجود تھے، اور ان سب کی نشست ایک اطالوی خاتون گرزیہ[۶] کے یہاں رہتی تھی۔ اور یہی خاتون اپنے اوضاع و اطوار اور حسن اخلاق کی وجہ سے کرسٹوفر کے نزدیک ایک دیوی تھی۔ اس جماعت کا مقولہ "جرأت کے ساتھ فکر کرو" تھا۔ اور یہی مقولہ خود رولینڈ کا بھی تھا۔

"رُوح مسحور"[۷] رولینڈ کا ایک اور ضخیم ناول ہے۔ اگرچہ یہ ناول عیاریوں، مکاریوں، کوتاہیوں اور غلطیوں کا ایک غیر مربوط طومار ہے، مگر اس میں بھی شروع سے آخر تک تلاش حق کی رُوح جاری و ساری ہے۔ رولینڈ کے تمام ناول ضخیم و شاندار داستانیں

Edmund Gosse [۳] Jhon Christopher [۲] Gaster Floubert [۱]

The Soul Enchanted [۷] Grazia [۶] Dickens [۵] Butler [۴]

ہیں، اوران میں جو کردار مصنف نے پیش کئے ہیں، وہ نہایت شاندار اور بلند ہیں۔

مشہور و معروف روسی مصنف کاونٹ ٹولسٹائی[۱] کے خیالات و تعلیمات سے دنیا میں جن شخصوں نے کام لیا ہے، وہ صرف دو ہیں:- (۱) مہاتما گاندھی اور (۲) رومین رولینڈ۔ اور موخر الذکر نے تو ان خیالات سے اپنی تصانیف میں بھی استفادہ کیا ہے۔ ان کے ابتدائی ڈراموں میں ہر جگہ ٹولسٹائی کے افکار عالیہ پائے جاتے ہیں۔ اور ان کے ناول کا ہیرو کرسٹوفر بھی ٹولسٹائیت کے اصولوں پر عمل پیرا تھا۔ گاندھی جی کی طرح رولینڈ نے بھی صلح کل مسلک ٹولسٹائی ہی سے اختیار کیا ہے۔ اور عدم مزاحمت کا عقیدہ بھی ٹولسٹائی کا تحفہ ہے۔ مہاتما گاندھی کے بعد دنیا کی اخلاقی نشاۃ ثانیہ کے لئے رولینڈ ہی سب سے بڑی قوت ہے اور گاندھی جی کے بعد رولینڈ ہی خلوص و صداقت کا سب سے بڑا نمونہ ہے۔ زوئیگ[۲] جس نے رولینڈ کی سوانح عمری لکھی ہے۔ ان کی نسبت لکھتا ہے کہ:- "جو اخلاقی قوت رولینڈ کو حاصل ہے، اس کی ادب جدید میں کہیں نظیر نہیں ملتی۔ اور یہی اخلاقی قوت رولینڈ کی ذات میں ایک شاعر اور ایک روحانی پیشوا دونوں دوش بدوش موجود تھے کیا بہ حیثیت انسان اور کیا بہ حیثیت مصنف، رولینڈ اپنی نظیر آپ ہی تھے۔ اب رولینڈ ایک ادیب کے درجہ سے گذر کر ایک تاریخی شخصیت کے مقام تک پہونچ گئے تھے۔ اور ان کی زندگی نشوونما و ترقی انسانیت کی عالمگیر تاریخ کا ایک طاقتور و محرک ٹکڑا تھی۔

الغرض رومین رولینڈ محض ایک ناول نگار نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ تھے۔ اوائل عمر ہی میں جبکہ وہ سرسوتی دیوی[۳] کی پرستاری اور ناز برداری میں مصروف تھے، ان میں وہ زبردست اخلاقی قوت پیدا ہوگئی تھی، جو ان کی سب سے بڑی خوبی بھی اور سب سے بڑی خرابی بھی تھی۔ ان کا شباب کس طرح گذرا؟ حسینوں سے آنکھیں لڑانے میں نہیں، بلکہ بڑے بڑے اور مشاہیر لوگوں کے خواب دیکھتے ہوا گذرا۔ اور یہ وہ خواب تھا جس سے وہ کبھی بیدار نہ ہوئے۔ اپنی کتاب "عقل کی فتح"[۴] میں وہ اپنے ایک کردار کی زبانی کہلاتے ہیں:- "ہمارا فرض اولین بڑا ہونا اور دنیا میں بڑے پن کی حمایت کرنا ہے۔" اسی مقولہ کو رہنما بنا کر انھوں نے جہاد زندگی شروع کیا جس میں وہ ناکام رہے، مگر اس ناکامی میں بھی انہیں طرفہ کامیابی حاصل ہوئی۔

سنہ ۱۹۱۴ء کا زمانہ تھا، دنیا میں ہیجان اور بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ "جان کرسٹوفر" وجود میں آچکا تھا۔ اور یہ وہ زمانہ تھا کہ سرزمین فرانس رولینڈ جیسے شخص کے رہنے کے قابل نہیں رہی تھی وہ وطن سے دور سوئزرلینڈ کے شہر جنیوا میں بیٹھے ہوئے نہایت کوفت کے ساتھ یورپ کو دیکھ رہے تھے، جس کے سر پر خون آشامی کا بھوت سوار تھا۔ بڑے صاحب دماغ اہل قلم اور مصنفین فتح و ظفر کے خواب ہائے شیریں دیکھنے میں محو تھے۔ اور مدبرین اپنی عظیم ترین سیاسی غلطیوں پر قومیت کا پردہ ڈال رہے تھے۔ حتیٰ کہ اشتراکیت پسند طبقہ بھی عسکریت نواز ہوگیا تھا۔ اس وقت رولینڈ نے جو دے کو لکھا تھا:- "میں طاقت کے استعمال سے ہمیشہ متنفر رہا ہوں۔ میں جنگ سے بہت ڈرتا ہوں، اور ہمیشہ ڈرتا رہا ہوں" اپنے ایک جرمن

Triumph of Reason ۴ Muse ۳ Zewieg ۲ Count Tolstoy ۱

دوست بیٹمان کو انہوں نے ایک خط لکھا تھا جس میں جرمنی کی جارحانہ ذہنیت کو برا بھلا کہا گیا تھا اور اپنے اہل وطن کے نام جو خط لکھا اس میں تنگ دلانہ وطنیت کے عیوب بتائے گئے تھے۔ انہوں نے فرانسیسوں کو ہدایت کی کہ "وہ اپنے شہر کے حصار کو اس قدر بلند اور اس قدر عریض تعمیر کریں۔ کہ اس کی بلندیوں سے انصاف دشمنی اور قومی منافرت نظر نہ آسکے، اور اس غمر پناہ سکے علاوہ دنیا کی تمام آزاد اور اخوت نواز روحیں مجتمع ہوجائیں"۔ جب جرمن فوجیں فرانس کا دروازہ کھٹ کھٹا رہی تھیں، اس وقت یہ بے یار و مددگار روح رعد کی طرح گرجی اور اس جذبۂ قومیت پر لعنت بھیجی، جو دنیا کو ہلاکت اور بربادی کے غار میں دھکیل رہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود رولینڈ کے اہل وطن اس سے ناخوش ہوگئے اور اسے قومی غدار قرار دے دیا۔ اور وہ غریب الوطنی جواب تک رضاکارانہ تھی، اب اس پر سرکاری مُہر بھی لگ گئی۔ بایں ہمہ وہ ہراساں نہیں ہوئے۔ وہ دنیا کو بین الاقوامیت کا درس دیتے رہے، اور جنگ و جدال کا ذمہ دار امپیریلزم کو قرار دیا۔ اور اسی کے ساتھ انھوں نے آسٹریا، جرمنی اور زار روس کو بھی بہت کچھ برا بھلا کہا، اسی زمانہ میں انھوں نے سوئزرلینڈ کے ایک اخبار میں لکھا:-

"ہر ملک کا بدترین دشمن حدود ملک سے باہر نہیں بلکہ حدود کے اندر رہتا ہے۔ اور کسی کو بھی اس کے خلاف جہاد کرنے کی جرأت نہیں ہوتی ہے۔ یہ ایک عجیب الخلقت حیوان ہے جس کے سو سر ہیں، یہ خونخوار حیوان امپیریلزم ہے"۔

بعض لوگ رولینڈ کو جذبۂ قومیت کا دشمن خیال کرتے تھے، مگر ان کا یہ خیال غلط تھا۔ ان کا نظریۂ قومیت خود انھیں کے تخیل کی پیداوار تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ہر شخص اپنے وطن کی بہترین خدمت اس صورت میں انجام دے سکتا ہے جبکہ وہ تمام بنی نوع انسان کی خدمت کرے اور جنگ کے خلاف مسلسل اور بے تکان جہاد کرتا رہے۔

فرانسیسی نقاد آر۔ لالو نے لکھا ہے کہ بین الاقوامیت رولینڈ کے عقائد میں داخل تھی۔ مگر استعمال طاقت، عسکریت اور خواہش فتح کے وہ جانی دشمن تھے جب صلحنامۂ وارسائی لکھا گیا تو اس کا تمام دنیا نے خیر مقدم کیا اور اس کو دنیا کے آیندہ امن و سلامتی کا چارٹر قرار دیا، لیکن رولینڈ اس سے قطعی متاثر نہیں ہوئے تھے، کیونکہ معاہدہ مذکور کی بنیادیں قوت بہیمیہ اور تشدد پر قایم تھیں۔ وہ پہلے سمجھ گئے تھے، کہ یہ صلحنامہ بے نتیجہ ثابت ہوگا۔ اور انھوں نے فوراً فتویٰ دیا کہ "اسلحہ کے ذریعہ سے فتح حاصل کرنا بے لاگ انسانیت کی تخیل کے لئے تباہ کن ہے"۔ مگر اس وقت صدا طوطی کی سنتا کون تھا نقارخانہ میں؟ لہٰذا ان کی آواز صدا بصحرا بن کر رہ گئی۔ حالانکہ جو کچھ رولینڈ نے کہا تھا وہی پیش آیا۔

کیا بہ حیثیت انسان اور کیا بہ حیثیت مصنف وہ اپنی ذمہ داریوں کا زبردست احساس کرتے تھے۔ وہ اس بات کے قایل نہیں تھے، کہ ایک آرٹسٹ کو دنیا کے معاملات میں نہیں پڑنا چاہیئے کیونکہ ایسا کرنا مفکرین اور روشن خیال لوگوں کے لئے بمنزلہ جرم ہے۔ انھوں نے اپنے فرض کا احساس کیا جو بالکل صاف اور سیدھا تھا، یعنی وہ جینوا کی ایڈ کر اس سوسائٹی میں شامل ہوگئے۔ کیونکہ یہی ایک بین الاقوامی جماعت تھی جو اس وقت دنیا کے مشترکہ مفاد کا کام انجام دے

رہی تھی۔

۱۹۱۴ء سے رومین رولینڈ انسان کی بلند ترین تخیل یعنی آزادی، اخوت اور امن و صلح کے لئے مسلسل جہاد کرتے رہے تھے۔ اب وہ اپنی ذہنی تنہائیوں کے گوشۂ عافیت سے نکل کر حقایق کی ٹھوس چٹان پر مردانہ وار قدم جما کر کھڑے ہوگئے تھے۔ ان کی وہ مشہور اپیل جو انھوں نے پریسیڈنٹ ولسن سے کی تھی، آزادی انسانیت کی ایک لافانی وکالت خیال کی جاتی ہے۔ پریسیڈنٹ ولسن سے رولینڈ کی یہ استدعا کہ وہ اخوت انسانی کے مستقل قیام کے لئے لوگوں کی ایک پارلیمنٹ طلب کریں، ایک ایسی عظیم الشان تخیل ہے جس کے سامنے دنیا کے بڑے بڑے روحانیین و مفکرین کے تخیلات گرد ہو جاتے ہیں۔

۱۹۱۹ء میں رولینڈ نے "آزادی خیال کا اعلان" شائع کیا جس میں انھوں نے لکھا کہ :- "خیال کسی کا غلام نہیں ہے۔ بلکہ ہم خود اپنے خیالات کے غلام ہیں۔ خیالات کے سوا ہمارے کوئی آقا نہیں ہیں" آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ:- "آزادی فکر پیرس، روما یا ماسکو سے احکام حاصل نہیں کرتی"

لوگوں نے رولینڈ کو تخیل بازی اور صلح جوئی کا ملزم قرار دیا تھا، اور کہا تھا کہ یہی دونوں چیزیں ذمہ داری سے فرار کا دوسرا نام ہیں۔ رولینڈ نے اس الزام کی فوراً تردید کی اور کہا کہ وہ شخص ہرگز قابل معافی نہیں ہے جو آزادیٔ فکر کا نام لے کر اپنی ذمہ داریوں سے بھاگتا ہے۔ اپنے اس مشہور مناظرہ میں جو رولینڈ کا ہنری باربسے سے ہوا تھا، انھوں نے اس الزام کی سختی کے ساتھ تردید کر دی تھی۔

رولینڈ کی زندگی کا آخری باب اور بھی زیادہ شاندار ہے۔ کیونکہ یہی وہ زمانہ ہے کہ جب ان کی روح صحیح طور پر بیدار ہوئی، اور یہی وہ زمانہ ہے جبکہ ان کی روح روسی شعلوں سے از سر نو مشتعل ہوگئی تھی۔ روسی اشتراکیت رولینڈ کی دماغی دیانت او خلوص کے لئے ایک بڑا بیڑھا امتحان تھی۔ کیونکہ اپنی صوفیانہ افتاد طبع کے باعث وہ ہمیشہ آزادیٔ فکر کے علمبردار رہے تھے، لیکن لوگ روسی اشتراکیت کو اس کا دشمن خیال کرتے تھے۔ بعض اشتراکیت پسندوں سے انھوں نے کھلم کھلا کہہ دیا تھا کہ وہ روشن خیال اور صاحب فکر طبقہ کا یہ مقدس فرض سمجھتے ہیں کہ کسی ریاست کی غلامی کی مخالفت کریں۔ اور خود کو اس سے محفوظ رکھیں۔ بات یہ ہے کہ سوویٹ روس کے ابتدائی زمانہ میں دنیا یہ خیال کرتی تھی کہ وہ انفرادی آزادی کی قطعی دشمن ہے۔ اور یہ ایک ایسی بات تھی جسے برنارڈ رسل جیسا دیانتدار اور غیر جانبدار مفکر بھی نظر انداز نہ کرسکا تھا۔ لیکن رولینڈ کے نزدیک یہ معاملہ دوسری نوعیت رکھتا تھا۔ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کو سوویٹ روس میں اپنی زندگی کی دیرینہ اور عزیز ترین تمنائیں پوری ہونے کے مواقع حاصل ہوں گے۔ اسی لئے انھوں نے سوویٹ روس کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ بایں ہمہ رولینڈ کو اس بات سے انکار نہیں تھا

کہ سوویٹ میں لوگوں کی انفرادی آزادی کو کسی قدر دبایا جاتا ہے، پھر بھی وہ اپنے مختلف مضامین، سپاسناموں اور اپیلوں میں روسیوں کو مبارک باد دیتے تھے۔ کیونکہ وہ ان کی سماجی سختیوں کو ایک عارضی اور چند روزہ برائی خیال کرتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ آگے چل کر یہ برائی خود بہ خود رفع ہو جائے گی، اور انسان کے لئے مستقل خیر ہی خیر باقی رہ جائے گی۔ رولینڈ کے نزدیک سوویٹ روس کا تجربہ تشدد و استبداد اور عدم مساوات کے خلاف ایک مذہبی جہاد تھا جب سوویٹ روس کی سال گرہ کے موقع پر رولینڈ نے مبارک باد کا پیغام ارسال کیا تو یونانی بالونٹ اور دوسرے جلاوطن روسیوں کو بہت شاق گذرا، کیونکہ ان کے نزدیک رولینڈ ایک ان تھک جویائے حق اور آزادیٔ فکر کا سرگرم علمبردار تھا۔ رولینڈ نے ان روسیوں کو جوابی خط لکھا جس میں اس امر پر اظہار افسوس کیا کہ وہ اپنے وطن عزیز سے محروم ہو گئے ہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی نصیحت کی کہ وہ رنج و غم کو دل میں جگہ نہ دیں۔ کیونکہ عالم انسانیت کی تمام اُمیدیں صرف سوویٹ روس سے وابستہ ہیں۔ "یہ اُمید ہے۔ بد قسمت بنی نوع انسان کے مستقبل کی اُمید۔"

ہندوستان پر بھی رومین رولینڈ کا زبردست احسان ہے جس کے بارگراں سے وہ سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ رولینڈ ان معدودے چند اہل مغرب میں سے تھے، جنھوں نے ہندوستان کی ثقافت (کلچر) کو نہ صرف سمجھا اور اس کی تعریف کی۔ بلکہ دنیا کے دوسرے لوگوں کو بھی سمجھایا۔ رولینڈ اپنی جوانی کے زمانہ میں کہا کرتے تھے کہ "بڑے لوگوں کی حمایت کرو۔" چنانچہ انھوں نے ہندوستان کے بڑے اور مشاہیر فرزندوں کی نہایت جوش و خروش سے تائید و حمایت کی۔ اور اپنا روحانی عزیز سمجھا۔ سوامی رام کرشن، سوامی دیکانند، گاندھی جی، اور ابندرا ناتھ اور ڈاکٹر ٹیگور وغیرہ ہندوستان کی عظیم ہستیاں تھیں اور ہیں، جو ہندوستان کی لافانی روحیں ہیں۔ ہندوستان کی تصوف مآب سرزمین کے ان عظیم الشان فرزندوں کو کسی مغربی نے اس طرح نہیں سمجھا تھا جیسے رولینڈ نے اور نہ کسی مغربی نے دنیا کے سامنے ہندوستان کی زندگی اور اس کے فلسفہ و حکمت کی اس طرح ترجمانی کی تھی جیسے رولینڈ نے کی تھی۔ مہاتما گاندھی میں رولینڈ نے روح عمل کا مجسمہ دیکھا اور رام کرشن کو انھوں نے پیکر دیانت پایا تھا۔ موخرالذکر کی شان میں انھوں نے "ہمارے یسوع مسیح کا برادر خورد" اور "عالمگیر روحانیت" کے الفاظ استعمال کئے تھے۔ اور دیکانند جی رولینڈ کی نظروں میں "سب سے زیادہ روشن دماغ، سب سے زیادہ قوی الاثر، اور ہندوستان جدید کے مذاہب عظیم کے لئے سب سے بڑے اور قابل فخر ہستی تھے۔" اگر بنگال کے مسیح رام کرشن تھے تو اس کے سینٹ پال رولینڈ تھے۔

مہاتما گاندھی کے بارہ میں رومین رولینڈ کا قول یہ تھا:-

"یہ وہ شخص ہے جس نے تیس کروڑ انسانوں کو حرکت دے کر میدان عمل میں کھڑا کر دیا ہے، جس نے سلطنت برطانیہ کی بنیادیں ہلا دی ہیں، اور جس نے سیاسیات انسانی میں، تقریباً دو ہزار سال کے بعد، نہایت زبردست اخلاقی تحریک کا افتتاح کیا ہے۔"

گاندھی جی سے رومین رولینڈ کو ایک روحانی نسبت تھی، کیونکہ ان دونوں کے روحانی بزرگ کاونٹ ٹولسٹائی ہیں۔ دونوں کا عدم تشدد اور عدم مزاحمت پر پختہ ایمان تھا۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ ع

"بنی آدم اعضائے یک دیگراند"

اور گاندھی جی فرماتے ہیں کہ:۔ "تمام بشر ایک ہیں"۔ اسی طرح رومین رولینڈ نے کہا تھا۔ کہ:۔

"روح مجرد کے نزدیک کوئی مشرق ہے نہ مغرب۔ یہ چیزیں تو روح کے لئے بمنزلہ ساز و نوا کے ہیں۔ تمام دنیا روح کا گھر ہے"۔

رومین رولینڈ نے یہیں بس نہیں کیا۔ ان کی تصنیف "میں آرام نہ لونگا" کا نام ہی گویا ان کی کردار کا خلاصہ ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے مجملاً اپنی روحانی آپ بیتی بیان کی ہے۔ اس میں انھوں نے ان بیشمار خطوط، مضامین، اور اپیلوں کا خلاصہ دیا ہے جو وہ وقتاً فوقتاً لکھتے رہے تھے۔ اور جنھیں ان کی روحانی جد و جہد کے بے ضرر ہتھیار سمجھنا چاہیئے۔ اس کتاب میں رومین رولینڈ بے پردہ اور اپنی عریاں جلالت کے ساتھ نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۹۱۴ء سے تا دم آخر، آزادی، اخوت اور امن و صلح کے لئے مسلسل اور بے تکان جہاد کرتے رہے تھے۔ نظریہ و عمل، تخیل و تکمیل کا یک جائی اجتماع، اتنا کسی شخص واحد میں نہیں دیکھا گیا ہوگا، جتنا رولینڈ میں تھا۔ وہ ایک طرف آرٹسٹ تھے تو دوسری طرف صدر روحانیان، اگر ایک طرف تخیل کار تھے تو دوسری طرف حقیقت آشنا بھی تھے۔ یورپین تہذیب و تمدن کے قصر رفیع کو روبا انہدام دیکھ کر رولینڈ کا دل کڑھتا تھا۔ انھوں نے تمام دنیا کو آگاہ کردیا تھا کہ اگر مستقل امن و سلامتی کا نظام قائم کرنا مقصود ہے تو قومیت کے تحدیدی قیود کو توڑ ڈالا جائے۔ روح کو ہلاک کرنے والے انڈسٹریلزم اور تیزی کے ساتھ زندگی کو مشینی سانچوں میں ڈھالنے کے عمل کو روکا جائے۔ مستقبل کی جملہ تنظیمات کا سنگ بنیاد خلوص و دیانتداری پر رکھا جائے۔ اور امن و صلح کو جملہ سیاسی خواہشات کی روح بنایا جائے۔

"میں نے اپنی تمام زندگی کو مصالحت و مفاہمت انسانی کے لئے وقف کردیا ہے"۔

رومین رولینڈ نے پہلے اقوام مغربی میں اور بعد ازاں مشرق و مغرب میں یک جہتی ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ الغرض رولینڈ کی زندگی اور ان کا اسوۂ حسنہ ہم سب کے لئے قابل تقلید ہے۔

رباعیات

یوں صبح ہوئی شام جوانی میری
دم بھر نہ رکی اشک فشانی میری
اے شمع یقیں مان کہ تیری ہی طرح
جلنے کے لئے تھی زندگانی میری

تفریق شب و روز ہی بیجا اے دوست
امروز کوئی شئے ہے نہ فردا اے دوست
آمد کے لئے وقت کی تخصیص نہ کر
دنیا سے الگ ہے دل کی دنیا اے دوست

"قصرِ زرنگار"

(از جناب شمیم کرہانی)

نگاہِ شوق میں فضائے گلستاں لئے ہوئے
ضمیرِ خلق میں بنائے کہکشاں لئے ہوئے
نئی زمین پہ نیا اک آسماں لئے ہوئے
نہادِ غم پہ رکھ رہے ہیں طرحِ خوشگوار ہم
بنا رہے ہیں زندگی کا قصرِ زرنگار ہم

بنا رہے ہیں لالہ زار دشت گیر و دار کو
لہو کا شوخ رنگ دے رہے ہیں کارزار کو
کہاں ہم ایسے منچلے ملیں گے روزگار کو
کئے ہوئے ہیں جان و دل ہنسی خوشی نثار ہم
بنا رہے ہیں زندگی کا قصرِ زرنگار ہم

ارادے حوصلہ شکن ہیں عہدِ نحس و شوم کے
خدنگ و سنگ پھینکتا ہے وقت جھوم جھوم کے
مگر جبینِ شاہدِ عمل کو چوم چوم کے
دل و جگر پہ مسکرا کے روکتے ہیں وار ہم
بنا رہے ہیں زندگی کا قصرِ زرنگار ہم

ہر ایک باغ دشت ہے، ہر ایک گھر اجاڑ ہے
ہر ایک شب طویل ہے، ہر ایک دن پہاڑ ہے
زمیں سے تا بہ آسماں، نہ چھاؤں ہے نہ آڑ ہے
مگر بہ فیض ولولہ ہیں آپ اک حصار ہم
بنا رہے ہیں زندگی کا قصرِ زرنگار ہم

حیات کو شرار پر تپا رہی ہے زندگی
ہری ہری جوانیاں جلا رہی ہے زندگی
ستارے توڑ توڑ کر لٹا رہی ہے زندگی
بنے ہوئے ہیں جشن قتل گاہ کی بہار ہم
بنا رہے ہیں زندگی کا قصرِ زندنگار ہم

چھپائے جسم، جنگلوں سے چھال کاٹ کاٹ کے
مٹائی بھوک، پیٹ، پتھروں سے پاٹ پاٹ کے
بجھائی پیاس دل کا خوں زباں سے چاٹ چاٹ کے
یہ مانتے نہیں جہادِ زندگی میں ہار ہم
بنا رہے ہیں زندگی کا قصرِ زرنگار ہم

بھری ہوئی ہیں جاں گداز پتھروں سے جھولیاں
ادھر سے تیر چل رہے ہیں اُس طرف سے گولیاں
حیات کے لہو سے کھیلی جا رہی ہیں ہولیاں
مگر لئے ہوئے دلوں میں عزم پائدار ہم
بنا رہے ہیں زندگی کا قصرِ زرنگار ہم

کڑک رہا ہے ظلم، تیغِ جانستاں لئے ہوئے
شرر فشاں ہے رعد ابرِ خوں فشاں لئے ہوئے
یہ بجلیوں میں زندگی کا آشیاں لئے ہوئے
سجا رہے ہیں گلشنِ حیات کا نگار ہم
بنا رہے ہیں زندگی کا قصرِ زرنگار ہم

زمیں ڈگمگا رہی ہے، زلزلوں کے زور سے
پہاڑ تھرتھرا رہے ہیں آندھیوں کے شور سے
دھواں سا اٹھ رہا ہے زندگی کے پور پور سے
الجھ الجھ کے کھینچتے ہیں سانس بار بار
بنا رہے ہیں زندگی کا قصرِ زرنگار

نہ امن کی حیات ہے، نہ آشتی کا دین ہے
دھویں کا آسمان ہے، غبار کی زمین ہے
ہزار ہیں رکاوٹیں، مگر ہمیں یقین ہے
کہ نو عروسِ مدعا سے ہوں گے ہمکنار ہم
بنا رہے ہیں زندگی کا قصرِ زرنگار ہم

آئینہ خانہ

(از منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی)

بخدا جتنی صفائی ہے مرے سینے میں
نہ ہے شبنم میں نہ گوہر میں نہ آئینے میں

کچھ اس انداز سے پڑتا ہے جبیں کا پرتو
حرفِ قسمت کے نمودار ہیں آئینے میں

کیا سے کیا کر نہ دیا آپ نے آئینے کو
کیا سے کیا ہو گئے آپ خود آئینے میں

کس قدر حسن کے اسرار میں گہرائی ہے
دیکھیے اور ذرا ڈوب کے آئینے میں

دسترس آپ تک اس شکل سے حاصل ہے مجھے
آئینہ ہاتھ میں ہے آپ ہیں آئینے میں

کیجیے شوق سے آرائشِ گیسوئے جمال
نہ پڑے بال مگر ایک بھی آئینے میں

آپ کے ہاتھ میں آیا ہے تو جاگا ہے نصیب
آب آ جائے گی اب اور بھی آئینے میں

پاس رہ کر تو دکھاتے نہیں صورت اپنی
نظر آتے ہیں مگر دور تک آئینے میں

ایک تصویر سے دونوں کو سجا رکھا ہے
میرے دل میں ہیں ادھر اور ادھر آئینے میں

دیکھیے شکل کوئی اور نہ پیدا ہو جائے
دیکھیے منہ نہ کسی دوسرے آئینے میں

آئینہ آپ سے معیار ہے آئینے کا
آئینہ آپ میں ہے آپ ہیں آئینے میں

کیوں نہیں جوہرِ کامل کا ابھی تک حامل
شکل کوئی بھی ٹھہرتی نہیں آئینے میں

دم بخود صورتِ آئینہ منور ہوں میں
سانس لینے سے پڑے بال نہ آئینے میں

غزل

(از جناب راج بلدیو راج)

وقت آگیا کہ حسنِ بہاراں سے کھیلئے
کھا کر فریبِ رنگِ گلستاں سے کھیلئے

آسودگی ہی مقصدِ ہستی نہیں کوئی
پھولوں سے بچکے خارِ بیاباں سے کھیلئے

غم کی گھٹاؤں سے ہے دھواں دھار زندگی
آنسو بہا کے گوشۂ داماں سے کھیلئے

تاچند لطفِ عہدِ گذشتہ کو روئیے
تاچند یادِ خوابِ گریزاں سے کھیلئے

انجامِ ہر بہار کا جب ہے غمِ بہار
کس موسمِ بہار بداماں سے کھیلئے

بازی گہِ حیات میں جینے کے واسطے
مقصود کھیل ہی کسی عنواں سے کھیلئے

گلباریوں میں لاکھ بہاریں خزاں ہوئیں
امسال میرے چاکِ گریباں سے کھیلئے

انجامِ انفعال ہے اس کا خدا گواہ
یوں کھیلنے کو غیرتِ انساں سے کھیلئے

رقص و سرود و جام و صراحی کو چھوڑ کر
ہمت پڑے تو گردشِ دوراں سے کھیلئے

کشتی کو دے کے ساحلِ اُمید کا فریب
موجوں سے کھیلئے کبھی طوفاں سے کھیلئے

ہیں راج چودھویں کی بہاریں شباب پر
اُس دلنواز دشمنِ ایماں سے کھیلئے

بنیادی افسانے

(از مسٹر سلطان حیدر جوش ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر یو-پی)

مغربی دنیا اصلی وطبع زاد افسانے ۳۶ سات سمجھتی ہو، مگر میں تو یہاں بھی وحدانیت کا قائل ہوں، میری نگاہ میں اصلی وطبع زاد افسانہ صرف ایک ہے اور وہ "افسانۂ کائنات" ہے۔ اس افسانے کی تصنیف سے پیشتر، یا سرشٹی کی لیلا رچائے جانے سے پہلے کیا تھا؟

حافظ شیرازی تو اس سوال سے گریز کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

حدیث از مطرب و مے گو، و راز دہر کمتر جو! | کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معما را

گروید مقدس (رگ وید- ×: ۱۲۹) جواب دیتا ہے کہ:-

"نہ ہستی تھی نہ نیستی- نہ جولانئ باد نہ فلک، پھر کیا بھرا تھا کیا چھپا تھا- کیا ان تھاہ پانی ہی پانی تھا؟ نہ فنا تھی نہ بقا نہ سورج تھا کہ دن اور رات کو جدا کرتا، صرف وہ تھا، قایم بالذات- اس کے سوا کچھ نہ تھا- سب سے پہلے تاریکی در تاریکی، وہ ناقابل فہم، کُل پوشیدہ تھا"

مقدس وید کے ارشاد پر مجھے غالب بادہ خوار کا یہ شعر یاد آجاتا ہے:-

نہ تھا کچھ تو خدا تھا اور نہ ہوتا تو خدا ہوتا | ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا؟

اس افسانے کا آغاز نارائن کی ناف والے کنول کے پھول پر برہما کے برآمد ہونے سے سمجھا جائے۔ یا- انسان کے اولین جوڑے یاما اور یامی کے اتصال سے- (یا- پھر رودر کے قالب اور امبکا کے روپ سے سلسلۂ ازدواج قایم ہونے سے) کچھ بھی ہو اس لیلا کو رچے ہوئے لکھوکھا برس گذر چکے تھے۔

برہما کے دورِ تخلیق کا جزو اول، یعنی- چار ہزار آٹھ سو برس والا کرتا جگ بیت چکا تھا- وہ ماحول اولین جس کی روح رواں سفید رنگ تھا اور جس میں "کسے را با کسے کارے نہ باشد" کا مکمل بہشتی لطف تھا، باقی نہ تھی- وہ عالم نہ تھا کہ نہ عبادت کی حاجت ہو، نہ خدمت و محنت کی تکلیف، نہ مالدار ہو نہ مفلس، نہ دیتا ہوں نہ راکشس نہ خرید ہو نہ فروخت، بلکہ ہر فرد بشر محض اپنی قوت ارادی سے جو چاہے مہیا کرے،

یہی نہیں، تین ہزار چھ سو برس والا تریتا جگ بھی نکل گیا تھا جس میں روح کائنات سرخ تھی اور حصول مقصد کے لئے کوشش شروع ہو چکی تھی، نیکی پہلے جگ سے ایک چوتھائی کم ہو چکی تھی اور عبادت و قربانی رونما ہو چکے تھے۔

غالباً تیسرا دواپر اجگ بھی جس کی مدت دو ہزار چار سو برس کی تھی اور جس کی رُوح زرد تھی، بیماری اور مصیبت کو وجود میں لاتا اور دھرم کو ادھیا مار گذر گیا تھا۔ سچ گھٹنے اور پاپ بڑھنے لگا تھا اور وید مقدس بھی چار حصوں میں منقسم ہو کر، جاننے والوں کے مبلغ علم کے اعتبار سے، دویدی۔ تر ویدی اور چترویدی طبقے بنا چکا تھا۔

شاید کل جُگ۔ یا موجودہ دَور ہو جس کی رُوحِ رواں سیاہ ہے جس میں پاپ کا سمندر ڈبوئے دیتا ہے، مخلوقات ضعیف ہو چکی ہے، عبادت کا نتیجہ برعکس ہوتا ہے، اور نیکی فقط چوتھائی رہ گئی ہے۔ خیریت ہے کہ اس جُگ کی عمر ایک ہزار دو سو برس ہی کی ہے۔ گویا، افسانۂ حیات ان چار جُگ کے بارہ ہزار برس گذار کر ختم ہو جائے گا؟

اوّل تو یہ بارہ ہزار برس بشری دنیا کے برس نہیں، بلکہ دیوتائی جنتری پر منحصر ہیں، جس میں بشری سال دیوتائی ایک دن کے برابر ہوتا ہے اور اس طرح بارہ ہزار دیوتائی سال بشری ۴۳ لاکھ بیس ہزار برس کے ہوئے۔

دوسرے چار جُگ گذر جانے پر برہما کا صرف ایک دن (یا کلپ) ختم ہوتا ہے۔ ہر کلپ یا دن کے ختم ہونے پر برہما آرام کرتا ہے اور کائنات پانی پانی ہو جاتی ہے۔ دوسرے دن یا کلپ میں جاگتے ہی برہما پھر چار جُگ کا دَور از سر نو چلا دیتا ہے اور حیاتِ مضطر پھر سرگردانی میں مصروف ہو جاتی ہے۔

برہما میں ایسے سَو کلپ تک قوتِ تخلیق یا طاقتِ قیام باقی رہے گی اور اس کے بعد؟۔ اُس کے بعد کون جانتا ہے کہ نارائن کی ناف کوئی اور پھول نہ کھلائے گی، یا کسی نئے برہما کو وجود میں نہ لائے گی؟۔ گویا۔ رُوحِ حیات کا راز اور ارتقائے حیات کا سفر، دم لینے بھر کو رُکے تو رُکے ورنہ برابر جاری رہے گا۔ نہ راز کھُلے گا، نہ مقصد معلوم ہوگا!

کل جُگ بھی سہی تو موجودہ بیل و نہار ہرگز نہ تھے۔ گنگا جی کو راجہ ساگر کے ساٹھ ہزار لڑکوں کو زندہ کرنے، عالمِ بالا سے شیو جی کی جٹا میں سے ہوتے ہوئے پرتھوی پر نازل ہوئے عرصہ دراز ہو چکا ہے، مگر ابھی تک گنگا جی کی کاٹ پھانس سے نہروں کا وجود نہ ہوا تھا آریا ورت میں دو قومیں نہ بنی تھیں اور بھارت ورش کو وجود میں آئے دو پشتیں گذر چکی تھیں۔

اس زمانے اور ماحول میں۔

کشیدہ قامت، سُبک خال و خد، کتابی چہرہ، ستواں اور سیدھی ناک، بھری بھری پیشانی، اُبھرے جسم اور کندن سا گندمی رنگ والا، شان تنو گنگا کے کنارے کنارے ٹہل رہا تھا۔ اُس کے ہر قدم سے افتخار اور ہر انداز سے پندار ٹپک رہا تھا۔ افتخار کا باعث نسلی شجرہ تھا تو پندار کا باعث جوانی کی راج گدی۔

دکھشنا پور بسانے والے شاہ ہستن کا پوتا اور بھارت ورش کو وجود میں لانے والے مہاراج بھارت کا پر پوتا بلکہ شاہِ دُشینت و شکنتلا کے اتصال سے پیدا ہونے والی نسل کا گوہر شب چراغ تھا۔ یا۔ کورو کا جگر گوشہ ہونے کے

سے مہابھارت کا دیباچہ تھا۔

شان تنو کی پاک بازی و عدل گستری مشہور ہو چکی تھی، البتہ اُس کے تجرّد پر حیرت تھی۔ وہ قد آور و بلونت ہی نہیں تھا بلکہ حسّاس و خود بیں بھی تھا۔

پیکر کی موزونی و تندرستی پر پیدا ہونے والی خود بینی مقدمہ ہوتی ہے خود نمائی کا! اور تجرّد و شباب کی اُمنگ پیش خیمہ ہوتی ہے تلاشِ زوج کا۔ ہل بیل والی دیہاتی زندگی ہو یا تاج گدّی والی مصروف کُن حیات، راجہ ہو یا پرجہ، زر و زمین والے تفیضے زن کی جگہ نہیں لے سکتے۔ انسانی قالب میں جلوہ گر ہونے والی رُوح، مقصدِ حیات کے تگ و دو میں ہمیشہ ایک ایسی رُوح کی تشنۂ محبّت رہتی ہے جو جنسِ مخالف کے رُوپ میں، جنم بھر کے لئے اُسکی ہمنوا و ہم صحبت بن سکے۔ یہ خواہشِ جنسی رازِ حیات نہیں تو کیا ہے؟ اور اس کے احساسِ اوّل کو حُصولِ بلوغ کے سوا اور کیا کہا جائے؟

شان تنو بیش بہا نیلی ریشمی دھوتی باندھے، سرخ شال کندھے پر ڈالے، مُرصّع تاج رکھے، موتیوں کا مالا پہنے، جڑاؤ جوشن ڈنڈ پر باندھے، کنارے کنارے ٹہلتا، رُکتا، بڑھتا، چاروں طرف دیکھتا، چلا جا رہا تھا! غالباً اس کی نظریں اپنی شایانِ شان جُفت کی تلاش میں تھیں۔ یا شاید وہ گنگا جی سے امداد کا خواہاں ہو۔

بھارت ورش کلیلیں کرنے والی ہرنیوں اور آہو چشم کنواریوں سے خالی نہ تھا۔ ایک ہی گھاٹ پر حُسنِ انسانی کے ایسے ایسے نظر گیر نمونے دیکھنے میں آتے تھے کہ دیکھنے والا "رام جی" کی دہائی پُکار اُٹھے۔ مگر شان تنو کی نظر اور معیار، اُس کے مرتبہ و قامت کی طرح بلند تھے۔ وہ ابھی تک کسی گردیدہ کر لینے والے چشم و ابرو سے دو چار نہ ہوا تھا۔ وہ تخیّل کے اُس حصّے میں جو شرمندۂ الفاظ نہیں ہوتا، اپنی مطلوبہ کی خاطر خواہ مورتی بناتا اور بگاڑتا۔ مگر ابھی تک اس مورتی کی جیتی جاگتی صُورت اُسے میسّر نہ ہوئی تھی۔

اِس زمانۂ تلاش، یا، عادت چہل قدمی میں، شان تنو کی مڈبھیڑ ایک ایسی پری چہرہ سے ہو گئی جو اُس کی دماغی مورتی کو بھی مات کرتی تھی۔ وہ ایکھ اور دھان کے کھیتوں سے گذرتا، ایک برگد کے نیچے پونہچا تھا کہ سامنے، ٹخنوں اونچے پانی میں، ایک پری چہرہ گنگا میں کھڑی نظر آئی۔

اُس کا جسم زیریں۔ ناف سے نہیں بلکہ پیڑو سے نیچے کا جسم۔ حریری ساڑی میں، جو نظر گیر تاگڑی سے رُکی ہوئی تھی، چھپا تھا۔ مگر اوپر کا جسم، چند مرصّع اور جگمگاتے زیوروں کے علاوہ قطعی عُریاں تھا۔ ساڑی کا آنچل۔ یا۔ لباس کا بقیہ حصّہ پیکرِ عریاں کا پس منظر بن کر کچھ اِس طرح پھیلا ہوا تھا جیسے پھولوں پر تھرکنے والی، نمونۂ رنگ آمیزی، تیتری کے لرزاں پر۔ چہرے کے گرد، حُسنِ منوّر سے پیدا ہونے والی شعاعوں کا ہالہ سا تھا۔ صُراحی دار گردن کی بلوریں کیفیت پس پشت پھیلی ہوئی زلفِ دراز کے مقابلے سے اور زیادہ پھوٹی پڑتی تھی۔ غلافی و بادامی

وضع کی آنکھیں، سیاہ اور گھنی بھنویں، لمبی اور خفیف سی اوپر کی جانب مڑی ہوئی پلکیں، موتی سے زیادہ سفید بتیسی، مرمریں جسم، اُبھرا ہوا جوبن، تنگ کمر اور کولوں کا پھیلاؤ — شان تنو کی نظر پڑنی تھی کہ کلیجہ پکڑ لیا۔

شان تنو غرقِ نظارہ ہوگیا، مگر یہ پری وش بھی اعجازِ حُسن نمائی کے مزے لے رہی تھی۔ نازک گردن کی خفیف سی جنبش اور ایک طرف قدرے جھک جانے والے انداز نے، چلبلی اور سیاہ تپلیوں کو گوشۂ چشم سے ایسے ایسے ترچھے تیر مارنے کا موقعہ دیا کہ شان تنو کا دل چھلنی ہوگیا۔ شان تنو اُس کی دزدیدہ نگاہی اور تبسم طرازی میں رغبت زبان بریدہ، یا دعوتِ پسندیدہ کی جھلک تاڑتے ہی، بول اُٹھا:-

"اے نازک کمر درتی! تو عورت ہے یا پری، دیبی ہے یا عالم بالا کی تصویر! اے عیوب و نقائص سے پاک ہستی! کیا تو بھارت کے پوتے کی آغوش میں آنا، میری بیوی بننا پسند کرے گی؟"

پری وش بولی:-

"منظور ہے۔ مگر تم نے مجھے درشت کلامی کے ساتھ آدھی بات کہی میں فوراً تم کو چھوڑ دوں گی"

"یہ شرط منظور۔ ایسی پری وش درشت کلامی کی متحمل نہیں ہوسکتی"

اِس عہد و پیمان کے ساتھ ہی، شان تنو برگد کے نیچے، اُس پری وش کو آغوش میں لئے بیٹھ گیا اور گنگا کی آہستہ خرام موجوں کو دیکھتے دیکھتے، ماہ وش کے پریم میں ایسا ڈوب گیا جیسے گنگا میں جنا لہر مارے!

دسویں مہینے ایک چاند سا لڑکا، اس اِتصالِ جنسی کا نتیجہ، برآمد ہوا لیکن وضع حمل کے بعد ہی، یہ پری وش نوزائیدہ بچے کو گود میں لئے، محلِ شاہی سے تنہا نکل کھڑی ہوئی۔ شان تنو، جو محبت میں سرشار اس پری وش کا سایہ بن گیا تھا، کسی قدر فاصلہ پر، دبے پاؤں پیچھے پیچھے چلا۔ وہ پری وش گنگا تک پہنچی اور پنڈلیوں گہرے پانی تک گھسی چلی گئی، مگر شان تنو ایک درخت کی آڑ پکڑے کنارے سے دیکھتا رہا۔

اُس نے کیا دیکھا؟

بظاہر نرم دل معلوم ہونے والی پری وش نے، انتہائی سنگ دلی کے ساتھ، "میری مکتی کے لئے" کہتے ہوئے ننھی سی معصوم جان کو گنگا میں پھینک دیا۔ دو چار بلبلے اُٹھے، دس پانچ دائرے پھیلتے گئے، اور ایک جیتی جاگتی ہستی معدوم ہوگئی!

شان تنو محو حیرت تھا، شکار صدمہ تھا، کش مکش اضطراب و صبر تھا! مگر شادی کا قول یاد آتے ہی اُس کی زبان بند ہوگئی۔ وہ کسی طرح ایسی بے نظیر ہستی کو اپنی آغوش سے کھونا نہیں چاہتا تھا۔

کیا اندر کو تخلیق عالم میں ساوتری کی امداد نہیں ملی ؟ کیا رابھو جو عالم کے معمار تھے اندر کی اولاد نہ تھے ؟ کیا آخر کار اندر اندرانی میں غرق نہیں ہو گیا ؟

جو کچھ بھی ہو، اتصالِ جنسی کے بعد، محبت کی رُوح رفتہ رفتہ نکل جانا لازمی ہے۔ اولاد کی فطری کشش بھارت ورش کی ماں میں اس قدر عجیب و غیر معمولی ہو کہ اُس کے جذبات کی صحیح ترجمانی کے لئے ماتا کا مخصوص لفظ وجود میں آجائے، پھر بھی باپ اس جذبے سے قطعی خالی نہیں ہوتا بلکہ اکثر یہ جذبہ باپ کو بھی، ماں کے برابر نہ سہی، بے آپے اور بے قابو کر دیتا ہے۔

شان تنو اپنی سی چاندسی اولاد کو گنگا میں ڈوبتے دیکھتا اور کچھ نہ کہتا! کیوں ؟۔ اس لئے کہ پری وش کو ہاتھ سے کھو دینے کا اندیشہ تھا اور قولِ مرداں جاں دارد کے ٹوٹ جانے کا یقین تھا۔ مگر ہر چیز کی ایک حد اور ہر کیفیت کی ایک انتہا ہوتی ہے۔ اُس حد یا انتہا سے تجاوز ہوتے ہی اثر دگرگوں اور معاملہ برعکس ہو جاتا ہے۔ طیش نرمی سے اور محبت نفرت سے بدل جاتی ہے۔ قوتِ ضبط زائل ہو جاتی ہے اور اندر ہی اندر گھٹنے والے جذبات ایک دم اُبل پڑتے ہیں۔ شان تنو کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔ اُس نے پہلے ہی بچے کو غرق گنگا ہوتے نہیں دیکھا بلکہ یکے بعد دیگرے سات کو اسی طرح معدوم ہوتے دیکھا اور اُف نہیں کی، دم نہیں مارا۔ لیکن کون انکار کر سکتا ہے کہ ہر بچے کے ڈبو دیئے جانے پر اُس کے قلب و دماغ میں شورش برپا کر دینے والے خیالات کا تلاطم نہ ہوا ہو، اور یہ تلاطم ہر مرتبہ زیادہ تیز اور دیرپا نہ ہوتا گیا ہو۔

جب شان تنو کی پری وش دل رُبا، آٹھویں بچے کے وضعِ حمل پر بھی اپنی پُرانی سنگدلی پر قائم رہی اور اُس بچے کو گود میں لئے گنگا کی طرف چلی، تو شان تنو انتہائے کوشش خودداری کے ساتھ کلیجا تھامے، اُس کے پیچھے پیچھے خاموش اُس وقت تک چلا گیا جب تک کہ وہ پایاب پانی میں گھس نہ گئی۔ اس کے بعد چند لمحے درکار تھے کہ "تیری نکی کے لئے" کہتے ہوئے یہ معصوم بھی غرق گنگا کر دیا جاتا۔ پری وش کے ہاتھوں کو، ہلکی سی جنبش ہوئی ہو گی کہ شان تنو درخت کی آڑ سے نکل کر چیخ اٹھا!

"خبردار اے عورت! تو ماں ہے یا ڈائن ؟ سات بچوں کو جیتے جی ڈبو کر بھی تجھے شرم نہ آئی! تو اب اس آٹھویں کو بھی ڈبونا چاہتی ہے! بس! اب ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں ہرگز یہ ہتیا برداشت نہیں کر سکتا۔ تو بڑی ہتیاری ہے!"

پری وش نے گھوم کر شان تنو کو دیکھا اور دل فریب مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا:۔

"تم نے قول توڑ دیا اور اب میں جاتی ہوں۔ اب میں تمہاری بیوی نہیں رہ سکتی....."

"کیا کہا ؟" شان تنو نے قطع کلام کرتے ہوئے للکارا "ہے کوئی جو تجھے کورو کے سپوت سے جدا کرے ؟۔ ہے کوئی بھارت ورش کا کونہ جہاں میرا ہاتھ نہ پہنچ سکے ؟....."

"قہ ۔قہ۔قہ!" سریلا قہقہہ لگاتے ہوئے پری وش بول اٹھی۔ "ٹھیرو! پہلے سُن لو کہ میں کون ہوں اور تمہاری بیوی کیوں بنی؟ ۔ میں گنگا دیی ہوں ۔ اندر کے ہم صحبت واسو جو آٹھ ہیں، اتفاقاً وشسٹھا رشی اور سورج نارائن کے درمیان ایسے وقت اُڑتے ہوئے حائل ہوگئے جب کہ رشی دھیان میں غرق تھا ۔ اس دخل ناجائز سے رشی برہم ہوا اور اُس نے واسو کو انسان کا جنم لے کر دنیا میں پیدا ہونے کی بددعا دے دی۔ جب وہ میری امداد چاہنے میرے پاس آئے تو میں نے وعدہ کر لیا کہ میں ان کی ماں کا رُوپ دھار کر اُن کی پیدائش کے بعد ہی اُن کو ڈبو دیا کروں گی تاکہ وہ اس طرح جلد سے جلد انسانی جنم سے نجات پا جائیں۔ میں اسی مقصد سے انسانی رُوپ میں تمہاری بیوی بنی اور اپنے قول کے مطابق اب آزاد ہوں ۔ کیسا بھارت ورش اور کیسی دنیا؟ میری جگہ تو ملائے اعلیٰ ہے جہاں کوروا ور بھارت کا دست رس نہیں ۔ سُنا! ۔ اب میں جاتی ہوں مگر تمہارے اس قدر صبر و تحمل کا معاوضہ ضرور دوں گی .....!"

شان تنو کچھ کہنا چاہتا تھا کہ وہ پری وش، بچہ گود میں لئے، دیکھتے ہی دیکھتے، مسرتِ ماضی کی طرح غائب ہوگئی !!!

وہ اِس مختصر زمانے کی مستقل یادگار اس سے زیادہ کیا بناتا کہ بھارت ورش کے بھارتی ہمیشہ ـــ "گنگا مائی کی جے" پکارا کریں !!!

سائنس کے احسانات

انساں علمِ سائنس کا احسان مند ہے　　فرشِ زمیں سے جس کی فلک تک رسائی ہے
آنکھوں کو خوردبیں سے بصیرت عطا ہوئی　　اور دوربیں نے گم شدہ منزل سجھائی ہے
کانوں کے ٹیلی فون نے پردے اُٹھا دیئے　　اور ریڈیو نے نطق کی قوت دکھائی ہے
توپوں نے زورِ پنجۂ انساں بڑھا دیا　　ٹینکوں نے اس کی اور بھی عظمت جتائی ہے
وہ پاؤں جس کو بادیہ پیمائی عار تھی　　سائیکل نے اس کی چال ہوا سے ملائی ہے
زپلن ہوا میں لے اُڑا اور سب مرین نے　　قلزم کے نیچے آب میں آتش لگائی ہے
بامِ فلک سے کود کے آتے ہیں بیرا شوٹ　　تارے سے ٹوٹتے ہیں یہ معجز نمائی ہے
القصہ سائنس ہی کا کرشمہ ہے جس نے آج　　انساں کے عضو عضو کی قوت بڑھائی ہے
لیکن یہ علم رُوح کو پستی میں لے گیا

(محمود بسمل)

ظہورِ قدسی

(از جناب منظور الحق کلیم اعظم گڈھی)

کفر تھا یوں شباب پر جیسے کوئی خدا نہ تھا
چھائی ہوئی تھی تیرگی نور کا کچھ پتا نہ تھا
روح پہ تھے حجابِ کفر پردہ وہ اٹھا ہوا نہ تھا
بھولے تھے وعدۂ ازل جیسے کبھی کیا نہ تھا

برقِ غضب گزر گئی کفر کے نیستان سے
ٹھنڈا ہوا دلِ جہان رحمتِ دوجہان سے

بادِ سموم کفر سے پھول نہ تھے کلی نہ تھی
غنچۂ دل وہ کون تھا جس میں کہ بیکلی نہ تھی
تھی شبِ تار جوش پر بادِ سحر چلی نہ تھی
جوشِ نمو تھا مضمحل کوئی کلی کھلی نہ تھی

رحمتِ حق کو آ گیا جوش اس حالِ زار پر
نور کو کر دیا بلند نارِ شرارہ بار پر

نور وہ نور جس کا ہے عالمِ قدس مستقر
نور وہ نور جس میں ہے نورِ خدا ہی مستتر
نور وہ نور جس سے ہیں سارے جہاں کے خشک و تر
نور وہ نور جس سے ہیں ذرے بنے قمر قمر

جوشِ خزاں کے دور میں بن کے بہار آ گیا
غنچہ و گل کا ذکر کیا وجد میں خار آ گیا

ساری فضائے دہر پر ابرِ کرم تھا چھا گیا
آبِ حیات بن گیا مُردوں کو وہ جلا گیا
خاک کی ترک و تاز کو اس طرح سے دکھا گیا
جذبِ الوہیت سے وہ فرش سے تا سما گیا

اس طرح کر دیا الگ اس نے وجودِ خشک و تر
جس طرح نخلبندِ فکر چھانٹ دے شاخِ بے ثمر

سب کو مئے الست کا اترا ہوا خمار تھا
دورِ خزاں کے نام کا نام پڑا بہار تھا
نام تھا آدمی مگر جانوروں کو عار تھا
رحم و کرم سے دور تھا نام ستم شعار تھا

اترے ہوئے خمار پر رنگ نیا جما دیا
ساقیِ مہربان تھا مستِ ازل بنا دیا

غزل

(از جناب قمر نعمانی سہرامی)

دیکھنا ہے تو مرا شوقِ فراواں دیکھئے　　آپ کے جلوے نہ ہو جائیں پریشاں دیکھئے
منظرِ آغاز و انجامِ گلستاں دیکھئے　　برگِ گل پر قطرۂ شبنم کو لرزاں دیکھئے
حسن سے معمور ہے ہستی کا داماں دیکھئے　　غیر آسودہ ہے پھر بھی شوقِ انساں دیکھئے
لطف لینا ہے جو ساحل کی ہوائے سرد کا　　موج کی انگڑائی بن کر زورِ طوفاں دیکھئے
کیجئے کیونکر اثر پیدا جنونِ عشق میں　　حسن کو اپنی طرح کیونکر پریشاں دیکھئے
فطرت خاموش ہوتی ہے یہاں نغمہ سرا　　آیئے رنگینیٔ شامِ بیاباں دیکھئے
تازگی دائمی پا جائے گا رنگِ بہار　　مسکرا کر ایک دن سوئے گلستاں دیکھئے
آپ کی نظروں میں جس کی کوئی وقعت ہی نہ تھی　　آج وہ افسانۂ غم کا ہے عنواں دیکھئے
ہے مری ہی خاک سے رنگین دامانِ بہار　　دیدۂ دل سے ذرا رنگِ گلستاں دیکھئے
آپ ہی کے ہوں گے کچھ نغمے برنگِ مختلف　　چھیڑ کر میرا کبھی سازِ رگِ جاں دیکھئے
ہمتِ دل کہہ رہی ہے ختم کر کے راہِ شوق　　اس طرح مشکل ہوا کرتی ہے آساں دیکھئے
آدمی کیا، وجد میں آئے گی ساری کائنات　　ساز پر دل کے کبھی ہو کر غزل خواں دیکھئے

ہے تقاضائے دلِ شوریدہ سر مجھ سے قمر
حسنِ آسودہ کو بھی کر کے پریشاں دیکھئے

قطعات

بزمِ ہستی میں انبساط نہیں　　نام کو بھی یہاں نشاط نہیں
آدمیت نہیں ہے انساں میں　　یعنی آپس میں ارتباط نہیں

دن نہیں اس کا اس کی رات نہیں　　اس کے قابل یہ کائنات نہیں
حریت کی تڑپ نہ ہو جس میں　　وہ تو کچھ اور ہے حیات نہیں

رفتار زمانہ

گذشتہ چند دنوں کی سب سے اہم خبر مسٹر روزویلٹ مسٹر چرچل و مارشل اسٹالین کی کانفرنس ہے اس کی پہلی اطلاع ۱۳ فروری ۱۹۴۵ء کو عالمگیر ریڈیو میں کانفرنس کے اجلاس لندن میں سر والٹر سیٹرائن کی زبانی ملی کہ اب ثلاثۂ عظیم یعنی پریسیڈنٹ روزویلٹ مسٹر چرچل اور مارشل اسٹالن کے درمیان جو کانفرنس ہونے والی تھی وہ اس وقت بحرۂ اسود میں کسی مقام پر ہو رہی ہے۔ کانفرنس مذکور کے سامنے دو قسم کے مسائل تھے یعنی جنگی و سیاسی۔ جنگی مسائل کا تعلق تو یورپ میں جرمنی کو شکست دینے اور بعد ازاں تمام اتحادی طاقت جاپان کے خلاف منتقل کرنے سے ہے اور دوسرے حصہ کا جنگ کے بعد جرمنی کے انتظامات۔ پولینڈ، بلجیم، بلقان۔ اور اطالوی نو آبادیات سے ہے پہلا مسئلہ یعنی جنگی کارروائیوں کا معاملہ تو کانفرنس میں باتفاق رائے طے ہو گیا اس بارے میں لندن سے جو بیان سرکاری طور پر شائع ہوا ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ مشترکہ دشمن کو جلد سے جلد شکست دینے کے لئے اجتماعی کارروائیوں کی اسکیم تیار کر لی گئی ہے نیز آنکہ جنگ کے آخری مرحلوں میں جو جنگی کارروائیاں عمل میں لائی جائینگی ان پر پورا اتفاق رائے ہو گیا ہے مندرجہ بالا سرکاری اعلان سے تمام اتحادی دنیا میں مسرت و شادمانی کی لہر دوڑ گئی۔ اس لئے کہ جرمنی اسی کانفرنس کے نتائج پر اپنی آخری امید قائم کیے ہوئے تھا۔ جرمنی کو یہ خیال تھا کہ ہونے والی کانفرنس میں اتحادیوں کے درمیان پھوٹ پڑ جائیگی اور ان کی باہمی نا اتفاقی سے جرمنی کی جان بچ جائے گی۔ لیکن اب جہاں تک جرمنی کو شکست دینے کا تعلق ہے اتحادیوں میں پورا پورا اتفاق ہو گیا ہے۔

جرمنی کی شکست کے بعد دوسرے مسائل ثانوی حیثیت رکھتے ہیں الغرض اب جرمنی کی یہ تمام توقع جاتی رہی ہے کہ اتحادیوں کی نا اتفاقی سے اسے گفت و شنید کر کے صلح کرنے کا موقع مل جائیگا۔ اب جرمنی کو بلا شرط ہتھیار ڈال دینے کے سوا اور کوئی چارۂ کار باقی نہیں اس مطلب کی بھی خبریں آ رہی ہیں کہ اب اندرونی طور پر بھی جرمنی میں بدنظمی اور گڑبڑ پھیلتی جا رہی ہے۔

اس کانفرنس کے سلسلہ میں ایک برطانوی ہوائی جہاز جو سواریاں لے کانفرنس کے مقام کو جا رہا تھا۔ اثناء راہ میں تباہ ہو گیا۔ اس حادثہ میں بارہ آدمی ہلاک ہوئے۔ وزارت ہوائی کے فضائی کمانڈر سینڈرسن زخمی ہوئے۔ ہوائی جہاز کے عملہ کے تین آدمی لاپتہ ہیں ہلاک شدگان میں چھ ممبر برطانوی دفتر خارجیہ کے تھے۔ جس میں ایک عورت بھی تھی۔ ان کے علاوہ وزارت جنگ کے چار فوجی افسر ایک گروپ کیپٹن اور ایک طیارہ مستری بھی ہلاک ہوا۔

اس اثناء میں جنگ کا کیا حال رہا وہ تفصیل کے ساتھ ذیل میں ملاحظہ فرمائیے:-

مغربی محاذ | مغربی محاذ پر برطانوی، فرانسیسی، امریکی، اور کناڈی فوجیں بڑی سرگرمی کے ساتھ مصروف جنگ رہیں پیش قدمی بھی کی گئی۔ لیکن رفتار سست رہی پچھلے دنوں جرمن خبر رساں ایجنسی نے اعلان کیا تھا کہ "امریکی لشکر نمبر ۱ دریائے رور تک جا پہنچ گیا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ امریکی فوجوں نے سیجفریڈ لائن پر شدید حملے کر کے مورچوں میں کئی جگہ مزید شگاف ڈال دیئے ہیں لیکن اتحادی ہیڈ کوارٹر نے اس کی تردید کی اور اعلان کیا کہ "کسی مقام پر مکمل شگاف نہیں ڈالا جا سکا ہے" البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ امریکی لشکر نمبر ۳ جو آرڈینس میں مصروف جنگ ہے۔ کسی قدر پیش قدمی کی ہے وہ بڑھتا بڑھتا بعض مقامات پر سیجفریڈ لائن کے قریب پہنچ گیا ہے لیکن لائن کو توڑ نہیں سکا ہے جبکہ خبروں سے معلوم ہوا ہے کہ سیجفریڈ لائن میں اتحادی فوجوں نے شگاف ڈال دیئے ہیں۔

اتحادی فوجوں کے ساتھ جو سیفرین وناظرین جنگ ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ جہاں تک فوجوں اور اسلحہ کی تعداد کا تعلق ہے اتحادیوں کو جرمنوں پر زبردست فوقیت حاصل ہے لیکن یہ بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کہ دشمن بڑھتی ہوئی اتحادی فوجوں کو روکنے کے لئے کافی فوج مورچوں میں لاسکا ہے یا نہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اتحادی فوجیں مغربی محاذ پر ہم آہنگی سے کام کررہی ہیں۔ ادھر امریکی فوجوں نے جنوب مشرقی بلجیم اور لکسمبرگ کی سرحدیں پار کرکے جرمن علاقہ میں پیشقدمی شروع کی اور انگریزی اور کناڈی فوجوں نے ہالینڈ میں نجمین کے مورچہ پر جدید حملہ کردیا۔ مغربی محاذ کے انتہائی شمالی حصہ میں باشنا نجمین کے اتحادی فوجیں دریائے ماس کے کنارے کنارے روئرمنڈ تک بڑھتی چلی گئی ہیں کلیوہ اور ایمریخ پر ہوائی جہازوں سے کافی بمباری کرلینے کے بعد جنرل کریرار نے مشرقی سمت دریائے رائن کی جانب حملہ کیا جو کامیاب ہورہا ہے اور کلیوہ کے اہم مقام پر امریکی فوجوں کا قبضہ ہوگیا ہے:۔

امریکی لشکر نمبر ۳ نے اچانک حملہ کرکے دریائے اُور کو عبور کرلیا یہ دریا بینٹ دیتھ اور افترناخ کے درمیان جرمن سرحد کے متوازی بہتا ہے اگرچہ سیجفریڈ لائن کے مورچوں سے گولوں کی شدید بارش ہوتی رہی۔ لیکن امریکی فوجوں نے افترناخ سے آور کے شمال مشرق ایک مقام تک ۲۲ میل کے محاذ پر دریا کو سات جگہ پار کرلیا۔ اس کے بعد امریکی فوجیں آگے بڑھکر جرمنی کے اندر داسبرگ میں داخل ہوگئیں اسی اثنار میں جرمن خبر رساں ایجنسی نے اعلان کیا کہ امریکی لشکر نے شیلڈن کے محاذ پر جرمن مورچوں کو توڑ دیا۔

مغربی محاذ کے جنوبی حصہ میں کوہستان واسجیس اور دریائے رائن کے درمیان جنوبی الساس کو دشمنوں سے صاف کردیا گیا۔ اس کے بعد کولمار کا محاصرہ کرلیا گیا جہاں سے جرمنوں کو دریائے رائن کے پار بھاگنے پر مجبور ہونا پڑا اور اس طرح کولمار بھی فتح ہوگیا۔ اس حصہ محاذ میں صرف ایک پل نیومبرگ میں باقی رہ گیا تھا۔ جس پر سے ریل گزرتی تھی اتحادیوں نے اسے بھی توڑ دیا:۔

روسی محاذ | روسیوں نے اپنے شدید حملوں اور بے پناہ یلغاروں میں وہ کمال دکھلایا کہ تمام دنیا حیران و ششدر رہ گئی ہے اس وقت مارشل ژوکوف کی فوجیں دریائے اوڈر کے مشرقی کنارے پر پچاس میل تک مضبوطی سے مورچہ بند ہیں اور وہ کئی جگہ دریا کو پار کرکے مغربی کنارے بھی پہونچ گئی ہیں۔ اس وقت کسٹرین کے شمال مغرب سے فرینکفرٹ کے جنوب تک تمام دریائے اوڈر پر روسی فوجیں قابض ہیں اور یہ دونوں مقام روسی توپوں کی زد میں ہیں۔ دریائے اوڈر برلن کے مشرق میں آخری قدرتی مورچہ سمجھا جاتا ہے الغرض اب روسی فوجوں کی منزل مقصود برلن ہے جو غالباً چالیس یا پینتالیس میل دور رہ گیا ہے اور اب دشمن میں اتنی طاقت نظر نہیں آتی کہ وہ جوابی حملے کرکے روسیوں کو دریائے اوڈر کے پار دھکیل دے گا۔ اس کے علاوہ خود جرمن خبر رساں ایجنسی کی دوسری رپورٹ میں بتلایا گیا ہے کہ مارشل ژوکوف نے اسٹیٹن کی طرف ایک نئی اور زبردست یلغار کی ہے اور وہ مقام بائرٹزنک پہونچ گیا ہے جو دریائے اوڈر کے دہانے سے صرف بائیس میل دور ہے دوسری طرف مشرقی پروشیا میں مارشل رخسوفسکی اور مارشل شرنیاکوفسکی اور دواکوشاخسکی یلغاریں کرتے بڑھ رہے ہیں جن کا دشمن بڑی سختی سے مقابلہ کررہا ہے یہ دونوں روسی جنرل علی الترتیب کونگسبرگ اور ایلبنگ کے علاقوں میں نبرد آزما ہیں لیکن اگر مارشل ژوکوف کی وہ یلغار جو وہ جنوب کی طرف سے شمال کی جانب کررہا ہے کامیاب ہوگئی اور یقیناً کامیاب ہوگی تو جرمنوں کے فرار کی تمام راہیں بند ہوجائیں گی اور وہ علاقہ پومیرانیہ سے گذر کر بھاگ بھی نہ سکیں گے

تیسری طرف مارشل کونیف کی فوجیں جو جنوب کی طرف مصروفِ پیکار ہیں۔ پچاس میل کی دوری میں دریائے برگ کو پار کر گئی ہیں اور بارہ میل اور آگے بڑھ گئی ہیں۔ اب مارشل کونف کی فوجیں مشرق اور جنوب کی سمت سے جرمن شہر بریسلاؤ کی اینٹ سے اینٹ بجا رہی ہیں اور یقین ہے کہ وہ شہر کو مغربی سمت سے بھی بہت جلد گھیر لیں گے۔ بریسلاؤ کو ختم کرنے کے بعد مارشل کونیف کے سامنے دو راہیں ہونگی یا تو وہ شمال مغرب کی طرف سے یلغار کر کے خاص شہر برلن پر چڑھائی کرینگے۔ یا سیدھے مغربی سمت یلغار کر کے ڈریسڈن پر حملہ کریں گے۔ اگر انہوں نے موخر الذکر صورت اختیار کی تو مشرقی جرمنی کی جرمن فوجوں کا سلسلۂ مواصلات ان جرمن فوجوں سے خطرہ میں پڑ جائیگا۔ جو اطالیہ، آسٹریا، نیز بوڈاپسٹ کے گرد و نواح میں موجود ہیں:۔

دریائے اوڈر کی اہمیت کا اندازہ ناظرین کو جرمن فوجی مبصر ڈٹمار کے قول سے ہو سکتا ہے۔ جس نے دریائے اوڈر کو "جرمنی کی قسمت کا دریا" بیان کیا ہے۔ اور اسی دریا کے جرمن مورچے توڑے جا چکے ہیں اگر مقامات اسٹیٹن، اور گلوگاؤ جو دریائے اوڈر کے کنارے واقع ہیں، فتح ہو گئے، تو پھر جرمنی میں اتنی طاقت نہیں رہیگی کہ وہ زیادہ مدت تک اپنی قسمت کے آخری فیصلہ سے بچ جائے بریسلاؤ مشرقی جرمنی کا سب سے بڑا انڈسٹریل شہر ہے۔ برگ کے جانب مغرب بڑھتے ہوئے اب روسی فوجیں سلیشیا میں کوئلہ اور لوہے کی جرمن معادن کو پامال کر رہی ہیں۔ فرینکفرٹ کے قریب بھی کوئلہ کی بہت بڑی کان ہے اور بندرگاہ اسٹیٹن جہاز سازی کا اہم مرکز ہے بعد کی خبر سے معلوم ہوا ہے کہ روسی فوجوں نے دریائے اوڈر پر جرمن مورچوں کو توڑ کر دریا اوڈر پار کر لیا ہے اور ہنگری کے دارالحکومت بوڈاپسٹ پر بھی قبضہ کر لیا ہے:۔ جنوب میں مارشل کونیف کی فوجوں نے جانب مغرب نیشہ کی طرف بڑھتے ہوئے شہر گرونبرگ کاڈ پر بھی قبضہ کر لیا ہے اور اب یہ فوجیں چیکوسلاویکیہ کی سرحد سے صرف چند میل کے فاصلہ پر ہیں:۔

اطالوی محاذ بعض لوگوں کا خیال تھا کیونکہ آجکل مغربی و مشرقی محاذات میں جرمنی پر اتحادیوں اور روسیوں کا بہت زبردست زور پڑ رہا ہے، اس لئے غالباً اپنی مشرقی و مغربی فوجوں کو کمک بہم پہنچانے کے لئے، جرمن ہائی کمانڈ۔ اپنی فوجیں اطالیہ سے ہٹالیگا اور اپنے "اندرونی قلعہ" کی حفاظت کے لئے صرف کوہستان ایلپس کے قدرتی مورچوں پر بھروسہ کریگا۔ جہاں وہ قلیل سپاہ کے ساتھ بھی عرصہ دراز تک مدافعت کر سکیگا۔ لیکن جہاں تک واقعات کا تعلق ہے ایسی کوئی علامت ابھی تک ظاہر نہیں ہوئی جس سے ظاہر ہو کہ جرمنی نے اطالیہ سے اپنی فوجیں ہٹالی ہیں۔ بلکہ برعکس اس کے فیلڈ مارشل کسلرنگ متواتر سخت جوابی حملے کیا رہا ہے۔ خصوصاً دریائے سینو کے محاذ پر تو اس نے بہت ہی سخت حملہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ اطالوی محاذ کے دوسرے مورچوں پر بھی جرمن چھاپوں نے شدید ہماہمیاں کیں جرمنوں کو اس بات کی بڑی فکر ہے کہ ان کی رسد رسانی کا جو راستہ درہ برینر سے گذر کر اٹلی پہنچتا ہے اس کو پوری طرح سے محفوظ رکھا جائے۔ اس کا ثبوت اس وقت ملا جب اتحادی ہوائی جہاز درہ برینر پر بمباری کرنے گئے، اور ان کا جرمن ہوائی جہازوں کی بہت بڑی تعداد نے سخت مقابلہ کیا اس کے علاوہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جرمنوں نے بڑی تعداد میں اطالوی پلوں کے ٹکڑے بنا رکھے ہیں۔ اگر اتحادی ہوائی جہاز بمباری کر کے کسی پل کا کوئی حصہ توڑ دیتے ہیں تو دوسرے ہی دن شکستہ حصہ غیر معلوم طور پر درست کر لیا جاتا ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اطالیہ میں جنگ کی رفتار بہت سست ہے:۔

ایشائی محاذات ایشیائی محاذات پر اتحادی فوجیں جاپانیوں کے خلاف ہر طرف کامیابی کے ساتھ پیشقدمی کرتی رہی ہیں۔ خصوصاً

جاپانیوں کے سب سے بڑے جزیرے لیوزان پر امریکن حملہ نہایت کامیاب رہا ہے۔ امریکی فوجوں نے فلپائن کے دارالحکومت منیلا کو جاپانیوں سے چھین لیا ہے۔ امریکی فوجیں منیلا میں داخل ہو گئی ہیں اور بچے کھچے جاپانی دستوں کا صفایا کر رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی امریکی فوجیں جزیرہ نمائے بتعان اور موہ بانگاس میں بھی جو خلیج منیلا کے ادھر ادھر واقع ہیں، کارروائیاں کر رہی ہیں اگر یہ کارروائیاں کامیاب ہو گئیں تو امریکی فوجوں کا تو بلکہ کے اہم بحری مستقر اور جزیرہ کوریجیدور کے مضبوط قلعہ پر بھی بہت جلد قبضہ ہو جائیگا لیکن ابھی جزیرہ لیوزان میں جاپانیوں کا خاتمہ نہ سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ ایک تو جزیرہ بہت بڑا ہے دوسرے لنگائن کے شمال وسطی میدان کے شرقی اور دوسرے جزیروں میں بہت سنگلاخ اور دشوار گذار کوہستان ہیں جہاں جاپانیوں کے لئے مورچہ بندی کے بہت اچھے مواقع ہیں بہرحال اب جزیرہ فلپائن کی بازیابی شروع ہو گئی ہے۔ مکمل قبضہ اور تسلط ہونے میں ابھی عرصہ لگے گا۔

برما میں بھی اتحادیوں کی پیشقدمی بڑی کامیابی کے ساتھ جاری ہے تازہ اطلاعات میں مقام پاکوکو کا نام کئی بار آیا ہے جو مانڈلے سے ستر میل کے فاصلہ پر جانب جنوب مشرق واقع ہے خبر آئی ہے کہ لشکر نمبر ۱۴ کے دستے مغربی اور جنوب مشرقی سمت سے پاکوکو کی طرف بڑھ رہے ہیں جن کا جاپانی فوجیں دریائے ایراوتی و چندوین کے سنگم کے علاقہ میں بڑی شدت سے مقابلہ کر رہی ہیں لشکر نمبر ۱۴ کے دونوں دستوں کی یلغاریں یقیناً منڈلے کے لئے زبردست خطرہ ہے۔ کیونکہ منڈلے پر عقب سے بھی حملہ ہونے کا امکان ہے۔

اراکان میں جاپانی بہت سخت مقابلہ کر رہے ہیں اور ان کی کوشش یہ ہے کہ ساحلی علاقہ میں میبونگ اور ساحلون کے درمیان جو سڑک واقع ہے اس پر اتحادی فوجوں کی گرفت مضبوط نہ ہونے دی جائے۔

جزیرہ رامری پر بھی گھمسان کی لڑائیاں ہو رہی ہیں جہاں اتحادی فوجیں شہر رامری پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں لیکن اب چونکہ جزیرہ مذکور میں جنوبی سمت سے بھی اتحادیوں نے اپنی فوجیں اتار دی ہیں۔ اس لئے یقین ہے کہ شہر رامری پر قبضہ ہونے میں زیادہ عرصہ نہیں لگیگا شوئیبو کے چودہ میل کے فاصلہ پر اتحادی لشکر نمبر ۱۴ نے چڑھ کر دریائے ایراوتی کے مشرقی کنارہ پر مقام کیوکیتھ پر یلغار کی تھی جہاں جاپانیوں نے چار ہفتہ تک نہایت سخت مقابلہ کیا۔ لیکن مقام مذکور پر اتحادیوں کا قبضہ مضبوط ہو گیا ہے۔

شمالی مشرقی برما میں چینی فوجیں بھی نمایاں پیشقدمی کر رہی ہیں اور ان کی منزل مقصود لاشیو ہے۔ جو برما ریلوے کا آخری اسٹیشن ہے۔

۱۷ فروری کو ختم ہونے والے ہفتہ میں جو تازہ ترین اطلاعات مختلف محاذات جنگ سے موصول ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوا ہے کہ اتحادیوں کے جہازوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ وسیع پیمانہ پر حملے کئے۔ اور انھوں نے نہ صرف اراکان و مانڈلے کے علاقوں میں دشمنوں کے فوجی اڈوں اور ٹھکانوں پر بم برسائے، بلکہ انھوں نے مولمین تک کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور خاکنائے قرا کو برباد کیا اور سیام کو بھی سزا دیئے بغیر نہ چھوڑا اور سیام کے پایۂ تخت بنکاک پر بھی بمباری کی۔ اور ان کی پرواز ہند چینی کے بھی بعض مقامات تک ہوئی۔ اتحادی بری فوجوں نے برما کے شمال مغربی اور جنوب مغربی محاذات پر بھی نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ شمال مشرق کی طرف سے چینی فوجیں بھی کامیاب پیشقدمی کر رہی ہیں اور اب وہ لاشیو کے قریب پہنچ گئی ہیں لاشیو فتح ہونے کے بعد برما چین کی سڑک بالکل صاف ہو جائیگی۔

"مشعلِ راہ"

یہ کتاب جناب نخشب صاحب جارچوی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ مجموعہ کیا ہے ایک دلفریب گلدستہ ہے جس میں گل بھی ہیں گیاہ بھی، خار بھی ہیں اور پتیاں بھی۔ بہت سے پھول خوشنما ہیں، لیکن خوشبو سے تہی دامن اور بہت سے پھول خوشبودار ہیں، لیکن رنگینی سے بے بہرہ۔ نخشب صاحب ایک نوجوان اور ہونہار شاعر ہیں۔ اگرچہ کلام میں سطحیت بہت زیادہ ہے لیکن زبان بہت صاف اور ٹکسالی ہے۔ پڑھتے بھی اچھا ہیں۔ ترنم کے ساتھ جب اشعار پڑھتے ہیں تو الفاظ منہ سے نکلتے ہی دلوں میں جاگزیں ہو جاتے ہیں اس گلدستہ کے چند خوبصورت پھول ذیل میں درج کئے جاتے ہیں

جو بن پڑے تو ذرا میرے بن کے بھی دیکھو — کہ تم نے اپنا تو مجھ کو بنا کے دیکھ لیا
کسی طرح بھی وہ دل سے جدا نہیں ہوتے — ہر ایک طرح سے ان کو بھلا کے دیکھ لیا

عرض غم پر ان کا یہ کہہ کر جلانا یاد ہے — اور کچھ فرمائیے یہ تو فسانا یاد ہے

کتابِ دوعالم مرتب نہ ہوتی — نہ ہوتا اگر ایک بابِ محبت
وہ نظریں مجھے دے رہی ہیں تسلّی — محبت بنی ہے، جوابِ محبت

روئے نہیں ہے روبرو، جلووں میں گم نظر بھی ہے — اپنے سے بے خبر بھی ہوں، اپنی مجھے خبر بھی ہے
عشق بھی ہے کرشمہ ساز، حسن بھی ہے فسوں طراز — پہلے جو حال تھا ادھر آج وہی ادھر بھی ہے

نگاہِ قہر پرورکو بھی تمہید خوشی سمجھے — سمجھنا ہے تو کوئی ہم سے راز زندگی سمجھے
ہمیں تو خیر جو کچھ آپ نے چاہا وہ سمجھا یا — مگر یہ تو ذرا سمجھائیے کچھ آپ بھی سمجھے

جہاں جلوے ہی جلوے ہوں وہاں نظریں نہیں ہوتیں — وہ سب پردے اٹھا دیتے ہیں جب مستور ہوتے ہیں
محبت اور تقسیم، توہین محبت ہے — وہ دیوانے ہیں جو واقفِ دستور ہوتے ہیں

نخشب صاحب کا ایک محاورہ کسی قدر کھٹکتا ہے ذیل کا شعر ملاحظہ فرمائیے :-

دھوکے پہ دھوکا کھائے جا عشق کو سادہ کار کر — حسن کے دل میں گھر بنا حسن پر اعتبار کر

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں نخشب صاحب نے عشق کو "سادہ کار" بتلایا ہے ممکن ہے کہ اس وقت ان کے خیال میں اسکے معنی سادہ کام کرنیوالا یا بھولا ہو، لیکن اصطلاح میں سادہ کار اس صناع کو کہتے ہیں جو چھوٹے چھوٹے نگ اور خوبصورت زیورات بناتا ہو [illegible] کے معنی نہیں
اس مجموعہ میں نخشب صاحب نے بہت سی غلطیاں زبان میں کی ہیں مثلاً صفحہ ۱ پر ایک نظم لکھا ہے جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے :-

فریبِ دوستی صیقل گر آئینۂ دل ہے

اس میں صیقل کا املا صیقل ہونا چاہئے
مجموعہ میں نخشب صاحب کی قلمی تصویر بھی شامل ہے

[illegible]
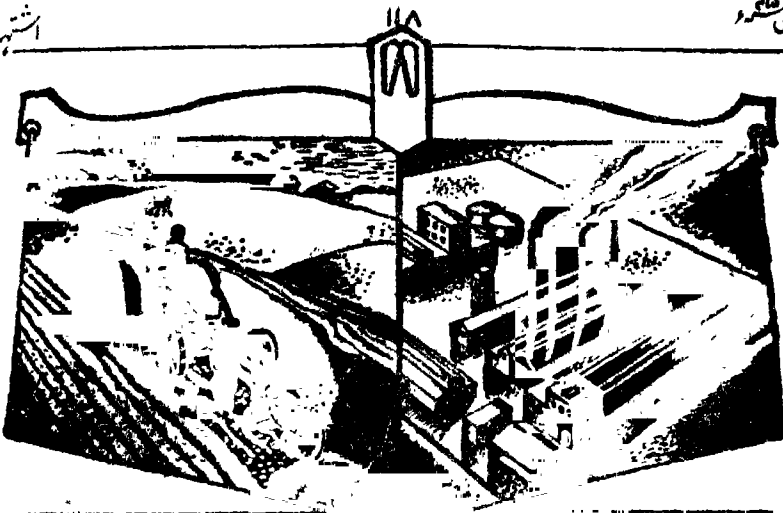
صنعتی ترقی کے ذرائع
ہندوستان ترقی یافتہ اور ... قوموں کی صف میں آنا چاہتا ہے تو اسے جلد اپنی صنعتی کمی کو دور کرنا چاہیے اور اس کے
ساتھ ساتھ زراعت ... صنعتی ترقی کا راز یہی ہے کہ صنعت اور زراعت کے درمیان توازن قائم
رہے اس اصول کو پیش نظر رکھ کر ... ایک صنعتی اسکیم بنائی ہے اس اسکیم کے ذریعے عوام کی قوت خرید
کو بڑھایا جائے گا صحت کے برقرار رکھنے اور تعلیم کو بہتر بنانے کا انتظام اور معیار زندگی کو بلند بنانے کے لئے کام کیا جائے گا:-
... مختلف کارخانوں کے ذریعہ ہر قسم کے صنعتی کام انجام دیتے ہیں:-
مصنوعات و خدمات
پارچہ جات - سوتی، اونی، موزری (موزہ بنیائن وغیرہ) جوٹ (سن) لوہا، اسٹیل، دھات، انجینئرنگ، کیمیاوی سامان، تیل، صابون گھریلوں اور کارخانوں میں استعمال کے لئے، نباتیتی، شکر اور دیگر غذائی پیداواریں، برف، بجلی کے فٹنگ، پلاسٹک، صنعتی وغیرہ کی اشیاء، پلائی وڈ اور ... عمارتی تختے، کا اسٹرابورڈ، بلیپ بورڈ، دفتیاں، شیشہ آلات، الومنیم، ہینڈ ٹولز، گیس پلانٹ، پرانے ناٹروں کی تجدید، بنک و بیمہ خالص اور سرمایہ لگانے کا کاروبار:-

چار سوال
۱ کیا آپ کو سائنٹفک ورزش کرنی آتی ہے ؟
۲ کیا آپ کو معلوم ہے کہ کس طرح سونا جاگنا چاہیئے ؟
۳ کیا آپ جانتے ہیں کہ کس طرح کھانا پینا چاہیئے ؟
۴ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اعلیٰ تن درستی کیا چیز ہے ؟
میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہندوستان کے اٹھانوے فی صدی عورتیں اور نوّے فی صدی مرد ان معمولی سوالوں کا جواب نہیں دے سکتے۔ ہم ہندوستانیوں کا یہ عقیدہ ہوگیا ہے کہ ہر بیماری کو دوائیں بچاتی ہیں حالانکہ یہ غلط فہمی ہے۔ محض دوائیں بیماریوں سے ہرگز نہیں بچا سکتیں۔ اس کے لئے آپ کو تن درست رہنے کے سائنٹفک اصول اور معلومات جاننے چاہئیں۔ ان چار سوالوں کا جواب آپ اسی وقت دے سکتے ہیں جب آپ کے پاس علم ہو۔ علم بڑی طاقت ہے۔ اس کے بغیر آپ کچھ نہیں کر سکتے۔
"ہمدرد صحت" ہندوستان کا سب سے زیادہ سستا اور مفید اور سب رسالوں میں نہایت دیدہ زیب رسالہ ہے اور صرف ایک روپیہ سالانہ قیمت میں آپ کو تن درست رہنے کے متعلق ایسی معلومات بہم پہونچا دیتا ہے جو سینکڑوں کے خرچ سے بھی آپ کو حاصل نہیں ہو سکتیں۔ اس رسالے میں سائنٹفک ورزشیں، قدرتی علاج کے طریقے۔ جدید معلومات اور تحقیقات اور نہایت دلچسپ افسانے اور لطیفے وغیرہ ہر مہینے شائع کئے جاتے ہیں۔
میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایک روپے سال میں آپ کو اس سے زیادہ دلچسپ اس سے زیادہ مفید اور اس سے زیادہ رنگین رسالہ ہرگز نہیں مل سکتا۔ اور صرف ایک روپیہ سال ادا کر کے آپ دواؤں کے سینکڑوں کے بل ادا کرنے سے یقینی طور پر بچ جائیں گے۔
آج ہی ایک روپیہ منی آرڈر کے ذریعہ بھیج کر خریدار بن جائیے۔ (وی۔ پی نہیں بھیجا جاوے گا)
نمونہ تین آنے کے ٹکٹ بھیج کر منگایا جا سکتا ہے
منیجر ہمدرد صحت
ہمدرد منزل
ہمدرد ڈاک خانہ
دہلی

زمانہ

بیادگار منشی دیا نراین صاحب نگم مرحوم

جلد ۸۴ | مارچ سنہ ۱۹۴۵ء | نمبر ۳

فہرست

[illegible] شائع ہوا

زمانہ مارچ سنہ ۱۹۴۲ء
آپ اپنی
کمزوری نہیں چھپا سکتے
دوسرے لوگ جانتے ہیں اور عورتیں جلد محسوس کر لیتی ہیں کہ آپ کیا ہیں موجودہ
زمانے میں کمزور دل شرمیلے اور ہچکچانے والے آدمی کیلئے کوئی گنجائش نہیں
دنیا کو اسکی ضرورت نہیں آپ یقیناً اس قسم کے لوگوں میں اپنے کو شمار ہوتا
ہوتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے، صحیح معنوں میں مرد بنئے۔
زندگی کا لطف دوبارہ حاصل کیجئے!
اگر آپ کمزور اور نامرد ہیں، اگر آپکی دنیا ہنستی ہے اور آپکے
متعلق سرگوشیاں ہوتی ہیں، آپکا ذکر حقارت سے کیا جاتا ہے
تو اسکے لئے آپکے پاس معقول عذر نہیں یہ آپ کا اپنا
قصور ہے کہ آپ کمزور اور دائم المریض ہیں
آپ صحیح معنوں میں مرد بن سکتے ہیں
ایسے مرد جس کی سب تعریف کریں اور عزت کریں قطع نظر
اسکے کہ آپنے گذشتہ زمانے میں اپنی قوت کے متعلق کتنی لاپرواہی
سے کام لیا ہے اور کن کن بدعنوانیوں کے مرتکب ہوئے ہیں،
آپ بھی اب دنیا کی مشہور دوا
طلاء حنا
جو فخر خاندان شریفی عالیجناب افضل الاطبا حکیم محمد ذکریا خان صاحب رئیس اعظم دہلی سرپرست شریفی دواخانہ
کی مایہ ناز ایجاد ہے اور جسکے جادو اثر اور حیات پرور ہونیکا ہزاروں مایوس العلاج مریض اعتراف کر چکے ہیں
طلب فرما کے زندگی کا حقیقی لطف حاصل کیجئے۔ پہلے یہ طلا نوابوں راجاؤں کیلئے مخصوص تھا، آبلہ و چھالہ نہیں ڈالتا
ٹھنڈے پانی کا پرہیز نہیں دقت پہلے ہی روز کے استعمال سے طلسماتی اثر ظاہر ہے ناکارہ سے ناکارہ شخص بے پناہ
قوت کا مالک بن جاتا ہے اور پندرہ روزہ استعمال سے جملہ نقائص دور ہو جاتے ہیں اور پھر تمام عمر کسی طلاء کی ضرورت
باقی نہیں رہتی، قیمت، فی شیشی پانچ روپے۔ جو پندرہ دن کے لئے کافی ہے۔ ترکیب استعمال ہمراہ دوا۔
شریفی دواخانہ یونانی بلیماران پوسٹ بکس ۶۴ دہلی

جلد ۸۴ — مارچ سنہ ۱۹۴۵ء — نمبر ۳

غالب کی شاعری میں واقعات کا پرتو

از ڈاکٹر م، حفیظ سید، ام اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

غالب کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کا کلام خود ان کی زندگی کا آئینہ ہے تقریباً ہر شاعر صاف یا مبہم طور پر اپنی زندگی کے کچھ واقعات کو ضرور موضوعِ تحریر بناتا ہے لیکن غالب کے ساتھ یہ خصوصیت وابستہ ہے کہ انھوں نے اپنی غزلوں کے تمام فلسفیانہ اور شاعرانہ مواد خود اپنی زندگی کے واقعات اور حالات سے فراہم کئے جن سے ان کے وسیع نظریۂ حیات اور صحیح ادبی شعور کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

غالب کے دیوان سے ایسے بہت سے اشعار کا انتخاب کیا جاسکتا ہے جن میں ایک حد تک شاعر کی داخلی زندگی کے نقوش نمایاں ہیں اور جن سے بعض اہم کوائف اور حالات کا انکشاف ہوسکتا ہے میں نے مرزا غالب کے دیوان سے اس قسم کے متعدد اشعار منتخب کر کے ان میں ایسا ربط باہمی اور تسلسل قایم کرنے کی کوشش کی ہے جس سے ان کی زندگی کا ایک رخ سامنے آجائے۔ یہ اشعار مرزا غالب کی زندگی کے ان اہم واقعات کا پتہ دیتے ہیں جنھیں روایتی اور بے کیف تفصیلات کی بڑی سی بڑی مقدار بھی پیش کرنے سے قاصر ہے ان اشعار میں شاعر کی داخلی زندگی کا ردوبدل ہو کر مطالعہ کیا جاسکتا ہے کیونکہ دراصل ان اشعار میں غالب کے پختہ عقاید اور ان کی زندگی کے بحرانی

واقعات کی یادیں محفوظ ہیں یہ اشعار غالب کی شخصیت کے انہیں پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں جو ہر لحاظ سے قابل یادگار ہیں۔

پانچ سال کی عمر میں غالب کے سر سے والدین کا سایہ اٹھ گیا۔ اور نو سال کی عمر میں چچا کا انتقال ہوگیا۔ تیرہ سال کی عمر میں شادی ہوئی۔ غالب اس واقعے کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ شادی کم عمری میں یتیم ہوجانے کی مصیبت سے کم نہ تھی۔ غالب کے نزدیک یہ شادی کیا تھی گویا حبس دوام کی سزا تھی، ہمیشہ کے لئے پاؤں میں بیڑیاں اور گردن میں طوق محکومیت ڈال دیا گیا۔

مندرجہ ذیل شعر میں انھیں دو واقعات کی طرف اشارہ ہے:-

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے — اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

مرزا کا عنفوان شباب، دولت، آرام اور آسایش کی گود میں پلا تھا۔ وہ عیش و عشرت کی محفل کے رند تھے۔ یہاں تک کہ ایک نو بہارِ ناز پر فریفتہ بھی ہوگئے۔ انھیں عیش و عشرت کی محفلوں کی یاد میں کہتے ہیں:-

یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں — لیکن اب نقش و نگار طاقِ نسیاں ہوگئیں

محبوب دنیا سے چل بستا ہے مرزا نے اس صدمۂ عظیم سے متأثر ہوکر جو غزل شاید اس کی یاد میں لکھی تھی اس کا آخری شعر یہ ہے:-

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے — کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

غزل کے کامیاب ہونے میں شک نہیں لیکن اس میں وہ بے پایاں غم اور وہ لامتناہی احساس نہیں جو دلوں کو ویران کر دیتا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ غالب عشق کے زخموں سے اتنے چور نہیں تھے یا ان کی محبت دیوانگی کی اس حد تک نہیں پہونچی تھی۔ جیسے خود انھوں نے ذیل کے اشعار میں پیش کیا ہے:-

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا — دل پہ اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے
عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ — رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوق خواری ہائے ہائے

بہر حال اس محبت کی یاد ان کے دل سے کبھی نہیں مٹی۔

مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام ایک خط میں اپنی منظورِ نظر چنا جان کی موت پر یوں اظہارِ غم کرتے ہیں:-

"شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہوجائے۔ فقیر کی یہ انتہا ہے کہ وہ حسن بصری سے ٹکر کھائے۔ عاشق کی

نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی۔ تمھاری محبوبہ تمھارے سامنے مری بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمھاری معشوقہ تمھارے گھر میں مری۔ بھئی مغل بچے بھی غضب کرتے ہیں جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے مار رکھا ہے۔ خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو کہ دوست کے مرنے کا زخم کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے۔ چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے اب وہ کوچہ چھٹ گیا اس فن میں بیگانۂ محض ہوگیا ہوں۔ لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔"

غالباً اسی پُرآشوب زمانے میں مرزا نے شراب نوشی کی ابتدا کی۔ اپنی ایک غزل میں انھوں نے اس واقعہ کی نفسی کیفیت بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کی ہے۔ جو غم زدہ اور مجبور اور لاچار انسان کو شراب نوشی میں پناہ لینے پر مجبور کر دیتی ہے۔

مندرجہ ذیل اشعار کے مطالعے سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کی شراب ان لوگوں کی مصنوعی شراب سے الگ ہے جو جام و صراحی کا حقیقی تجربہ تو نہیں رکھتے لیکن تخیل کے زور سے شراب کے اوصاف بیان کرنے اور اس کے نشے اور کیفیت کو سراہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مرزا اپنی شراب نوشی کے لئے یوں وجہ جواز تلاش کرتے ہیں کہ شراب سے مقصد نشہ و کیفیت نہیں بلکہ وہ بے خودی و سرشاری ہے جس میں دنیا کے آلام و افکار ڈوب کر رہ جاتے ہیں۔ غالب کی انتہا پسندی یہاں بھی رنگ لائی اور وہ بے خودی سے گذر کر اس منزل پر پہونچ گئے جہاں شراب کا کیف و خمار انسان کی ذہنی صلاحیتیں کو وقتی طور پر ابھار کر اس پر ایک شاعرانہ وجد کا عالم طاری کر دیتا ہے۔

مئے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو	ایک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

جیسا کہ ظاہر تھا "غم و آلام" کو "غرق مئے کوثر" کرنے کی کوشش غالب کی صحت کے لئے بہت مضر ثابت ہوئی۔ ان مصائب کا احساس تیز تر ہوتا گیا جن سے وہ فرار اختیار کرنا چاہتے تھے۔ صحت تباہ ہوگئی۔ مالی مشکلات نے اور بھی ملول خاطر کیا اور وہ ایک تباہ و برباد انسان ہوکر رہ گئے۔

مئے ہی پھر کیوں نہ میں پئے جاؤں	غم سے جب ہوگئی ہے زیست حرام

بہت سہی غم گیتی، شراب کم کیا ہے	غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز	سوائے بادۂ گلفام مشکبو کیا ہے

میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"میر یہدی صبح کا وقت ہے۔ جاڑا خوب پڑ رہا ہے انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے دو حرف لکھتا ہوں ہاتھ تاپتا جاتا ہوں، آگ میں گرمی نہیں گر ہائے آتش سیال کہاں کہ جب دو جرعے پی لئے فوراً رگ دپے میں دوڑ گئی دل توانا ہو گیا۔ دماغ روشن ہو گیا نفس ناطقہ کو تواجد بہم پہونچایا۔"

اسی خیال کو وہ یوں ایک شعر میں پیش کرتے ہیں:۔

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا		سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

مرزا کے طریق شعر گوئی کے بارے میں مولانا حالی فرماتے ہیں:۔

"فکر شعر کا یہ طریقہ تھا کہ اکثر رات کو عالم سرخوشی میں فکر کیا کرتے تھے اور جب کوئی شعر سرانجام ہو جاتا تھا تو کمر بند میں ایک گرہ لگا لیتے تھے اسی طرح آٹھ آٹھ دس دس گرہیں لگا کر سو رہتے تھے اور دوسرے دن صرف یاد پر سوچ سوچ کر تمام اشعار قلم بند کر لیتے تھے۔"

ایک دوسری جگہ مولانا حالی لکھتے ہیں:۔

"مرزا کے خاص خاص شاگرد اور دوست جن سے نہایت بے تکلفی تھی اکثر شام کو ان کے پاس جا کر بیٹھتے تھے اور مرزا سرور کے عالم میں اس وقت بہت پُر لطف باتیں کیا کرتے تھے۔"

غالب نے اس شعر میں اسی واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

پھر دیکھئے انداز گل افشانی گفتار		رکھ دے کوئی پیمانہ صہبا مرے آگے

ان رنگ رلیوں کا نتیجہ سوائے تباہی اور کیا ہو سکتا تھا، دولت اور جائداد دونوں ہاتھ سے جاتی رہیں اور مختلف قسم کے جسمانی امراض نے اپنا زور دکھلانا شروع کیا جیسا کہ خود غالب کو شکایت ہے:۔

کر دیا ضعف نے عاجز غالب		ننگ پیری ہے جوانی میری

مرزا غالب کے لئے خانگی زندگی میں بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس بے تعلقی کے دو اسباب قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ ایک تو غالب کی ذاتی مصروفیتیں جن کا اوپر تذکرہ کیا جا چکا ہے، اور دوسرے خود ان کا بلند فلسفیانہ دماغ جس کے نزدیک تمام انسانی تعلقات اور رشتے انسانی اُمیدیں اور تفکرات وہم سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ اس بے تعلقی کو یوں وہ ایک شعر میں ادا کرتے ہیں:۔

فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں		میں کہاں اور یہ وبال کہاں

یہاں پر حالی کو شبہہ ہے کہ آیا یہ غالب کی محض ایک شاعرانہ ادا تھی یا انھوں نے اپنے سچے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ مرزا ہمیشہ کرایہ کے مکان میں رہے۔ اگرچہ دہلی میں ان کا قیام پچاس سال تک رہا، لیکن ذاتی مکان بنوانے کی خواہش تشنۂ تکمیل ہی رہی اسی سلسلے میں وہ خود ایک جگہ

لکھتے ہیں :-

گھر میں تھا کیا؟ جو ترا غم اسے غارت کرتا — وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرت تعمیر سو ہے

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ — سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

قلتِ آمدنی کے سبب مرزا ہمیشہ مقروض رہے۔ مرزا قربان علی کے نام ایک خط میں وہ اپنی مشکلات کا یوں نقشہ کھینچتے ہیں :-

"میری جان کن اوہام میں گرفتار ہے، جہاں باپ کو پیٹ چکا۔ اب چچا کو بھی رو۔ تجھ کو خدا جیتا رکھے اور تیرے خیالات اور احتمالات کو صورت وقوعی دے۔ یہاں خدا سے بھی توقع نہیں مخلوق کا کیا ذکر۔ کچھ بن نہیں آتی اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصوّر کیا ہے جو دکھ مجھے پہونچتا ہے کہتا ہوں۔ کہو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ غالب کیا مرا بڑا الحد مرا۔ بڑا کافر مرا۔ ہم نے ازراہِ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرام گاہ و عرش نشیمن خطاب دے دیتے ہیں چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمروئے سخن جانتا تھا۔ سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آئیے نجم الدولہ بہادر ایک قرضدار کا گریبان ہاتھ میں ایک قرضدار کو بھوگ لگ رہی ہے میں اس سے پوچھ رہا ہوں اجی حضرت نواب صاحب، نواب صاحب کیسے اور خاں صاحب آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے، کچھ تو اکسو کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا۔ بے عزّت۔ کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا۔ میوہ فروش سے آم۔ صرّاف سے دام قرض لئے جاتا ہے یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا۔"

اس طویل خط کا خلاصہ یوں کیا ہے ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں — رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مرزا کی جوانی بڑے عیش و آرام میں گذری تھی چنانچہ بڑھاپا آنے سے قبل آمدنی کے تمام ذرائع ختم ہو گئے۔ زندگی کے آخری سال بجائے عیش و آرام کے مصائب اور مالی مشکلات میں گذرے چنانچہ وہ اکثر اور بیشتر اپنے گذشتہ دنوں کو حسرت و یاس کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے — متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن کا

وہ کمرہ جس میں مرزا اپنے روز و شب گذارتے تھے۔ مکان کے صدر دروازہ کے ٹھیک اوپر ایک دو منزلے پر واقع تھا۔ کمرے پر ایک اور اندھیرے اور نیچی چھت والے بغلی کمرے کا چھوٹا سا تنگ دروازہ

کھلتا تھا۔ مرزا کے کمرے کی تاریکی اور اندھیرا کی نے مندرجہ ذیل شعر کی قنوطیت اور یاس انگیزی میں مکمل اظہار پایا ہے ؎

کیا کہوں تاریکی زندانِ غم اندھیر ہے
پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

مرزا کو چوسر سے بہت شوق تھا۔ اور جوئے سے ہمیشہ شغف رہا۔ ایک مرتبہ اسی بنا پر کوتوال شہر نے جسے مرزا سے ذاتی بغض اور عناد بھی تھا۔ انہیں پولیس کی حراست میں ڈال دیا۔ غالباً یہی واقعہ اس شعر کا محرک ہوا ؎

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں ہی سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

مولانا آزاد رقم طراز ہیں کہ ایک غیر معمولی واقعے کی بناء پر مرزا کچھ دنوں تک زیرِ حراست رہے۔ ٹھیک جیسے یوسف علیہ السلام مصر کے قید خانہ میں بند رہے تھے، ان کے کپڑے گرد آلود تھے اور ان میں جوئیں رینگ رہی تھیں۔ ایک روز مرزا کپڑوں سے جوئیں نکال رہے تھے کہ ایک رئیس ملاقات کو آئے۔ مزاج دریافت کیا تو برجستہ شعر میں جواب دیا ؎

ہم غم زدہ جس دن سے گرفتار بلا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیوں کے ٹانکوں سے سوا ہیں

جس دن قید خانے سے باہر نکلے اور کپڑے بدلنے کا موقع آیا تو مرزا نے اپنی قمیص چاک کر دی اور برجستہ یہ شعر پڑھا ؎

ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

اپنی خود نوشتہ سوانح عمری اور خطوط میں مرزا نے لکھنؤ، مراد آباد، رام پور، اور ہاپوڑ کے واقعات سفر درج کئے ہیں۔ لیکن سفر کی صعوبتوں اور ہم سفروں کی بے اعتنائیوں کا کہیں تذکرہ نہیں اور سفر کے مصائب اور مشکلات اور دوستوں کی سرد مہری کو یوں نظم کیا ہے ؎

دشوارِ رہ دستم ہم زباں نہ پوچھ
ناچار بے کسی کی بھی حسرت اٹھائیے

چودھری عبدالغفور خاں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"بندہ پرور میرا کلام، کیا نظم کیا نثر، اُردو کیا فارسی، کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا۔ دو چار دوستوں کو اس کا التزام تھا کہ وہ سودات مجھ سے لے لے کر جمع کر لیا کرتے تھے سو ان کے لاکھوں روپئے کے گھر لٹ گئے۔ جس میں ہزاروں روپیہ کے کتب خانے بھی گئے۔ اس میں وہ مجموعۂ پریشان بھی غائب ہوئے ہیں۔"

غالباً اسی نقصان کا احساس اس شعر کی تخلیق کا باعث ہوا۔

نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل بہ باد　　　یادگارِ نالہ ایک دیوان بے شیرازہ تھا

مرزا کے ابتدائی کلام پر خوب اعتراض ہوئے۔ کچھ لوگوں نے تو مرزا کے منھ پر کلام کے بے معنی ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس پر جل کر کہتے ہیں ؎

نہ ستایش کی تمنا نہ صلہ کی پروا　　　گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

بقول مولانا حالی مندرجہ ذیل شعر بھی اسی واقعے سے متعلق ہے۔

گر خامشی سے فائدہ اخفائے راز ہے　　　خوش ہوں کہ بات میری سمجھنا محال ہے

مندرجہ ذیل رباعی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　　سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمایش　　　گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

مرزا آزاد منش تھے یہاں تک کہ داد و ستایش کی بھی پروا نہیں کرتے تھے۔ وہ خود اپنے کلام کی صحیح قدر و قیمت سے آگاہ تھے۔ اپنے دواوین کے نام کے نیچے مندرجہ ذیل اشعار کو عنوان زرین بنایا ہے۔

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے　　　کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور
جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی　　　گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

اپنے ادق کلام کے بارے میں کہتے ہیں۔

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے　　　مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

اپنے اشعار کے پُر معنی ہونے کی خصوصیت کو یوں ایک شعر میں بیان کرتے ہیں۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے　　　جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

ایک اور جگہ یوں گوہر فشاں ہیں ؎

فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر　　　کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل

ایک بلند پایہ شاعر ہونے کی حیثیت سے جس مقبولیت اور قدر و منزلت کے مرزا حقدار تھے وہ انھیں جیتے جی نصیب نہ ہوئی۔ شہنشاہ بہادر شاہ کو "نیمروز" کے لقب سے یاد کر کے لکھتے ہیں۔

"بہ شاہجہانی میں کلیم کا کلام سونے میں تولا گیا تھا میری صرف یہ آرزو ہے کہ میرا کلام بھی کلیم کے مقابلے میں تولا جائے"

لیکن ان کی یہ آرزو کبھی پوری نہ ہوئی۔ بالکل بجا طور پر اپنے کلام کی بے قدری کے شاکی ہیں۔

حبیب اللہ ذکا کے نام ایک خط میں اپنی طویل عمر کا تذکرہ کرتے ہوئے اس بات کے شاکی ہیں کہ ۷۰ سال کی عمر ہوئی لیکن فن شاعری کا کوئی صلہ نہ ملا۔ بادشاہ وقت ان کی شاعری کی قدر ضرور کرتا ہے لیکن اس سے کوئی مالی فائدہ نہیں حاصل ہوتا۔

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد　　کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا　　سمجھا ہوں دل پذیر متاع ہنر کو میں

مرزا کی سوانح عمری میں ان کے ہم عصروں کی بے اعتنائیوں کا تذکرہ صرف ان کے کلام کے اعتراضات کے سلسلے میں آتا ہے۔ "قاطع برہان" پر نہایت سخت قسم کی بوچھار کی گئی اور معترضین نے مرزا کو گالیوں سے بھرے ہوئے خطوط بھی لکھے۔ اس قسم کی مخالفانہ تنقیدوں نے مرزا کے دل کو جتنی تکلیف پہونچائی اتنی شاید کوتوال شہر نے یا ان کے چچا نے بھی نہ پہنچائی ہوگی جنھوں نے مرزا کو حق وراثت سے محروم کر دیا تھا۔

مرزا نے مخالفین کے ایک کمینہ گروہ کے خلاف جنھوں نے "قاطع برہان" کے جواب میں ایک گندہ اور بیہودہ رسالہ شایع کیا تھا۔ مقدمہ دائر کیا۔ مولویوں نے جن کو وہ اپنا دوست سمجھ بیٹھے تھے مخالفت میں گواہی دی۔ ان کے نقادوں کا یہی غیر ہمدردانہ رویہ تھا جس نے مرزا کو مندرجہ ذیل اشعار کہنے پر مجبور کیا۔

کہوں کیا خوبی اوضاع ابنائے زماں غالب　　بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

ہے اب اس معمورہ میں قحط غم الفت اسد　　ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

کرتے کس منھ سے ہو غربت کی شکایت غالب　　تم کو بے مہری یاران وطن یاد نہیں

ان کے خلاف جن کا پیشہ جھوٹ اور فریب کاری تھا اور جنھوں نے ان کے دل پر چرکے لگائے تھے انتہائی جذبۂ نفرت ہی کی بنا پر مرزا نے یہ آرزو ظاہر کی تھی۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو　　ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

تمام زندگی مرزا نے نہ تو نماز پڑھی نہ روزہ رکھا۔ ایک مرتبہ مولانا حالی نے مرزا کو ایک خط لکھا جس میں پنجگانہ نماز ادا کرنے کی ہدایت کی۔ مرزا نے اس دوستانہ خط کے غلط معنی لئے۔ چنانچہ انکا مندرجہ ذیل شعر اسی واقعہ سے تعلق رکھتا ہے۔

دل گذرگاہ خیال مے و ساغر ہی سہی　　گر نفس جادۂ سر منزل تقویٰ نہ ہوا

دوسرے شعر میں کہتے ہیں ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زُہد　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ایک اور شعر میں وہ اپنے طرزِ حیات کو یوں سراہتے ہیں ؎

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے؟　　ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو

مرزا کے حالات زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی غم و آلام سے معمور تھی۔ مالی حالت عہد جوانی تک اچھی رہی۔ اس کے بعد مرزا نے کبھی آسودہ حالی کا منہ نہیں دیکھا آمدنی خاصی تھی۔ لیکن ان کی ضروریات کے لئے ناکافی چنانچہ ہمیشہ تنگ دست رہے۔ غدر کے زمانے میں ایک عظیم الشان آفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی تمام جائداد چھن گئی اور وہ مفلس اور قلاش بن گئے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ان پر آشوب دنوں میں بستر، کپڑے اور اوڑھنا بچھونا لوگ فروخت کر رہے ہیں اور اس کے بدلے سامان خورد و نوش خرید رہے ہیں۔

اپنی حیثیت بڑھانے کے لئے کئی ذرائع آزمائے لیکن تقدیر دوبارہ لوٹ کر نہیں آئی کہتے ہیں

کوئی اُمید بر نہیں آتی　　کوئی صورت نظر نہیں آتی

مالی مشکلات کے علاوہ مرزا کو قریبی رشتہ داروں اور عزیزوں کی اچانک موت کے صدمے بھی برداشت کرنے پڑے۔ بچپن ہی میں والدین کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ بھائی جن کا نام مرزا یوسف تھا تین سال تک پاگل رہے اور غدر کے زمانے میں انتہائی کس مپرسی کے عالم میں انتقال کیا۔ ایک موقع پر اپنے بھائی کی کیفیت مرض کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:۔

دی میرے بھائی کو حق نے از سر نو زندگی　　میرزا یوسف ہے غالبؔ یوسفِ ثانی مجھے

مرزا کے سات بچے تھے لیکن کوئی زندہ نہیں رہا۔ اپنی بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارفؔ سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس موقع پر مرزا نے جو اندوہناک اشعار کہے تھے ان میں سے ایک یہ ہے ؎

لازم تھا کہ دیکھو میرا رستہ کوئی دن اور　　تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

یہی وہ غم و مصائب تھے جنھوں نے مرزا سے اس نوع کے دردناک اشعار کہلوائے ؎

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا　　دل بھی یا رب کئی دیئے ہوتے

کچھ تو دیجئے فلکِ ناانصاف　　آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے　　لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

آخر مرزا بھی انسان تھے اور مصائب کا خاتمہ چاہتے تھے۔ انتہائی مایوسی کے عالم میں انھوں نے

موت کی آرزو کی۔

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام　　ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

ایک مرتبہ انہوں نے عبدالغفور کو خط میں لکھا۔

"حضرت سچ تو یوں ہے کہ غم ہائے روزگار نے مجھ کو گھیر لیا ہے سانس نہیں لے سکتا۔ اتنا تنگ کر دیا ہے کہ ہر بات سو طرح سے خیال میں آئی پر دل نے کسی طرح تسلی نہ پائی۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید　　ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے

موت سے بیس سال پہلے سے مرزا مرنے کے لئے بے قرار تھے ہر سال اپنی موت کی تاریخ کہتے اور ہر سال غلط ثابت ہوتی۔ آخر کار مرزا نے ۱۲۷۷ھ اپنے مرنے کا سال مقرر کیا۔ الفاظ یہ تھے — "غالبؔ مرد" جواہر سنگھ جوؔاہر، مرزا کے ایک جگری دوست نے کہا: "خدا کے فضل سے یہ بھی غلط ثابت ہو گی۔"

مرزا نے التجا کی اس قسم کی پیشین گوئی نہ کرو۔ اگر یہ تاریخ غلط نکلی تو سر ٹکرا کر زندگی کا خاتمہ کر لوں گا۔

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ　　ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　　موت آتی ہے پر نہیں آتی

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجئے　　ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

آخر مرزا کی آرزو بر آئی اور وہ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو بہتر (۷۲) سال کی عمر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔

رباعی

ہر گام پہ دھوکے کے بچھے ہیں پھندے　　اور مکر و ریا کے ہیں جہاں میں دھندے

باہر سے جو دیکھیں تو ہیں تن کے اُجلے　　دنیا میں سیہ دل کے ہیں لیکن بندے

بَدبیں

(از شاعرِ اعظم حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

کونین کی ہر آگ کو کجلاتا ہے   آفاق کے ہر نور کو دھندلاتا ہے
مہتاب میں دھبے ہیں، گلوں میں کانٹے   بدبیں کو بس اتنا ہی نظر آتا ہے

غیبت و خرابات

غیبت ہو خرابات کے اندر، یہ کیا   بوتل سے کھُلے کذب کا دفتر، یہ کیا
اربابِ نظر! بساطِ پاکِ مے پر   گردش میں ہو بہتان کا ساغر، یہ کیا!!!

ناروا تیز رفتاری

اے عمرِ رواں کی رات، دَم بھر تو ٹھہر
اے ناظرِ کائنات، دَم بھر تو ٹھہر
اک شے پہ بھی جمنے نہیں پاتی ہے نگاہ
اے قافلۂ حیات، دم بھر تو ٹھہر!

جذباتِ فراق!

(از جناب پروفیسر رگھپتی سہائے صاحب ایم-اے)

اک جہانِ رنگ و بو ہو کر وہ نام آہی گیا
آج گردش میں یہ چھلکا چھلکا جام آہی گیا

دھڑکنیں تاروں کے دل کی لیکے جام آہی گیا
جس کا ڈر تھا آج ساقی وہ مقام آہی گیا

سمتِ اہلِ غم کوئی مستِ خرام آہی گیا
بے پیام آہی گیا بے التزام آہی گیا

دل کے اسبابِ اسیری شوق کچھ رکتے ہوئے
بچ کے اُڑتا تھا کہ طائر زیرِ دام آہی گیا

آمدِ آدم سے ذراتِ جہاں لو دے اُٹھے
اس بھری محفل میں اک ناشاد کام آہی گیا

عشق کی آواز ہے شمعِ شبستانِ حیات
اس میں اُن جلووں کا اندازِ خرام آہی گیا

ایک پیغامِ سکوں تیری نظر دے ہی گئی
انقلاباتِ زمانہ کو قیام آہی گیا

مہر و مہ سے بھی عیاں ہے حسرتِ پسماندگاں
منزلیں ہیں گردِ منزل وہ مقام آہی گیا

بڑھ چلا سوز و گداز داستانِ اہلِ دل
اک چراغِ شامِ غم بن کر وہ نام آہی گیا

کشتگانِ عشق پھر انگڑائیاں لیکر اُٹھے
زندگی کا موت کو آخر سلام آہی گیا

روئے تاباں پر گھنی پلکوں کی یہ پرچھائیاں
اس سحر میں آج سوز و ساز شام آہی گیا

تال سم بن کر مرے نغموں کا اے جانِ فراق
تیرا نام آہی گیا تیرا پیام آہی گیا

تصویرِ حُسن

از مسٹر سلیم جعفر

ناظرین "نیرنگ حُسن"[1] ملاحظہ فرما چکے، اب "تصویرِ حُسن" کے نظارے سے لطف اندوز ہوں۔ "نیرنگِ حُسن" میں پروازِ تخیل کو بہت کم دخل ہے۔ جو واقعات کہ علم و تجربے سے متعلق ہیں، وہ شاعرانہ زبان میں بیلاگ بیان کئے گئے ہیں۔ اُن پر فضائے ابتذال چھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے، لیکن حسن و عشق کی معاملہ بندی میں اس سے دامن بچانا خارج از امکان ہے۔ سر جارج گریرسن نے اعتراض ابتذال کے جواب میں ایک جرمن شاعر کا یہ مقولہ پیش کیا ہے۔ "اگر کسی شاعر کو سمجھنے کی ہوس ہے تو پہلے اقلیم سخن میں داخل ہو۔" لیکن جب معاملہ بندی سے نکل کر شاعر نے ایسے میدان میں قدم رکھا جہاں واقعات شاعری کے لئے مصالح بہم نہیں پہونچاتے بلکہ ایک چیز کو دلکش اور نئے پہلوؤں سے پیش کرنے کی ضرورت ہے تو تخیل بروئے کار آیا اور جدت و جودت کو موقع ملا۔ مگر یہاں بھی تخیل کے کرشموں کا جلوہ خیرہ کن نظر نہیں، اس کی تگ و دو زیادہ تر قفِ تلاش تشبیہات ہے۔ کیونکہ شاعر اس تصور و کیفیت کا نقشہ دکھانے کی سعی کر رہا ہے جو ایک حسین شے کے نظارے سے اس کے آئینہ قلب پر منعکس ہوتی ہے۔ لیکن تشبیہ سے بہتر نامعلوم کو معلوم کے دائرے میں لانے کا کونسا ذریعہ یا ترکیب ہے؟

غالباً ایشیا کے غالب حصے کے شاعروں نے "سراپائے محبوب" لکھا ہے۔ چونکہ اُردو نے فارسی کا دودھ پیا ہے جس طرح ہندی نے سنسکرت کا، اس لئے اُردو نے فارسی کی نقل کی ہے۔ جن اصحاب کو شوق ہو کہ وہ اس بات میں فارسی کا اندازِ بیان دیکھیں، وہ نعمت خاں عالی کی تصنیف "حُسن و عشق" ملاحظہ فرمائیں۔ ایرانیوں کے محبوب کا نقشہ آنکھوں میں پھر جائے گا۔ اردو میں سیّد محسن علی صاحب محسن نے اپنی تالیف "سراپا سخن"[2] میں اربابِ ذوق کے لئے سامان مہیا کر دیا ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے ابھی ہدیۂ ناظرین ہے۔ جناب منشی دیبی پرشاد صاحب بدایونی متخلص بہ سحر کے ذاتی مثنوی "ضوابطِ معروف بہ تحویرِ عشق" سے سراپائے ذیل منقول ہے:

---

[1] ملاحظہ ہوں رسالہ زمانہ کے نمبر از ماہ فروری سنہ ۱۹۴۲ء تا جولائی سنہ ۱۹۴۲ء۔

[2] یہ کتاب مطبع نامی منشی نول کشور نے سنہ ۱۸۶۱ء میں شائع کی تھی۔

بارے اک کوچے سے اک روز ہوا میرا گزر　　ناگہاں پڑ گئی میری نظر اک غرفے پر
آیا اک شوخ طرح دار پری زاد نظر　　خوش ادا مہر لقا زہرہ جبیں رشکِ قمر

رشکِ عذرا کہوں یا غیرتِ لیلیٰ اس کو
لعبتِ چین کہوں یا یوسفِ مصری اس کو

گیسو و جعد سیہ اس کی تھی الفی سیاہ　　تیغ ابرو تھی مژہ تیر تھی خنجر تھی نگاہ
جبہ نورِ سحر عید تھی اس کی واللہ　　آنکھیں تھیں غیرتِ آہو جو کریں دل کو تباہ

اوج میں اپنی وہ بینی تھی سرِ شعلۂ طور
صدفِ قلزمِ خوبی تھے وہ گوشِ پُر نور

گل تھے رخسار تو گلبرگ سے لب تھے حاشا　　تھا دہن غنچہ صراحی تھی وہ گردن بہ خدا
دوش ہمدوشِ قیامت تھے تو بازو تھے بلا　　ہاتھ تھا نام خدا نور کے سانچے میں ڈھلا

پنجۂ حُسن کا تھا نخلِ جو وہ دلبر ست
شاخِ گل سے نکل آئی تھی کلائی سرِ دست

ہاتھ کے وصف سے میں کیونکر کروں دستکشی　　کوئی تشبیہ سرِ دست نہیں ہاتھ آئی
قابلِ بوسہ تھی ہاتھوں کی ہتیلی اس کی　　حُسن و خوبی میں تھی انگشت نما ہر انگلی

سینہ اُبھرا تھا شکم نرم تھا اور پشت تھی صاف
تھی کمر بال سے باریک گرہ بال کی ناف

ران کو دیکھ کے پرّاں ہوں پری کے اوسان　　غیرتِ شمع تھیں ساقیں کروں کیا وصف بیاں
پاؤں اور پاؤں کے تلووں کو جو دیکھے انسان　　ہو دے خورشید جہاں تاب کے جلوے کا گماں

قد قیامت تھا بلا چال تھی فتنہ تھا خرام
عجب انداز و ادا رکھتا تھا وہ گل اندام

ب ایک ایک گیت یا سویا دوہا جو بیشتر سے بیشتر ہر عضو کے اوصاف کا حامل ہے، پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے مطالعے سے یہ امر بخوبی روشن ہو جائے گا کہ کم سے کم ایشیائی مذاق میں ایک اشتراک پایا جاتا ہے۔ جو اقوام ایشیا کے اشتراکِ فطرت کی دلیل ہے۔ اس کی جلوہ گاہیں خواہ ایران ہو، خواہ وادیہائے گنگ و جمن۔ رعبِ حُسن ہندی کے شاعر کو بیباکانہ رُخِ محبوب کی طرف دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا اس کی نظریں جھکی ہوئی ہیں اس لئے پہلے پاؤں پر پڑتی ہیں۔ وہ محوِ حیرت ہو کر ثنا خوانی شروع کرتا ہے

اور جیسی جیسی عبارت ترقی کرتی جاتی ہے وہ اُٹھتی اور پستی کی طرف مائل ہوتی جاتی ہیں

چَرَن [चरण] پاؤں کی توصیف میں سُرخی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

बिम्ब में प्रबाल में न ईंगुर गुलाल में न चंपक रसाल में न नेसुक निहारे में।
दाड़िम प्रसून में न सून धरा नून में न बुन्द्र बधून में न गुंजा अधिकारे में ॥
कुसुम सुरंग में न किनसुक सुरंग में न जावक मजीठ कंज पुंज वारि डारे में।
राधा जू तिहारे पग अरुन समान ताको हेरे हेरि कबिता न आवत हमारे में ॥

سیب، مونگے، سیندور، گلال، چمپا اور آم کی کونپل میں اس کے پاسنگ بھی سُرخی نہیں۔ گل انار ٹول، گھنگچی اور بیر بہوٹی میں یہ سُرخی کہاں؟ جاوک، مجیٹھ، کمل، خوشرنگ، کُسم اور خوبصورت ٹیسو اس پر قربان۔ اے پیاری رادھا تیرے پاؤں کیا ہیں شفق پھولی ہوئی ہے۔ میں نے ان کی توصیف نظم کرنی چاہی مگر تخیل نے جواب دیدیا۔ عہ

پَادَانگلی [पादांगुली] انگشت پا

अरुन कमल पग पांखुरी की पांते लसै सरस सघन सोभा मन के हरन की।
दीरघ न लघुताई पातरी सोहावती हैं देखे दुति होत जात बिद्रुम के बरन की ॥
नख कीनिकाई नीकी आरसी सोहाति है जामें देखी सोभा सौति के सरन की।
भरमी सुकवि कहु आवति न मेरी मति पांगुरी भई है लखि आंगुरी चरन की ॥

سُرخ کنول کے سے پاؤں گلاب کی پنکھڑیوں کا گچھا معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی دلفریب زیبائی دل چھینے لیتی ہے۔ انگلیاں نہ بڑی ہیں نہ چھوٹی۔ خوبصورت پتلی پتلی ہیں جنھیں دیکھنے سے آنکھوں میں مونگے کے رنگ کا سماں چھا جاتا ہے۔ ہر ناخن کیا ہے گویا ایک بہت ہی اچھی آرسی ہے کہ جس میں سوتوں کے سر نظر آتے ہیں۔ پاؤں کی انگلیاں دیکھکر عقل دنگ ہے۔ کچھ کہتے نہیں بن پڑتا۔

پَدنکھ [पदनख] ناخن انگشت پا

गुरुजन हू में राधे एके तक ताक करि प्रेम परिपाक कैन कबहू डगी रहै।
'गुरुदन्त' भूपर उदोत जगमग जोति कबिता चकोरन की ओरन जगी रहै।
भूलि सुधि पल की अनूप अंशु जालन में रूप ही के लालच में पुलक पगी रहै।
तेरे पदनख शशि मण्डल में बंक छबि सांवरे की नज़र कलंक सी लगी रहै।

عہ لفظی ترجمے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ لیکن خیال شاعر پیش کرنے کی کوشش سے بھی پہلو تہی نہیں کی گئی۔

ٹکٹکی باندھ کر دیکھا اور نشۂ محبت میں سرشار ہو کر بھی انھوں نے کبھی بزرگوں کے سامنے زمین پر قدم نہیں رکھا۔ تاہم اس پر روشنی پھیلی ہوئی ہے تخیل شاعر پر چکور کی سی کیفیت طاری ہے۔ اسے اپنا ہوش نہیں ماہ حسن کے دل کش دام شعاع میں گرفتار ہو کر بے خود ہے۔ اسے رادھا جی تمھارے ناخن کے ہالہ میں بانکی ادا والے سانولیا کی نظر گڑی رہتی ہے۔ جس طرح چاند میں سیاہی۔

بہار

(از جناب قمر لقمانی سہسرامی)

اودے اودے نیلے ابر کے چھانے کا موسم آگیا
فطرتِ رنگین کے اترانے کا موسم آگیا

بیٹھے بیٹھے دل کے گھبرانے کا موسم آگیا
پھر کسی ظالم کے یاد آنے کا موسم آگیا

شوخیاں اٹکھیلیاں کرتی ہوئی آئی نسیم
دل کی ہر اک چوٹ ابھر آنے کا موسم آگیا

کیف بارو شکر پرور ہوگئی ساری فضا
پھر لبِ جو، مینھ کر گانے کا موسم آگیا

ہو رہی ہیں محوِ آرائش عروسانِ چمن
پھر ردائے سبز بچھ جانے کا موسم آگیا

اب کہاں ذوقِ سکوں کیسی سکوں کی جستجو
کیف رنگ و بو میں کھو جانے کا موسم آگیا

تو مبارک ہو تمھیں شکوہ سرایانِ خزاں
ڈالی ڈالی کے نکھر آنے کا موسم آگیا

پھر نظر آتی ہے ہر اک شاخ پیمانہ بکف
لغزشِ پُر کیف چھڑ جانے کا موسم آگیا

احتیاط و ضبط کی سب کاوشیں جاتی رہیں
اے جنوں پھر پاؤں پھیلانے کا موسم آگیا

رخصت اے ضبطِ محبت رخصت اے صبر و قرار
بے نیازِ ہوش ہو جانے کا موسم آگیا

کار فرما ہر طرف ہے زندگی ہی زندگی
زندگی میں زندگی پانے کا موسم آگیا

مژدہ باد اے شوقِ بے پایان دیدار جمال
دامنِ نظارہ بھر جانے کا موسم آگیا

پھر دلِ مجروح میں محسوس ہوتی ہے چمک
پھر سراپا برق بن جانے کا موسم آگیا

آج تک جن سے لرز اٹھتا ہے دل میرا قمر
پھر انھیں باتوں کے یاد آنے کا موسم آگیا

از جناب کرشن سہائے صاحب وحشی کانپوری

اسی کا ڈھونڈھ رہا ہوں ازل سے کاشانہ
دل حزیں کی تڑپ میں ہے جس کا افسانہ

کسے یہ ہوش کہ مستی میں امتیاز کرے
یہ دورِ چشم سیہ ہے کہ دورِ پیمانہ

جو تم نہ ہونگے ماسوا کے پردے میں
تمام عالمِ ہستی ہے ایک ویرانہ

یہ اتصالِ محبت کا وقت ہے شاید
کہ شمع وجد میں ہے رقص میں ہے پروانہ

ہر ایک ذرہ میں اپنی ہی شکل پاتا ہوں
یہ بزم کون و مکاں ہے کہ آئینہ خانہ

عجب ہے عشقِ جنوں زا کی فطرتِ معصوم
کہ آگ کو بھی سمجھتا ہے کھیل دیوانہ

ہر ایک رنگ میں جلنا ہے پیکرِ غم کو
بشکلِ شمع جلے یا بشکلِ پروانہ

رہِ جنوں میں یہ پہلا قدم تھا وحشی کا
ابھی سے ہوگیا ہوش و خرد سے بیگانہ

ازجناب محکم سنگھ سونی - بی - اے، ایل - ایل - بی

دل میں خلش ضرور تھی۔ پھر بھی نہ آہ کر سکے
ضبط ہے شرطِ عاشقی، ہاں! جو نباہ کر سکے

ایسی نہیں ہے کیا کوئی گردشِ چرخ اے ندیم
جس سے موافقت مرا حالِ تباہ کر سکے

دیر و حرم سے درگزر دل کو وہ دِل بنا کبھی
جس کو جمالِ دوست خود اپنا گواہ کر سکے

حُسن کی عشق ابتدا۔ عشق کی حُسن انتہا
دونوں سے دور دیکھئے۔ دل جو نگاہ کر سکے

تیرا کرم۔ کہ دعوتِ دید عطا ہوئی ہمیں
اپنا نصیب۔ اُس طرف ہم نہ نگاہ کر سکے

آہ سحر گہی نہیں۔ نالۂ نیم شب نہیں
دیکھئے ہوش تابکے دل سے نباہ کر سکے

محکمؔ خستہ حال کا ذوقِ سخن تو دیکھئے
ایسا سخن ہی کیا ہے جو دل میں نہ راہ کر سکے

ثمر ممنوعہ

از مسٹر جگیشور ناتھ ورما بیتاب بریلوی بی۔اے۔ایل،ایل۔بی

بابو درگا چرن کے والد اپنی وفات کے وقت باغ بازار میں جو ایک چھوٹا سا مکان چھوڑ گئے تھے اس میں انھوں نے اور تو کوئی قابل ذکر اضافہ نہ کر پایا۔ البتہ مکینوں کی تعداد تھوڑے ہی دنوں میں بہت کچھ بڑھا لی۔ حالانکہ ایک مردم خیز طبقہ کے لئے یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی تاہم انھوں نے جس پامردی کے ساتھ یہ کامیابی حاصل کی تھی وہ قابل رشک ضرور تھی۔ لیکن اگر کوئی بابو صاحب سے دریافت کرتا تو اسے ماننا ہی پڑتا کہ اس نئی بڑھی ہوئی آبادی میں ناخواندہ مہمانوں ہی کی اکثریت تھی۔ ایسے ناخواندہ مہمانوں کی اکثریت جو مانے سے بھی ٹلنے کا نام نہ لیتے ہوں اور صاحب خانہ کے لئے بلائے بے درماں بنے ڈٹے بیٹھے ہوں۔

ایسے ہی ایک بارہ سالہ ناخواندہ مہمان کو نئے بھڑکیلے کپڑوں اور چھوٹے موٹے دو چار زیوروں سے سجا کر گھسیٹتے ہوئے بابو درگا چرن اپنی آبائی نشست گاہ میں داخل ہوئے۔ بیٹھک میں ایک ٹوٹے پھوٹے بتیں پانگ والے تخت پر بھوانی پور کے رائے بہادر پرسن کمار متر اپنے مصاحبوں کے حلقے میں بیٹھے فرشی حقہ کے لمبے لمبے کشوں سے دھوئیں کے بادل اڑانے میں مشغول تھے۔

بابو درگا چرن نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔ "رائے بہادر صاحب! یہی ہے میری منجھلی لڑکی"۔ اس کے بعد لڑکی سے بولا۔ "انھیں پرنام کر دو بیٹی"۔ لڑکی بدستور سمٹی سمٹائی رائے بہادر کے قدموں میں آنکھیں جھکائے چپ چاپ کھڑی رہی۔

رائے بہادر کی عمر کوئی پچاس برس کے قریب ہوگی۔ رنگ کافی گورا ہے۔ داڑھی مونچھوں کا بالکل صفایا ہے آنکھیں خوب بڑی بڑی ہیں اور جسم بھی خاصہ موٹا تازہ ہے۔ گلے میں چوڑے کنارے کا قیمتی دوشالہ ڈالے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے کچھ دیر تک لڑکی کو دیکھ کر انھوں نے کہا۔ "واہ یہ لڑکی تو بہت اچھی ہے۔ واقعی رنگ روپ اسی کا نام ہے بھگوان اس کی عمر دراز کرے اور سب طرح سے سکھی رکھے۔ کیوں سریش لڑکی اچھی ہے نا؟"

"جی ہاں اس میں شک نہیں" سریش نامی مصاحب نے کہا۔

"بیٹی اپنا نام تو بتاؤ؟" رائے بہادر نے پوچھا۔ لڑکی کے دونوں ہونٹ نیم شگفتہ کنول کی پنکھڑی کی طرح ہل کر رہ گئے اور ہمہ تن گوش سامعین کے کانوں میں بھنک تک نہ پڑی۔ درگا چرن نے ہمت افزائی کی۔ "بتا دو نا بیٹی با ہرج ہی کیا ہے"۔ "نندرانی" دہی۔ بڑی مشکل سے دبی ہوئی آواز میں اس نے کہا۔

"نندرانی؟ ٹھیک تو ہے۔ نام بھی برا نہیں ہے۔ کیوں مہیندر بھائی؟"

خوب ہے۔ مہیندر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نام تو یہی ہے۔ بابو درگا چرن بولے۔ لیکن گھر میں سب رانی ہی کہتے ہیں۔"

"کیوں نہیں۔ لڑکی بھی اسی لائق ہے۔ وہ ضرور راج رانی ہوگی۔ دیکھتے نہیں چہرہ کتنا صاف اور بے عیب ہے۔ آنکھوں سے بھولا پن ٹپکتا ہے۔ کیوں گھوشال مہاشے! ہے نا یہی بات؟"

"بالکل ــــ بالکل ــــ یہ لڑکی تو آپ ہی کی بہو بننے کے لائق ہے۔" گھوشال مہاشے نے اونگھتے اونگھتے سٹپٹا کر جواب دیا۔

"ہاں بیٹی! تم کھڑی کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ۔ درگا چرن بابو آپ بھی ادھر نکل آیئے۔ اس طرح کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہیں" لڑکی کو جھجکتے دیکھ کر درگا چرن ایک طرف کونے میں بیٹھتے ہوئے بولے "آؤ رانی! میرے پاس آ بیٹھو۔" رانی نیچا سر کئے باپ کے پاس جا بیٹھی۔

"بیٹی تم پڑھی کیا ہو؟" رائے بہادر نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھنے کے لئے پوچھا۔

"آکھیاں مجری دوسرا بھاگ، پدیہ پاتھ دوتیہ کھنڈ اور رامائن۔"

"پان لگانا جانتی ہو؟"

"جی ہاں!" بابو درگا چرن بیچ میں بول اٹھے۔ "ہماری بڑی لڑکی جب سے گھر بار کی ہوئی ہے تب سے گھر بھر کے لئے رانی ہی پان لگایا کرتی ہے۔ آپ نے جو بیڑا کھایا ہے وہ اسی کا لگایا ہوا ہے۔" رائے بہادر نے چاندی کی ڈبیہ میں سے ایک بیڑا نکال کر منھ میں رکھا اور اُسے چباتے ہوئے بولے "بیڑا تو اچھا ہے۔ مگر کچھ روٹی پانی کی بھی سُدھ بُدھ ہے؟"

"یہ سب کام تو کبھی کے سیکھ لئے ہیں۔"

"یہ بھی سیکھ لیا؟ اچھا ہے۔ آلو کا بھرتا، پرول کی ترکاری اور جھول بھی تو بنا ہی لیتی ہوگی؟"

"یہ بھی کیا کچھ مشکل ہے۔" رانی نے مسکرا کر کہا۔ رائے بہادر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "اتنی سی عمر میں سبھی کچھ سیکھ لیا۔ لڑکی بڑی ہوشیار معلوم ہوتی ہے۔"

"میں تو اس کا باپ ہوں۔" بابو درگا چرن سے بولے بغیر نہ رہا گیا۔ "رائے بہادر صاحب میرے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ پھول کی مہک اور کندن کی دمک کہیں چھپا کرتی ہے۔ اگر آپ اسے قبول کر لیں گے تو دیکھ لیں گے کہ لڑکی کیسی ہے۔ پچھلے مہینے جب گھر میں بال بچہ ہوا تھا۔ تو بڑی لڑکی موجود نہ تھی۔ میرے بیحد خوشامد کرنے پر بھی سمدھی جی نے اُسے دو دن تک کیلئے بھیجنا منظور نہ کیا۔ اس وقت میں بڑی مشکل میں پڑ گیا تھا۔ لیکن رانی نے سارے گھر کا بوجھ اپنے سر لیکر یہ مشکل بھی آسان کر دی تھی۔ اس کے جوہر تو آپکے قدموں میں جگہ پا لینے کے بعد ہی جان سکیں گے۔"

"یہ تو ہوگا ہی۔" سر ہلاتے ہلاتے مسکرا کر رائے بہادر نے کہا۔ "میں بڑی خوشی کیساتھ اسے اپنی بہو بناؤں گا۔ ایسی لڑکی کون ہاتھ سے جانے دیگا۔ اچھی بہو بڑی تقدیر سے ملتی ہے۔ کیوں ستیش کیا رائے ہے تمھاری! آخر تم چپ کیوں ہو؟"

"جی آپکا فرمانا بالکل بجا ہے۔ میں بھی یہی کہنے والا تھا۔" ستیش بولا۔

"اچھا ایک بات اور پوچھ لوں۔ پھر تم اندر چلی جانا بیٹی"۔ رائے بہادر نے اس کے کندھے کا سہارا لیتے ہوئے آگے کو جھک کے کہا:- "میرے سر میں جو سفید بال ہیں۔ انھیں بھی تم چن سکو گی؟ رانی! دوپہر کو جب میں کھانا کھا کر آرام کیا کرونگا۔ تو تم اس ننھے بڈھے باپ کے پاس بستر پر بیٹھ کر ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایک ایک پکے بال کو اکھاڑ کر پھینک سکو گی؟ معلوم ہوتا ہے تم نے یہ کام نہیں سیکھا ہے کیوں؟ ارے تمھارے باپ کا تو ایک بال بھی سفید نہیں ہے"۔ رائے بہادر کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ سندر رانی کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کا ہلکا سا سایہ آپڑا۔ آنکھ اٹھا کر اس نے رائے بہادر کی پیشانی پر نگاہ ڈالی۔ اس نے دیکھا کر وہاں بالوں کی تعداد اتنی ہے جتنی کہ کلجگ میں بھلے آدمیوں کی جو تھوڑے بہت بال ہیں بھی وہ ایک دوسرے سے بہت فاصلہ پر ہیں۔ اسکی خاموشی ہی کو نیم رضا سمجھ کر رائے بہادر نے کہا:- "اچھا! بیٹی یہ امتحان بھی ہو جائیگا۔ بہت دیر ہو گئی۔ اب تم اندر جا سکتی ہو۔"

نادمہ پہلے سے باہر منتظر تھی۔ سندر رانی کے تخت سے نیچے اترتے ہی وہ قریب آگئی اور بڑے تپاک سے ہاتھ پکڑ کر اُسے اندر لے گئی۔

۲

کوئی ایک منٹ تک رائے صاحب چپ چاپ حقہ گڑگڑاتے رہے۔ پھر بابو درگا چرن کی طرف فرشی بڑھاتے ہوئے بولے "اب یہ بتاؤ کہ تم نے شادی کے بارے میں کیا سوچ رکھا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ کب تک لڑکی کے ہاتھ پیلے کرنے کا ارادہ ہے؟ پہلے میں یہ بات ٹھیک طرح سے نہیں کہہ سکا تھا۔ ارے میں اپنی حماقت سے آپکو تم کہہ بیٹھا۔ معاف کیجئے گا"۔ "میرے لئے تو آپ کا تم کہنا ہی مناسب ہے۔ آپ کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کیجئے۔ آپ سے تو میں سب باتوں میں چھوٹا ہوں۔ عمر دولت مرتبہ اور عزت کس بات میں میں آپکی ہمسری کر سکتا ہوں اور ابتو۔"

"ہاں ہاں یہ تو میں مانتا ہوں کہ آپکی عمر میری بہ نسبت کچھ نہ کچھ کم ضرور ہے لیکن میرے یہ سفید بال کچھ بہت بھروسہ کی چیز نہیں ہیں ان کے پھیر میں پڑ کر کہیں آپ بھی دھوکہ نہ کھا جائیں۔ لیکن اگر آپنے کسی طرح بھی مجھے ایکدم بڈھا۔ پھونس سمجھ لیا تو میرا تو کہیں بھی ٹھکانا نہ لگے گا"۔ ایک زور کے قہقہے کے ساتھ انھوں نے بابو درگا چرن کی پیٹھ ٹھونکنا شروع کر دی۔ رائے بہادر کے مصاحبوں نے بھی اس چہلیش میں دل کھول کر انکا ساتھ دیا۔

درگا چرن نے ہنستے ہنستے کہا:- "آپ جب حکم کریں میں اسی روز کنیا دان کرکے اُدھار ہو جاؤں۔ اس کے لئے میں ہر وقت تیار ہوں اس بھاگن میں بھی سہاگ ہے۔ صورت بھی ٹھیک کرلی ہے۔ لیکن میں بہت ہی غریب ـــ سداماں کی طرح کنگال آدمی ہوں اس کا"ـــــ "کس بات میں غریب ہو بھائی۔ اور اگر ہوتے بھی تو کیا ہوا؟ کسی کے یہاں بھیک مانگنے تو نہیں جاتے ہو۔ کیا غریب کی لڑکیاں کنواری ہی بیٹھی رہتی ہیں؟ ہندو شاستر کہیں بھی یہ نہیں کہتے کہ غریبوں کے بیٹے بیٹیوں کا بیاہ نہ ہو۔ پھر یہ کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یہاں کس چیز کی کمی ہے جو میں تم سے مانگنے بیٹھوں گا؟ معلوم ہوتا ہے کہ تم آجکل کی دان جہیز کی بدعت ہی کے خیال سے یہ بات کہہ رہے ہو۔ لیکن میں ان بری رسموں کا سخت مخالف ہوں۔ سخت مخالف!"

بابو درگا چرن نے کہا ـــ "جی ہاں یہ بات سُن کر ہی تو"ـــــ

"تو کیا صرف سنا ہی ہے پڑھا نہیں؟ تعجب ہے ہماری کتاب سماجاک سمتیا سماو ھان آجتک تمھاری نظر سے نہیں گذری۔ اسمیں قرار داد کے موضوع پر پورا ایک باب موجود ہے۔ اس بُرے رواج کی بیخکنی کے لیے ہمیں نے کوئی تسمہ باقی نہیں چھوڑا ہے اور اسکی عالمگیر تباہ کاریوں کو ہر پہلو سے بے نقاب کیا ہے۔ تم نے میری کتاب کو پڑھا نہیں ہے یہی افسوس ہے۔"

"پڑھا ہے۔" درگا چرن نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے جواب دیا "بھلا ایسا کون بدنصیب ہوگا جو آپ کی تصنیف لطیف کے مطالعہ سے بے بہرہ رہ سکے۔ آپ جیسے مشہور اور بلند پایہ مصنف ہمارے اس غلام ملک میں اور کتنے ہوں گے؟

کہاں مشہور ہوں؟ چھوڑیے اس دل لگی کو۔ مجھے جانتا ہی کون ہے۔ ہاں بنکم البتہ ایک مشہور مصنف ہے۔ وہ ہمارا بچپن کا دوست ہے۔ پریذیڈنسی کالج میں ہم دونوں ساتھ ساتھ قانون پڑھتے تھے۔ اور اب اسکا خوب نام ہوگیا ہے۔ بچہ بچہ اسکا دم بھرنے لگا ہے۔ ابھی ابھی اسکی نئی کتاب راج سنگھ چھپ کر آئی ہے۔ تم نے دیکھی ہوگی۔ دھڑا دھڑ بک رہی ہے اور ایک ہماری کتاب ہے جسے کیڑے چاٹ رہے ہیں۔ کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ ایک جلد تک نہ نکل سکی۔ اسی لیے ہم نے اس دن بنکم سے کہا تھا۔......"

"کیا کہا تھا آپ نے"؟ حاضرین میں سے ایک نے قدرے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

رائے بہادر بولے "ہم نے بنکم سے کہا بھئی! بازار میں تمھاری دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ اب تم اس عشق و ہوس، جدال و قتال کے ڈھکوسلوں پر خاک ڈالو۔ اور کوئی ایسا قصہ لکھو جس سے ملک کی کچھ بہتری ہو۔ ہماری بات پر تو کوئی کان نہیں دیتا۔ تمھاری سب سُنیں گے۔ ہمارے سماج میں شادی کے نام پر جو لڑکے بیچے جانے لگے ہیں۔ اس سے بہت جلد ہم لوگ غارت ہو جائیں گے۔ اپنی کسی کہانی میں ذرا اس بات پر تو لوگوں کو توجہ دلاؤ اور ملک میں عیش پرستی و عیاشی کی وبا کو پھیلنے سے روکنے کی کوشش کرو۔ ہماری چائے اور سگریٹ نوشی کی لت چھوٹنا بہت ضروری ہے۔ اس کا کوئی راستہ ڈھونڈھ نکالو۔ کیا ان باتوں کی طرف تمھارا دھیان بالکل نہیں جاتا؟ ملکی تجارت اور سودیشی کے موضوع پر اگر اور کچھ نہ بن پڑے تو مضمون ہی لکھتے رہو۔ اور اسمیں تفصیل کے ساتھ یہ بتاتے رہو کہ بیوپار میں بنگالیوں خاصکر کایستھوں کو کیوں کامیابی نہیں ہوتی اور کیا کرنے سے وہ اس پیشہ میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ تمھاری تدبیریں جتنی آسان اور جاذب ہوں اتنی ہی وزنی اور منطقی ہونا چاہیے۔ مثال کے لئے تمھیں ہم ایک پلاٹ بھی بتائے دیتے ہیں۔ مان لو کچھ لڑکے کالج سے نکلتے ہی نوکری تلاش کرنے کے بجائے ایک ساتھ مل کر کسی چیز کی تجارت میں لگ جاتے ہیں۔ ان کا کاروبار نہایت سلیقہ ایمانداری اور باقاعدگی کے ساتھ چلتا ہے اور دن بدن اسمیں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ وہ لوگ لکھ پتی ہو جاتے ہیں

سرکار انھیں خطاب دیتی ہے۔ ایسی ہی کچھ اور اور باتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ اپنی ناولوں میں تم یہ باتیں تو لکھتے نہیں۔ لکھتے ہو بے سر پیر کی عشقیہ داستانیں یا چنڈو خانہ کی معرکہ آرائیاں۔ بتاؤ تو سہی ان باتوں سے ملک کو کیا فیض ہوگا ؟"

" اور بنکم بابو نے کیا جواب دیا ؟" گھوشال مہاشے نے بڑے اشتیاق کے ساتھ دریافت کیا۔

رائے بہادر بولے ـــ " ہنسنے لگے۔ جواب کیا دیتے ؟ اپنی غلطی اپنی کمزوری کو سبھی اس طرح چھپایا کرتے ہیں۔ مگر میں کب اتنی آسانی سے ماننے والا تھا۔ مجھے پیچھا نہ چھوڑتے دیکھکر کہنے لگے۔ اچھی بات ہے۔ ایسی ہی کہانیاں لکھنا شروع کرتا ہوں۔ مگر یہ تو بتلائیے کہ اگر ان کے آغاز میں کچے مال کا نرخنامہ، اس کے ملنے کا پتہ، پیدا ہونے کے مقامات اور جگہہ بجگہہ کے ریل کے کرایہ کی تفصیل، اسٹیشنوں، سڑکوں اور ڈاکخانوں کا حال وغیرہ تمام باتیں نہ بتائی جائیں تو ساری محنت اکارت تو نہ ہو جائیگی۔ غرض مذاق ہی مذاق میں بات آئی گئی ہوگئی پھر جو دل میں آئے لکھے جاؤ۔ کہکر اور اپنی ناراضگی کا اظہار کرکے میں وہاں سے چلا آیا۔"

رائے بہادر کی خفگی اس وقت بھی ان کے چہرہ پر نمودار ہوگئی۔ کوئی پانچ منٹ کی حقہ نوشی کے بعد ان کا مزاج ٹھکانے پر آیا۔ درگا چرن نے موقع پاکر اپنا دکھڑا رونا شروع کر دیا۔" روپئے پیسے کے معاملہ میں اگر آپ مجھ پر اتنی عنایت کریں تب پھر کوئی مشکل ہی نہیں ہے۔ جس دن آپ چاہیں لڑکی کو گانٹھ باندھکر لے جائیں۔ رکاوٹ ہی کیا ہے۔ اسی مہینے میں کیا۔ کل بھی سب ٹھیک کر لینے میں مجھے کچھ دشواری نہیں ہے۔" ـ ـ ـ ـ

" ٹھہریئے ٹھہریئے۔ ابھی ایک بات اور باقی رہ گئی۔ مجھے بھی نہ جانے کیا سنک سوار تھی کہ اصل بات تو بھول ہی گیا شادی کے بارے میں میری رائے بالکل دوسری ہی ہے۔ اگر تم اس سے متفق ہو سکو اور میری شرط منظور کرو تب میں تمھارے یہاں اپنے لڑکے کی شادی کرنے کو تیار ہوں۔ ورنہ مجبوری ہے۔"

درگا چرن نے یکایک چونک کر ڈرتے ڈرتے کہا" فرمایئے۔ سنوں تو ایسی کون سی شرط ہے جسے مان لینے میں مجھے تامل ہوگا۔ میری کیا مجال جو آپ کے حکم سے سرتابی کروں۔"

رائے بہادر ذرا ہل ڈل کر خوب اچھی طرح زمین پکڑ کر جم گئے اور بڑے اطمینان کے ساتھ آہستہ آہستہ کہنے لگے میری اس کتاب میں صغر سنی کی شادی کے عنوان پر بھی پورا ایک باب شامل ہے۔ اُسے بھی پڑھ لیا ہے ؟"

درگا چرن نے قدرے گھبراہٹ کے ساتھ کہا" جی ہاں! کیا معلوم۔ شاید ٹھیک ٹھیک یاد نہیں۔" ـ ـ ـ

" ہم نے اس میں اپنے تجربہ سے کم سنی کی شادی کو مناسب خیال کرکے اُسکی پر زور تائید کی ہے۔ ہم لوگوں میں جب تک خاندانی اشتراکیت کا چلن ہے۔ تب تک بال بیاہ کے رواج سے نجات پانا ناممکن ہے۔ یہاں تو اکیلا نوبیاہی عورتوں کا سرپرست نہیں ہوتا۔ بلکہ انھیں ساس، سسر، دیور، جیٹھ، دیورانی اور جیٹھانی سبھی کے ساتھ زندگی چلانی پڑتی ہے۔ اسلئے تھوڑی عمر ہی سے بہو کو گھر میں شامل ہو جانا چاہیئے۔ ٹھیک ہے نا ؟"

دُرگا چرن جیسے دھکے کھا کر امید و بیم کے دوراہے پر بھٹکتے بھٹکتے بول اُٹھے:۔

"جی ہاں آپکا فرمانا بالکل بجا ہے" بیچارے اس کے سوا اور کہہ ہی کیا سکتے تھے؟

"اچھا تو ثابت ہوا کہ ہمارے سماج کے لیے بال بواہ بہت سود مند ہے۔ بہتوں کو یہ بات تسلیم ہے۔ لیکن اسکی تہ میں ایک اور راز بھی ہے اور وہ میری سوجھ ہے۔ جسے سُنکر تم یقیناً اس دماغ کی تعریف کرو گے۔ بابو کیا کہتے ہو۔ لیکن ---- کیا؟"

بابو درگا چرن کچھ جواب نہ دے سکے۔ صرف سر کھجلا کر رہ گئے۔ رائے بہادر نے کہنا شروع کیا۔

"بال بواہ تو ہونا ہی چاہیئے۔ لیکن جبتک میاں بیوی پوری طرح بالغ نہو جائیں۔ ان کو آپس میں ملنے جلنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ہم نے اپنی کتاب میں لڑکے کا سِن بلوغیت چوبیس برس اور لڑکی کا سولہ سال مقرر کیا ہے اس سے پہلے ایک دوسرے کا مُنہ بھی نہیں دیکھ سکتا۔ ڈاکٹروں کی کتابیں دیکھیئے۔ آپکو یقین ہو جائیگا کہ ہماری بات کہاں تک ٹھیک ہے"۔ یہ کہکر رائے بہادر نے بڑے فخر کے ساتھ ہنستے ہوئے سر اوپر اٹھایا۔ درگا چرن ذرا دیر تک مُنھ اوندھائے سوچتے رہے۔ پھر بولے "بات تو بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن ایک مشکل ہے" -----

"مشکل اور مشکل کچھ نہیں ہے۔ جی۔ کیا تم نے نپولین کا وہ قول نہیں سُنا۔ ؟ مشکل کیا ہوتی ؟" ---

"لیکن میں ایک دوسری بات کہہ رہا تھا" ---

"کیا کہہ رہے تھے تم ؟"

"میری رانی اس وقت بارہ برس کی ہوگی۔ ساون میں اس کی تیرھویں سالگرہ ہے۔ تو کیا میں تین چار برس تک داماد کو گھر پر نہ بلا سکوں گا۔ تب تو گھر میں" ---- رائے بہادر نے روک کر کہا:۔

"کیوں؟ یہاں اس کے آنے میں کیا دقت ہے۔ اُسے آنا ہی چاہیئے۔ جس دن چاہو بلا لینا۔ مجھے اعتراض نہیں ہے۔ لیکن ہمارے اصول کی سختی کے ساتھ پابندی ہو"۔

"بڑی ٹیڑھی کھیر ہے"۔ رائے بہادر بولکر تپا ہو گئے"۔ ہاں مشکل کیوں نہیں ہے۔ ہماری کتاب میں ایسی ہی تمام مشکلیں حل کی گئی ہیں۔ ہم نے اسکا بہت آسان علاج ڈھونڈھ نکالا ہے اور لطف یہ ہے کہ گرہ سے بھی کچھ نہیں جاتا۔ ترکیب تو سہل ہے۔ لیکن یکایک اسپر کسی کا دھیان نہیں جاتا"۔

"تو وہ ایسی کونسی ترکیب ہے۔ معلوم بھی تو ہو ؟"

"لڑکی مکان کے اندر ہوگی اور لڑکا باہر والے کمرے میں۔ چلو چھٹی ہوئی۔ کہو کتنی سیدھی سادی بات ہے؟ ہر لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ اسی کو اُستادی کہتے ہیں۔ جناب!"

یکایک رائے بہادر کے بے پناہ مہیب قہقہوں سے سارا کمرہ لرز کر رہ گیا۔

—— ((۳)) ——

بابو درگا چرن کچھ دیر تک کھوئے ہوئے سے بیٹھے رہے۔ پھر کچھ سوچکر بولے۔ "دھرم تو اس کی اجازت دے ہی نہیں سکتا۔ لیکن کیا دنیا داری کے لحاظ سے بھی ایسا کرنا ٹھیک ہوگا؟"

اپنی بات کٹ جانے سے رائے بہادر بگڑ جاتے ہیں۔ انھوں نے کہا "ہم نے ٹھیک سمجھا ہے اسی لیے کہا ہے اگر مجھا یہ بات ناپسند ہو تو اپنی لڑکی کیلئے کوئی دوسرا گھر دیکھ لو۔ ہم تو ایک ہی بات کہتے ہیں۔ پہاڑ جا ہے تو ٹل جائے۔ مگر پر پھلّی متر کا بات کبھی ٹل نہیں سکتی۔ بات پوری کرکے انھوں نے خاموشی کے ساتھ سنجیدگی بھی اختیار کر لی۔

درگا چرن رنگ میں بھنگ ہوتے دیکھکر ڈر گئے۔ اگر یہ لڑکا ہاتھ سے نکل گیا تو زندگی بھر پچھتاوا رہیگا رائے بہادر کو اپنی زمینداری سے چالیس ہزار روپیے سالانہ کی آمدنی ہوتی ہے۔ کلکتہ میں ان کے دو تین قلعہ سے مکان ہیں۔ یہی اکلوتا لڑکا ہے۔ بی۔ اے میں پڑھتا ہے۔ لڑکا بہت نیک ہے۔ چال چلن کا اچھا ہے۔ روپ رنگ بھی چوکھا ہے۔ لینے دینے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ ایسا نادر موقع اور کہاں مل سکتا ہے؟ اسی وجہ سے بڑی نرمی سے خوب میٹھی میٹھی باتیں کرکے درگا چرن اپنے ہونیوالے سمدھی کو منانے کی کوشش کرنے لگے انھوں نے کہا "گھر میں مشورہ کرکے جیسا طے ہوگا اسکی اطلاع مکان پر پہونچا دی جائے گی۔"

رائے بہادر اپنے مصاحبوں سمیت خوش خوش وہاں سے رخصت ہوگئے۔ انکی بڑی لینڈو گاڑی گھوڑوں کی ٹاپوں سے درگا چرن کی میلی کچیلی گلی کی اُدھڑی ہوئی چھاتی کو چیرتی ہوئی چکنی چپڑی سڑک کی جانب چلی گئی

پھاگن ہی میں شادی ہوگئی۔ رائے بہادر اپنے لڑکے ہیمنت کمار کو بیاہ کر بہو گھر تو لے آئے۔ لیکن جتنے دن وہاں رہی۔ لڑکے کو اسکی جھلک تک دکھائی نہ دی۔ انھوں نے پہلے ہی سے اپنی بیوی اور دوسرے رشتہ داروں سے اس بارے میں سخت تاکید کردی تھی۔ گھر والی اپنے خاوند کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھی۔ اسلئے اس نے اس حکم کو رد کرنے کی فضول کوشش نہیں کی۔

ایک ہفتہ کے قریب سسرال میں رہ کر رانی اپنے گھر واپس لوٹ آئی۔

درگا چرن نے اپنے داماد کو گھر بلانا مناسب نہ سمجھا۔ بیوی نے اس کے لیے ان سے کئی بار درخواست کی ہار تھک کر انھوں نے کہا۔ "دیکھو داماد کو دن بھر کے لیے بلا کر شام کو رخصت تو کر سکتا ہوں۔ لیکن لڑکے لڑکی کی بھینٹ ایک منٹ کے لیے بھی نہو پائی۔ اس بات پر اگر سمدھی جی یقین نہ کر سکے تو میں صفائی کے لیے گواہ کہاں سے لاؤں گا۔ ان کی عادت کو تو تم جانتی ہی ہو۔"

جیٹھ کے مہینے میں* جمائی شَشٹھی ہوئی۔ درگا چرن نے رانی کو شو پور میں اپنی بڑی لڑکی کے پاس بھیج

* یہ بنگال کی ایک رسم ہے اس موقع پر لوگ اپنے داماد کو بلا کر اسکی پوجا پاٹ کرتے ہیں۔ مترجم

اور اس طرح ایلیبائی کا ایک معتبر گواہ پیدا کر لیا۔ اس کے بعد ہیمنت کمار کو اپنے گھر بلا کر اوسکی آرتی اوتاری۔ اساڑھ میں رائے بہادر نے بہو کو اپنے گھر بلوا لیا۔ ہیمنت ابتک اندر ہی سوتا تھا۔ اس دفعہ اس کے سونے کے لیے باہر کا کمرہ تجویز کیا گیا۔ امسال اُسے امتحان کے لیے تیاری کرنا تھی۔ لیکن وہ میگھ دوت کو سامنے رکھ کر اور بیار وغیرہ مختلف چھندوں میں آتش ہجر، درد فراق اور آرزوئے وصال سے لبریز نظمیں لکھ لکھ کر وقت گذارنے لگا۔ برسات کی بھیگی بھاگی۔ تنہا اور طول راتیں اس کے لیے سوہان روح ہو گئیں۔

صرف دو بار ناشتہ کرنے اور دو بار کھانا کھانے کے لئے ہیمنت اندر جا سکتا تھا۔ رانی کو گھر میں آئے بمشکل پندرہ دن ہوئے ہوں گے کہ ایک دن اتفاقاً دونوں کی آنکھیں چار ہو گئیں۔ اس کے بعد اکثر ایسا اتفاق ہونے لگا بار بار گھر میں آنے جانے کے لیے ہیمنت نے نئے نئے بہانے بھی تلاش کر لیے اب گیا تھا چھپ چھپ کر خوب آنکھیں لڑائی جانے لگیں۔

اس دن شام کو ہیمنت ناشتہ کر کے لوٹا آرہا تھا۔ رانی سنسان راستہ میں گھونگھٹ نکالے دبکی کھڑی تھی آس پاس دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ ہیمنت نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر اسکی ساڑی کھینچ لی۔ اور آنکھوں کی برسوں کی پیاس بجھا کر بسرعت باقی راستہ طے کر کے چوروں کی طرح اپنے کمرہ میں پاؤں رکھا۔ اُس روز سے تو پھر یہ روزانہ کا معمول ہو گیا۔ ساتھ ہی پان بیڑے رقعے پرچے اور اس بعد مختصر ملاقات میں نجانے کیا کیا کچھ چلنے لگا۔

برسات گذر گئی۔ جاڑا آگیا۔ بھادوں کے آخری ہفتہ کی بات ہے۔ بنگ بانی میں ہیمنت کی ایک نظم شایع ہوئی اُس کا عنوان تھا "چکور کی چاہ" نیچے غلطی سے اسکا نام بھی چھپ گیا تھا۔ نہ معلوم کس طرح اس نظم پر رائے بہادر کی نگاہ پڑ گئی۔ انھوں نے فوراً رانی کے باپ کو لکھ بھیجا۔

"بہو کو یہاں آئے بہت دن ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے وہ اپنی ماں کی یاد میں گھلی جاتی ہے۔ آپ جب چاہیں کچھ دنوں کے لیے رخصت کرا کے لے جا سکتے ہیں۔"

دوسرے ہی دن بابو درگا چرن بیٹی کی رخصت کرا کے لے گئے۔

درگا پوجا کی لمبی چھٹیوں کے بعد کالج کھلنے پر ہیمنت کو کلاس میں ایک چھٹی ملی۔ پتہ انگریزی کی بجائے بنگلہ میں تحریر تھا۔ لکھاوٹ صاف زنانی معلوم ہوتی تھی۔ سرنامہ سے بھی لکھنے والے کا کچھ پتہ چلتا تھا۔ ہیمنت بڑی الجھن میں پڑ گیا۔ کالج کے پتہ سے اس نے کبھی کسی سے خط و کتابت نہ کی تھی۔ لفافہ پر شیو پور کی مہر ثبت تھی اور وہاں سے چٹھی آنیکا امکان نہ تھا۔ ہیمنت اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ پاس والے لڑکے نے مسکرا کر کہا: "تمہاری جی کا سندیسہ ہے کیا؟"

"نہیں تو!" منہہ بگاڑ کر ہیمنت نے لفافہ جیب میں چھپا لیا۔ اور ایسا بن گیا گویا وہ پروفیسر صاحب کے

خشک و بے کیف لیکچر میں ہمہ تن محو ہے۔ لیکن سیکڑوں طرح طرح کے وسوسے اس کے خیالات کو پراگندہ کر رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا۔ شوپور میں میری سالی کا مکان ہے۔ ممکن ہے اسی نے مجھ کو یاد کیا ہو۔ لیکن ابتک کیا وہ مجھے بالکل بھولے ہوئے تھی؟ پھر آج ہی کیوں یکایک اُسے میری یاد آنے لگی؟ رانی بھی تو آجکل وہیں ہے۔ تو کیا یہ سب اسی کی کرتوت ہے۔ لیکن کیا بڑی بہن کی معرفت خط بھیجنا نامناسب تو نہ ہوگا؟ اور اگر لکھ ہی بھیجوں تو وہ والد صاحب تک تو نہ پہنچے گا؟ آخر وہ اتنے سخت کیوں ہیں؟ یکایک ہیمنت کو پیاس کی شدت محسوس ہونے لگی۔ اور وہ فوراً وہاں سے دبے پاؤں باہر کھسک آیا۔ لیکن پانی کے لیے اُسے دور جانے کی ضرورت نہ پڑی اسکی جیب میں پڑے ہوئے لفافے کے اندر آبحیات کا ایک ایسا سرچشمہ بند تھا جو خود بخود اُبلا پڑتا تھا۔ پھلواڑی میں گھس کر وہ اپنے دل کی پیاس بجھانے بیٹھا۔ خط میں لکھا تھا۔

"پیارے ہیمنت! معلوم نہیں کہ تم مجھے پہچان بھی سکوگے یا نہیں۔ آٹھ نو ماہ ہوگئے۔ جب تم نے مجھے صرف ایک بار دیکھا تھا۔ تو میں تمھیں اور پریشان نہ کرکے آپ ہی بتائے دیتی ہوں کہ میں تمھاری کون ہوں اور اگر میں نہ بتاؤں تو بتا سکوگے؟ نہیں بتا سکوگے نا؟ تو سنو میں ہوں تمھاری بڑی سالی۔ شوپور میں ہی میرا مکان ہے۔ میری ساس نے تمھیں دیکھا نہیں ہے۔ ایک بار دیکھنا چاہتی ہیں۔ تمھارے کالج سے شوپور کچھ ایسا دور بھی تو نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی گھنٹے آدھ گھنٹے کا راستہ ہوگا۔ گھاٹ پر اتر کر جس کسی سے پوچھوگے وہی ہم لوگوں کا پتہ بتا دے گا۔ مجھے بھی تم سے ایک بہت ضروری کام ہے۔ اسلیے جتنی جلدی ہو سکے چلے آؤ۔ دوپہر کو بارہ بجے سے دو بجے تک کا وقت ہی تمھارے آنے جانے کے لیے ٹھیک ہوگا۔ اپنی ساس کی رائے ہی سے میں تمھیں یہ چٹھی لکھ رہی ہوں۔ تمھاری یامنی یا رانی بھی تو کل سے یہیں ہے۔ اتوار تک وہ گھر لوٹ جائے گی"

خط کی آخری دو سطروں کو بار بار پڑھکر ہیمنت پھر کلاس میں لوٹ آیا۔ اس وقت پروفیسر صاحب سائنٹ کی توضیح کرکے بتا رہے تھے کہ آخر کی دو سطروں ہی میں سائنٹ کا تمام لطف پوشیدہ ہوتا ہے۔

ہیمنت نہیں کہہ سکتا کہ اس دن اس کی جماعت کے باقی گھنٹوں میں کیا کیا پڑھایا لکھایا گیا۔ رات کو بستر پر پڑے پڑے اُس نے سوچا۔ رانی وہاں موجود ہے اسی لیے کیا یامنی نے مجھے بلایا ہے۔ یا واقعی اسکی ساس مجھے دیکھنے کی مشتاق ہیں؟ وہاں جاکر رانی سے ملاقات ہو بھی سکتی ہے یا نہیں۔ اسمیں شک ہے۔ کم از کم میری تقدیر تو اتنی یاور نہیں ہے۔ باپ کی بات رکھنے کے لیے رامچندر بن کو چلے گئے تھے۔ میں لڑکا ہو کر کیوں ان کا سر نیچا کروں؟ یامنی کے باپ نے اگر کوئی عہد کیا بھی ہے تو وہ اسکی پابند نہیں ہے۔ کیا تعجب میری تکلیف سے اُس کا دل پسیج اٹھا ہو اور اُس نے اسکا کوئی آسان علاج ڈھونڈھ نکالا ہو۔ بیشک یہی بات ہے۔ ورنہ گھر کے پتہ پر لکھکر

کالج میں خط بھیجنے کے معنی ہی کیا ہیں پھر ——"رانی صرف اتوار تک کی مہمان ہے"! مجھے یہ بات بتانے کی ضرورت ہی کیا تھی ؟ اگر ملاقات تک نہیں ہو سکتی تو پھر مجھے کسی کے آنے جانے سے مطلب ؟ - - - - - -

رات اسی مخمصے میں تمام ہو گئی - دیکھتے ہی دیکھتے طلوع صبح کی پھیکی پھیکی روشنی نے پاؤں پھیلانا شروع کر دیئے آج ہمینت شب بیداری کے باوجود بہت جلد کھا پی کر فارغ ہو گیا اور وقت سے پہلے ہی کالج کے لیے چل پڑا پڑھائی کے لیے اتنا شوق اتنی مستعدی اس میں پہلے کبھی نظر نہ آئی تھی - آج شاید لیکچر بھی خلاف معمول وقت سے پیشتر شروع ہونے والا تھا -

پونے گیارہ بجے کالج کے پھاٹک کے سامنے گاڑی سے اتر کر ہمینت نے کوچوان سے کہا :"آج واپسی میں ممکن ہے کہ مجھے کچھ دیر لگ جائے اسلئے چار بجے سے پہلے گاڑی لانے کی ضرورت نہیں ہے"! گاڑی چلی گئی - کتابیں دربان کے سپرد کر کے ہمینت ایک دوسری گاڑی میں جا بیٹھا - چاند پال گھاٹ پر اتر کر شو پور کے لیے وہ فوراً کشتی پر سوار ہو گیا - کشتی گنگا کے دھارے میں مست ہاتھی کی طرح جھومتی ہوئی چلی جا رہی تھی - منزل سامنے تھی مگر راستہ طے ہوتے دکھائی نہ دیتا تھا - ہمینت کی بےچین نگاہیں اُدھر ہی لگی ہوئی تھیں - دل ہی دل میں وہ سست نکمے ملاحوں کو کوستا جا رہا تھا -

کنارے پر پہونچکر مکان کا پتہ لگانے میں تھوڑا بہت وقت صرف ہو گیا - پوچھنے سے معلوم ہوا کہ مالک مکان ہاوڑہ کے ایک وکیل صاحب ہیں - ان کا لڑکا جسکی شادی باغ بازار میں ہوئی ہے - کلکتہ کی کسی کمپنی کا نائب خزانچی ہے - ۱۵ نمبر والے مکان کے قریب پہونچکر ہمینت نے گھڑی نکالکر دیکھا - کالج سے یہاں تک آنے میں کل ایک گھنٹہ اور بیس منٹ صرف ہوئے تھے -

آواز دینے پر ایک نوکر نے کواڑ کھولدیئے - اور ساری کیفیت سُنکر اطلاع دینے اندر چلا گیا - اس کے بعد کسی خادمہ نے آکر کہا" آہا جمائی بابو —— آپ اچھے تو ہیں ؟ آئیے اندر آئیے"! اسی کے پیچھے پیچھے ہمینت دوسری منزل کے ایک کمرہ میں داخل ہوا -

تھوڑی دیر بعد انیس بیس سال کی ایک ہنس مکھ، گوری چٹی لڑکی نے اس کمرہ میں یہ کہتے ہوئے قدم رکھا "بھلا مجھے پہچان سکو گے ؟" لڑکی کی گود میں سال بھر کا ایک بچہ بھی تھا -

ہمینت کو یاد آیا شادی میں اُسے دیکھا تو ضرور تھا —— یامنی دیدی ! کہتے کہتے ہمینت فوراً ہاتھ باندھ کر اٹھ کھڑا ہوا -

"چلو رہنے دو - میں یونہی تمھیں آشیرباد دیتی ہوں - لیکن تمھیں تو اسکی بھی ضرورت دکھائی نہیں دیتی رابہ تو تم اسی دن ہو گئے تھے جس دن رانی سے تمھارا بیاہ ہوا تھا"! یکایک یامنی کے سریلے قہقہوں کی جھڑی

سے سارا کمرہ کھل سا گیا۔ اسی وقت گلا گھونٹ گھونٹ کر دی ہوئی ہنسی کی ڈوبی ہوئی آواز بند کمرہ کو چیر کر اندر گھس آئی۔ اس میٹھی ہنسی سے ہیمنت تو صرف چونک کر ہی رہ گیا۔ لیکن یامنی نے برہم ہو کر فوراً ڈانٹ بتائی۔
"کون ہو لڑکیو! بھاگو یہاں سے"۔۔

یامنی کے پاؤں نکالتے ہی چھم چھم کی آواز سے کمرہ گونج اٹھا۔ ایک ہی لمحہ میں یامنی پھر واپس لوٹ آئی۔ اس کے آتے ہی ہیمنت نے پوچھا "کہیئے کس لیے بلایا تھا؟ آپ نے!"
"جو بتا سکو تو تمھیں بتاؤں نا ــــ سندیش کھلاؤں گی ــــ" یامنی پھر کھل کھلا کر ہنس پڑی۔
"نہیں میں نہیں بتا سکتا ــــ سندیش تو میری قسمت ہی میں نہیں لکھے ہیں" مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے ہیمنت نے بچّہ کو گود میں لینے کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے۔ لیکن بچّہ ماں کے بہت کچھ کہنے سننے پر بھی ایک بالکل اجنبی آدمی کے پاس جانے کو راضی نہ ہوا۔
گھر باہر کی خیر و عافیت معلوم کر کے یامنی نے پوچھا "تو تم یہاں کے بجے تک ٹھہر سکو گے؟"
ہیمنت پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا بولا: "مجھے یہاں سے ڈھائی بجے چل دینا ہوگا"
سامنے گھڑی تھی۔ یامنی نے دیکھا اس میں ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ اُس نے کہا "اچھا تو میں اپنی ساس کو بلا لاؤں"۔

کوئی دو تین منٹ بعد ہیمنت کے کانوں میں پھر وہی پہلے کی سی چھما چھم کی جھنکار آنے لگی۔ آہستہ آہستہ یہ آواز تیز ہوتی گئی اور اس کے بالکل قریب آکر یکایک سکون و سکوت کی بے پایاں گہرائیوں میں گم ہوگئی۔ وہ سوچنے لگا۔ یامنی کے پیروں میں تو بج اور بجنے والی کوئی چیز تھی ہی نہیں۔ پھر کیا اسکی بوڑھی ساس ہی جھن جھن کرتی اسکے ساتھ آئی تھی؟ ۔۔۔ مگر یہاں آنے سے پہلے وہ ٹھٹھک کر رک کیوں گئی؟
کمرہ میں یامنی اکیلی ہی آئی۔ اس کے بعد بھی کوئی نہ آیا اور نہ کسی نے لوٹ جانے کی ہی کوشش کی۔ البتہ یامنی ہنس کر بولی "ساس جی کو ابھی چھٹی نہیں ہے۔ وہ پوجا پاٹ میں لگی ہیں۔ تمھیں اور کسی کی ضرورت ہو تو کہو۔ کس کی ضرورت ہے؟"
ہیمنت کے چہرہ پر سُرخی دوڑ گئی۔ اسکا بےچین دل اُمید و انبساط کی مست لہروں کے تھپیڑے کھا کر مدہوش شرابی کی طرح ناچ اُٹھا۔
یامنی ہنستی ہوئی جسے باہر سے گھسیٹ لائی وہ سر سے پیر تک سرمئی ساڑی میں لپٹی ہوئی تھی۔ اُسے دھکّا دیکر ــــ زبردستی اندر کر کے یامنی یہ کہتی ہوئی واپس ہوگئی "راجہ صاحب لو! سنبھالو اپنی رانی کو۔ راجہ رانی کا ناٹک ہم لوگوں نے بہت دیکھا ہے۔ اسلئے اب یہاں کوئی چھپ چھپا کر بھی تمھارا یہ کھیل دیکھنے نہ آئے گا۔

تم اطمینان کے ساتھ دو بجے تک راج کرو۔ تب تک میں تمھارے کھانے پینے کا بندوبست کرتی ہوں۔ لو بس اب میں چلی! اسکے بعد ہیمنت نے سنا جیسے کوئی اسی کو جتانے کے لئے خوب زور زور سے دھم دھم کرتا ہوا زینہ سے نیچے اوتر گیا۔

(۵)

امتحان کی تیاری کے بہانہ سے ہیمنت کلکتہ چلا آیا۔ رائے بہادر نے بھی ہونہار بیٹے کی اس تجویز کو ناپسند نہ کیا کالج کی چھٹی تھی ہی۔ لیکچر بھی پورے ہو چکے تھے۔ صرف امتحان کی فکر تھی۔ لیکن اس درمیان میں اسکا اپنے ساڑھو کنج لال سے آنا ربط ضبط بڑھ گیا تھا کہ وہ شیو پور آنے جانے کی دھن میں سب کچھ بھول گیا۔ کنج لال سے تو روز ہی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ لیکن یامنی کا میس میں آنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اسیلئے اُسے دن بھر میں ایک بار دیکھ بھال آنا نہایت ضروری تھا۔

ادھر یامنی بھی یکایک رانی کی محبت میں پاگل ہو اُٹھی تھی۔ غالباً اسی لیے رانی بار بار شیو پور آنے جانے کے لیے مجبور ہو گئی تھی۔ رانی کے اتنے جلدی جلدی شیو پور بلائے جانے میں کوئی رازِ پوشیدہ ہے۔ یہ بات بابوؤں کا حزن کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی۔

ہیمنت کی زندگی کے یہ دن کتنے پُر لطف اور رنگین تھے۔ لیکن شومی تقدیر سے ان دنوں وہ جو کھیل کھیل رہا تھا وہ بہت دن تک نہ چل سکا اور اس کا امتحان شاید وقت سے بہت پہلے ہی ختم ہو گیا۔ امتحان کے بعد اس کے کلکتہ میں پڑے رہنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ چنانچہ اُسے فوراً ہی مکان واپس جانا پڑا۔

جیسا کہ میں ہیمنت کے امتحان کا نتیجہ شایع ہوا۔ لیکن اخبار والوں کی ستم ظریفی یا ممتحنوں کی حماقت سے اس کا نام چھپنے سے رہ گیا۔ رائے بہادر ہفتوں اخبارات کا ایک ایک کونہ چھانتے رہے۔ مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ہار کر تھک کر انھوں نے بہو کی رخصت کرالی اور ہیمنت کو سختی کے ساتھ تاکید کر دی کہ وہ ابھی سے کلکتہ جا کر کسی اچھے میس میں اپنے لیئے جگہہ تلاش کرے۔ تاکہ چھٹیوں کے بعد کالج کھلنے پر اچھی جگہہ نہ مل سکنے کا اندیشہ نہ رہے۔ اور گھر پر رہ کر پڑھائی میں جو خلل واقع ہوتا ہے وہ بھی دور ہو جائے۔

ہیمنت اس یکطرفہ فیصلہ کے خلاف باپ سے تو کچھ عذر معذرت نہ کر سکا۔ لیکن ماں کے پاس جا کر اس نے کھانے پینے، نہانے دھونے اور اپنی ان بیشمار دقتوں کی دہائی دینا شروع کر دی جن سے کلکتہ کے کسی میس میں پناہ نہیں مل سکتی۔ ماں نے ڈرتے ڈرتے رائے بہادر سے ان تمام باتوں کا ذکر کیا۔ لیکن اس کا جواب رائے بہادر نے جھڑکیوں سے دیکر ہیمنت کی اپیل سرسری ہی میں خارج کر دی۔ یہی نہیں بلکہ محض خفقانِ صحت کا بہانہ بنا کر یہاں کی جانب سے کی گئی رحم و کرم کی درخواست تک پر انھوں نے کان دینا گوارا نہ کیا۔ ماں اپنا سا منہہ لیکر لوٹ آئی۔ ہیمنت کو دھکے

گھر سے باہر نکلنا پڑا۔

جدید انتظام کے تحت ہیمنت ہر اتوار کو گھر آتا اور کھا پی کر شام تک لوٹ جاتا۔ گھر میں آتے جاتے اب کسی وقت بھی اُسے رانی کی ساڑی کی جھلک تک دکھائی نہ دیتی۔ اسی طرح دو اتوار گذر جانے کے بعد ہیمنت نے گھر کی خادمہ کو کچھ دے دلا کر گانٹھ لیا۔ اب کیا تھا۔ اس کے ذریعہ دونوں کی خط و کتابت پورے زور کے ساتھ چل پڑی۔

دُرگا پوجا کی چھٹیوں میں ہیمنت میس چھوڑ کر پھر گھر آیا۔ اُسے یقین تھا کم سے کم دسہرے کے روز تو رانی اس کے پاؤں چھونے آئے گی ہی۔ لیکن اس کی اس اُمید پر بھی پانی پھر گیا۔ اس کے بعد سے ہیمنت اُدھر سے بالکل مایوس ہوگیا۔ گھر آنا اسے اچھا نہ لگتا۔ جتنی دیر وہ قیدیوں کی طرح وہاں رہتا۔ مُنھ اوندھائے خاموش پڑا رہتا۔

ایک دن موقعہ پاکر خادمہ نے اس سے کہا "چھوٹے بابو بہو جی روز رات کو رویا کرتی ہیں"۔

"کیوں، کس لیے روتی ہیں"؟ ہیمنت نے چونک کر پوچھا۔

"ہزار سکھ ہوتے ہوئے بھی اپنے آدمی کے دور ہونے پر سب پھیکے ہیں وہ کہتی ہیں کہ میری ایسی بُری تقدیر ہے کہ پاس ہوتے ہوئے بھی ان کے درشن نہیں کر سکتی"۔

"تو نے کیسے سمجھا"؟

"جس کمرہ میں وہ سوتی ہیں۔ مجھے بھی تو وہیں رہنا پڑتا ہے چھوٹے بابو"!

اگلے اتوار کو خادمہ نے خبر دی "چھوٹے بابو ایکبار اگر بہو جی سے بھینٹ ہو سکتی تو۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر اس کے لئے تدبیر ــــ"؟

آپ ایک کام کریں تو کچھ مشکل نہیں ہے"۔

"کیا"؟

"آپ کسی دن گھر آکر بیماری کے بہانے رات کو یہیں ٹھہر جائیں۔ پھر سب لوگوں کے سو جانے کے بعد میں چپکے سے آپ کے لیے دروازہ کھول دوں گی"۔

ہیمنت سوچنے لگا۔ دو منزلہ پر زینہ سے ملا ہوا جو کمرہ ہے۔ رانی اسی میں سوتی ہے۔ پتا جی کا کمرہ اس سے کچھ فاصلہ پر ہے۔ اگر کافی احتیاط برتی جائے تو کام بن سکتا ہے۔ اور اگر پکڑ لیا گیا تو ـــ؟ ڈوب مرنے کو بھی جگہہ نہ رہے گی۔

"تو چھوٹے بابو کیا حکم ہے"؟

"بہو نے تجھ سے کیا کہا"؟

"وہ تو بہت ڈرتی ہیں"

"اچھا میں سوچوں گا" خادمہ چپ چاپ وہاں سے کھسک گئی۔
بیس میں پہونچکر رومیو جولیٹ نامی ناٹک پڑھتے پڑھتے اُسے ایک ترکیب سوجھی۔ کمند کے سہارے باغ میں پہنچکر پچھلے جنگلے سے رانی کے پاس پہنچنے میں پکڑے جانیکا خطرہ نہیں ہے۔ ایک ہی لمحہ میں تمام باتیں طے کرکے تھوڑی بہت دوڑ دھوپ کے بعد وہ پندرہ روپے میں ایک کمند خرید لایا۔ دوسرے اتوار کو وہ کمند ہینڈ بیگ میں چھپا کر گھر لیگیا اور موقعہ پاکر کمند معہ ایک خط کے خادمہ کو دے آیا۔ خط میں لکھا تھا۔

"میرے دل کی رانی!

بہت کچھ سہہ چکا ہوں، اب نہیں رہا جاتا۔ اگر ایکبار تمھیں نہ دیکھ سکونگا تو پاگل ہو جاؤنگا۔ ترکیب میں بتائے دیتا ہوں۔ ذراسی ہمت کرکے تم مجھے دوزخ کے عذاب سے بچا سکتی ہو۔ میں نے تمھارے پاس جو کمند بھیجی ہے وہ اگر تم پچھلے جنگلے میں باندھکر باغ میں لٹکا سکو تو میں آسانی سے تمھارے پاس پہونچ جاؤں گا۔ اسمیں کسی طرح کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس کام کیلئے کل رات کے گیارہ بجے کا وقت بالکل ٹھیک رہے گا۔ دیکھنا کہیں انکار نہ کر بیٹھنا۔ میں کل ٹھیک وقت پر آجاؤنگا۔ تم یہ بات کہیں بھول نہ جانا۔ "تمھارا ہیمنت"

تقریباً دو گھنٹہ بعد خادمہ کے لوٹنے پر ہیمنت نے پوچھا "کیوں راضی ہوئیں"؟

"ہاں بڑی مشکل سے۔"

"تو پھر یہی طے ہے؟" "بالکل۔"

—— (۶) ——

اس دفعہ کلکتہ میں اگہن ہی کے مہینہ جاڑا پڑنا شروع ہوگیا ہے۔ پانی کے دانت ابھی سے پینے (تیز) ہوگئے ہیں۔ اخبارات کا بیان ہے کہ اس غیر معمولی سردی کی وجہ یہ ہے کہ کوہاٹ کے پہاڑوں میں بڑی شدت کے ساتھ برف باری ہو رہی ہے۔ آجکل دن میں بھی رضائی اوڑھنا ناگوار نہیں ہوتا۔ برجی تالاب کی بڑی گھڑی نے اندھیری رات کے ٹھہرے ہوئے سناٹے کو توڑتے ہوئے ٹن ٹن کرکے گیارہ بجا دیئے۔

بھوانی پور کے جس حصہ میں پرچل متر کا مکان ہے وہ رسا روڈ سے مغرب کی طرف ہے۔ ان کے صدر دروازہ کا پھاٹک سڑک سے ملحق ہے۔ پائیں باغ کے عقب میں دونوں جانب ایسا راستہ ہے جس میں بہت کم آمد و رفت رہتی ہے۔ اور چونکہ اُدھر جن بڑوں کے جھنڈ اور سرخی کوٹنے کی چند کلوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اسلئے آبادی بھی بہت کم ہے۔ گیارہ بجنے کے کچھ ہی دیر بعد کانساری محلہ کے موڑ پر ایک گاڑی آکر کھڑی ہوگئی اور اس میں سے سیاہ اوان میں سر سے پاؤں تک لپٹا ہوا ایک نوجوان باہر نکل کر کھڑا ہوگیا اور جلدی جلدی کرایہ دیکر گاڑی بان کو رخصت کرکے اندھیرے میں روپوش ہوگیا۔

ابھی ابھی گاڑی رخصت کر کے جو سیاہ پوش بسرعت ہائے بہادر کے باغ کی طرف روانہ ہوا تھا۔ وہ ہیمنت کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

باغ کے قریب آکر ہیمنت نے اپنی چال دھیمی کر دی۔ موڑ پر ایک سپاہی سے اسکی مڈبھیڑ ہوگئی۔ سپاہی کمبل کا ایک لمباسیاہ کوٹ پہنے چبوترے پر بیٹھا اطمینان کے ساتھ سگرٹ پی رہا تھا۔ ہیمنت کے دل میں چور تھا اسلئے وہ اُسے کنکھیوں سے گھورتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

موڑ سے کچھ دور آگے تک برائے نام روشنی تھی۔ اس کے بعد وہی تاریکی کا غلیظ۔ ساکت سمندر پھیلا پڑا تھا۔ روشنی سے گذر کر وہ پھر اندھیرے میں دبک گیا اور دیوار پر چڑھنے کے لئے ادھر اُدھر سہارا ٹٹولنے لگا۔ یکایک کسی کے پیروں کی چاپ سنکر وہ چوکنا ہوگیا۔ ایک ہی جگہہ پر کھڑا رہنا مناسب نہ تھا۔ اسلئے جدھر سے یہ آواز آرہی تھی آہستہ آہستہ وہ بھی اُدھر ہی بڑھنے لگا۔ تھوڑی دور چلکر اُس نے دیکھا کوئی دوکاندار یا مستری اس کے بالکل قریب سے ہوکر نکل گیا۔

وہاں سے ہیمنت پھر واپس لوٹا۔ اس کے بعد دیوار پھاندنے کے لیے اس نے جو جگہہ تجویز کی اس کے سامنے دوسری طرف جمرول کا پیڑ تھا۔ دیوار پر چڑھکر اور درخت کی ٹہنی پکڑکر باغ میں کود جانا کسقدر آسان تھا؟ بڑی مشکل سے وہ دیوار پر چڑھ سکا۔ انتہائی احتیاط کے باوجود اس کے دونوں گھٹنے چھل گئے۔ کہنی پھوٹ گئی اور کپڑے خون میں لت ہوگئے۔ اُسے یاد آیا کہ شعراء کا یہ خیال کہ عشق و محبت کا دشوار گذار راستہ کیسر کانٹوں سے مملو ہے۔ کس قدر صداقت پر مبنی ہے۔

منڈیر پر پاؤں جماکر ٹہنی پکڑنے کے لئے اس نے دونوں ہاتھ ادھر اُدھر پھیلائے لیکن فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث کوئی شاخ ہاتھ نہ لگی۔ آس پاس کے گھنے درختوں کے جھنڈوں کے کالے سائے نے اندھیرے کو اور بھی گہرا کردیا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ ہیمنت اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ پھر کوئی راہگیر اُدھر آنکلا۔ آہٹ پاکر اس کے اوسان خطا ہوگئے۔ چپ چاپ کھڑے رہنے میں خیریت نظر نہ آتی تھی۔ اسلئے اُس نے سنبھل کر بیٹھ جانے کی کوشش کی۔ گھبراہٹ میں اس کا پاؤں ایک باہر کو نکلی ہوئی اینٹ پر جاپڑا۔ وہ تو خیر کسی طرح بچ ہی گیا۔ لیکن اینٹ ایک زور کے دھماکے کے ساتھ نیچے جاگری۔ راہگیر اسی محلہ کا آدمی تھا اور پہلے بھی اکثر بے وقت ٹپکے ہوئے جمرول یہاں سے اُڑا لیگیا تھا۔ آواز سنکر اُسے جمرول گرنے کا شبہہ ہوا اور وہ ٹھٹھک کر گرا ہوا جمرول ادھر اودھر تلاش کرنے لگا۔ ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے مایوس ہوکر اُس نے اوپر کی طرف نگاہ دوڑائی۔ سامنے ہیمنت سمٹا سمٹایا گٹھری بنا بیٹھا تھا۔ چور نے چور کو دیکھ لیا۔ اب کیا تھا وہ چور چور چلاتا سر پر پیر رکھکر بھاگا۔ ہیمنت اس باغ کا مالک تھا اور راہگیر وہاں سے جمرول چرانے آیا تھا۔ لیکن تقدیر کے ذرا سے پھیر کی

بدولت چور خود مالک کو چور بنا کر نکلا جا رہا تھا اور وہ پھر بھی اس سے کچھ کہہ نہ سکتا تھا۔ اس مشکل میں بھی ایک بار اُسے اپنی دُرگت اور چور کی ہمت پر ہنسی آ گئی۔ لیکن ایک نہایت کرخت آواز نے فوراً اس کے کان کھڑے کر دیئے۔ کوئی طرح طرح کی فحش گالیوں کی بوچھار کر کے زور زور سے چیخ رہا تھا "کون ہے بے! کہاں کیسے گھسے جاتا ہے"۔

ہیمنت تاڑ گیا کہ یہ زبان کی صفائی دکھانے والا دو کوڑی کے پولیس کے سپاہی کے سوا اور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ غیرت اور ندامت کے ساتھ ساتھ موقع کی نزاکت کے فوری احساس نے اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے کر دیئے۔ اس نے سنا کوئی کانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا ——"چور ہے جمعدار صاحب!"

"کہاں ہے ---- بتاؤ!"

"وہاں —— ستر بابو کے باغ کے احاطہ کی دیوار پر بیٹھا بیٹھا جبرول کھا رہا ہے"۔

چور کا سُراغ ملتے ہی سپاہی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر پکارنا شروع کیا۔

"چوڑی دار موت!"

ہیمنت اس ساری واردات کو مذاق سمجھ کر ٹالدینا چاہتا تھا۔ لیکن دیسی جوتوں کی آواز اور سڑک پر رینگتی ہوئی دستی لالٹینوں کی روشنی نے اُسے چونکا دیا اور وہ بالکل مجبور و مایوس ہو کر باغ میں کود پڑا۔ نیچے جا بجا بکھرے ہوئے کنکروں اور اینٹوں سے اس کے تمام جسم میں چوٹ آ گئی۔ ایک ہی لمحہ میں پولیس کا سپاہی وہاں آ پہنچا اور لالٹین کی دھندلی روشنی میں دیوار اور پیڑ کی اچھی طرح تلاشی لیکر واپس چلا گیا۔

اب ہیمنت آہستہ آہستہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک بار اُس نے حسرت بھری نگاہوں سے اپنے مکان کی طرف دیکھا۔ وہاں بالکل سناٹا تھا۔ صرف رانی کے کمرہ کا پچھلا جنگلہ کھلا ہوا تھا اور اس میں بہت تیز روشنی ہو رہی تھی۔ بقیہ تمام دروازے اندر سے بند تھے۔ ہیمنت نے جلدی جلدی دھوتی اُتار کر جبرول کے ڈالوں پر پھیلا دی اور جانگیا پہنے پہنے کند کی طرف لپکا۔ ابھی وہ نصف راستہ بھی طے کرنے نہ پایا تھا کہ پھاٹک کا دروازہ کھل گیا اور تین چار آدمی لالٹین لئے اندر گھس آئے۔

"کہاں ہے وہ؟ جمعدار صاحب"! کسی نے پوچھا۔

"وہاں جبرول کے پیڑ تلے —— میں نے خود دیکھا ہے"۔

سب لوگ پھونک پھونک کر پاؤں رکھتے ہوئے اُدھر ہی چل پڑے۔ ہیمنت ایک پیڑ کی آڑ میں ہو گیا۔ کچھ دور چلکر اس کے اپنے دربان نے کہا "یہاں تو کوئی بھی دکھائی نہیں دیتا"۔

"تو کیا ہوا ہو گیا۔ یا زمین نگل گئی"؟ سپاہی نے جوابدیا۔ ایک ہی لمحہ بعد وہ پھر دیوانوں کیطرح چلانے لگا!

"وہ کیا ہے — وہ کیا ہے۔ بغیر دیکھے ہی تم سب مجھے آتو بنا رہے تھے!"

جھردل کے پیڑ کے پاس جاکر لوگوں نے دیکھا۔ ہمینت کی پھیلی ہوئی دھوتی ہی کو روشنی میں چمک اٹھنے پر انہوں نے چور سمجھ لیا تھا۔ ہمینت سانس روکے کھڑا تھا۔ پھر بھی لوگوں کی اس سوجھ پر اس کے دانت زبردستی باہر نکل آئے

"پینا۔ پکڑ لیا ہے۔" یہی نعرے لگاتا۔ اور شور و غل کرتا ہوا یہ چھوٹا سا لشکر دھوتی پر جا پڑا۔

"دھت تیرے کی!" جمادیر سنگھ نے جھینپتے ہوئے کہا۔ "یہ تو خالی دھوتی ہی نکلی!"

سپاہی کچھ نہ کچھ کیفیت دیکھ اپنی خفت مٹانے کی فکر ہی میں تھا کہ رائے بہادر کے کمرہ کا جنگلہ بڑی دیوار کی تیز روشنی سے جگمگا اٹھا۔ "کیا ہے جمادیر سنگھ؟" انھوں نے دربان کو مخاطب کرکے پوچھا۔

"حضور! باغ میں کوئی چور گھس آیا ہے۔" سب نے ایک زبان ہو کر جواب دیا۔ "ہم سب اسی کو تلاش کر رہے ہیں۔"

بڑی مصیبت ہے۔ تھوڑی دیر میں لوگ ادھر ہی آجائیں گے۔ دیوار پھلانگنے کے سوا بھاگنے کا بھی کوئی راستہ نہیں ہے — — — سر منڈاتے ہی اولے پڑنا اسے کہتے ہیں۔ بیچارہ پہلی ہی کوشش میں بری طرح پھنس گیا۔

لوگ آہستہ آہستہ باغ میں اندر کی طرف بڑھنے لگے اور ہمینت پیڑوں کی آڑ میں چھپتا چھپاتا دیوار کی جانب۔ یکایک کسی کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ "وہ بھاگا!" اس نے زور سے کہا۔ ساتھ ہی سب لوگ ہاتھ جھاڑ کر اس کے پیچھے بھاگنے لگے۔ بھاگتے بھاگتے ہمینت نے ایک ڈھیلا اٹھا کر ان لوگوں پر پورے زور سے دے مارا۔

"ہائے مار ڈالا" ایک آدمی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ہمینت نے جان توڑ کر ڈھیلے برسانا شروع کر دیا۔

"کیا بات ہے جمادیر! تم اتنے لوگ ابھی تک کھڑے کھڑے منہ کیوں دیکھ رہے ہو۔ ایک آدمی نہیں پکڑ سکتے۔"

"پکڑنے ہی جا رہے تھے سرکار! مگر اس نے تو پتھر برسا کر ہمیں آگے بڑھنے سے روک دیا ہے۔ جمادیر کا سر پھٹ گیا ہے اور وہ جھردل کے نیچے ڈھیر ہو گئے ہیں۔"

"ٹھہرو! ہم بندوق لاتے ہیں۔"

دیر کرنے میں جان کا خطرہ تھا۔ ہمینت نے آناً فاناً اپنی قسمت کا فیصلہ کر لیا۔ ایک ہی جست میں وہ دیوار پر جھول رہا تھا۔ ابھی بمشکل جنگلہ تک پہونچا ہی تھا کہ رائے بہادر نے ڈن سے بندوق داغ دی۔ ہمینت نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ لیکن رائے بہادر کی نظر اس پر پڑ ہی گئی۔

بہو کے کمرہ کا دروازہ کھلا تھا۔ چور بھی ادھر ہی چلا جا رہا تھا۔ رائے بہادر بندوق چلانا بھول کر زور زور سے چلانے لگے — "اندر آجاؤ — اندر! چور مکان میں گھس آیا ہے۔"

نوکر چاکروں کی بھیڑ بڑے اطمینان کے ساتھ صحن میں آکر ڈٹ گئی۔ رائے بہادر حوصلہ کرکے بہو کے کمرہ

کی طرف چلے۔ ہمینت کو موقع مل گیا۔ کمند کھینچ کر اس نے جلدی سے کواڑ بند کر لیے۔
رائے بہادر زور زور سے بہو کے کمرہ کا دروازہ پیٹنے لگے۔ خادمہ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کواڑ کھولے
رائے بہادر نے اندر جا کر دیکھا۔ بہو زمین پر بیہوش پڑی ہے اور چودھرے پاؤں تک رضائی تانے پلنگ پر
سو رہا ہے۔

دوسرے روز رائے بہادر نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف سا ماجک سمتیا سما دھان میں چوبیس کی جگہ کاٹ کر بائیس اور سولہ کی جگہ کاٹ کر چودہ لکھ دیا۔ اگر کبھی ان کی کتاب کے دوبارہ چھپنے کی نوبت آئی تو یہ ترمیم یقیناً جلی حروف میں شایع کی جائے گی۔

(از جناب یوسف کماؔل ناردی)

نہیں سے ہم نہیں ڈرتے مگر ڈر جاتے ہیں ہاں سے ۔۔۔ خوشی ہوتی نہیں ہمکو تمہارے عہد پیماں سے
تمھیں سے پوچھتا ہوں میں ذرا مجھ کو بتا دینا ۔۔۔ کبھی وعدہ وفا تم نے کیا ہے کہہ دو ایماں سے
تعجب ہے نہیں تم ہم سے رسم و راہ رکھتے ہو ۔۔۔ زمانے میں نہیں ملتے ہیں کیا انساں انساں سے
خدا جانے تمھاری آرزو میں جوش کتنا ہے ۔۔۔ کہ بہتے رہتے ہیں ہر وقت آنسو چشم گریاں سے
محبت میں جو بدنامی ہوئی تو اس سے کیا حاصل ۔۔۔ کسی کو کیوں کروں آگاہ اپنے راز پنہاں سے
بسر اپنی کریں گے عمر رہ کر کوئے جاناں میں ۔۔۔ نہ گلشن سے غرض ہمکو نہ مطلب ہے بیاباں سے

خبر کیا تھی زلیخا کو کماؔل اس راز پنہاں کی
ملے گا بے گناہی کا پتہ یوسف کے داماں سے

غزل

(از جناب جگدیش سہائے سکسینہ وکیل شاہجہاپور)

موجبِ راحت مجھے سوزِ غم و حرماں بھی ہے
زخمہائے دل میں اندازِ گلِ خنداں بھی ہے

دردِ الفت کیلئے دل حُسن کا ممنون ہے
اور کچھ منّت کشِ رنج و غمِ دوراں بھی ہے

حیف شیخ و برہمن اس راز سے واقف نہیں
اِک عبادت کا طریقہ خدمتِ انساں بھی ہے

کلفتیں ہی کلفتیں ہوتیں تو کچھ پروا نہ تھی
غم تو یہ ہے دہر میں آرام کا ساماں بھی ہے

نشہ ہوتا ہے بقدرِ ظرف ہر میخوار کو
جانِ ایماں بھی ہے مے، غارتگرِ ایماں بھی ہے

یہ مری خامی کہ غم سے ہوں نوا سنجِ فغاں
خامشی آموز ورنہ شدّتِ حرماں بھی ہے

جان دینا عشق میں جگدیش کچھ آساں نہیں
درد کی جانکاہیوں میں زیست کا ساماں بھی ہے

غزل

(از جناب سید معین الدین احمد عرشی بھوپالی)

عشق کے سانچے میں ڈھلکر رہ گئی
زندگی کروٹ بدل کر رہ گئی

آنکھ کچھ موتی اُگل کر رہ گئی
غم کی چنگاری بگھل کر رہ گئی

وقتِ نظّارہ، نگاہِ باریاب
اُن کے جلووں میں مچل کر رہ گئی

نیچی نظروں سے وہ پیمانِ وفا
ہر تمنّا رُخ بدل کر رہ گئی

پھر وہی محشر، وہی قیدِ حیات
مَوت بھی کچھ دور چل کر رہ گئی

کیا کیا اے بلبلِ آتش نفس
آشیاں میں برق جل کر رہ گئی

آنکھ میں آنسو تڑپ کر رہ گئے
مَوج دریا میں اُچھل کر رہ گئی

فسرگیں نظریں ہوئیں یوں ملتفت
جرأتِ لغزش سنبھل کر رہ گئی

نقشِ سجدہ بن گیا خود آستاں
جب جبیں میری مچل کر رہ گئی

کوئی ان پھولوں کی قسمت دیکھنا
زندگی کانٹوں میں پل کر رہ گئی

آج عرشی پر بہت ہوتا عتاب
بات دلوں کیسے کہ ٹل کر رہ گئی

حشرِ جذبات

از حضرت ثاقبؔ کانپوری

سامانِ ضبط پہلے مہیا کرے کوئی
پھر میرے دردِ دل کا تماشا کرے کوئی

ہر ذرہ کائنات کا ہے پیکرِ جمال
پیدا تو ذوقِ دیدۂ بینا کرے کوئی

تیری طلب میں جان کا دینا ہے زندگی
مرنے کی تجھ پہ کیوں نہ تمنا کرے کوئی

دینے میں جان کچھ بھی تامل نہیں مجھے
لیکن یہ چاہتا ہوں اشارا کرے کوئی

بربادیوں میں گھر کی نہیں جب کوئی کمی
پھر کیوں خیالِ وسعتِ صحرا کرے کوئی

ثاقبؔ تمام عمر تو برباد ہو چکی
اب کیا علاجِ جوشِ تمنا کرے کوئی

میں اپنے ہوش میں آؤں تو راز تجھ سے کہوں
کہ عشق تو تیرے کوچے میں اب ہے خوار و زبوں

ہے اعترافِ شکستِ جنوں تو خود مجھ کو
ترے جنوں کا مقابل نہیں ہے میرا جنوں

سمجھ سے کام لے تو اے اسیرِ صحنِ چمن
فریب دیں نہ تجھے رنگہائے گوناگوں

زمین والوں کی یہ خواجگی معاذ اللہ
زمیں پہ کیا میں اب سے مالکِ زمین رہوں

مری خموشی سے دھوکا نہ کھا تو اے ثاقبؔ
کہ جانتا ہوں میں رازِ الست و کن فیکوں

تنقید بر تنقید

(از جناب محمد ابو بکر صاحب نظمی)

فنونِ علمیہ سے دل چسپی رکھنے والے ارباب ذوق کا یہ ایک مسلّمہ مسئلہ ہے کہ ہر فن کے مسائل کی تصحیح و تنقیح کا بہترین ذریعہ، اس فن کی عالمانہ و فن کارانہ تنقید ہے۔ اسی معیار کی بدولت' ہر فن کا معیاری اور غیر معیاری ہونا روشن ہوتا ہے' بشرطیکہ ناقد جس فن کی تنقید کو اپنا فریضۂ کرم جانتا ہے، اس فن میں استادانہ واقفیت اور کامل مہارت رکھتا ہو۔ ورنہ اس کی تنقید' خود اس کی ناقص الفنی کی واضح دلیل بلکہ مبتدیانِ فن کے حق میں سم آمیز ساغرِ شیریں ثابت ہوگی۔ چنانچہ مسٹر سری کرشن داس صاحب نے "زمانہ" کانپور ۱۹۴۲ء کے اپریل نمبر میں حضرت الاستاذ محوی لکھنوی مدظلہٗ کے کلام "پر بحث و مباحثہ" کے عنوان سے جو تنقید فرمائی ہے یہ ناقد موصوف کے تقاضائے بشریت، سہو نظر و عدم غور و خوض کی منت پذیر نہیں معلوم ہوتی بلکہ مبتدیانہ ناقص الفنی کا شفاف آئینہ ہے' کیونکہ آپ نے حضرت الاستاذ کی جس نظم پر تنقید فرمائی ہے اس کی بحر کو آپ کما حقہٗ نہ سمجھ سکے، دوسرے یہ کہ لفظ "ستم" کی "ت" کو ایک مصرعہ میں مکسور بتایا ہے، دوسرے میں ساکن اور تیسرے میں مفتوح۔ اہل فن حیران ہیں کہ "ستم ان کا کرم نہ ہو جائے" میں ناقد موصوف کو یہ کیسے پتہ چلا کہ لفظ ستم کی "تے" مکسور ہے اور "ستم دوست کم نہ ہو جائے" میں لفظ "ستم" کی "تے" کا ساکن ہونا آپ پر کیونکر ثابت ہوا۔ مزید طرہ یہ کہ اس "تے" کے مفتوح ہونے پر اساتذۂ اُردو و فارسی کے متعدد نظائر پیش کرنے کی لایعنی ضرورت کیوں پڑی۔ تیسرے یہ کہ آپ نے اس مصرعہ کی جو تقطیع فرمائی ہے وہ بھی غلط ہے۔ لہٰذا میں زیر تنقید مصرعوں کی صحیح تقطیع فن نواز ارباب سخن پر واضح کرنا چاہتا ہوں"

حضرت الاستاذ کی زیر نظر نظم کی بحر کا نام ہے بحرِ خفیف۔ اور سہ رکنی ہونے کی وجہ سے مسدس کہی جاتی ہے۔ اس کے ارکان فاعلاتن، مفاعلن، فعلن ہیں۔ کسی استاد کے کلام میں اس بحر کے صدر و ابتدا دونوں سالم ہیں تو کسی کے کلام میں دونوں مخبون۔ کسی کے کلام میں صدر مخبون اور ابتدا سالم اور کسی کے کلام میں صدر سالم تو ابتدا مخبون۔ مختصر یہ کہ اس بحر کے صدر و ابتدا میں زحافات بڑے بڑے مسلم الثبوت اساتذہ کے مندرجۂ ذیل نظائر سے ثابت ہے۔

فنِ عروض کی اصطلاح میں مصرعۂ اوّل کے رکنِ اوّل کو صدر اور مصرعۂ ثانی کے رکنِ اوّل کو ابتدا کہتے ہیں۔

نظائر

حضرت غالب

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے — نگہِ چشم سرمہ سا کیا ہے

پہلے شعر میں صدر "دلِ ناداں" کا وزن فعلاتن اور ابتدا "آخر س در" کا فاعلاتن ہے۔

دوسرے شعر میں، صدر شکنے زل اور ابتدا، مجھے چش" دونوں کا وزن فعلاتن ہے۔

حضرت وزیر

رنگِ گل سے گر ہے کچھ نازک ۔۔۔ فرق دونوں میں اک سر مو ہے

چمن رخ میں جا نہ مرغِ نگاہ ۔۔۔ جی کا جنجال دامِ گیسو ہے

پہلے شعر میں، صدر، رنگِ گل سے، کا وزن، فعلاتن اور ابتدا، فرق دونو، کا فاعلاتن ہے۔

دوسرے شعر میں صدر، چمنے رخ، کا وزن فعلاتن اور ابتدا، جی کجنجا، کا فاعلاتن ہے۔

حضرت جلال

نکل آیا تڑپ کے سینے سے دل ۔۔۔ اب تسلی دیا کرے کوئی

کسی بے درد کی دل آزاری ۔۔۔ درد کی اپنے ہم دوا سمجھے

پہلے شعر میں صدر، نکلا یا، کا وزن، فعلاتن اور ابتدا، اب تسلی، کا فاعلاتن ہے

دوسرے شعر میں صدر، کس بے در، کا وزن فعلاتن اور ابتدا، درد کی اپ کا فاعلاتن ہے۔

حضرت داغ

نہیں کھنچتی مجھی سے تیری شبیہ ۔۔۔ تجھ سے کب ہم کلام ہوتی ہے

کیوں سنے وہ شکایتِ بے داد ۔۔۔ صفتِ خنجرِ ادا نہ سنے

پہلے شعر میں صدر، نہ کچتی، کا وزن، فعلاتن اور ابتدا تجس کب ہم، کا فاعلاتن ہے۔

دوسرے شعر میں، صدر، کو سنے وہ، کا وزن، فاعلاتن اور ابتدا، صفتے خن، کا فعلاتن ہے۔

ان اشعار سے ارباب ذوق پر ہر طرح واضح کہ مسلم الثبوت اساتذہ کے کلام میں بحر خفیف کے صدر و ابتدا بالعموم مجنوں ہیں۔ پس اسی طرح حضرت الاستاذ کے زیر تنقید مصرعوں میں بھی صدر و ابتدا مجنوں ہیں۔ یعنی مصرعہ نمبرا " ستم ان کا کرم نہ ہو جائے" کا پہلا رکن " ستمن کا" بروزن " فعلاتن" مجنون اور مصرعہ نمبر ۲ " ختم شوقِ ستم نہ ہو جائے" کا پہلا رکن " ختم شو قے" بروزنِ فاعلاتن، سالم اور مصرعہ نمبر ۵ " عزم ترکِ ستم نہ ہو جائے" کا پہلا رکن " عزم ترکے" بروزن فاعلاتن سالم اور مصرع عطا " ستم دوست کم نہ ہو جائے" کا پہلا رکن " ستمے دو" بروزن فعلاتن مجنوں ہے۔

دکس صاحب اوّل تو اس نظم کی بحر کے مزاحف وغیر مزاحف ہونے سے بالکل ناواقف ہیں، اس پر طرّہ مزید یہ کہ آپ کو شعر کی تقطیع کرنا بھی ہنوز نہیں آیا، جس کی دلیل یہ ہے کہ آپ کو اتنا بھی نہیں معلوم کہ عروض میں حروفِ مکتوبی وغیر ملفوظی اور حروف غیر مکتوبی و ملفوظی کتنے اور کون کون سے ہیں، ورنہ آپ " ستمِ دوست کم نہ ہو جائے" کی تقطیع کرنے میں ایسی فاش اور مبتدیانہ غلطی نہ کرتے، جیسی، زیر بحث نمبر زمانہ" کے صفحہ ۱۹۹ کی دسویں سطر میں کی ہے اور جو اربابِ فنِ عروض کے سامنے قابلِ مضحکہ ہے۔ آپ نے

اس مصرع کی تقطیع میں پہلی غلطی تو یہ کی ہے، کہ اس کے رکن اول کو سالم خیال فرمایا، حالانکہ وہ "مخبون" ہے جیسا کہ میں نے مسلم الثبوت اساتذہ کے کلام سے ثابت کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ کو اس کا علم نہیں کہ لفظ "دوست" کا حرفِ اول متحرک اور حرفِ ثانی ساکن ہے۔ تیسرا اور چوتھا دونوں موقوف ہیں لہذا قاعدۂ عروض کے مطابق دوسرے حرفِ موقوف یعنی "تے" کو تقطیع سے ساقط کر کے اس مصرع کی ٹھیک تقطیع یوں کی جانی چاہیئے: "ستے دو" فعلاتن، "ستم نہو" مفاعلن، "جائے" فعلن۔ لفظِ "ستم" کے میم کا کسرہ بقاعدہ عروض، یائے مجہول سے بدل دیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ اس بیان سے اربابِ ذوق پر یہ ثابت ہو جائے گا کہ حضرت الاستاذ کے کلام پر جتنے فنی اعتراضات داس صاحب نے کئے ہیں وہ عدم واقفیت فن کا لازمی نتیجہ ہیں۔ استاذی حضرت محوی مدظلہ کم از کم چالیس سال سے شعر کہتے ہیں اور اس دور کے مانے ہوئے اساتذہ میں ہیں، آج تک آپ کے کلام پر کبھی نہ ایسے لغو اعتراض ہوئے نہ ایسی غلطی آپ سے وقوع پذیر ہو سکتی ہے۔ داس صاحب کی جرأت قابلِ داد ہے۔

ایک اور ضروری بات یہ ہے کہ لفظِ "متعلق" "کو" "کے" اور "سے" کے ساتھ استعمال کرنے میں کئی باتوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اول یہ کہ آیا یہ لفظ فاعل ہے یا مفعول؟ اگر فاعل ہے تو بکسرِ لام ہے اور اس کا استعمال "سے" کے ساتھ اس طرح ہوتا ہے۔ فلاں انجمن کی سرپرستی فلاں صاحب سے متعلق ہے، یعنی فلاں سے تعلق رکھنے والا امر ہے۔ اور اگر مفعول ہے تو بفتح لام ہے۔ نیز یہی لفظ صرفِ عربی کی رو سے مصدر میمی اور ظرفِ زمان و مکاں بھی ہے اور اس کا استعمال "کے" کے ساتھ اس طرح ہوتا ہے۔ موجودہ تجارت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے جس کے معنے ہیں، تجارت کی بابت، تجارت کے بارے میں تجارت کی نسبت وغیرہ اور یہ استعمال عربی داں اصحاب کا ہے۔ اہلِ زبان تو اس لفظ "کو" "کے" اور "سے" کے ساتھ بکسرِ لام ہی استعمال کرتے ہیں۔

داس صاحب کے بقیہ استفسارات فنیہ، حروفِ مکتوبی وغیرہ ملفوظی کی واقفیت سے متعلق ہیں۔ لہذا ان کے جوابات بخوفِ طوالت نظر انداز کئے جاتے ہیں۔

ادب برائے زندگی

(از شاعر محبت میرزا اثر چنگیزی (فیروزآباد)

اگر بندہ ہو جذبِ بندگی مسجود ہو جائے
ایازی شرط ہے ہر آدمی محمود ہو جائے
اثر عالم بدل دیتا ہے "شکروکیف" کا عالم
بڑھیں جس قوم میں شاعر عمل مفقود ہو جائے

آبشار

یہ حضرت فیض جھنجھانوی کا مجموعۂ کلام ہے، جس میں ۵۵ نظمیں اور ۱۵ غزلیں ہیں۔ حضرت فیض پُرانے کہنے والے ہیں اور آپ کا کلام ملک کے وقیع رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتا ہے

جہاں تک ہم نے کتاب زیر نظر کا مطالعہ کیا ہے ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ فیض صاحب اقلیم سخن ہیں، منظر عام سے دور ایک نئی دنیا بسانا چاہتے ہیں۔ ان کے کلام میں "خواص پسند" رنگینی ضرور ہے لیکن "عوام پسند" شگفتگی و روانی نہیں ہے حالانکہ یہی چیز نظم کی جان ہے، غزلیں بھی ٹھوس ہیں۔ خال خال کسی شعر میں شانِ تغزل پائی جاتی ہے، حالانکہ تغزل ہی غزل کی روح رواں ہوتا ہے۔

ہمارا ہی یہ خیال نہیں ہے بلکہ اُردو کے مسلم الثبوت ادیب خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی کی بھی غالباً یہی رائے ہے جو "آبشار" کے مقدمہ میں "تہی دستانِ علم وادب" کی آڑ لے کر اس طرح سچی بات کہتے ہیں:۔

"اکثر تہیدستانِ علم وادب کو فیض صاحب سے شکوۂ ادق گوئی ہے، کاش انھیں معلوم ہو کہ فیض صاحب کا کلام بلیغ اس ادب عالیہ کا جزو ہے جو عوام کیلئے نہیں بلکہ خواص کے واسطے ہے۔

ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس کے ثبوت میں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے، آبشار کی پہلی ہی نظم کے چند شعر ملاحظہ فرمالیجئے، فرماتے ہیں۔ ؎

نغمہ زارِ انجمن، ہنگامۂ محفل میں تو — نالۂ شبگیر، آوازِ شکستِ دل میں تو
نقشِ محرابِ حرم، تصویرِ طاقِ بتکدہ — جلوہ گاہِ حق میں تو ظلمت گرِ باطل میں تو
نشۂ چشمِ فلک، گلگونۂ روئے زمیں — خمستانِ مہر و مہ، فردوسِ آب و گل میں تو
غمزۂ برقِ جہندہ، شوخیِ رنگِ شفق — برشِ تیغِ دو دم، خونِ رگِ بسمل میں تو

آجکل کی دنیائے مشغول کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ ایسی ترکیبوں کے سُلجھانے میں اُلجھے اور پھر "کوہ کندن وکاہ برآوردن" کے بعد لطف معانی سے بہرہ اندوز ہو۔

بایں ہمہ فیض صاحب کی وہ نظمیں جن کے عنوان "جامع مسجد دہلی"، "اقبال"، "بغاوت"، "زندگی"، "شکست دل"، "مغنیہ"، "کمال" اور "بسنت" ہیں، تحسین و داد سے مستغنی ہیں۔

جہاں تک فیض صاحب کی غزلوں کا تعلق ہے ان میں بھی کہیں کہیں کوئی شعر پسندیدہ ہے۔ مثلاً۔

نشاطِ روح، وجہ گرمیٔ محفل نہیں ہوتا　　　وہ اک نغمہ جو آوازِ شکستِ دل نہیں ہوتا
بجز صحرا نوردی اور کچھ حاصل نہیں ہوتا　　　اگر وستِ جنوں پردہ کشِ محمل نہیں ہوتا
یقیناً ہے ابھی ناواقفِ رسم و رہِ منزل　　　وہ خضرِ راہ جو گم کردہ منزل نہیں ہوتا
یہیں سے پھر ایک آفتابِ حیات نو بھی طلوع ہوگا　　　اگر وہ تارِ نظر بھی بخشیں تو چاکِ دل کو رفو نہ کرنا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فیض صاحب بعض اوقات کہتے تو چلے جاتے ہیں لیکن اپنی دھن میں معائب سخن کی پروا نہیں کرتے۔ بعض بعض شعروں میں عیب تنافر پایا جاتا ہے جو بہت ہی گراں گزرتا ہے مثلاً اپنی نظم "بعد المشرقین" میں ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

زندگی وہ کیا جو ہو محروم لطفِ زندگی　　　سانس لینے کو تو یوں لیتا ہی ہے ہر جاندار

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں "ہی ہے ہر" ایک ہی حرف (ہ) سے شروع ہوئے ہیں۔ انگریزی شاعری میں یہ بات صنائع و بدائع میں داخل (Alliteration) ہو تو ہو لیکن اُردو شاعری میں اسے عیب تنافر کہتے ہیں۔

اسی نظم میں ایک دوسرا شعر ہے ؎

سبزۂ پامال ہو اس گلستانِ دہر میں　　　شبنم افشاں جس پہ ہے صبح و مسا چشم ہزار

یہ شعر ہر اعتبار سے بلند پایہ ہے لیکن کاش پہلے مصرعہ کی ترکیب ایسی ہوتی جو لفظ "اس" نکل جاتا کیونکہ یہ لفظ کھٹکتا ہے اور حشو و زوائد میں داخل ہے۔

ایک شعر میں فرماتے ہیں ؎

خندۂ گل، جلوۂ شبنم، فروغِ ماہتاب　　　میں نے جس منظر پہ چاہا ان کو عریاں کر دیا

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں لفظ "عریاں" بہت ہی عریاں ہے۔ اگر فیض صاحب اپنے محبوب کو عریاں کرنے کے بجائے اس کو بے نقاب یا بے پردہ کر دیتے تو مذاق سلیم کو کوئی شکایت نہ ہوتی۔

بعض بعض جگہ فیض صاحب "تکرار ردیف" کا بھی کوئی خیال نہیں رکھتے۔ اسی کتاب کے صفحہ ۹۲ پر دو شعر ہیں جن میں ردیف کی تکرار ہوئی ہے۔

بہرحال برائی بھلائی کس چیز میں نہیں ہوتی، خود کائنات خیر و شر کا مجموعہ ہے۔ کتاب کے شروع میں خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی کی رنگین تمہید اور فیض صاحب کا فوٹو بھی شامل ہیں۔

لکھائی چھپائی نہایت روشن، کاغذ بیش قیمت، جلد انگریزی کتاب کا نام طلائی حروف میں درج ہے ضخامت دو سو صفحات قیمت ساڑھے تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ: اُردو مجلس پبلشرز شیامحل دہلی

رفتارِ زمانہ

پچھلے ماہ ہمارے ملک میں کئی اہم واقعات رونما ہوئے ہیں جن کا اثر غالباً دوررس اور مفید ہوگا۔ مرکزی اسمبلی کے اجلاس میں کئی موقعوں پر تو حکومت کے خلاف اسمبلی کی تمام سیاسی پارٹیاں ایک ہوگئیں اور انھوں نے کم سے کم ایک درجن مرتبہ گورنمنٹ کو شکستیں دیں اور فنانس ممبر نے جو بل پیش کیا تھا اس کو کثرت رائے سے ٹھکرا دیا۔ اور لطف یہ ہے کہ اس مرتبہ مرکزی اسمبلی کے یوروپین گروپ نے بھی حکومت کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ پاس کیا۔

صوبہ سرحد شمال مغربی صوبہ سرحد شمال مغربی میں مئی سنہ ۴۳ء سے سردار اورنگ زیب خاں کی مسلم لیگی وزارت قائم تھی، اور چونکہ اسمبلی کے بہت سے کانگریسی ممبر نظر بند تھے اس لئے کام چلتا رہا لیکن پچھلے دنوں ڈاکٹر خان صاحب نے اسمبلی میں شریک ہوکر مسلم لیگی وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تجویز پیش کردی جو کثرت رائے سے پاس ہوگئی، نتیجہ یہ ہوا کہ سردار اورنگ زیب خاں کی مسلم لیگی وزارت ٹوٹ گئی اور اس کے بجائے ڈاکٹر خان صاحب نے اپنی سرکردگی میں کانگریسی وزارت قائم کرلی۔ اس کانگریسی وزارت نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ تمام سیاسی قیدیوں اور نظر بندوں کو فوراً رہا کردیا۔

آسام آسام میں سر سعد اللہ کی مسلم لیگی وزارت قائم تھی جس کے قدم مدتوں سے ڈگمگا رہے تھے، بالآخر پچھلے دنوں آسام اسمبلی میں ایک تحریک پر وزارت اور اپوزیشن میں سخت مقابلہ ہوا۔ جس میں ووٹ شماری پر فریقین کے برابر ووٹ آئے، صرف اسپیکر صاحب (صدر اسمبلی) کا ووٹ باقی رہ گیا تھا جو رواجاً حکومت کو ملا۔ اس طرح سر سعد اللہ کی وزارت شکست سے بچ گئی لیکن سر سعد اللہ نے دانشمندی سے کام لیکر آسام اسمبلی کی سرکردہ پارٹیوں کے لیڈروں سے صلاح و مشورہ کرکے سمجھوتہ کرلیا اس کے بعد انھوں نے اپنی وزارت کا استعفا داخل کردیا جو گورنر نے منظور کرلیا لیکن نئی وزارت کی تشکیل کا کام پھر سر سعد اللہ کے سپرد کیا گیا جنھوں نے سب پارٹیوں کے نمایندے چن کر ایک مخلوط وزارت مرتب کی جسمیں ہندو مسلم وزرا کی تعداد برابر ہے، گویا اب آسام میں بھی مسلم لیگی وزارت باقی نہیں رہی۔

بنگال آسام و سرحد کے بعد بنگال کا نمبر آیا جہاں سر ناظم الدین کی مسلم لیگی وزارت قائم تھی۔ جب بنگال اسمبلی میں حکومت کی طرف سے محکمۂ زراعت کا مطالبہ پیش کیا گیا تو اپوزیشن نے مخالفت کی اور اسی اجلاس میں بہت سے ممبر جو پہلے حکومت کے حامی تھے اپوزیشن سے جا ملے، نتیجہ یہ ہوا کہ باوجودیکہ یوروپین گروپ کے سولہ ممبران نے حکومت کا ساتھ دیا لیکن وزیر اعظم سر ناظم الدین نے اعلان کیا کہ وہ اس شکست کو محض اتفاقیہ سمجھتے ہیں لیکن حکومت کو کثرت رائے سے شکست ہوگئی لیکن کونسل کے اسپیکر نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا اس پر وزارت مستعفی ہوگئی، اور اب بنگال میں قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء کی دفعہ ۹۳ کی رو سے گورنر نے تمام نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور گورنری راج قائم ہے،

اسمبلی کے صدر کا رویہ اس مسئلہ میں کہاں تک درست تھا اس کے بارہ میں اختلاف رائے ہے، ہماری رائے میں بھی قانوناً صاحب صدر کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ وزارت کو اسمبلی ہال کے استعمال سے بھی روک دیں۔ بہر حال کچھ بھی ہو بنگال کی وزارت کی برخاستگی سے کسی کو رنج نہ ہوگا۔

وائسرائے کا سفر لندن | اسی اثنا میں ہز اکسلنسی لارڈ ویول وائسرائے و گورنر جنرل ہندوستان لندن تشریف لے گئے ہیں، اس سفر کا مقصد کیا ہے ؟ اس کے بارے میں ہندوستان اور برطانیہ کے سیاسی حلقوں میں مختلف قسم کی قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں جس میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے۔ ان قیاس آرائیوں کا لب لباب یہ ہے کہ وائسرائے کے سفر لندن کے مقاصد دو ہیں۔ ایک کا تعلق جاپان کے خلاف جنگ سے ہے اور دوسرے کا تعلق ہندوستان کی سیاست سے ہے، پہلا مقصد تو بالکل صاف ہے یعنی یوروپ کی جنگ ختم ہونے والی ہے، اور آج نہیں تو کل جلد ہی جرمنی ہتھیار ڈالنے والا ہے۔ اس کے بعد اتحادیوں کی تمام جنگی طاقت جاپان کے خلاف منتقل ہو گی اور جو اتحادی فوجیں آج کل یوروپ میں جرمنی سے برسر جنگ ہیں ان کا بڑا حصہ جاپان سے لڑنے کیلئے لایا جائیگا۔ اور چونکہ ان کے لئے ہندوستان کے سوا اور کوئی مستقر نہیں ہے اس لئے یہ تمام فوجیں ہندوستان آئینگی جن کے کھانے، پینے اور دیگر ضروریات کا انتظام ہندوستان کو کرنا پڑیگا، یہی وجہ ہے کہ حکومت برطانیہ نے اس بارہ میں صلاح و مشورہ کرنے کیلئے لارڈ ویول کو طلب کیا ہے جو ہندوستان کے کمانڈر انچیف بھی رہ چکے ہیں، چونکہ جاپان کے خلاف کامیاب جنگ لڑنے کیلئے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ ہندوستان جان و مال سے پوری طرح مدد دے، جو ہندوستان میں صرف ایک نیشنل گورنمنٹ کر سکتی ہے اس لئے غالباً ہندوستان کا موجودہ سیاسی جمود دور کرنیکی بھی تدابیر زیر غور آئیں گی اور ہندوستانیوں سے سمجھوتہ کرنے کیلئے کوئی نیا قدم ضرور اُٹھایا جائیگا، یہ نیا قدم کیا ہوگا ؟ اس کا حال اسی وقت معلوم ہوگا جب لارڈ ویول ہندوستان آکر کوئی اعلان کریں گے، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کانگریس سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کیجائیگی، یہی وجہ ہے کہ تمام صوبوں میں سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جا رہا ہے۔ اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو بھی قلعہ احمد آباد سے ان کے صوبوں میں منتقل کر دیا گیا ہے، جہاں صوبجاتی حکومتوں کے حکم سے وہ بہت جلد رہا کر دیے جائیں گے۔

مغربی محاذ | یوروپ کے مغربی محاذ پر جرمنوں کی قوت مزاحمت بالکل ٹوٹ چکی ہے اور وہ اتحادی فوجوں کے سامنے بے تحاشا پیچھے ہٹتے چلے جا رہے ہیں۔ اتحادی فوجیں اب جرمنی کے علاقہ میں بلا روک ٹوک بڑھتی چلی جا رہی ہیں، اتحادی ٹینک اور پیدل فوجوں کی یلغاروں کو کوئی روکنے والا نہیں رہا۔ جرمن سپاہی دھڑا دھڑ ہتھیار ڈال کر قید ہو رہے ہیں، اب تک اتحادی فوجیں کبھی کی برلن پہونچگئی ہوتیں لیکن جوں جوں انکا سلسلہ مواصلات بڑھتا چلا جاتا ہے رسد رسانی کی دقتیں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ بہر حال اس وقت اتحادی فوجیں برلن سے تقریباً ڈیڑھ سو میل دور رہگئی ہیں۔ بایں ہمہ جنرل ائیسن ہاور کا خیال ہے کہ اگرچہ جرمنوں کی قوت مزاحمت زائل ہو چکی ہے اور انھیں خود بھی اپنی شکست کا یقین ہوگیا ہے لیکن

ابھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ لڑائی ختم ہونیوالی ہے۔ افسوس ہے کہ ہٹلر ابھی تک اپنی ضد پر قائم ہے اور غالباً اس وقت تک قائم رہیگا جبتک اتحادی فوجوں کے ہاتھوں ہیمبرگ، برلن، لائپزگ، ڈریسڈن، اور وآنا وغیرہ سے جیسے بڑے بڑے اور مشہور شہروں کی اینٹ سے اینٹ نہیں بج جائیگی۔ امریکن فوجوں نے علاقہ روہر کو بالکل پامال اور بیکار کردیا ہے، اس علاقہ میں تقریباً ایک لاکھ بہترین جرمن فوج برسر مقابلہ تھی جس کا بہت بڑا حصہ اب تک ہلاک یا زخمی ہوچکا ہے، بایںہمہ جب کبھی موقعہ ملتا ہے جرمن فوجیں اب بھی شدید جوابی حملے کر بیٹھتی ہیں، چنانچہ پچھلے دنوں جرمنوں نے دعویٰ کیا تھا کہ انہوں نے شہر گوتھا اتحادیوں سے واپس لے لیا ہے۔ مغربی محاذ کے سلسلہ میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ اب اس محاذ پر فیلڈ مارشل فان رنسٹیڈ کمانڈر انچیف نہیں رہے ہیں بلکہ انکی جگہ فیلڈ مارشل کیسلرنگ کو دیدی گئی ہے جو اطالوی محاذ پر کمانڈر انچیف تھے انکی نسبت اتحادی ماہرین جنگ کا خیال ہے کہ وہ غالباً لائپزگ کے مورچہ پر ایک سخت اور فیصلہ کن لڑائی لڑیں گے جو غالباً جرمنی کی آخری گھمسان کی لڑائی ثابت ہوگی اور یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ اگر اتحادی فوجیں اسیطرح بے روک ٹوک آگے بڑھتی رہیں تو وہ بہت جلد روسی فوجوں سے مل جائیں گی۔

روس | ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب روسیوں نے اپنے نقشۂ جنگ میں کچھ ردوبدل کردیا ہے، پہلے شمال اور شمال مشرقی جرمنی کی طرف روسی یلغاروں کی بہت خبریں آیا کرتی تھیں مگر اب بہت دن سے یہ خبریں بند ہیں اور انکے بجائے یہ خبریں آرہی ہیں کہ روسی فوجوں کی توجہ آسٹریا کی طرف ہے، انھوں نے ہنگری کو تو جرمنوں سے بالکل صاف کردیا ہے اور اب کچھ روسی فوجیں ایک طرف آسٹریا کے دارالحکومت وآنا پر حملے کررہی ہیں اور کچھ اٹلی کی طرف بڑھ رہی ہیں جن کا رخ بحیرۂ ایڈریاٹک کی مشہور بندرگاہ تریستہ کی طرف ہے۔ شمالی جرمنی کی مشہور بندرگاہ ڈانزگ اور گڈنیا روسیوں نے فتح کرلی ہیں۔ اسی طرح روزامبیروک، براتسلاوہ، بروک اور گراز پر بھی روسیوں کا قبضہ ہوگیا ہے۔ شہر کوسٹرین بھی جو برلن کے مشرق میں واقع ہے، روسیوں نے فتح کرلیا ہے لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وآنا کی حفاظت کیلئے جرمن کمک پہونچ گئی ہے اور یہاں سخت مقابلہ ہوگا۔

برہما | جہاں تک وسطی برہما کا تعلق ہے اتحادی فوجوں نے اس حصۂ ملک کو جاپانیوں سے صاف کردیا ہے اور جہاں کہیں چھوٹے چھوٹے جاپانی دستے باقی رہ گئے ہیں ان کا صفایا کیا جارہا ہے۔ الغرض وسطی برہما کی لڑائی اتحادیوں نے صاف جیت لی ہے البتہ مانڈلے لاشیو روڈ کے شمال میں ابھی جاپانی کسی قدر مزاحمت کررہے ہیں لیکن یہ مزاحمت کچھ زیادہ سخت نہیں ہے، اس علاقہ میں اتحادی فوجیں مونگیا ئی تک پہونچ گئی ہیں۔ مانڈلے رنگون ریلوے لائن تھازی تک اتحادیوں کے قبضہ میں ہے اور اب لشکر ۱۴ شوین یانگ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس ریلوے لائن کے مغربی سمت کہیں کہیں جاپانی دستے باقی رہ گئے ہیں جن کا صفایا کیا جارہا ہے اور یہ جنگی سرگرمیاں کیوکسے اور میک تیلا کے درمیان جاری ہیں۔ اسی سلسلہ میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ لشکر ۱۴ کے ہراول دستے دریائے اراودی کے مغربی کنارے سے سیلیو میں

داخل ہو گئے ہیں جو باکو سے ۴۲ میل جنوب مغرب واقع ہے اور یہی وہ علاقہ ہے جہاں تیل کے چشمے واقع ہیں۔

اراکان میں ۱۵ ہندوستانی فوج نے تونگیا پر قبضہ کر لیا ہے۔

بحرالکاہل | امریکن فوجیں بحرالکاہل کے جزیروں میں اُترتی ہوئی سرزمین جاپان کے قریب تر ہوتی جا رہی ہیں، آئیو جیمہ پر قبضہ کرنے کے بعد امریکن فوجیں مجمع الجزائر ریوکو کے جزیرۂ اوکیناوہ میں اُتار دی گئیں جہاں جاپانیوں سے نہایت سخت جنگ ہو رہی ہے، اسی جزیرہ کے سمندروں میں فریقین کی بحری و ہوائی جنگ بھی نہایت سخت ہوئی جس میں فریقین نے ایک دوسرے کو سخت نقصان پہنچانے کا دعویٰ کیا ہے۔

جزائر فلیپائن کے خلاف جنرل میک آرتھر نے اکتوبر ۱۹۴۴ء میں فوج کشی کی تھی اور سب سے پہلے جزیرہ لیتے پر حملہ کیا تھا، اس کے بعد امریکی حملوں کی کثرت و شدت بڑھتی چلی گئی اور اب تک امریکی فوجیں جزائر لیوزان، منڈورو، پلاوان، منڈاناؤ، پنائے، سیبو اور دیگر میں اُتر کر بہت کچھ ترقی و قبضہ کر چکی ہیں۔ اب امریکی فوجوں کا تازہ حملہ مجمع الجزائر سولو کے جزیرہ مستبتہ پر ہوا ہے جو شمالی بورنیو کے ساحل سے صرف ۵۰ میل کے فاصلہ پر ہے اس کے علاوہ برطانوی بحری بیڑہ نے بھی جنگ میں حصہ لینا شروع کر دیا ہے اور وہ مختلف جزیروں پر جن میں سماترا بھی داخل ہے، گولہ باری کر چکا ہے۔

دو معاہدے | روس نے اپنے دو معاہدوں کے انفساخ کا نوٹس دے دیا ہے۔ ایک معاہدہ ٹرکی سے تھا جو دوستداری اور غیر جانبداری کے لئے ۱۹۲۵ء میں ہوا تھا۔ انفساخ معاہدہ کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ ۱۹۲۵ء سے جب یہ معاہدہ کیا گیا تھا۔ اب تک دنیا کے حالات بالکل بدل گئے ہیں۔ اس لئے معاہدۂ مذکور حالات موجودہ کے مطابق نہیں ہے، عام خیال یہ ہے کہ اگر روس نے ٹرکی سے کوئی دوسرا معاہدہ کیا جس کے لئے گفت و شنید ہو رہی ہے تو اس میں وہ ٹرکی سے خاص رعایات طلب کریگا۔ بہت ممکن ہے کہ آبنائے باسفورس اور درہ دانیال پر اقتدار طلب کرے اور یہ بھی ممکن ہے کہ قفقاز میں جو روس و ٹرکی کی سرحد ہے اس میں بھی کوئی رد و بدل کیا جائے۔ دوسرا معاہدہ دوستداری و غیر جانبداری ۱۳ اپریل ۱۹۴۱ء کو جاپان سے کیا گیا تھا اس کے انفساخ کے وجوہ روس کے وزیر خارجیہ موسیو مولوٹوف نے یہ بتائے ہیں کہ یہ معاہدہ اس وقت سے پہلے ہوا تھا جب جرمنی نے روس پر حملہ کیا تھا یا جب جاپان کی جنگ برطانیہ و امریکہ سے شروع نہیں ہوئی تھی۔ برطانیہ و امریکہ روس کے حلیف ہیں اور جرمنی کے دشمن اور جاپان جرمنی کا حلیف ہے اور برطانیہ و امریکہ کا دشمن۔ اس کے علاوہ جاپان روس کے خلاف بھی جرمنی کو مدد دیتا رہا ہے۔ اندریں حالات معاہدہ مذکور بالکل بے معنی ہو کر رہ گیا ہے جس کی تجدید نہیں کی جا سکتی، یہ معاہدہ ۱۳ اپریل ۱۹۴۶ء کو کالعدم ہو جائیگا۔ اگرچہ روس کی سیاست خارجیہ ابھی تک کسی کی سمجھ میں نہیں آئی لیکن مفکرین کا خیال ہے کہ روس بہت جلد برطانیہ و امریکہ کے ساتھ مل کر جاپان کے خلاف جنگ میں شریک ہو جائیگا۔ اور اس کی قیمت اتحادیوں سے بہت بڑی وصول کرے گا۔ دوسرے طبقہ کا خیال ہے کہ روس اگر جاپان سے نہ بھی لڑا تو اس سے زبردست حقوق و مراعات طلب کرے گا۔

بچوں والو یہ یاد رکھو
حکیم تلتی پرشاد اگروال علیگڈھ کی گورنمنٹ سے رجسٹرڈ
اصلی میٹھی
بال جیون گھٹی
رجسٹرڈ
بچوں کی ہر ایک بیماری کو دور کرتی کمزور بچوں کو تندرست طاقتور
بناتی ذرا سی روزانہ صبح و شام بچوں کو چٹا دینے سے بچے
ہرگز نہیں ہوں گے۔ دانت بڑی آسانی سے
سب جگہ فروخت ہوتی ہے لیکن نقلی اور جعلی
قیمت فی شیشی ۸ چار شیشی ایک روپیہ درجن ۱۲ علاوہ محصول
معقول کمیشن دیا جاتا ہے
المشتہر:۔ مینیجر بال جیون کارپالیسر علی گڈھ یو۔ پی
لوکل ایجنٹ:۔ محمد حفیظ محمد نصیر سوداگر کانپور
آزاد
کیا آپ نے ہفتہ وار اخبار آزاد ملاحظہ فرمایا ہے؟
جو ہر ہفتہ کانپور
سے ایڈیٹر صاحب زمانہ کی نگرانی میں
شایع ہوتا ہے
صرف پانچ روپیہ سالانہ میں آپ ضروری
خبروں اور واقعات کے بہترین مجموعہ افسانے
جدید معلومات کو سال بھر دیکھ سکتے ہیں۔
اس قیمت پر اس قدر دلچسپ مفید اخبار آپ کو کہیں نہ ملیگا
نمونہ مینیجر آزاد کانپور سے طلب فرمائیے

بیادگار منشی دیا نراین صاحب نگم - مرحوم

نمبر ۵	مئی ۱۹۴۵ء	جلد ۸۴

فہرست

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

آپ اپنی
سے
لوگ جانتے ہیں اور عورتیں جلد محسوس کر لیتی ہیں کہ آپ کیا ہیں جو
شرمیلے اور جھجکنے والے آدمی کیلئے کوئی گنجائش نہیں دنیا کو اسکی ضرورت نہیں
اس قسم کے لوگوں میں اپنے کو شمار ہوتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے صحیح معنوں میں مرد بنیئے
زندگی کا لطف حاصل کیجئے!
آپ کمزور اور بناوٹی مرد ہیں اگر آپ پر دنیا ہنستی ہے اور آپکے متعلق
شیاں ہوتی ہیں آپکا ذکر حقارت سے کیا جاتا ہے تو اسکے لئے آپکے
کوئی معقول عذر نہیں آپکا اپنا قصور ہے کہ آپ کمزور اور دائم المریض ہیں
آپ صحیح معنوں میں مرد بن سکتے ہیں
ایسے مرد جسکی سب تعریف کریں اور عزت کریں قطع نظر اسکے کہ
آپنے گذشتہ زمانے میں اپنی قوت کے متعلق کتنی لاپرواہی سے کام
لیا ہے اور کن کن بدعنوانیوں کے مرتکب ہوئے ہیں آپ بھی
اب دنیا کی مشہور دوا
طلاء حنا
جو فخر خاندان شریفی عالیجناب افضل الاطباء حکیم محمد ذکریا خان صاحب رئیس اعظم دہلی و سرپرست شریفی دواخانہ
کی مایہ ناز ایجاد ہے اور جسکے جادو اثر افراد حیات پرور ہونے کا ہزاروں مایوس العلاج مریض اعتراف کر چکے ہیں،
زندگی کا حقیقی لطف حاصل کیجئے، پہلے یہ طلا نوابوں۔ راجاؤں کیلئے مخصوص تھا، آبلہ چھالہ نہیں ڈالتا۔
وقت پر پہلے ہی روز کے استعمال سے طلسماتی اثر ظاہر ہوتا ہے ناکارہ سے ناکارہ شخص بے پناہ قوت کا مالک
بن جاتا ہے اور پندرہ روزہ استعمال سے جملہ نقائص دور ہو جاتے ہیں اور پھر تمام عمر کسی طلاء کی ضرورت باقی نہیں رہتی
قیمت۔ فی شیشی پانچ روپے۔ جو پندرہ دن کیلئے کافی ہے ترکیب استعمال ہمراہ دوا
محمود احمد
شریفی دواخانہ یونانی بلیماران پوسٹ بکس ۳ دہلی

جلد ۴۴ مئی ۱۹۴۵ء نمبر ۵

اقبال اور اُس کا فلسفہ

از جناب فیاض صاحب گوالیاری بی، اے

اُس وقت جبکہ زمانہ گرمِ رفتارِ ترقی ہو تو محض چشم شاعر ہی پُر نم ہو کر نہیں رہجاتی بلکہ قلب شاعر تپاں اور شعورِ شاعر تلاش راہ عمل میں جولاں نظر آتا ہے۔ ہر قوم و ملک میں شعرا نے نہ صرف قومی زوال پر آنسو بہائے ہیں بلکہ انسانوں کے اندر جوشِ عمل کی روح بھی پھونکی ہے اور سوتی ہوئی قوموں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیداری پر مجبور کیا ہے۔

شاعر اور غیر شاعر میں موزونیت کلام کے علاوہ شدتِ احساس کا بھی فرق ہوتا ہے اور یہ شدتِ احساس جب شعور کے ساتھ مل کر کام کرتی ہے تو زیادہ گہرائی سے وقت و زمانہ کی نباضی کر سکتی ہے، نطشے اور اقبال دونوں ایک ایسے ماحول میں پیدا ہوئے جہاں مذہبیت شدت سے کار فرما تھی اور تقدیر پرستی نے قوائے عمل کو معطل کر رکھا تھا جب مرض تقریباً یکساں ہوتا ہے تو وسیع العلم متفکرین و معالجین کے نسخوں میں شعوری و غیر شعوری طور پر مشابہت واقع ہو ہی جاتی ہے، فرق یہ تھا کہ جرمن شاعر نے یورپین سائنس کی ملحدانہ فضا میں "عزم للقوۃ" کا علم قدامت پرستی کو دور کر کے بلند کیا تو اقبال نے ایشیا کی اخلاقی اور مذہبی دنیا میں تقدیر پرست مشرق کو خودی کی لامحدود طاقتوں کا آئینہ دکھا کر دعوتِ خود شناسی دی، عنصر قوت نطشے اور اقبال دونوں کے تخیل میں جزو مشترک ہونے سے غلط بحث کی گنجائش پیدا ہے ورنہ اقبال کا متصوفانہ انسان کامل نطشے کے ملحدانہ فوق الانسان سے بالکل علیحدہ اور ایک اور مکمل چیز ہے۔

بڑھتی ہوئی معلومات کی روشنی میں ایک متفکر کو کسی رجحان میں اپنے ہمخیال متفکرین و فلاسفہ کے ساتھ جو قدرتی لگاؤ ہونا چاہیئے اُسے چھپانے کی اقبال نے کوشش نہیں کی بلکہ وسیع القلبی کے ساتھ اپنا اخلاقی پُرچار کرتے ہوئے اسکا رہبر گِنا یا اور ان کے ماتحتی کارناموں کو سراہا ہے مگر یہ ستائش عزیزانہ و منصفانہ ہے نہ کہ عقیدتمندانہ بلکہ خود نطشے کے ایسے کافی عناصر ایسے پائے جاتے ہیں جن سے وہ صرف مغربی بلکہ قدیم مشرقی فلسفہ سے متاثر نظر آتے ہیں

اقبال نے اُسے "بر طرحِ حرم بتخانہ ساز" بنایا ہے لیکن اس قسم کے تاثر کو دوسروں کے خیالات کو اپنانا نہیں کہا جا سکتا، انگریزی میں ایک مثل ہے کہ "بڑے آدمی ایک ہی طریق پر سوچتے ہیں۔" (ستوسیا نے ایک مت) یہ ایک نفسیاتی نکتہ ہے بڑے آدمی سے مراد وہ انسان ہیں جن کی قلبی صلاحیت، ذہنی تربیت اور سوچنے سمجھنے کی قوت عام انسانوں سے بڑھی ہوئی ہو، چونکہ علم و معلوماتِ جدیدہ کے سلسلے میں عصرِ جدید و ازمنۂ قدیم کی تاریخ و فلسفہ کی لہریں اُن کے دماغ پر خاموشی سے اپنے نقوش ثبت کرتی رہتی ہیں، وہ محسوس و نامحسوس طور پر ملتے جلتے ماحول میں ملتے جلتے خیالات کا اظہار کرتے ہیں کیونکہ اُن کے طرزِ خیال کا نفسیاتی اصول یکساں ہوتا ہے۔

انسانی تہذیب کے ہر دور پر نظر ڈالئے تو کوئی خیال اوریجنل یا اچھوتا نہیں کہا جا سکتا، چشمِ تحقیق کو سارے چراغ کسی نہ کسی چراغ سے روشن ہوتے ہوئے نظر آئیں گے، مگر دیکھنے کی بات یہ ہوگی کہ اس اخذ و تاثر میں کس مفکر نے کیا تنوّع پیدا کیا اور اُس تنوع میں بنی نوعِ انسان کی خدمت انجام دینے کی کتنی صلاحیت ہے؟

جو لوگ اقبال سے غیر معمولی عقیدت رکھتے ہیں اُن کے لئے یہ خیال ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے کہ اقبال نے کسی اقتدار پسند ملحد فلسفی کا کوئی اثر لیا مگر ایسی کورانہ عقیدت جو ہمیں انصاف و تنقید کی صلاحیت سے محروم کر دے، میرے خیال سے نہ مذہب کی کوئی خدمت انجام دیتی ہے نہ قومی شاعر کی۔ جو قومیں دنیا کی ہر چھائی اپنے اندر دیکھنے اور ثابت کرنے کی کوشش میں رہتی ہیں وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتیں کیونکہ قدامت پرستی کے جراثیم اُن کو پنپنے کا موقع ہی نہیں دیتے!

اقبال خالص اسلامی ماحول میں رہکر مغربی تعلیم و فلسفے سے بہرہ اندوز ہوا۔ وہ مولانا روم اور نطشے دونوں ہی سے متاثر ہے اُس نے مشرقی اخلاق و روحانیت میں مغربی مادیت کے قوی اجزاء کو سمو دینے کی کوشش کی ہے۔ جو لوگ مقتضیاتِ زمانہ کو سمجھتے ہیں وہ اقبال کی اس کوشش کو افادی حیثیت سے غیر مستحسن نہیں قرار دے سکتے بلکہ اسکی متنوع خصوصیات کے باعث اُس کے نئے طرز اُن کو اختراعِ فائقہ کا درجہ دیتے ہیں۔

بیمار جسم میں اعادۂ قوت کے لئے خون کی روانی تیز کرنی ہی پڑتی ہے، نتیجہ میں انسانِ کامل کا تصور پیدا ہوا فوق الانسان کا۔ اور چونکہ اِس تکمیل و تفوق کے لئے اظہارِ قوت و حصولِ قوت ناگزیر ہے، اسی لئے اقبال حیات منظہرِ قوت سے متاثر نظر آتا ہے، جس مفکر کا مذہب، رہبانیت کے خلاف ایک جہاد ہو (لا رهبانية في الاسلام) وہ اگر کسی ایسی چیز کے لئے جھومتا ہے جو تنازع للبقا میں سب سے زیادہ ضروری ہے تو اُس کا یہ عمل غیر اسلامی نہیں کہا جا سکتا! اقبال کا وجد و تاثر حیات کے مظہرِ قوت کی صحیح قیمت جاننے کے باعث ہے، وہ اس عنصر کو قوم کے لئے جتنا ضروری خیال کرتا ہے اُتنا ہی زیادہ متاثر نظر آتا ہے اس کے برعکس قوت و حصولِ قوت سے نفرت انسان کو رہبانیت کی طرف لیجاتی ہے جو انسانی ارتقاء کے لئے ایک بڑی ٹھوکر ہے! افراط و تفریط

مطلب اور نتیجہ بدل جاتا ہے اگر ہم اقبال کے مقصد اور مطمح نظر کو ذرا بدل کر اس کے نظریہ کو پرستاری قوت کی انتہا پسند تلقین قرار دیدیں تو اس کا فلسفہ غیر اسلامی بھی نظر آئیگا اور گمراہ کن بھی، مگر یہ فرق زاویہ نگاہ کا ہوگا، اقبال بہیمانہ قوت کی پرستاری نہیں سکھاتا وہ تو جبن و بزدلی کے راستے سے ہٹا کر انسان کو حیات کے مظہر قوت سے روشناس کرتا ہے اور انسان کے اندر جو قوتیں چھپی رہتی ہیں انھیں روشنی میں لاکر ارتقا کی خدمت انجام دیتا ہے۔

باب علم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا زریں ارشاد مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ (خود شناسی خدا شناسی ہے) ایک بحر بے پایاں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ارشاد سارے اسلامی تصوف کی بنیاد اور خدا کا پہلا داخلی تصور ہے۔ اقبال کا فلسفہ اسی مقولۂ عالیہ کے غواصی میں ڈوبا ہوا ہے، عام دماغوں کے مقابلہ میں اقبال کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس سمندر میں سے فلسفۂ خودی کا موتی ڈھونڈھ نکالا اور اسے "عزم القوۃ" کی روشنی میں اتنی بلندی پر چمکایا کہ تقدیرات، رضا جوئے تدبیر نظر آنے لگیں۔ جو نگاہیں اس چمک سے خیرہ ہو گئیں انھیں یہ جرأت تاب سخن ایک آنکھ نہ بھائی مگر جنھوں نے تیغ اصیل کی جوہر شناسی سے کام لیا وہ دیکھ سکے کہ اقبال نے خودی اور خود شناسی، خود پرستی و خدا پرستی کے درمیانی تلوار کی دھار سے باریک تر راستہ کس مجتہدانہ خود اعتمادی سے طے کیا ہے، وہ جانتا تھا کہ اس پل مراط سے گزرے بغیر اس کی قوم کا جنت ارتقا میں داخل ہونا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

ملحد نطشے کے دل کو مومن قرار دینے والا اقبال خودی کے درجہ کو اتنا بلند کر سکتا ہے کہ خدا بندے کے عزائم کے مطابق ہی احکام جاری فرماتا ہوا معلوم ہو مگر یہ منزل باغیانہ نہیں، لوح و قلم کے خارجی تصور سے قطع نظر کیجیے تو تقدیر و تدبیر ایک ہی تصویر کے دو رخ نظر آئیں گے اور مقدم و مؤخر کا فرق مٹ کر اتنی مغائرت ہی نہیں رہیگی کہ باہم گستاخی کا سوال پیدا ہو، رومی، حافظ اور دوسرے فارسی شعراء کے وسیع النظرانہ معارف اور متصوفانہ نکات کا نکتہ رس ہونے کے باعث اقبال بڑی بے تکلفی کے ساتھ اُن مقامات سے گزر جاتا ہے جہاں اہل شریعت کے پر جلتے ہیں۔

اُس کا یہ شاعرانہ طرز بیان کہ ؎

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں　　کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر
روز حساب جب مرا پیش ہو دفتر عمل　　آپ بھی شرمسار ہو مجھکو بھی شرمسار کر

مذہبی تلمیحات کے ساتھ نازِ عاشقانہ کی ایک شان ہے، جو مقام دل سمجھنے والوں کی نگاہ میں گناہ نہیں ٹھہر سکتی محبت کی زبان اعتراضات سے بالاتر ہوتی ہے ان اشعار میں گہری محبت کا جو عنصر پایا جاتا ہے اُس میں اور اُملاء کا شمیر آہو بچاہ جوش ؛ اللہ سے انتقام آدم لینے ب ــــــ کے نعرۂ باغیانہ میں جو فرق ہے

اُس کی تیز اُلمی فوق بخوبی کر سکتے ہیں۔

خیابان و گلزار و باغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی

میں بھی انسانی تخلیق کی عظمت کا بیباکانہ اظہار نہیں بلکہ "شکوہ" والی جرأتِ تابِ سخن کے ساتھ خدا کی دنیا کو سنوارنے
میں اُسکی دی ہوئی قوتوں سے انسان نے جو خدمت انجام دی ہے اُس کا اظہار کیا گیا ہے۔
اقبال بظاہر کہیں سراپا عبودیت نظر آتا ہے تو کہیں اُس کے لہجہ پر ملحدانہ گستاخی کا شبہ ہوتا ہے، کہیں فقر کی
تعلیم دیتا ہے تو کہیں حصول قوت کی تلقین کرتا ہے، کہیں پکے قدامت پرست مسلمان کا روپ بھر لیتا ہے تو کبھی بڑی
وسیع النظری کے ساتھ کافر نطشے ہی کو مومن قرار نہیں دیتا بلکہ ابلیس کو بھی جبرئیل کے ساتھ مکالمہ میں چمکا کر پیش کرتا ہے

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پود!

میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو،

اسی لئے ہندی کی چندی کرنیوالے منطقی اُسے تضاد گو قرار دیکر اُس کے فلسفے کو درخورِ اعتنا نہیں ٹھہراتے! اگرچہ
اُس کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہیں، ایسے اصحاب نادانستہ طور پر اُسے اُس کی ایک ایسی خصوصیت سے
محروم کرنا چاہتے ہیں جو اُس کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے اور جس نے اُس کے نام کو آفاقی اور بین الاقوامی درجہ
دیا ہے انہیں اُس کے کلام میں متضاد عناصر کے کھوج میں پڑنے کی بجائے اُس کے دل و دماغ کا صحیح مطالعہ
کرنا چاہیئے، اُسکی شاعری میں اہتزازِ روح بھی ہے اور فلسفۂ حیات بھی، مگر شاعرانہ طرزِ بیان کو منطقی استدلال و
اُصول پر جانچنا بنیادی غلطی ہے۔
اقبال جس وقت مومن و کافر کی سرحدوں سے گزرا ہوتا ہے اُس وقت متصوفانہ شعریت کی مستی میں ڈوب کر
مَن تو شدم تو مَن شدی، کے جوش میں صدائے "انا الحق" اس طرح بلند کرتا ہے کہ "کرشنا" چونک پڑتا ہے۔

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں اپنا
اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

چونکہ متصوفانہ آزاد خیالی اور موروثی مذہبیت، سائنٹیفک فلسفہ طرازی قوت اور مراتب فقر و فنا کے متقابل جذبات
اُس کے کلام میں جا بجا اپنا کام کرتے نظر آتے ہیں اِس لئے ہمیں اس تقابل پر تضاد کا وہم ہوتا ہے ورنہ اُس کا دماغ
غیر منطقی نہیں، وہ کافر نطشے کا مداح بھی نظر آتا ہے جبکہ اُس کے دل میں حقیقی مومن کے عناصر محسوس کرتا ہے،
اُس کا دماغ ہبوطِ آدم میں ارتقاءِ عالمِ انسانی کی بنیادیں دیکھ کر اُسے دوسرے معنوں میں عروج سے تعبیر کرتا ہے
اُس کی شاعری اسلامی تصورات کے باوصف شیطان کی جرأت و قوت کی معترف نظر آتی ہے مگر غور سے دیکھئے تو
سب کچھ اُس کے پیامِ ارتقاء اور فلسفۂ خودی کی تائید ہے جس میں کوئی منطقی تضاد واقع نہیں۔ وہ چونکہ زمانہ اپنی تو
کے لئے ایک ضروری فلسفہ اور پیام لیکر آیا تھا اِس لئے اس کی شعریت نے مذہبی تصورات کی تفسیر و تعبیر اپنے

خاص رنگ میں کمی ہے، اُس کے کلام میں تضاد مل سکتا ہے تو اُسی طرح کا جیسے شاعر مختلف جذبات و کیفیات کے تحت غیر مسلسل غزل کے مختلف اشعار کہتا ہے اور کسی شعر میں اُس کا دل زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے کسی میں اُس کا دماغ!

غزل گو شعراء کے علاوہ اُردو ادب جن شعراء کے بار احسان سے سر نہیں اُٹھا سکتا، وہ انیس، حالی، چکبست، سیماب، جوش اور اقبال ہیں۔ انیس نے اُردو نظم کو تشبیہات، محاکات، فصاحت، روانی اور اثر سے مالا مال کیا، تو حالی نے اصلاحی جذبے کے ساتھ درد و گداز میں ڈوبی ہوئی جذبے نظیر نظمیں عطا کیں۔ چکبست نے سلاست زبان کے ساتھ حب وطن کے بیش قیمت عناصر اُردو شاعری کو زیادہ سے زیادہ دئے۔ سیماب نے اپنی شاعرانہ قوتوں کو بروئے کار لاکر اُردو ادب کو متنوع ہمہ گیر اور ترقی یافتہ بنایا۔ جوش نے قدیم طرز شاعری کو کوسوں پیچھے چھوڑ کر تشبیہات و استعارات کی حیرت انگیز جدت، نازک نفسیاتی صناعی، شاداب تخیل اور زور بیان کے دریا بہا دئے، تو اقبال نے اپنی سحر کارانہ عظمتِ شاعری کے ساتھ ساتھ اُردو ادب کو ایک ایسا فلسفہ عطا کیا جس کی قوم و ملک کو سخت ضرورت تھی، اُس کے دماغ سے ایک ایسا آفتاب طلوع ہوا جس کی روشنی میں ہم انسانی قوتوں کی عظمت کو سمجھ سکے اور ہمارے قوائے عمل جگمگا اُٹھے۔

وہ مسلمان قوم جس میں قوتِ عمل مٹتی جا رہی تھی اور دین و دنیا کا توازن جو اُن کا طرۂ امتیاز تھا، رفتہ رفتہ ناہو تا جا رہا تھا، اُسے سر سید نے موجودہ تعلیم و معلومات کی ضرورت کا احساس کرایا۔ حالی نے پیام بیداری سُنایا تو اقبال نے خودی و خود اعتمادی کی روح پھونک کر اُسے کاروانِ ارتقا کا ساتھ دینے کے قابل بنا دیا اور ایک معنی میں ملک کے کسی اہم اور وسیع عنصر میں صلاحیت ارتقا پیدا کرنیکی یہ سعی بھی ایک وطنی خدمت ہے۔

نوجوانی میں اقبال ایک پُر خلوص و پُر جوش وطن پرست شاعر تھا، اُس کا نغمۂ وطن "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" اور نظم "نیا شوالہ" اُس دور کی زندۂ جاوید یادگاریں ہیں مگر جیسے جیسے عمر ڈھلتی گئی اُس کے دماغی رجحانات، دل کے پھوٹ نکلنے والے بیساختہ چشموں سے دور ہوتے گئے، رفتہ رفتہ وطن کی محبت پر عالمگیر اسلامی اُخوت کا تصور غالب آگیا اور اُس کی شہرت و مذہبی ماحول نے اُسے صنمخانۂ ملک و وطن بلکہ گنگنائے اُردو کے باہر کھینچ لیا۔ اس "محدود وسیع النظری" نے ایک ایسے قابل قدر دماغ کو جو اسی ملک کی خاک پاک سے پیدا ہوا تھا اور جس خاک کے اُس پر اور اُس کی قوم پر بہت کچھ حقوق تھے وطن کی محبت کا پُرسوز راگ الاپنے اور حُبِ وطن کی روح پھونکنے سے روک دیا۔ سقراط جیسے حکیم و فلسفی کو جس نے مزعومات باطل کے پُرزے اُڑا دئے تھے اور ہدایات کو عقل و منطق کی روشنی میں پرکھنا سکھا کر اپنے ملک اور دنیا کی بے نظیر خدمات انجام دیں، زہر کا پیالہ پلانے میں اہل ایتھنز کسی باب میں حق و عقدہ محض اس لئے حق بجانب قرار دئے جاتے ہیں کہ سقراط عالمگیر اخوت و انسانیت کی

جو تعلیم دے رہا تھا وہ نہ صرف حب وطن کے محدود مگر ضروری جذبہ اور وطنی مفاد کے منافی تھی بلکہ انگلستان والوں کی قومی زندگی کے لئے بڑا خطرہ تھی۔

اِس بدنصیب ملک کے حالات کچھ دنیا بھر سے ہی مختلف ہیں۔ تنگ نظرانہ مذہبیت اور قدامت پرستی جس بھیانک روپ میں یہاں پائی جاتی ہے وہ دُنیا کے کسی دیگر ملک میں نہیں پائی جاتی، چین کے بودھ عیسائی اور مسلمانوں میں حب وطن کا عنصر پوری قوت سے مشترک ہے۔ ایران و عرب کا زاویۂ نظر بدل چکا ہے اور ٹرکی نے تو پکا اُدھری بننے ہی میں اپنا رازِ حیات سمجھا ہے، مگر یہاں دھرم کے ٹھیکیداروں اور جنت کے کلید برداروں نے ہماری ذہنیتیں کچھ ایسی بنا رکھی ہیں کہ یہاں کی سماجی، معاشرتی، تمدنی اور سیاسی فضا پر مذہب ہی مذہب چھایا ہوا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ ہم نہ صرف مذہب کے بنیادی انسانی اُصولوں اور اصلاحی مقاصد کو نظر انداز کئے ہوئے ہیں بلکہ مذہبی قیود اور اوامر و نواہی کے ترک کرنے کی حد تک تو روشن خیال ہیں مگر تنگ نظرانہ منافرت و فرقہ وارانہ جذبات پھیلانے کی حدود تک پکے قدامت پرست! یہ محسوس کرتے ہوئے بھی کہ اگر یہ مرض ہمیں لاحق نہ ہوتا اور ہم کشادہ دلی اور وسیع النظری سے کام لے سکتے تو ہمارا وسیع زرخیز و مردم خیز ملک شاہراہ ترقی میں دُنیا کے کسی ملک سے پیچھے نہیں رہ سکتا تھا۔ ہم قدامت پرستی سے بُری طرح چمٹے ہوئے ہیں اور پچھلی تہذیب پر لوٹ جانے ہی کو وسیلۂ نجات سمجھتے ہیں، ہمارے بڑے سے بڑے دماغ کسی نہ کسی حد تک اس تنگ نظرانہ قدامت پرستی کا شکار ہیں۔ چنانچہ اقبال بھی باوصف اپنی تمام وسیع معلومات اور فلسفیانہ نکتہ سنجیوں اور شاعرانہ مُوشگافیوں کے اس موروثی بیماری سے متاثر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ منطق اُس کے کلام میں روشن خیالی اور قدامت پرستی کے متضاد سے عناصر پاکر چین بجبیں نظر آتی ہے، بایں ہمہ اقبال ایک ایسا ادیب ہے جس کی شاعری اور فلسفے کے احسانات کو اُردو ادب کبھی فراموش نہیں کرسکتا اور جہاں تک تلقینِ عمل کا تعلق ہے اُس کے کلام سے عوام و خواص بلا امتیاز مذہب و ملت مستفید ہوتے رہیں گے، تقدیر پرستی پر اُس کے فلسفے نے جو ضرب کاری لگائی ہے وہ انسانی ارتقا کی ایک ایسی خدمت ہے جو اُسے دنیا کے ایک بڑے شاعر اور مفکر کا درجہ دیتی ہے۔

غزل

از جناب دیا شنکر بی اے

ساقی ہر دَور میں ایک جام بدل دیتا ہے
پینے والوں کے لئے کام بدل دیتا ہے

نشہ میں یار مرا نام بدل دیتا ہے
اِس طرح میرے لئے جام بدل دیتا ہے

کیا ظرافت ہے کہ قاصد مرے بہلانے کو
یار کا نامہ و پیغام بدل دیتا ہے

تاکہ مُرغانِ چمن جھل سمجھنے سے رہیں
روز صیاد بھی ایک دام بدل دیتا ہے

صحنِ گلزار میں جو پھول نکلتا ہے نسیم
اشکِ شبنم کا وہ انجام بدل دیتا ہے

خوابِ گراں

از جناب بہار کوٹی

طاری ہے کائنات میں خوابِ گراں ابھی
گُل کا کہیں نہ خندۂ گُل کا نشاں ابھی
ہنگامۂ فروغِ بہاراں کہاں ابھی
باغوں پہ چھا رہا ہے بنوں کا دُھواں ابھی

صحنِ چمن ہے مسکنِ زاغ و زغن ہنوز
ہیں محوِ خواب نازِ گل و نسترن ہنوز
کانٹوں سے کھیلتی ہے نسیمِ چمن ہنوز
شائستۂ بہار نہیں گلستاں ابھی

ذوقِ تمام و جذبۂ کامل کا ذکر کیا
حاصل کا ذکر کیا غمِ حاصل کا ذکر کیا
شوقِ عناں گستۂ منزل کا ذکر کیا
گرمِ سفر ہوا ہی نہیں کارواں ابھی

ہر ہر قدم پہ خطرۂ رہزن ہے اندنوں
مندر کمین گاہِ برہمن ہے اندنوں
تنکوں پہ اعتبارِ نشیمن ہے اندنوں
کیا جانے کس خیال میں ہے باغباں ابھی

تخصیصِ نسل و قوم و جماعت کی دُھوم ہے
اُنتہاِ اقتدار قیادت کی دُھوم ہے

نیرنگِ حل و عقدِ سیاست کی دُھوم ہے
گھیرے ہوئے ہیں گھر کو مرے آندھیاں ابھی

کودے جو بڑھ کے آگ میں ایسا کوئی نہیں
مجنوں بہت ہیں بادیہ پیما کوئی نہیں
رمز آشنائے ضربتِ موسیٰ کوئی نہیں
ہیں ہر جبیں کے ساتھ کئی آستاں ابھی

ازجناب حیاتؔ. بی، اے

فسردہ دل کی تمنا میں انقلاب آیا
وہ دل میں آئے کہ ذرے میں آفتاب آیا

عبودیت کے ترنم کی داد یہ پائی
ہمارے سامنے ٹوٹا ہوا رباب آیا

شباب اس کو نہ کہئے وہ ہے سراب شباب
گنہ کے ڈر سے جو پابند اجتناب آیا

وہ اضطرار مسلسل ہوں جسکی دنیا میں
سکوں بھی آیا تو مانوس اضطراب آیا

حیاتؔ کون ہے! وہ نامہ بر سے پوچھیں گے
یہی خیال تھا میرا یہی جواب آیا

تصویر حسن

(از مسٹر سلیم جعفر صاحب)

(۳)

کر (कर) دست حنائی

देखे अन देखे हरि तजत न अंक तेरो बिमल मयंकमुखी मोहे कोटि निबलों। कालिदास रीझि२ करत सराह प्यारो क्यों न यह छबि लागे बैरिन को बिखलों॥ लाल कुरबिन्द अरबिन्द इन्द्रबधू वारों बिद्रुम ललाई मीच करि राखी इखलों। तेरे करनख की बनक को बिलोकि उठैं सौतिनको अनख की आग नख सिख लों॥

بے سوچے سمجھے پڑے رہتے ہیں وہ کسی وقت تیرے پہلو سے جدا نہیں ہوتے۔ اے مہ جبین ہزار ناز نخرے سے تو دل چھین لیتی ہے۔ پیارا دیکھ دیکھ کر تیری تعریفیں کرتا ہے۔ پھر تیرا یہ انداز سوتوں کو کیوں نہ زہر لگے۔ لعل شنگرف کنول بیر بہوٹی تجھ پر نثار! دیکھ کس طرح تو نے مونگے کی سُرخی کو مٹھی میں دبا رکھا ہے۔ تیرے ناخنوں اور ہاتھ کی آب و تاب دیکھ کر سوتیں رشک سے ایڑی چوٹی تک جل اُٹھتی ہیں۔

پیٹھ (पीठ) پُشت

कैधों यह केस भेस नरेस वाके देस की सुदेस भूमि सोभा रस भीनी है। कैधों यह मदन की पाटी मंत्र पढिबे की सूरत सुकवि बनी हाटक नवीनी है॥ जोबन के मन्दिर की भीति है सुढार कैधों राज रतिराज रुचि सो बनाय कीनी है। एरी बीर तेरी यह पीठ नेक दीठ परी देखत हीं ईठ सब ही पीठ दीनी है॥

یا تو یہ شاہ عشرت کے، جس نے موئے عنبریں کا روپ بھرا ہے، ملک کی خوشنما، دل فریبی میں ڈوبی ہوئی زمین ہے یا یہ کامدیو کی منتر پڑھنے کی لوح ہے جو نئے سونے سے بنی ہے۔ یا دیر حسن کی سڈول دیوار ہے۔ جس کو کامدیو نے ذوق شوق سے بنایا تھا۔ اے پیاری تیری پیٹھ کی جھلک دیکھتے ہی تیرے عاشق نے سب سے منہ موڑ لیا۔

گریوا (ग्रीवा) صراحی دار گردن

सुंदर सुडौल आछी भांति सों सुधारि करी हरि कर कबु सोभा वारि फेरि डारिये। कोकिल औ पायक वारि न सकत सारि जग में न और उपमान लै बिचारिये॥ सोभा कीसी सींव नूर कहि बरनत भवे रातो दिन पीतम रख चित धारिये। जाके कंठ मध्य पीक दुति ऐसी सोहियत जैसे सीसी माहे रंग जावक को धरिये॥

صانع نے اسے خوبصورت، سڈول احتیاطات سے سنبھال کر بنایا ہے۔ اس پر ملک کشمیر اور سنکھ کی والہانہ قربان۔ کوئل اور کبوتر اس کی ہم سری نہیں کر سکتے۔ دنیا میں کوئی چیز نہیں ملتی کہ اس سے تشبیہہ دی جائے بے انتہا دلکش ہے۔ کون اس کے راز کو پا سکتا ہے؟ رات دن پیتم کے دل میں بسی رہتی ہے۔ اس کے گلے میں پیک کا رنگ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شیشی میں جاوک کا رنگ۔

چبک (चिबुक) زنخدان

कनक बरन कोकनद के बरन और झलकत झाईं ता में बसन रदन की। कीनी चतुरानन चतुर ऐसी रचिप चमलपसी चौकी चारु आसन मदन की॥ अंगुल ते आन उपमान की अवधि सब सुमिल सुपान मानो पिय के सदन की। सुन्दर सुढार है चिबुक नव नायिका की मानो बलभद्र बादसाही है बदन की॥

کندنی رنگ کے سرخ کنول میں لباس اور دانتوں کا سایہ جھلک رہا ہے۔ عقلمندوں نے نہایت ہوشیار سے کامدیو کی نشست کے لئے ایک چھوٹی سی خوبصورت چوکی بنائی ہے۔ تشبیہہ دینا محال ہے۔ پیتم کے گھر داخل ہونے کی سیڑھی ہے۔ اس نوخیز کی زنخدان خوبصورت، اچھی ڈھلی ہوئی ہے۔ گویا چہرے کا پہرا دار دوڑ رہا ہے۔

چبک تل (चिबुक तिल) خال زنخداں

है कहा की गुलाब कली पर भौंर को चेटुआ आनि अरयो है। न डबा पे जवाहिरी मैन मनो नग मिलम चारु जरयो है॥ न्यारी नैदो बिराजि रह्यो तिल देखि बिचार यहै मैं कह्यो है। मौ हैं बनवत मनो बिरंचि के लेखिनी तें मसि बिन्दु झरयो है॥

کوئی کہتا ہے کہ گلاب کی کلی پر بھورے کا جو بیٹھا ہے وہ ان کا سیاہ تل ہے کہ جیسے پر کار یو جوہری نے نگینہ جڑ دیا ہے۔ پیاری کی ٹھوڑی پر تل دیکھ کر میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ صانع جس وقت اس کی بھویں بنا رہا تھا۔ اس کے قلم سے روشنائی کی ایک بوند ٹپک پڑی۔

اَدَھر (अधर) لب لعلین

जाको मधुराई लै सुधाई सुरलोक छपी ऊरव को छिप्यो है रीपियूख आ परनि में। देरवन ही विद्रुम भये हैं जड़ रूप अरु बिम्ब मतिहीन भये जिन के हरनि में॥ पान अंग पातरो भयो है तब ही तें पेरिपरो ब्रजनारी अब रहें को सरनि में। सूरतिसुक तिनैं सकै को बरनि प्यारी तेरे अधरन की न उपमा धरनि में ॥

جن کی شیرینی چرا کر گنگا جی آسمانوں میں جا چھپیں اور ایکھ کا رس خدا جانے کہاں غائب ہو گیا۔ مونگے دیکھتے ہی حیران و سرگردان رہ گئے۔ اور بسبب ڈر سے حواس باختہ ہے۔ تجھے دیکھ کر بتوں کا دل پتلا ہو گیا ہے۔ اب بتا کہ بتان برج کس کی پناہ لیں۔ ان ہونٹوں کا بیان کرنا ممکن ہے۔ تشبیہ کے لیے دو عالم میں کوئی چیز نہیں ملتی۔

लिरवत चहल रसलीन जब तुव अधरन की बात ।
लेरवनि की विवि जीभ बंधि मधुराई तें जात ॥

رس لین (شاعر کا نام) نے جب تیرے لب لعلین کا وصف لکھنا چاہا تو حلاوت کے باعث اس کی دونوں زبانیں باہم پیوستہ ہو گئیں۔

ओभा अधरन तरुनि के सोभा धरत न कोय ।
याही विधि बुन को परयो नाम अधर विधि जोय ॥

جو دلربائی اس نوخیز کے ہونٹوں میں ہے۔ وہ اس دنیا کی کسی شے میں نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اصطلاح عام میں ان کو ادھر (جو زمین پر نہو) کہتے ہیں۔

دَسَن (दसन) دُر دندان

कैधों सातों मंडल के मंडन मयंक मध्य बीजुरी के बीज सुधासींचि के उगाये हैं। कैधों अलबेली के चमेली की चमक चौक कैधों कीर वालक ने दाड़िम दुराये हैं ॥ कैधो मुकता हल महावर में राखे रंगि

कैधों मनि मुकुर में सुधर ... हैं। केसोदास प्यारी के बदन में र
छबि सोरह कला को काटि बत्तिस बनाये है

ساتوں آسمانوں کے بنانے والے نے چاند کے کھیت کے بیچ میں آب حیات سے سینچ کر بجلی کے بیج لگا...
۔البیلی کی ہتیلی کی منو ہیلی ہے یا طوطے نے کنول میں انار دانے چھپائے ہیں۔ ہمادر میں رنگ کر موتی
ہیں یا آئینہ میں لعل رکھے ہیں۔ پیاری کے چہرے میں دانتوں کی نمود ہے کہ چاند کے سولہ حصے کاٹ کر بتیس بنا دیے
ہیں۔

कैधों मुकताहल हैं कहल के आबदार जावक रंगाए अरबिन्द मुख
हैं। कैधों लाल बिद्रुम अमोल मनि मानिक के दामन जवाहिरी डब
खोलि भरे हैं ॥ दाड़िम के बीच कैधों सुधा मैं सिराय हंस सुंदर सुधा
के मंदिर में भरे हैं। राधे को रदन कैधों काम के सदन माफ जरिया
मदन ले जवाहिर से जरे हैं ॥

جاوک میں رنگا کر آبدار موتی کنول کے منہ میں بھرے ہیں۔ لعل، مونگے، بیش بہا ہیرے اور جواہرات کا ڈبہ
کھول کر جوہری نے دامن بھرتے ہیں ورنہ اس نازنین نے بجلی کو ٹھنڈا کرکے چاند کے مندر میں بھر دیا ہے۔ اس کے
دانت ہیں یا کامدیو جڑیے نے عشرت خانے میں جواہرات جڑے ہیں۔

को बरनै उपमा कबि गंग सु तोही में है गुन ऊरबसी के। जा दिन तें दरसो
मुसुकात सुकान्ह भये बस तेरी हँसी के ॥ चन्द से आनन पै तिल
राजत ऐसे बिराजत दांत मिसी के। फूलन के फुलवारिन में मनो
खेलत हैं लरिका हबसी के ॥

اے گنگ (شاعر کا نام) کس کی مجال ہے کہ تشبیہ تلاش کر سکے؟ اور اُروسی (آسمان کی ایک اپسرا
(دیوی) کا نام) کے اوصاف صرف تیری ہی ذات میں ہیں۔ جس دن تجھے مسکراتے دیکھا اُسی دن سے کنھیا
جی تری ہنسی کے بندہ بے دام و درم ہوگئے۔ چاند سے چہرے پر تل زیب دے رہے ہیں اور مسی آلودہ
دندان دل کش منظر پیش کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھولوں کی پھلواری میں حبشیوں کے لڑکے کھیل
رہے ہیں۔

رسنا (रसना) زبان

गुरु गुन ग्रन्थ के प्रकाश के करन-हारी झूठ सांच कहे देति सब के
मनस की। नाद भेद बेद के उचारि देत आखरनि कोमल रसालमय

बसुधा के बस की ॥ मरमी सुकवि प्रिय मन को हरनहारी सुधासों सुधारी जानी मन- हारी जस की। रसना की उपमा न होत कोटि रसना ते मन की सचौटी के कसौटी घट रस की ॥

کتابوں کے معانی دقیق پر سے نقاب اٹھانے والی۔ سب کے دلوں کے صدق و کذب کا پردہ فاش کرنے والی۔ موسیقی کے پُراسرار فنوں کو بتانے والی۔ اپنی شیرینی سے دنیا کو بس میں کرنے والی۔ پیتم کے دل کو موہنے والی آکیات سے شستہ و شوکی ہوئی۔ شہرت و نیک نامی کی شستہر کرنے والی۔ لاکھ زبانیں بھی اس کی تشبیہ دینا چاہیں تو نہ دے سکیں۔ خیالات دل کی آراستہ کرنے والی اور سچوں ذائقوں کی کسوٹی ہے۔

بانی (बानी) آواز

सुधा के समुद्र की लहर सी कढ़त है या ही को सुनाम लाल कीने है अधीन है। बन उपबन बैठ आप को दुराबे याते मेरे जान पिक है कल कंठी कंठ- हीन है ॥ बलदेव ऐसी नारची है ना रचैगो बिधि मोतिन की उपमा लगन लागी हीन है। कमल के कोष पैठि गुंजरत भौरे कैधों बानी मांझ बानी जू बजायो आनि बीन है ॥

بحر آکیات میں موجیں سی اٹھ رہی ہیں۔ انھیں کو سنا کر تو نے پیتم کو بس میں کیا ہے۔ کوئل کے گلے سے اب آواز نہیں نکلتی اسی وجہ سے باغوں اور جنگلوں میں چھپتی پھرتی ہے۔ صانع قدرت نے تو اب تک ایسی بنائی اور نہ بنائے گا۔ موتیوں کی آب اسکے سامنے ماند پڑ گئی۔ بھونرے کمل کے پھول میں گھس کر گونج رہے ہیں۔ ورنہ سرسوتی نے آواز بن کر بین بجائی ہے۔

مکھ راگ (मुख राग) دلربائی دہن

कैधों कमला के गेह कमल की लाल माल ताकी ताकी झलकन है। कैधों अनुराग रह्यो फैल बानी रानी जू को जब काहू काहू कारन प्रसंग है ॥ कैधों आली मेरे लाल ओठन की लाली छाई मनोमय मेरे बनमाली जू के संग है। मोहन अनंग कैधों सोभा को तुमगनी कैधों प्यारी तेरे मुख पान को सुरंग है ॥

یا لکشمی جی کے مندر میں سورج دیوتا نے لال کنولوں کی مالا لٹکائی ہے۔ جس کا رنگ جھلک رہا ہے سرسوتی جی کی صحبت کی ضو پھیلی ہوئی ہے کہ ہر شخص اس سے متاثر ہے۔ یا اے سکھی تیرے سرخ

دانتوں کی دلآویز سُرخی کنھیا جی کی ہم نشینی کا نتیجہ ہے۔ یہ کام دیو کو رجھانے والی ہے۔ زیبائی کا ایک دل فریب حصہ ہے یا تیرے منہ کے پان کا دل کش رنگ ہے۔

مُکھ وَاس (मुखवास) خوشبوئے دہن

याही मुख वास कमलनि की प्रतीत देत याही मुख वास केतकी सो मधुमन्त है। याही मुख वास बेलि मालती को मारे मान याही मुख वास कामी होत जन संत है॥ याही मुख वासन तन कैसी फूली याही मुखवास सखी सोहति अनंत है। तेरे मुख वास ही सों सकल सुबास भयो बारहो महीना भौंर मानत बसंत है॥

یہی خوشبوئے دہن کنولوں کا احساس پیدا کرتی ہے یہی خوشبوئے دہن کیتکی کی مہک سی مست کن ہے یہی خوشبوئے دہن مالتی بیل کا غرور خاک میں ملاتی ہے۔ یہی خوشبوئے دہن خداپرستوں کو عیش پرست بناتی ہے۔ نوخیز کی اسی خوشبوئے دہن سے پھولوں کا تن پھولا معلوم ہوتا ہے۔ اسی خوشبوئے دہن پہ سکھی مست ہوئی ہے اسی خوشبوئے دہن سے سارا جہان مہک اوٹھا۔ بھونرے سمجھتے ہیں کہ سال بھر برابر موسم بسنت رہتا ہے

مُسکیَان (मुसक्यान) تبسم

सिव सिरगंग जैसे जल की तरंग जैसे उड्डगन भंग जैसे करत पयान है। मोतिन की माल जैसे दामिन की धार जैसे ओपी तरवार जैसे तजत मियान है॥ दीपक की माल जैसे पावक की ज्वाल जैसे मोहिबे को लाल मन निपट सयान है। तार जरजरी कैसे फूल भरभरी कैसे जुगनू ज्यों जरी तैसे तेरी मुसक्यान है॥

تیری مسکراہٹ کا یہ عالم ہے جیسے شیوجی کے سر پر گنگا۔ پانی میں موج ستاروں کی مالا۔ موتیوں کا ہار۔ بجلی کی لہر نیام سے نکلی آبدار تلوار۔ چراغوں کی قطار۔ آگ کا شعلہ۔ زری کا تار۔ جھر جھری کا پھول۔ جڑاؤ جگنو۔ موہن کا دل چھیننے میں ہوشیار۔

ھَاس (हास) خندہ

कोकनद कली जैसे खिलत बयारि लागे मंद मुसकान उसकल है चमेली [illegible] आरसी में भानु के प्रकाश को उजास होत जैसे दीप माल दीपै दीपति बेली की॥ भारती सुकवि दुति दामिनि सी कौंधति है चांदनी सी चहं

श्रोर बात में सहेली की। चंद की चमक चकचौंधति दसन दुति बिच। मन बसन हसन अलबेली की ॥

جیسے ہوا لگنے سے لال کنول کی کلی کھلتی ہے۔ تبسم شیریں غنچۂ یاسمن کے چٹکنے کی مانند ہے۔ جیسے آرسی میں سورج کا عکس۔ جیسے دوالی میں چراغ مکانات کو ضیا بار کرتے ہیں۔ بجلی کی چمک سی آنکھوں میں کوند جاتی ہے۔ جب وہ سہیلی سے باتیں کرتی ہے۔ چاروں طرف چاندنی سی پھیل جاتی ہے۔ دانتوں کی چمک سے چاند کی روشنی مدھم پڑ جاتی ہے۔ البیلی کا ہنسنا پیا کے دل میں گھر کر لیتا ہے۔

کپول (कपोल) گل رخسار

चपला के ऐसे चारु चमके हैं छबि पुंज छेदि निसरत झीने घूघट निचोल हैं। कालिदास आस पास तरल तरौनन की जोति किरनावली ललित अति लोल हैं॥ कान्ह अवलोकन वदन प्रतिबिम्ब निज कनक सरूप मानो मुकुर अमोल हैं। लेत मन मोल कहैं दृगन की तौल ऐसे गोरे २ गोल बने प्यारी के कपोल हैं ॥

پیارے پیارے بجلی کی طرح چمک رہے ہیں۔ عجب باریک دوپٹے کے گھونگھٹ سے چھن چھن کر نکل رہی ہے ان کے آس پاس ہلتے ہوئے کرن پھولوں کی تابانی اپنا رنگ جما رہی ہے۔ ان کی لرزتی ہوئی شعاعیں بہت پیاری اور دلاویز معلوم ہوتی ہیں۔ کنھیا جی کو اپنا کندنی عکس اس نازنین کے چہرے میں دکھائی دیتا ہے۔ اس کے سرخ رخسارے کیا ہیں بے بہا آئینے ہیں۔ دل کو آنکھوں کی ترازو میں تول کر خرید لیتے ہیں۔ پیاری کے ایسے اورے گورے گول گول گال ہیں۔

کپول تِل (कपोलतिल) خال رخسار

फूले बारिजात में लखात हैं मधुप कैधों सुखमा सरोवर में रसराज पैठो है रति के मुकुट पै धरी है नील मनि कैधों कामनी वदन परम छवि जेठो है॥ श्री पति रसिकराज सुन्दर गुलाब बीच मृग-मद बिन्दु रूप परैठो है। ललित कपोलन में तिल छविदेत मानो पूरन मयंक निसंक सनि बैठो है ॥

جس طرح پھولے کنول میں بھونرے نظر آتے ہیں بحر عشرت میں رسوت جا پڑی ہو۔ رتی (کامدیو کی) کے تاج پر نیلم رکھا ہو۔ خوبصورت گلاب میں مشک کا نشان بہت ہی دلاویز معلوم ہوتا ہے۔

خوبصورت رخساروں پر تِل اس طرح پھب دیتا ہے جیسے پورے چاند میں سنیچر (ایک ستارہ جو سیاہ مانا گیا ہے) جا بیٹھا ہے۔

کپول گاڑ (कपोल गाड़) چاہِ رخسار

भंवर परत जल जोबन के जोर कैधों आये छवि बूड़त सकल प्रेम दान की। बिकासि सके न बल कर हारे बलभद्र नैन नाग नाथिबे की ओंदी बिष बान की॥ उदित नवीन होत एचित भरत मानं रूप कोनिवास कैधों कूंडी सुख दान की। थिरमन पारद अटकिबे की गाड़ कैधों गाड़ गंडमंडलनि मंद मुसकान की॥

بحرِ حسن میں طغیانی کی وجہ سے گرداب پڑ رہے ہیں جس میں عشق و محبت کی ساری دلآویزی غرق ہو گئی ہے۔ یا رچشم کے پکڑنے کی ڈوری ہے۔ وہ اس میں سے نکلنے کے لیے زور مار کر تھک گئے اور نہ نکل سکے۔ یہ تیروں کے چلانے کا چِلّا ہے۔ اس میں نئی نئی زیبائیاں ٹھاٹھ مار رہی ہیں۔ مجسّم حسن کی قیام گاہ ہے۔ وہ ظرف ہے جس کا نظارہ راحت افزا ہے۔ وہ چاہ ہے جس میں پیتم کا سیماب قلب اٹک کر قرار پاتا ہے۔ یا وہ گڑھا ہے جو دل لبھانے والی مسکراہٹ کے کنپٹی تک پھیل جانے سے بن گیا ہے۔

شرون (श्रवन) گوش

थिप गुन आसन सरोज के सिंहासन हैं कैधों बिधि बासन सनेह रस भरे हैं। सांच झूठ तोलिबे को तुला के पला हैं कैधों किंसुक के पात से लपटि पाछे परे हैं॥ कैधों बिबि चक्र सह चक्र के सुधारे कैधों कुंडल कला की निधि बिधि कर धरे हैं। करन के छिद्र के भाछिद्र छबि तापे कवि कंचन की सीप मानो मुकतासों गरे हैं॥

پیتم کے اوصاف کے آسن۔ کمل کی نشست ہیں ورنہ وہ برتن محبت کے رس سے بھرے ہیں۔ جھوٹ سچ تولنے والے کی ترازو کے ڈھنپے ہیں ورنہ ٹیسو کے پتے لپٹ کر پیچھے کی طرف پڑے ہیں تو [illegible] نے دو پہیے بنائے ہیں۔ ورنہ چاند کے کنڈل صانع نے بنائے ہیں۔ کانوں کے سوراخ کی مسلسل زیبائی ہے۔ ورنہ برہا نے سونے کی سیپ میں موتی جڑے ہیں۔

نوائے راز

(از مولانا ابوالفضل راز چاندپوری)

دلربا بھی وہ دلنواز بھی ہے
اور پھر سب سے بے نیاز بھی ہے

فطرتِ حسن و حُسنِ فطرت میں
کیا کوئی وجہِ امتیاز بھی ہے!

شکر صد شکر اوستم پرور!
اِس کرم کا کوئی جواز بھی ہے؟

روح فرسا ہے سوزِ عشق، مگر
مجھ سے پوچھو تو جاں نواز بھی ہے

شکوۂ دورِ آسماں ہی نہیں
اپنی قسمت پہ مجھکو ناز بھی ہے

کیا تماشا ہے! محفلِ ہستی
اک حقیقت بھی ہے، مجاز بھی ہے

واعظِ شہر، خیر، نام نہ لو،
پارسا بھی ہے، عشقباز بھی ہے

نغمۂ شاعرِ شکستہ دل
سوز آگیں، حریفِ ساز بھی ہے

جو خدا سے بھی کہہ نہیں سکتا
میرے دل میں نہاں وہ راز بھی ہے

میکش حق نیوش و خود آگاہ
اور بھی ہوں گے ایک راز بھی ہے

کون پوچھے کہ حضرتِ سیماب!
آپ واقف ہیں، کوئی راز بھی ہے؟

کسی سے اوّلین ملاقات کے بعد

(از حضرت فاروقی محشر بدایونی)

جو سانس آرہی ہے اُسی میں مگن رہا لایا نفس نفس میں تسی بوئے تن ہوں میں

گھر سے بھی دور ہوں ترے در سے بھی دور دور محسوس اب ہوا کہ غریب الوطن ہوں میں

رخصت ہوا ہوں چھوڑ کے اشک اُنکی آنکھ میں اور اب یہ سوچتا ہوں بڑا دل شکن ہوں میں

یا مرکزِ نگاہ تھیں اُن کی تجلیاں یا انجمن کی یاد میں بے انجمن ہوں میں

دامن جھٹک کے مجھکو نہ ای باغباں اُڑا تیرے ہی تو چمن کا غبارِ چمن ہوں میں

غیروں کی برہمی سے مجھے کیا معاملہ اپنوں کی بے رخی پہ بھی اب خندہ زن ہوں میں

تیری طرف سے لاکھ ہوں ذرہ نوازیاں میں تو یہی کہوں گا ترا حسنِ ظن ہوں میں

میں درخورِ خیال تو ہوں خار ہی سہی ممنونِ بد نگاہیٔ اہلِ چمن ہوں میں

آساں نہیں ہے میرا چمن سے نکالنا کانٹا مجھے نہ جانیئے بوئے چمن ہوں میں

محشر زمانہ کتنا ترقی پسند ہے
دعویٰ ہر ایک کو ہے کہ استادِ فن ہوں میں

اُردو میں غلط لفظوں کا استعمال

(از جناب سید اختر علی صاحب تلہری)

جنوری ۱۹۴۶ء کے زمانہ کانپور میں جناب قمر نعمانی سسرامی کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے اس کے ذریعہ سے لائق مقالہ نگار نے میرے اگست والے مضمون کے بعض حصوں کا جس میں چند غلط الفاظ کے استعمال کے متعلق اظہار خیال کیا گیا تھا جواب دینا چاہا ہے۔

جناب قمر نعمانی کو یہ غلط فہمی ہوگئی ہے کہ میرے اس مضمون کی تحریر کا منشا جناب ساغر پر نکتہ چینی تھی حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے۔ اس مقالہ کا منشا ایک اُصولی مسئلہ پر اظہار خیال تھا۔ اتفاق سے جناب ساغر کا دیوان اُس وقت پیش نظر تھا۔ اُس میں سے بعض غلطیاں مثال کے طور پر پیش کردی گئیں۔ اگر جناب ساغر کے کلام ہی کا انتقاد پیش نظر ہوتا تو مضمون کی نوعیت دوسری ہوتی اور اغلاط کی فہرست خاصی طولانی ہوتی۔

جناب قمر نعمانی صاحب یقینی طور سے اس کا حق رکھتے ہیں کہ وہ ساغر صاحب کی غلطیوں کی صحت ثابت کریں مگر غلط قسم کے انداز بحث اختیار کرنے سے اُنکی یہ خواہش پوری نہ ہوسکے گی۔ لائق مقالہ نگار نے عربی قواعد اور عربی لغات پر سطحی نظر ڈالتے ہوئے جس روش سے غلط الفاظ کی صحت ثابت کرنیکی کوشش کی ہے وہ تو علمی بحث کا ذوق رکھنے والوں کیلئے ہمت شکن ہے۔ ذیل میں جناب نعمانی صاحب کے مقالہ پر محض اس لئے اظہار خیال کیا جارہا ہے کہ زمانہ کے غیر عربی داں ناظرین میں جناب موصوف کی نمایشی بحث سے غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے لفظ منتشَر بفتح شین کو بحث کیلئے منتخب کیا جارہا ہے کیونکہ مقالہ نگار نے اسی کے صحیح ثابت کرنے کیلئے انتہائی کوشش کی ہے۔

<u>لفظ منتشَر سے بحث</u> لفظ منتشر شین کے فتحہ (زبر) کے ساتھ اسم مفعول کی صورت میں کچھ عرصہ سے اُردو کا ذوق رکھنے والوں میں زیر بحث ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ عربی اور اُردو دونوں کے لحاظ سے یہ لفظ صحیح ہے۔ جناب نعمانی صاحب بھی اسی خیال کے مؤید ہیں۔ میری رائے میں اس لفظ پر دو حیثیتوں سے نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اول تو اس حیثیت سے کہ عربی قواعد کی رو سے اسم مفعول کے معنی میں مُنتشَر بفتح شین صحیح ہے یا نہیں۔ اگر عربی قواعد کے لحاظ سے یہ لفظ صحیح ثابت نہ ہو تو پھر اس پر اس حیثیت سے نظر کرنے کی ضرورت ہے کہ اُردو میں شین کے فتحہ کے ساتھ اسم مفعول کے معنی میں اس کا استعمال درست ہے یا نہیں۔ اگر یہ ثابت ہوسکے کہ اُردو نے اس پر تصرف کرلیا ہے تو پھر اس کا استعمال اُردو لفظ کی حیثیت سے جائز ہوگا۔

میں نے جناب نعمانی صاحب کے مضمون کی روشنی میں اس لفظ پر دوبارہ غور کیا لیکن مجھے دونوں حیثیتوں سے

لفظ غلط ہی معلوم ہوا۔

اوّل اس لفظ پر عربی قواعد کی حیثیت سے نظر کیجائے گی بعد میں اُس کے مستند ہونے سے بحث کیجائیگی۔

میرا دعویٰ یہ ہے کہ منتشَر شین کے فتحہ کے ساتھ اسم مفعول کے معنی میں عربی لغت و قواعد کی بنا پر غلط ہے کیونکہ انتشار کے معنی عربی کے تمام معتبر لغتوں میں وہی دئے ہوئے ہیں جو مصدر لازم کے ہو سکتے ہیں۔ اس امر سے اس کا ثبوت پہونچ سکتا ہے کہ یہ مصدر لازم ہے خواہ باب افتعال سے ہو یا باب انفعال سے، اور جب یہ مصدر لازم ثابت ہوگیا تو پھر اس کا اسم مفعول نہیں بن سکتا۔ ایسی صورت میں منتشَر بفتح شین اسم مفعول کے معنی میں عربی قواعد کے لحاظ سے قطعاً غلط ہے۔

ذیل میں عربی کے بعض مستند لغات کے حوالے پیش کئے جارہے ہیں، سب سے پہلے المنجد کی شہادت لیجئے۔

انتشار کے تحت میں لکھا ہوا ہے۔ انتشر الشی، استبنط (کوئی شے پھیل گئی) انتشر النہار طال وامتد (دن دراز ہوا اور بڑھ گیا) انتشر الخبر ذاع وفشا (خبر پھیل گئی) انتشر الابل تفرقت (اونٹ تتر بتر ہوگئے) انتشر الرجل ابتدا سفرہٗ (سفر شروع ہوگیا) ان میں سے کوئی معنی بھی تو ایسے نہیں جس میں متعدی کی کہیں سے بھی جھلک دکھائی دیتی ہو۔

قاموس کی بھی شہادت لیجئے، نشر وغیرہ کے معنی لکھنے کے بعد انتشر کے معنی لکھے ہیں۔ انتشر انبسط کتنشر والنہار طال وامتد والخبر انزاع والابل انفرقت عن غرۃ من راعیہا والعصب انتفخ والنخلۃ انبسط سعفہا۔

یہاں بھی انتشر کے جتنے معنی ہیں سب لازمی ہیں، پھیلنا، دن کا بڑھنا اور دراز ہونا خبر کا پھیلنا۔ اونٹوں کا نگہبان کی غفلت سے تتر بتر ہو جانا پٹھوں کا پھول جانا وغیرہ سب مصدر لازم ہی کے معنی ہیں۔

منتہی الارب میں نشر کے معنی لکھنے کے بعد انتشار کے حسب ذیل معنی لکھے ہوئے ہیں۔

انتشار گسترده گردیدن و دراز گشتن روز و فاش شدن خبر و پراگنده گردیدن شتراں از غفلت شباں و بار گرفتن بے ستور از ماندگی و گسترده شدن شاخہائے خرما بن و برگ آوردن آں و پراگنده شدن ہرچہ باشد و رفتن در زمین

ان معنوں میں بھی متعدی کے معنی کہیں سے نہیں پیدا ہوتے۔

صراح میں اس لفظ کے معنی حسب ذیل ہیں۔ انتشار پراگنده شدن و بار گرفتن بے ستور از ماندگی مختار الصحاح وغیرہ میں بھی اس لفظ کے یہی معنی ہیں۔

کتب لغت کی ان شہادتوں کے بعد یہ صاف واضح ہو جاتا ہے کہ انتشار خواہ باب انفعال سے ہو خواہ باب افتعال سے بہر حال لازم ہے۔

اس ضمن میں ایک لطیفہ کا تذکرہ فائدہ سے خالی نہیں ہے۔ نعمانی صاحب نے اپنے محولہ بالا مضمون میں قاموس الاغلاط کا ایک جگہ تذکرہ کیا ہے۔ اتفاق سے وہ کتاب ایک مہربان سے مل گئی اُس میں منتشَر کا لفظ بھی

مؤلفین قاموس الاغلاط نے اس لفظ سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ منتشَر شین کے فتحہ کے ساتھ صحیح ہے کیونکہ صحاح و قاموس میں اس کے معنی خبر وغیرہ پھیلانا اور شائع کرنا بھی ہیں لہٰذا یہ متعدی ہو گیا اور اب اس کا اسم مفعول بن سکتا ہے۔

مؤلفین قاموس الاغلاط کا صحاح و قاموس کے حوالے سے خبر وغیرہ پھیلانے کے معنی لکھنا نہایت ہی عجیب بات ہے۔ قاموس میں جو انتشار کے جو معنی دئے ہوئے ہیں وہ اوپر لکھ دئے گئے ہیں اس میں کہیں خبر وغیرہ پھیلانا اور شائع کرنا مندرج نہیں ہیں۔ نشر مجرد کے معنی ضرور قاموس میں خبر وغیرہ پھیلانے کے لکھے ہوئے ہیں۔ لائق مؤلفین کو اس سلسلے میں بہت سخت اشتباہ ہوا ہے۔ اُنھوں نے قاموس کی عبارت کا مطالعہ بہت ہی بے پروائی سے کیا ہے۔ منتہی الارب قاموس ہی کا ترجمہ ہے بہت سے اضافوں کے ساتھ۔ کاش کہ اُس پر بھی اس سلسلے میں نظر کر لی ہوتی تو یہ اشتباہ نہ ہوتا۔ اسی طرح صراح صحاح کا ترجمہ ہے۔ مختار الصحاح بھی اُسی سے ماخوذ ہے۔ اس میں بھی کہیں خبر وغیرہ پھیلانے کے معنی نہیں ہیں۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح لائق مؤلفین کو قاموس کی عبارت کا مفہوم سمجھنے میں اشتباہ ہوا ہے، اس طرح صحاح کا مفہوم بھی اُنھوں نے غلط سمجھا ہے۔ لغات عربیہ سے اس لفظ کی تحقیق کے بعد نعمانی صاحب کے دلایل کا مختصر طور سے جائزہ لے لینا بھی ضروری ہے۔

نعمانی صاحب نے منتشَر بفتح الشین کو اسم مفعول کے معنی میں صحیح ثابت کرنے کے لئے چند عربی اشعار سے بھی استشہاد فرمایا ہے مگر ان پر غور کرنے سے منتشَر شین کے فتحہ کے ساتھ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا۔

اُن کے پیش کردہ اشعار اور اُن سے استشہاد کی نوعیت حسب ذیل ہے:۔

ادفع من ذیلی ما کان یجرُّ	قد یجمع الامر المنتشر

چونکہ یجُرّ میں جیم کو فتحہ ہے لہٰذا منتشَر میں بھی قافیہ ہونے کی وجہ سے شین کو فتحہ ہونا چاہیئے۔

ثم لیس فی علی خطرٌ ولا ضررٌ	الناس فی طلب والرزق منتشَرٌ

ضرر میں پہلی رے کو فتحہ ہے لہٰذا منتشَر کے شین کو بھی قافیہ ہونے کی وجہ سے فتحہ ہونا چاہیئے، اسی طرح دوسرے جو اشعار پیش کئے گئے ہیں اُن میں بھی خطَر اور مُنتظَر کا قافیہ مُنتشَر ہے اس لئے استدلال یہ کیا گیا ہے کہ چونکہ ط اور ظ کو زبر ہے اس لئے قافیہ ہونے کی وجہ سے شین کو بھی زبر فتحہ ہونا چاہیئے۔

قافیہ کی بنا پر جو استدلال کیا گیا ہے وہ تمامتر عربی ادب و عربی عروض سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔

عربی میں یجُرّ و خطَر و ضرَر و منتظَر بفتح جیم و طا و را و ظا کا قافیہ منتشِر بہ کسرۂ شین آسکتا ہے۔ عربی قوافی میں اس قسم کا اختلاف حرکات بہت زیادہ عام ہے اس میں "شاید" وغیرہ کی گنجایش ہی نہیں ہے اس لئے مقالہ نگار کا یہ لکھنا کہ شاید اختلاف حرکت قوافی کلام عرب میں جائز ہے: استدلال بے بسی کی نشانی ہے۔ نعمانی صاحب کا فرض تھا کہ اس

امر کی پہلے تحقیق کر لیتے بعد میں اس سے استدلال فرماتے۔
قوافی میں اس قسم کے اختلاف حرکات کے ثبوت میں سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ سبعہ معلقہ کا پہلا
قصیدہ امرا القیس کا ہے اس میں برابر قافیہ کے حرف آخر سے پہلے والے حرف کی حرکات میں اختلاف پایا جاتا
ہے۔ پہلا مطلع یہ ہے۔

قفا نبك من ذكرى حبيب ومنزلِ　　بسقط اللوى بين الدخول فحوملِ

دیکھئے منزل کی "ز" کو کسرہ ہے لیکن حومل کی میم کو فتحہ ہے۔

كأني غداة البين يوم تحملوا　　لدى سمرات الحي ناقف حنظلِ

اس میں بھی "ظ" کو فتحہ ہے۔ غرضکہ اس قصیدہ میں آخری حرف سے پہلے والے حرف میں کہیں کسرہ ہے کہیں
فتحہ ہے کہیں ضمہ ہے۔
اس کے بعد والے قصیدہ میں جو طرفہ کا ہے اس کی بھی یہی حالت ہے۔
سبعہ معلقہ کے علاوہ اگر آپ قصائد متنبی اور حماسہ کی ورق گردانی فرما لیتے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی نفحۃ الیمن
عربی ادب کی ابتدائی درسی کتاب ہے وہ بہت پرانی کتاب بھی نہیں ہے اس میں جدید قصائد بھی ہیں۔ اگر آپ
سرسری طور سے اس کا مطالعہ فرما لیتے تو ایسے قافیے حل ہو جاتے جن میں حجر نفع جیم بھی ہے اور مخلد کمبر وال
بھی۔ یہ ایسی واضح بات ہے کہ اس پر زیادہ طول کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔
فاضل مقالہ نگار نے ان لفظوں سے جہاں استدلال قافیہ سے کیا ہے وہاں ہر جگہ یہ بھی بڑھا دیا ہے
کہ اس جگہ مُنتشَر اسم مفعول کے معنی میں استعمال ہوا ہے مگر لطف یہ ہے کہ ان میں کہیں بھی اسم مفعول کے معنی نہیں ہیں۔
فاضل مقالہ نگار کو چاہیئے کہ وہ اسم فاعل و اسم مفعول کے مفہوم پر پھر سے نظر کریں۔ ابھی یہ بحث دیکھنے سے
مجھے یہ خطرہ ہو رہا ہے کہ اسم فاعل و اسم مفعول کے مفہوم کی واضح تصویر ان کے دماغ میں نہیں ہے۔
غور فرمائیے انھوں نے "قد یجمع الامر الشتیت المنتشر" کا ترجمہ فرمایا ہے "کبھی جمع کیا جاتا ہے امر
پراگندہ بکھرنے والا" منتشر کا ترجمہ بکھرنے والا کرنا اور پھر اس پر اصرار فرمانا کہ یہ اسم مفعول ہے ستم ظریفی کے سوا
اور کیا کہا جا سکتا ہے اس طرح دوسری جگہ "ونسق الی نظام کل منتشر" کا ترجمہ کیا ہے "اور ہر منتشر مضامین
کو سلک میں منسلک کر دیا" معلوم نہیں اسی معنی سے انھوں نے اس کا اندازہ کیونکر کر لیا کہ منتشر یہاں اسم مفعول
ہے منتشر کے معنی "تتر بتر" اور بکھرنے والی چیز کے ہیں، ایسی حالت میں اسم فاعل کے سوا اس کے کوئی اور معنی
ہو ہی نہیں سکتے۔ اسی طرح اس مصرعہ الناس فی طلب والرزق منتشر کا ترجمہ کیا ہے "لوگ طلب میں مشغول ہیں

سلہ پر کے بعد مضامین دلچسپ ہے ۱۲

اور روزی جہان میں منتشر ہے۔ یہ معنی لکھنے کے بعد دعویٰ کر دیا گیا ہے کہ یہاں بھی منتشر اسم مفعول بفتح شین ہے۔ لیکن اُن کا دعویٰ حسب معمول غلط ہے۔ یہاں بھی منتشر اسم فاعل کے معنی میں شین کے کسرہ کے ساتھ ہے۔

اس تمام بحث سے یہ امر تو واضح ہی ہو جاتا ہے کہ انتشار مصدر لازم ہے اور نعمانی صاحب نے اس کے متعدی ہونے پر جو استدلال کیا ہے وہ عربی ادب سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ آیئے اسی سلسلے میں اب اس پر بھی غور کر لیا جائے کہ انتشار باب انفعال سے ہے یا باب افتعال سے؟ انتشار اپنی ظاہری ہیئت کے لحاظ سے قطعاً باب افتعال سے ہے لیکن افتعال کے وزن پر جو مصدر آتے ہیں ان میں سے کچھ لازم ہیں کچھ متعدی۔ انتشار کتب لغت کی شہادت کی بنا پر لازم ہے۔ تعجب ہے حضرت شوق نے محوی لکھنوی کو خط لکھتے ہوئے اسے باب انفعال سے لکھ دیا ہے۔ اپنی موجودہ ہیئت میں یہ باب انفعال سے نہیں کہا جا سکتا۔ یہاں ایک عربی صرف کے نکتہ کی طرف توجہ دلانا فائدہ سے خالی نہیں ہے۔ ممکن ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے جناب شوق نے اسے باب انفعال سے قرار دیدیا ہو۔

وہ نکتہ یہ ہے کہ افتعال کے وزن پر جو ایسے مصدر ہیں جن کے فا کلمہ کی جگہ پر نون ہے اور اُن کے معنی لازم کے ہیں تو وہ ثقل سے بچنے کے لئے انفعال کی حدوں سے نکل کر افتعال کی حدوں میں داخل ہو گئے ہیں۔ راقم الحروف نے اگست والے مضمون میں اسی صرفی نکتہ کی طرف مختصر لفظوں میں اشارہ کیا تھا۔ اس میں کچھ ابہام رہ گیا تھا۔ شاید اسی ابہام کی وجہ سے نعمانی صاحب حقیقت مسئلہ کے ادراک سے عاجز رہے اور لفظ "انتظار" پیش کر کے اس خیال کی تغلیط کرنا چاہی۔ صورت حال یہ ہے کہ اس نکتہ کی طرف بہت سے صرفیوں نے اشارہ کیا ہے چنانچہ صاحب علم الصیغہ نے لکھا ہے۔

"ہر لفظیکہ فائے او نون باشد از باب انفعال نیاید بلکہ اگر اوائے معنی انفعال منظور باشد آں را بہ باب افتعال برند چوں انتکس سرنگوں شد" یعنی جس لفظ میں ف کی جگہ پر نون ہو وہ باب انفعال سے نہیں آتا بلکہ جب باب انفعال کے معنی ادا کرنا منظور ہوتے ہیں تو اُسے باب افتعال میں لیجاتے ہیں جیسے انتکس سرنگوں شد "سرنگوں ہو گیا"۔ لفظ انتشار بھی اسی قبیل کا مصدر ہے۔ لفظ انتظار سے یہ قاعدہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ وہ باب انفعال سے بدل کر نہیں آیا ہے اسی لئے وہ متعدی بھی ہے۔ اس نکتہ کے تحت میں وہ مصادر آتے ہیں جن کے فا کلمہ کی جگہ پر نون ہو اور معنی لازم کے ہوں۔ اگر انفعال و افتعال کی بحث کے سلسلے میں رضی شرح شافیہ کا مطالعہ فرما لیا جائے تو اس طرف مفید اشارے ملیں گے۔

ان تمام امور پر تفکر کرنے کے بعد میری قطعی رائے ہے کہ جہاں تک عربی کا سوال ہے مُنتشَر شین کے فتحہ کے ساتھ اسم مفعول کے معنی میں غلط ہے اور جو صاحبان اسے اُردو کی چند غلط سلط لغت کی کتابوں کی بنا پر صحیح ثابت کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں وہ غلط راستہ پر چل رہے ہیں۔

منتشر کا مستند ہونا | عربی قواعد سے بحث کے بعد دوسری منزل یہ ہے کہ منتشَر بفتح شین کو مستند قرار دیکر صحیح مان لیا جائے۔
میرا خیال تو یہی ہے کہ اس لفظ پر اُردو کا تصرف ابھی ثابت نہیں، عوام یہ لفظ استعمال نہیں کرتے، جو لوگ اسے استعمال کرتے ہیں ان میں منتشِر شین کے کسرہ کے ساتھ رائج ہے۔ دو ایک یونیورسٹی کے پروفیسروں کے غلط استعمال سے اس کا عام استعمال مخصوص حلقہ میں ثابت نہیں ہوتا جو اُسے بولتا رہتا ہے۔

یونیورسٹیوں کے بعض اُردو کے اساتذہ عام الفاظ کے تلفظ کے ساتھ جس بیدردی سے کھیلتے رہتے ہیں وہ بہت ہی عبرتناک امر ہے اور اُنکی بے سوادی کا ثبوت، اس سے پھر کبھی بحث کی جائے گی۔

نعمانی صاحب نے اس بحث میں جو باتیں ارشاد فرمائی ہیں، بالکل ہی مضحکہ خیز ہیں۔ نعمانی صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جناب ساغر، جگر، ظفر علی خاں، یاس، سیماب، احسن مارہروی مرحوم وغیرہ کے منتشَر بفتح شین لکھنے سے اس لفظ کا مستند ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ ساغر اور جگر تو معرض بحث ہی میں ہیں اُن کا اس فہرست میں ذکر ہی عبث تھا البتہ جناب ظفر، سیماب، یاس، احسن اور امیر مرحوم کی شہادتیں ایک حد تک ضرور قابل توجہ ہیں مگر ان کے مقابلہ میں جب ان سے اختلاف رکھنے والے اساتذہ کے جم غفیر پر نظر کی جاتی ہے تو یہ شہادتیں مسترد کر دینے کے قابل ہیں ظفر، یاس، سیماب، احسن اور امیر بھی آخر انسان ہی ہیں ان سے بھی غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ امیر کا کلام اس وقت پیش نظر نہیں ہے باقی اور صاحبان کے بہت سے رسالے اس وقت بھی میرے پیش نظر ہیں ایسی حالت میں انکے غلط استعمال کی وجہ سے یہ لفظ مستند نہیں قرار دیا جا سکتا۔ شاید فارسی میں بھی منتشَر بفتح شین کسی نہ کسی شاعر کے یہاں تلاش سے مل جائے مگر اس سے بھی استناد میرے خیال میں غلط ہے کیونکہ فارسی میں استعمال ہونے کی وجہ سے غلطی غلطی ہونے کی حد سے باہر نہیں ہو جاتی۔ ایرانی شعراء میں بھی ہر طرح کے شاعر گزرے ہیں۔ ان میں بھی بعض شاعر الفاظ کے استعمال میں نہایت غیر محتاط رہے ہیں۔ شفقت عربی لفظ میں "ق" کو تشدید نہیں ہے لیکن ایک فارسی شاعر نے ق کے تشدید کے ساتھ اسے استعمال کیا ہے۔ میں اس طریق استناد کا قائل نہیں کہ ایک غلط لفظ کے ثبوت میں کسی استاد کے یہاں سے وہ غلط لفظ ڈھونڈکر پیش کر دیا جائے۔ اساتذہ سے ہر قسم کی غلطیاں ہوئی ہیں غلطیوں کی صحت ثابت کرنے کیلئے غلطیاں ہی پیش کرنا وہ کہیں ہوں کوئی محققانہ طریقہ نہیں ہے اور اس لئے میں تو اسے شایانِ اعتبار سمجھتا ہی نہیں۔ ایسی صورت میں نعمانی صاحب کا یا کسی اور صاحب کا شعرائے متذکرہ بالا کے یہاں سے مُنتشَر کا استعمال دکھا کر اس کو صحیح ثابت کرنا کوئی معقول استدلال نہیں ہے میرے لئے ان میں سے کوئی بھی حجت نہیں ہے۔

نعمانی صاحب نے منتشَر بفتح شین کے ثابت کرنے کے لئے بعض ایسے اُردو شعر پیش کیے ہیں جن میں لفظ منتشر کا استعمال ہوا ہے مگر قافیہ میں نہیں۔ اسی طرح بعض نثر کی عبارتیں بھی پیش کی ہیں۔ اُن کے مضمون کا یہ حصہ نہایت

ہی لطیف ہے کیونکہ جو مقامات انھوں نے پیش کیے ہیں وہاں سب جگہ منتشِر بکسرۂ شین اسم فاعل کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ مزید لطف کی بات یہ ہے کہ اسم فاعل و اسم مفعول لازم و متعدی کے مفاہیم کی طرف سے غافل ہونے کی وجہ سے جہاں چاہتے ہیں منتشر کو اسم مفعول قرار دیدیتے ہیں۔ آثر لکھنوی کے اُنھوں نے اس ضمن میں دو شعر پیش کیے ہیں۔

بے نور جتنے خاک کے ذرے تھے منتشر   عبرت نے اُن کو دیدۂ بیدار کر دیا
منتشر تھیں جلوہ آرائے ازل کی قوتیں   شوق خود بینی میں یکجا ہو کے انساں ہو گئیں

نعمانی صاحب کو اصرار ہے کہ ان دونوں شعروں میں منتشَر اسم مفعول کے معنی میں بفتحۂ شین استعمال ہوا ہے، حالانکہ صورت حال یہ نہیں ہے۔ دونوں جگہ منتشِر اسم فاعل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ خود آثر صاحب اس کی تصدیق فرما سکتے ہیں کہ اُنھوں نے اپنے ان اشعار میں منتشر کو بفتح شین اسم مفعول کے معنی میں استعمال کیا ہے یا منتشِر بکسرۂ شین اسم فاعل کے معنی میں۔

نثر کی عبارتوں سے نعمانی صاحب نے جتنی شہادتیں پیش کی ہیں اُن سب کی بھی یہی مضحکہ خیز نوعیت ہے، اُن میں کہیں سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مُنتشَر اسم مفعول کے معنی میں بفتح شین استعمال ہوا ہے۔ ایسی غلط سلط شہادتوں سے اس لفظ کا مستند ہونا کسی طرح سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ اگر نعمانی صاحب خود ان عبارتوں کے زندہ لکھنے والوں سے دریافت کریں کہ اُنھوں نے منتشر کو کیا شین کے زبر کے ساتھ استعمال کیا ہے تو خلاف توقع ہی جواب ملیگا۔

لفظ طمانینت سے بحث | نعمانی صاحب نے لفظ طمانینت سے بھی بحث کی ہے اور یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ "طمانینت" صحیح ہے۔ میں پھر ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ نعمانی صاحب عربی صرف کے اساسی قواعد سے ذرا گہری واقفیت بہم پہونچا لیں اور پھر ان مسائل پر اظہار خیال فرمائیں تو مناسب ہے۔

"اطمینان" مصدر رباعی ہے اقشعرار کے وزن پر، لہٰذا اُس سے طمانینت دونوں کے ساتھ ہی بن سکتا ہے جیسے اقشعرار سے قشعریرہ، جوشؔ صاحب نے اگر اسکی اصلی شکل "طمانینت" لکھی ہے تو اُن سے غلطی ہوئی ہے، عربی الفاظ کا صحیح و غلط ہونا جوشؔ صاحب وغیرہ کی تحریروں کا پابند نہیں ہے۔ غلطی بہر حال غلطی ہے کہیں بھی ہو۔ اُردو زبان میں کیا مستعمل ہے اور کیا مستعمل نہیں ہے اس سے یہاں بحث بیکار ہے سابق مضمون میں جو کچھ لکھ چکا ہوں وہ کافی ہے۔

مقدم کرنا | نئی شراب سے دامن کو لالہ زار کریں   سرور تازہ سے پھر مقدم بہار کریں

مجھے اس پر اعتراض یہ تھا کہ "مقدم بہار" کرنا صحیح نہیں ہے۔ "خیر" کے حذف کی وجہ سے "مقدم بہار" کرنا بے معنی ہو گیا۔ نعمانی صاحب نے اس استعمال میں کچھ نہ کچھ قباحت تو ضرور تسلیم کی ہے لیکن تاویل بھی کرنا چاہی ہے مگر وہ تاویل اصل شعر سے کوئی ربط نہیں رکھتی۔ "خیر اور مقدم" لازم و ملزوم نہ سہی لیکن بحث شعر مذکورۂ بالا سے ہے، یہاں پر مقدم کے معنی سفر، کسی جگہ سے تشریف آوری، قدم رکھنے کا وقت، قدم رکھنے کی جگہ وغیرہ کے اصل شعر سے کوئی

ربط نہیں رکھتے۔ اصل شعر پر نعمانی صاحب نے غور تو کرلیا ہوتا پھر تاویلی کوشش کی ہوتی۔

اپنے مقالہ کے آخر میں نعمانی صاحب نے میرے اُس مضمون کا ذکر کیا ہے جو اکتوبر کے رسالۂ عالمگیر میں "نئے ادیبوں پر ماداکار دعمل" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کے بعض الفاظ اور محاورات پر اعتراض کیا ہے ساغر صاحب پر اعتراضات کا قصاص لینے کے لئے، لائق مقالہ نگار کے مضمون کا یہ حصہ کافی تلخ اور تیز ہے، اس سے بحث کرنا میرے مذاق کے خلاف ہے۔ یہاں صرف غلط فہمی رفع کرنے کیلئے بعض اشارے کئے جارہے ہیں۔

مضمون محولۂ بالا میں راقم الحروف نے "خضخضۃ" کا لفظ استمنا بالید جلق کا مفہوم ادا کرنے کے لئے استعمال کیا تھا، "جلق" کا لفظ سُوقیانہ معلوم ہوا اس لئے اُس سے احتراز کیا۔ استمنا بالید کے مقابلہ میں "خضخضۃ" لفظ زیادہ سبک معلوم ہوا اس لئے اُسے قصداً لکھا تھا۔ نعمانی صاحب کی آنکھیں یقیناً بہت تیز ہیں کہ اس کے استعمال سے اُنھیں غریب اُردو لرزہ براندام نظر آنے لگی۔ بہار کے زلزلہ کا شاید یہ اثر ہو۔

دوسرا لفظ اور ہے جس کی نعمانی صاحب نے گرفت کی ہے۔ "تہجینی" کتابت کی غلطی سے "تہجنی" چھپ گیا ہے۔ نعمانی صاحب عربی داں ہیں اُن کی نظر کتابت کی غلطی پر پہونچ جانا چاہئے تھی۔

اصل فقرہ مضمون کا یہ ہے۔

"مختصر لفظوں میں جنسیاتی اعضاء و جنسیاتی تعلقات کا استلذاذی یا تہجینی نقطۂ نظر سے ذکر کرنا اسی ضابطۂ اخلاق کو نقصان پہونچاتا ہے۔" "تہجینی" باب تفعیل سے ہے اس کا مادہ "ہجن" ہے۔ "تہجین" کے معنی زشت و باعیب کردن کے ہیں۔ یہاں پر یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ یہ لفظ ذرا اُردو کے لئے ثقیل ہے مگر جناب نعمانی صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس مضمون کا لہجہ علمی ہے۔ اس قسم کے الفاظ ایسے مضامین میں استعمال ہوتے ہی رہتے ہیں نعمانی صاحب کے مطالعہ میں شاید اس قسم کی کتابیں نہیں ہیں۔ تیسرا اعتراض لفظ نظامات پر ہے، انکا ارشاد ہے کہ "نظم و نظام" کو جانتا ہوں لیکن "نظامات" سے ابھی تک نا آشنا ہوں"

نا آشنائی کی تو کوئی وجہ نہیں ہے۔ سنجیدہ علمی کتابوں میں یہ لفظ مل سکتا تھا۔ ذرا چشم نظارہ کے وا کرنے کی ضرورت تھی۔ سردست ایک کتاب "ہیگل اور مارکس" کے چند ابتدائی اوراق سے مثالیں پیش کیجارہی ہیں۔

دیباچہ کے صفحہ "تین" پر یہ فقرہ ہے "آج خود یورپ میں متضاد نظاماتِ فکر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں" صفحہ ۱۵ پر یہ عبارت ہے" اور موجودہ سرمایہ دارانہ نظامات پیدائش میں ہم انسانی معاشرت کو" صفحہ ۱۴ پر ہے "اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ افکار و تصورات اور متقابل نظامات کی کشمکش بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ ہوتی ہے"

اس لفظ سے نا آشنائی دور کرنے کے لئے اتنی مثالیں غالباً کافی ہیں۔ نعمانی صاحب نے دو اعتراض اُردو کے محاوروں پر کئے ہیں مثلاً پیشتر سے پہلے کچھ غلط تھے لیکن اگر انکی توجہ مسئلۂ تجرید کی طرف ہے تو وہ سمجھ سکتے ہیں کہ

پیشتر میں یہی عمل جاری ہو چکا ہے اور اس لئے کچھ کا اضافہ غلط نہیں کہا جا سکتا۔

اسی طرح دوسرے محاورہ کے معنی پر بھی اگر غور کیا جاتا تو شاید اس نکتہ چینی کی ضرورت نہ ہوتی۔
مگر اس کا مطلب نعمانی صاحب یہ سمجھیں کہ میں غلطی نہیں کرتا۔ مجھ سے برابر غلطیاں ہوتی ہیں، میں بھی آخر انسان ہوں لیکن میرے غلطی کرنے سے یہ نتیجہ تو نہیں نکلتا کہ دوسروں کی غلطیاں غلطیاں نہ رہیں۔ اس طرزِ استدلال کی میں ہمت افزائی نہیں کر سکتا۔"

جذباتِ وفا

(از حضرت وفا براہی (پٹنہ))

حسن کی جلوہ گاہ میں کب کوئی جلوہ گر نہیں
دیکھ سکوں محال ہے اتنی مری نظر نہیں

لاؤں کہاں سے راہبر ایک بھی راہبر نہیں
وادیٔ عشق میں جدھر میں ہوں کوئی اُدھر نہیں

آگے قدم بڑھائیے حدِ تعینات سے
آپ ہیں جس پہ گامزن عشق کی رہگذر نہیں

سوزِ دروں ہی بن گیا وجہِ نمودِ زندگی
سنگ وہ ایسا کون ہے جس میں نہاں شرر نہیں

کام دعا سے لوں گا میں آہ کا اعتبار کیا
یہ تو بہت ہی بے اثر اس میں کوئی اثر نہیں

اپنی جفا پہ انفعال آپ کو اسقدر ہی کیوں
جس سے خطا ہوئی نہ ہو ایسا کوئی بشر نہیں

کثرتِ ذوق و شوق کا حال اب اور کیا کہوں
تیری خبر تو ہے مجھے اپنی مگر خبر نہیں

سجدے تڑپ کے رہ گئے میری جبینِ شوق میں
جسکی مجھے ہے جستجو پاس وہ سنگ در نہیں

آئیں گے کھنچ کے وہ کبھی جذبِ وفا کی شرط ہے
میرے کمالِ عشق کی شاید انھیں خبر نہیں

حُسنِ مغموم

(از حضرت مائل نقوی)

اے نازشِ سرو وسمن! اے طلعتِ منظوم!
وہ کونسی عشرت ہے کہ تو جس سے ہے محروم
ہر عیش ترے دفترِ عشرت میں ہے مرقوم
ہر نزہتِ آفاق ترے نام سے موسوم
تو کس لیے مغموم ہے اے صورتِ معصوم؟

رنجور سا، بیمار سا آنکھوں کا یہ جادو
ہر بات میں مژگاں پہ نمودار یہ آنسو
ڈھلکے ہوئے شانوں سے ڈوپٹے کے یہ پلو
زلفیں یہ پریشان، یہ بکھرے ہوئے گیسو
تو کس لئے مغموم ہے اے صورتِ معصوم؟

کھویا ہوا، ڈوبا ہوا، گھبرایا ہوا سا
اُلجھا ہوا، سہما ہوا، تھرایا ہوا سا
مجبور سا، مایوس سا، پچھتایا ہوا سا
جیسے کسی بیباکی پہ شرمایا ہوا سا
تو کس لئے مغموم ہے اے صورتِ معصوم؟

افسردہ و خاموش، سراسیمہ و حیراں
بیچین نگاہیں، تو خیالات پریشاں
تکلیف کے انداز ہر اک بات میں پنہاں
سینے کی جلن سرمئی رنگت سے نمایاں
تو کس لئے مغموم ہے اے صورتِ معصوم؟

خود رفتۂ و ناواقفِ آرام و تنعّم
بہائے حسین تشنۂ تسنیم تبسّم
اشعار کے پڑھنے میں یہ غمگین ترنّم
تفریح کے جلسوں میں یہ بے کیف تکلّم
تو کس لیے مغموم ہے اے صورتِ معصوم؟

محفل میں نگاہیں جو کہیں ہیں تو کہیں دل
سو باتوں میں اک بات پہ بھی غور بمشکل
آواز گلوگیریٔ اندوہ سے بسمل
ہر طرز میں وارفتگی و بیخودی شامل
تو کس لئے مغموم ہے اے صورتِ معصوم؟

افکار ہم آہنگ، نہ باتوں میں تسلسل
آشفتہ و بیگانہ آرائشِ کاکل
ہمجولیوں کے ساتھ بھی رہنے میں تامل
رشکِ گلِ تر ہو کے حریفِ دلِ بلبل
تو کس لیے مغموم ہے اے صورتِ معصوم؟

اے رشکِ سہیلِ یمن! اے حسنِ مجسّم
پامال ترے قدموں میں رنگینیٔ عالم
غم سے ترے شیرازۂ کونین ہے برہم
فرما تو سہی! اس دلِ نازک پہ ہے کیا غم
تو کس لئے مغموم ہے اے صورتِ معصوم؟

فردوس ترے کوچے میں لا کر میں بسا دوں؟
گلدستۂ قدرت تری محفل میں سجا دوں؟
قدموں پہ ترے ماہ و ثریا کو جھکا دوں؟
چھوٹا سا تری راہ میں اک کعبہ بنا دوں؟
تو کس لیے مغموم ہے اے صورتِ معصوم؟

ے آئے جہاں چرخ سے رضواں تری خاطر؟
ہو جائے جہاں خلد بداماں تری خاطر؟
آجائے ابھی تختِ سلیماں تری خاطر؟
رُک جائے یہ سب گردشِ دوراں تری خاطر؟
تو کس لیے مغموم ہے اے صورتِ معصوم؟

ہو جائے جوان پھولوں سے ہونٹوں سے کچھ ارشاد
گلدستے لئے ہاتھوں میں حاضر ہوں پریزاد
بن جائے نئے سر سے دُلھن گلشنِ ایجاد
آجائے ابھی بزم میں شیریں مع فرہاد
تو کس لئے مغموم ہے اے صورتِ معصوم؟

سُن تو سہی کیا کہتی ہے ماتھے کی صباحت
ہے شکوہ بلب دیر سے ہونٹوں کی لطافت
پژمردہ ہوئی جاتی ہے رخساروں کی رنگت
دیکھی نہیں جاتی تری مغموم یہ صورت
تو کس لیے مغموم ہے اے صورتِ معصوم؟

زندگی

(از حکیم سید محمد خورشید حسین مضطر رضوی)

آغوشِ گل میں کٹتی ہے خاروں کی زندگی
یوں ہوتی کاش عشق کے ماروں کی زندگی

دامانِ غم سے بہتے ہیں چشمے نشاط کے
پروردۂ خزاں ہے بہاروں کی زندگی

اے سوزِ دل تجسس پیہم سے منھ نہ موڑ
گرم سفر رہی ہے شراروں کی زندگی

قائم ہے بغیر تحرک محال ہے
امواج کی، شراروں کی، تاروں کی زندگی

طاقت کا اجتماع پراگندگی کی موت
ہے نذرِ مہر، لاکھوں ستاروں کی زندگی

اک بحر جس میں ہلکے تلاطم کا ہو ظہور
کیا زندگی ہے تازہ نگاروں کی زندگی

قرباں گہِ جمال میں مضطر کی کیا بساط
ہے نذرِ یک نگاہ ہزاروں کی زندگی

شہاب الدین محمد غوری کے ہندوستان پر حملے

(از پرنسپل سری رام شرما)

حضرت محمد صاحبؐ کی وفات کے تھوڑے عرصہ بعد ہی عرب کے مسلمانوں نے اپنے دھرم کے پرچار اور اپنی سلطنت کی حدود کو وسیع کرنے کے لئے اردگرد کے ملکوں پر حملے کرنے شروع کر دئے۔ ہندوستان پر پہلا حملہ ۷۱۲ء میں ہوا جب کہ محمد بن قاسم نے سندھ پر فوج کشی کی۔ سندھ کا حملہ عرب کے مسلمانوں کے لئے کچھ بہت مفید ثابت نہیں ہوا۔ اسی لئے اس کے ڈھائی سو سال بعد تک مسلمانوں نے ہندوستان کا رُخ نہیں کیا۔ دسویں صدی کے آخر میں پنجاب کے ہندو شاہی حکمراں اور غزنی کے بادشاہ سبکتگین اور محمود کے درمیان باہمی نزاعات نے محمود کو ہندوستان پر فوج کشی کے لئے اُبھارا چنانچہ محمود نے پنجاب، ملتان، دوآبہ اور گجرات پر کئی یورشیں کیں جن کا مدعا لوٹ مار تھا۔ پنجاب کے ہندو حکمرانوں نے آٹھ بار سر اُٹھانے کی کوشش کی جس پر محمود نے پنجاب پر قبضہ کرنا ہی مناسب سمجھا۔ پنجاب غزنوی سلطنت کا حصّہ بن گیا۔

افغانستان میں محمود کے جانشینوں کو آرام چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ غور کی پہاڑیوں میں رہنے والے قبیلوں کے سرداروں نے اُنھیں غزنی سے نکال کر ہی دم لیا۔ پنجاب غزنوی خاندان کا آخری سہارا ثابت ہوا۔ غور میں اس وقت دو بھائی [غ]یاث الدین اور شہاب الدین حکمران تھے۔ اِن دونوں کے آپس کے تعلقات نہایت ہی اچھے تھے۔ غیاث الدین غور میں بیٹھا، اپنی سلطنت کی اندرونی گتھیوں کے سلجھانے میں لگا رہا۔ شہاب الدین نے حدودِ سلطنت کو وسیع کرنے کا کام اپنے ذمہ لیا۔ غزنوی اور غوری حکمرانوں کی عداوت نے اسے ہندوستان کی راہ دکھائی اور تیس سال لگاتار شمالی ہندوستان کے مختلف حصوں پر پے در پے حملے کرتا رہا۔ ۱۱۷۵ء میں اُس نے ملتان پر حملہ کر کے اسے فتح کیا اور وہاں سے سندھ میں اُچھ کے مقام پر جا دھمکا۔ اُچھ کی رانی کی اپنے خاوند سے نہیں بنتی تھی، اس نے شہاب الدین سے سازش کر کے اپنے ملک کو اس کے حوالے کیا۔ ۱۱۷۹ء میں شہاب الدین نے غزنوی خاندان کے آخری بادشاہ خسرو ملک سے پشاور چھین لیا۔ ۱۱۸۱ء میں جموں کے راجہ نے خسرو ملک کے خلاف شہاب الدین کو مدد دی۔ اس حملے کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہاب الدین نے بڑھ کر سیالکوٹ میں اپنی چھاؤنی قائم کر لی۔ ۱۱۸۶ء میں شہاب الدین نے پھر پنجاب پر حملہ کیا اور لاہور کو گھیر لیا۔ خسرو ملک شہاب الدین سے مقابلہ کی طاقت نہ رکھتا تھا لیکن شہاب الدین نے فریب سے کام لیکر اپنا کام اور بھی آسان کر لیا۔ خسرو ملک کو صلح کی شرطیں طے کرنے کے بہانے سے بلا کر اُسے قید کر لیا گیا۔ خسرو ملک کے قید ہوتے ہی سارا غزنوی، پنجاب شہاب الدین

کے ہاتھ میں آگیا۔
شومیٔ قسمت سے شہاب الدین کے سرداروں نے خسرو کی حدود سلطنت سے بڑھکر بھٹنڈہ پر حملہ کردیا جو اس وقت دہلی اور اجمیر کے چوہان فرمانروا پرتھوی راج کی سلطنت میں شامل تھا۔ پرتھوی راج نے حملہ کی خبر پاتے ہی اپنی فوج کی باگ سنبھالی اور اپنے دوست راجاؤں کو مدد کے لئے لکھا۔ قلیل عرصے میں ہی کثیر فوج اکٹھی ہوگئی۔ جس کو لیکر پرتھوی راج اجمیر سے چل پڑا۔ محمد غوری اس وقت (۱۱۹۱ء) پنجاب میں تھا۔ اس نے پرتھوی راج کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ کرنال کے نزدیک تراوڑی کے مقام پر دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ پرتھوی راج کے بانکے سورماؤں نے اس جوش سے حملہ کیا کہ محمد غوری کے سپاہیوں کو بھاگتے ہی بنی۔ خود محمد غوری زخمی ہوگیا۔ ایک سپاہی نے اسے میدان میں زخمی پڑا دیکھ کر پہچان لیا۔ اور اپنے گھوڑے پر بٹھاکر اسے میدان سے لے بھاگا۔ غور کے سپاہیوں نے میدان جنگ سے منہ ہٹاکر اپنے گھوڑوں کو ایسی ایڑ لگائی کہ کہا جاتا ہے اُنھوں نے تیس میل جاکر دم لیا۔ پرتھوی راج نے آگے بڑھ کر بھٹنڈہ کو بھی فتح کرلیا۔
شہاب الدین نے غور واپس جاکر اس شکست کا دھبّہ دھونے کی تیاری شروع کی۔ ۱۱۹۲ء میں ایک لاکھ بیس ہزار سوار لیکر وہ پھر ہندوستان آیا۔ پشاور تک اس نے اپنے ساتھیوں کو اپنے مقصد سے آگاہ نہیں کیا لیکن یہاں آکر اُس نے اپنے ہمراہی سرداروں کو اُن کے پچھلے طرز عمل کے خوب لعنت ملامت کی، شرمندہ ہوکر اُنھوں نے اسکو پورے جوش و خروش سے کام لینے کا قول دیا۔ شہاب الدین جب اپنے پنجابی علاقے سے نکل کر پرتھوی راج کی حدود میں داخل ہوا تو پرتھوی راج کے قاصد نے آکر اُسے آگے بڑھنے سے روکا اور پچھلی شکست کی یاد دلاکر پنجاب تک رہنے کا ہی مشورہ دیا۔ شہاب الدین نے جواب میں اپنی مجبوری ظاہر کی اور اپنے بھائی غیاث الدین سے جو دراصل غوری سلطنت کا حکمراں تھا مشورہ کرنے کا عذر پیش کیا۔ پرتھوی راج دھوکہ میں آگیا۔ وہ خود تراوڑی تک آچکا تھا وہاں ہی ڈیرے ڈالنا مناسب سمجھا اور غوری علاقے میں دست درازی کرنے سے اجتناب کیا۔
شہاب الدین نے خفیہ طور پر اپنے سپاہیوں کو حملہ کے لئے تیار رہنے کا حکم دیا اور علی الصباح جبکہ ہندوستانی فوج ابھی حاجات ضروری سے فارغ بھی نہیں ہوئی تھی ان پر حملہ کردیا۔ بہادر راجپوتوں نے جلدی سے سج سجاکر غوری فوجوں کا مقابلہ کیا۔ شہاب الدین نے اپنے سپاہیوں کو کہہ دیا تھا کہ وہ کچھ دیر مقابلہ کرکے پھر اس طرح پیچھے ہٹیں کہ پرتھوی راج یہ سمجھے کہ پچھلے سال کی طرح اب بھی غوری سپاہی بھاگنے والے ہیں۔ اور جب راجپوت فوج میں غوری سپاہیوں کا تعاقب کرتے وقت ابتری پیدا ہو ویسے ہی غوری سپاہی واپس مڑکر اُن پر دھاوا بول دیں۔ اُدھر خود ۱۲۰۰۰ سوار اُس نے علٰحدہ اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ دن ڈھلے تک راجپوتوں نے غوری سپاہیوں سے خوب جم کر لڑائی کی۔ مقررہ اشارہ ہونے پر غوری سپاہیوں نے بھاگنا شروع کی۔ راجپوت خوش تھے کہ اب

پو بارہ ہیں، دشمن کو لے لیا لیکن اُن کی حیرت کی کچھ حد نہ رہی جب غوری سپاہیوں نے تھوڑی دور جاکر پھر پاؤں جمالئے۔ اُدھر شہاب الدین نے ... ۱۲ تازہ دم سپاہیوں کے ساتھ راجپوتوں پر عقب سے حملہ کر دیا۔ راجپوت گھبرا گئے۔ اُن کی جماعت بندی ٹوٹ چکی تھی، دو طرفوں سے دشمن کے نرغے میں آکر اُن میں مقابلہ کی طاقت نہ رہی، پرتھوی راج میدان جنگ میں مارا گیا اور اسکی فوج شکست کھاکر میدان جنگ چھوڑ گئی۔

لیکن اس فتح نے راجپوتوں کے حوصلے پست نہیں کئے۔ شہاب الدین کے ہاتھ تراوڑی کے اردگرد کا علاقہ ہی آیا۔ دہلی تک پر بھی اُس کا قبضہ نہ ہوسکا۔ وہ پہونچا تو اجمیر تک لیکن وہاں اپنی حکومت قائم کرنے کا اُسے حوصلہ نہ ہوا۔ پرتھوی راج کے لڑکے کو اجمیر کا وارث مان کر اُس سے کچھ خراج لینا ٹھہرا کر وہ واپس لوٹ آیا۔ تراوڑی کے میدان پر پرتھوی راج کے ساتھ بہت سے ہمسایہ راجگان موجود تھے۔ پرتھوی راج کی شکست کو اُنھوں نے اپنی قطعی شکست نہیں سمجھا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد جاٹوں کے ایک گروہ نے گجرات کے راجہ بھیم کی حمایت میں ہانسی پر چڑھائی کر دی۔ محمد غوری تو ہندوستان میں موجود نہیں تھا لیکن اس کے نائب قطب الدین ایبک نے جاٹوں سے زور آزمائی کی اور اُنھیں شکست دیکر میرٹھ کو بھی اپنے قبضہ میں کر لیا۔ ایبک نے ۱۱۹۳ء میں دہلی پر بھی قبضہ جما لیا۔

۱۱۹۴ء میں شہاب الدین نے پھر ہندوستان پر حملہ کیا۔ تراوڑی کی فتح نے اسے زیادہ محتاط بنا دیا تھا اس دفعہ اس کا ارادہ جے چند والی قنوج سے نبرد آزمائی کرنے کا تھا۔ قنوج پر قبضہ کئے بغیر غوری حکومت کا مشرق کی طرف بڑھنا مشکل تھا۔ شہاب الدین چین سے بیٹھنا تو جانتا ہی نہ تھا اس لئے اُس نے جے چند سے پنجہ لینا ضروری سمجھا۔ ہمارے پاس یہ باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ جے چند اور شہاب الدین کی اس سے پہلے بھی کوئی مڈ بھیڑ ہو چکی تھی۔ تراوڑی کی پہلی لڑائی میں بھی پرتھوی راج کے زیر کمان کئی دوسرے راجاؤں کی فوج تھی اور دوسری میں بھی۔ لیکن اس بات کا ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں کہ مہاراجہ جے چند اُن راجاؤں میں سے ایک تھا۔ قطب الدین ایبک اور محمد غوری کے ماتحت اس وقت ایک جرار فوج تھی۔ جو کہ غالباً ڈیڑھ دو لاکھ کے قریب تھی۔ فیروز آباد کے مقام پر جے چند نے غوری فوج کا مقابلہ کیا، خوب گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ راجپوتوں نے اپنی داد مردانگی دی کہ غوری فوجوں کے چھکے چھوٹ گئے، قریب تھا کہ تراوڑی کی پہلی لڑائی کی کہانی دُہرائی جائی، اور مسلمان بھاگنے میں ہی امان پاتے۔ قضا کار راجہ جے چند کی آنکھ میں ایک تیر لگا جس سے وہ مارا گیا اُس کے مرتے ہی راجپوتوں نے دل توڑ دیا اور اُن کے پاؤں اکھڑ گئے۔ قنوج بھی شہاب الدین غوری کے قبضہ میں آگیا، غوری فوج بنارس تک لوٹ مار کرتی نکل گئی۔

پرتھوی راج کو شکست دینے کے بعد شہاب الدین نے اس کے لڑکے کو اجمیر میں خراج گزار بنانے پر ہی اکتفا کی تھی، لیکن جب میرٹھ اور دہلی، علی گڈھ اور ہانسی میں راجپوت سر اُٹھاتے رہے تو وہ اجمیر میں بھلا کب

آرام سے بیٹھنے والے تھے۔ پرتھوی راج کے بھائی ہیم راج نے اپنے بھتیجے کو اجمیر سے نکال کر وہاں خود قبضہ کر لیا۔ اجمیر کا راج پاتے ہی اُس نے دہلی کو واپس لینے کی کوشش کی اور جات رائے کی سرکردگی میں ایک جرار فوج دہلی پر قبضہ کرنے کے لئے بھیجی۔ شہاب الدین تو اس وقت غور میں تھا۔ قطب الدین ایبک نے ہیم راج کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ دہلی پر راجپوتوں کا حملہ ناکام ہوا۔ قطب الدین نے بڑھ کر اجمیر پر چڑھائی کی ہیم راج کو شکست ہوئی اور وہ چتا پر چڑھ کر سورگ باشی ہوا۔ قطب الدین نے اب اجمیر اپنے ایک سردار کو سونپ دیا۔

اجمیر کے رہنے والے آسانی سے دبنے والے نہیں تھے۔ پرتھوی راج اور ہیم راج کی یاد جلدی بھلائی جانیوالی نہیں تھی، دو سال بعد پھر میٹروں نے یہاں سر اُٹھایا اور گجرات کے راجہ بھیم کی مدد سے اجمیر میں آزادی کا جھنڈا بلند کر دیا۔ قطب الدین ایبک نے شہر سے باہر نکل کر ان کا مقابلہ کیا لیکن میٹروں نے اس جوش و خروش سے مقابلہ کیا کہ اُس کو اُن کا لوہا ماننا پڑا۔ دوسرے دن راجہ بھیم کی فوج بھی میٹروں کے ساتھ آشامل ہوئی، اب تو قطب الدین کو شہر میں ہی پناہ لیتے بنی۔ اُس کی خوش قسمتی سے راجپوتی کیمپ میں یہ افواہ گرم ہو گئی کہ شہاب الدین غوری فوج لیکر اجمیر کو بچانے کے لئے آرہا ہے۔ اب تو راجپوت گھبرا گئے، انھیں دونوں فوجوں کے درمیان نرغے میں آنے کا خطرہ سامنے دکھائی دیا۔ اس لئے وہ اجمیر کے محاصرہ کو اُٹھا کر وہاں سے چل دئے۔

شہاب الدین محمد غوری نے گجرات پر سب سے پہلے ۱۱۷۸ء میں چڑھائی کی تھی۔ سومناتھ کی لوٹ مار کی وجہ سے مسلمانوں کے دل میں گجرات کی فتح کا خیال بنا رہا۔ ویسے بھی اُچھ کو فتح کرنے کے بعد شہاب الدین نے سمجھا کہ گجرات کو فتح کرنا بھی بائیں ہاتھ کا کرتب ہوگا۔ سندھ کے ریگستان میں سے ہوتے ہوئے شہاب الدین اور اس کے ساتھی گجرات کے دارالحکومت انہل واڑہ میں پہونچے۔ راجہ بھیم تیر و تفنگ سے اُن کا استقبال کرنے کیلئے تیار بیٹھا تھا جیسے ہی غوری فوجیں سامنے آئیں اُس نے اُن کو ایسے آڑے ہاتھوں لیا کہ اُن کو بھاگتے ہی بنی، غور بہت دور تھا۔ اور راستہ جنگل و بیابان، دشت و صحرا میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ جہاں کھانے پینے کے سامان کی کمی تھی، بھگوڑے سپاہیوں کو آرام کہاں، ہزاروں سپاہی راستہ میں بھوک اور پیاس کی شدت سے مر گئے۔ یہ چڑھائی حملہ آوروں کو ایسی مہنگی پڑی کہ پندرہ سال تک کسی نے اس طرف کا پھر رُخ نہ کیا۔

راجہ بھیم کی حکومت گجرات تک ہی محدود نہ تھی، دور و نزدیک کے کئی علاقے اُس کے حلقۂ اطاعت میں تھے۔ حملہ آوروں نے گجرات پر حملہ کرنے سے گریز کیا، لیکن جیسے ہی تراوڑی کی دوسری لڑائی کے بعد غوری حکومت نے شمالی ہندوستان میں قدم جمانے کی ٹھانی، بھیم نے اُن کے برخلاف جنگ میں حصہ لینا اپنا فرض سمجھا، گجرات سے دہلی بہت دور تھی۔ لیکن راجہ بھیم کا حلقۂ اثر ہریانہ کے جاٹوں تک پھیلا ہوا تھا۔ جب راجہ جاٹ وان نے حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی تو بھیم نے اس کی مدد کے لئے فوج بھیجنا مناسب سمجھا، اتحادی فوجوں نے

سنہ ۱۱۹۲ء میں ہانسی پر حملہ کر دیا۔ غوری حاکم کھلے میدان جنگ میں مقابلہ کی تاب نہ لا کر قلعہ بند ہو بیٹھا لیکن جاٹوں نے پھر بھی پیچھا نہ چھوڑا، قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ قلعہ تو سر نہ ہوا لیکن نئے حاکموں کے زور حکومت کو اس حملے سے بہت صدمہ پہونچا۔

جب سنہ ۱۱۹۴ء میں اجمیر کے لوگوں نے سر اُٹھایا تو بھی اس آزادی کی جنگ میں بھیم کا ہاتھ کام کرتا دکھلائی دیتا ہے۔ ہیم راج چوہان کا سب سے بڑا ساتھی جاٹ رلئے راجہ بھیم کا تابع جاٹ ہوان ہی معلوم ہوتا ہے، اجمیر فتح کرنے کے بعد قطب الدین ایبک نے سنہ ۱۱۹۵ء میں گجرات پر حملہ کرنے کی ٹھانی۔ راجہ بھیم نے گجرات میں رہ کر دشمن کا مقابلہ کرنے پر بس نہیں کی بلکہ اپنے سیناپتی کنور پال کو فوج دیکر ایبک کا مقابلہ کرنے کو بھیجا۔ کنور پال ہار گیا اور ایبک نے انہل واڑہ پہنچکر وہاں لوٹ کھسوٹ مچادی، بھیم بھی آسانی سے قابو میں آنے والا نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ غوری فوجوں کے لئے گجرات پر قبضہ کرنا آسان نہیں ہے اور نہ وہ گجرات میں زیادہ دیر ٹھہر سکتی ہیں۔ کنی کترا کر وہ ایک طرف نکل گیا۔ قطب الدین انہل واڑہ میں اس بات کا انتظار کرتا رہا کہ بھیم آکر اطاعت قبول کرے اور نہیں تو تھوڑی بہت نذر دیکر ہی خلاصی پائے لیکن راجہ بھیم اطاعت قبول کرنے کا تو نام بھی نہیں جانتا تھا قطب الدین تھوڑے دن وہاں ٹھیر کر واپس لوٹ گیا۔ گجرات کو دہلی کے نئے حاکموں کی ماتحتی قبول نہیں کرنی تھی سو نہیں کی، گجرات نے اپنی آزادی قائم رکھی۔

شہاب الدین کے ایک اور سردار بختیار خلجی نے پہلے تو بہار فتح کیا اور پھر وہاں سے بنگال پر حملہ کر دیا۔ راجہ لکشمن سین اپنے دار الحکومت لکھنوتی میں بیٹھا دشمنوں کا انتظار کرتا رہا۔ وہ اپنے باپ کی موت کے بعد پیدا ہوا تھا، کہا جاتا ہے کہ نجومیوں کے کہنے کے مطابق اس کی پیدایش نیک ساعت میں کرنے کے لئے اس کے ماں کے وضع حمل کو کچھ گھنٹوں کے لئے ٹھہرا دیا گیا تھا جیسے ہی شبھ گھڑی میں اسکی پیدایش ہوئی، ماں تکلیف کے مارے مر گئی، باپ پہلے مر چکا تھا ماں اس غیر قدرتی تکلیف کی وجہ سے جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ لیکن جوتشیوں نے پھر بھی اس کو نیک ساعت میں پیدا ہوا ہی ٹھہرایا ہے۔ اس وقت وہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ جن جوتشیوں نے اُسکی ماں کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا اُن کے جانشیں اب بھی موجود تھے، اُنھوں نے جیسے ہی بہار کی فتح کی خبر سُنی اپنی پیشین گوئیوں سے لوگوں کے دل توڑنے شروع کر دئے، سب کو یقین دلایا کہ مقابلہ کرنا بے فائدہ ہے کیونکہ بنگال کی فتح یقینی ہے۔ ان کی اس دُہائی دینے سے کہا جاتا ہے کہ سارا دار الحکومت اور ارد گرد کا علاقہ خالی ہو گیا تھا۔ اب جو کچھ سپاہی تاجروں کے بھیس آ وارد ہوئے تو پھر جوتشی صاحبان نے راجہ لکشمن سین کو بھی بھاگ کر جان بچانے کا اُپدیش دیا۔ اب کی بار لکشمن سین نے اُن کی نصیحت قبول تو کی لیکن قریب ہی وکرم پور [illegible] بیٹھا یہاں [illegible] عرصہ اور بنگال کے آزاد حصے پر حکومت کرتا رہا۔

یہ ۱۲۰۲ء کی بات ہے، بختیار خلجی نے ۱۲۰۵ء میں اپنا حلقۂ اثر بڑھانے کا ارادہ کیا۔ ایک منگھ راجہ کے بھروسے پر جو مسلمان ہو چکا تھا اُس نے کامروپ کے راستے پہاڑی علاقے پر حملہ کرنے کی ٹھانی، دیوکوٹ سے وہ آگے بڑھا، تو ایک بڑا دریا سامنے پایا جس کو عبور کرنے کا کوئی سامان ساتھ نہیں تھا۔ دریا کے کنارے کنارے چل کر کچھ دنوں کے بعد ایک پتھر پل نے دریا پار کرنے کا راستہ بتا دیا۔ اندھے کو کیا چاہیئے، دو آنکھیں۔ بختیار خلجی نے پل کے راستے دریا عبور کر کے آگے بڑھنے کی ٹھانی، پُل کی حفاظت کے لئے فوج کا ایک دستہ تعینات کیا اور خود آگے بڑھ گیا۔ پہاڑی علاقہ تھا۔ جس راستہ وہ گیا لوگوں نے اُسکی حماقت پر ہنسی اُڑائی اور اس کو آگے بڑھنے سے نہ روکا۔ کئی دن کے سفر کے بعد ایک بڑے بھاری شہر میں ایک قلعہ نظر پڑا۔ بغیر مقابلہ کے آگے بڑھتے ہوئے حملہ آور خوش ہوئے کہ قتل و جدال کی تو اب نوبت آئیگی لیکن جیسے ہی بختیار خلجی نے قلعہ کا محاصرہ شروع کیا۔ شہر کے لوگوں نے پیچھے سے حملہ کر کے اس کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ شام ہونے سے پہلے ہی حملہ آوروں کے چھکے چھوٹ گئے، رات کو خبر ملی کہ قریب کے ایک شہر سے ایک بڑی بھاری جمعیت شہر والوں کی مدد کے لئے آرہی ہے، اب تو بختیار خلجی گھبرایا، بھاگتے ہی بنی لیکن اب تو بھاگنا بھی دشوار ہو گیا، سارے راستہ میں لوگوں نے کھیتیاں اُجاڑ ڈالی تھیں، راستے خراب کر دئے تھے، شہر برباد کر چھوڑے تھے تاکہ بختیار خلجی کو ایک دانہ بھی غلہ کا نصیب نہ ہو سکے۔ مرتے کھپتے جب پل پر پہونچے تو دیکھا کہ جس فوجی دستے کو اس کی حفاظت کے لئے چھوڑا تھا وہ غائب تھا۔ پُل وہاں کے باشندوں نے توڑ ڈالا تھا۔ دور و نزدیک دریا کو پار کرنے کا کہیں بھی کوئی ذریعہ دکھلائی نہ دیا۔ کامروپ کے راجہ نے اپنے دیش کی نیچ کا اب بدلہ لینے کی ٹھانی اور بچے کھچے سپاہیوں پر حملہ کر دیا۔ جب بختیار لکھنوتی واپس پہونچا تو صرف سو سوار اس کے ساتھ تھے ۔۔ ۹۹ سپاہی اس مہم کے نذر ہو گئے۔

دوسرے جگہوں پر بھی دہلی کے ان نئے حاکموں کو کسی نے چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ قنوج، بنارس اور میرٹھ پر تو دہلی کی فوجوں کا قبضہ تھا لیکن صوبہ کے چندیل خود مختار تھے، ۱۲۰۲ء میں قطب الدین نے اُن پر چڑھائی کی، راجہ پرمال ہار گیا اور اس نے دہلی کی ماتحتی قبول کر لی اور خراج دینا منظور کر لیا، ابھی دہلی کی فوجیں خراج لینے کے لئے ٹھہری ہوئی تھیں کہ کسی باغیرت چندیل نے پرمال کو موت کے گھاٹ اُتار دیا، اس کے وزیر اجے دیو نے خراج دینے سے انکار کر دیا اور کالنجر کے قلعے کی مضبوطی پر بھروسہ کر کے قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا، قطب الدین نے قلعہ کا محاصرہ کیا، شومیِ قسمت سے جس چشمہ سے قلعہ والے پانی لیتے تھے وہ خشک ہو گیا۔ آج تک کسی نے اس چشمہ کو خشک ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ پیاسے مرتے ، راجپوتوں نے صلح کرنی ہی مناسب سمجھی لیکن قطب الدین کے غصہ کا پارہ اب چڑھ چکا تھا، ہزاروں آدمیوں کو موت کے گھاٹ اُتارا، شہر میں کچھ دنوں قتل و خون ہوتا رہا اور صوبہ فتح ہو گیا۔

۱۲۰۵ء میں شہاب الدین کے مرنے کی افواہ ہندوستان میں پھیل گئی۔ کوہستان نمک کا راجہ اس سے پہلے مسلمان ہو چکا تھا لیکن اب پھر وہ واپس ہندو دھرم میں آگیا۔ اس موقع کو اس نے غنیمت جانکر ملتان پر حملہ کر دیا۔ غوری حاکم ہار کر بھاگ گیا۔ کھکھر یہاں سے لاہور آدھمکے اور وہاں خوب لوٹ کھسوٹ مچائی۔ سارے پنجاب میں ابتری پھیل گئی۔ شہاب الدین نے بذات خود کھکھروں کو سزا دینے کے لئے پنجاب میں آنا مناسب سمجھا۔ کھکھروں نے خوب جم کر اس کا مقابلہ کیا۔ قریب تھا کہ شہاب الدین کے قدم اکھڑ جاتے تو قطب الدین کی تازہ دم فوج نے لڑائی کا نقشہ بدل دیا اور کھکھروں کو شکست ہوئی۔

اس فتح کے بعد ۱۲۰۶ء میں جب شہاب الدین غور واپس جا رہا تھا تو اٹک کے کنارے غالباً کسی کھکھر نے اسے قتل کر کے اپنے ملک کی فتح کا انتقام لے لیا۔

شہاب الدین ۳۱ سال ہندوستان پر حملہ کرنے میں مصروف رہا۔ اس عرصے میں اس نے یا اس کے سرداروں نے ملتان، کوہستان نمک، پنجاب، دوآبہ، بہار اور بنگال کا کچھ حصہ فتح کر لیا۔ مغرب کی طرف غوری فوجیں اجمیر پر بھی قابض ہو گئیں، جہاں کہیں بھی وہ گیا ہندوستانی راجاؤں نے خوب جم کر اس کا مقابلہ کیا۔ سوائے اچھ کے جہاں کے گھر میں ہی راجہ اور رانی کے درمیان پھوٹ نمودار ہو گئی اور کسی جگہ پر بھی راجاؤں کا مفروضہ باہمی عناد کام کرتا دکھلائی نہیں دیا۔ اس کے برخلاف ترادڑی اور اجمیر پر کئی دفعہ راجاؤں نے اکٹھے ہو کر اس کا مقابلہ کیا، دور و نزدیک کے راجاؤں نے بھی غیر ملکی حملہ آوروں کو باہر نکالنے کے لئے عہد کر کے ان پر حملے کئے، جہاں کہیں بھی حملہ آوروں نے اپنا قدم رکھا نہ ہی وہاں کے حاکموں نے اور نہ ہی وہاں کے باشندوں نے آسانی سے ماتحتی قبول کی، دہلی، لاہور، ہانسی اور اجمیر کو کئی دفعہ فتح کرنا پڑا۔ کالنجر اور کامروپ میں بغاوت تک کی نوبت پہونچی، بنگال کے شمالی کوہستان میں تو بختیار خلجی کی وہ گت بنی کہ اسے لکھنوتی میں منہ دکھلانا مشکل ہو گیا، شہاب الدین کی موت بھی لاہور اور پنجاب کو دوبارہ فتح کرتے ہوئے ہی ہوئی۔

اندریں حالات یہ کہنا کہ شمالی ہندوستان کا جو حصہ شہاب الدین کے قبضے میں آگیا تھا وہ آسانی سے فتح ہو گیا غلط ہے۔ نہ تو شہاب الدین ہر مہم میں فتحیاب ہوا اور نہ ہی اس کی مفروضہ غیر معمولی جنگی قابلیت نے لوگوں کے دلوں پر ایسا سکہ جمایا کہ جہاں کہیں وہ گیا وہاں کے لوگوں نے اس کے آگے بآسانی سر تسلیم خم کر دیا، چپے چپے زمین کے لئے اسے لڑنا پڑا۔ بہار اور بنگال کا شمار اس کے مفتوحہ علاقوں میں کیا تو جاتا ہے لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ ان پر حکومت کس حد تک قائم ہوئی، جب دوآبہ کو فتح کرنے کیلئے دہلی، ہانسی، کالنجر، میرٹھ، کویل، مہوبہ اور بیانہ کو لینا پڑا، تو یہ مشکل ہی نہیں بلکہ غیر ممکن معلوم ہوتا ہے کہ بختیار خلجی کی ایک اسی مہم نے سارے بنگال اور بہار پر خاندان کی حکومت قائم کر دی ہے۔ لکشمن سین کے جانشین مدتوں ڈھاکہ کے نزدیک حکمراں رہے۔

شہاب الدین کی فتح کے اسباب لڑائیوں کے اُن بیانات میں ڈھونڈے جا سکتے ہیں جو ہم اُوپر دے آئے ہیں۔ ترائن کی دوسری لڑائی میں شہاب الدین کی فتح کے بڑے اسباب اس کے نامہ و پیام میں دھوکہ دہی اور میدان جنگ میں لڑائی کے نئے طریقے تھے۔ اسی قسم کے طریقے اُس نے راجہ بھیم کے ساتھ آبو کے قریب لڑتے وقت استعمال کئے، جہاں اُس نے بھاگنے کا بہانہ کر کے راجپوت سپاہیوں کو اُن کی محفوظ کمین گاہوں سے نکالکر کھلے میدان میں لڑنے پر مجبور کیا۔ لکشمن سین پر حملہ کرتے وقت بھی دھوکہ دہی سے بختیار خلجی کے سپاہی تاجروں کے بھیس میں ندیا میں داخل ہو گئے اور اپنے ساتھیوں کے لئے شہر کے دروازے کھولنے کا ذریعہ بنے، ہماری توہم پرستی نے بھی بختیار خلجی کے لئے بنگال کی فتح آسان کر دی۔ ندیا کے بہت سارے باشندے اس وجہ سے شہر کو چھوڑ گئے تھے کیونکہ جوتشیوں نے بتلایا تھا کہ دور و نزدیک کے زمانے میں ہی شہر ترکوں کے قبضہ میں آ جائیگا۔ چندواڑہ کی لڑائی میں جے چند کی اتفاقیہ موت نے جنگ کا نقشہ پلٹ دیا اور قنوجی فوج کی فتح کو شکست میں تبدیل کر دیا۔ کالنجر کے محاصرہ کے وقت بھی قلعہ کے چشمہ کا پانی اتفاقاً خشک ہو گیا۔ حالانکہ یہ عام طور پر سمجھا جاتا تھا کہ پانی کا وہاں ایک لاانتہا ذخیرہ ہے۔ ان ساری باتوں کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑیگا کہ شہاب الدین بذات خود ایک بڑا بھاری جنرل تھا جس نے جنگ کے نئے طریقے ہندوستان میں استعمال کئے اسکی فوجی دانشمندی اور حکیمانہ چالوں سے اس کی فتح کو آسان بنا دیا۔ ایک دو لڑائیوں میں شہاب الدین کی فوج کے سپاہیوں کی تعداد اس کے مخالف سپاہیوں کی تعداد سے زیادہ تھی۔ کھکھڑوں کے خلاف آخری لڑائی میں کھکھر نہ صرف دو طرف سے نرغے میں آ گئے بلکہ ایک اور شہاب الدین کی فوجیوں کی تعداد کھکھر فوج سے کہیں زیادہ تھی۔ غوری سپاہی کسی حالت میں بھی راجپوتوں یودھاؤں کی نسبت زیادہ بہادر نہ تھے ہاں اُن کے گھوڑے شاید بہتر ہوں۔

بغداد کے خلیفہ کے حکم سے سنہ ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا، سنہ ۱۲۰۶ء میں دہلی شمالی ہندوستان کے فرمانرواؤں کا دارالخلافہ بنا۔ دہلی کی اس سلطنت کے ماتحت تقریباً آدھا شمالی ہندوستان تھا۔ کشمیر اور جموں، موجودہ ہوشیارپور۔ کانگڑہ اور گورداسپور اور شملہ کے اضلاع کا بیشتر حصہ، گجرات، تمام تر راجپوتانہ صرف اجمیر کو چھوڑ کر۔ گوالیار کے سوا سارا وسط ہند۔ مشرقی بنگال اور اڑیسہ، یہ سب اس وقت بھی دہلی کے مالکوں کے قبضہ میں نہیں تھے، اس طرح سے آدھے شمالی ہندوستان کی فتح میں پانچسو سال لگ گئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس سارے عرصے میں ہندوستان پر پے در پے حملے نہیں ہوتے رہے لیکن ڈھائی سو سال کے قریب ہندوستان کا اِن حملوں سے محفوظ رہنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مسلمان فاتحوں کو دوسری جگہ یعنی میسوپٹیمیا، مصر، مراکو اور اسپین کے خطے زیادہ آسانی سے ہاتھ آ سکتے تھے جس کی وجہ سے ہندوستان کی بجائے وہ مغرب کا رُخ کئے رہے، سبکتگین اور جے پال میں جنگ چھڑنے کے بعد بھی شمالی ہندوستان کا آدھا حصہ تقریباً ڈھائی سو سال

میں فتح ہوا۔ اِن باتوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے یہ کہنا غلط ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان کو بہت آسانی سے یا بہت تھوڑے عرصے میں فتح کر لیا۔ یہ حملے نہ تو لابدی تھے اور نہ ہی دیر پا، اپنے مذہبی عقیدوں کی وجہ سے حملہ آور نہیں جیتے۔ اِس اسلامی جوش و خروش نے جنگجو بادشاہوں کے لئے اُن کی حکومت کو وسعت دینے کی غرض سے لاتعداد سپاہی آسانی سے بہم پہونچاتے۔ اس وقت کی لڑائی کے دستور کے مطابق لوٹ کھسوٹ اور شکست خوردہ طبقہ کو غلام بنانے کے رواج نے نہ صرف بادشاہوں کو فوج کشی کی ترغیب دی بلکہ اُن کے سپاہیوں کے لئے بھی مذہبی جنون اور ذاتی مفاد کو یکساں سمجھنے میں مدد دی۔ حملہ آوروں میں رواداری کی کمی نے ایک آدھ مورتی کو توڑ ڈالنا اور کسی مندر کے گرانے میں حصہ لینا ثواب کے کام سمجھے گئے اور ہم مذہب ہم ثواب کے مطابق وسط ایشیا سے ہزاروں جنگجو سپاہیوں کو غوری جھنڈے کے نیچے کھڑا کرنے کا سبب بنے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگا کہ اِن حملہ آوروں نے یا اُن کے حملوں نے اسلام کی کتنی خدمت کی۔ دو چار جگہ پر تو حملہ آوروں کی چمکتی تلواریں حکمراں خاندانوں کو تبدیلِ مذہب کرنے کا سبب بنیں لیکن ان حملوں سے اسلام کو لوٹ کھسوٹ ظلم و ستم کا مترادف بنا کر اسلام کی کوئی خدمت نہیں کی اور جو ہتھیار ہندوستان سے باہر مفید ثابت ہوئے تھے وہ ہندوستان آکر بیکار ثابت ہوئے، دہلی کی اِس نئی حکومت کو اسلامی حکومت سمجھنا یا ہندوستان کی تاریخ کے اسی عہد کو اسلامی عہد کہنا بھی دانشمندی سے بعید ہے دہلی کے نئے حکمراں بظاہر خلیفہ کے پیرو تھے لیکن دو چار باتوں کو چھوڑ کر اُنھیں ہندوستان میں اپنے طرزِ حکومت کو ہندوستانی بنیادوں پر ہی رکھنا پڑا۔ بادشاہ نام کے مسلمان ضرور تھے لیکن نہ اپنے نظامِ حکومت میں اور نہ ہی اپنی روزمرہ کی زندگی میں وہ اسلام کے کامیاب نمونے ثابت ہوئے۔ مراکو، فارس اور افغانستان کو فتح کرکے اسلامی فاتحوں نے وہاں اسلامی عہد کا آغاز کیا لیکن ہندوستان میں تو آبادی کا بہت بھاری حصہ مسلمان نہ بننا تھا نہ بنا۔ ہندوؤں کا قانون اپنا تھا اور عدالتیں خود مختار، جو ہندو مسلمان بھی بنے وہ بھی بسا اوقات ہندوانہ طریقِ کار کے ہی پیرو رہے اور ہندو قانون یا رواج کا ہی غلام۔ اسلام کا پھیلاؤ مسلمان بادشاہوں کی وجہ سے ہندوستان میں ممکن تو ہوا لیکن عام طور پر اِنکی حکومت نے ہندوستان کے مذہب پر کچھ بہت اثر نہیں ڈالا اندریں حالات یہ کہنا زیادہ ٹھیک ہوگا کہ دہلی میں مسلمان بادشاہوں کی حکومت سے اسلام کی تاریخ میں ہندوستانی باب شروع ہوتا ہے نہ کہ ہندوستان کی تاریخ میں اسلامی عہد۔

قطعہ

اسے بھولے سے بھی بھولا مسافر کہہ نہیں سکتے
بھٹک کر صبح دم واپس جو وقتِ شام آجائے
نہ ہو شرمندۂ آغازِ امرِ ناروا کوئی
نظر انسان کو اپنا اگر انجام آجائے

(سٹرڈی۔ پی کستہ)

بہار کی صبح اور کسی کی یاد

(از حضرت نازش پرتاب گڈھ)

نقاب اُلٹائے اپنے رُخ سے فلک پہ خورشید آ رہا ہے
ہر ایک غنچہ مہک مہک کر سحر کا جادو جگا رہا ہے
زمین پرنور کی ہے بارش شجر شجر مسکرا رہا ہے
کہیں کہیں وادیوں میں جھرنا سریلی تانیں اُڑا رہا ہے

چہک رہی ہے شجر پہ بلبل پپیہا "پی" کو بلا رہا ہے
کوئی اب ایسے میں یاد آ کے مجھکو نازش رلا رہا ہے

گلوں کا چہرہ کھلا ہوا ہے خوشی سے پودا لہک رہا ہے
بہک رہی ہیں کلی کی نظریں چمن میں ساغر چھلک رہا ہے
مہک رہے ہیں گلاب و سنبل ہوا بھی جیسے سنک رہی ہے
شفق کا مینا چھلک رہا ہے زمیں پہ شبنم دمک رہی ہے

ندی کا سینہ دھڑک رہا ہے۔ چمن کا لب تھرتھرا رہا ہے
کوئی اب ایسے میں یاد آ کے مجھکو نازش رلا رہا ہے

کلی کلی پھول بن رہی ہے روش روش جگمگا رہی ہے
لچک لچک کر اک ایک ڈالی سحر کی ہنسی بجا رہی ہے
کلی کا خم خانہ کھل گیا ہے گلوں کے ساغر بھرے ہوئے ہیں
چمن کے غنچے بھی دوش پر اب صراحی جیسے دھرے ہوئے ہیں

سبھوں کو بھر بھر کے جام رنگیں سحر کا ساقی پلا رہا ہے
کوئی اب ایسے میں یاد آ کے مجھکو نازش رلا رہا ہے

افق پہ بھرتا چلی ہیں کرنیں شجر کے سر سے بندھا ہے
ابھر رہا ہے شفق کی رنگینیوں سے سورج کا شرخ

سحر کی دیوی اُڑا رہی ہے فلک پہ اپنا حسین آنچل
سلگ رہے ہیں بہار کی آگ سے بیاباں اور جنگل
الاپتی ہے وہ کالی کویل وہ پھول نغمہ سنا رہا ہے
کوئی اب ایسے میں یاد آکے مجھکو نازش رولا رہا ہے

فکر و نظر

(از محمود یار خاں آثر ایم - اے - جوناگڈھی)

داغہائے قلب سینے میں فروزاں ہو گئے
دل کے سب ارمان سنگریوں نمایاں ہو گئے

ہے کشش انگیز کتنی وہ نگاہِ دل شکار
سینکڑوں دل دوڑ کر خود نذرِ پیکاں ہو گئے

حیرتِ نظارگی چشمِ تماشا کی بڑھی
منتشر یوں جلوہ ہائے بزمِ امکاں ہو گئے

آبلہ پائی سے میری بڑھ گئی قدرِ جنوں
دشت میں سیراب کچھ خارِ مغیلاں ہو گئے

رونق افزائے چمن بنتے ہیں گل صدہا مگر
دیدنی ہیں پھول جو زیبِ بیاباں ہو گئے

کشتیٔ ساحل کی آسانی سے کیا نسبت انھیں
وہ سفینے آہ جو بربادِ طوفاں ہو گئے

گریۂ غم سے نمایاں ہو گئی دل کی بساط
چند قطرے خون کے تھے، صرفِ مژگاں ہو گئے

وہ اسیرانِ بلا ہیں قابلِ صد احترام
کوششوں سے جنکی وا درہائے زنداں ہو گئے

جزو میں مجھکو نظر آتی ہیں کل کی وسعتیں
مرحبا ذوقِ نظر ذرّے بیاباں ہو گئے

انقلاب انگیزیٔ دورِ زمانہ کیا کہوں
کتنے مجمعے آہ دنیا میں پریشاں ہو گئے

اشتیاقِ دید میں پھیلے جو نظارے تمام
سب سمٹ کر وہ فدائے حسنِ جاناں ہو گئے

وہ اُدھر حسنِ مجسم، دل اِدھر صرفِ نیاز
میری بربادی کے سب موجود ساماں ہو گئے

ایسی دلسوزی کے قرباں، اس تلطف کے نثار
حالِ غم سن کر مرا وہ کچھ پریشاں ہو گئے

غایتِ ہستی نہیں سمجھے جہاں میں وہ اثر
حادثاتِ زندگانی سے جو نالاں ہو گئے

میرے لئے

(از جناب بدری ناتھ صاحب شاطر الہ آبادی)

زندگی ہی نے نہیں سب کچھ کیا میرے لئے
موت بھی چکر میں آئی بارہا میرے لئے

اک خوشیِ مختصر کی کیا حدیں قایم کروں
میری دنیا ہے غمِ لا انتہا میرے لئے

جس سے پیدا ہو ربابِ زندگی میں اضطراب
چھیڑ دے نے مطربِ آفت نوا میرے لئے

یا بدلنا چاہتا ہوں میں نظامِ کائنات
یا بدلتی ہے زمانہ کی ہوا میرے لئے

دل تو کہہ گذرا قیامت میں سب اپنے واقعات
دیکھئے ارشاد وہ کرتے ہیں کیا میرے لئے

جلوۂ محبوب سے بڑھتی گئی تابِ نظر
پردۂ کون و مکاں اُٹھتا گیا میرے لئے

جس کی تلچھٹ میں نہاں ہو چشمۂ آبِ حیات
ساقیِ بزمِ ازل وہ جام لا میرے لئے

مبتلائے دردِ غم ہے عشق میں سب جزوِ تن
ہر بنِ مو سے نہ کیوں نکلے دعا میرے لئے

مجھ میں اے شاطر کہاں اوصافِ شعر و شاعری
ہے غنیمت پھر بھی فکرِ نارسا میرے لئے

اُردو مری زباں ہے

یوں بجلیوں کی زد میں بلبل کا آشیاں ہے
بچ جائے تو ہے کانٹا جل جائے تو دھواں ہے

اظہارِ عشق و الفت سرمایۂ بیاں ہے
ہر لفظ ہے کہانی ہر فقرہ داستاں ہے

بیتابیِ نظر سے گلشن میں وہ سماں ہے
جس سمت دیکھتا ہوں میرا ہی آشیاں ہے

حسن و جمال کا بھی اللہ رے معمہ
وہ سامنے ہے لیکن کھلتا نہیں کہاں ہے

محدود ہو گیا ہوں ہستی کے دائرے میں
یہ مرگ و زیست کیا ہے اک شغلِ رایگاں ہے

وارفتگی سمجھئے یا اس کو کم نگاہی
اوروں سے پوچھتا ہوں منزل مری کہاں ہے

اہلِ قلم نے شاطر چونکا دیا ہے ورنہ
میں خواب دیکھتا تھا اُردو مری زباں ہے

حکومت ہند کا سالانہ بجٹ

(از مسٹر پریم پرکاش اغروہی ورما)

حکومت ہند کا سالانہ بجٹ بابت سنہ ۱۹۴۵-۴۶ء و سنہ ۱۹۴۳-۴۴ء کے موازنہ آمد و خرچ پر مختلف زاویہ ہائے نظر سے غور و خوض کیا جا چکا ہے۔ لیکن صورت حال سے واقف ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اعداد و شمار کے طلسم کی حقیقت کو بخوبی سمجھا جائے۔ کیونکہ حکومت ہند کے محکمہ اعداد و شمار کی رپورٹوں کی تہ میں کوئی نہ کوئی امر پوشیدہ رہتا ہے جسکو اجاگر کئے بغیر اصلیت کا پتہ نہیں چل سکتا۔ بجٹ ہی کو لے لیجیئے۔ حکومت ہند کا بجٹ بابت سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء موجودہ جنگ عظیم کے پیشتر کا مرتب کیا ہوا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ بجٹ میں تبدیلی ہوتی گئی وہ مندرجہ ذیل تفصیل سے ظاہر ہوگی۔ لیکن ان اعداد و شمار کو سمجھنے کے لئے ایک معیاری رقم فرض کر لینا ہوگی۔ تاکہ اس معیار کی مدد سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکے۔

سنہ ۱۹۳۸-۳۹ء میں حکومت ہند کی کل آمدنی ایک ارب اکیس کروڑ چھ لاکھ اڑسٹھ ہزار روپیہ تھی اور اخراجات ایک ارب ۲۱ کروڑ ۷۰ لاکھ ۷۶ ہزار روپیہ تھے۔ یعنی حکومت کو ۳۶ لاکھ ۸۰ ہزار روپیہ کا خسارہ رہا۔ اب ان اعداد کو معیاری بنانے کے لیے ان کو ۱۰۰ کے برابر فرض کر لینا چاہیئے اور چھتیس لاکھ کے خسارہ کو بھی ۱۰۰ کے برابر سمجھکر اس معیار سے آئندہ سال کے بجٹ پر نظر ڈالیئے۔

سال	آمدنی / اخراجات	۱۰۰ کے معیار کے مطابق	خسارہ ۱۰۰ کے معیار کے مطابق
سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء	آمدنی۔ ایک ارب ۲۲ کروڑ ۹۶ لاکھ ۷۹ ہزار	۱۰۲/۴	
	اخراجات۔ ایک ارب ۲۳ کروڑ ۹۰ لاکھ ۷۹ ہزار	۱۰۱/۸	بچت
سنہ ۱۹۴۰-۴۱ء	آمدنی۔ ایک ارب ۴۵ کروڑ ۱۲ لاکھ ۸۹ ہزار	۱۱۹/۸	
	اخراجات۔ ایک ارب ۵۱ کروڑ ۶۵ لاکھ ۴۸ ہزار	۱۲۴/۶	۱۰۲۳/۵
سنہ ۱۹۴۱-۴۲ء	آمدنی۔ ایک ارب ۷۶ کروڑ ۹ لاکھ ۱۰ ہزار	۱۴۰/۳	۲۷۰۸/۴
	اخراجات۔ ایک ارب ۸۵ کروڑ ۲۴ لاکھ ۲۸ ہزار	۱۵۲/۲	
سنہ ۱۹۴۲-۴۳ء	آمدنی۔ ایک ارب ۶۶ کروڑ ۸۹ لاکھ	۱۳۷/۸	۱۸۷۸۲۱/۶
	اخراجات۔ دو ارب ۶۱ کروڑ ۵۲ لاکھ	۳۱۴/۷	
سنہ ۱۹۴۳-۴۴ء	آمدنی۔ ۳ ارب ۴ کروڑ ۹۷ لاکھ ۴۳ ہزار	۲۵۱/۵	۵۱۹۰۱/۳
	اخراجات۔ ۴ ارب ۹ کروڑ ۷۶ لاکھ ۳۰ ہزار	۴۰۶/۲	

سال			۱۰۰ کے معیار کے مطابق	خسارہ ۱۰۰ کے معیار کے مطابق
	آمدنی			
	اخراجات -	۱۰۰ کے معیار کے مطابق		
۱۹۴۴-۴۵ء	آمدنی -	۴-ارب ۸ اکروڑ ۱۲ لاکھ ۱۴ ہزار	۳۴۵ر۴	۴۲۳۵۱ر۳
	اخراجات -	۵-ارب-۳-۷ کروڑ ۸ لاکھ ۸۹ ہزار	۴۷۲ر۱	
۱۹۴۵-۴۶ء	آمدنی -	۴-ارب-۷ اکروڑ ۲۷ لاکھ ۵۱ ہزار	۳۴۵ر۸	۴۲,۲۲۰ر۱
(تخمینہ)	اخراجات	۵-ارب ۴۷ کروڑ ۱۱ لاکھ ۱۶ ہزار	۴۷۱ر۶	

مندرجہ بالا اعداد سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ گذشتہ پانچ سال میں ہندوستان کا بجٹ برابر خراب ہوتا جا رہا ہے اور ۱۹۳۹-۴۰ء کے مقابلہ میں امسال ۴۲,۲۲۰ر۱ گنا زیادہ نقصان رہا - علاوہ چین کے دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو جسکی مالی حالت اتنی پست ہو - گذشتہ پانچ سال میں خسارہ اس طرح پر رہا -

سال	خسارہ	
۱۹۴۰-۴۱ء	۶ کروڑ ۵۲ لاکھ ۸۰ ہزار	روپیہ
۱۹۴۱-۴۲ء	۱۶ کروڑ ۲۷ لاکھ ۳۲ ہزار	"
۱۹۴۲-۴۳ء	۹۴ کروڑ ۶۶ لاکھ	"
۱۹۴۳-۴۴ء	ایک ارب ۱۷ کروڑ ۸۷ لاکھ ۹۵ ہزار	"
۱۹۴۴-۴۵ء	ایک ارب ۵۵ کروڑ ۳۷ لاکھ ۴۳ ہزار	"
۱۹۴۵-۴۶ء (تخمینہ)	ایک ارب ۵۵ کروڑ ۲۸ لاکھ ۵۷ ہزار	"
	۶ - ارب ۱۹ اکروڑ ۳۰ لاکھ ۳۷ ہزار	"

بالفاظ دیگر ۱۹۴۰-۴۵ کے اندر حکومت ہند کو سوا چھ ارب روپیہ کا نقصان رہا یعنی آمدنی کے مقابلہ میں اسقدر زائد روپیہ خرچ ہوا - اس کا مطلب یہ ہوا کہ اتنا روپیہ یا تو قرض لیکر یا اتنی رقم کے کاغذی نوٹ رائج کر کے یہ کمی پوری کی گئی -

اس حساب سے ہندوستان کی آبادی کے اوسط کے مطابق پندرہ روپیہ فی کس بمقابلہ آمدنی زیادہ خرچ ہوا - یعنی جنگ کے گذشتہ پانچ سال میں ہر ہندوستانی نے تین روپیہ سالانہ نقصان اوٹھایا - چالیس کروڑ نفوس کے لیے اتنا کثیر نقصان کوئی معمولی بات نہیں ہے اور اس کا انجام خطرہ سے خالی نہیں -

جنگی اخراجات منجملہ ان اخراجات کے کتنی رقم جنگی مقاصد پر خرچ کی جاتی ہے اور اسکی وجہ سے

آمدنی و اخراجات کا باہمی توازن کس قدر درہم برہم ہو رہا ہے۔ اس کا اندازہ ناظرین بآسانی لگا سکتے ہیں۔

کل آمدنی سے جو رقم جنگی اخراجات پر خرچ ہو رہی ہے اسکی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

سنہ ۳۹-۱۹۳۸ء میں فوج پر بحیثیت مجموعی ۵۲ کروڑ ۶ لاکھ ۱۰ ہزار روپیہ خرچ ہوا تھا۔ اس رقم کو معیاری سمجھکر اس کو سو فرض کر لیجئے۔

سال	خرچہ	سنہ ۳۹-۱۹۳۸ء کے معیار کے مطابق
سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء	۵۵ کروڑ ۱۷ لاکھ ۲۸ ہزار	۱۰۵/۹
سنہ ۴۱-۱۹۴۰ء	۷۴ کرور ۸۰ لاکھ ۶۴ ہزار	۱۴۳/۶
سنہ ۴۲-۱۹۴۱ء	ایک ارب ۳ کروڑ ۷۶ لاکھ ۲۳ ہزار	۱۹۹/۲
سنہ ۴۳-۱۹۴۲ء	ایک ارب ۸۹ کروڑ ۷۵ لاکھ	۲۶۴/۴
سنہ ۴۴-۱۹۴۳ء	۳-ارب ۶۸ کروڑ ۱۸ ہزار	۷۰۶/۷
سنہ ۴۵-۱۹۴۴ء	۴-ارب ۱۸ کروڑ ۷۱ لاکھ ۲۶ ہزار	۸۰۴/۳
سنہ ۴۶-۱۹۴۵ء	(تخمینہ) ۴-ارب ۱۶ کروڑ ۹۹ لاکھ ۲۹ ہزار	۸۰۰/۴
	۱۶-ارب ۲۷ کروڑ ۸ لاکھ ۹۱ ہزار روپیہ	

یعنی سنہ ۱۹۳۹ء سے سنہ ۱۹۴۵ء تک صرف جنگی مقاصد پر ہم نے سولہ ارب سے زائد روپیہ خرچ کر ڈالا۔ ہندوستان کی کل آبادی کے اوسط کے مطابق یہ رقم چالیس روپیہ آٹھ آنہ فی کس خرچ ہوئی۔ جس ملک کی فی کس سالانہ آمدنی کا اوسط ۶۵ روپیہ ہو۔ اسکے لیے چالیس روپیہ آٹھ آنہ محض فوج پر خرچ کر دینا کہاں تک مناسب ہے۔

سنہ ۴۰-۱۹۳۹ء سے سنہ ۴۶-۱۹۴۵ء تک حکومت ہند کی کل آمدنی بجٹ کے مطابق ۱۷-ارب ۴۴ کروڑ ۹۰ لاکھ ۱ ہزار روپیہ ہوئی۔ یہ واضح رہے کہ سنہ ۴۶-۱۹۴۵ء کے اعداد تخمیناً ہیں اور ان میں خفیف رد و بدل ہو سکتا ہے۔ اسی دوران میں جنگی اخراجات ۱۶-ارب ۲۷ کروڑ ۸ لاکھ ۹۱ ہزار روپیہ ہوئے یعنی جنگی اخراجات کو منہا کرنیکے بعد ان پانچ سال میں کل جمع ایک ارب ۱۷ کروڑ ۸۱ لاکھ ۱۰ ہزار روپیہ باقی بچے۔ اس حساب سے اس دوران میں ہندوستان میں غیر جنگی مدوں میں صرف سوا ارب روپیہ خرچ ہوئے یعنی فی سال صرف ۲۳ کروڑ ۳۷ لاکھ ۴۲ ہزار روپیہ جو فی کس آٹھ آنہ ہوا۔

حکومت ہند کے ممبر مالیات ہمیں اس صاف گوئی کیلئے معاف کریں گے۔ ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ جنگی اخراجات ضروری نہیں ہیں یا نہ کیئے جائیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اس ملک کی ترقی اور اس کے باشندگان کے آرام و تندرستی کیلئے کیا کیا جا رہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہماری حالت کسی طرح ان ملکوں سے جو ہوائی بمباری یا دشمن کے حملوں سے تباہ و برباد ہو گئے ہیں بہتر نہیں ہے۔ اسلئے ہندوستان کو اس سے بہتر اور ایسے بجٹ کی ضرورت ہے جس میں اسکے باشندگان کی فلاح و بہبودی کا زیادہ خیال رکھا جائے۔

(افسانہ)

(از کشمیری لال ذاکر بی۔اے)

پورا چاند آسمان کی وسعتوں میں چمک رہا تھا کہیں بھی ابر کا کوئی ٹکڑا نہ تھا لیکن اُسکی چاندنی اتنی شفاف اتنی حسین، اتنی دلکش نہ تھی جتنی اُسے پہلے دکھائی دیا کرتی تھی، وہ کچھ اُداس اور گھُٹی گھُٹی تھی جیسے ایک نوجوان بیوہ کا حُسن، چاندنی راتوں سے اُسے پیار تھا، وہ اُس کے دُکھے ہوئے دل پر مرہم کا کام کرتی تھیں لیکن آج اُس کے دل کی دُکھن میں کوئی خاص فرق نہ پڑا۔ وہ اپنے مکان کی چھت پر ٹہلتے ٹہلتے فضا میں گھُلتے ہوئے گہرے غبار کو دیکھ رہا تھا۔ ایک ایسی دُھند جو کسی ہونیوالے بُرے واقعہ کا پیش خیمہ سمجھی جاتی ہے، ایک ایسا غبار جو میدان جنگ میں کئی ہزار گھوڑوں کے دوڑنے سے پیدا ہوتا ہے اور لڑنے والوں کو دوسروں کی نظروں سے چھُپا دیتا ہے۔ اُنکی چیخیں اور کراہیں دوسرے لوگوں کے کانوں تک نہیں پہونچتیں، اُنکی موت کے دلسوز نظارے دُنیا والوں کی نگاہوں سے چھُپے رہتے ہیں اور اُسکی آنکھیں پچھم اور پورب میں خون کی ہولی کھیلنے والوں کا تصور ہی تصور میں جائزہ لینے لگیں۔ وہ جیسے توپوں کی گڑگڑاہٹ، زخمیوں کی چیخیں، اور خون کی ندیاں صاف دیکھ رہا تھا، وہ سوچنے لگا آخر انسانیت کس طرف جا رہی ہے، قوموں کی ارتقا میں حیوانیت بھی ایک منزل ہے، پُورا ترقی یافتہ ہونے کے لئے انسان کو کیا حیوان بھی بننا پڑتا ہے۔ یہ جنگ ایک نئے نظام کی بنیاد ہے۔ یہ الفاظ اُس نے ایک نہیں بیسیوں دفعہ سُنے تھے۔ تو کیا کسی اچھے نظام کی تکمیل کے لئے انسانی خون اور ہڈیوں کی ضرورت ہوتی ہے؟ اور کیا ایسا نظام خود ہی اپنی شکست نہیں؟ کیا بُنیادوں میں رکھی ہوئی ہڈیاں کبھی نہ چٹخیں گی، دیواروں میں سمایا ہوا خون سُوکھ کر علٰحدہ نہ ہو جائیگا اور اُسے محسوس ہوا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اُفق پر بکھری ہوئی شفق دراصل زمین پر بہتے ہوئے خون کا عکس تھی، خونی عکس دنیا کی ہر مہذب قوم ایک گدھ ہے اور ہندوستان ترقی کی راہ پر تھک کر پڑا ہوا ایک جاں بلب مسافر، اُس نے نامعلوم کتنے بڑے بڑے گدھوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سُنی، وہ چیخ چیخ کر ایک دوسرے پر جھپٹ رہے تھے۔ مسافر کی لاش پر سب سے پہلے پہونچنے کے لئے۔ مگر گدھ اسی طرح آپسمیں اُلجھ کر اپنا ستیاناس بھی تو کر سکتے ہیں اور راہ میں پڑا ہوا جاں بلب مسافر شاید مرے ہی نہ — اتفاقات ہی تو ہیں۔

اُس نے تپائی پر رکھی ہوئی لالٹین کی طرف دیکھا، شیشے کا نچلا حصہ سیاہ ہو گیا تھا، وہ دیر تک شیشے

پر جمی ہوئی سیاہی کو دیکھتا رہا۔ اُس کا اپنا دل بھی نا اُمیدی کے کچھ کچھ جلتے ہوئے چراغ کے دھوئیں سے کالا ہو گیا تھا۔ کالا اور ماتمی! اس لئے اُسے دنیا کی ہر چیز پر ایک کہر، ایک دُھند، ایک غبار کا پردہ پڑا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اُسے یاد آگیا کہ وہ چھت پر کیوں چڑھا تھا۔ کل بنگال ریلیف فنڈ اکٹھا کرنے کیلئے مشاعرہ منعقد ہوا تھا اُسے بھی دعوت نامہ ملا تھا، اُسے کچھ لکھنا تھا اس موضوع پر اور پھر ترنم سے پڑھنا تھا ترنم سے۔ بنگال ریلیف فنڈ اور ترنم۔ لوگ تو ماتمی جلوسوں میں بھی راگ رنگ چاہتے ہیں۔ میوزیکل کنسرٹ، ڈانسنگ شو اور بنگال ریلیف فنڈ اور اُسے بھی نقشہ کھینچنا تھا۔ بھوک سے مرتے ہوئے لاکھوں انسانوں کا جو کلکتہ کے بازاروں میں کیڑوں کیطرح رینگتے ہیں۔ ایک لقمہ کے لئے گڑگڑاتے ہیں۔ اپنے بچوں کو، بہنوں کو، عورتوں کو بیچتے ہیں سر بازار نیلام کرتے ہیں لیکن خون اور ہڈیوں کی بنیادوں پر بنائی ہوئی پکی عمارت سے ٹکرا نہیں جاتے۔ بچ کر۔ سہم کر۔ آنکھیں نیچی کر کے گزر جاتے ہیں گویا یہ ایک معبد ہے جس کی تقدیس اُن پر فرض ہے۔ اور بنگال کے دیہات اور شہروں میں سڑتی ہوئی انسانی لاشوں کا منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔ بھوک کی قربان گاہ پر چڑھائی ہوئی بھیڑیں جنھیں ٹھیک ٹھیک ممیانا بھی نہیں آتا اُسے یوں لگا کہ وہ خود بھی ایک لاش ہے جو سانس لے سکتی ہے لیکن حرکت نہیں کر سکتی، جیسے ہر قسم کے جمود نے جکڑ رکھا ہے، کاش اُسے بھی کوئی اُن گلی ہوئی لاشوں کے ڈھیر میں پھینکدے اس قسم کی زندگی سے موت کہیں بہتر ہے۔ اور وہ کیا لکھے گا اُن لاشوں کے متعلق، وہ خود بھی تو بھوکا ہے، اُس کا دماغ نشو و نما کے لحاظ سے بھوکا، اُس کا جسم آرام کا بھوکا۔ اُس کی روح سکون و شانتی کی بھوکی، وہ سراپا بھوک ہے، بھوک سے کفنائی ہوئی انسانی زندگی کی لاش، تپائی پر رکھی ہوئی کاپی پر نہ جانے کتنے ہی پروانے بے ہوش پڑے تھے، چند حرکت بھی کر رہے تھے، لیکن وہ حرکت زندگی کے نہیں موت کے آنے کا نشان تھی۔ شاعر افسانہ نگار، سیاس، لیڈر، سبھی پروانے ہیں۔ وہ ایک ایسی لالٹین کے گرد گھوم رہے ہیں جو کالی ہو چکی ہے۔ ٹکرا رہے ہیں، مر رہے ہیں، وہ بڑبڑایا۔

آج اُسے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ وہ جو کچھ بھی لکھتا ہے سب غلط ہے، تصورات کی حسین آغوش میں لیٹا ہوا وہ تلخ حقیقتوں کے نشتر کی کسک کو بھول جاتا ہے، اُس کی شاعری ایک جائے پناہ گھر ہے، زندگی کے بھوکے درندے سے بھاگ کر چھپنے کی، مگر اُس کے چھپ کر بیٹھ رہنے سے درندے کی بھوک کم تو نہ ہو جائیگی، وہ تو اور بڑھے گی اور ایک دن وہ اُس جائے پناہ کی ہر حفاظتی تدبیر کو توڑتا ہوا اندر داخل ہو جائے گا۔

اُس کے کمزور سے جسم میں درندے کے تیز دانت کھُب جائیں گے اور وہ بے ہوش ہو جائیگا، درد کو دیکھنا تکلیف کا سامنا کرنا تو اُس کی طاقت سے باہر کی بات ہے۔ وہ اپنی موت کا بھی خیر مقدم نہ کر سکے گا۔ موت جو ہر دُکھی روح کے لئے شانتی کا پیغام ہے آج بھی کئی دفعہ اُس نے سوچا کہ اُس کی شاعری نے اُسے بالکل نکما

کر دیا ہے۔ زندگی کی کشمکش سے بہت دور اپنی ہی موت مرجانے کیلئے پھینک دیا ہے وہ اپنے ذہن و دماغ سے
لڑتا ہے چیختا ہے روتا ہے، وہ زندگی کی دوڑ میں حصہ لینا چاہتا ہے لیکن اُس کے ذہنی اور جسمانی جمود
کی بیڑیاں ایکدم جھنجھنا اٹھتیں۔ وہ پھر خاموش ہو جاتا۔ مدافعت اور جرأت کی قوتیں اُس سے چھین لی گئی
تھیں۔ اُس کی شاعری نے اُسے اپنے ہی گھر میں ایک اجنبی بنا دیا ہے۔ اُسکی آنکھیں اب اپنوں ہی کو نہیں پہچان
سکتیں، اُس کے اپنے ہی اُس کی بیوقوفی پر ہنستے ہیں اور وہ اور چڑتا ہے وہ اُس خلیج کو جو اُس کے اور لوگوں کے
درمیان حائل ہے زیادہ وسیع کرنے کیلئے اور پیچھے بھاگتا ہے، اس طرح بھاگتا بھاگتا ایک دن وہ بھی لاشوں کے
اُس بڑے سے ڈھیر پر جا گرے گا اور پھر آسمان میں منڈلاتے ہوئے گدھ۔

چاندنی میں گھلا ملا غبار کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔ چاند زیادہ افسردہ اور مایوس دکھائی دیتا تھا۔ تارے نہ جانے
کن نظروں سے زمین کو گھور رہے تھے۔ تصور کے کاغذی پھولوں پر رنجھنے کی بجائے اب میں انگاروں سے کھیلونگا
طوفان اور کشتی کے تصور کی بجائے خود لہروں سے ٹکروں گا۔ مشاعروں اور جلسوں میں لوگوں کی واہ واہ سے کلکتے
کی گلیوں میں گونجتی ہوئی چیخیں سُننا زیادہ اچھا ہے۔ چیخیں اگرچہ کبھی کبھی سُنی جاتی ہیں تاہم وہ زندگی کا نشان ہیں۔
یہ کہتے کہتے اُس نے تپائی پر رکھی ہوئی کاپی کی طرف دیکھا اور اُس کے صفحوں پر لکھی ہوئی سطریں اُسے وہ بیڑیاں
معلوم ہوئیں جنھوں نے اُس کے دل و دماغ کو جکڑ رکھا تھا۔

اُس نے چاہا وہ بیڑیاں ایک دم ٹوٹ جائیں فوراً ہی اُس نے لالٹین کے شیشے کو ذرا اُٹھایا جو تقریباً سیاہ
ہو چکا تھا اور کاپی کو آگ لگا دی۔ یہ وقتی شعلہ سُلگ سُلگ کر جلنے والی بتی سے زیادہ روشن تھا جس نے شیشہ
کے خول کو سیاہ کر دیا تھا۔

چند ہی لمحوں میں اُس کی بیڑیاں ٹوٹ گئیں، اب وہ آزاد تھا۔ سانسوں کے ساتھ لاش میں بھی حرکت آگئی
تھی۔ چاندنی کا غبار کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔ اور گدھوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وہ اب
زیادہ تُندی سے ایک دوسرے پر جھپٹ رہے تھے۔ ترقی کی راہ پر پڑا ہوا جاں بلب مسافر بھی شاید نہ مرے۔
اتفاقات ہی تو ہیں۔

رُباعی

اِس زخمِ جگر کو سی سکوں گا کیونکر
یہ خون کے گھونٹ پی سکوں گا کیونکر
ہو خون مری آرزوؤں کا پیہم
اِس طرح بتاؤ جی سکوں گا کیونکر

(مرزا یاور علی)

جلد ۸۴ — جون سنہ ۱۹۴۵ء — نمبر ۶

فسانۂ عجائب اور باغ و بہار

ازاویس احمد ادیب ایم۔ اے

"فسانۂ عجائب اور باغ و بہار" کے عنوان سے "زمانہ" کانپور ماہ دسمبر سنہ ۱۹۴۴ء میں ایک مضمون صفحہ ۲۴۱ پر سید ذکی رضا صاحب کا شایع ہوا ہے جس میں صاحب مضمون نے مذکورہ بالا دونوں ادبی کارناموں کی تنقید کی آڑ میں اول الذکر کو آخر الذکر پر ترجیح دینے کی ناکام کوشش کی ہے ان ادبی شہپار ... انے کی ابتدا سے قبل سید صاحب نے یہ لکھا ہے:-

"دونوں کتابیں اُس زمانے کے سیاسی اور معاشر ... سے لئے ہیں۔ ... وار نہیں ہیں ان میں ایک مخصوص ماحول نقشہ ہے، اور موازنہ کا خیال اس وجہ سے نہیں پیدا ہو ... زنا۔ طوطے سے تمام ح ... ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہے دونوں مدرسۂ فکر کی خصوصیات ایک دوسر ... دانش میں طوطے ہی تی رہ گیا ... بیان اور نزاکت خیال پر ہمیشہ نازرہا ہے اور سادگی تحریر اور داخلی پہلو دہلی کے د

فاضل مضمون نگار نے یہ جانتے ہوئے کہ دو کتابیں مختلف ماحول کی علٰحدہ علٰحدہ ہیں زبردستی موازنہ کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بتانا چاہا ... بہار دانش میں طوطے کو ہر وقت اپنے ہمراہ ... یات ... نش کی نقل ہے، یہی انداز انوار سہیلی میں عجب سرور کو میر امن پر فوقیت حاصل ہے اسی مضمون کے صفحہ ۲۴۲ کی تیسری

"ان سب باتوں کے باوجود موازنہ کب جائز ہے جبکہ ایک طبعزاد ا ... سفید دیو کی مدد کرنا (بہار دانش میں ملک زادہ ... تو سرے ہیں مجھوں نے ہر کردار اور ہر واقعہ طبعزاد پیش کیا ہے، کھلا ... دانا) ... کو کتابوں سے مل گئے لیکن سرور نے محنت کی اور کچھ اضافہ بھی ... کا دیوانہ وار حوض میں کود پڑنا (از قصہ حاتم طائی) ... ن کا تالاب میں کود پڑنا)

مذکورۂ بالا عبارت سے یہ بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے کہ مرزا رجب ... کی غرض سے روانہ ہونا۔ دشت ہولناک میں تالاب

کوئی حصّہ انھوں نے کہیں سے نہیں لیا بلکہ میر امّن نے کھانوں، چڑیوں اور لباس کے نام دوسری کتابوں سے لئے ہیں۔ گویا میر امّن ترجمہ کرتے ہوئے بھی سرقہ کے ذمہ دار تھے مگر سرور اس ادبی چوری سے بالکل بری۔ اُنھوں نے اپنا یہ ادبی معجزہ اپنی خداداد ذہانت اور قابلیت کی بنا پر بالکل اورجنل پیش کیا ہے مگر جب ہم "فسانۂ عجائب" کے اجزاء ترکیبی پر غور کرتے ہیں تو سید ذکی رضا صاحب کا یہ دعویٰ بالکل باطل ہو جاتا ہے۔ ان کا مکمل مضمون پڑھنے کے بعد قاری کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ فسانۂ عجائب کی تعریف میں انھوں نے جتنے دعوے کئے ہیں تقریباً سب غلط ہیں۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے سرور کی زبان اور انداز بیان غیر فانی ہے مگر اُنھوں نے اس سلسلہ میں بھی زبردست دھوکا کھایا ہے کیونکہ مقفیٰ و مسجع عبارت کا جو معیار سرور نے قصہ کی ابتدا اور تمہید میں قائم کیا ہے وہ دوران قصہ میں نہ صرف پست بلکہ پست ترین ہوتا گیا ہے اور نتیجۃً انھیں وہی سادہ اور عام فہم زبان استعمال کرنا پڑی ہے جو کہ میر امّن نے لکھی تھی اور جس پر خود سرور نے یوں طنز کیا تھا۔

> "اگر شاہجہاں آباد مسکن اہل زبان، کبھی بیت السلطنت ہندوستان تھا، وہاں چندے بود و باش کرتا، فصیحوں کو تلاش کرتا تو فصاحت کا دم بھرتا جیسا میر امن صاحب نے چار درویش کے قصہ میں بکھیڑا کیا ہے کہ ہم لوگوں کے ذہن دحصہ میں یہ زبان آئی ہے، دلّی کے روڑے ہیں محاورے کے ہاتھ منھ توڑے ہیں، پتھر پڑیں ایسی سمجھ پر۔"

یہ عبارت پڑھکر بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ سرور آسان اور عام فہم زبان لکھنے پر میر امن سے کس قدر برہم ہیں۔

حالانکہ میر امن کو عام فہم اور سادہ زبان لکھنے کی مختلط سُلگ سُلگ سَبا نہیں کیونکہ ماحول کی ضرورت اور دوراندیشی کا تقاضہ ہی یہی تھا۔ قدیم لکیر کے فقیر بننے سے کہ

ب اس میں کوئی جاذبیت باقی تھی۔ سرور قدامت پرست تھے

اور میر امن ترقی پسند۔ تری نیس اُس کی بیڑیاں ٹوٹ گئیں ستی کو چھوڑ کر عام فہم زبان عوام اور کم استعداد انگریز افسروں کے لئے لکھنے، دکی کا عیار کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔ اس سے نزدیک تر آ گئے، ان کا نظریہ زبان سرور سے زیادہ وسیع تھا

سرور اپنا نقطہ تندی سے ایک دوسرے پر جھپٹ پڑ کے لفظی گورکھ دھندوں کی داد لینا چاہتے تھے مگر امّن اُردو زبان کو زیادہ سے زیادہ اتفاقات ہی تو ہیں۔

ہ کالج کے ماحول سے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ اب مقفیٰ و مسجع عبارت کا زمانہ

ہ زبان چاہتے اور پسند کرتے تھے جس میں میر امّن نے ترجمہ کیا ہے۔

ا۔ اُنھوں نے "فسانۂ عجائب" طبعزاد لکھا ہے کسی حد تک صحیح نہیں ہے

اِس زخم جگر کو سی سکوں گا

در بھی واقعات پیش کئے ہیں ان میں معدودے چند کے علاوہ بقیہ سب لئے ہیں ان کو یکجا کرکے اُنھوں نے ایک طبعزاد افسانہ پیش کر دیا۔

ہو خون مری آرزوؤں کا

چھان بین کی جائے تو یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ سرور نے تو دماغ دہلہ

کو اپنے پیش نظر رکھا اور بہت سے واقعات "باغ و بہار" سے اخذ کئے۔ سرور کی دلیری اور جرأت ملاحظہ فرمائیے کہ جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے ان کا کہیں اشارۃً و کنایۃً اعتراف بھی نہیں کیا۔ اگر فسانۂ عجائب اور باغ و بہار کی تاریخ تصنیف پر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ باغ و بہار فسانۂ عجائب سے تقریباً ۲۲ برس پہلے نہ صرف طبع ہو چکی تھی بلکہ شایع بھی ہو چکی تھی یعنی سنہ ۱۸۰۱ء میں اس کا ترجمہ ہوا اور سنہ ۱۸۰۳ء میں یہ زیور طباعت سے آراستہ ہو کر قدردانان ادب کے ہاتھوں میں پہونچی۔ سرور نے فسانۂ عجائب سنہ ۱۸۲۴ء میں لکھی، سرور کو نہ صرف باغ و بہار پڑھنے کا موقع ملا جیسا کہ انکی اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے جو اُنھوں نے میر امن کے انداز بیان کے متعلق لکھی ہے بلکہ اُنھوں نے اُردو کی دیگر کتابیں بھی پڑھی اور ان سے فسانۂ عجائب کی تکمیل کے لئے واقعات کا سرقہ کیا مندرجۂ ذیل تفصیل اس پر کافی روشنی ڈالے گی۔

(۱) فیروز بخت شاہ کا اولاد کی طرف سے نااُمید ہو کر پریشان ہونا سلطنت سے دستبردار ہونا پھر اولاد کا ہونا۔

(۲) جانعالم کا جنگل میں پہونچنا۔ ہرن کا نظر آنا۔ شہزادہ کا اس کا پیچھا کرنا اور وزیر زادے سے بچھڑ جانا۔

(۳) جانعالم کا ایک ہولناک جنگل میں پہونچنا اور چشمہ آب نظر آنا۔

(۴) جانعالم کو پیر مرد کا ملنا اور راستہ بتلانا۔ انجمن آرا کے وطن کو دکھلانا۔ پیر مرد کا جانعالم کو سلانا اور پھر مقررہ مقام پر پہونچا دینا۔

یہ تمام حصّے سرور نے باغ و بہار سے لئے ہیں اس میں بیشتر حصّہ تیسرے درویش کی سیر سے لیا گیا ہے، اب وہ حصّے ملاحظہ فرمائیے جو سرور نے اُردو کے دوسرے قصّوں سے لئے ہیں۔

(۵) جانعالم کا بازار کی طرف گزر ہونا۔ اس کا طوطا خریدنا۔ طوطے سے تمام حالات سُننا اور پھر وطن کو خیرباد کہنا (از پدماوت اور قصہ بہار دانش، راجہ رتن سین پدماوت میں اور بہروز بانو بہار دانش میں طوطے ہی کی وجہ سے مبتلائے عشق ہوتے ہیں اور سفر کی مصیبتیں برداشت کرتے ہیں۔

(۶) جانعالم کا ہر وقت طوطے کو اپنے ہمراہ رکھنا (جہاندار شاہ، قصہ بہار دانش میں طوطے کو ہر وقت اپنے ہمراہ رکھتا ہے)

(۷) فسانۂ عجائب میں جو حکایت دوران قصہ میں پیش کی گئی ہے بہار دانش کی نقل ہے، یہی انداز انوار سہیلی میں بھی موجود ہے۔

(۸) انجمن آرا کا دیو کے قبضہ میں آنا۔ جانعالم کا اس کو رہائی دلوانا۔ سفید دیو کی مدد کرنا (بہار دانش میں ملک زادہ کا دیو ہلاہل سے لڑنا۔ وزیر زادہ کا مدد کرنا اور پری نژاد کو رہائی دلوانا)

(۹) جانعالم کا حوض پر پہونچنا۔ انجمن آرا کی شکل دکھائی دینا۔ اس کا دیوانہ وار حوض میں کود پڑنا (از قصہ حاتم طائی، حاتم طائی کا منیر شامی کی امداد کرنا۔ حسن بانو کے پہلے سوال کے جواب کی غرض سے روانہ ہونا۔ دشت ہولناک میں تالاب نظر آنا۔ اس میں حسین عورت کا برہنہ دکھائی دینا اور حاتم طائی کا تالاب میں کود پڑنا)

(۱۰) جانعالم کا جادوگرنی کے فریب میں آنا۔ اس سے ہم صحبت ہونا۔ نجات حاصل کرنے میں ناکام رہنا (از مثنوی سحر البیان۔ بینظیر کا فرخ کے دام میں گرفتار ہونا، اس سے ہم صحبت ہونا مگر نجات حاصل کرنے میں ناکام رہنا)

(۱۱) جانعالم کا جادوگرنی کے فریب میں آنا (مثنوی سحر البیان کے علاوہ قصہ گل وصنوبر سے لیا گیا ہے کیونکہ الماس روح بخش بد قسمتی سے لطیفہ بانو جادوگرنی کے قبضہ میں آجاتا ہے مگر رہائی میں ناکام رہتا ہے)

(۱۲) جانعالم کا ملکہ مہرنگار کے باغ میں پہونچنا اور عیش و عشرت میں مشغول ہونا (از قصہ گل وصنوبر شہزادہ الماس روح بخش کا حمیدہ بانو سے ملنا) اس کے علاوہ اُردو افسانہ گویوں کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ افسانے کے ہیرو کو متعدد مقامات پر حسین اور خوبصورت عورتوں کے دام فریب میں گرفتار کراتے ہیں۔ اس کے لئے آرایش محفل، بوستان خیال اور داستان امیر حمزہ ملاحظہ ہوں۔

(۱۳) جانعالم کا انجمن آرا کے شہر میں پہونچنا۔ جادوگر کے قبضہ سے اس کو چھڑانا (از داستان امیر حمزہ)

(۱۴) شہزادے کا بندر بننا۔ وزیر زادے کا اپنا قالب چھوڑ کر شہزادے کے قالب میں آنا۔ (از مثنوی پھول بن مصنفہ ابن نشاطی دکنی۔ اس کتاب میں جا بجا قالب کی تبدیلی کا تذکرہ ہے اور ایک شخص کی روح آسانی کے ساتھ دوسرے کے جسم میں حلول کرتی رہتی ہے) قصہ الف لیلہ میں بھی آدمی کا بندر اور بکری بننا ملاحظہ ہو)

(۱۵) جانعالم، انجمن آرا اور ملکہ مہرنگار کا ایک ساتھ جانا۔ جادوگرنی کا جادو سے کام لینا اور ان کو نصف پتھر کا جادو کے زور سے بنا دینا (از گل بکاؤلی یا مذہب عشق، راجہ اندر کی بد دعا سے بکاؤلی کا نصف پتھر کا ہو جانا)

(۱۶) جانعالم، انجمن آرا اور مہرنگار کا جہاز پر سوار ہونا اور جہاز کا تباہ ہونا (از الف لیلہ)

(۱۷) جانعالم کا طوطے کے ذریعہ سے انجمن آرا اور مہرنگار سے ملنا (از بہار دانش، اس میں بھی ہیرو اور ہیروئن کی ملاقات کا باعث طوطا بنتا ہے) قصہ نل دمن بھی ملاحظہ ہو۔ نل دمن کی تمام تر خط و کتابت طوطے ہی کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا حصوں کے علاوہ اور بھی بہت سے ایسے حصے ہیں جن کو سرور نے اُردو کی دوسری نادر کتابوں سے لیکر یکجا کر دیا ہے اس طرح وہ ایک افسانے کو وجود میں لے آئے ہیں۔ فسانۂ عجائب کے ماخذ پر غور کرنے کے بعد یہ بھی دیکھنا ہے کہ یہ دونوں افسانے اپنے زمانے کی معاشرتی کیفیت بھی پیش کرتے ہیں یا نہیں۔ صاحب مضمون کے خیال کے مطابق ان میں ایک مخصوص ماحول کا نقشہ موجود ہے۔ یہ خیال فسانۂ عجائب کے متعلق تو صحیح ہو سکتا ہے کیونکہ سرور نے فسانۂ عجائب میں معاشرتی ماحول صرف اودھ تک محدود کر دیا ہے اور اس میں کل ہندوستانیوں کے اطوار زندگی پیش نہیں کئے گر میر امن کی باغ و بہار پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ میر امن کو گردش زمانے کی بدولت ہندوستان کے مختلف کوچوں کی خاک چھاننا پڑی۔ اس وجہ سے ان کو ہندوستان کے مختلف گوشوں کے ہندوستانیوں کی عام معاشرتی حالت دیکھنے کا موقع ملا۔ یہی وجہ ہے کہ میر امن کا نقطۂ نظر سرور کے مقابلہ میں زیادہ وسیع ہے۔ میر امن نے نہ صرف عوام کی معاشرتی حالت پیش کی ہے

بلکہ خواص کے حالات زندگی بھی پیش کئے ہیں۔ ایسے واقعات جن سے شہزادوں اور امیرزادوں کو رحم دانصاف اور سخاوت وفیاضی کی طرف رجوع کیا ہے بکثرت موجود ہیں۔ شاہانہ انتظامات کے بارے میں بھی باغ و بہار میں تفصیلات موجود ہیں۔ بادشاہ سال میں آٹھ ماہ دارالسلطنت سے باہر رہتا تھا اور انتظام سلطنت کی جانچ پڑتال مختلف صورتوں سے کیا کرتا تھا۔ شاہی محلوں میں مسلح عورتیں پہرہ دار ہوا کرتی تھیں۔ باورچی خانے کا انتظام شہزادیوں کے سپرد ہوا کرتا تھا، خواجہ سرا محلوں اور زنانخانوں میں ملازم رکھے جاتے تھے، وہی شہزادیوں کے محرم راز ہوا کرتے تھے اور ضرورت کے وقت انھیں سے مدد لی جاتی تھی۔ بادشاہ ان پر بھروسہ نہ کرتے تھے۔ ان کے زیادہ معتبر حبشی غلام ہوا کرتے تھے، جو ضرورت کے وقت اپنی جان تک فدا کرنے کے لئے تیار رہتے تھے، بادشاہ تعلیم کے حامی ہوتے تھے وہ شہزادیوں تک کو دینی اور دنیاوی تعلیم دلواتے تھے اور انھیں مردانہ کمالات کا حامل دیکھنا چاہتے تھے تاکہ ضرورت کے وقت وہ بھی اپنے جوہر دکھا سکیں، شہزادیاں اور امیرزادیاں پردہ ضرور کرتی تھیں مگر اسقدر سختی سے نہیں کہ وہ ضرورت کے اوقات میں بھی پردہ میں بیٹھی رہیں، میرامن نے تو یہاں تک بتایا ہے کہ شہزادیاں اور امیرزادیاں کس کس وقت بھاری اور قیمتی جوڑے پہنتی تھیں اور وہ کس وقت سادہ لباس زیب تن کرتی تھیں۔ انھیں اپنے شوہروں کے انتخاب میں بھی کامل آزادی ہوتی تھی، دوسرے الفاظ اس کو یوں کہہ لیجئے کہ وہ اپنے طرز معاشرت میں کسی حد تک پابند اور کسی حد تک آزاد ہوتی تھیں۔

عوام کی معاشرتی زندگی کے مکمل نمونے باغ و بہار میں جابجا موجود ہیں۔ مجموعی حیثیت سے اس عہد کے لوگوں کی اخلاقی، سماجی، مذہبی اور معاشرتی زندگی کے پورے پورے موجود ہیں۔ بچوں کی پرورش و نگہداشت کی طرف خاص توجہ دی جاتی تھی نہ صرف خواص بلکہ عوام بھی بچوں کے پیدا ہوتے ہی نجومیوں اور رمالوں سے ان کا زائچہ تیار کراتے تھے اور انکی آئندہ زندگی کا حال دریافت کرتے تھے، ان کی ہدایتوں کے مطابق بچوں کی پرورش ہوتی تھی، علم نجوم پر عام لوگوں کو بہت اعتقاد ہوتا تھا۔ شادی بیاہ کی تاریخوں کے مقرر کرنے میں بھی ان سے مدد لی جاتی تھی۔ ان کے علاوہ نجومی اور رمال سے مرض کی حالت دریافت کی جاتی تھی اور لاعلاج مریضوں کو عاملوں اور سیانوں کے سپرد کیا جاتا تھا جو ان کا تعویذ اور گنڈوں کے ذریعہ سے علاج کرتے تھے، ان کو اس عہد کے لوگوں کے اعتقادات کہئے یا اوہامات مگر نجومی، رمال، پنڈت، سیانے اور عامل ان کی زندگی کا جزو اعظم تھے اور زندگی کے ہر اہم کام میں ان کو دخل تھا، صدقے، خیرات کے علاوہ مکانات کی تعمیر میں بھی ان کی رائے لی جاتی تھی۔ اس عہد کے لوگ رسوم کے بھی بہت پابند ہوتے تھے، جب کبھی کوئی سفر پر جاتا تھا تو اس کے بازو پر امام ضامن کا پیسہ باندھا جاتا تھا اور سفر سے واپس آنے پر تیل، ماش اور ٹکے اس پر سے نچھاور کئے جاتے تھے ایسے موقعوں پر جبکہ کسی کو دشواریاں پیش آتی تھیں تو بزرگوں، سادھوؤں اور درویشوں کی مدد لی جاتی تھی کیونکہ عام اعتقاد یہ تھا کہ بزرگان دین مصائب کے موقعوں کی دستگیری کے لئے ہیں۔ عوام میں شراب بہت رائج تھی۔ مسلمانوں کا امیر طبقہ شراب کو بہت پسند کرتا تھا۔ خوشی کے موقعوں پر اس کا خاص استعمال ہوتا تھا۔ اکثر

اوقات اس قدر شراب پی جاتی تھی کہ مدہوش ہو جاتے تھے۔ مہمان نوازی کا ایک جزو شراب تھی۔ یوں تو عام طور پر لوگ مہمان نواز ہوا کرتے تھے اور کسی مہمان کو تین دن سے قبل رخصت ہونے کی اجازت نہ دیتے تھے مگر ذرا خوشحال طبقہ مہمانوں کی خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتا تھا۔ ان کی خوشنودی اور دلجوئی کا خیال ہر وقت پیش نظر رہتا تھا ان کو باقاعدہ جوڑے تبدیل کرائے جاتے تھے اور ان کی دلبستگی کی خاطر عیش و عشرت کی محفلیں آراستہ کی جاتی تھیں جن میں گانے بجانے والی لڑکیاں انتہائی بے تکلفی کے ساتھ گاتی اور ناچتی تھیں۔ مذہبی معاملات میں لوگ بہت سخت ہوتے تھے، غیر قوموں کی عورتوں کو اپنے مذہب میں شریک کرنے کا عام رواج تھا۔ ان سے شادیاں بھی کی جاتی تھیں۔ غرض عوام کی زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جو ہمیں باغ و بہار میں نہ ملتا ہو، اس لحاظ سے بھی باغ و بہار کو فسانۂ عجائب پر فوقیت حاصل ہے۔

ذکی رضا صاحب نے میرامّن کی عام فہم زبان کو "ہندی" بتایا ہے اور یہ تحریر کیا ہے:۔

"ان تمام خوبیوں کے باوجود کچھ خامیاں بھی ایسی ہیں جو نظر انداز نہیں کی جا سکتیں، میرامّن ہندی پسند تحریر کو انتہا پر پہونچانے کی کوشش میں بصرہ کی شہزادی سے ہندی دوہے پڑھواتے ہیں اور سرور اپنی رنگینی تحریر میں اس قدر اُلجھ جاتے ہیں کہ جب ہم اس جملہ کو پڑھتے ہیں کہ "بالائی نور اکی دوکان پر جب نظر آئی بے قند و شکر، شکر کر، نورٌ علیٰ نور، کہ کر چھری سے کاٹ کر کھائی۔"

ذکی رضا صاحب نے جس زبان کو ہندی کہا ہے وہی در اصل عام فہم زبان اُردو ہے اس زبان کو ہندی کہنا سراسر ناانصافی ہے۔ ہندی اور اُردو کا نزاعی مسئلہ فورٹ ولیم کالج سے شروع ہوتا ہے جبکہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے للو لال جی کو بلوا کر اس سے سنسکرت آمیز زبان میں سنگھاسن بتیسی لکھوائی۔ خود انگریز اس زبان کو "ہندوستانی" کہتے تھے چنانچہ اس زمانے میں قواعد اُردو پر جتنی بھی کتابیں لکھی گئی ہیں ان کو اُنھوں نے "ہندوستانی گرامر" کے نام سے پکارا ہے، یہ تھی وہ زبان جس میں دنیا کی زیادہ سے زیادہ زبانوں کے الفاظ موجود تھے اور شامل ہوتے جا رہے تھے اور جس کو لشکر کی زبان کہا جاتا تھا، یہ بھاشا نہ تھی بلکہ ایک مخلوط زبان۔ اس میں اگر میرامّن نے وہ دوہے استعمال کئے جو اس عہد کی بھاشا میں موجود تھے تو کوئی ادبی گناہ نہیں کیا، انھوں نے اُردو کو اور وسیع بنانے کی کوشش کی، لشکر کی زبان جس میں عربی، فارسی، ترکی، پرتگالی، اطالوی، انگریزی اور دیگر زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں اگر ہندی دوہوں کی حامل ہو جاتی ہے تو اس کے سرمایے میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ میرامّن کی ہندی نوازی نہ تھی بلکہ اپنی زبان کو وسیع اور وسیع تر بنانے کی کوشش تھی۔ اس کو تنگ نظری سے جرم قرار دینا زبردست غلطی ہے، یہ میرامّن کی دور اندیشی تھی کہ اس نے ایک ایسی زبان پیش کی جس کو ہندوستان کی ہندوستانی ہونے پر بجا طور سے ناز ہو سکتا ہے۔ اگر صاحب مضمون کو یہ اعتراض ہے کہ بصرہ کی شہزادی کی زبان پر ہندی دوہے کیوں آئے، تو انکا اعتراض سر آنکھوں

لہ اُردو زبان کی نئی تحقیق، مصنفہ اویس احمد ادیب ملاحظہ ہو۔

ہے؟ مگر مقامی رنگ (LOCAL COLOUR) قصّے کی کامیابی کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اگر یہ اعتراض باغ و بہار پر صحیح تصور کر لیا جائے تو اُردو زبان وادب کا وہ بیش بہا سرمایہ جو مراثی پر مشتمل ہے بیکار اور ناکارہ ہو جاتا ہے کیونکہ ان میں واقعات کربلا پیش کئے گئے ہیں جو صرف اہل عرب سے متعلق تھے ان میں جو منظر کشی کی گئی ہے وہ ہندوستان کے مناظر پر منحصر ہے۔ صبح، دوپہر، شام کے تمامتر مناظر ہندوستانی ہیں۔ گفتگو کا انداز، ملبوسات ہیں، اور احساسات وجذبات بالکل ہندوستان کے ہیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ مرثیوں میں ہندوستانی فضا پیدا کر کے انھیں ہندوستانیوں کے لئے مؤثر اور قابل قبول بنانا تھا۔ اگر یہ مقامی رنگ پیدا نہ کیا جاتا اور واقعات کربلا کو ہندوستانی جذبات واحساسات کو مدنظر رکھ کر مرثیوں میں پیش نہ کیا جاتا تو یقیناً مراثی بیکار، فضول اور لغوگوئی سے زیادہ اہمیت نہ رکھتے، بالکل اسی طرح بصرہ کی شہزادی سے دوہے کہلوائے ہیں تاکہ ہندوستانیوں کو یہ محسوس ہو کہ فضا اور احول وہی ہے جسمیں وہ خود زندگی بسر کر رہے ہیں اور جس میں صاحب مضمون نے زندگی گزاری ہے، یہ میر امّن کی دوراندیشی تھی کہ اُنھوں نے یہ بخوبی محسوس کر لیا تھا کہ مقامی رنگ ہر قصہ کی کامیابی کے لئے ضروری ہے۔ میر امّن کے وہ بیانات جن میں وہ دلّی کی عمارتیں، دلّی کے طرز معاشرت، وضع قطع اور کھانے پیش کرتے ہیں، ان کے اس ترجمہ کا بہترین حصہ ہیں اور ان ہی کی بدولت آج تک یہ کتاب ہندوستانیوں کو غیر مانوس نہیں معلوم ہوتی۔ اس میں کہیں بھی بدیشی فضا محسوس نہیں ہوتی، اُنھوں نے اس کو اس طرح اپنایا کہ اس میں تمامتر ہندوستانی فضا پیدا ہو گئی ہے صرف نام غیر ملکی رہ گئے ہیں، یہ دراصل میر امّن کی خامی نہیں بلکہ ان کے فن کا کمال ہے، اس لحاظ سے میر امّن اور میر انیسؔ دونوں دوراندیش تھے۔ جہانتک "فسانۂ عجائب" کا تعلق ہے اس میں بھی یہ خامی نہیں کہ بالائی چھُری سے کاٹ کر کھائی، یا لائی چھُری سے کاٹ کر فروخت کیا جاتا ہے۔ اکثر مقامات پر حلوائی اس کے قتلے یا ٹکڑے چھُری ہی سے کرتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں اتنا اور عرض کرنا پڑے گا کہ اگر میر امّن نے باغ و بہار کو فارسی سے ہو بہو اُردو میں منتقل کر لیا ہے اور اس میں یہ دوہا موجود ہو، تو میر امّن کسی طرح اس کے ملزم نہیں ہو سکتے۔ اور اگر میر امّن نے ترجمہ کرتے وقت "آزاد ترجمہ" کو پیش نظر رکھا ہے تو میر امّن کو صرف مترجم نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ایسے ترجمہ میں تصنیف کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ باغ و بہار میں دراصل تصنیف کی شان موجود ہے گو وہ ترجمہ ضرور ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسمیں مقامی رنگ بدرجۂ اتم موجود ہے، ذکی رضا صاحب کا یہ جملہ کہ کھانوں، چڑیوں، اور لباس کے نام امن کو کتابوں سے مل گئے اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ صاحب مضمون کو بھی اعتراف ہے کہ میر امّن نے جابجا ذاتی تصرف سے کام لیا ہے ورنہ ان تمام چیزوں کے تذکرہ سے میر امّن کا کیا تعلق۔ ایک طرف تو میر امّن کو صرف مترجم قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف مجرم، مگر حقیقت یہی ہے کہ میر امّن نے اس ترجمہ کو تصنیف کے درجہ پر پہنچا دیا ہے۔ "فسانۂ عجائب" اور "باغ و بہار" دونوں داستان عشق ہیں مگر ان میں جگہ جگہ مافوق العادت عناصر سے مدد لی گئی ہے اور یہ اُردو کے قدیم افسانوں کا ایک خاص رنگ تھا

کہ مصنف اپنے قصہ کے ہیرو یا ہیروئن کو مصائب کا شکار بنا کر کسی بزرگ، درویش یا فقیر کی مدد سے اسکی مشکلات حل کرا دیتے تھے، صاحب مضمون نے "فوق العادت عنصر" کا بدل (UN-NATURAL ELEMENT) لکھا ہے یہ صحیح نہیں ہے اس کا صحیح بدل SUPERHUMAN ہے (UN-NATURAL) کے معنی غیر فطری کے ہیں۔ اگر وہ صرف ان ہی عناصر کو لیتے ہیں جو فطرت سے مطابقت نہیں کرتے تو یہ استعمال صحیح ہے مگر مافوق العادت اور مافوق الفطرت عناصر کے لئے غیر فطری کا استعمال صحیح اور جائز نہیں۔

از جناب کیلاش چندر ملشا آیق ترنگامی بی اے

جنونِ فتنہ ساماں کی فراوانی نہیں جاتی
مرے سر سے ہوائے خاک دامانی نہیں جاتی

حقیقت حسنِ عالم سوز کی جانی نہیں جاتی
یہ ہر جانب نظر آتی ہے پہچانی نہیں جاتی

ہمیں ساجد، ہمیں سجدہ، ہمیں مسجودِ عالم ہیں
کسی کے آستاں تک اپنی پیشانی نہیں جاتی

گنہگارِ محبت دل اگر ہوتا ہے ہونے دو
کہ سمجھانے سے بھی نادانوں کی نادانی نہیں جاتی

نہ جانے ہو گیا ہوں کیا سے کیا دنیا کی نظروں میں
یہ عالم ہے کہ میری شکل پہچانی نہیں جاتی

یہ کیا پردہ نشینی ہے کہ ہے بے پردگی قائم
یہ کیسی جامہ پوشی ہے کہ عریانی نہیں جاتی

حجاب آگیں نظر ہو، یا ہو عالم بے حجابی کا
جمالِ خوش ادا کی جلوہ سامانی نہیں جاتی

گزر جاتا نہیں جبتک حدودِ ہوش سے کوئی
کسی کی بندگی بھی بندگی مانی نہیں جاتی

بہت مشہور ہے رسوائیوں کی آڑ میں شائق
یہ کیا شکلِ عنایت ہے کہ پہچانی نہیں جاتی

جذبات آثر

از جناب خاں بہادر مرزا جعفر علی صاحب آثر وزیر اعظم ریاست کشمیر

ہزار حسن سے چمکا ستارۂ سحری نہ تیرا ناز و کرشمہ نہ تیری عشوہ گری

شراب عشق بھری دل کے آبگینے میں کمال شیشہ گری پھر کمال خوش نظری

فغاں تو لب پہ نہ آئی، مگر سحر ہوتے فسانۂ شب غم کہہ گئی مژہ کی تری

یہ بار بار رہا چشم مست پر دھوکا کہ زیر سایۂ مژگاں ہے محو خواب پری

جہانِ ہوش کے سب مرحلے تمام ہوئے نسیم شوق کے جھونکے ہیں اور بے خبری

دعا سے ہاتھ اٹھایا کہ جب اٹھایا ہاتھ زباں پہ آنے لگے شکوہ ہائے بے اثری

بڑے نصیب سے ملتا ہے جس کو ملتا ہے وہ زخم جسکی ہو تیری مژہ سے بخیہ گری

چمن ہے تیرا تصور، بہار تیری یاد گل مراد سے رہتی ہے میری گود بھری

یہ کہہ رہا تھا آثر فلسفی دیوانہ

جنوں جنوں ہی نہیں جب ہے قید جامہ دری

زینتِ حیات

از جناب رَوش صدیقی صاحب

مستیِ عشق بے حضور نہیں — بیخودی آگہی سے دُور نہیں

کیفِ غم زینتِ حیات سہی — مگر اظہارِ غم ضرور نہیں

اُس کے اندازِ بے نیازی میں — حُسن ہی حُسن ہے غرور نہیں

آخرش، نشۂ سکوں کب تک — زندگی درد ہے سرور نہیں

اور ہی کچھ ہے رازِ بیتابی — عشق اتنا تو ناصبور نہیں

ہے نظر بھی، شریکِ نظارہ — اعتبارات کا قصور نہیں

چہرہ افروزِ کائنات سہی — بادۂ ہوش میں سرور نہیں

بندگی! آہ زاہدِ ناداں — داغِ دل ہے جبیں کا نور نہیں

یہ کسی کا حجابِ روز افزوں — کیا مرے عشق کا ظہور نہیں

رَوش اک خواب ہی سہی لیکن — تیری چشمِ کرم سے دور نہیں

ناسکا (नासिका) بینی

सोभा को सकेलि ऊंची बोलि बांधी बलभद्र राख्यो समसोधन कुलंनको रोस है। दीपति को दीप मुख दीप को सुमेर यह मृदु मुख सारस को सिफा- कन्द जोस है॥ कपल तरोवर की कलिका सुगंध फूली उपमा अनूपम की बिविध निसोस है। तिल को सुमन है कै नासिका तरुनि तेरी सुन की सरन कै सौरभ को कोस है॥

دلا ویزی کو اکٹھا کرکے ایک اونچی حد بنا دی ہے تاکہ سمند چشم کا غصہ برابر رہے۔ ضیائے حسن کی شمع ہے یا جزیرۂ رخِ تاباں کا پہاڑ ہے۔ یا رخِ دلفریب کے کنول کی جڑ ابھر آئی ہے۔ کَلپ تَرُوَر [سورگ میں ایک درخت کہ جس سے جو خواہش کی جائے پوری کر دیتا ہے] کی خوشبو دار کلی نکلی ہے۔ بے شک اس کی بے انتہا، بے نظیر تشبیہات ہیں۔ تل کا پھول ہے یا نوخیز کی ناک، فرشتوں کی آرامگاہ ہے یا طبلۂ عطار۔

ناسکا بیدھ (नासिका वेध) سوراخِ بینی

सोभा सुख सदन को बातायन बलभद्र मानो महा मोहनी पपीलका को गेह है। मैन पंचबान को छबीलो छिद्र छाजत है देखिबे को देह मे अदेह जू की देह है॥ पिय मन रोकिवे की निडर किली को रंध्र सुखमा मधुर को रुचिर जासो नेह है। मैन के मवास में धनुर्धर को मोरचा है कैधौं बाम नासिका में बेसर को बेह है॥

قصرِ لطف و زیبائی کا غرفہ ہے یا بہت ہی دل موہنے والا چیونٹیوں کا بِل ہے۔ تیر انداز کامدیو کا خوبصورت نشانہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غیر مجسّم [کامدیو کا ایک نام] کا جسم ہے۔ پیتم کا دل پھانسنے میں بیباک کیلی کا

سوراخ جس سے دلفریب زیبائی کو محبت ہے۔ کامدیو کے قلعہ میں تیر انداز کا مورچہ ہے یا اس مہ جبین کی ناک میں بلاق کے لئے سوراخ۔

ناسکا بھوشن (नासिकाभूषण) زیور بینی

कोऊ कहै नाक हासी कोऊ मनमथ फांसी कोऊ कहै देवमाया चक्र सो बनायो है। मुकुता अनूप लाल चूनी छबि रूप नथ कंचन की तार कैधों सुघर गढ़ायों है॥ दीप जीत सुकजीत चंपक कली को जीत नासिका बिजय जय कबि पै पढ़ायो है। सील को सुजस तीन लोक को सोहाग निज नैन में पिरोय मैन भूखन दिखायो है॥

کوئی کہتا ہے کہ ناک ہنسی ہے، کوئی کہتا ہے۔ کامدیو کی پھانسی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ "دیو مایا" (ایشور کی قدرت جو فریب نظر بن کر انسان کو دام دنیا میں پھنساتی ہے) نے چکر بنایا ہے۔ اُس خوش سلیقہ نے موتی، لعل، چنّی اور زیبائی حُسن کو سونے کے تار میں پرو کر نتھ بنوائی ہے۔ ناک نے شمع، طوطی، اور چمپا کی کلی پر فتح حاصل کر کے شاعر کو اپنا قصیدۂ کامرانی پڑھنے کیلئے مجبور کیا ہے کامدیو نے خوش مزاجی کی شہرت اور تینوں عالم کی رونق و زینت کو اپنی آنکھ میں پرو کر ایک زیور بنایا اور دکھایا ہے۔

نتھ موتی (नथमोती) نتھ کے موتی

छाड्यो जल सागर बिधायो तन आप आय अधर के बीच रह्यो और ना चाहत है। बिधि के संजोग बस आनि पर खोरा सर वन्यो है बनाव मनि कंचन सहित है॥ पूरब प्रताप चन्द पायो है मुखारबिन्द एतो कहा लहै कन्त जेतो तू लहत है। प्यारी के बदन पै मदन जू को मद पिये मोती मतवारो सदा झूमत रहत है॥

سمندر چھوڑا، آپ آکر اپنا بدن چھدوایا، ہونٹوں کے درمیان قیام کیا۔ اب کوئی خواہش باقی نہیں ہے۔ ناگہانی کے چنگل میں پڑ کر سمندر سے جدا ہو کر لعل اور کندن کی صحبت میں پہنچ گیا۔ مینا بار بدر کامل ہا سے مل گیا ہے۔ کنول سے چہرے کو جتنا یہ دیکھتا ہے پیتم کو بھی دیکھنا نصیب نہیں ہوتی سرشار بادۂ حسن ہو کر متوالوں کی طرح ہمیشہ اس نازنین کے چہرے پر پڑا جھومتا ہے۔

لوچن (लोचन) چشم فتاں

पिय मनवृत्त कैधों प्रेम रस सूत कैधों भंवर अभूत वपु बास के सुरंग है।

चितयत चहुं ओर पीतम के चित्त चोर चन्द के चकोर किधों केसव कुरंग हैं। मात मद भजन हैं खीलिबे के खंजन की रंजन कुंवर कामदेव के तुरंग हैं। सोभा सर लीन मीन कुवल परस भीन नलिन नवीन किधों नैन बहु रंग हैं ॥

پیتم کے دل کے قاصد، محبت کے رتھ کے رتھ بان، ملکِ حسن کے عدیم المثال خوش رنگ بھونرے ہیں۔ چاروں طرف دیکھتے ہیں، پیتم دل کا چرا لیتے ہیں، چاند کے چکور ہیں۔ ہرن ہیں۔ کلام کا غرور خاک میں ملانے والے، کھیلتے ہوئے مولے ہیں یا مدیو کے من موہنے والے گھوڑے ہیں۔ دریائے حسن میں ڈوبی ہوئی مچھلیاں یا نیا کنول ہے۔ جس پر اوس پڑی ہوئی ہے۔ یا رنگ برنگی آنکھیں ہیں۔

सिपर सुंपूतरी कृपान कल कज्जल त्यों दल बरुनीन के छबीले छैल छाजे हैं। कहे पदमाकर न जानी जाति कौन पै धौं भौंहन के धनुख चितौन सर साजे हैं ॥ घेरदार घूंघट घटा के छांहगीर तेरे मदन वज़ीर के लियई मंजु माजे हैं। बखत बुलन्द मुख चन्द के तखत पर चारु चख चंचल चकत्ता है बिराजे हैं ॥

خوبصورت پتلیوں کی سپر، دلفریب کاجل کی تلوار، پلکوں کی فوج لے کر مہ جبین نکلا ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ کس کو کمانِ ابرو سے تیرِ نظارہ مار کر بسمل کیا جائیگا۔ گھیر دار گھونگھٹ کر چھتری کے سائے میں وزیر کامدیو کے لئے ایک دلاویز نشست بنائی گئی ہے۔ بلند طالع تختِ رخِ ماہ پر خوبصورت آنکھیں چغتہ بنکر بیٹھی ہیں۔

उदासी रहति अरबिन्दन की आभा महबूबी मृग छौनन की छाम करियुत है। दूबी बन बीथिन चकोर चारुताई मनसूबी तुरगंन की तमाम करियुत है ॥ डूबी जल जोरन सो मीन बरजोरी सोभ भौंर मगरूरी बदनाम करियुत है। देखि देखि तेरी अंखियान की अजोबी प्यारी खूबी खंजरीटन की खाम करियुत है ॥

کنولوں کی رونق افسردہ خاطر رہتی ہے، غزالوں کی محبوبی پر اوس سی پڑی رہتی ہے۔ چکور جنگل کے راستوں میں اپنی خوش ادائی لیکر چھپ گیا۔ گھوڑوں کے تمام شوخی دکھانے کے منصوبے خاک میں مل گئے مچھلی ان کے دور دورہ میں پانی میں ڈوب مری۔ ان کی دلاویزی نے بھونروں کا غرور گرد کر دیا۔ پیاری تیری آنکھوں کا انوکھا پن دیکھ دیکھ کر ممولوں کی خوبصورتی نگاہوں سے گری جاتی ہے۔

अमी हलाहल मद भरे, सेत स्याम रतनार । जियत मरत झुकि झुकि परत, जिह चितवत एक बार ॥

ان میں آبحیات ازہر ہلاہل اور شراب بھری ہوئی، سفید، سیاہ اور سرخ ہیں - جو ایک بار دیکھ لیتا ہے (یا جسکو وہ ایک بار دیکھ لیتا ہے) وہ جیتا، مرتا اور جھک جھک پڑتا ہے -

انجن (अंजन) سرمۂ دنبالہ دار

रेमन रीति बिचित्र यह, तिय नैनन की चेत । बिष काजर निज खाय के, जिय औरन को लेत ॥

اے دل! یہ عجیب دغریب رسم ہے کہ اس مہ جبین کی آنکھیں خود کاجل کا زہر کھا کر اوروں کی جان لیتی ہیں -

राते डोरन ते लसत चख, चंचल इहि भाय ।
मनु बिबि पूना अरुन में खंजन बांध्यो आय ॥

چنچل آنکھیں سُرخ ڈوروں کی وجہ سے ایسی معلوم ہوتی ہیں - گویا دو سُرخ باداموں میں ممولا لاکر باندھ دیے ہیں -

برُنی (बरुनी) سنانِ مژگان

केधों द्दग सागर के आस पास स्यामताई ताही के ये अंकुर उलाहि दूति आदे हैं। केधों प्रम क्यारी जुग ताके ये चहुंधा रची नील मनि ससने की आरि दुरखडाढ़े हैं ॥ सूरति सुकवि तरुनी की बरुनीन होवे मेरे मन आवे ये बिचार गाढ़े हैं। जेई जे निहारे मन तिन के पकरवे की देखो इन नैनन हजार हाथ काढे हैं ॥

بحر چشم کے اردگرد سیاہی ہے - اسی کے انکُروں نے نکل کر روشنی میں اضافہ کیا ہے - محبت کی دو کیاریاں ہیں جن کے چاروں طرف نیلم جڑے ہیں یا بہت ہی تکلیف دہ تیروں کی باڑھیں - اس نوخیز کی مژگاں نہیں ہیں، سمجھ میں یہ آتا ہے کہ جو لوگ ان کی طرف دیکھیں ان کے دلوں کو گرفتار کرنے کے لئے چشم سفاک نے ہزاروں ہاتھ نکالے ہیں -

بھرکُٹی (भृकुटी) تیغ ابرو

जे बिन पनच बिन कर की कसीस चलत दूसारे यह जिन को प्रमान है।

आरिबन उड़न्ता जाय उर में करत घाय परत न देरवी पीर करत अमान हैं ॥ बंक अवलोकन की बानि औरई बिधान कज्जल कलित जामें जहर समान हैं । तासों बरबस बेधें मेरे चित चंचल को प्यारी तेरी भौ हैं कैरसो कहर कमान हैं ॥

جن کی یہ حالت ہے کہ بغیر رودے اور ہاتھ سے کھینچنے کے اشارہ پر چلتے ہیں۔ آنکھوں سے اڑ کر سینے میں پہنچے اور اسے زخمی کر دیتے ہیں۔ گر نظر نہیں آتے، بے انتہا درد پیدا کر دیتے ہیں۔ ترچھی نظروں سے دیکھنے کا عجب انداز ہے۔ ان میں کاجل کا جل نہیں زہر بھرا ہے۔ زبردستی میرے بے قرار دل کے پار ہوکے جاتے ہیں۔ پیاری تیرے ابرو ہیں یا قہر کی کمانیں ہیں۔

بھال (भाल) جبینِ منور

बेनी भानु तरवत के रूप को बरवत यह संभु राज लरवत भंडार काम माल को। आनद को कन्द कैधों सरद को चन्द लसे दामिनी अमंद के किनारो सुधा नाल को ॥ मोहिबे को जंत्र कैधों कामरूप को मंत्र बिधि रच्यो है स्वतंत्र मनहरन गोपाल को। अति ही विसाल कैधों जोतिन को जाल यह प्यारी तेरो भाल है हरैया लाल साल को ॥

چولی کے لئے چمکدار تخت، حسن کا طالع بیدار، متاع عشرت کا خزانہ۔ لطف و راحت کا گنجینہ، موسم رما کا ماہتاب، چشمہ آب بقا کا کنارہ، موہنے کے لئے تعویذ، ملک کا مروپ کا جادو، صانع نے اپنی مرضی سے منموہن کی گرفتاری دل کے لئے بنایا ہے۔ بہت ہی کشادہ، اشعۂ انوار کا بنا ہوا دام۔ پیاری تیری پیشانی سرخ دوشالے کو مات کرتی ہے۔

بھال بند (भाल बिन्दु) خالِ پیشانی

आज मुख चन्द पर राजत रुचिर बिन्दु सोई ब्रज चन्द को बिकावन सिताब को। छाजति छबीली छवि बरनि न जाय मोंपे हरनी हितोजन के हिय को हिताब की ॥ रति की न रंभा की न सची उर बसी की न आर २ डारियत उपमा किताब की। गालिब गुलाब की न पंकज के आब की रही न आफ़ताब की न ताब माहताब की ॥

کن رخ ماہ پر خوبصورت بندی لگی ہوئی ہے۔ یہ کنھیا جی کا دل چھین لے گی۔ یہ پیاری پیاری زیبائی تصویر

ہے - اس کا بیان ممکن نہیں - عشاق کا دل ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے - رتی ، رمبھا ، سچی اور - اُرؔوسی (حوروں
کے نام) کا کتابوں میں ذکر ہے - مگر ان سے تشبیہ دینا بیکار ہے - نہ گلاب کی ، نہ کنول کی ، نہ مہر و ماہ کی ، کسی کی آب
و تاب اس پر غالب نہ آئی -

سیتلا داگ (सीतल दाग) چیچک کے داغ

भाग भरे आनन अनूप दाग़ सीतला के देव अनुराग कि किपा से झमकत हैं।
नज़र निगोडिन की गड़ि गड़ि गाड़े परे आछे कारि पैन दीठ लोभ लचकत हैं॥
जोबन किसान सुख खेत रुप बीज बोयो बीज भरे सुन्दन अमोल दमकत हैं।
बदन के बेझे पै मदन कमनैती के चोटारे सर चोटन चटा से चमकत हैं॥

خوش بخت ، خوبصورت چہرے پر چیچک کے داغ اس طرح لطف دے رہے ہیں جیسے تخم الفت چمکتا ہے -
کم بختوں نے گھور گھور کر گڑھے ڈال دیئے - نظر ان میں جا جا کر وہیں رہ جاتی ہے - کاشت کار شباب نے کشت
رخ میں تخم حسن بوئے ہیں - بجلی بھرے ہوئے بے بہا قطرات دمک رہے ہیں - ہدف رخ پر تیر انداز کا مدیو کے
گھایل کرنے والے تیروں کے نشانے بجلی کی طرح چمک رہے ہیں -

کیش (केश) موئے عنبریں -

लामे लहकारे सटकारे सुकमारे कारे मृगमद धारे मरवचूल के से तार
हैं। तम के निवास कैधों तामस प्रकास के सिंगारके सरोवर में
सुथरे सेवार हैं ॥ मार सिरमौर के मुबारक ये मौरें कैधों चातुरी के
चौरं मन में चक के सार हैं। ससि के समीप कैधों राहु की रसन सी
है नागिन के बार के सोहागिन के बार हैं ॥

لمبے لٹکتے ، لہراتے ، دل لبھانے والے ، کالے ، مشکیں ، کھتولی کے تار سے ، ظلمات کے مسکن وہ تاریکی جو پھیل
کر دنیا پر چھا گئی ، سنگار کے تالاب میں صاف ستھری سوار - سرتاج کا مدیو کے بھونرے ، عقلمندی کا چھور - چاند کے
گرد راہو کا حلقہ ، ناگن کے بچے ، یا سہاگن کے بال ہیں -

لٹ (लट) گیسوئے پُر خم

हग मीन बाझिबे को बंसी यह सच्ची कैधों गाँसिबे की बरछी कैधे प्रकृत
अमन्द है। प्रेम के कपाट खोलिबे की आंकुसी है कैधों कैधों प्रसाद
फांसबे की फन्द है ॥ रूप के जहाज बीच लंगर लगो है कैधौं

मोहनी महल पर लसत कमन्द हैं। चन्द की चटक पे सुराहु की सक्क परी लटकि रहे हैं लट साहब पसंद है ॥

ماہی چشم کو پکڑنے کی جنسی، یا ناگن کی بچی جو عمدہ آب حیات بیتی رہتی ہے۔ دل محبت کی کلید بادل کے پھانسنے کا پھندا ہے۔ حسن کے جہاز کا لنگر یا اس نازنین کے محل پر کمند لٹک رہی ہے۔ چاند پر راہو کی رسی پڑی ہے یا صاحب پسند گیسو لٹک رہے ہیں۔

پائی (पाटी) پٹیاں

कैधों बेनी पन्नगी के फन दुहूं ओर कैधों मृग दृग रोकबे की रूप भूप घाटी है। मुख विध तान के बितान जुग मेरे जान कमल के ऊपर सेवारन की टाटी है ॥ कैधों करतल रसराज राखे माथे दोऊ दीपत दिनेस तातें ललित ललाटी है। एरी आगे मोहन मयूर से नरखि नाचें सघन के घन पटली की परिपाटी है ॥

یا تو دونوں طرف ناگن چوٹی کے پھن ہیں یا غزالان چشم کے روکنے کے لئے سلطان حسن کی گھاٹی ہے۔ رخ ماہ کے محل کے دو خیمے ہیں۔ یا کنول پر سوار کی ٹٹی رکھی ہے۔ "رس راج" نے پیشانی پر دونوں ہتھیلیاں رکھ لی ہیں۔ جو چمک رہی ہیں اور اس لئے خوبصورت معلوم ہوتی ہیں۔ اری اس بادل کو دیکھکر موہن مور کی طرح ناچتے ہیں۔ یہ بادلوں کی چھت کا سلسلہ ہے۔

مانگ (मांग) فرق دلاویز

तम के विपिन में सरल पंथ सत्विक को कैधों नीलगिरि पर गंगाजू की धार है। कैधों बनवारी बीच राजत रजत रेख कैधों चन्द कीनो अंधकार के प्रहार है ॥ नापति सिगार भूमि डोरी हासरस कैधों बलभद्र कीरति की लीक सुकुमार है। पय की है सार घनसार की असार मांग अमृत की आपगा उपाई करतार है ॥

تاریکی کے جنگل میں عابدوں زاہدوں کے لیے سیدھا راستہ یا نیلگری پر گنگاجی کی دھار ہے۔ بادلوں میں سفید لکیر ہے یا چاند نے اندھیرے پر حملہ کردیا ہے۔ تبسم ڈوری سے کرسنگار کی زمین ناپتا ہے۔ یا آب وتاب کا خوبصورت خط ہے۔ دودھ کا جوہر ہے یا کافور کو مات دینے والی مانگ یا صانع نے امرت کی ندی بنائی ہے۔

بینی (बेणी) چوٹی

लाबी लहकारी अति कारी सुकुमारी सखिआन ने सुधारी मन्त मधुप की सेनी है। डारत कलंकहि कलानिधि निचोरि कैधों कैधों मनधीर बिदारिवे की छेनी है ॥ नागिरि सनाल मुखकंज तें लगी है कैधों कैधों कारी नागिनी निपट सुख देनी है। कीनो तम पान के तमीपाते के पाछे परी कैधों अंधकार धार कैधों यह बेनी है ॥

لمبی، خوشبودار، بہت ہی کالی، خوبصورت، سکھیوں کی بنائی ہوئی۔ مست بھونروں کی قطار ہے۔ چاند نے اپنی سیاہی کو نچوڑ ڈالا ہے یا دل کے صبر کو دور کرنے کی چھینی ہے۔ اچھی ڈنڈی کنول (چہرے) سے لگی ہوئی یا کالی ناگن بہت ہی دل فریب ہے۔ یا تاریکی کو پی کر چاند کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ اندھیرے کی تحریر ہے یا چوٹی ہے۔

جوڑا (जूरा) جعد عنبریں

कैधों सांप पींडुरी दै फन उकसाय बैठो कैधों काम आंकुस संवारिवे को पूरा है। कंचन को गुटिका सों पाटी पारिवे को रख्यो कैधों सालगाम को सरूप रूप सूरा है ॥ कैधों सती करत तपस्या तीर कालिन्दी के वृन्दा कैसो फल देखियत रूरा है। चीकने चटक मटकत कारे स्यामहू तें ऐसो सीस प्यारी के बिराजमान जूरा है ॥

سانپ کنڈلی مارے پھن اٹھائے بیٹھا ہے۔ کام دیو کے آنکس کو درست کرنے کا گول گول لکڑی کا کندہ ہے۔ سونے کی لکیر کھینچنے کا بٹا۔ سنیچر (سیاہ رنگ کا ستارہ) نے سالگ رام (شیو جی کی گول پتھر کی مورت) کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ستی دریائے جمنا کے کنارے اپنے آپ کو جلا رہی ہے۔ تلسی کا دل لبھانے والا پھل ہے۔ چکنے، چمکیلے بال، جو شیام جی سے بھی زیادہ کالے ہیں، چمک رہے ہیں۔ پیاری کے سر پر جوڑا اس طرح لطف دے رہا ہے۔

سیس پھول (सीस फूल) سر کا پھول

जगर मगर होत जमुना को जल कैधों कोकनद कमनीय पूरन प्रभनि को। सुकवि रतन कैधों रजत रतन घर कारी कुण्डलीस फनि ऊपर फवनि को ॥ कैधों सुरभान परभान भोर ही को कैधों उग्यो भौमतर दै तनू भव तरनि को। कैधों प्रान प्यारी की संवारी पारी

पाटिन में सोहत सुभग सीस फूल लाल मनि को ॥

جمنا جی کا پانی جھلمل جھلمل کر رہا ہے یا اعلیٰ درجہ کی آب و تاب کا خوبصورت سُرخ کنول ہے۔ بہت بڑا لعل سانپ کے پھن پر رکھا ہوا چمک دمک رہا ہے۔ آفتابِ صبح درخشاں ہے۔ یا مریخ (سُرخ رنگ کا ستارہ) سینچر کے نیچے سے نکل کر طلوع ہوا ہے۔ جانِ جہاں کے خوبصورت پٹی جمائے ہوئے سر پر لعل کا حسین پھول اپنی رعنائیاں دکھا رہا ہے

سَرْوانگ (सर्वाङ्ग) جملہ اعضاء

कंज से चरन देवगढ़ी से गुलुफ सुभ कदली से जंघ कटि सिंह पहु-
चत है। नामी गंभीर व्याल रामावली कुंभ कुच भुज ग्रीव भाप कैसी
ठोढी बिलसत है ॥ मुख चन्द बिम्बाधर चोंका चारु सुक नाक खंज
मीन नैबम बंकाई अधिकत है। भाल अधो बिधु भाग करन अमृत
कूप बेनी पिकबैनी जू की भूमि परसत है ॥

پاؤں کنول سے خوبصورت ٹخنے ایکھ کی گرہوں سے، رانیں کیلے سی ہیں کمر شیر کی کمر کی حریف ہے۔ ناف گہری، موئے ناف لہلہاتے ہوئے۔ پستان مثل خُم ہیں، بازو، گردن اور زنخدان اپنی زیبائی دکھا رہے ہیں۔ چہرہ چاند سا، ہونٹ سیب سے، سامنے کے چار دانت دلفریب، ناک طوطے کی چونچ سی ہے۔ موٹے اور مچھلیاں آنکھوں سے کسبِ رعنائی کرتے ہیں۔ پیشانی نصف ہلال، کان چشمۂ آبِ بقا ہیں، اور اس خوش گلو کی چوٹی زمین کو چھوتی ہے۔

اس مضمون کے شروع ہی میں ایک "سراپا" ہدیۂ ناظرین کیا جا چکا ہے۔ لیکن چونکہ منقولہ بالا کتاب میں یکجائی طور پر شاعر ہندی نے سراپا پیش کیا ہے۔ اسلیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایسا ہی ایک نمونہ تفنن طبع ناظرین کے لیئے اردو سے بھی پیش کیا جائے۔

کل نظر آیا چمن میں اک عجب رشکِ چمن
گُل رخ و گلگوں قبا و گلعذار و گلبدن

مہر طلعت، زہرہ پیکر، مشتری رو، مہ جبیں
سیمبر، سیماب طبع و سیم ساق و سیمتن

نازنیں، ناز آفریں، نازک بدن، نازک مزاج
غنچہ لب، رنگیں ادا شکر دہاں، شیریں سخن

تیر قد، نشتر نگہ، مژگاں سناں، ابرو کماں
برق تاز، رزم ساز و نیزہ باز و تیغ زن

بے مروت، بے وفا، بے درد، بے پروا خرام
جنگ جو، قتال و شوخ و سرفراز و سرفگن

زلف و کاکل، خال و خط، چاروں کے چاروں غلام
مشکِ تبت، مشکِ چیں، مشکِ خطا، مشکِ ختن

روشن بر، دندان و لب، چاروں سے چاروں خجل
نسترن، برگِ سمن، دُرِّ عدن، لعلِ یمن

مبتلا ایسے ہی خوش قسمتوں کے ہوتے ہیں نظیر   بے قرار و دل فگار و خستہ حال و بے وطن

انگ سگندھ (अंग सुगंध) خوشبوئے تن یا ہمیں

फूले है न सरद सरोज इहि समे कहू फूले है न फूल फैली सौरभ कहाते हौ। चंपक थलीन मिली मालतीन अवलीन केसर परसि पौन आयो ना तहांते हौ॥ खोल्यो है न घनसार खोल्यो न कुरंगसार सौरभ अपार पारावार को जहां ते हौ। बल्लभ रसिक हम जानी लपटानी रानी आई रंग महल तें मिलन जहां ते हौ॥

آج کل نہ تو کہیں کنول پھولے ہوئے ہیں اور نہ کسی اور ہی قسم کے پھول، پھر یہ بوئے عنبر بیز کہاں سے آئی؟ چمپا اور مالتی کے ملے ہوئے تختوں اور کشت زار زعفران کو بھی تو چھو کر نہیں آئی۔ کسی نے کافور یا نافے کے ڈبے بھی تو نہیں کھولے کہ یہ وعدہ آفریں خوشبو اُن کی ہو۔ یہ ہوا تو رانی کے رنگ محل سے ان کے جسم عنبر آگین سے مل اور لپٹ کر آئی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

شورہ شرنگار (सोरह शृङ्गार) سولہ سنگار

मोतियन सो भरी मांग सीस फूल टीको दिये वेसर तरौना छबि सारी जरतारी की। मोतियन को हार माल फूल के हुमेल हेम कंकन जराव छबि आरसी निहारी की॥ भरमी सुकबि कटि किंकिनी रसाल बाजे जेहर औ पायजेब सोभा सुखकारी की। बिछिया अनौट राजै खोडस सिंगार साजे मोह्यो मन मोहन को देख दृति प्यारी की॥

مانگ موتیوں سے بھری، سر پر پھول، ٹیکا لگا ہوا، بلاق اور کرن پھول پہنے، زرتاری کی ساری زیب بر کئے ہوئے ہے۔ موتیوں کا ہار، پھولوں کی مالا، سونے کی ہمیل سے جڑاؤ کنگن اور آرسی اپنی اپنی چمک دمک دکھا رہے ہیں۔ کمر کی کردھنی خوش آوازی سے بج رہی ہے۔ اور پازیب کی زیبائی راحت افزا ہے۔ بچھیا، اَنوٹ اور کھور (یہ تینوں زیور ہیں) سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ من موہن کا دل انھیں اندازوں سے چھینا ہے۔

رباعیات

از جناب فراق صاحب گورکھپوری

مہتاب میں سُرخ انار جیسے چھوٹے یا توسِ قزح لچک کے جیسے ٹوٹے
وہ قد ہے کہ بھیرویں سُنائے جب صبح گلزارِ شفق کے نرم کونپل پھوٹے

لہروں میں کھلا کنول نہائے جیسے دوشیزۂ صبح گنگنائے جیسے
یہ روپ کا لوچ یہ ترنم یہ نکھار بچّہ سوتے میں مُسکرائے جیسے

تاریخ حجابِ رُخ اُٹھائے جیسے جھرمٹ تاروں کا مل کے گائے جیسے
یہ کشف و کرامات دمِ نظارہ صدیوں کا حجاب ٹوٹ جائے جیسے

وہ آنکھ کھُلی، دن کی کرامات ہوئی ہر مست نگہ رمز و کنایات ہوئی
چھلکائے ہوئے میکدے دن ڈوب گیا گیسوئے سیہ تاب کھلے، رات ہوئی

جب جلوہ نما چاند لبِ بام ہوا جب ساغرِ شب چھلکا ہوا جام ہوا
تُو سامنے آیا، کہ مری آنکھوں کو اس پردۂ دیدار میں الہام ہوا

گلِ پژمردہ

از جناب رادھا رمن سکسینہ شوق آبادی بی اے

اے گلِ پژمردہ، اے روحِ بہارِ گلستاں — اے شہیدِ یاس، اے جذبِ خلش کے ترجماں
اے سکوں نا آشنا، اے واقفِ دردِ نہاں — اے سبق آموز، اے سرِّ ازل کے رازداں

کس قدر حسرت فزا ہے غم کا افسانہ ترا
بادۂ گلرنگ سے خالی ہے پیمانہ ترا

آنکھ کھلتے ہی تری نظروں میں تھی شانِ بہار — آفرینش نے بنایا تجھ کو مہمانِ بہار
تھا تو ہی روحِ روانِ گلستانِ جانِ بہار — تیرے دم سے تھے چمن میں ساز و سامانِ بہار

ناز تھا فطرت کو تیری شوخیِ انداز پر
تھی بہارِ رنگ و بو حسنِ فسوں پرواز پر

بلبلِ شیدا نے کہہ دی تجھ سے اپنی داستاں — جنبشِ بادِ صبا نے تجھ سے کیں اٹکھیلیاں
اوس کے چھینٹوں نے کیں تجھ پر گہر افشانیاں — تتلیوں نے کسب کیں تجھ سے تری رنگینیاں

لب بہ لب ہونے لگے پھر تجھ سے مرغانِ چمن
سب کو تو شیدا بنا کر خود بنا جانِ چمن

حسن تیرا کیف پرور ہر ادا مستانہ وار — شاہدِ فطرت تھی تیرے حسن و خوبی پر نثار
اک ذرا سی دھوپ کی گرمی پہ تیرا انتشار — نازکی میں پرورش پاتا تھا تیرا افتخار

حیف سمجھا تو نہ کچھ رازِ جمالِ زندگی
تیری ہستی پر تھا پوشیدہ مآلِ زندگی

چار دن کی زندگی پر تجھ کو کتنا ناز تھا — اک نظر بدلی ہوا کی اور تو مرجھا گیا
شاخِ گل سے ایک جھونکے نے کیا تجھ کو جدا — حیف تیرا تاج خود بینی زمیں پر آ گرا

آہ وہ حسنِ فسوں انگیز فرشِ خاک ہے
اُف مآلِ زندگانی کس قدر غمناک ہے

اب کہاں رونق فزا رنگِ بہارِ گلستاں — تیرگیِ شام میں ہیں حسن کے جلوے نہاں
خامشی میں دفن ہیں بلبل کی نغمہ سنجیاں — ختم ہیں تیرے لئے گلشن کی سب رنگینیاں

واقفِ رازِ گلستاں ہو کے تو خاموش ہے
ذرہ ذرہ تیری ہستی کا چمن بر دوش ہے

تیاگ

از جناب اطہر فتحپوری بی۔ اے

مجھے طالب علمی کے زمانہ کی وہ بحث خوب یاد ہے جب میں نے عورت کے بارے میں یہ کہا تھا کہ وہ ایک ناگن ہے۔ بڑی ہی خوبصورت، بڑی ہی نازک۔ بڑی سبک مگر بلا کی زہریلی۔ اس سے دور بھاگنا چاہئے کیونکہ اس کا ڈسا بچتا ہی نہیں! عورت شیرنی ہے حسین جسم والی۔ نازک کمر والی، نرم جلد والی مگر انتہائی خونخوار۔ عورت ایک کسی ہوئی تلوار ہے جس پر گری اس کا خون چاٹ گئی۔ جدھر جھکی آنکھوں کو خیرہ کر گئی، جس طرف جھکی ادھر صفایا کر گئی، جس سے گلے ملی اس کو موت کی نیند سُلا دیا۔ اس کے جواب میں میرے دوست رفیق نے بڑے جوش کے ساتھ کہا تھا، نہیں تمہارا خیال غلط ہے، عورت ایک سپنا ہے، رنگین اور اچھوتا۔ ایک پھول ہے حسین اور عطر بیز، ایک چاند ہے بلند اور منور، ایک آسمان ہے بلند اور باوقار۔ عورت ایک روشنی ہے نظر فریب اور دلکش۔ ایک رنگ ہے ہوشربا اور دلنواز، عورت جذبات لطیف کی حامل ہوتی ہے اس میں وجدانیت کا عنصر غالب ہوتا ہے، وہ محبت کو محبت سمجھتی ہے نہیں بلکہ وہ مجسم محبت ہوتی ہے وہ محبت کر کے دوسروں کو بھی زندہ رکھتی ہے اور خود بھی زندہ رہتی ہے، وہ دوسروں پر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے بعد بھی سمجھتی ہے کہ اپنے ہی لئے سب کچھ کر رہی ہے۔ اگر محبت مرد کی ہستی کا صرف ایک جزو ہے تو عورت کی ساری ہستی ہی محبت ہے ایسی محبت جو زمانہ اور فطرت دونوں کی گرفت سے آزاد ہے۔

مجھے اب رفیق کے قول کی صداقت اور اپنی غلط فہمی کا پورا پورا احساس ہے۔ آٹھ سال ہوئے شکیلہ سے جب میری شادی ہوئی تو میں بحیثیت ایک کامیاب بیرسٹر کافی مشہور ہو چکا تھا۔ مرحومہ ہر نقطہ نظر سے ایک محبوب بیوی بننے کے قابل تھی۔ وہ نہایت حسین، پاکیزہ اخلاق، تعلیمیافتہ اور وفا شعار تھی، اُس نے آتے ہی اپنے حسن و اخلاق سے میرے دل میں گھر کر لیا تھا۔ اس کے آنے سے پہلے جب میں کام سے فارغ ہو کر گھر لوٹتا تو وقت کاٹنا دوبھر ہو جاتا، وہی گھر پہلے سُونا سُونا نظر آتا تھا شکیلہ کے آنے سے فردوس نظر بن گیا تھا مگر یہ صورت زیادہ دن نہ رہی، شکیلہ جس دن سے میرے گھر آئی سوگوار ہی رہی۔ شروع میں مجھے یہ خیال ہوا کہ ماں باپ اور بھائی بہنوں کے چھوٹنے کا غم ہے، زندگی کے ایک نئے دور میں قدم رکھا ہے، فضا نامانوس ہے پھر شکیلہ کو جس سے میری جان نہ پہچان مجھ سے محبت کیسے ہوتی۔ یہ ممکن ہے کہ اسے آتے ہی میرے دُکھ درد کا احساس ہونے لگے اور میری عزت اور میرے گھر کی عزت کی دھن لگی رہے لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسے مجھ سے وہ محبت ہو جس کی ایک جوان مرد کے دل میں تمنا ہوا کرتی ہے میں اکثر یہ سوچ کر اپنے دل کو تسکین دے لیتا کہ عام طور پر عورت محبت کا اظہار بہت کم کیا کرتی ہے، کیونکہ مردوں کی

بہ نسبت اُسکے اپنے جذبات پر بہت زیادہ قابو ہوتا ہے اور وہ اکثر اس خیال میں مگن رہتی ہے کہ اسے کسی سے محبت ہے۔

خیر - کچھ زمانہ اسی طرح گزر گیا۔ ایک تو میرا کام کچھ ایسا تھا کہ بہت سا وقت کچہری میں گذر جاتا۔ پھر گھر آنے پر بھی یہ حال ہوتا کہ ادھر کھانا کھایا اور ادھر دفتر میں آ بیٹھا۔ پھر بھی میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ شکیلہ میرے لئے آنکھیں فرش راہ کئے رہتی، میرے گھر میں آتے ہی اسکی دنیا پلٹ جاتی، سو سو طرح میری خاطر و مدارات کرتی مگر اسکی دائمی افسردگی سے میری زندگی میں پھیکا پن پیدا ہوگیا تھا۔ اب میں اپنی شادی سے کچھ خوش نہ تھا۔ مجھے ایسی بیوی کی تمنا تھی جسے میں دل سے چاہوں اور وہ بھی مجھے دل سے چاہتی ہو۔ اکثر میں دل میں سوچا کرتا کہ یوں تو ہر عورت اپنے شوہر سے محبت کرتی ہے بات بات پر جان چھڑکتی ہے لیکن میں زن و شو والی محبت کا قائل نہ تھا۔ میرے نزدیک اس محبت کی وقعت ایک مقدس معاہدہ سے زیادہ نہ تھی، میں چاہتا تھا کہ میری بیوی مجھے محض میرے لئے چاہے۔

شکیلہ ابتدا ہی سے میرے لئے ایک معمہ بنی رہی، وہ ہمیشہ کچھ کھوئی کھوئی سی رہتی تھی، پہروں نہ جانے کیا چھت کی طرف دیکھا کرتی۔ میں سوچتا کہ شاید اس کے تصورات کے سامنے پُرانے دنوں کی پرچھائیاں تیرتی ہوئی نظر آتی ہیں یا اس کا مضطرب جذبات سے معمور سینہ کسی ایسی قوت کا متلاشی ہے جو اس کے سیل جذبات کو اپنے سینہ میں جذب کرلے، وہ بات بات پر چونک پڑتی۔ اکثر بات سُنتے سُنتے کسی گہری فکر میں ڈوب جاتی، پھر جب اس سے پوچھا جاتا کہ کیا سوچ رہی ہو تو کچھ اس انداز سے مُسکرا دیتی گویا سب کچھ سن رہی ہو، ہر بات سمجھ رہی ہو، اسکی نظر ہر شے کے تاریک ہی پہلو پر پڑتی۔ درد سر اور بُخار تو اس کا کبھی پیچھا ہی نہ چھوڑتے مگر ہر حال میں وہ اپنے فرائض کو ہمیشہ یاد رکھتی اور فرمانبرداری میں ذرہ برابر کمی نہ آنے دیتی۔

کچھ ہی عرصہ بعد میرا یہ شک پایہ یقین تک پہونچ گیا کہ جس طرح سمندر اُوپر سے دیکھنے میں ساکت اور پُرسکون نظر آتا ہے مگر اندر ہی اندر کیسے خوفناک طوفان اُٹھتے ہیں، کتنی خطرناک چٹانیں کھڑی رہتی ہیں اسی طرح شکیلہ بھی اپنے دل کی گہرائیوں میں کوئی بھیانک طوفان۔ کوئی بے پناہ غم چھپائے ہوئے ہے، میں دیکھ رہا تھا کہ خاموش اور سنجیدہ مزاج شکیلہ اندر ہی اندر گھُل رہی ہے مگر اپنے دل کا راز ظاہر نہیں کرتی۔ میرے خیال میں تو وہ ان میں سے تھی جو اپنے آپ سے بھی اپنا غم چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ درحقیقت اسکی ہنسی میں ایک چیخ اور اس کی مُسکراہٹ میں ایک سرد آہ چھُپی رہتی۔

اس کی یہ حالت مجھ سے زیادہ دنوں نہ دیکھی گئی اور آخر ایک دن میں نے اس سے سوال کر ہی دیا۔

"پیاری شکیلہ تم اُداس کیوں رہتی ہو، کیا یہاں تمھیں کسی قسم کی تکلیف ہے؟"

"جی نہیں، خدا کا شکر ہے، مجھے آپ کے صدقے میں ہر طرح کا آرام ہے۔"

"تو پھر یہ گلاب سا چہرہ اور افسردگی کچھ بے جوڑ سی چیزیں ہیں"۔ میں نے مسخرانہ انداز میں کہا۔

"یہ کیسے؟" وہ اپنے خاص انداز سے مسکرا کر بولی، "کیا پھول کے ساتھ کانٹا، ہنسی کے ساتھ رونا۔ اور دھوپ کے ساتھ چھاؤں نہیں ہوتی؟"

"کیوں نہیں، مگر ایسا تو نہیں ہے کہ پھول کانٹے میں، ہنسی رونے میں اور دھوپ چھاؤں میں قطعی مدغم ہو جائے۔"

"یہ میں کب کہہ رہی ہوں۔"

"زبان سے کہو یا نہ کہو مگر میں تو تمھیں کچھ اسی حالت میں دیکھ رہا ہوں۔ پیاری شکیلہ، انسان کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ چند روزہ زندگی ہنسی خوشی سے گزر جائے۔ افسوس! تمھارے چہرے کی پژمردگی پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ تم کسی بہت بڑی فکر میں گھل رہی ہو۔" میں نے پُر خلوص لہجہ میں شکایتاً کہا۔

آنکھوں میں آنسو بھر کر شکیلہ بولی "میں فکر مند کیوں ہونے لگی، میرے پاس آپ ہیں اور میری بچی نادرہ ہے، خدا کے فضل سے روپیہ پیسہ کی کوئی کمی نہیں۔ قیمتی زیورات اور کپڑوں سے بھرے ہوئے بکس موجود ہیں۔ غیر میری خوش قسمتی پر رشک کرتے ہیں۔ ہاں اگر مجھے کسی بات کا رنج ہے تو صرف یہ کہ جب سے میں اس گھر میں آئی ہوں آپ کو ایک دن بھی آرام نہ پہونچا سکی۔ آپ کو میری وجہ ایک مستقل کوفت رہتی ہے، میں اس خیال سے کانپ اٹھتی ہوں کہ اگر آپ کے سے فرشتہ خصلت شوہر کو خوش نہ رکھ سکی تو مجھے دہکتے ہوئے جہنم کی آگ میں جھلسنا پڑیگا۔ میں انتہائی کوشش کرتی ہوں کہ آپ کو خوش رکھ سکوں مگر نہ جانے کیوں کامیاب نہیں ہوتی؟"

میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا — "یقین مانو شکیلہ میں تم سے شادی کر کے بہت خوش ہوں۔"

"میں کیسے باور کر لوں؟ دیکھتی نہیں کہ اب آپ بہت بے پروائی کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگے ہیں کھانا کھایا، کھایا نہ کھایا نہ سہی، بال کتنے بڑھ گئے ہیں مہینوں حجامت بنوانے کی نوبت نہیں آتی، پوشاک کا بھی کچھ خیال نہیں، ہفتوں سوٹ نہیں بدلا جاتا۔ خدا کیلئے دو وقت کھانا تو کھا لیا کیجئے، خواہ مخواہ میرے لئے اپنی زندگی تباہ کر رہے ہیں۔"

"آہ شکیلہ تم کو کیا معلوم کہ میں کس عالم میں رہا کرتا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ بظاہر مجھے کوئی صدمہ نہیں اور میں ایک حد تک زمین و آسمان کی بلاؤں سے محفوظ ہوں مگر اس کو کیا کیا جائے کہ انسان جس سے محبت کرتا ہے اس سے خود بھی محبت کا خواہاں ہوتا ہے، محبت کر کے محبت ہی کا طلبگار ہونا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔"

میرے الفاظ سے اس کے نازک دل پر چوٹ سی لگی پھر بھی وہ ضبط کرتے ہوئے بولی،

"کیوں نہیں، آپ سچ کہتے ہیں، انسان کی سرشت ہی محبت ہے، محبت انسان میں اپنی انتہا کو پہونچ چکی ہے محبت ایک مقدس حقیقت ہے جو زندگی کو بھی ایک حقیقت بنائے ہوئے ہے۔ وہ ایک کیمیا ہے جس کا حاصل کرنا انسان کی زندگی کا خاص مقصد ہے، محبت نہ ہو تو زندگی آزار ہے۔" اتنا کہکر وہ حسب معمولی کسی گہری فکر میں ڈوب گئی

اس کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔

میں یہ سوچ کر کہ مغموم دل کو تنہائی پسند آتی ہے اٹھکر برآمدہ میں چلا آیا اور آرام کرسی پر لیٹ کر ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف دیکھنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے وہ آنکھوں سے اوجھل ہوگیا اور اس کی جگہ مجھے شکیلہ نظر آنے لگی میں نے دیکھا کہ ہم دونوں متوازی راستوں پر چلے جارہے ہیں جو شاید کبھی ایک دوسرے سے نہ ملیں، درحقیقت اُس نے آج تک مجھ سے محبت نہیں کی۔ کیوں؟ یہ مجھے نہیں معلوم۔ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے مگر ایسی جس کو تعمیل حکم کہا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک باندی کیطرح میری خدمت کرتی ہے، اسکی محبت میں ایثار تو ہے مگر رومانیت نام کو بھی نہیں، تعجب ہے کہ وہ محبت کے بغیر بھی زندہ رہ سکتی ہے۔ شاید وہ سمجھتی ہے کہ میں جو کچھ چاہتا ہوں وہ جسم ہی تک محدود ہے اس سے آگے اور کچھ نہیں۔ مگر میں اس شئے کا خواہاں ہوں جس نے صنف نازک کو دراصل صنف نازک بنایا ہے جہاں تک حُسن کا تعلق ہے۔ چاند۔ ستارے اور پھول کچھ کم حسین نہیں ہوتے۔ شفق اور کوہستانی مناظر میں بھی بلا کی دلکشی ہوتی ہے۔ مرقعے اور مجسمے بھی بیحد جاذب نظر ہوتے ہیں مگر انسان ان کے لئے کیوں نہیں تڑپتا، ان کی محبت میں کیوں نہیں گُھلتا، اسی لئے تاکہ وہ محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتے مگر عورت تو مرد کی محبت کا گنبد ہے، اس سے ٹکراکر تو محبت کی آواز بازگشت پیدا ہوتی ہے۔

میں اپنے خیالات کی رو میں یہاں تک پہونچا تھا کہ آنکھ لگ گئی، نہ جانے کب تک وہاں پڑا رہتا مگر شکیلہ کے آنے سے میری آنکھ کھل گئی اور میں اسکی طرف متوجہ ہوگیا۔

شکیلہ نے کہا۔ "آیئے تھوڑی دیر کے لئے احاطہ میں پھولوں کی سیر کی جائے۔"

ہم دونوں سیڑھیوں سے اُتر کر لان پر ٹہلنے لگے۔

ٹہلتے ٹہلتے شکیلہ نے کہا۔ "یہ ہوا کے کیف آگیں اور معطر جھونکے، پھولوں اور سبزہ زار کی یہ رُوح افزا رنگینیاں سمجھ میں نہیں آتا کہ جنت میں اس سے زیادہ کسی کو کیا میسّر ہوسکتا ہے یہ سب نعمتیں مجھے آپ کے طفیل میں حاصل ہیں۔"

میں نے اس کے چہرہ پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "کاش! میں ان نعمتوں سے لطف اندوز ہوسکتا۔ جانتی ہو شکیلہ! میں تو اب ان لوگوں میں سے ہوں جس کو تنو بڈھوں کا ایک بڈھا کہا جاسکتا ہے، میرے دل میں اب نہ تو کوئی جوش ہے اور نہ اُمنگ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے میری حسرتوں اور ارمانوں کا گلا گھونٹ دیا ہو، اس لئے پیاری شکیلہ تم خود جوان بنکر مجھے بھی جوان بناؤ۔

"لگے نہ آپ چٹکیاں لینے۔" شکیلہ نے افسردہ لہجہ میں کہا۔ "یہ سب آپکی رعنائیوں کا صدقہ ہے کہ میں اپنی زندگی کو زندگی سمجھنے لگی ہوں۔"

میں نے کہا" اچھا یوں ہی سہی"

ہم دونوں باغ میں ٹہل رہے تھے، میں کچھ اور کہنے جا ہی رہا تھا کہ شکیلہ نے جلدی سے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ میری داہنی طرف ایک سانپ آرہا تھا جس کو میں نے نہیں دیکھا مگر شکیلہ نے دیکھ لیا تھا، اور اگر اس نے کھینچ کر روک نہ لیا ہوتا تو شاید میرا دوسرا قدم سانپ ہی پر پڑتا۔

رات ہو چکی تھی، شکیلہ نے کہا اب یہاں ٹھہرنا خطرہ سے خالی نہیں۔

اس واقعہ کے بعد وہ خوش و خرم نظر آنے لگی، وہ نادرہ کو کھلاتی، جوش میں اس کا منہ چومتی جاتی، کبھی اسے چھاتی سے لگاتی تو کبھی گدگداتی، نادرہ مسکراتی تو اس کے دل کی کلی کھل جاتی۔ کبھی کبھی تو وہ اس کے نکلتے ہوئے ننھے سے دانتوں میں اپنی انگلی رکھدیتی۔ نادرہ اس کی گود میں خوشی سے اچھلتی کودتی اور بال نوچتی، میں یہ سب باتیں دیکھتا اور خدا سے دعا کرتا کہ وہ ہمیشہ اسی طرح خوش رہے۔ اس بے پناہ خوشی سے میری روح کو اس درجہ مسرت ہوتی کہ مجھے اس کے سامنے دنیا کی ہر شے ہیچ نظر آنے لگی۔ اکثر میں خوشی میں آکر ان دونوں کو اپنے بازوؤں میں دبوچ لیتا۔

لیکن مسرتوں کے یہ دن جلد ہی ختم ہو گئے، شکیلہ پھر اداس رہنے لگی۔ اس مرتبہ جو اسکی صحت بگڑی تو پھر وہ جانبر نہ ہو سکی، شاید وہ زندگی کی کٹھن راہ طے کرتے کرتے تھک گئی تھی اس لئے ڈاکٹروں سے پہلے ہی اس نے اپنے آپ کو جواب دیدیا تھا اس کو دیکھکر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا گھل گھل کر اپنی ہستی کھو رہی ہے، شکیلہ تنہا کمرہ میں پڑی رہتی۔ اسکی بلغمی کھانسی سے کبھی کبھی کمرہ میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی۔ اسکی صحت روز بروز خراب ہو رہی تھی، سانس رک رک کر آنے لگا تھا جیسے تھکا ہوا مسافر اپنی منزل طے کر رہا ہو، وہ بالکل نیجان ہو چکی تھی مگر اسکی آنکھوں میں اب بھی چمک تھی جن میں سے اسکی روح کی ساری افسردگی ایک معصومیت کے انداز سے جھانک رہی تھی جیسے موم بتی کے جسم میں دھاگے کی ڈور، شکیلہ کے دل میں رنج و الم کی موم بتی جل رہی تھی، وہ کب سے جل رہی تھی اور کب تک جلتی رہے گی یہ اس کا شوہر بھی نہ جانتا تھا۔

مرنے سے کچھ دن پہلے میں نے اس سے کہا" شکیلہ تمھیں کسی پہاڑ پر لے چلوں تم ضرور اچھی ہو جاؤگی"

اس نے ایک مایوسی کی سانس لیکر کہا" سوکھا درخت پانی دینے سے ہرا نہ ہوگا"

میں نے بہت دوڑ دھوپ کی اس کے علاج میں بہت سر مارا مگر سب بیکار ثابت ہوا۔ میں شکیلہ کی زندگی کی کشتی کو موت کے منجدھار میں بہتے ہوئے دیکھ کر ایک روحانی تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ میری تنہا زندگی میں وہ سنسان چٹانوں کے درمیان تاریکی میں موم بتی کی طرح روشنی پھیلا رہی تھی مگر اب وہی موم بتی جھلملانے لگی تھی، مرنے سے پہلے اس نے مجھے بلوایا۔ جب میں اس کے پاس پہونچا تو وہ پلنگ پر لیٹے ہی لیٹے بولی۔

"آپ آگئے اچھا ہوا۔ میں آپ سے آخری ملاقات کرنا چاہتی ہوں، ذرا قریب آجائیے۔"
میری آنکھوں میں آنسو آگئے، شکیلہ بھی رو رہی تھی، نادرہ پاس ہی بیٹھی حیرت سے ہم دونوں کا منہ تکنے لگی اور ہم دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھکر تھوڑی دیر میں خود بھی رونے لگی میں نے بے اختیار اسے اپنی گود میں لے لیا۔
شکیلہ بولی۔ "اسے میرے ہی پاس لٹا دیجئے۔"
وہ اسے سینہ سے لگا کر کہنے لگی۔ "بیٹی میں اب جا رہی ہوں آج سے یہی تمھارے ماں باپ ہیں۔" پھر اُس نے مجھے مخاطب کر کے کہا۔ "میں بہت نادم ہوں کہ آپ کی کوئی خدمت نہ کر سکی اُمید ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں گے خدا کے لئے میرے بعد میری بچی کا خیال رکھئے گا اب آپ کے سوا اس کا اور کون ہے۔"
میں بھرائی ہوئی آواز میں صرف اتنا کہہ سکا "یہ تو تمھاری نشانی اور ہماری محبت کا تاج محل ہے۔"
اس نے گہری سانس لی گویا سکون نصیب ہو رہا ہو، میں نے کہا "شکیلہ ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔"
وہ بولی۔ "میں جانتی ہوں آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں، میں نے اپنے بارے میں ایک ڈائری لکھی ہے۔" یہ کہتے کہتے اس نے تکیے کے نیچے سے ایک نوٹ بک نکالکر میرے ہاتھوں میں دیدی، پھر اُس نے بغور مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔
"معاف کیجئے گا جب سے مجھے آپکی زوجیت کا فخر حاصل ہوا میں ایک دن بھی محبت نہ کر سکی اور آج اپنے آپکو اسی محبت کا بار اُٹھانے کے قابل نہ پاکر محبت کی آغوش میں سونے جا رہی ہوں کیونکہ خود زندگی کا بوجھ جسے گراں ہو وہ محبت کا بار کیونکر اُٹھا سکتا ہے، وہ درد بھری آواز میں کہنے لگی "عورت محبت میں نامراد رہکر اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر مر جاتی ہے۔" پھر نادرہ کو میرے سپرد کرتے ہوئے اُس نے کہا "مجھے نیند آرہی ہے۔"
میں نے زور سے آواز دی۔ "شکیلہ! شکیلہ!"
اُس نے آنکھیں کھولدیں۔ ایک حسرت زدہ نگاہ مجھ پر ڈالی جسمیں معلوم کیا تھا، پھر دو ہچکیاں آئیں اور تیسری کے ساتھ اسکی روح پرواز کر گئی اور میں زندگی سے نپٹنے کے لئے بالکل اکیلا رہ گیا۔ ابھی شکیلہ کو مرے ہوئے صرف چھ مہینے ہوئے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے مدتیں گزر گئیں اور پہلے دن کس قدر مختصر ہوا کرتے تھے۔
مرحومہ کی ڈائری میں کئی بار پڑھ چکا ہوں مگر نہ جانے کیوں بار بار اُسے پڑھکر آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے۔

۷ مارچ ۱۹۳۳ء

میرے گھر میں خوشی کے شادیانے بج رہے ہیں کہ ایک دولتمند اور ذی عزت باپ کی بیٹی ایک بڑے آدمی کی بیوی بننے جا رہی ہے۔ ماں باپ اپنی بیٹی کی راحت اور خوش قسمتی کے کیسے کیسے عجیب خواب دیکھ رہے ہیں، مگر انھیں کیا معلوم کہ ان کی ناز و نعم میں پلی ہوئی شکیلہ اس کو اپنے ساتھ قسمت کا کھیل اور بیدرد کھیل سمجھ رہی ہے، میں بار بار سوچتی ہوں کہ شادی کیا ہے؟ میرے خیال میں تو یہ ایک ظاہری بندش ہے جو عورت کی آزادی سلب کر کے اُسے

شوہر کے ہاتھوں میں رُباب بنا دیتی ہے۔ شوہر جس طرح اُس کے تاروں کو حرکت دیتا ہے اُسی طرح کی آواز اُسے دینی ہوتی ہے۔ کبھی خیال آتا ہے کہ جس شادی میں محبت ایثار و قربانی کے پاک جذبات کارفرما ہوں اسے شادی کا درجہ دینا سخت حماقت ہے۔ دنیا ہر چیز کو روپے کے پیمانے سے ناپنے کی اتنی عادی ہو چکی ہے کہ جو چیز اس پیمانے پر پوری نہیں اُترتی اسے وہ حقیر و ذلیل سمجھنے لگتی ہے اسکے ہاں انسان کی کوئی قیمت نہیں۔ ہماری زندگی رسم و رواج کی پابند ہے۔ سماج کے قوانین سے تو مر کر بھی نجات نہیں ملتی۔ ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھنا انسان کی فطرت ہے۔ شادی بیاہ کے معاملات میں لڑکی کی مرضی کون پوچھتا ہے؟ ماں باپ تو اس روش پر چلتے ہیں جس پر دوسروں کو گامزن دیکھتے ہیں۔ انسان دولت کو وجود میں لایا ہے مگر اب وہی دولت انسان کو اپنے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنائے ہوئے ہے۔ آج میرے مغموم دل میں نہ جانے کون کون سے خیالات پیدا ہو رہے ہیں۔

۲۰ مئی سنہ ۳۰ء

میں نے سہیلیوں کی چٹکیوں اور پھبتیوں سے بچنے کیلئے دوڑ کر دروازہ بند کر لیا اور اندر بیٹھکر سوچنے لگی کل نکاح ہے۔ نکاح کے بعد ہمیشہ کے لئے میرے پاؤں میں بیڑیاں پڑ جائیں گی۔ میری انفرادیت کا خاتمہ ہو جائیگا۔ مجھے مذہب اور سماج کی قربان گاہ پر محبت کو بھینٹ چڑھانا ہوگا۔ عورت اور رباب، رباب اور عورت یہ الفاظ بار بار میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ سر میں میٹھا میٹھا درد ہو رہا تھا میں نے تازہ ہوا کیلئے دروازہ کھول دیا، اتنے میں وہ آگئے، دیکھتے ہی بول اٹھے "شکیلہ! کل سے تم کسی اور کی ہو جاؤ گی اور میرے لئے صرف غیر۔ لیکن اس کا یقین رکھو کہ میں دُکھ میں رہوں یا سُکھ میں۔ تمھارے لئے ہر وقت یہی دعا کرتا رہوں گا کہ تم سے رنج اتنا ہی دور رہے جتنا کہ زمین سے آسمان۔ خدا تمھیں ہر طرح کی خوشیاں دے اور تمھارے دن ہمیشہ عیش و آرام میں کٹیں۔

میں نے روتے ہوئے پوچھا "یہ سب تو میرے لئے ہے اور تم؟"

اُنھوں نے کہا کہ "میں؟ میری زندگی تمھاری خوشی، میرا چین تمھیں سکھ میں دیکھنا ہے۔ میری سب سے بڑی تمنا یہی ہے کہ خدا کرے تم مجھے بھول جاؤ۔ تمھیں میری صورت کبھی یاد نہ آئے اور نہ کبھی محبت کی پچھلی باتیں۔"

میں نے انکی بات کاٹتے ہوئے کہا "یہ مجھ سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ میری محبت پانی کا بلبلہ یا شفق کی روشنی نہیں کہ ذرا سی دیر میں اُبھرے اور مٹ جائے۔"

"لیکن تم کر ہی کیا سکتی ہو؟" اُنھوں نے دردمندانہ اشتیاق سے پوچھا۔

"میں بہت کچھ کر سکتی ہوں۔ میں تمھیں کائنات کے تاریک ترین گوشوں میں بھی ڈھونڈھ سکتی ہوں۔ میں ہزاروں کوس پر بیٹھی ہوئی بھی تم سے نزدیک رہ سکتی ہوں۔" میں نے پُرجوش مگر دردمندانہ لہجے میں کہا۔

وہ متحیرانہ انداز میں بولے "سانپ نکل جانے پر لکیر پیٹنے سے فائدہ؟" اکثر میرے دل میں یہ خیال کھٹکتا تھا کہ

ایک دولتمند اور غریب کی محبت کا انجام خوشگوار ہونا ناممکن ہے، آج میرا یہ خیال یقین میں بدل گیا"
ان کے یہ فقرے میرے دل میں تیر سے لگے۔ میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور ہونٹ لرزنے لگے، میں بولی "تمہیں یقین ہی نہیں آتا۔ میری محبت میں روپیہ پیسہ کو دخل نہیں، یہ دل کا سودا ہے۔ دل سونے چاندی کا نہیں، آنسوؤں اور مسکراہٹوں کا غلام ہے۔ یقین مانو میری روح کی گہرائیوں میں تمہارا پیکر مشعل بنکر سما گیا ہے۔
اُنھوں نے جواب دیا " میں یقین ہی کر لوں مگر تم شوہر کو شک میں ڈالکر، دنیا کی روش سے منہ موڑکر، سماج کی انگشت نمائی سے بے پرواہ ہوکر اپنے دل کے نہاں خانوں میں میری محبت کو جوالامکھی بنا کر رکھ سکوگی؟ اور اگر رکھنے کا ارادہ بھی ہو تو میں یہی کہوں گا کہ گذری ہوئی باتوں کو بھول جاؤ، مجھے سماج سے جو کچھ شکایت ہو تو ہو تم سے کوئی شکایت نہیں اس لئے کہ تم وہ چڑیا ہو جو ایک بہت بڑے پنجرے میں بند ہے۔ بیچاری چڑیا نہیں جانتی کہ اسکی پرواز میں کوئی چیز حائل ہوگی، مگر اس کو سمجھ لینا چاہیئے کہ پنجرے کی آہنی سلاخیں اس کی راہ روک کر کھڑی ہو جائینگی۔ اور وہ بے بس ہوکر اپنی بقیہ زندگی وہیں پر گزارنے پر مجبور ہو جائیگی اس لئے اسے پرواز کا خیال بھی دل میں نہ لانا چاہیئے"
اتنا سنکر میرے صبر کا پیمانہ چھلک گیا، میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور کہا " میں آپ کو کیسے بھول سکونگی؟ وہ چلدیے، چلتے چلتے اتنا کہہ گئے " تم سمجھنا کہ ایک خواب دیکھا تھا"

۲۲، مئی ۳۰ء

بڑی دھوم دھام سے برات آئی۔ نکاح ہو گیا میں ہمیشہ کے لئے پابند ہو گئی۔ رخصتی کے وقت سارے گھر میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ میں بھی خوب دل کھولکر روئی، اس وقت میں بالکل زندہ لاش کی طرح تھی، بزرگوں نے آنسو بہائے اور دعائیں دیں، چھوٹے بھائی بہن بھی پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ آخر میں ابا جان آئے، انکی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔ آتے ہی اُنھوں نے سب کو کمرہ سے ہٹا دیا، پھر میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے: "بیٹی اب زیادہ مت روؤ" مگر اس کے بعد خود ہی روتے ہوئے کہنے لگے " بیٹی میں نے تجھے بڑے لاڈ پیار سے پالا ہے میں تیری راہ میں آنکھیں بچھاتا تھا تیری ذراسی تکلیف پر تڑپ جاتا تھا مگر اس لئے نہیں کہ تو کبھی مجھ سے جُدا نہ ہوگی بلکہ اس لئے کہ ایک دن میں تجھے تیرا فرض پُورا کرنے کے لئے اپنے گھر سے رخصت کر دوں گا۔ میری بچی آج وہ دن آگیا۔ بیٹی باپ کی باتوں کو بُرا نہ ماننا۔ میں نے غیر کی امانت سمجھتے ہوئے تیری پرورش کی۔ تجھے تعلیم و تربیت دی، اور اب آنسو بہاتے ہوئے تجھ کو تیرے حقیقی مالک اور ارضی خدا کے حوالے کرنے جا رہا ہوں۔ جا میری بچی، خدا تیرا نگہبان ہے۔ مگر اپنا فرض ہمیشہ یاد رکھنا، مشکلات و آزمایش میں خدا پر بھروسہ کرکے ثابت قدم رہنا اور پچھلی زندگی کو بھول کر نئی زندگی کی شاہراہیں تعمیر کرنیکی کوشش کرنا۔

۱۰، فروری ۳۱ء

نہ جانے کیوں جی اُچاٹ رہتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی بہت ہی قیمتی چیز کھو گئی ہے، دن بھر کام میں

مصروف رہتی ہوں۔ پہاڑ سے دن اور اُداس راتیں کاٹے نہیں کٹتیں۔ بستر پر کروٹیں بدلتی رہتی ہوں، وہ کانٹوں کی طرح چبھتا معلوم ہوتا ہے۔ ملنے والی کہتی ہیں شکیلہ تم اُداس کیوں رہتی ہو؟ شادی کے بعد تو عورت کا چہرہ گلاب کی طرح کھل جاتا ہے ہاتھوں میں چوڑیاں کس جاتی ہیں مگر تمھاری تو انگوٹھی ہی چوڑی بنتی جاتی ہے۔ کل خالہ جان دیکھ کر رو پڑیں۔ آہ میری شکیلہ! تجھے کیا ہو گیا ہے، تونے اپنی یہ کیا گت بنا رکھی ہے۔ میں نے کہا "خالہ جان. بزرگوں کو اپنے توانا اور تندرست بچے بھی کمزور ہی نظر آتے ہیں، میں تو پہلے سے بہت اچھی ہوں" خالہ جان آج رات کی گاڑی سے گھر جانے والی ہیں اُنھوں نے مجھے بھی اجازت دیدی ہے۔ میں بھی خالہ جان کے ساتھ میکے جاؤں گی۔

۹ جنوری ۳۲ء

نہ جانے اب وہ کس حال میں ہوں، رشید بھائی کل آئے تھے باتوں باتوں میں کہنے لگے اب تو وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے ہیں، ملازمت چھوڑ دی ہے۔ سڑی دیوانوں کی طرح مارے مارے پھرتے ہیں۔ لڑکے گلی راستوں میں اُنھیں دیکھ کر تالیاں بجاتے، پتھر مارتے اور ستاتے ہیں۔ وہ بھی تنگ آکر مرنے مارنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ ان سب باتوں کو سُنکر کلیجہ دہل جاتا ہے، کیا کروں؟ کہاں جاؤں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ سُنتی تھی کہ انسان محبت میں ناامید ہو کر فرشتہ بن جاتا ہے یا شیطان؛ افسوس وہ بلندی پر چڑھنے کے بجائے قعر مذلت میں گر پڑے۔

۱۴ اپریل ۳۳ء

کبھی کبھی سوچتی ہوں کیا بیاہ کر کے ہی محبت ہو سکتی ہے، کیا بیاہ کے بغیر محبت ہو ہی نہیں سکتی۔ پھر خیال آتا ہے کہ مذہب اور سماج کی نظروں میں مرد و عورت میں زن و شو کی محبت کے علاوہ اور کسی قسم کی محبت گناہ عظیم ہے جس محبت کا انجام شادی پر نہ ہو اسے دنیا کا کوئی آسان سے آسان سماج بھی پسند نہیں کرتا، مگر پھر دل کہتا ہے کہ سماج انسان کیلئے بنایا گیا ہے، انسان سماج کیلئے نہیں، اُس نے تو تجھے خاک میں ملا دیا پھر تو اس کے لئے کیوں مری جا رہی ہے؟

آہ! میرے دل میں گمراہ کن خیالات کیوں پیدا ہو رہے ہیں؟ کیا ایک مسلم خاتون کے دل میں کسی غیر مرد کا خیال آنا گناہ نہیں؟ یا اللہ تو مجھے سکون قلبی اور عقل سلیم دے تاکہ میں اس دنیا میں سرخرو رہ کر جب تیرے دربار میں آؤں تو بھی سرخرو آؤں۔

۲۸ جون ۳۴ء

بارہا سوچتی ہوں کہ وہ میرے کون ہیں؟ میں کیوں ان کے لئے گھُل گھُل کر اپنی جان کھوؤں، دل کو کتنا سمجھاتی ہوں مگر کسی طرح مانتا ہی نہیں۔ محبت کی آگ جوالا مکھی بن چکی ہے جی چاہتا ہے سب کچھ اس میں بھسم کر دوں۔ رہ رہ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑیگا۔ دل کھولکر رونا چاہتی ہوں مگر آنسو نہیں نکلتے، ہاں دل کی چنگاریاں سُلگنے لگتی ہیں، محبت بھی عجیب شے ہے۔ انسان صرف ایک ہی ہستی کا دم بھرے۔ دل میں صرف ایک

ہی خیال اور لبوں پر صرف ایک ہی نام ہو۔ ہر وقت ایک ہی نام روح کی گہرائیوں سے اُٹھکر لبوں پر آئے گویا انسان تسبیح پڑھ رہا ہے۔

۱۳/ فروری ۱۹۳۵ء

میری شادی کو پونے پانچ سال ہوگئے ہیں، میری بچی نادرہ چھ مہینے کی ہوگئی ہے جب وہ بیٹھے بیٹھے مسکراتی ہے تو میرا دل خوشی کی لہروں میں جھولا جھولنے لگتا ہے۔ میں کتنا ہی خوش رہنا چاہوں مگر دل میں ایک ٹیس سی اُٹھتی رہتی ہے، سُنا ہے کہ انکی حالت اور بھی خراب ہوگئی ہے۔ وہ شہر کو چھوڑکر نہ جانے کہاں چلے گئے ہیں، جاتے وقت وہ شہر والوں کو بہت ہی بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ خدا جانے اب وہ کہاں بے یار و مددگار بھٹک رہے ہوں۔

۱۴/ جون ۱۹۳۶ء

اب اس گھر سے دل گھبرا گیا ہے۔ زندگی وبال جان اور ایک ناقابل برداشت بوجھ معلوم ہوتی ہے، دن رات کی فکر سے چہرہ اتنا بھیانک ہوگیا ہے کہ مجھے اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے جیسے میں نے کوئی بہت بڑا گناہ کیا ہو، میں انکو دل سے نکالنے کی لاکھ لاکھ کوشش کرتی ہوں مگر جتنا انھیں بھلانا چاہتی ہوں اتنا ہی وہ اور یاد آتے ہیں میری حالت اس دولتمند اندھی کی سی ہے جو چور کو مکان کے ایک کونے سے نکالتی تھی اور وہ دوسرے کونے میں جاکر چھپ جاتا تھا۔ ہر وقت اپنی محبت کی بھُو کی زندگی پر حسرت و افسوس سے بھری ہوئی آہیں کھینچتی رہتی ہوں۔ سوچتی ہوں کیا دنیا میں انسان کو ان گناہوں کی سزا بھی ملتی ہے جنھیں وہ کبھی نہیں کرتا۔

۱۵/ جنوری ۱۹۳۷ء

میرے آقا اور سرتاج اب بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں حالانکہ میں اب ہڈیوں کے ڈھانچے کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوں۔ وہ کہتے ہیں میری شکیلہ تم اچھی ہوجاؤ جس طرح بابر نے ہمایوں کے گرد چکر لگا کر اپنی جان قربان کردی تھی اسی طرح میں بھی تمھاری بلائیں اپنے اُوپر لینے کو تیار ہوں۔ تمھارے بغیر زندہ رہنا میں زندگی کی توہین سمجھتا ہوں۔ تم تو میرے دل کا کھلا ہوا پھول ہو۔ درحقیقت ان کی محبت سے مجھے "وہ" یاد آجاتے ہیں۔ جوں جوں مجھے "ان کا" خیال آتا ہے میں زیادہ توجہ سے اپنے سرتاج کی خدمت کرنے لگتی ہوں۔ دیکھتی ہوں کہ خدمت سے ان کو قلبی سکون نصیب نہیں ہوتا، وہ اسے پھیکی محبت کہتے ہیں۔ میں مُسکرا دیتی ہوں مگر میری مُسکراہٹ میں مسرت کی کوئی کیفیت نہیں ہوتی۔

۱۹/ جولائی ۱۹۳۷ء

مرض ترقی کر رہا ہے اس کے ساتھ ساتھ کمزوری بھی بڑھتی جاتی ہے۔ رات کو سوتی ہوں تو یہ خیال آتا ہے کہ شاید اب آنکھ نہ کھُلے۔ ایک لمحہ کا بھی یقین نہیں رہا۔ ہر آنیوالی سانس پر آخری سانس کا گمان ہوتا ہے جو کچھ کرنا

ہوتا ہے اسی وقت کرلیتی ہوں۔ مایوسی اور الجھن ساتھ ساتھ بڑھ رہی ہے۔ خدا جانے کیوں اب مجھے گھر سے کچھ محبت ہونے لگی ہے۔ نادرہ کے لئے دل بیتاب سا ہو جاتا ہے۔ اکثر تنہائی میں والدین کی اُلفت اور ان کے ساتھ گزرے ہوئے دن یاد آتے ہیں۔ خدایا، کیا مجھے سب کو بیک وقت چھوڑنا پڑیگا؟

کاش! میرے مرنے سے پہلے "وہ" مجھے ایک بار اپنی صورت دکھا جاتے تو مجھے موت سے ذرا بھی ڈر نہ لگتا۔ مگر سماج نے تو مجھے سونے کے پنجڑے میں قید کر رکھا ہے۔

۱۳ ارمئی ۱۹۳۸ء

میں گور میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں، وہ کبھی ڈاکٹروں کو بُلالاتے ہیں، کبھی پہاڑ پر چلنے کو کہتے ہیں مگر میں کہتی ہوں کہ زمین پر گرا ہوا درخت پانی دینے سے ہرا نہ ہوسکیگا۔ سُنتی ہوں کہ "وہ" پھر شہر میں آگئے ہیں، اب تو بالکل پاگلوں کی سی حرکتیں کرنے لگے ہیں۔ کئی دن ہوئے شریر لڑکوں نے پتھر مار مار کر انھیں لہولہان کر دیا تھا۔ اب تو مجھ سے ان کی زبون حالی سُنی بھی نہیں جاتی۔ میرے مولا! اب تو مجھے اس دنیا سے اُٹھالے۔

اپنی ڈائری کے ساتھ شکیلہ بھی ختم ہوگئی۔ اب میں ہوں اور میری محبت کا تاج محل۔ ہر وقت ڈرتا رہتا ہوں کہ کہیں زلزلہ کا کوئی خفیف سا جھٹکا اُسے پاش پاش نہ کر دے۔

غزل

از جناب عرشی، بھوپالی

ذرّے ذرّے میں کوئی مستور ہے
ہر جگہ روشن چراغِ طور ہے

نشۂ کیفِ الم سے چور ہے
زخم کھاکر دل بہت مسرور ہے

اللہ اللہ رے نزاکت عشق کی
دل کی دھڑکن بھی صدائے صُور ہے

راہرو کے خاص تیور دیکھ کر
میں سمجھتا تھا کہ منزل دُور ہے

دیکھ کر جلوے نگاہیں لُٹ گئیں
یہ بھی کیا نظارہ کا دستور ہے

کر رہے ہیں مجھ سے وہ عہدِ وفا
اب تو ترکِ رسم بھی منظور ہے

اُف وہ نظریں اُف وہ پیہم التفات
عشق بھی کل سے بہت مغرور ہے

ہوں شریکِ آہ گرا جزائے دل
ہر دہائی نغمۂ منصور ہے

جانے والے او نگاہیں پھیر کر
سو جگہ سے شیشۂ دل چور ہے

اُس تجلّی کی ہے موسیٰ کو ہوس
جس کا پروانہ چراغِ طور ہے

اپنی بربادی کا عرشی کیا گِلہ
اِس جگہ خود حُسن بھی مجبور ہے

غزل

(از جناب کرشن سہائے ہنکاری ایڈووکیٹ کانپور المتخلص بہ وحشی)

محبت کی تجلی جب فروغِ راہِ دیں ہو گی
جبینِ شوق ہر سجدہ پہ کعبہ آفریں ہو گی

نقابِ رخ الٹ دے بے خیالِ خوفِ رسوائی
مری چشمِ تحیر تیرے جلووں کی امیں ہو گی

ابھی ہے دورِ تکمیلِ ذوقِ میکشی کر لے
کہ پھر شیشہ کہیں ساغر کہیں صہبا کہیں ہو گی

محبت خود پرِ پرواز ہے ہر قلبِ مضطر کی
یہ کیا منت کشِ بال و پرِ روح الامیں ہو گی

کہاں کا خوفِ رسوائی سر سودا تو ہونے دے
محبت رازِ حسن و عشق کی خود ہی امیں ہو گی

خدا جانے جنوں کا شغل کیا ہو گا بہاراں میں
نہ دامن ہی رہیں گے جیب باقی آستیں ہو گی

نہیں جاتی کسی صورت خلش تارِ رگِ جاں کی
خبر کیا تھی یہ تاثیرِ نگاہِ اولیں ہو گی

خیالِ خام ہے عقبیٰ پہ اس کا منحصر ہونا
گناہوں کا ترے پاداش اے وحشی یہیں ہو گی

یادِ رفتگان

دیوان بہادر راجہ نریندر ناتھ ایم، اے

(از پنڈت وشنو پرشاد فدا بی، اے)

راجہ نریندر ناتھ ایم، اے جن کا انتقال حال ہی میں ہوا ہے چند مایۂ ناز شخصیتوں میں سے ایک تھے، آپکی زندگی گوناگوں مصروفیتوں کا ایک مرقع تھی۔ آپ نہایت علم دوست بزرگ تھے، جنھیں عربی، فارسی اور سنسکرت کے ادب پر پُورا عبور تھا۔ اس کے علاوہ آپ پنجاب یونیورسٹی کے ایم، اے تھے اور بزمرۂ پی، سی، ایس آپنے پنجاب کے چند اضلاع میں ڈپٹی کمشنری کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ یہاں تک کہ کمشنری کے عہدہ کو بھی عارضی طور پر زینت بخشی۔ ڈپٹی کمشنری کے منصب سے سبکدوش ہونے پر آپنے بیسؔ سال کے قریب پنجاب کی سیاسی زندگی میں اہل پنجاب کی عموماً اور ہندوؤں اور سکھوں کی خصوصاً رہنمائی کی۔ آپ کے متعلق لوگوں کا صحیح اندازہ یہ ہے کہ آپ ہندو اور اسلامی تہذیب کے ایک نہایت فصیح البیان ترجمان تھے اور ان دونوں تہذیبوں کے درمیان ایک سنہری کڑی کا کام دیتے تھے۔

وارث روڈ پر آپکی قصر نما کوٹھی موجود ہے، یہ ایک ایسی معروف جگہ ہے جہاں بارہ مہینے ہندوستانی شہرت کے قومی اور ملکی لیڈر آتے اور ملکی تدابیر میں راجہ صاحب سے قیمتی مشوروں سے فیضیاب ہوتے تھے، راجہ صاحب راونڈ ٹیبل کانفرنس میں شامل ہو چکے تھے۔ اور ہندو مہاسبھا اور پنجاب ہندو سبھا کے ایک مسلمہ لیڈر رہے تھے لوگوں کے دلوں پر آپ کو پُورا اختیار حاصل تھا۔

آباؤ اجداد | آپ کا اصلی وطن کشمیر تھا۔ سنہ ۱۷۵۲ء میں ان کے جد امجد (پرداوا) پنڈت کشن داس احمد شاہ ابدالی کے مظالم اور سخت گیری سے تنگ آکر وطن سے نکل آئے اور مغل بادشاہوں کے عہد میں اپنی خداداد قابلیت اور تعلیمی حیثیت کی مدد سے باسودہ حالی گزر کرتے رہے۔ پنڈت کشن داس کے اکلوتے صاحبزادے پنڈت گنگارام بنارس کے قریب رام نگر میں پیدا ہوئے تھے، جو بعد میں مہاراجہ گوالیار کے دربار میں ایک اچھے منصب پر فائز ہو گئے، رفتہ رفتہ انکی دور اندیشی، قابلیت اور محاسن ظاہری و باطنی کی شہرت مہاراجہ رنجیت سنگھ کے کانوں تک پہونچی، مہاراجہ نے بڑی عقیدت سے پنڈت جی کو اپنے دربار میں طلب کیا اور جنگی ہیڈ کوارٹرز کا افسر اعلیٰ مقرر کر دیا۔ اس کے بعد آپ سنہ ۱۸۱۲ء میں ایک با اختیار حاکم ہو کر اثر و اقتدار کے نصف النہار پر پہونچے۔ مگر افسوس کہ سنہ ۱۸۲۶ء میں لاولد مر گئے۔ آپنے ایک قریبی رشتہ دار دیوان اجودھیا پرشاد کو متبنیٰ کر لیا تھا جو بعد میں ایک ہزار روپیہ پر کشمیر کے فوجی اسکول میں گئے۔ اس کے بعد

انھیں لاہور میں بُلالیا گیا اور مہاراجہ اور اُس کے یوروپین جرنیلوں کے درمیان ترجمانی کے لئے مقرر کئے گئے۔ یہ دونوں جرنیل فرانس سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی خاص فوجوں کے کمانڈر ہو کر آئے تھے۔ ۱۸۳۱ء میں دیوان اجودھیا پرشاد کو لفٹننٹ برنز کی ملاقات کے لئے منتخب کیا گیا جو شاہ انگلستان کی طرف سے کچھ گھوڑے، گھوڑیاں، اور ایک گاڑی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے لئے تحفے کے طور پر لیکر بمبئی سے آرہا تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے تدبّر اور بہادری کی شہرت شاہ انگلستان کے کانوں تک پہونچ چکی تھی اس لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ اس مقتدر مہاراجہ سے خلوص اور دوستی کے تعلقات قائم کئے جائیں۔

فرانسیسی جرنیلوں کی غیر حاضری میں دیوان اجودھیا پرشاد شاہی فوجوں کی پوری کمان پر فائز ہوئے اور راجہ ہیرا سنگھ کی طرف سے جب کچھ سیاسی مشکلات پیدا کی گئیں اُس وقت بھی دیوان اجودھیا پرشاد نے اپنی دانائی اور معاملہ فہمی کا ثبوت دیا جس کے صلہ میں اُنکی تنخواہ میں تین ہزار روپیہ ماہوار کا اضافہ کیا گیا اور ضلع حافظ آباد میں ایک جاگیر بھی دی گئی۔ اس کے بعد مصلحت وقت کی بناپر آپنے کپتان ایبٹ کے ساتھ مل کر کمشنری کے فرائض انجام دیے، سر رابرٹ منٹگمری نے ان کے لئے ساڑھے سات ہزار روپیہ کی تاحیات پنشن مقرر کرادی۔ اور ۱۸۵۲ء میں سپریم کورٹ نے ایک ہزار روپیہ کی مستقل پنشن اس کے علاوہ دی۔ اس کے بعد لاہور کے آپ آنریری مجسٹریٹ مقرر ہو گئے۔ اور ۱۲۰۰ ایکڑ زمین مل گئی۔ اور اور خلعتوں کے اعزازی تحفے عطا کئے گئے آخر کار ۱۸۷۰ء میں دیوان صاحب کا انتقال ہو گیا۔

دیوان اجودھیا ناتھ کے نقش قدم پر اُن کے اکلوتے بیٹے دیوان بیجناتھ نے اپنی زندگی نہایت کامیابی سے گزاری، غدر کے ایک سال بعد آپ تحصیلدار کے منصب پر فائز ہوئے اور چار سال میں آپ ای، اے، سی کے مرتبہ پر پہونچ گئے پھر ۱۸۷۰ء میں آپ ریاست کپورتھلہ میں ایک نہایت ذمہ وار عہدے پر مامور ہوئے لیکن جلد ہی وہاں سے آپ کو اپنے سابقہ منصب پر واپس آنا پڑا، کیونکہ حکومت ہند کی طرف سے وہ عہدہ ایک انگریز افسر کے سپرد کیا گیا۔ ۱۸۷۵ء میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

راجہ نریندرناتھ دیوان بیجناتھ کے نور نظر تھے۔ آپ کی عمر اپنے والد کی وفات کے وقت گیارہ برس کی تھی۔ آپنے اپنی خاندانی روایتوں کو بہت عمدگی سے نباہا۔ آپنے تعلیم کے اعلیٰ ترین مدارج طے کئے۔ پنجاب میں کمشنری تک کے جلیل القدر عہدوں پر کام کرتے رہے اور اُس کے بعد بیس برس سے زیادہ عرصہ تک پنجاب کی سیاسی زندگی میں ایک باثر رہنما کی طرح کام کیا۔ راجہ صاحب کی زندگی کا ایک خاص انداز یہ تھا کہ وہ حالات کا صحیح جائزہ لینے میں اپنے دماغ کا پورا پورا استعمال کرتے تھے اور دلی احساسات اور جذبات کو دخل نہ دیتے تھے۔ وہ واقعات کو اپنے اصلی روپ میں دیکھتے تھے اور شاعرانہ باتوں سے پرہیز کرتے تھے، اُنکی تقریریں مختصر اور مدلل ہوتی تھیں، وہ اپنے نظریہ میں چٹان کی طرح مضبوط رہتے تھے۔ ایک دفعہ جو رائے قائم کر لیتے تھے اسی پر مضبوطی سے قائم رہتے تھے، انصاف اور

امتیازی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ پنجاب اسمبلی میں آپ نے یونینسٹ پارٹی کی بنیاد ڈالنے میں سرسکندر حیات خاں کے ساتھ تعاون کیا لیکن جب اُنھوں نے دیکھا کہ مطلب سعدی دیگر است تو آپنے اسمبلی کی اعلیٰ سے اعلیٰ پوزیشن کو لات مار کر علیحدگی اختیار کر لی۔

اسی قربانی اور ایثار کی بدولت راجہ نریندر ناتھ آنجہانی نے اپنے لئے شہرت دوام حاصل کی ہے۔ گزشتہ بیس برس میں پنجاب کے قریباً ہر ایک پبلک کام میں آپ کی مدد شامل حال رہی۔ آپ ٹریبون، دیال سنگھ کالج ٹرسٹ سوسائٹی، دیال سنگھ لائبریری، ہندو ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ، پنجاب ہندو سبھا۔ آل انڈیا ہندو مہاسبھا۔ سرگنگارام ٹرسٹ اور اور بیسیوں بہبود عامہ کی درسگاہوں کے پریذیڈنٹ اور مرکزی ستون کی حیثیت میں کام کرتے رہے ہیں۔ اور ۸۱ برس کی عمر تک اُسی شد و مد کے ساتھ کام کرتے کرتے دارالقرار کو سدھارے ہیں۔

آپ مہاتما ہنسراج، لالہ لاجپت رائے اور پنڈت گورودت ودیارتھی ایم۔ اے کے ہم سبق تھے، آپ نے یونیورسٹی کے ایام میں ان مہاپرشوں کی دوستی کا شرف حاصل کیا اور ان سب سے زیادہ زندہ رہکر اُنھوں نے پنجاب کی سیاسی زندگی میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ آپ ایک سچے قوم پرست تھے۔ اور جداگانہ انتخاب اور فرقہ پرستی اور فرقہ داری کے دشمن تھے اور تمام عمر آپ نے اسی نیشنلسٹ جذبے کی حمایت کی، لیکن جب اُس انتہائی مقصد کے حصول کا امکان نظر سے دور دیکھا۔ اقلیتوں کی حق رسی کے لئے شب و روز کوشش کرتے رہے۔

آپ نے آخری روز تک اپنے روزانہ معمول کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ مرنے کے دن بھی آپ شام کی سیر کو گئے۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد کچھ دل میں تکلیف محسوس کی اور ڈاکٹروں کے پہونچنے سے پیشتر ہی حرکت قلب بند ہوجانے سے اپنی زندگی کے سفر کو ختم کر گئے۔ اب اُن کے بعد ان کا اکلوتا بیٹا دیوان آنند کمار اُن کا صحیح معنوں میں جانشیں ہے۔ اور پنجاب میں یونیورسٹی پروفیسر کے علاوہ درس و تدریس کے میدان عمل میں پوری کامیابی سے گامزن ہے۔ راجہ صاحب کی رانی بھی بقید حیات ہیں۔ راجہ صاحب کی بڑی لڑکی رامیشوری نہرو بڑے اونچے درجہ کی پبلک ورکر اور لیڈر ہیں۔

ہم اس تذکرہ کو اس اُمید کے اظہار سے ختم کرتے ہیں کہ راجہ نریندر ناتھ کی زندگی دورحاضرہ کے نوجوانوں کے لئے ایک عرصہ تک مشعل ہدایت کا کام کرے گی، اور آئندہ نسلیں اس محسن کی بے لوث زندگی اور بہبود عامہ کی خدمت کے جذبے کو اپنی زندگی میں ڈھالنے کی کوشش کریں گے۔

راجہ نریندر ناتھ کا نوحہ

(از جناب دتّاتریہ پرشاد قدائی، ایم اے)

دیکھ کر راجہ نریندر ناتھ کی ارتھی کے پھول
کھُل گیا آنکھوں کے پردے پر یہ حقانی اُصول

زندگی کرتے ہیں جو بھی لوگ اوروں پر نثار
لاش سے اُن کی لپٹ جاتی ہے خود آکر بہار

کرتے کرتے کام جیسے آدمی جاتا ہے لیٹ
ہاتھ منہ لیتا ہے اپنے آپ چادر میں لپیٹ

ختم کر کے کام سو جاتے ہیں یونہی نیک مرد
رُوح میں زندہ مگر رہتا ہے وطنیت کا درد

عمر پاکر جسم اُن کا خواہ ہو جائے نزار
آتما کا اور بھی جوبن پہ ہوتا ہے نکھار

دامنِ راحت میں جب بھی موت لیتی ہے انھیں
آنکھ اپنے آنسوؤں کی نذر دیتی ہے اُنھیں

اِک صفِ ماتم بچھا دیتے ہیں اُن کے سب فدا
مرنے والے کی مہک اُٹھتی ہے پھولوں سے سوا

نذرِ آتش ہو کے بھی مٹتی نہیں یہ ہستیاں
پھیل جاتا ہے وطن میں ان کے سینے کا دھواں

(۲)

خوبیوں کا اک مرقع تھے نریندر ناتھ بھی
شانِ قائم مادرِ بھارت کی اُن کے ساتھ تھی

اُن کے چہرے پر شگفتہ تھی شرافت کی بہار
مسکراہٹ اُن کی دنیا میں رہے گی یادگار

قدِ موزوں پر جوانوں سے نہ کم تھی راستی
بال اُن کے عزم کا پیری نہ بیکا کر سکی
آخری دم تک جلا کی زور سے شمعِ حیات
کر گئے رشیوں کا جیون موت سے اپنی وہ مات

---

(۳)

ہنس راج اور لاجپت رائے کے تھے وہ ہم سبق
قوم کی تاریخ کے تینوں ہوئے زرّیں ورق
تھا گورو دت بھی اُن ہی کے ساتھ کا اک نوجواں
بُجھ گئی اُس کی سرِ رہ جل کے شمعِ ناتواں
ایک نے تعلیم کو ارزاں کیا پنجاب میں
نام زندہ کر گیا ایثار کا پنجاب میں
دوسرے نے دیش کی سیوا کی طے کیں منزلیں
مدتوں اُس نے جلا وطنی کی جھیلیں آفتیں
تیسرا پہلے حکومت کا بڑا افسر بنا
اپنے منصب میں وہ مظلوموں کا چارہ گر بنا
بعد میں پچیس برسوں تک رہا ہے یہ شعار
دل رہا صبحِ وطن کے دیکھنے کو بے قرار
ہندو و مسلم سے کہتا تھا کہ مل جل کر رہو
دونوں آنکھوں کی طرح مل کر بہم دیکھا کرو
سکھ ہو عیسائی، جینی پارسی ہو کوئی ہو
سب سے کہتا تھا وقارِ ہند کو اونچا کرو

(۴)

ایک تھا وہ اور ہزاروں دل تھے اُس سے شاد کام
وہ نہیں تو ہو رہی ہے نیند آنکھوں کو حرام

درس گاہوں پر نظر آتے ہیں جھنڈے سرنگوں!
چھا رہی ہے ہر طرف وہ یاس، کیا تم سے کہوں؟

دل کے تاروں نے ہلا ڈالے ہیں سارے تارِ گھر
ہو رہی جذبات کی دنیا ہے کیا زیر و زبر؟

دیکھ کر ٹریبوں کے صفحوں کے کالے حاشیے
تھام کر اپنے کلیجے لوگ ششدر رہ گئے

آج علم و فضل کی دُنیا ہے سُونی ہو گئی
آنسوؤں کے سیل میں جذبوں کی دنیا کھو گئی

روحِ سردارِ مجیٹھا آج ہو گی سوگوار
دیکھ کر خطرے میں اپنی درسگاہوں کی بہار

مادرِ بھارت سے بیگانہ ہوا ہے لختِ دل
دل نے جا ڈیرہ جمایا کوہِ غم کے متصل

(۵)

رو رہے ہیں لوگ رونے کا بہانہ ڈھونڈھکر
ہے یہ سب مرگِ نریندر ناتھ صاحب کا اثر

لاکھ سمجھاتے ہیں، مت ہو لے دلِ ناداں حزیں
ایسے محسن زندۂ جاوید ہیں، مرتے نہیں

دل کی دنیا میں عقیدت سے اُنھیں آباد رکھ
ہاتھ پھیلا کر دعا کر، اُن کے احساں یاد رکھ

اے فدا مرحوم کو ہو راحتِ ابدی نصیب
جاوداں رکھے اُسے حق اپنی رحمت کے قریب

تصحیح: افسوس ہے کہ زمانہ بابت مارچ ۱۹۴۰ء کے صفحہ ۲۲ کی پہلی سطر میں "پستی" کی طرف درج ہوگیا ہے۔ یہاں "پستی سے بلندی کی طرف" ہونا چاہیئے۔

اسی پرچہ میں حضرت بیتاب بریلوی کا افسانہ "ثمر ممنوعہ" شائع ہوگیا ہے "ثمر ممنوع" ہونا چاہیئے۔

راجہ نریندر ناتھ کی وفات پر

از جیمنی سرشار خیرپور سادات ضلع مظفر گڈھ

دونیم دل نہ ہوں کیونکر وفات سے تیری
ہزار فیض تھے ہم کو حیات سے تیری
عمل کا جوش عیاں بات بات سے تیری
وطن کو کتنی اُمیدیں تھیں ذات سے تیری

کوئی اُمید رہی ہے نہ آسرا باقی!
نہیں جو تو ہی وطن میں تو اب ہے کیا باقی!

وطن کو دیکھ کے رسوا، ذلیل، خستہ حال
چمن کو دیکھ کے بوسیدہ خشک اور پائمال
دل و جگر تھا ترا فکر و رنج و غم سے نڈھال
خموش بیٹھ سکا تو نہ ملک و قوم کے لال

نظر کے سامنے منظر ہو یوں تباہی کا
لہو اُبل نہ پڑے قوم کے سپاہی کا

خدائے پاک نے بخشی تجھے حکومت بھی
شکوہ شان بھی عزت بھی، جاہ و حشمت بھی
صفائے قلب بھی، مہر و وفا کی دولت بھی
نمود و نام بھی، شہرت بھی اور عظمت بھی

مگر ملا نہ کہیں راحت و سکوں تجھکو
کہ اپنی قوم کی خدمت کا تھا جنوں تجھکو

ہوئی جو خدمت سرکار سے سبکدوشی
برائے راحت و آرام و عافیت کوشی
دل و ضمیر میں ہونے لگی یہ سرگوشی
کہ صرف ذوق شکم پروری و تن پوشی

تمام عمر ہوئی بھی تو کیا ہوئی افسوس!
بشر کا ہو یہی معیارِ زندگی، افسوس!

جب آیا دہر میں انساں تو کوئی کام کرے
کسی کی رفع مصیبت کا انتظام کرے
جہاں تک اس سے ہو کارِ رفاہِ عام کرے
بڑھائے قوم کی عزت، وطن کا نام کرے

یہ زیست کیا ہے کہ کھا پی کے مر گیا انساں
جہاں میں اپنے لئے جی کے مر گیا انساں

جو خود غرض کوئی دنیا میں سر اُٹھاتا ہے
جفا و جور سے رنگ اپنا کچھ جماتا ہے
زمانہ خاک میں پھر جب اسے ملاتا ہے
کسی کے لب پہ کہاں اس کا نام آتا ہے

دلوں میں پہلے نہ تھا اب زبان سے بھی گیا
یہاں کا بھی نہ رہا، اُس جہان سے بھی گیا

ہزار شکر نہ ایسوں میں تھا شمار ترا
ہوا نہ دامنِ اخلاق داغدار ترا
ہے بعد مرگ بھی اس سے وہی وقار ترا
زباں پہ تذکرے تیرے دلوں میں پیار ترا

ہے اپنے بزم کی رونق ترے فسانے سے
فدائے قوم! نرالا تھا تو زمانے سے

زباں ہو، دل ہو، قلم ہو، سٹیج یا اخبار
نہ اپنے فرض سے غافل رہا کہیں زنہار
کسی بشر کو بھی اِس بات سے نہیں انکار
سبھا، سماج، وطن، کانگرس ہو یا سرکار

کسی کے سامنے رُکتی نہ تھی زباں تیری
بدن ضعیف تھا، ہمت مگر جواں تیری

وطن پرست بھی تھا، حامیِ حکومت بھی
عجیب چیز بھی راجا! تری طبیعت بھی
وفا بھی رکھتا تھا سینے میں، جوشِ غیرت بھی
رگوں میں خون بھی تھا، خون میں حرارت بھی

کسی کی بات کو جب ناپسند کرتا تھا
مخالفت کی صدا بھی بلند کرتا تھا

زبسکہ خلق ہے خوگر زمانہ سازی کی
سمجھ رہی ہے سبیل اس کو سرفرازی کی
عمل سے قدر سوا ہے زباں درازی کی
مگر قسم ہے ہمیں تیری پاکبازی کی

وفا شناس دیا ہے خدا نے دل جن کو
کبھی نہ بھول سکیں گے وہ تجھ سے محسن کو

رفتارِ زمانہ

مئی ۱۹۴۵ء کا مہینہ واقعات کے لحاظ سے بہت ہی اہم تھا۔ اس ماہ میں جنگ یورپ کا خاتمہ ہوگیا جرمنی نے اتحادیوں کے سامنے بلا کسی شرط کے ہتھیار ڈال دئے، ہٹلر نے شکست اور ناکامی کا منہ دیکھ کر اس دنیا سے ناامراد عالم کو کوچ کیا، سان فرانسسکو میں بین الاقوامی انجمن کا پہلا اجلاس منعقد ہوا اور برطانیہ میں مخلوط وزارت کا خاتمہ ہو کر نئے انتخابات کا اعلان ہوا۔

یکم مئی ۱۹۴۵ء کو ایڈولف ہٹلر کے انتقال کی اچانک خبر آئی۔ اس کے خاتمہ کے متعلق مختلف روایتیں ہیں، ایک روایت تو یہ ہے کہ ہٹلر برلن میں چانسلری کی عمارت میں فوج کی کمان کر رہا تھا کہ ایک روسی گولہ نے اسکی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ ہٹلر نے خودکشی کر لی۔ تیسری روایت یہ ہے کہ جب ہٹلر ہر طرف سے مایوس ہوگیا تو اس کے حکم سے اس کے طبیب خاص نے اس کو زہریلا انجکشن دیکر اس کو موت کی نیند سُلا دیا۔ اب روسی ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ آخری روایت صحیح ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ روسیوں کو تلاش کرنے سے ایک سوختہ لاش ملی ہے جو تحقیق کے بعد ہٹلر کی کہی جاتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہٹلر کے جرمنی سے فرار کے متعلق جو مختلف روایتیں مشہور تھیں وہ سب غلط ثابت ہوئیں اور دنیا کے امن کو اب اسکی شخصیت سے کوئی خطرہ باقی نہیں رہا۔

روسی فوجوں کے برلن کو پورے طور پر فتح کر لینے کے بعد جرمن خفیہ پولیس کے افسر اعلیٰ اور ہٹلر کے دست راست ہمر ہملر نے برطانیہ وامریکہ کے سامنے "بلا شرط" ہتھیار ڈالدینے کی پیشکش کی لیکن اسی کے ساتھ روس کے خلاف لڑائی جاری رکھنے پر اصرار کیا۔ برطانیہ وامریکہ نے اس درخواست کو نامنظور کر دیا۔ اس کے بعد ہملر کے بارہ میں کوئی بات سُننے میں نہیں آئی مگر یہ اطلاع آئی کہ ہٹلر نے اپنے مرنے سے پہلے گرانڈ امیر البحر ڈونیز کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا اور امیر البحر مذکور نے بلا شرط ہتھیار ڈالدینا منظور کر لیا چنانچہ جرمن فوجوں نے ہر طرف ہتھیار ڈالنا شروع کر دئے لیکن جو جرمن کمانڈر چیکوسلاوکیہ میں تھا اس نے روسیوں کے خلاف مزاحمت کا سلسلہ چند دنوں جاری رکھا لیکن آخرش اُس نے بھی ہتھیار ڈالدیے اس طرح ۹ مئی کو سرکاری طور پر اعلان ہوگیا کہ یورپ کی لڑائی ختم ہوگئی۔

لیکن یورپ میں لڑائی ختم ہوجانے پر امن مستقبل کے پیچیدہ مراحل نمودار ہو گئے ہیں اور اتحادیوں کے درمیان ایسے ذہنی اختلافات پیدا ہو گئے ہیں جن کا حل جنگ جاری رکھنے سے کہیں زیادہ مشکل ہے اس کے علاوہ دیکھنا یہ ہے

کہ آیا اتحادی تدبر و دانشمندی سے کام لیکر ایسی صلح کا سنگ بنیاد رکھتے ہیں جو فاتح اور مفتوح دونوں کے حق میں منصفانہ ہو یا محض صلح ورسائی کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ نیز وہ دنیا میں امن و امان کے قیام کے لئے کوئی ایسی تجاویز پیش کرتے ہیں جو واقعی مؤثر اور مقبول ہونگی یا انکی تجاویز محض یک طرفہ اور خود غرضی پر مبنی ہونگی۔ بالفاظ دیگر دیکھنا یہ ہے کہ اتحادی ان اعلیٰ مقاصد کو پیش نظر رکھ کر جن کے ماتحت کہا جاتا تھا کہ اُنھوں نے فیسطائیت کے خلاف جنگ کی تھی اور جن کا اعادہ وقتاً فوقتاً دوران جنگ ان کے ملکی لیڈر کیا کرتے تھے۔ خود غرضی و ذاتی مفاد سے قطع نظر دنیا کی نئی ترتیب و تشکیل کرتے ہیں یا پرانا نظام محض خفیف وغیر اہم تغیر و تبدل کے بعد بدستور قائم رہتا ہے۔ کسی مدبر نے سچ کہا تھا کہ امن کے خطرات جنگ کے خطرات سے زائد ہیں۔ فی الواقع اتحادیوں کے طرز عمل پر ہی منحصر ہے کہ آیا اب دنیا میں مستقل امن و امان کا دور دورہ ہوگا یا موجودہ واقعات اس جنگ سے زیادہ ہولناک تیسری عالمگیر جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوں گے۔

جہاں تک اتحادیوں کے باہمی اختلافات کا سوال ہے وہ مندرجۂ ذیل ہیں:۔

۱۔ جب ۱۹۳۹ء میں پولینڈ کو جرمنوں نے شکست دی اور روسیوں اور جرمنوں نے مل کر پولینڈ کے حصے بخرے کر لئے تو پولینڈ کی گورنمنٹ بھاگ کر لنڈن چلی آئی تھی اور اب تک وہیں ہے۔ اس گورنمنٹ کو برطانیہ و امریکہ پولینڈ کی جائز اور صحیح گورنمنٹ تسلیم کرتے ہیں۔ روس اس حکومت کو تسلیم نہیں کرتا۔ جب روس نے پولینڈ کو فتح کیا تو اس نے وہاں اپنے زیر سایہ پولینڈ کی لبلن گورنمنٹ قائم کر کے اس کو تسلیم کر لیا لیکن برطانیہ اور امریکہ نے اس گورنمنٹ کو تسلیم نہیں کیا ہے۔

۲۔ دوسری چال روس نے یہ چلی کہ اس نے لبلن گورنمنٹ سے بیس سال کیلئے دوستانہ معاہدہ کر لیا۔

۳۔ روس نے آسٹریا کے اس علاقہ میں جس پر روسی قبضہ ہے اپنے زیر اثر ایک گورنمنٹ قائم کر دی ہے، مگر مغربی اتحادیوں سے اس بارہ میں کوئی مشورہ نہیں لیا۔ مغربی اتحادیوں نے آسٹریا کی روسی گورنمنٹ کو تسلیم نہیں کیا۔

۴۔ روس نے سولہ پوستانی لیڈروں کو اس الزام میں گرفتار کر لیا کہ وہ روسی فوجوں کے پیچھے تخریبی اور خطرناک کارروائیاں کر رہے تھے۔ پولینڈ کی گورنمنٹ مقیم لندن کا بیان ہے کہ ان ۱۶ لیڈروں کو خود روس نے گفت و شنید کے لئے طلب کیا تھا۔ برطانوی دارالعوام میں اس فعل کی مذمت کی گئی۔

۵۔ جب جرمن فوجوں نے شمالی اطالیہ خالی کیا تو یوگوسلافیہ کی فوجوں نے آگے بڑھ کر اٹلی کی بندرگاہ ترئیسٹ پر قبضہ کر لیا بعد میں انگریزی فوجیں بھی بندرگاہ مذکور میں داخل ہوگئیں۔ مارشل ٹیٹو کا دعویٰ ہے کہ اس کی فوجوں نے بندرگاہ ترئیسٹ کو دشمنوں سے لیا ہے، لہذا یوگوسلافیہ کو وہاں اپنا فوجی قبضہ رکھنے کا حق ہے۔ مارشل ٹیٹو نے صوبہ کارنتھیا پر بھی یوگوسلافیہ کا حق بتلایا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یوگوسلافیہ جیسی کمزور سلطنت کا برطانیہ و امریکہ کی آنکھیں دکھانا خالی از علت

نہیں ہے۔ یہ اس لئے شک کیا جاتا ہے کہ مارشل ٹیٹو روس کے بھروسہ پر یا روس کے اشارہ سے یہ کاروائی کر رہا ہو۔
۶۔ روس سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ پولینڈ کی حکومت کو از سر نو مرتب کرے جس میں دوسرے عوامیت پسند پولستانی لیڈر بھی داخل ہوں۔ روس نے اس کے لئے ایسی شرطیں پیش کر دی ہیں جن کا پورا ہونا مشکل ہے۔
۷۔ چینی ترکستان میں بغاوت کا مادہ پک رہا ہے جس کی تہ میں روس کا ہاتھ بتایا جاتا ہے۔ اگر یہ بغاوت پھوٹ نکلی تو ایک فریق کی پشت پناہی روس کریگا اور اس کا مقابلہ برطانیہ و امریکہ کرینگے تاکہ بالشوزم سے مشرق محفوظ رہے۔
۸۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ روس برلن میں اپنے اقتدار میں ایک جرمن گورنمنٹ قائم کرنا چاہتا ہے تاکہ شمال مشرقی جرمنی، چیکوسلاویکیہ، پولینڈ، آسٹریا، ہنگری، رومانیہ، بلغاریہ، یوگوسلافیہ میں کمیونسٹ حکومتیں قائم ہو جائیں، اور اس طرح جرمنی کی بندرگاہ اسٹیٹن سے تریستہ تک تمام یوروپ بالشویک اقتدار میں آجائے۔
الغرض روس اور برطانیہ و امریکہ کے درمیان اس قسم کے شبہات و شکوک پیدا ہو گئے ہیں۔ ممکن ہے ان میں سے بعض صحیح اور بعض غلط فہمیاں ہوں۔ لیکن جب تک یہ شکوک و شبہات رفع نہ ہوں گے، دنیا میں امن و امان قائم ہونا ناممکن ہے۔

شام و لبنان سنہ ۱۹۴۰ء میں جب وشی گورنمنٹ نے جرمنی سے صلح کر لی تو شام و لبنان میں جو وشی گورنمنٹ کے ماتحت تھے نازیوں کا داخلہ شروع ہو گیا اور اندیشہ پیدا ہو گیا کہ وشی گورنمنٹ شام و لبنان کے ہوائی اور بحری اڈے جرمنی کو دیدیگی۔ اس وقت فرانس کی آزاد فوج اور انگریزی سپاہ نے شام و لبنان پر حملہ کرکے وہاں سے نازیوں کو نکالدیا۔ اور ان دونوں ملکوں کو وشی گورنمنٹ سے آزاد کرا لیا، اس کے بعد جب شام و لبنان میں تحریک آزادی نے زور پکڑا اور شورش کا خطرہ پیدا ہو گیا تو فرانسیسی جنرل کاترو نے آکر فرانس کی طرف سے شام و لبنان میں آزادی و خود مختاری کا اعلان کر دیا اور حکومت برطانیہ و امریکہ نے بھی شام و لبنان کی آزادی کی گارنٹی کی۔ فرانسیسی جنرل ڈیگال نے مصلحت وقت سمجھ کر اس اعلان کو بادل ناخواستہ منظور کر لیا۔ اب جبکہ برطانیہ و امریکہ کے طفیل فرانس آزاد ہو گیا ہے تو جنرل ڈیگال نے شام و لبنان میں فرانسیسی فوج بھیجکر حسب ذیل مطالبات پیش کر دئے۔
۱۔ شام و لبنان میں فرانس کے کلچرل مفاد کا تحفظ کیا جائے اور فرانس نے جو بہت سے اسکول شام و لبنان میں قائم کئے ہیں ان کے قواعد و ضوابط، انکی آزادی اور ان کے حقوق تسلیم کئے جائیں۔
۲۔ فرانس کے اقتصادی مفاد کے تحفظ کی گارنٹی دی جائے۔
۳۔ فرقوق سے لیکر طرابلس تک جس نل کے ذریعہ سے فرانس کا تیل آتا ہے اسکی حفاظت کی گارنٹی دیجائے۔
۴۔ فرانسیسی ہوائی اور بحری جہازوں کو مشرق کی طرف جانے کیلئے ہوائی اور سمندری اڈے دیے جائیں اور بعض بندرگاہیں حوالہ کیجائیں جن میں فرانس کے جنگی جہاز لنگر انداز ہو سکیں۔

شام اور لبنان کی حکومتوں نے فرانس کے مطالبات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس وقت شام و لبنان میں فرانسیسیوں اور شامیوں میں جنگ تک کی نوبت پہنچ گئی۔ فرانس اپنے مطالبات بزور شمشیر منوانے پر تل گیا۔ دمشق پر فرانسیسی توپخانوں نے بمباری کی۔ حلب۔ حمص اور حما میں شامیوں اور فرانسیسی فوجوں کے درمیان ٹکر ہوئی جس میں فریقین کا اتلاف جان ہوا۔ تمام عرب سلطنتوں نے شام ولبنان کی مدد کرنیکا اعلان کر دیا۔ اگر گفت وشنید کے ذریعہ سے معاملہ طے نہ ہوا تو تمام مشرق وسطیٰ میں آگ لگ جائیگی جس کا اتحادیوں کے مفادات پر بہت خراب اثر پڑیگا۔ برطانیہ وامریکہ آپس میں سمجھوتہ کرانے کی فکریں کر رہے ہیں اور سلسلہ گفت وشنید جاری ہے۔ اور طرفہ یہ ہے کہ فرانس کے نزدیک شام ولبنان کی سرکشی کے پس پشت انگریزوں کا ہاتھ ہے۔

برطانیہ میں انقلاب حکومت برطانیہ میں آجکل تین خاص سیاسی پارٹیاں ہیں۔ (۱) کنسرویٹو پارٹی جس کے لیڈر مسٹر چرچل ہیں (۲) لیبر پارٹی جس کے لیڈر مسٹر اٹیلی ہیں اور (۳) لبرل پارٹی جس کے لیڈر سر آرچبالڈ سنکلیر ہیں۔ یوروپ کی جنگ ختم ہونے تک ان تینوں پارٹیوں کے سر جڑے رہے اور تینوں پارٹیوں پر مشتمل ایک مخلوط گورنمنٹ قائم رہی جس میں وزیر اعظم مسٹر چرچل تھے لیکن بعض معاملات میں مسٹر چرچل اور لیبر پارٹی کے بعض لیڈروں میں کچھ کشیدگی پیدا ہو گئی جو جنگ یوروپ ختم ہونے کے بعد زیادہ زور پکڑ گئی۔ لیبر پارٹی نے پارلیمنٹ کے نئے انتخابات کا مطالبہ کیا۔ مسٹر چرچل نے چاہا کہ جاپان کو شکست دینے تک مخلوط گورنمنٹ قائم رکھی جائے لیکن لیبر پارٹی نے یہ بات منظور نہیں کی اور وزارت میں شامل رہنے سے انکار کر دیا۔ جب مسٹر چرچل نے کوئی چارہ کار نہ دیکھا تو انھوں نے اپنی وزارت کا استعفا داخل کر دیا۔ اور اس کے منظور ہو جانے کے بعد یہ اعلان کیا کہ (۱) ۱۵ جون ۱۹۴۵ء کو موجودہ پارلیمنٹ توڑ دی جائیگی (۲) ۵ جولائی کو نئے الکشن شروع ہوں گے اور (۳) ۲۷ جولائی تک الکشن کے نتائج کا اعلان ہوگا اس کے بعد جس پارٹی کی اکثریت ہوگی اسی کی حکومت قائم ہوگی۔ مخلوط وزارت ختم ہو جانے پر مسٹر چرچل نے کنسرویٹو پارٹی کی عارضی وزارت قائم کر لی ہے جو نئے انتخابات تک کام کرتی رہیگی۔

اب سب پارٹیاں الکشن کی جدوجہد میں مصروف ہیں جس کے سلسلہ میں مختلف پارٹیاں ہندوستان کا بھی ذکر خیر کرتی ہیں۔ لیکن ہمیں امید نہیں کہ اس ملک کو برطانیہ کی کوئی بھی سیاسی پارٹی کوئی اہم اختیارات عطا کریگی۔

سان فرانسسکو کانفرنس دنیا میں مستقل امن وامان قائم کرنے کی تدابیر بروئے کار لانے کے لئے ۴۹۔ اتحادی قوموں کی ایک کانفرنس ۲۵ اپریل ۱۹۴۵ء سے امریکہ کے مقام سان فرانسسکو میں منعقد ہو رہی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ ڈمبارٹن اوکس کانفرنس میں جو اسکیم مرتب کی گئی تھی اس پر مزید غور وخوض کر کے دنیا کے مستقبل کے امن وامان کا ایک چارٹر مرتب کیا جائے تاکہ دنیا آئندہ جنگ کے خطرات سے مامون ومصئون رہے۔

یہ کانفرنس اب قریب قریب ختم ہو چکی ہے۔ بڑی بڑی طاقتوں کے وزرائے خارجہ اور بڑے بڑے نمائندے

اپنے ملکوں کو واپس چلے گئے ہیں اور ہندوستان کے "نمایندے" بھی اپنا کارنامہ دکھا کر بالخیر واپس آگئے ہیں اس کانفرنس میں کیا مسائل پیش ہوئے اور کیا کیا نتائج برآمد ہوئے اس بارہ میں جو اطلاعات منظر عام پر وقتاً فوقتاً آتی رہی ہیں وہ عموماً مبہم اور نامہ نگاروں کے خیالات پر مبنی ہیں اس لئے ان رپورٹوں کی بنا پر ہمارے لئے کسی خاص نتیجہ تک پہونچنا بہت مشکل ہے۔ بایں ہمہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض اہم باتوں پر سمجھوتہ ہوگیا ہے لیکن بڑی بڑی طاقتوں کے دلوں میں صفائی نظر نہیں آتی۔ اور اندیشہ ہے کہ اس کانفرنس کے فیصلوں کے باوجود بڑی بڑی طاقتوں میں اثر و اقتدار کے لئے رسہ کشی جاری رہیگی اور ڈپلومیسی کے میدان میں بدستور گھوڑے دوڑتے رہیں گے۔

سان فرانسسکو کانفرنس میں جو اہم مسائل زیر بحث آئے وہ (۱) علاقہ جات انتدابیہ کی بین الاقوامی تولیت (ٹرسٹی شپ) (۲) ریاست ارجنٹائن کی رکنیت (۳) حکومت پولینڈ کی تشکیل (۴) حق استرداد کا سوال تھے، تولیت کے معاملہ میں پہلے برطانیہ، فرانس و امریکہ نے روسی تجویز کی مخالفت کی۔ لیکن جب معاملہ بگڑتا نظر آیا تو کسی قدر ترمیم کے ساتھ روس کی تجویز منظور کر لی گئی۔ امپیریلیسٹ طاقتوں کی تجویز یہ تھی کہ علاقہ جات زیر انتداب کو "سلف گورنمنٹ" تک پہونچا دیا جائے لیکن روس کی یہ خواہش تھی کہ منزل مقصود "آزادی و خود مختاری" ہونی چاہئے۔ پولینڈ کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہوگیا تھا لیکن جب پریسیڈنٹ ٹرومین کے ایلچی مسٹر ہاپکنس نے ماسکو جا کر گفت و شنید کی تو روس نے وارسا گورنمنٹ میں توسیع کر دینا منظور کر لیا ہے اور ان سولہ پولستانیوں میں سے جو روس میں گرفتار کر لئے گئے تھے۔ پندرہ کو رہا کر دیا گیا ہے۔ ارجنٹائن کو کانفرنس میں نشست دئے جانے کی روس نے مخالفت کی تھی لیکن اس کو شکست ہوئی اور ارجنٹائن کو شریک کر لیا گیا۔ اب آخر میں صرف حق استرداد (ویٹو) کا مسئلہ رہ گیا ہے، یقین کیا جاتا ہے کہ اس پر بھی کوئی نہ کوئی سمجھوتہ ہو جائیگا۔ اس کے بعد کانفرنس کی تمام کارروائی ایک سند اعظم (چارٹر) کی صورت میں شائع ہوگی۔

برہما | برہما میں اتحادیوں کو عظیم الشان فتوحات حاصل ہوئی ہیں۔ ۳ مئی کو اتحادیوں نے ہوائی اور بحری جہازوں سے فوج اُتار کر رنگون پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد دہانہ دریائے ایراوتی کی آخری بندرگاہ بسین پر بھی اتحادیوں کا قبضہ ہوگیا۔ رنگون چھوڑنے کے بعد جاپانی فوجیں مشرق کی طرف فرار ہوگئیں اور اب ان کی رسد کا تمام انحصار مولمین بنکاک ریلوے لائن پر ہے۔ ۱۳ مئی کو اتحادی ہوائی جہازوں نے بنکاک سنگاپور ریلوے کا چھ سو فٹ لمبا پل توڑ دیا۔ جاپانی فوجیں پیگو اور مرتبان کی طرف ہٹتی جا رہی تھیں اور ان کا ارادہ مولمین کی طرف جانے کا معلوم ہوتا تھا لیکن یکایک پھر ٹھہر گئیں اور انھوں نے منظم ہو کر پھر لڑنا شروع کر دیا ہے، دوسرے برہما میں بارش بھی شروع ہوگئی ہے جس سے لڑائی اور رسد رسانی میں مزید دقت پیش آتی ہے۔ اس وقت ایک جاپانی فوج ٹانگو ٹاپی روڈ پر ۱۹ ہندوستانی ڈویژن کا سخت مقابلہ کر رہی ہے اور جاپانیوں نے دریا کا پل بھی توڑ دیا ہے جس کی وجہ سے اتحادی ٹینکوں کی

رفتار رک گئی ہے، دوسری جاپانی فوج ٹیگو سے ۴۴ میل شمال مشرق توآشتدا کے علاقہ میں مزاحمت کر رہی ہے۔

چین | چینیوں نے بھی جاپانیوں کے خلاف نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہیں، اُنھوں نے جاپانیوں کی پیشقدمی
صوبہ چیہ کیانگ میں روک دیا ہے بلکہ صوبۂ فوکین کی بندرگاہ فوچاؤ پر بھی قبضہ کر لیا ہے جو جزیرہ فارموسا کے
ایک چینی دستے نے فوچاؤ کے جنوب میں جاپانیوں سے طیارہ میدان بھی چھین لیا ہے۔ فوچاؤ ایسی بندرگاہ ہے جہاں
امریکن فوجیں اُتارے جانے کا امکان ہے۔

مارشل چیانگ کائی شیک چین کی وزارت عظمیٰ سے مستعفی ہو گئے ہیں اور اب ان کی جگہ مسٹر سونگ سابق وزیر خارجہ
وزیر اعظم ہو گئے ہیں۔

جزائر بحر الکاہل | فلیپائن کے جزیرہ لیوزان میں جاپانیوں کی قوت مزاحمت ٹوٹ گئی ہے اور اب وہ سیتتانی کے مغربی
سمت بھاگ کر پہاڑیوں میں پناہ لے رہے ہیں اور کچھ جاپانی فوجیں وادی دریائے کاگاین میں ہٹ گئی ہیں۔
منیلا کے مشرق میں دواؤ ڈام کے آس پاس جو جاپانی فوجیں رہ گئی تھیں ان کا صفایا کیا جا رہا ہے
منڈاناؤ میں امریکن فوجوں نے مقام دواؤ فتح کر لیا ہے اور اب اس جزیرہ میں جاپانی فوجیں مغرب کی طرف
پسپا ہو رہی ہیں۔

نیو گنی میں آسٹریلوی فوجوں نے بھی ویواک کے علاقہ میں پیشقدمی کی ہے، جزیرۂ تاراکان میں بھی، جو بورنیو کے
مشرق میں واقع ہے آسٹریلوی فوج معقول پیشقدمی کر رہی ہے اور امریکن جنگی جہاز اس کی مدد کر رہے ہیں۔

بحر الکاہل میں سب سے زیادہ خونریز لڑائیاں اوکیناوہ میں ہو رہی ہیں جہاں جاپانی فوجیں بڑی سختی سے
مقابلہ کر رہی ہیں۔ جاپانیوں کا دعویٰ ہے کہ اُنھوں نے اوکیناوہ کے سمندر میں پانسو امریکن جہاز ڈبو دئے ہیں مگر جاپان
ایک جہاز ڈبوتا ہے تو امریکہ دو جہاز نئے لے آتا ہے۔ اور اگر جاپان ایک امریکی طیارہ تباہ کرتا ہے تو امریکہ بیس نئے
طیارے لے آتا ہے۔

امریکہ کے بڑے بڑے بمبار ہوائی جہازوں نے جاپانی شہروں پر شدید بمباری کی ہے اور ٹوکیو کی تو اس
اینٹ سے اینٹ بجا دی ہے کہ اب اس کی دوبارہ تعمیر ہونے کے لئے کثیر وقت چاہیئے۔ یاکوہامہ پر بمباری کر کے
ہوائی جہازوں نے ساٹھ ہزار گھر تباہ و برباد کر دیے ہیں جس سے تقریباً دو ڈھائی لاکھ جاپانی خانماں برباد ہو گئے
اسی طرح امریکن ہوائی جہازوں نے جاپان کے دوسرے اہم شہروں اور بندرگاہوں اوساکا، کوبی وغیرہ کو
تباہ و برباد کر دیا ہے۔

زمانہ

بیادگار منشی دیا نراین صاحب نگم مرحوم

جلد ۸۵ | جولائی سنہ ۱۹۴۵ء | نمبر ۱

فہرست

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

آپ اپنی
کمزوری کو نہیں چھپا سکتے
دوسرے لوگ جانتے ہیں اور عورتیں جلد محسوس کر لیتی ہیں کہ آپ کیا ہیں موجودہ زمانے
میں کمزور دل شرمیلے اور جھجکنے والے آدمی کیلئے کوئی گنجایش نہیں دنیا کو اسکی ضرورت
نہیں یقیناً آپ اس قسم کے لوگوں میں اپنے کو شمار ہوتا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے صحیح معنوں میں
زندگی کا لطف حاصل کیجئے
اگر آپ کمزور اور بناوٹی مرد ہیں اگر آپ پر دنیا ہنستی ہے اور آپکے
متعلق سرگوشیاں ہوتی ہیں آپکا ذکر حقارت سے کیا جاتا ہے تو اسکے یہ
معنی ہیں آپکے پاس کوئی معقول عذر نہیں آپکا اپنا قصور ہے کہ آپ کمزور اور نامرد ہیں
آپ صحیح معنوں میں مرد بن سکتے ہیں
ایسے مرد جس کی سب تعریف کریں اور عزت کریں قطع نظر اسکے کہ
آپنے گزشتہ زمانے میں اپنی قوت کے متعلق کتنی لاپرواہی سے کام لیا
ہے اور کن کن بدعنوانیوں کے مرتکب ہوئے ہیں۔ آپ بھی
محمود
اب دنیا کی مشہور دوا
طلاء حسنا
جو فخر خاندان شریفی عالیجناب افضل الاطباء حکیم محمد زکریا خانصاحب رئیس اعظم دہلی و سرپرست شریفی دواخانہ کی مایۂ ناز
ایجاد ہے اور جس کے جادو اثر اور حیات پرور ہونے کا ہزاروں مایوس العلاج مریض اعتراف کر چکے ہیں۔ طلاء حسنا
کے زندگی کا حقیقی لطف حاصل کیجئے، پہلے یہ طلاء نوابوں، راجاؤں کیلئے مخصوص تھا آج بلا دریغ پیش کیا جاتا ہے
نہیں وقت پر پہلے ہی روز کے استعمال سے طلسماتی اثر ظاہر ہوتا ہے ناکارہ سے ناکارہ شخص بے پناہ قوت کا مالک بن جاتا ہے اور چند
روز کے استعمال سے جملہ نقائص دور ہو جاتے ہیں اور پھر تمام عمر کسی طلاء کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔
قیمت:۔ فی شیشی پانچ روپے جو پندرہ دن کے لئے کافی ہے۔ ترکیب استعمال ہمراہ دوا۔
شریف دواخانہ

جلد ۸۵ جولائی سنہ ۱۹۴۵ء نمبر ۱

غزل اُردو یا تصویر کا ایک ہی رُخ

(از مسٹر سلیم جعفر)

غزل کے لغوی معنی ہیں عورتوں سے باتیں چیتیں کرنا اور اصطلاحی معنی عاشق کا اپنے معشوق کے ہجر یا وصل کے خیالات کو وسعت دیکر اس کے بیان سے دل کا ارمان یا غم کا بخار نکالنا۔ اور زبان بھی وہ گویا دونوں آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔

کیا ہماری اُردو اور ہندی کی غزل پر یہ تعریف صادق آتی ہے؟ اگر آتی ہے تو کس حد تک؟

ان دونوں سے واقف بے تامل بول اُٹھے گا کہ ہماری غزل میں اگر یہ باتیں نہیں تو ہے کیا؟ ہمیں بھی تسلیم ہے کہ اُردو کی غزل اور ہندی کے شرنگار رس (جو ہندی میں اُردو کی غزل کا جواب ہے) وہ دفتر ہیں جو عاشق و معشوق کے اُن رازوں کی تفسیر کرتے ہیں جن کی کراماً کاتبین کو بھی خبر نہیں۔ لیکن اس جواب سے عجلت پسندی مترشح ہے۔ اس دفتر کا بہ نظر امعان مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے اور غزل کی تعریف کو بھی مدنظر رکھنے کی۔

غزل اُردو غزل فارسی کا چربہ ہے۔ عہد طفولیت میں اسکی روش چاہے جو کچھ رہی ہو لیکن منزل شباب میں قدم رکھنے سے پہلے، بہت پہلے، اس نے اپنی اصل کا رنگ اس حد تک اُڑا لیا تھا کہ اگر اسے فارسی طرز کی شاعری بزبان اُردو کہا جائے تو اس کو قبول کرنے میں تامل نہ ہونا چاہیئے۔ غزل اُردو کے مطالعہ کرنے والے ہندوستانی کو وہ سب سامان اپنی مادری زبان میں مل جائے گا جس پر غزل فارسی ناز کر سکتی ہے، ایران کے گل وریحان، قمری وبلبل، برق نشیمن، سحاب آہ، بندوقبا، زلف گرہ گیر، چشم غزالین، ستم گر سیمتن، غرض جو کچھ چاہیئے وہ سب ایک ہی دیوان کی جلد میں موجود ہے، دست و برد زمانہ سے محفوظ۔

لیکن غزل اُردو کے ماخذ، غزل فارسی، کو دسویں، حد ہے نویں، صدی سے آگے لیجانے کی کوشش بے سود، ہو گی۔ اگر اس مسئلے کو پیش نظر رکھا جائے کہ ایرانیوں اور ہندوستانیوں کے آبا و اجداد کسی زمانے میں جو وہم و ادراک سے پرے ہے ایک ہی سر زمین سے اُٹھے اور وقتاً فوقتاً ان کی جماعتیں اپنے مستقر سے نکل کر ایران کو آباد کرتی ہوئی دریائے گنگا اور جمنا کے سرسبز میدانوں تک پہونچ گئیں تو ان کے خیالات میں وحدت کا ہونا لازمی ہے، مذہب میں اس وحدت کا پتہ چلتا ہے جس کی دو مثالیں یہ ہیں کہ ہندو اپنے مذہبی رسوم ادا کرتے وقت "سوم رس"[۱] پیتے تھے خوردہ اوستا نے اسے "ہوم ہوس" سے موسوم کرکے ایک باب اس کی ثنا و صفت اور طریق استعمال کی نذر کر دیا۔ یہ لفظ بھی وحدتِ ماخذ کا پتہ دیتا ہے۔ سنسکرت میں س فارسی میں ہ سے بدل گیا سپت اور ھفت کے اتحاد سے کون بے خبر ہے۔ ہند میں آکر آباد ہونے والے آریے دریاؤں کو متبرک سمجھ کر پوجتے ہیں، گنگا، جمنا، سرسوتی سبھی متبرک و مقدس ہیں۔ ان آریوں کے ایرانی بھائی بھی مظاہر قدرت کی پرستش میں ان سے پیچھے نہیں۔ خوردہ اوستا شاہد ہے کہ " اردوی سُور" کا صاف و شفاف پانی صحت بخشتا، ناپاک کو پاک کرتا۔ اور دافع امراض ہے۔ ستارہ "تشتر" ایران کی سرسبزی کا کفیل اور ضامن ہے۔ اس نے ہندوستان پہونچکر "راجہ اندر" کا روپ بھر لیا اور اس کے زمین پر پانی برسا کر اس کی چمن آرائی کرتا ہے، مگر سرسری نظر سے دیکھنے والا اس لجۂ حیرت میں غرق ہو جاتا ہے کہ اقلیم غزل میں یہ مجانست و موانست کیوں مفقود ہے، ایک کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کا مرجع خیالات عاشقانہ اَمرد ہے اور دوسرے کی نسبت دعویٰ ہے۔ کہ جب شباب آکر جنس لطیف کے چٹکی لے کر اسے خوابِ معصوم دوشیزگی سے بیدار کرتا ہے تو وہ دل کی لگی کا رُخ جنس شدید کی طرف پھیر کر محو عشوہ طرازی ہو جاتی ہے یعنی اس کا مخاطب مرد ہے، اس فرق کا پتہ لگانا طالب علم ادب اور بالخصوص صنفِ غزل کا مطالعہ کرنے والے کا فرض ہے۔

اس کوچے میں قدم رکھتے ہی اسے سب سے پہلے تاریخ کی ورق گردانی کرنی پڑیگی۔ کہا جاتا ہے کہ صرصر تعصب و بربریت نے گلشن ایران قدیم کے نخلہائے تہذیب و تمدن کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکا۔ پور داؤد، ایران کے مشہور شاعر و ادیب نے جرمنی، فرانسیسی اور انگریزی کی اکتالیس تصنیفات سے مدد لے کر پارسیوں کے صحیفۂ آسمانی موسوم بہ "گاتھا"[۲] کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ اس وقت " گاتھا " کا جو نسخہ ملتا ہے اس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ ایک ضخیم کتاب کا محض ایک جزو ہے، اور وجہ تضییع دیگر حصص سکندر رومی کی شقاوت، مسلمانوں کا تعصب اور آل چنگیز کی بربریت بتائی جاتی ہے، پور داؤد نے جس معاندانہ لہجے میں اس کا ذکر کیا ہے وہ قابل غور ہے، باوجود خوف طوالت اسکا اقتباس درج ذیل ہے۔

" مرز و بوم ہیزا ایران گزند و آسیب بسیار دید۔ در مدت ہشتاد سال در زیر تسلط اسکندر و سلوکید ہا جانشینان یونانی

---

[۱] عہد قدیم کی ایک بیل کا نام جس کا رس زرد رنگ کا ہوتا تھا اور جو نشہ آور تھی۔ زمان وید کے رشی اسے پیا کرتے تھے، شبد ساگر۔

[۲] پارسیوں کی مذہبی کتاب ہے [illegible] اور روزانہ، ماہانہ، سالانہ، [illegible] مشتمل

وے بود کہ بخصوصہ در ترویج تمدن خود می کوشیدند لا بد دریں مدت بسیارے از کتب مذہبی و کلیہ آثار ملی ایران از دست رفت، و سنت بسیار قدیم زرتشتیان نیز چنیں آمدہ است کہ آئین مزدیسنا مخصوصاً از اسکندر ملعون لطمہ دید و حتی اوستائے کہ در قصر سلطنتی ہخامنشیان بود، بہ فرمان فاتح یونانی سوخت۔

"پس از دورہ سلوکید باز مان سلطنت اشکانیان فرارسید۔ ہرچند کہ آناں ایرانی نژاد و زرتشتی کیش بودند، تسلط ہشتاد سالہ یونانیہا بکلی در آنہا اثر کردہ خود را دوستار ہلاس میخواندند۔ در خصوص رسوم و آداب و آثار ایرانی بے قید بودند۔۔۔ وے افسوس کہ ذخیرہ چہار صد سالہ ساسانیاں بہ یک بار از دست رفت۔ آنچہ ایران داشت چہ معنوی وچہ مادی دست بردعرب و فدائے تعصب او گردید۔

ہرچند صد سال پس ازیں فاجعہ اردوئے مغول و تاتار چنگیز و تیمور مانند سیل بنیاں کن از ایران گزشتہ آنچہ را عرب نتوانست پایمال کند و یا آنچہ را کہ در دورہ صفاریان و سامانیان دوبارہ جانے گرفتہ بود دغرقہ سیل فنا گردید۔"

یہاں تک مذہبی تصنیفات کا تعلق ہے۔ اس تلخ نوائی سے تعرض جادۂ مقصد سے اعراض کا مترادف ہوگا لیکن اس بیان کو وسعت دیکر اس کا ادب ایران کے ہر صنف پر اطلاق ہرگز درست نہیں ہوسکتا۔ اس کو عقل سلیم نہیں مان سکتی کہ اغیار یا دلدادۂ اغیار نے اس حد تک تصنیف و تالیف کا گلا گھونٹ دیا کہ ایرانیوں نے اپنی مادری زبان میں تصنیف و تالیف قطعی بند کردی۔ پھر ملزموں کے ارتکاب جرم کے درمیان جو طویل مدتیں حائل ہیں انھیں نظرانداز کرنا بھی خلاف انصاف ہے، سکندر اعظم نے ۳۳۱ء ق۔م۔ کے قریب اپنا اقتدار قائم کیا ہے۔ اشکانی ایک خفیف جرم کے مرتکب ہیں۔ اس کے بعد اسلام ۶۳۲ء میں آیا ہے، علاوہ ازیں اسلام کے سو سو آسو سال بعد تک طبرستان کے پہاڑ ایک ایرانی خاندان کے سپہ سالاروں کے قبضہ میں رہے اور آتش پرستی ان کا دین و آئین رہا۔ آل چنگیز نے چودھویں صدی کے ربع آخر میں ایران پر تسلط جمایا۔ لیکن ان تاریخی واقعات کے اثروں سے قطع نظر ایک محیر العقول امر یہ ہے کہ اگر اس کو تسلیم کرلیا جائے کہ ان ظالموں نے جب ایران پر دست تعدی دراز کیا ہے تو اپنے سے پہلے کے خزانہائے علوم کو اس حد تک مٹا دیا کہ تمام سلطنت میں کہیں ایک تصنیف و تالیف نہ چھوڑی تو کیا یہ بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ ایرانی شاعروں کے دماغ سے قومی خصوصیات بھی اس کمال کے ساتھ محو کردیں کہ اُن کے بعد کی تصنیفات میں اُنکی جھلک تک نظر نہ آئے۔ اسلامی عہد میں بہت سے ایرانی ایسے تھے جن پر اسلام بے تکلف منافقت کا فتویٰ صادر کرنے کو تیار تھا۔ اسی پاسٹی میں شاید فردوسی بھی تھا۔ جس نے کہا ہے۔ ؎

نگوئی کہ آتش پرستاں بدند　　　پرستندۂ پاک یزداں بدند

اور جس پر کہ شاید گبر ہونے کا الزام بھی لگایا گیا تھا، کیا یہ لوگ علانیہ نہیں تو خفیہ بھی اس قسم کا لٹریچر نہ چھوڑنے پر مجبور تھے۔ جو اُن کے حُب وطن کا ثبوت ہوتا؟ پھر غزل تو ایک عیش پرستی و نشاط اندوزی کا سامان ہے، مذہبی جوش

ب مقدسہ کی تباہی کے درپے ہوسکتا ہے مگر سرشاران بادۂ حکومت اور سالکان جادۂ طریقت کو کیا پڑی تھی غزل سی صنعت کلام سے جو ہوائے نفسانی کو پنکھا جھلنے والی ہے اس حد تک تعرض کرتے کہ حرف غلط کی طرح اس کا و جود صفحۂ ہستی سے محو ہو جائے؟ ایک اور امر بھی حیرت انگیز ہے، کیا اُن پارسیوں میں سے جو ۶۲۱ء میں اسی بناء پر ترک وطن کرکے ہندوستان پہونچے کہ انکی شدید قسم کی مذہبیت اجنبی فاشیۂ حکومت کی تاب نہ لاسکے۔ ایک بھی ذوق ادب سے بہرہ ور نہ تھا کہ ایک آدھ دیوان چرا چھپا کر ہندوستان لے آتا؟ کیا ان میں ایک فرد بھی ایسا نہ تھا جو ہندوستان ہو چکر شعر کہتا؟ حقیقت یہ ہے کہ ایران کے عام لٹریچر کی تباہی کے صحیح اسباب روشنی میں آنے کے لئے ایک بے لوث محقق کی جانفشانیوں اور جگر کاویوں کے منتظر ہیں۔

غزل فارسی کا پتہ دسویں صدی سے لگتا ہے۔ چونکہ اس وقت تک ادب ایرانی، ادب عربی کی خصوصیات سے معمور ہو چکا تھا اس لئے عربی کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے غزل عربی کی مخاطب عورت تھی، اقتباسات ذیل سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔

عَرَفْتُ مَنَازِلًا مِنْ آلِ هِنْدٍ   عَفَتْ بَيْنَ الْمُوَيْلِ وَالشَّرِيّ

ترجمہ:۔ میں نے آخر ہند کے گھرانے کی فرودگاہ کو پہچان لیا جو مویل اور شوری کے درمیان مٹ مٹا کر بے نشان ہو گئی تھی۔

غَذِيَّةٌ بَيْنَ أَبْوَابٍ وَدُورٍ   سَقَاهَا بَرْدُ رَاجِحَةِ الْعَشِيّ

ترجمہ:۔ اس ہند کی محبت جو عیش پر وردہ تھی کبھی کسی کام کاج کو گھر اور گھر کے دروازے کے باہر نہیں نکلی اور ہمیشہ رات کو برسے ہوئے ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے سیراب رہی (صفحہ ۹۹، مراۃ الشعر، مصنفہ شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن)

فارسی کے اصلی و نقلی دونوں ماخذوں کا یہ تقاضا نہیں کہ اس کا مخاطب امرد ہو۔ درحقیقت اس کی مخاطب عورت ہے، گو اس خیال غلط کا کہ اس امرد سے خطاب کیا جاتا ہے باعث یہ معلوم ہوتا ہے کہ نویں اور دسویں صدی تک ایرانی زبان اس منزل پر پہونچ چکی تھی جہاں اس کی روش نے تذکیر و تانیث کے فرق و امتیاز کو مٹا دیا تھا، صیغے اور ضمیریں اس کا پتہ نہ دے سکتے تھے کہ مخاطب کس جنس سے تعلق رکھتا تھا، اس کے علاوہ اخلاق انحطاط نے بھی شاید ایرانیوں کو اپنے قدیم ترین آباو اجداد کی حرکتوں کی تقلید کی طرف مائل کر دیا اور غزل فارسی کے مخاطب کے متعلق جو غلط خیال پیدا ہو گیا تھا اسے اس قدر تقویت پہونچی کہ وہ یقین راسخ بن گیا، خیال پردہ داری نے بھی اس بے بنیاد خیال کی مدد کی اور شاعروں نے معاملے کو حد غلو تک پہونچا کر محبوب کے لباس و سراپا میں خط، قبا کا ذکر کرکے کسی ایسی تاویل کی گنجایش باقی نہ رکھی جو خیال کو حقیقت کی طرف مائل ہونے دیتا۔

سے زبان اوستا میں دو لفظ ہیں

ہن کے معنی ہیں (۱) لواطت سے متعلق اور (۲) لوطی۔ یہ ایران قدیم کی تہذیب کے دامن پر داغ فعل خلاف فطرت ہونے کا پتہ دیتے ہیں۔

قصہ مختصر جب ہندوستانی شاعر فارسی میں شعر کہتے کہتے اُردو کی طرف متوجہ ہوئے تو فارسی کے رنگ میں اتنے رنگے ہوئے تھے کہ ملکی زبان پر فارسی کا ملمع چڑھا کر ہی زبان کی شستگی و ترقی پر اپنے ہمعصروں اور آیندہ نسلوں سے طالب داد نہ ہوئے بلکہ شاعری میں ملکی خصوصیات سے چشم پوشی کرکے ایرانی خصوصیات کو ایک نامناسب رتبہ دیدیا۔ اور یہاں بھی اس طرح کا اسلوب بیان اختیار کیا گیا جس نے محبوب شاعری پر پردۂ ابہام و اشتباہ ڈالدیا۔ اور غلوپسند بزرگوں میں سے ایک صاحب باوجود ادعائے صوفیت او رشہرت تقدس یہاں تک کہ گئے۔

سہ پہن کر کان میں بالا گلے میں ڈال کر مالا لئے جاتا ہے دل میرا یہ لڑکا برہمن والا

ایک طرف تو یہ اسباب اور دوسری طرف عورتوں کی جہالت اور مردوں کا یہ خیال کہ عورتیں اگر اپنے جذبات اصلی یا نقلی کو ظاہر کریں گی تو جس خاندان کی وہ فرد ہیں اس کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگ جائیگا، انھوں نے چند پڑھی لکھی عورتوں کی بھی ودیعت شاعرانہ کا گلا گھونٹ دیا۔ اب حالانکہ غزل کے معنی ہیں عاشق کا اپنے معشوق سے باتیں چیتیں کرنا، مگر یہ صورت پیدا ہوگئی کہ عاشق اپنے گونگے بہرے معشوق سے باتیں کرتا ہے یعنی شاعری میں زیادہ تر وہی خیال ظاہر کئے جاتے ہیں جنھیں مردوں کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے، اُن خیالات کا کہیں پتہ نہیں جن سے یہ نتیجہ نکالا جاسکے کہ عاشق کے اظہار تمنا پر معشوق نے کیا کہا۔ اگر کہیں کچھ ملے گا بھی تو اتنا سا کہ سوال وصل پر اس نے انکار کردیا۔ یا وہ رقیب پر مرتا ہے، یا وفا کے عوض اس نے جفا کی یا فطرتاً ظالم ہونے کی وجہ سے قتل کرڈالا۔ اور اگر عاشق نے اپنے اصلی خیالات ظاہر کئے ہیں تو معشوق کی طرف سے جو جواب دئے گئے ہیں وہ تو یقیناً فرضی ہیں اور عاشق کی زبان سے ادا ہوئے ہیں۔ ہماری شاعری میں اس قسم کے عنصر کا وجود اس کی دلیل تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ وہ معشوق کے منہ سے نکلے ہوئے لفظ ہیں اور وہ اس گفتگو میں شریک ہے مگر ہماری غزل کا صرف یہی ایک نقص نہیں ہے بلکہ اس میں ایک سرشار محبت عورت کے جذبات کے اظہار کا بھی فقدان ہے۔ اسمیں تامل ہے کہ جو کچھ ملتا ہے ایسے خیالات نسوان کے جذبات کی ترجمانی کا ہم مرتبہ سمجھیں۔ چونکہ اُردو کی غزل کسی شاعر دل سوختہ کے بیان وارداتِ قلب سے تہی دامن ہے اس لئے یہ حقیقتاً ہر لحاظ سے تصویر کا ایک ہی رُخ پیش کرتی ہے۔

لیکن کیا غزل اُردو، غزل ہندی کے نقش قدم پر چل کر کوئی مکمل تصویر پیش کرسکتی تھی؟ افسوس کہ جس نقطۂ نظر سے بحث کیجارہی ہے اس کے لحاظ سے ہندی کی شاعری سے استفادہ گو اظہار عشق کا مرکز بدل دیتا لیکن کسی مکمل تصویر کے پیش کرنے سے قاصر تھا۔ فارسی کی تقلید نے شاعر تفتہ جگر کو اپنے اصلی خیالات و محسوسات کے اظہار کا موقع دیا اور وہ تصویر میں معشوق کے جوابوں سے رنگ بھر کر اپنے نزدیک آرٹ کا ایک شاہکار منظر عام پر لے آیا۔ ہندی کی شاعری میں اسے اس کا موقع حاصل نہ تھا۔ اس میدان میں وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کرسکتا تھا کہ اپنے تجربہ و مشاہدہ کی مدد سے جنس لطیف کے جذبات کی ترجمانی کرے۔ نظم ہندی نو اصناف درسول اپر مشتمل ہے،

ن میں سے ایک کا نام شرنگار ہے جسے ہم فارسی و عربی کی غزل کا جواب کہہ سکتے ہیں۔ شرنگار رس کی کتابوں کا مطالعہ اس حقیقت کو فوراً بتا دے گا کہ مرد عورتوں کے جذبات کے ترجمان ہیں۔ شعراء میں کثیر تعداد مردوں کی ہے جو اُن واقعات و تاثرات کو بیان کرتے ہیں جو عورتوں سے منسوب کئے جا سکتے اور ان شاعروں کے مشاہدات و تجربات پر مبنی ہیں۔ ان شاعروں کی جسارت دیکھئے کہ جودت طبع دکھانے کو اُنھوں نے ایک فن ایجاد کیا جسے وہ "نایکا بھید" سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کی بنیاد عورتوں کی عمر اور اس کے حسب حال خیالات و حرکات وغیرہ پر رکھی ہے مثلاً وہ دوشیزہ جس کے گلشن حیات میں بہار شباب کی نسیم ولولہ انگیز چلنے لگی ہے مگر وہ اس سے بے خبر ہے اس کا نام اَگیاتَ یَوْوَنا (بے خبر شباب) رکھا ہے، بہاری اسکی بارگاہ حُسن میں گلہائے عقیدت پیش کرتے ہیں۔

अपने अंग के जानि कै, यौवन नृपति प्रवीन।
स्तन मन नैन नितम्ब को, बड़ो इजाफ़ो कीन॥

عاقل شہنشاہ حُسن نے اپنا خاص آدمی سمجھ کر اس کی چھاتیوں، دل، آنکھوں اور کولھوں میں بہت اضافہ کیا۔

नव नागिर तनु मुलक लहि, यौवन आमिल जोर।
घटि बढ़ि तें बढ़ि घटि रकम, करी और की और॥

عامل حسن نے ملک جسم پر زبردستی تسلط حاصل کر کے رقموں کو کہیں گھٹایا اور کہیں بڑھایا غرض کچھ کا کچھ کر دیا یعنی لڑکپن کو نکال دیا، کمر کو گھٹا دی۔ آنکھیں، بال، چھاتیاں، کولھوں اور شوخیوں میں اضافہ کر دیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مرد اپنے مشاہدات کو سلک نظم میں منسلک کر رہے ہیں۔ نایکا بھید کے میدان سے نکل کر جب شاعر بیان سراپائے معشوق کی منزل میں داخل ہوتا ہے تو بے شک جو کچھ کہتا ہے اسے اس کے اپنے جذبات کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً پیرن کمر کی تعریف کرتے ہیں۔

सुमन में बास जैसे सुमन में आवे कैसे नाही कहे होत नाहि हां कहे चहत है।
सुरसरि सुरजा में सरसती सो है जैसे बेद के बचन बांचे सांचे उचरत है॥
पीबा के इन्दु औ कलक ज्यों बसे अम्बर में पीरषा को अनुच्छद परतच्छ नाकहत है॥ जैसे अनुमान के प्रमान पर ब्रह्म जैसे कामिनी
कटि कवि मोरन कहत है॥

ترجمہ:۔ جیسے گلاب میں خوشبو کہ سمجھ میں نہیں آسکتی، نہیں کہتا ہوں تو دل خود ہی اس کی تردید کر دیتا ہے اور منہ سے ہاں نکل جاتی ہے۔ جس طرح گنگا اور جمنا کے درمیان سرسوتی رونق افروز ہے وید کے لفظ پڑھنے سے صداقت کا یقیں

ہوتا ہے پہلی تاریخ کو چاند آسمان میں ہوتا ہے لیکن صاف صاف نظر نہیں آتا۔ جس طرح قیاس کے ثبوت پر وجود باری،
تیرن کہتے ہیں کہ اس نازنین کی کمر کا یہی حال ہے۔ یا بوئے دہن کی تعریف۔

याही मुख बास कमलनि की प्रतीत हेत याही मुख बास केतकी
सों मधुमन्त है। याही मुख बास बोले मालती को मारै मान
याही मुख बास कामी होत जन संत है॥ याही मुख बासन
नवेली तन कैसी फूली याही मुख बास सखी सोहत अनंत
है। तेरे मुख बास ही सों सकल सुवास भयो बारहो
महीना भौंर मानत बसंत है॥

ترجمہ:۔ اس خوشبوئے دہن سے کمل کی خوشبو کی تیز ہوتی ہے، اسی کی خوشبو کیتکی سے زیادہ مست کُن ہے، یہی خوشبوئے دہن مالتی کے غرور کو خاک میں ملاتی ہے۔ یہی خوشبوئے دہن عابدوں اور زاہدوں کو نفس پرست و عیش پرور بنا دیتی ہے، یہی خوشبوئے دہن سکھی کو بے حد پسند ہے۔ اس کی خوشبوئے دہن سے کل عالم معطر ہے، بھونرے سمجھتے ہیں کہ سال بھر برابر موسم بسنت رہتا ہے۔

مگر یہ نہایت حیرت انگیز بات ہے کہ ہندی کی شاعری خیالات وصل و ہجر کا منبع و مصدر تو عورت کو مانتی ہے لیکن جب معشوق کے سراپے کی تعریف کا موقع آتا ہے تو صرف جنس لطیف کے اعضا اس کی توجہ کو جذب کر لیتے ہیں اور صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرد کسی عورت کے جسمانی اوصاف کا دلدادہ ہے، اس سے مجبوراً یہ نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ ہندی کی شاعری میں مرد عاشق اور عورت معشوق ہے۔ گو یہ تباین و تخالف نہایت حیرت انگیز ہے لیکن چونکہ شہادت کا پلہ اس طرف جھکتا ہے کہ غزل ہندی عورت کے خیالات عشقیہ کی آلۂ اظہار ہے اس لئے اس سے کسی قسم کا تعرض تحصیل حاصل ہے۔ شرنگار رس کا مطالعہ اس نظریہ کو بوجہ احسن ثابت کر دیگا کہ آہ و فغاں کا منبع عورت کا سینہ ہی رہے کہیں کہیں اس کی تردید ضرور مل جائے گی، مثلاً ایک کبت کا ایک ٹکڑا ہے۔

चोंपते चकोर चहूं ओर जानि चंदमुखी, जौ न होती
डर निहसन दुति दंपा की।

ترجمہ:۔ چکور چاروں طرف سے آکر ٹھونگیں مارتے ، چہرے کو چاند سمجھ کر اگر انھیں برق تبسم کا خوف نہ ہوتا، اس لئے ہندی کی شاعری بھی تصویر کا ایک ہی رُخ ہے۔

لیکن کیا ایران اور ہندوستان کی عورتوں کے ساتھ قدرت نے اس قدر بخل سے کام لیا کہ انھیں اپنے جذبات

याही ..... फूली اس کے معنی چھوڑ دئے گئے ہیں کیونکہ چھاپے کے حرف ٹوٹ گئے۔

لے منظوم کرنے کی صلاحیت سے ہی محروم کر دیا؟ نہیں تذکرۂ شعرائے ایران و مصنف دولت شاہ سمرقندی شہادت دیتا ہے
بتان ایران میں وصف شاعری پیدا کیا گیا ہے، اس نے چند شعر بھی ان کے درج کئے ہیں جن میں سے کچھ یہاں
نقل کئے جاتے ہیں۔

مہستی۔ شکستہ نباد سر دسیمیں تن را ۔۔۔ زیں واقعہ شیون است مرد و زن را
افسوس کہ در گندہ نخواہد فرمود ۔۔۔ پائے کہ دو دست شانہ بود صد گردن را

در خانۂ تو آنچہ مرا شاید نیست ۔۔۔ بندہ ہی ز دل رمیدہ بکشاید نیست
گوئی ہمہ چیز دارم از مال و منال ۔۔۔ آرے ہمہ ہست آنچہ می باید نیست

مہستی۔ قصاب چنانکہ عادت اوست مرا ۔۔۔ بفگند و بکشت و گفت کایں خوست مرا
سر باز بہ عذر می نہدم بر پایم ۔۔۔ دم می دہدم تا بہ کند پوست مرا

قصاب یکے دنبہ برآورد ز پوست ۔۔۔ در دست گرفت گفت دہ دہ چہ نکوست
با خود گفتم غایت حرص بہ بیں ۔۔۔ با ایں ہمہ دنبہ دنبہ میدارد دوست

یہ شعر متبذل ہیں اور افسوس کہ مصنف ان شاعرات کا اس سے بہتر کلام نہ تلاش کر سکا، لیکن جو ایسے شعر کہہ سکتی تھیں وہ اور طرح کے بھی ضرور کہتی ہوں گی جن کا موضوع عشق و محبت، رنج و الم وغیرہ ہوں گے، وہ کیا ہوں گے، شاید اس کے بتانے کی ضرورت نہیں۔ ہندوستان کے متعلق یہ ضرور تعجب خیز بات ہے کہ مردوں نے اپنے جذبات کا اظہار کیوں نہ کیا، محض نقالی پر کیوں قناعت کی ہندو عورتوں نے شعر کہے ہیں مگر انکی نواسنجیاں پاس ننگ و ناموس کی وجہ سے عشق مجازی سے منہ موڑ کر عشق حقیقی کے دام میں گرفتار ہو گئیں۔ اب تک ان شاعرات کے کلام کا جو حصہ روشنی میں آیا ہے اس کا جزو غالب ویراگ سے متعلق ہے۔ میرا بائی وغیرہ کا کلام اس کا شاہد ہے، لیکن ہندوستان بھر کی شاعرات اس قدر مذہب پرست نہیں ہو سکتیں کہ عشق مجازی کی فسوں کاریاں ان کے دامنِ دل کو نہ کھینچ سکیں۔ ایسی شاعرات کے کلام کی معدومیت کے وہی اسباب ہیں جو انکی ایرانی بہنوں کے کلام کو بحرِ فنا میں ڈبونے کے باعث ہوئے۔

ہندوستان کے زمانِ زوال و انحطاط میں رنگین کی اپج نے کسی قدر شاعری کا رخ پھیرا تھا اور اگر یہ صنف کلام بہت جلد مردود نہ ہو جاتی اور اسے مسالی شعرا ذرا بلند سطح پر لے آتے تو ریختہ اور ریختی مل کر اردو کی شاعری میں تصویر کے دونوں رخ پیدا کر دیتے، اگرچہ جو نقص ہندی کی شاعری میں ہے یعنی مرد عورتوں کے خیالات کی ترجمانی

[1] شوہر مہری، خواجہ عبدالعزیز، طبیب سرکار شاہ زنج مرزا گرگاں پیر بود،
[2] از اکابرزادگان گنجہ است وبعضے او را نیشاپوری دانستہ، در مجلس سلطان سنجر اعتماد داشتہ۔

کرتے ہیں، اس میں بھی باقی رہتا، مگر رہتا تو رہتا، ہوتے تو اس میں تصویر کے دونوں رُخ۔

کہتے ہیں کہ زمانے کو قرار نہیں یہ گھڑی گھڑی اور پل پل بدلتا رہتا ہے، انگریزی تسلط نے محض تختۂ حکومت ہی نہیں الٹ دیا۔ اس نے ہندوستانی تمدن و تعلیم پر بھی ہاتھ صاف کیا اور کر رہا ہے۔ دولت علم سے مالا مال ہو کر ہندوستانی عورتوں نے اقلیم ادب پر بھی یورش کی۔ اپنی صدیوں پہلے کی بہنوں کی طرح اُنھوں نے جواب کو مانع اظہار قابلیت نہ ہونے دیا اور تصوف کی طرف خواہ رُخ کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن میدان تغزل میں قدم ضرور رکھا، ابھی تک صدائے لبیک رُک رُک کر پبلک کے منہ سے نکل رہی ہے۔ کسی نہ کسی گوشے سے ان کے کلام کو بہ نظر اکراہ دیکھنے اور انھیں درپردہ صلواتیں سُنانے کی صدائیں گوش زد ہو ہی جاتی ہیں، ایک نمونہ ہدیۂ ناظرین ہے:۔

"نئے ادب کی مخلص خادمہ مس ..... صاحبہ کی ایک "سحر آفریں" غزل ... کے تازہ نمبر میں شائع ہوئی ہے جس کا عنوان ہے "گلشن جذبات کے چند پھول"۔ مطلع عرض ہے۔

سامنے جب ان کی صورت آگئی   دل کی دنیا پر قیامت آگئی

بے نظیر مطلع ہے۔ شعر کیا ہے "روزنامچہ دل" ہے۔ اس عالم دوشیزگی میں یہ زورِ کلام، ایں سعادت بزور بازو نیست، دوسرا شعر ہے۔

ان کے کہنے سے نہ ہو گا فیصلہ   آگئی جس پر طبیعت آگئی،

جرأت و شجاعت، عزم و استقلال اور "سینہ گرہ" کا بہترین مظاہرہ ہے ع اللہ کرے جوش جنوں اور زیادہ۔

چوتھا شعر ہے۔

جب کسی کے دل کو زیارت ہو گئی   دل کی دنیا پر قیامت آگئی

غالبًا یہ شعر کسی "زیارت گاہ" میں بیٹھ کر لکھا ہے۔ "زائرین کرام" کی خوش قسمتی لائق رشک ہے گلشن جذبات کے یہ چند "راحت آفریں" پھول ہیں۔ ع قیاس کن ز گلستان من بہار مرا۔

اللہ اس "نئے ادب" کو جلد بحر روم میں جگہ دے۔

لیکن ہمیں ان شاعرات کی روش کو ایک بے لوث نقاد کی نظر سے دیکھنا چاہیے، ذرا سوچنا چاہیے کہ ان کا قصور کیا ہے۔ اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے کاشانۂ تخیل میں عورت کی جو عفت مآب تصویر ایک بلند مقام پر آویزاں ہے یہ روش اس کو اس بلند مقام سے گرا کر چکنا چور کر دیتی ہے۔ یہ جواب ناانصافی پر دال ہے۔ مرد کے خیالات عریاں سے تعرض کیوں نہیں کیا جاتا؟ ایک نوجوان شاعر کو اجازت ہے کہ وہ نہایت عریاں طریقے سے اپنے بزرگوں کے سامنے اپنی خواہشات بہیمی کو پردۂ نظم میں جلوہ گر کرے اور زجر و توبیخ کے عوض تحسین و آفرین کا مستحق و سزاوار قرار پائے۔ اور ایک دوشیزہ انھیں باتوں کو زبان پر لائے تو مستوجب دار ہے اگر خواہشات

بہیمی کا عریاں و بیباکانہ اظہار قابل نفریں ہے تو پھر اس میں جنس کی تخصیص کیوں؟ کب تک زمانے کی رفتار کا رُخ بدلنے کی کوشش جاری رہے گی، اور اس ریختے کو، جسے رنگین و انشا نے متبذل رنگ میں پیش کیا تھا، چشمۂ صافی بننے کا موقع نہ دیا جائے گا، کیوں؟ غزل کو جو ابھی تک تصویر کا ایک ہی رُخ پیش کرتی ہے، اپنا دوسرا رُخ پیش کرنے کی سعی سے روکنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا جاتا ہے؟ یا تو عورتوں کو جاہل مطلق رکھا جاتا اور نہیں رکھا گیا تو مضر اثرات سے قطع نظر، کم سے کم ان اثرات پر تو کان نہ کھڑے ہونے چاہئیں جو مردوں پر پڑیں تو قابل اعتراض نہیں تصور کئے جاتے۔

حشرِ جذبات

از حضرت ثاقب کانپوری

حقیقت کیا تری بیداد کی اے باغباں سمجھے
وہ بربادِ تمنا جو قفس کو آشیاں سمجھے

ہماری بیخودیِ شوق نے رُسوا کیا ہم کو
رہِ اُلفت میں ہر ذرّے کو تیرا آستاں سمجھے

کہاں تک اُس کو اے دنیا فریبِ زندگی دیگی
جو مر جانے کو اُلفت میں حیاتِ جاوداں سمجھے

کروں بیدار کیونکر اُس کے احساسِ محبت کو
وفا کوشی کو میری جو متاعِ رائگاں سمجھے

لباسِ زندگی کو اپنے ثاقب چاک کر ڈالے
اگر غفلت سرشتِ انساں گُل کی داستاں سمجھے

تسلیاں دلِ مضطر کو چشمِ یار نہ دے
جو درد مجھ کو دیا ہے تو اب قرار نہ دے

میں جانتا ہوں یہ نیرنگ سازیاں تیری
مجھے فریب تو رنگینیٔ بہار نہ دے

نہیں ہے یادِ چمن بھی دماغ میں اُس کے
قفس نصیب کو اب مژدۂ بہار نہ دے

وفائے عہد سے اپنے تو نا اُمید نہ کر
مجھے تو جراُتِ انکار اعتبار نہ دے

مٹا چکا ہوں میں ہستی کو عشق میں ثاقب
مجھے فریبِ محبت وہ بار بار نہ دے

ہنگامِ قیام

(مشاعرۂ میرٹھ کی ایک غزل)

بر درِ میخانہ، ابرِ خوش خرام آ ہی گیا
مے کشو اُٹھو، کہ ہنگامِ قیام آ ہی گیا

لَوٹ اے خورشیدِ رفتہ، جاگ اے شمعِ خموش،
وہ مرادِ انتظارِ صبح و شام آ ہی گیا

کاروانِ شوق میں بڑھنے لگے آثارِ ہوش
خضر سے دامن بچانے کا مقام آ ہی گیا

برملا ہونے لگی تفسیرِ رازِ حُسن و عشق
بے زباں آنکھوں کو اندازِ کلام آ ہی گیا

لڑکھڑا کر ساقیِ مخمور نے بخشا ہے جام
امتحانِ ہوش و مستی کا مقام آ ہی گیا

خوابِ تعمیرِ نشیمن بن گیا خود ہی قفس
طائرِ آزاد آخر زیرِ دام آ ہی گیا

شوق بے حد لامکاں سے بھی گزر جاتا مگر
رو برو خود ہی وہ حُسنِ بے مقام آ ہی گیا

تذکرہ تھا جاں نثارانِ محبت کا روشؔ!
اُن کے لب پر اپنے دیوانے کا نام آ ہی گیا۔

روشؔ صدیقی

ایک پھول

(اندرجیت شرما ، چھرہ ضلع میرٹھ)

ایک پھول تھا کھلا ہوا باغِ حیات میں
جلوہ تھا جس کے نور کا ظلمت کی رات میں

فردوس کی بہار سے تمثیل دوں اُسے
یا حور کی نظر کا تبسم کہوں اُسے

زندہ تھے اُس کے دم سے ہی جذبات زندگی
تھا ایک یہ عطیہ کہ فطرت کی بھول تھی

نغمہ تھا میری روح کا ہمراز تھا مرا
جاں بخش جاں نواز تھا دمساز تھا مرا

آنکھیں بچھی رہیں مری اس گل کی راہ میں
رکھتا تھا ہر گھڑی اُسے اپنی نگاہ میں

اُس کی بہارِ عیش پہ میں جھومتا رہا
مستی میں اُس کے گرد یونہی گھومتا رہا

تخئیل کی میں ہائے عبادت کہوں اُسے
یا اپنے آنسوؤں کی ریاضت کہوں اُسے

نازک کہیں تھا پھول وہ حوروں کے ناز سے
اعجازِ حق نمائی تھا رنگِ مجاز سے

سرمایۂ سرود تھی نکہت مرے لئے
اک دیوتا کی شکل تھی صورت مرے لئے

فردوس کا خیال تھا پیارا مرے لئے
راجہ تھا میں وہ راج دلارا مرے لئے

اک حسن اور کیف کا جلوہ کہوں اُسے
یا عیش و انبساط کا دھوکا کہوں اُسے

تھی میری رُوح رقص میں اُسکی ہنسی کے ساتھ
نغمات کی بہار تھی اسکی خوشی کے ساتھ

جلوت میں ہمنشیں تھا وہ خلوت میں رازدار
ہوتے تھے اس سے زیست کے سب راز آشکار

جھونکا غمِ فراق کا گزرا جو یک بیک
ہل کر زمین رہ گئی تھرا گیا فلک

میری جہاں میں ہوگئی برباد زندگی
کرتی ہے ذرہ ذرہ سے فریاد زندگی

لیکن یہ بھول کر کبھی ہوتا نہیں یقیں
وہ مجھ سے دور ہوگیا میرے قریں نہیں

میں دیکھتا ہوں رات کو جب آسمان پر
آتا ہے وہ تو بن کے ستارہ مجھے نظر

اب تک بسا ہوا ہے وہ میرے خیال میں
رکھتا ہوں قید اُس کو تصور کے جال میں

ہندوستان میں مزدوروں کے لئے وظیفے

(از محمد عبدالقادر بی، ایس سی، آنرز (اکنامکس) (لندن))
لکچرار معاشیات، جامعہ عثمانیہ

ہندوستان کے مخصوص حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ کوئی ایک ایسی اسکیم پیش کی جائے جو "بیوا اسکیم" کا چربہ ہو۔ البتہ ہم اس کا اور دیگر بیرونی اسکیموں کا مطالعہ کرنے کے بعد ان میں سے بعض اہم اجزا ضروری ردوبدل کے ساتھ اختیار کرسکتے ہیں۔ ہمارا مقصد اپنی معاشی زندگی کو بیرونی سانچوں میں ڈھالنے کے بجائے یہ ہونا چاہئے کہ اپنی معاشی ترقی اور اپنے مقامی خصوصیات کے پیش نظر خود اپنے لئے ایک علحدہ سانچہ ڈھالا جائے۔

ہندوستان میں معاشرتی تحفظ کے بعض اہم پہلو مثلاً معاوضۂ مزدوران اور امداد زچگان نے قانونی حیثیت اختیار کر لی ہے لیکن آئندہ چل کر مذکورۂ بالا قوانین کے پچھلے نظم ونسق کی روشنی میں ان میں ضروری اصلاح وترمیم کی ضرورت درپیش ہوگی۔ نیز بیمۂ بے روزگاری اور بیمۂ صحت سے متعلق اسکیموں کو ہمیں مستقبل قریب میں عملی صورت دینی ہوگی۔ ثانی الذکر کی حد تک ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پروفیسر اڈارکار کی حالیہ رپورٹ کی وجہ سے ہمیں اپنے کام میں بہت ہی آسانی ہوگی۔ اب چند ایسے مسائل باقی رہ جاتے ہیں جن پر شاید ہماری فوری توجہ نہ ہوسکے لیکن ان کے متعلق بھی ابھی سے خاکے تیار کر لینے میں ہمیں کسی قسم کا تامل نہیں ہونا چاہیئے۔ منجملہ ان مسائل کے مزدوروں کے وظائف کا مسئلہ بھی ہمارے غور وخوض کا محتاج ہے اس سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ معاشرتی تحفظ SOCIAL-SECURITY کے مختلف اجزا ایک دوسرے سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ لہذا جب ہم کسی ایک اسکیم کو بھی تیار کریں تو دوسری متعلقہ اسکیموں کو نظرانداز نہیں کرسکتے۔ انمل بےجوڑ خاکوں کے بجائے مربوط اور ہم آہنگ منصوبوں کا بنانا زیادہ ضروری ہے۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مزدور اپنے بڑھاپے میں سماج کے لئے کچھ زیادہ سودمند ثابت نہیں ہوتے اور عمل پیدائش میں ان کا کوئی نمایاں حصہ باقی نہیں رہتا لیکن اس سلسلہ میں یہ امر نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ مزدور ایک شے تو نہیں ہے جسے بیکار ہو جانے پر ردی کی ڈھیر میں پھینک دیا جائے۔ مزدور بھی ایک انسان ہے جو اپنا ایک آزاد وجود اور اپنی ایک علحدہ شخصیت رکھتا ہے، اسکی زندگی کا بیشتر حصہ سماج اور اپنے پیشے کی خدمت میں گزرتا ہے اسکی بےبسی کے زمانہ میں اسے بے سروسامان چھوڑ دینا سماج کو زیب نہیں دیتا۔ انصاف کا تقاضا یہی کہ اسکی خدمات ماضی کا اسے معقول معاوضہ ملے۔ یہ صورت حال آجر کے لئے بھی فائدہ سے خالی نہیں، بڑھاپے کے وظیفے کی توقع ہر مزدور کی دلچسپیاں اپنے کام سے بڑھ جاتی ہیں۔ نیز سن رسیدہ مزدوروں کو وظیفے دیکر ہٹاتے رہنے سے انکی جگہ جوان، جفاکش اور مستعد مزدور

بنتے ہیں اور اس طرح محنت کی کارکردگی میں قابل ذکر اضافہ ہوسکتا ہے۔

بوڑھوں کی امداد کا طریقہ ہندوستانی معاشرتی زندگی کے جز کی حیثیت سے زمانہ سے چلا آتا ہے، ہمارے یہاں شترک خاندان کے طریق کے تحت، بزرگوں کی قدر و منزلت اور تعظیم و تکریم ہمیشہ سے ہوتی رہی ہے اور ہندوستانی گھرانوں میں والدین یا دیگر سن رسیدہ بزرگوں کو ایک باوقار مقام حاصل رہا ہے لیکن ایسے زمانہ میں جبکہ قدیم طریق کا شیرازہ رہا ہو اور ترقی پذیر INDUSTIRALISATION کی وجہ سے انفرادیت کی جڑیں مضبوط ہو رہی ہوں ہے معاشرہ کے قدیم ادارے اور ہمارے مروجہ اقدار حیات ان تبدیلیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ نیز ایسے ملک میں جہاں کہ فی کس آمدنی کا اوسط حد درجہ ادنیٰ ہے۔ افراد سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ بڑھتی ہوئی داریوں کے متحمل ہوسکیں گے۔ اسی طرح تغیر پذیر حالات کے تحت انفرادی جذبات ہمدردی اور احساسات خیر و خیرات نے طریقوں سے بھی اجتماعی مسائل کے سلجھانے میں کچھ زیادہ مدد نہیں مل سکتی۔

میرا خیال ہے کہ بوڑھوں کے وظائف کے نفاذ کی ابتدا کارخانہ کے مزدوروں سے ہونی چاہیئے کیونکہ جہاں تک دیہی اور زرعی مزدوروں کا تعلق ہے یہ ہنوز قدیم بندھنوں سے وابستہ ہیں اور انھیں اپنے بڑھاپے میں دیہات کی معاشرتی زندگی میں اپنے نمایاں مقام کا تیقن ہوسکتا ہے۔ شہری مزدوروں کے حالات اس سے مختلف بنتے جارہے ہیں، علاوہ ازیں کارخانوں کے کام کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ ان میں کام کرنے والے مزدور بہت جلد تکان اور اضمحلال محسوس کرنے لگتے ہیں اور اپنے آپ کو قبل از وقت بوڑھا پاتے ہیں اس کے برعکس زرعی کاروبار میں جو لگے ہوئے ہیں وہ اس قدر تکان محسوس نہیں کرتے اور اپنے آپ کو نسبتاً آزاد پاتے ہیں۔

بعض حلقوں میں یہ خیال ظاہر کیا جاتا کہ کارخانہ کے مزدور کے لئے وظیفوں کی اس لئے چنداں ضرورت نہیں کہ وہ اپنے بڑھاپے کے زمانہ میں دیہات کو منتقل ہو کر زراعت کا پیشہ اختیار کرسکتے ہیں لیکن یہاں ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اگر یہ طریقہ اختیار بھی کیا جائے تو اُسے کوئی خوشگوار صورت حال قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس طرح اول تو زمین پر بار بڑھتا جائیگا اور نتیجۃً اوسط رقبہ کاشت جو پہلے سے ہی چھوٹا ہے اس میں مزید تخفیف ہوجائیگی۔ علاوہ ازیں ایک ایسے زمانہ میں جب کہ ہم کارخانوں کے لئے دائمی مزدوروں کا طبقہ پیدا کرنے چاہتے ہیں۔ مذکورۂ بالا تجویز کچھ زیادہ مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ سب سے آخر ہم ان کثیر مصارف کو نظر انداز نہیں کرسکتے جو زرعی مزدوروں کے وظائف کی صورت میں آجر اور حکومت کو برداشت کرنے پڑیں گے۔

آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے بڑھاپے کے جبری وظائف کا آغاز بسمارک کی کوششوں کی بدولت ہوا۔ دوسرے ممالک بھی اس سے متاثر ہونے لگے۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں ڈنمارک نے غیر امدادی وظائف NON, CONTRIBUTORY PENSIONS ... جیسا ڈالی جو ... کے لئے محاصل کے ذریعہ فنڈ فراہم ... گیا لیکن اس طریقہ نے کچھ زیادہ تقبولیت حاصل نہ ...

دنیا کے دوسرے حصوں میں سہ جماعتی امدادی وظائف کے طریقہ کو اختیار کیا گیا جس کے تحت آجر، اجیر اور حکومت کے تعاون سے وظیفہ فنڈ قائم ہوتا تھا۔ یہ طریقہ ہر سہ فریق کے لئے مفید ہے۔ اگر ایک طرف آجر اور حکومت کے مالی بار میں کمی ہوتی ہے تو دوسری طرف مزدور اپنے آپ کو کفایت شعاری، خود اعتمادی اور ذاتی امداد کا عادی بنانے لگتا ہے۔

ہندوستان میں مزدوروں کے لئے وظائف جاری کرنے میں ہمیں گوناگوں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑیگا۔ کارخانوں کے مزدوروں کی شہروں میں عارضی سکونت، انکی ادنیٰ اجرتیں، ان کی غیر منظم حالت، ان تمام اسباب کی بنا پر ہمارے لئے قدم قدم پر عملی دقتیں پیدا ہوں گی۔ لہذا تاوقتیکہ مزدور شہروں میں دائمی طور پر سکونت اختیار نہ کرلیں، انکی خاطر خواہ تنظیم نہ ہو جائے اور ان کے لئے اقل اجرت کے اصول کو قانونی حیثیت نہ دی جائے ہم حسب دلخواہ تبدیلیاں کرنے نہ پائیں گے۔ اس لئے ہمیں اپنے کام کو مختصر پیمانہ پر شروع کرنا ہوگا اور اپنے دائرۂ عمل کو رفتہ رفتہ وسعت دینی ہوگی۔ ابتدا میں مزدوروں کے لئے بہت ہی ادنیٰ ادائیاں مقرر ہوں گی اور ان ادائیوں کا مقصد اسکیم کے مالی مسائل کا حل کرنا نہیں بلکہ مزدور کو غیر امدادی طریقہ کے مخرب اخلاق اثرات سے محفوظ رکھنا ہوگا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب مزدور کو وظیفہ فنڈ میں بہت ہی مختصر رقم دینی ہوگی تو اس کا بار لازماً آجر اور حکومت پر پڑیگا۔ یہ سچ ہے کہ ابتدائی زمانہ میں یہ صورت حال ضرور ہوگی لیکن جیسے جیسے ہندوستان کی صنعتی ترقی میں اضافہ ہوتا جائیگا۔ آجر کی آمدنیاں بڑھتی جائیں گی اور ان کا بار ہلکا ہوتا جائیگا۔ خود مزدور کی اجرتوں اور معیار زندگی میں اضافہ ہونے کی وجہ سے وہ بھی پنشن فنڈ میں زیادہ ادائی کے قابل ہو جائیگا۔ نیز نظام محاصل میں ضروری تبدیلیاں کی جائیں تو حکومت اپنے آپکو معاشرتی خدمات SOCIAL SERVICES پر دل کھول کر روپیہ صرف کرسکیگی۔

وظائف کے مصارف کا مسئلہ نہایت ہی پیچیدہ ہے، اس سلسلہ میں ہمیں بہت سے غیر یقینی عناصر کا لحاظ رکھنا پڑیگا اور بیمہ کے ماہرین کا مشورہ حاصل کرنا ہوگا۔ مزدوروں کی موجودہ تعداد مدت معینہ میں انکی تعداد میں متوقع اضافہ۔ ان کی عمر واری اور جنسی تقسیم۔ ان کی میعاد زندگی - یہ وہ مختلف امور ہیں جن کی کافی تحقیق کرنے اور جن سے متعلقہ تفصیلی اعداد حاصل کرنے کے بعد ہی کوئی ایک عملی اسکیم مرتب ہو سکیگی۔ اس قسم کے ابتدائی کام کے بعد ہمیں ایک وظیفہ فنڈ قائم کرنا اور اس میں مزدور، آجر اور حکومت کے مابین ادائیوں کا تناسب متعین کرنا ہوگا۔

وظائف کے انتظامی مسائل بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مرکزی حکومت کو محض عام پالیسی سے سروکار ہونا چاہیئے۔ وظیفہ کی عمر، استثنائی دفعات۔ ادائی اور معاوضہ کی شرحیں وغیرہ مقرر کرنا اور معاشرتی تحفظ کے مختلف شعبوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا یہ سب کام مرکزی حکومت ہی بخوبی انجام دے سکتی ہے لیکن وظیفوں کی اسکیم کے نفاذ اور نگرانی کا کام صوبائی حکومتوں کے تفویض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مزدوروں کے لئے وظیفہ یا اسی قسم کی دوسری اسکیموں کو مرتب کرتے وقت یہ امر پیش نظر ہونا چاہیئے کہ معاشرتی

[illegible]نظ کی کوئی ایک اسکیم بھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اگر ہم اس ملک کے عام معاشی لائحہ عمل سے علٰحدہ رد عمل لانے کی
[illegible]شش کریں۔ ہماری معاشی ترقی کے مختلف شعبے ایک دوسرے سے قریبی تعلق رکھتے ہیں لہٰذا بوڑھے مزدوروں
کے لئے وظائف کی اسکیم کے ساتھ ساتھ روزگار فراہم کرنے کی تدبیریں۔ قومی آمدنی بڑھانے اور اسے منصفانہ طور
پر تقسیم کرنے کے طریقے۔ صحت بخش غذا صاف ستھرے مکانات کی فراہمی۔ طبی امداد، عام خواندگی اور پیشہ ورانہ تعلیم
کے انتظامات، ان سب کی طرف بھی ہماری توجہ ہونی چاہیئے اور معاشی منصوبہ بندی کے جملہ اجزاء کو عملی حیثیت دینے
کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ عوام کا معیار زندگی بلند ہو۔

غزل

(از جناب قمر نعمانی سہسرامی ممتا)

وہ میرے دل میں ہیں جلوہ فرما میں انکی آنکھوں پہ چھا رہا ہوں
زہے مقدر خوشا محبت صلہ وفاؤں کا پا رہا ہوں

مرا ہی دل کچھ سمجھ رہا ہے جو زحمتیں میں اٹھا رہا ہوں
مگر تبسم کی موج میں ہر غم محبت چھپا رہا ہوں

ہے آج فطرت کا فیض جاری فضا سی ہوتی ہے کیف باری
ہوا کچھ ایسا سرور طاری کہ خود بخود گنگنا رہا ہوں

وفور جذبات میں نہ سوچا مآل کیا زندگی کا ہوگا
جو ظلم کی آندھیوں کے رخ پر چراغ الفت جلا رہا ہوں

مزاج بالکل بدل گیا ہے جنوں نہیں تو یہ اور کیا ہے
وہ سامنے میرے آ رہا ہے مگر میں خود کو چھپا رہا ہوں

رہا نہ ان کا غرور قایم ہوئی یہ فتحِ وفائے پیہم
خموش وہ سن رہے ہیں اور میں قصور ان کے گنا رہا ہوں

اگر ہے مجھ سے حجاب تمکو تو اور بھی احتیاط کرلو
کہ اپنی تخئیل کے سہارے نقابِ رخ سے اٹھا رہا ہوں

ہجوم عیش و نشاط میں بھی کمی سی محسوس کر رہے ہو
کیا نہ کچھ پہلے غور تم نے نظر سے کس کو گرا رہا ہوں

یہ موج و طوفاں سے کھیلتی تھی اسی طرح غرق بحر ہوتی
نہ جانے کیوں میں شکستہ کشتی قریب ساحل کے لا رہا ہوں

چراغ امید بجھ گیا ہے نہ کوئی ہمدرد و رہنما ہے
مگر یہ میرا ہی حوصلہ ہے کہ آج بھی مسکرا رہا ہوں

حقیقتوں سے جو آشنا ہیں وہی بغور اسکو سن سکیں گے
ہیں جنمیں کچھ تلخیاں بھی شامل ہیں ایسے نغمے سنا رہا ہوں

بدل گیا رخ ہی زندگی کا مری مسرت کا پوچھنا کیا؟
کسی کو ایوانِ دل میں پا کر فضائے عالم پہ چھا رہا ہوں

تمھیں مبارک ہوں اہل ساحل ہوا کے [illegible]
سفینۂ زندگی میں لے کر رخ حوادث پہ جا رہا ہوں

یہی جوانی کا [illegible]
کہ ایک رنگین گل کی خاطر چمن ہی سارا لٹا رہا ہوں

قمر بہت کچھ ہی شاک بازی ہوئی ہے میرے خلاف لیکن
[illegible] شعر و [illegible] اب [illegible] طرح گنگنا رہا ہوں

حسرت کی شاعری

(بشیر احمد ایم، اے)

حسرت نے اپنے مجموعۂ کلام کو جو صرف غزلیات پر مشتمل ہے مختلف حصّوں میں منقسم کیا ہے۔ ان میں ایک حصّہ کو عاشقانہ، ایک کو فاسقانہ، ایک کو عارفانہ بتایا ہے۔ یہ امر بظاہر ہمارے فہم نارسا سے بعید ہے کہ ایک ہی شخص بیک وقت عارف کامل، اور فاسق و فاجر کیونکر ہو سکتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ کبھی تو حسرت کو "آداب محبت" کا لحاظ اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ وہ خلوت میں بھی اپنے محبوب کی تصویر کو آنکھ سے لگا سکیں۔ ؎

یہ بھی آداب محبت نے گوارا نہ کیا — انکی تصویر بھی آنکھوں سے لگائی نہ گئی

اور کبھی یہی حسرت شب وصل میں ایسے بیباک ہو جاتے ہیں کہ معشوق کو اس قابل بھی نہیں چھوڑتے کہ وہ تمام شب ان سے آنکھ بھی ملا سکے۔ ؎

بے باک ملتے ہی جو ہوئے ہم تو شرم سے — آنکھ اُس پری نے پھر نہ ملائی تمام شب

کبھی کہتے ہیں ؎

دیکھنا بھی تو اُنھیں دور سے دیکھا کرنا — شیوۂ عشق نہیں حُسن کو رسوا کرنا

اور کبھی ایسے کھُل کھیلتے ہیں کہ محبوب کے مُنہ کا پان لے بھاگتے ہیں۔

ع ایک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

غرض حسرت کے کلام کے مطالعہ سے ان کا کوئی نظریۂ محبت ثابت نہیں ہوتا البتہ یہ ان کا کمال ہے کہ وہ اپنی "محبت کے واردات اور معاملات کو بالتشریح اور بالتفصیل بیان کرتے ہیں اور کسی قسم کا حجاب محسوس نہیں کرتے انکی محبوبہ چوری چھپے ان سے راتوں کو ملتی ہے۔ دوپہر کی تیز دھوپ میں ان سے ملنے کی خاطر ننگے پاؤں کوٹھے پر آتی ہے تمام رات یہ اسی غم میں گھُلتے ہیں کہ ان کے اور انکی ہم بستر محبوبہ کے درمیان رزائی کیوں حائل ہے اور اُس نے ارغوانی رنگ کی اوڑھنی کے بجائے سبز رنگ کی اوڑھنی کیوں اوڑھی ہے، لیکن یہ حسرت کا اپنا معاملہ ہے ہم اس پر اعتراض کرنے والے کون؟ وہ جانیں اور ان کی محبوبہ!

حسرت کے عاشقانہ جذبات میں جا بجا جو عامیانہ پن پایا جاتا ہے اس کی دو وجہیں ہماری سمجھ میں آتی ہیں اول تو یہ کہ حسرت کی غزل اُردو کی روایتی غزل کی جکڑبندیوں سے آزاد نہیں ہے یعنی یہ کہ خواہ انکا محبوب نرم دنداں ہی کیوں نہ ہو اس کو ظالم، سنگ دل، خون آشام، بد کلام اور دشنام گو بتانا ضروری ہے اور عاشق کے لئے باوجود کامگاری

بسلت نصیبی کے شب ہجر کی تڑپ کا بیان، خود ساختہ اغیار بدنہاد سے دست و گریباں ہونا اور بلے مانگے حضور دوست
اپنا سر حاضر کرنا لوازم غزل میں سے ہے۔ قدیم سے اُردو شاعروں کے کرداروں کے چند خصائص مسلم چلے آتے ہیں،
ہر غزل گو شاعر پر لازم ہے کہ وہ اُن قدیم آداب غزل گوئی کا کما حقہ لحاظ اور خیال رکھے۔ دوسری وجہ یہ بھی معلوم
ہوتی ہے کہ حسرت کی طبیعت ہی ایسی ہے کہ وہ ہر اچھی صورت پر مرتے ہیں خواہ بنت العم ہو خواہ محلہ کی چھوکری خواہ کوئی
اور ہی رشتہ دار جہاں ان کی دال گلتی نظر نہ آتی ہو۔ ؎

جائز نہیں چاہ اسکی مصیبت یہ بڑی ہے   کس فتنۂ ایماں سے کہاں آنکھ لڑی ہے

ان کی محبوبہ کبھی ثرو پائے اٹلی ہے کبھی عرشۂ جہاز کی ملاقاتی، کبھی شش بسر، کبھی ن بسر، کبھی دکن کی رونق اور کبھی پراگندہ
حال کوئی گڑیا۔ جب کسی شخص کا مرکز توجہ اس قدر جلد جلد بدلتا رہیگا تو ظاہر ہے کہ اس کے جذبات عشق میں بلندی، متانت
اور ترفع کہاں سے آئیگا۔ اپنے صفحات شاعری پر حسرت ایک عاشق کامگار اور وصل یار سے لذت آشنا شخص کی حیثیت
سے ظاہر ہوتا ہے، وہ کبھی کبھی فراق میں رونے بھی لگتا ہے مگر جلد ہی یا تو ان کا محبوب خود ہی من جاتا ہے یا یہ اپنا
کوئی اور انتظام کر لیتے ہیں۔ حسرت کو اپنے یار کی ناراضی کا بھی زیادہ ملال نہیں ہوتا اور وہ یہ کہکر بات کو ٹال جاتا ہے۔

ع بندہ پرور جائیے، اچھا خفا ہو جائیے!

حسرت کی یہ خوبی یقیناً قابل تحسین ہے کہ اُنھوں نے غزل گوئی میں وہ غلطی نہیں کی جو اکثر متاخرین نے کی یعنی وہ
نزاکت بیان، باریکی گفتار، تخیل کی بلندی، زبان کی بے جا تراشش خراشش پر جان نہیں دیتے بلکہ وہ جو کچھ کہتے ہیں
سلیس اور ستھری زبان میں اور صاف اور سادہ پیرایہ میں کہہ جاتے ہیں۔ انکی چھوٹی بحروں کی غزلیں اکثر سہل ممتنع کی
عمدہ مثالیں ہیں اور میر اور مومن کی یاد دلاتی ہیں۔ دو تین ایسی غزلیں درج ذیل ہیں۔

میں ہوں مجبور دل ہے سودائی   رخصت اے صبر اے شکیبائی
حسن کو ہے سر خود آرائی   مژدہ اے آرزوے شیدائی
نظر افروز اہل بینش ہے،   تیری پنہائیوں میں پیدائی
ہے وہ رنگین ادا بشان وفا   جان محبوبی و دلآرائی
بندۂ بندگان حضرت عشق
حسرت سرفراز رسوائی

(۲)

تھا مژدۂ بخشش الٰہی   پیغام نسیم صبح گاہی
در پر ہے مرے وہ حق فراموش   ثابت ہوئی میری بے گناہی

ہے دل کی صلاح جاں فشانی — از راہِ کمال خیر خواہی

زیبائشِ حسنِ دلبراں ہے — یہ کم نگہی، یہ کج کلاہی

دیتی ہے نگاہِ یار حسرت

آگاہیِ راز کی گواہی

—«۳»—

عاشق کو ہوئی فنائے فانی — پیغامِ حیاتِ جاودانی

ہے کثرتِ شوق کا نتیجہ — آنکھوں کی یہ آرزو فشانی

تھی ان کی نگاہ بے نگاہی — اک طرفہ ادائے دلستانی

کچھ داغِ فراق کے علاوہ — تم اور نہ دے چلے نشانی

لیکن جن اشعار میں حسرت کا کوئی مضمون متقدمین کے کسی مضمون سے لڑ گیا ہے وہاں حسرت کا عجز صاف ظاہر ہو جاتا ہے، مثلاً میر کا شعر ہے ؎

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ — نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائیگا

اس کے مقابلہ میں حسرت کا یہ شعر ؎

اس کا انجام بھی کچھ سوچ لیا ہے حسرت — تونے ربط اُن سے جو اس درجہ بڑھا رکھا ہے

بہت ہلکا معلوم ہوتا ہے۔

(یہ فرق بھی ملحوظ خاطر رہے کہ میر کو صرف یاد دوست میسر ہے اور حسرت کو ربط بھی)

یا غالب کا شعر ہے ؎

قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

اس کے ساتھ حسرت کا یہ شعر ؎

ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی — دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا

بہت ہی کم وزن معلوم ہوتا ہے۔

یا مومن کا شعر ہے ؎

چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمھارے سوا نہیں ہوتا

اس کے مقابلہ میں اگر حسرت کا یہ شعر پڑھیں ؎

ہجر ہے، حالِ مضطر کو سکوں — آنکھ، یاد کے سوا نہ ہوا

تو بڑا بے مزہ معلوم ہوتا ہے،
یا غالب نے کہا ہے، ؎

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

حسرت نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے، ؎

مل چکی ہم کو اُن سے داد وفا جو نہیں جانتے لگی دل کی

البتہ بیساختگی بیان اور زبان کے تیکھے پن میں حسرت داغ سے پیچھے نہیں ہیں، مشتے نمونہ از خروارے۔

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

کیا کیا میں نے جو تم ناحق خفا ہونے لگے کچھ سُنا بھی یا کہ یوں ہی فیصلہ ہونے لگا
غیر سے مل کر اُنھیں ناحق ہوا میرا خیال مجھ سے کیا مطلب بھلا میں کیوں خفا ہونے لگا
کیا ہوا حسرت وہ تیرا ادعائے ضبط غم دو ہی دن میں رنج فرقت کا گلہ ہونے لگا

سب ہماری زندگی ہی تک ہیں انکے حوصلے ورنہ یہ نازو غرور و دلربائی پھر کہاں؟

دم واپسیں آئے پرسش کو ناحق بس اب جاؤ تم سے خفا ہو چکے

اُن سے اظہار شوق کون کرے؟ جان ہی سے کوئی مگر گزرے
اُن کے قدموں پہ رکھدیا سر شوق ہم یہ کیا بیخودی میں کر گزرے

جرم نظارہ پہ کون اتنی خوشامد کرتا اب بھی وہ روٹھے ہیں، لو اور تماشا دیکھو

کیا کام اُنھیں پرسش ارباب وفا سے مرتا ہے، تو مر جائے کوئی انکی بلا سے

حسرت کی تشبیہیں بہت اچھی ہیں۔ رنگین، دلکش اور قریب الفہم، اکثر غیر مرئی اشیا اور وجدانی کیفیات مجسم بنکر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں یہ خوبی فارسی کے شاعر نظیری میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ معشوق کی موزونی جسم اور اُس کی رنگینی کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے۔ ؎

اللہ رے جسم یار کی خوبی کہ خود بخود رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

محبوب کی پیشانی کی دمک اور ٹھوڑی کی چمک اس طرح بیان کرتا ہے، ؎

ہے ناز حسن سے جو فروزاں جبین یار لبریز آب نور ہے چاہ ذقن تمام

معشوق جب کبھی عاشق سے ہمکلام ہوجاتا ہے تو عاشق کے تمام بدن میں لرزہ پڑ جاتا ہے۔ اس کیفیت کی یوں تصویر کشی کی ہے، ؎

تاثیر برقِ حُسن جو اُن کے سخن میں تھی اک لرزشِ خفی مرے سارے بدن میں تھی

اگر کبھی عاشق کو معشوق کے ساتھ خلوت میسر آجاتی ہے تو اکثر ایسا ہوجاتا ہے کہ وہ محبوب کے رخسار پر رخسار رکھکر رونے لگتا ہے اس حالت کی یوں عکاسی کی ہے، ؎

عالمِ حُسن میں ہیں نور کی نہریں جاری
یا رواں عارضِ جاناں کے کنارے آنسو

اکثر مواقع پر نئی تراکیب بھی کلام حسرت کو اور زیادہ دلکش اور دلنشیں بنا دیتی ہیں اس خوبی کے لئے فارسی کا شاعر عرفی مشہور ہے، چند اشعار میں یہ خصوصیت ملاحظہ ہو۔ ؎

دل نے پایا ہے محبت کا یہ اعلیٰ رتبہ آپ کے دردِ دوا کار کی خدمت کرکے

پاکے وہ گرم نظر مجھکو سرِ عرشِ بہاز کبھی چھُپنا تو کبھی پھر نظر آنا تیرا

حُسن کی نیم نگاہی بھی تمنا کے لئے موجبِ ناز ہوئی وجہ مباہات ہوئی

معاملات عشق کے ذیل میں حسرت اکثر ایسی پتے کی باتیں کہہ گئے ہیں جو اور شعراء کے کلام میں کم نظر آتی ہیں اور جن کو پڑھکر ہر شخص اپنا دل ٹٹولنے لگتا ہے اور اندر سے یہی آواز آتی ہے کہ یہ ہی میرے دل میں ہے۔ مثلاً یہ کہ جبتک عاشق اپنے عشق کا اظہار نہیں کرتا معشوق اپنے حُسن سے بے خبر رہتا ہے لیکن عاشق کی طرف سے اظہار تمنا ہوتے ہی اس میں خود بینی اور خود آرائی پیدا ہوجاتی ہے۔ ؎

حُسن بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

یا یہ کہ اگر عاشق اپنی تمنا اور خواہش کو زبان سے ادا کرتا ہے تو محبوب کو بُرا معلوم ہوتا ہے اس لئے اکثر نگہیں ہی 'ترجمانِ شوق' بن جاتی ہیں۔ ؎

گراں گزرے گا حرفِ آرزو اس طبعِ نازک پر نگاہِ شوق اس مفہوم رنگیں کو ادا کردے

یا یہ کہ ابتدائے عشق میں معشوق اپنے چاہنے والے پر بہت مہربان رہتا ہے اور اس وجہ سے عشق اور زیادہ بڑھتا جاتا ہے لیکن کچھ ہی دنوں بعد محبوب کی کج ادائیاں اور جفا شعاریاں شروع ہوجاتی ہیں۔ ؎

التفاتِ یار تھا اک خواب آغازِ وفا سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

یا یہ کہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ محبوب عاشق سے علیحدگی اور تنہائی میں اس کو یاد کرنے لگتا ہے تو قدرتی طور پر عاشق کا اضطراب اور بڑھ جاتا ہے۔ ؎

شاید وہ یاد کرتے ہیں مجھ کو کہ اور بھی
تکلیف اضطراب کی شدت ہے آجکل

یا یہ کہ محبوب اکثر تنہائی میں آئینہ کے اندر اپنی بہار حسن کی سیر کرتا رہتا ہے لیکن جونہی اپنے عاشق کا خیال آتا ہے سخت شرماتا ہے اور آئینہ کو نظروں کے آگے سے ہٹا دیتا ہے۔ ؎

آئینہ میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن
آیا میرا خیال تو شرما کے رہ گئے

چونکہ حسرت خود عشق پیشہ ہیں اس لئے اُنھوں نے اس قسم کے عاشق و معشوق کے معاملات کو جا بجا نہایت درجہ کامیابی کے ساتھ ادا کیا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں حسرت کی غزلوں کے مضامین میں کوئی تنوع اور جدت نہیں ہے بلکہ ان میں بھی وہی پُرانی داستانِ عشق دہرائی گئی ہے جس سے متقدمین کے دواوین بھرے پڑے ہیں، وہی شبِ ہجر کی طوالت کا رونا، وہی غمِ فراق میں گھُلنا، جنونِ عشق میں جیب و گریباں چاک ہونا، ہاتھ میں پتھر اور اپنا ہی سر، معشوق کی موکمری اور تنگ دہنی نہیں گئی نہ اس کا مزاج بدلا، وہی جفاکیشی وہی جلادی و سفاکی، وہی بنلادِ سنگھار، وہی بزمِ اغیار، وہی معشوق کی دشنام دہی اور سخت کلامی، وہی عاشق کی مذلت و رسوائی اور وہی رقیبوں کی خندہ زنی، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ سب کچھ حسرت نے ایک نئے ڈھنگ سے ادا کیا ہے اور اسی نئے طرز ادا اور تازگی بیان کی بدولت حسرت کو جدید غزل گوئی کا سردار مانا جاتا ہے۔ قدما کی طرح حسرت کی شاعری تخئیلی اور دماغی نہیں ہے، وہ پیچیدگی اور اختصار پر سلاست سادگی اور تفصیل کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار ہر شخص کو پسند آتے ہیں، زبان کی گھلاوٹ بیان کی بیساختگی اور طبیعت کی روانی اُس وقت اور زیادہ واضح ہوتی ہے جب وہ غزل مسلسل کہتے ہیں۔ تسلسل بیان میں مضمون اور خیال کی تمام تفصیلات حیطۂ بیان میں آجاتی ہیں اور یہی نکات انکی شاعری کو واقعیت اور حقیقت کا رنگ عطا کرتے ہیں۔ جب حسرت اپنے پہلے پہل دل لگانے کا حال اور اپنے عہد ہوس کا فسانہ یاد کرتے ہیں تو واقعی ہر قاری و سامع کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ تو میرے ہی دل کا حال ہے اور یہ تو میری ہی داستانِ عشق ہے اور یہی شاعر کا کمال شاعری ہے۔ بار بار کھڑکی کی طرف دیکھنا اور وہاں سے محبوبہ کا پردہ کا خیال رکھتے ہوئے جھانکنا، کبھی چوری چھپے مل جانے پر ان کا بے باک ہو کر گستاخ ہو جانا اور اس کا دانتوں میں اُنگلی دبانا، محبوبہ پس پردہ ہو تو ان کا پردہ کا کونہ کھینچ لینا اور اس کا دوپٹہ سے منہ چھپا لینا۔ محبوبہ کا جان کر سوتا بن جانا اور یہ جب جرأت رندانہ کے ساتھ تکمیل شوق کو آگے بڑھیں تو اس کا ہنسکر آنکھیں کھول دینا کبھی منانا کبھی خود روٹھ جانا غرض صدہا ایسے نکات باریک واقعات اور نازک معاملات بیان کئے ہیں جو اس تفصیل کے ساتھ کسی اور شاعر نے بیان نہیں

قدما کا معیار اخلاق یہ تھا کہ شہوانی جذبات اور جسمانی لوث کو چھپاتے تھے، ع دل در ہوس گناہ و برلب توبہ

والا معاملہ تھا، عہد حاضرہ کا یہ دستور ہے کہ شاعری شاعر کے دل اور دماغ کا آئینہ ہو جو اس کے دل پر گزرتی ہو اور جس

قسم کے خیالات اس کے دماغ میں ہیجان برپا کریں اُنھیں کا حال بے کم و کاست شعر میں ادا ہو تاکہ شاعری میں تازگی

واقعیت حقیقت اور آپ بیتی کا رنگ نمودار ہو خشک روایتی اور تقلیدی نہ ہو، حسرت کی عاشقانہ شاعری انکی آپ بیتی

ہے۔ اگر اس کی محبت کام جویانہ اور فاسقانہ ہے تو اس کو اس کا اعتراف کرتے ہوئے قطعی کوئی باک نہیں ہوتا اگر وہ اپنی

محبوبہ کی نازک کلائی موڑ دیتا ہے، اُس کے منہ کا پان لے بھاگتا ہے۔ اس کو ملاقات رقیب پر شرمندہ کرتا ہے۔ رُخ یار

سے چادر سرکا دیتا ہے، زلف معنبر کو چوم لیتا ہے، بوئے گریباں سونگھتا ہے، انتظار محبوب میں سیج کو سجاتا ہے اضطراب

شوق میں جسمانی وصل سے درگزر نہیں کرتا تو اس کے من وعن بیان کر دینے سے بھی نہیں چوکتا، متاخرین کی طرح

بیجا ہیر پھیر میں بات کو نہیں ٹالتا اور گل و بلبل کے پردے کی آڑ نہیں لیتا۔ ؎

کیا حُسن پرستی بھی کوئی جرم ہے حسرت
ہونے دو جو اخلاق کی تنقید کڑی ہے،

احساس

(حضرت منور لکھنوی)

بہت کچھ بوجھ دل کا لے منور دور ہوتا ہے
کسی نادار کو جب مسکراتے دیکھ لیتا ہوں

وہ دن بھر کی تھکی مزدورنیں غیرت دلاتی ہیں
جنھیں میں شام کو مستی میں گاتے دیکھ لیتا ہوں

طمانچے منہ پہ قسمت کے لگاتا ہے لہو میرا
کسی بیکس کو جب آنسو بہاتے دیکھ لیتا ہوں

مجھے اس کا جگر اپنا جگر معلوم ہوتا ہے
جسے بھی کوئی گہری چوٹ کھاتے دیکھ لیتا ہوں

مرے دل کا چمن بھی کچھ تقاضہ کر ہی دیتا ہے
جو پھولوں کو بہار اپنی لٹاتے دیکھ لیتا ہوں

مجھے مجبور کر دیتے ہیں میری خاک کے ذرے
جو تاروں کو فلک پر جگمگاتے دیکھ لیتا ہوں

غزل

(از جناب محکم سنگھ صاحب متوانی بی، اے ایل ایل بی)

یلِ ونہارِ دہر کیا، رنج ہے کیا، خوشی ہی کیا
حُسنِ فریب کے سوا، میری یہ زندگی ہے کیا

ہینِ بشر کا ارتقا، حُور و قصور و خُلد ہے
تیری ہی بندگی سہی، حاصلِ بندگی ہی کیا

اُٹھ! کہ محیط ہو گیا چار طرف سکوتِ غم
شورشِ کائنات میں صورتِ آگہی ہی کیا،

گردشِ دہر کا گلہ، رنجِ فغانِ بے صلہ
میرے مذاقِ درد میں کوئی ابھی کمی ہے کیا

جراُتِ دید ہے مگر حسرتِ دید اب کہاں
تیری نگاہِ فتنہ زا نقش بٹھا گئی ہے کیا

دَیر کبھی، حَرم کبھی، مسجد و میکدہ کبھی
کِس کی ہے جستجو مجھے، دل پہ یہ آبنی ہی کیا

منزلِ زندگی کہاں، زحمتِ رہنما کہاں
ہم ہیں فریبِ آشنا، تہمتِ گمرہی ہے کیا

زیست بھی ناتمام ہے، مَوت بھی ناتمام ہے
عالمِ دار و گیر میں پھر یہ ہما ہمی ہے کیا

عشق کی کیفیت نہ پُوچھ، محکم حیرتی ہے کچھ
سس ہیں، ،، ضالیا حسن ابھی ابھی ہے کیا

تاریخ ہندؑ

(از جناب ٹھاکر جے، آر رائے صاحب جرنلسٹ مورخ ہند)

تاریخ ہند کے نام سے جو کتابیں ہمارے اسکول اور کالجوں میں پڑھائی جاتی ہیں وہ اصلیت سے کوسوں دور اور محض علماء مغرب کے خیالات کی علمبردار ہوتی ہیں اور ان کے ذریعہ ہماری تہذیب و تمدن کی عظمت پر پردہ ڈال کر خیالات کی اشاعت کیجاتی ہے، چنانچہ علمائے مغرب کا اولین دعویٰ یہ ہے کہ ہمارے بزرگ تاریخ نویسی سے بالکل بے بہرہ تھے حالانکہ ایمان کی یہ ہے کہ ازمنۂ ماضیہ کے آریہ ہندوؤں کا شوق تاریخ اور اس کا تصور ایسا اعلیٰ درجہ کا تھا کہ مغرب کے عالی دماغ ماہروں کو ابتک نصیب نہیں ہوا۔ مہابھارت (آدی پرب) متسں پُران، اور وایو پُران سے بخوبی عیاں ہے کہ نہایت قدیم زمانہ سے فن تاریخ موجود اور رائج ہے اور اس کا خاص نام اتہاس پران مشہور ہے گر ہمارے رشیوں کا تصور تاریخ مروجہ خیال سے کلیۃً مختلف تھا۔ زمانہ قدیم کے ہندو آریوں کی تاریخ کی حامل مہابھارت، رامائن اور پران ہیں، ہم اسے تہذیب و تمدن کی تاریخ CULTURAL HISTORY کہہ سکتے ہیں جس کا خیال اس زمانہ میں پہلے پہل امریکہ میں رونما ہوا، اس کی رو سے صرف حکمرانوں اور امراء کی مار دھاڑ کی کہانیاں ہی انہیں قلمبند کیجاتیں بلکہ افراد قوم کے جملہ مشاغل اور ہر قسم کی ترقی کا تذکرہ بھی اس کا خاص موضوع ہے۔ اس اعتبار سے ہمارا اتہاس پران سب سے اعلیٰ و بلند مرتبہ تاریخ ہے اسمیں سورج بنس اور چندر بنس کے شاہی خاندانوں کے حالات کے علاوہ تمام مہذب اور ملیکش قوموں اور اُن کے عقائد اور دستوروں اور رسموں اور تمام نرالی باتوں کا اجمالی ذکر پایا جاتا ہے، دریاؤں، پہاڑوں، جھیلوں اور جنگلوں کے حالات بھی ملتے ہیں۔ اس کے سوا مہابھارت میں فلسفیانہ باتیں، علوم و فنون کی تاریخ، مہا پرشوں کے تذکرے، ادبی مسائل وغیرہ بھرے پڑے ہیں۔ تخلیق کے بارے میں طرح طرح کے خیالات، چتر ورگ پر لمبی لمبی بحثیں، مذہبی نکات، بھگتی مت، سیاست کے لمبے چوڑے مسائل، بھیشم پتامہ کی زبانی بیان کیے گئے ہیں اور یہ تمام باتیں ہماری تہذیب سے تعلق رکھتی ہیں۔ مہابھارت، رامائن اور پرانوں کا طرز بیان شاعرانہ ہے، پرتھوویں पृथुवेरा کے مقرر کردہ سوت मृत جن کی اولاد سے آجکل بھاٹ اور چارن ہیں، ہر ایک راجہ کے خاندانی شجرے اور اُن کے کارہائے نمایاں نظم میں قلمبند کرنے

عہ اسی سلسلہ میں زمانہ بابت ۱۹۳۲ء میں شری پت جگیشور ناتھ ورما بیتاب کا مضمون "آریوں کی تاریخ نویسی" ملاحظہ ہو۔ مضمون ہذا اس کی تائید میں تحریر کیا گیا ہے۔

تھے۔ اس کے علاوہ ہر قسم کے علوم قدیم بھی سوت ہی محفوظ رکھتے تھے۔ اگر غور سے پڑھ کر ترجمہ کیا جائے تو ان ہی کتابوں سے ہماری تاریخ قدیم مرتب ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنے انداز پر انگریزی زبان میں تاریخ عہد قدیم شروع کر رکھی ہے۔

تاریخ کا شوق | ہمارے رشیوں نے ہندوؤں میں تاریخ اور جغرافیہ کا مستقل شوق قائم رکھنے کیلئے دو تدبیریں کی ہیں۔ (۱) سری رام چندر جی کو تہذیب کا سب سے بڑا مظہر قرار دیا ہے جیسا کہ بن پرب میں لکھا ہے۔ رام جنم وگنی نے شری رامچندر میں آٹھوں قدیم تو میں، آدتیہ، رودر، وسو، وید، اُپنشد اور سارے دریا اور پہاڑ مجسم دیکھے، (۲) انوشاسن پرب میں یوں لکھا ہے، "برہما، ساوتری، نارائن، شیو، آدتیہ وغیرہ وشودیو، بڑے بڑے رشیوں، منیوں، چکرورتی تاجداروں، دریاؤں، پہاڑوں اور جھیلوں کے نام اشنان کر کے لینے سے ثواب ہوتا ہے۔ اس بات کو فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ مہاپرشوں کے کارنامایاں ہی قومی تاریخ کا تذکرہ ہوتے ہیں۔ ذرا غور فرمائیے شری رامچندر اور شری کرشن کے سب سے ممتاز مظہر ہیں۔ بھگوان گوتم بدھ، مہابیر بھرت، سگر، منو، وے وست یاگ ولکیہ، اگست وغیرہ بزرگ ہستیوں میں گنے جاتے ہیں۔ اشوک اور بکرماجیت کا نام سُنتے ہی ان کے تمام کارنامے ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ دریاؤں، پہاڑوں اور تیرتھوں سے جغرافیہ کا ادراک پیدا ہوتا ہے اسی سے قومی اتحاد و یگانگت کا زور پکڑتا ہے۔

اسکولی کتابوں میں ہمارے بزرگوں کا وسط ایشیا سے آنا بتایا جاتا ہے لیکن یہ بالکل غلط ہے، ہماری کتابوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آریہ ہند و غیر ملکوں سے نہیں آئے بلکہ وہ اسی سرزمین ہند کے رہنے والے تھے ان کا مقام پیدائش سورگ کہلاتا ہے جس سے مراد آجکل کا ٹہری گڑھوال ہے۔ قدیم زمانہ میں یہ خطہ جھیل مان سرودر تک پھیلا ہوا تھا۔ منداکنی اور الکانندیاں اس کے اندر بہتی تھیں۔ گندھ مادن، مایہ ورت اور میرو کے پہاڑ سورگ کے خاص نشانات کہے جاتے ہیں، ذرا سوچئے ٹہری گڑھوال سے بڑھ کر سارے ہند میں کوئی خطہ پاک ہے؟ بدری ناتھ اور کیدار ناتھ کے تیرتھ اور سب سے بڑا پاک دریائے گنگا اسی سرزمین میں بہتا ہے۔

ہماری پُرانی کتابوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نہایت قدیم زمانے سے آٹھ بڑی بڑی قومیں ہند کے مختلف حصّوں میں آباد تھیں (۱) سر۔ سرسوتی اور چندر بھاگا (چناب) کے درمیان کانگڑے سے بلوچستان تک (۲) آریہ، سرسوتی اور نربدا کے درمیان بہارسے کاٹھیاواڑ تک (۳) ناگ۔ آج کل کے صوبہ بمبئی کے خاندیش اور دیگر صوبوں میں (۴) راکشش۔ آج کل کے حیدرآباد، میسور، احاطہ مدراس اور سارے جنوبی ہند میں۔ (۵) پشاچ بندھیاچل کی کوہوں اور بیابانوں میں (۶) یکش۔ الموڑہ کے مشرق اور نیپال میں (۷) گندھرب، ہری ورش میں جس سے مراد شملے اور کانگڑے کا علاقہ ہے (۸) کنر۔ رامپور بشہر میں۔ آج کل کی ہند قوم انہیں

قدیم قوموں کے باہم میل سے بنی ہے۔ اور جسے ہندو دھرم پکارا جاتا ہے، وہ انھیں ابتدائی قوموں کے مختلف عقاید اور مراسم کا مجموعہ ہے اور ہندو تہذیب و تمدن انھیں قوموں کی گوناگوں عقائد و مراسم سے بنے ہیں۔ ہماری قدیم کتابوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہند قدیم کے باشندے دنیا کے مختلف ملکوں میں جاکر آباد ہوتے اور دیگر اقوام میں اپنی تہذیب پھیلاتے اور اپنا سکہ جماتے رہے۔ سب سے پہلے اسر لوگ جنگ دیواسر میں شکست کھاکر خالدیہ میں جابسے۔ جس سے بعد میں سمیری تہذیب رونما ہوئی۔ بجاتی بنش کی نسل چھتری ایران میں آباد ہوئے۔ پھر خطۂ جنوب کے ناگ مصر میں گئے اور فرعون خاندان کے حکمرانوں کے بزرگ بنے۔ پھر یہ مغربی ایشیا میں آباد ہوئے، جس سے یونان کی تہذیب ظہور میں آئی۔ عیسیٰ سے ہزار بارہ سو برس پہلے مالوہ، جنوبی ہند اور کلنگ کے لوگ ملایا، ہند چینی، جزائر سماترا، جاوا، بورنیو، جزائر فلپائن اور پالی نیشیا میں جاکر آباد ہوئے۔ بعد میں وسطی امریکہ اور میکسکو میں جارہے۔ پہلے چین پھر جاپان نے ہندوؤں کی تہذیب کا لوہا مانا۔ کوریا اور منچوریہ بھی اس عالمگیر اثر سے نہ بچ سکے۔ پچھلے ڈیڑھ سال کی تحقیقات سے تہذیب مغرب کے عالمگیر اثرات کے زبردست ثبوت ہم پہونچ چکے ہیں۔ مگر ہم یہاں پر تفصیلی بحث نہیں کر سکتے۔ مصر اور بحیرہ روم سے لیکر بحرالکاہل کے پرلے سرے کے ملکوں میں کبھی نہ مٹنے والے نشان پائے جاتے ہیں۔ ان ملکوں کی زبان میں سنسکرت کے لفظ ملتے ہیں، صناعی کا طریقہ رواج، مذہبی عقائد، رقص، صنعت، سکے اور اوزان وغیرہ سب کے سب ہندی ہونے کے زندہ جاوید ثبوت ہیں۔ کمبوڈیہ کا انگروات کا وہ پیکر وشنو مندر اور جاوا کا بوروبندر کا بودھ مندر ہندو تہذیب اور عظمت کی سب سے بڑی یادگاریں ہیں جنھیں یوروپی ماہر عجائبات روزگار میں شمار کرتے ہیں یہ ہندو فن تعمیر کے عظیم الشان نمونے ہیں۔ ہندو جہاں گئے وہاں اُنھوں نے ملیکش لوگوں کو لوٹنے اور غلام بنانے کی کوشش نہیں کی جیسا کہ مغربی قومیں کئی برس سے کرتی چلی آئی ہیں بلکہ انھیں تہذیب کا سبق پڑھایا، ان کا اخلاق سدھارا جس سے انھیں مستقل فیض پہونچا۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ تہذیب ناآشنا قوموں کو شائستہ بنانے اور اغیار کو فیض پہنچانے میں ہندو سارے جہاں کی قوموں میں لاثانی اور سب سے بڑھے ہوئے ثابت ہوئے۔ بنی آدم کے ساتھ جو بھلائی عہد قدیم کے ہندوؤں نے کی اسکی نظیر صرف عیسائی مشنریوں کی روش پیش کرتی ہے۔

تہذیب کا آغاز اب یہ دکھانا ضروری ہے کہ آریائی تہذیب کی ابتدا کب سے ہوتی ہے۔ سرکاری تاریخ بھگوان گوتم بدھ سے شروع ہوتی ہے اس سے پہلے کے حالات پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ تہذیب ہنود کا سب سے بڑا نتیجہ وید ہے جسے ہندو ایشور یہ کرت (کلام الٰہی) مانتے ہیں۔ یہ ہماری روحانی اور دنیاوی تہذیب کا محرک اولی اور مخزن ہے اس سے ہم دو حوالے پیش کرتے ہیں (۱) رگ وید ۵ منڈل۔ ۴۰ سوکت ۵۔ ۶ ورچیہ۔ اس میں ایک کامل گہن TOTAL ECLIPSE کا ذکر ملتا ہے۔ اس کا حساب کلکتے کے ایک ماہر نے لگایا ہے۔ یہ سورج گہن ۳۹۲۳

قبل مسیح میں ۲۹ جولائی کو واقع ہوا تھا (۲) رگ وید ۱۰ منڈل ۸۰ سوکت میں جس واقعہ کا ذکر ہے پروفیسر دھرنیدر نکھ پادھیائے نے اُس کا حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ عیسیٰ سے سولہ ہزار برس پہلے رونما ہوا تھا۔ بمبئی کے نامی عالم ایس۔ آر گربوتے نے ۱۸۵۳ء میں اس کا حساب لگایا تھا تو بھی اتنی ہی مدت نکلی تھی۔ فلکی مشاہدوں کے حساب میں فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ ریاضی کے اُصول پر مبنی ہوتے ہیں۔ اسی طرح اور مشاہدوں کا ذکر ویدک لٹریچر میں پایا جاتا ہے۔ ہماری جنتری سے بھی ہندو تہذیب کی قدامت ثابت ہوتی ہے، آجکل سارے حساب اشونی نکشتر سے کئے جاتے ہیں لیکن پُرانی کتابوں میں بھارنی، سرآوشتہ، کرتکہ، روہنی، مول، مرگ شترا اور پنروسو کا ذکر آتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مختلف جگہوں میں مختلف نکشتروں سے حساب ہوتا رہا ہے۔ سب سے پہلا (آدمی نکشتر) پنروسو تھا۔ جو آج سے آٹھ ہزار تین سو پچاس (۸۳۵۰) برس پہلے نکشتروں میں پہلا قرار پایا تھا۔ گویا ہندوؤں کے فلکی مشاہدات آٹھ نو ہزار برس کے پرانے ہیں جو انکی تہذیب کی قدامت پر دلالت کرتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ہندو رشیوں نے صدہا سال کے مشاہدوں کے بعد استقبال اعتدالین کا قاعدہ وضع کیا تھا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جب دن رات برابر ہوتے ہیں تو ہر سال موجودہ رفتار سے سوا پچاس سکنڈ کا فرق پڑتا ہے۔ اب کے دو ہزار برس پہلے اسکی رفتار ۴۶ سیکنڈ تھی۔ جتنا پیچھے جاؤ اتنی ہی رفتار سست ہوتی جاتی ہے ۷۲ برس میں ایک گھنٹے کا فرق پڑتا ہے۔ ایک ہزار سال میں پورا نکشتر ہی بدل جاتا ہے۔ رشیوں نے یہ دَور مکمل کیا جس کا عرصہ (۲۵۸۲۷) برس مقرر کیا گیا ہے۔ موسمی تغیر و تبدل، بارش کا جلد یا دیر سے شروع ہونا اسی استقبال اعتدالین کی برکت ہے۔

<u>ہندوؤں کی اصل</u> | علمائے مغرب اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے ہندو اہل قلم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہندو لفظ سندھ سے بگڑ کر بنا ہے کیونکہ اہل ایران سؔ کو ہ سے بدل ڈالتے ہیں مگر اصل یہ ہے کہ ہندو لفظ سنسکرت کے لفظ اندو (چاند) سے بگڑ کر بنا ہے جو قرین قیاس ہے کہ عوام کی زبان میں اندو سے ہندو آسانی سے بن جاتا ہے، انگریزی نام جیکسن جے کشن ہو جاتا ہے اور لسنبت سے لسنیٹ آسانی سے بن سکتا ہے۔ آدتی کے بارہ لڑکے آدتیہ مشہور ہیں، بعد میں ان کا نام دیوتا (شریف۔ ممتاز) ہو گیا مگر جب وہ سُورگ سے اُتر کر اودھ اور ضلع میرٹھ میں آباد ہو گئے تو آریہ کہلائے جس سے یہ زمین آریہ ورت کہلائی۔ اس سے پہلے بھارت اور مانو ودیپ مشہور تھا، عرصہ کے بعد چندر بنشی راج کے غلبہ کے باعث ہندوستھان کہلایا۔ لفظ ہندو سے شرمانے کی کوئی وجہ نہیں۔ فارسی اور عربی لغات میں اس لفظ کے کچھ ہی معنی ہوں مگر یہ سنسکرت کا لفظ اندو بمعنی چاند ہے جو اپنے اندر زبردست تاریخی یادگار لئے ہوئے ہے۔ اسروں نے سو سال کے ہولناک معرکہ کے بعد شکست کھائی اور بصرہ و بغداد بھاگ گئے۔ اس لفظ کے عرصہ وجود میں آنے کا یہی باعث ہوا۔

معصوم رُوح

(از جناب حیات. بی. اے)

جنگ عظیم سے قبل پیرس میں مصوروں اور بُت تراشوں کی کثرت تھی لیکن ہیری کی شہرت دیگر تمام سنگ تراشوں پر چھا چکی تھی، وہ ایک عجیب آدمی تھا۔ اگر کبھی اس پر کام کرنے کا دورہ پڑتا تو وہ شب و روز بغیر خواب و خور اپنے خیالات کو مادّی لباس میں جلوہ گر کرنے کی کوشش میں مصروف رہتا۔ دنیا کی تمام دلچسپیاں سمٹ کر اُس کے تنگ نگار خانے کی چار دیواری میں سما جاتی تھیں، وہ اپنے برہنہ ماڈل کو سامنے رکھ کر اُسکی قدرتی ساخت اور حُسن کی گہرائیوں میں اس قدر ڈوب جایا کرتا تھا کہ اسکی نفسانی خواہشات، اُس کو سطحی خیالات اور ارذل جذبات سے ہمکنار کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی تھیں۔ وہ بظاہر کسی اعلیٰ روحانی مقصد کے حصول کی کوششوں میں منہمک نظر آتا تھا اسکی نظریں ہمیشہ کسی خاص ماڈل کی متلاشی رہتی تھیں اور جب کبھی وہ کسی حسین ماڈل کو اپنی فن کاری کا مظہر بنانے میں کامیاب ہو جاتا تھا اس وقت اس کی مسرتوں کی انتہا نہ رہتی تھی۔ اس کا مختصر نگار خانہ علوی نغموں سے گونجتا ہوا محسوس ہونے لگتا تھا لیکن یہ مسرت ایک سرمایۂ مستعار کی طرح چند لمحوں سے زیادہ اس کے مضطرب دل کو نہیں بہلا سکتی تھی، اُسے یکا یک احساس ہوتا کہ اُس کا تخلیق کیا ہوا مجسمہ اُس کے ناقابل فہم بلند خیالات کا محض ایک خفیف اور لطیف پرتو ہے اور بس۔ وہ چیز جس کے اظہار کے لئے وہ اس قدر جانفشانی سے کوشاں تھا یا تو اس عالم کے مادّی وسائل کی رسائی سے بالا تر تھی یا مادہ خود اتنی صلاحیت نہ رکھتا تھا کہ مادّی ذرائع سے روحانی محسوسات کی ترجمانی کرسکتا۔ بہرحال وہ اپنی ناکامی پر پہلے مایوس ہوتا اس کے بعد برافروختہ ہو جاتا اور ایک آہنی مارتول سے اپنی اس مجسّم سعی ناتمام کو پاش پاش کر دیتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے نگار خانے میں شکستہ بتوں کے لاتعداد ٹکڑے اس کے اضطراب قلب اور عدم سکون کی شہادت دیا کرتے تھے۔ پیرس کے دیگر سنگ تراشوں کے مقابلے میں ہیری اپنے ماڈل کو خاطر خواہ معاوضہ دیا کرتا تھا اُس کا ذریعۂ معاش اُن خوش قسمت مجسمہائے سنگیں کو سمجھ لیجئے جو اسکی مایوسی کی مشق ستم سے بچکر کسی قدر شناس کے ہاتھ لگ جاتے تھے۔ اس لئے وہ مفلس تھا لیکن افلاس کے اندوہگیں احساسات سے مستغنی۔

ایک روز ایک مدّت دراز کے بعد پیرس ہی میں میری اس سے ملاقات ہوئی۔ میں اُسے بمشکل پہچان سکا۔ دس سال کے عرصے میں وہ کس قدر بدل گیا تھا۔ وہ مجھے اپنے ہمراہ نگار خانے میں لے گیا۔ میں نے اندر داخل ہوتے ہی اپنے سامنے ایک نہایت خوبصورت مجسّمے کو دیکھا۔ میری نظروں میں وہ مجسمہ ہر لحاظ سے مکمل تھا اور آرٹ کا نادر نمونہ۔ میں نے اسکی تعریف نہ کرنا ظلم سمجھا اور ہیری سے کہا "کتنا حسین! کس قدر مکمل ہے یہ مجسمہ!" میرے یہ الفاظ سُنکر اسکی وہ مُسکراہٹ جو میری ملاقات

سے پیدا ہو گئی تھی معدوم ہو گئی اور اُس نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا "دنیا میں میرا ہمنوا کوئی نہیں، ہمخیال کوئی نہیں۔ مجھے
امید نہ تھی کہ تم بھی اوروں کی طرح مجھے بیوقوف بنانے کی کوششوں میں خود بھی بیوقوف بنو گے" یہ کہکر اُس نے اُسی ظالم
مارتول سے اُس کو پاش پاش کر دیا۔ میری نظروں کے سامنے کسی کے جذبات کے ٹکڑے بکھر گئے مجھے یہ صدمہ ہوا، ناقابلِ
بیان صدمہ۔ اُس نے مجھے دیکھا اور میرے قریب آکر کہنے لگا "تم اُسے حسین کہتے ہو، تم اُسے مکمل کہتے ہو، کسی نسوانی
جسم کے مختلف اعضاء کی فطری مناسبت کو ظاہر کرنا ہی حُسن نہیں ہے ایک بے رُوح مجسمہ بنا کر کھڑا کر دینا ہی کمال نہیں ہے
تم اُسے ایک عورت کہتے ہو، کیا تم نے اس عورت کے مجسمے کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ کیا تمھیں اُن آنکھوں کو دیکھ کر کسی
معصوم روح کی نزدیکی کا احساس ہوا تھا؟ اگر نہیں تو یہ اسی قابل تھا کہ اُس کے ٹکڑے میرے اسٹوڈیو کی ویرانیوں میں
اضافہ کریں؟ "سُنو!" اُس نے میرے شانے پر شفقت سے ہاتھ رکھکر کہا "میں ایک مدت سے اس حسین اور معصوم رُوح
کی تلاش میں ہوں۔ میں نے اُسے پیرس کے ویران اور درخشندہ سوسائٹی میں ڈھونڈھا۔ میں نے اُسے تصنع کی نقابوں
میں سے جھانکا۔ میں نے اُسے لاوارث سہمی ہوئی آنکھوں میں تلاش کیا مگر آج تک اُسے نہیں پاسکا ہوں مگر یہ تلاش
میری زندگی کا ماحصل ہوگی۔ میں اپنی تمام زندگی اس مقدس مقصد پر قربان کر دینا بہتر سمجھتا ہوں۔ اُس نام نہاد آرٹ
سے جس کی قیمت چند کلماتِ آفریں ہوں یا چند حقیر سکے۔ تمھاری سمجھ میں میری یہ باتیں ابھی نہیں آسکتیں لیکن اگر میں
اپنی تلاش میں کامیاب ہو گیا تو میں تمھیں دکھاؤں گا کہ "معصوم روح" سے میری کیا مراد ہے"

اس واقعے کے چند سال بعد میری ہیری سے دوبارہ ملاقات ہوئی لیکن اس وقت اس میں حیرت انگیز تبدیلی
رونما ہو چکی تھی۔ اُس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر بشاشت کھیل رہی تھی، اُسکی آنکھوں سے اُسکی دلی مسرت جھانک
رہی تھی اور وہ جوانوں کی طرح چست و چالاک نظر آرہا تھا۔ اُس نے غیر معمولی طریقے سے مجھ سے مصافحہ کیا اور اُسکی
بات سے شوخی ہر لفظ سے آزاد اور بے باک مسرت عیاں تھی "تمھیں یاد ہوگا کہ میں نے تم سے کسی حسین روح کا ذکر کیا
تھا" اُس نے مجھ سے پُر جوش لہجے میں مسکرا کر کہا "وہ مجھے مل گئی ہے! دوست! وہ مجھے غیر متوقع طریقے سے ملی!
میری زندگی کا مقصد! میری روح کی جنت! چلو میں آج اپنا وعدہ پورا کروں گا اور آج تمھارے تمام ثنا و صفت کو
بخوشی برداشت کرکے جھوموں گا" اُس نے مجذوبانہ انداز میں کہا اور مجھے کھینچکر نگار خانے میں لے گیا۔ اندر داخل ہوتے
ہی میں نے اپنے مقابل ایک ذی روح مجسمے کو دیکھا ایک حسین دوشیزہ بالکل ساکت ایک مخصوص انداز میں نگار خانے
کی مقابل دیوار کے قریب کھڑی ہوئی تھی لیکن میں نے اس سے ایسی کئی لڑکیاں دیکھی تھیں، وہ پیرس کی ناپاک
تصنع سے پاک ضرور نظر آتی تھی۔ "یہاں سے نہیں ذرا قریب جاکر اُسکی آنکھوں کی گہرائیوں میں دیکھو!" ہیری نے خوشی
سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔ میں اُس لڑکی کی جانب بڑھا لیکن ہر قدم پر اُسکی بڑھتی ہوئی نزدیکی میری روح کے لئے
ایک عجیب ماحول پیدا کرنے لگی۔ یہاں تک کہ میں اُس کے بالکل قریب پہونچ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں وہ چیز تھی یا نہیں

جسے میرا دوست حسین روح اور معصوم روح کے نام سے یاد کرتا تھا یہ میں نہیں کہہ سکتا لیکن میں نے اُن پیاری پیاری آنکھوں میں سادہ حُسن اور وہ معصومیت دیکھی جواب تک میری نگاہوں سے کوسوں دُور تھی۔ اُن آنکھوں کی طرف دیکھتے وقت مجھے محسوس ہو رہا تھا گویا میری روح کی تمام کثافتیں لطافتوں میں تبدیل ہو رہی ہوں جیسے میری زندگی گزشتہ زندگی کی آوارہ سانسوں پر کسی نے قلم زن کر دیا ہو اور میرے اُن جذبات اور احساسات کو جن کے وجود کا مجھے احساس تک نہ تھا کسی نے جھنجھوڑ کر اُبھارا ہو میرے کانوں میں مترنم نقرئی گھنٹیاں سی بجنے لگیں "شاید حسین روح اسی کو کہتے ہیں، شاید یہی معصوم روح ہے" میں اپنے دل میں کہہ رہا تھا اتنے میں ہیری کی آواز نے مجھے اس حسین خواب سے چونکا دیا۔

"کہو دوست! کیا خیال ہے؟" اُس نے کہا "کچھ نہیں کہا جاتا، ہیری! میں نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا" لیکن یہ تو کہو کہ تم نے اسے پیرس جیسے شہر میں کیسے حاصل کر لیا، ہیری!" میں نے اُس سے سوال کیا۔

"درحقیقت اس کے ملنے میں میری کوششوں کو مطلق دخل نہیں ہے" اُس نے کہا "کل صبح میرے دروازے پر کسی نے دستک دی اُس کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ کوئی جوان لڑکی مجھ سے امداد کی طلبگار ہے، میں نے اُسے دیکھا میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میں نے اُسے ملازم رکھ لیا۔ کیا میں یہ نہ سمجھ لوں کہ میرے متلاشی جذبات اور میرے بکھرے ہوئے خیالات نے اُسکی رہنمائی کی ہو"

"یہ تو خیر ٹھیک ہے مگر تم پیرس کی اُس معصومیت کُش فضا میں اُس کی روح کو گناہ سے کیونکر بچا سکو گے؟" میں نے ہمدردانہ لہجے میں اُس سے سوال کیا لیکن اِن الفاظ سے وہ بیحد متاثر ہوا۔ اُس کے شگفتہ چہرے پر غصّے کے آثار ظاہر ہونے لگے اور اُس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا "اسکی معصومیت میری جان ہے۔ اس معصومیت کو ساتھ لئے ہوئے میں موت کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔ جب تک میرے جسم کی رگوں میں خون کا ایک بھی قطرہ باقی ہے۔ "میرین" کی روح پر گناہ نظر نہیں ڈال سکے گا"

عنقریب شہر میں ایک عظیم الشان نمائش ہونیوالی تھی، دُور دُور سے آرٹسٹ آئے ہوئے تھے، شہر میں ہر طرف دھوم مچی ہوئی تھی۔ نمائش کی پہلی رات کو پیرس بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ برقی روشنی نے آفتاب کی ضیا باری سے بے نیاز کر دیا تھا۔ تماشائیوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ حسین دوشیزائیں مردوں کے دوش بدوش رنگین تتلیوں کیطرح نمائشگاہ کی جانب حرکت کر رہی تھیں۔ نمائش گاہ میں منتخب آرٹ کے نادر نمونے بڑے سلیقے سے سنوارے گئے تھے، سمجھ میں نہ آتا تھا کس کو سب سے اچھا کہئے، یکایک ہیری کے بنائے ہوئے مجسمہ پر لوگوں کی نظریں پڑیں اور وہیں ٹھٹک کر رہ گئیں۔ ہیری کے مجسمہ کے سامنے دوسرے تمام نمونے بے وقار و بے وقعت تھے۔ رات کے دو بجے تک تماشائیوں کا بیحد ہجوم رہا۔ یکایک گھنٹے کی مہیب صداؤں نے چیخ چیخ کر اعلان کرنا شروع کیا کہ عوام کی تفریح کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ اب سوائے آرٹسٹ حضرات کے اور کوئی یہاں نہیں رہ سکتا۔ اُن آرٹسٹوں کے سوا جنکی ہر گناہ سے ملوث حرکت

آرٹ ہوگئی جن کی بیمانہ خواہشات آزادی سے پاؤں پھیلانے کیلئے بیتاب ہیں۔ تماشائی رخصت ہوگئے، بیرونی روشنی
گُل کر دی گئی۔ نمایش گاہ کے گوشہ گوشہ میں سیاہکاری دام عشوہ بچھانے لگی معصیت کے بادل چھاگئے اور نفس
پرستی نے آرٹ کی بوسیدہ قبا کی دھجیاں اُڑا دیں لیکن اس شبستانِ عشرت میں ہیری کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ کہیں سے
رات کے دو ڈھائی بجے جب مکان پر پہونچا تو اُس کے ملازم نے اطلاع دی کہ میرین کسی دوست کے ساتھ ایک کار
میں بیٹھکر گیارہ بجے کے قریب کہیں چلی گئی۔ ہیری کو معلوم تھا کہ پیرس کے ہر طبقے میں میرین کے نام دعوت نامے آئے
تھے لیکن اُس نے میرین کو کہیں نہ جانے دیا تھا ہیری کی روح کانپ اُٹھی، اُس کی زندگی کے تمام روشن چراغ یک لخت
گُل ہوگئے، آج میرین، عورت میرین. نے میرین کی معصوم روح کو ہوس پرستوں کے سپرد کر دیا تھا۔ ہیری کی نظروں
کے سامنے دنیا کی معصومیت فنا ہو رہی تھی اور وہ زندہ تھا۔ وہ وحشیانہ انداز میں نمایش گاہ کی جانب رُوانہ ہوگیا۔ نمایش
گاہ میں کئی آرٹسٹ اُس سے مصافحہ کرنے کے لئے بڑھے لیکن اُس نے کسی کی پروا نہیں کی۔ اُسکی جلتی ہوئی نظریں میرین
کی تلاش میں بندگان نفس کے ہجوم کا جائزہ لے رہی تھیں۔ مثاً اُس نے دیکھا کہ میرین ایک خوبصورت کھلونے کیطرح
ہوس اور نفس پرستی کے ہاتھوں میں اُچھالی جا رہی ہے۔ گناہ نے ٹوکا، ہوس نے منع کیا مگر ہیری نے کسی کی نہ سُنی،
اُس نے جھپٹ کر میرین کو اپنے قبضے میں کرلیا اور سیکڑوں اعتراضات پر کان بند کئے ہوئے ہمراہ لیکر گھر آگیا۔

دوسرے روز شہر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ میرین یکایک کہیں غائب ہوگئی۔ اور نہ ایسی ایسی نمعلوم کتنی جوان لڑکیاں
غائب ہوچکی تھیں۔ پیرس میں حُسن کا پامال ہو جانا یا لُٹ جانا معمولی باتیں تھیں۔ چند روز تک میرین کے چاہنے والوں
نے اُسے یاد کیا لیکن جلد ہی اس کا نام بھی زبان پر آتے ہوئے کھٹکنے لگا۔

میرین کے غائب ہو جانے کے چوتھے روز ہیری کے بنائے ہوئے ایک نئے مجسمے کے چرچے ہونے لگے۔ ہیری بیمار
تھا لیکن اُس کے نگارخانے میں ایک حسین اور مکمل مجسمہ رکھا ہوا دیکھ کر اُس کے کسی دوست نے اُس کو ہیری کی اجازت کے
بغیر نمایش میں بھیجدیا تھا۔ نمایش کے انعامات تقسیم ہونے میں دو روز رہ گئے تھے اس لئے ہیری کا یہ نیا شاہکار نمایش
کی گیلری میں ایک ممتاز جگہ پر نصب کر دیا گیا تھا۔ نمایش حسب معمول جاری رہی تماشائیوں اور اہل نظر حضرات نے ہیری کے
بنائے ہوئے مجسمہ میں کسی غیر مرئی قوت کو محسوس کیا اور نمایش کے ارباب بست وکشاد نے اُسے بہترین تسلیم کرلیا، اور
فیصلہ کیا کہ فرانس کا ممتاز ترین تمغہ ہیری کو عطا کیا جائے۔ یہ خبر سُنکر میں ہیری کو قبل از وقت مبارکباد پیش کرنے کی غرض
سے اُس کے پاس پہونچا۔ ہیری بستر مرگ پر پڑا ہوا اپنی آخری سانس کی منت وساجت کر رہا تھا۔ میرے مبارکباد پر
غصے سے کانپ اُٹھا اور کہنے لگا۔ یہ نہیں ہوسکتا فرانس کا مقدس تمغہ ایک قاتل کے جسم کو نہیں چھونے دوں گا، میں:
"قاتل" میں نے حیرت سے دُہرایا۔ "ہاں، قاتل" اُس نے کہنا شروع کیا۔ "نمایش کی پہلی رات کو میں میرین کو نمایش
سے اُٹھا لایا تھا یہ تم نے سُنا ہوگا۔ یہاں لاکر میں نے میرین کی آنکھوں میں اُسکی معصوم روح کو تلاش کیا۔ مگر آہ

آنکھیں اُس حسین روح سے محروم ہو چکی تھیں۔ وہ میرتین رہ گئی تھی صرف میرتین۔ میں اُسے عورت بھی نہیں کہہ سکتا کیونکہ میرا خیال ہے کہ عورت نام ہے معصومیت مجسّم کا اور اُسکی معصومیت اور اُسکی روح کے حُسن کا اظہار اُس کی آنکھوں سے ہوتا ہے۔ جس عورت کی آنکھیں اِس معصومیت سے اِس حسن سے محروم رہ چکی ہوں اُس عورت کو عورت کہلانے کا حق نہیں رہتا اور نہ اُسے زندہ رہنے کا حق رہتا ہے بلکہ اُسے زندہ رہنے دینا ایک بڑا ظلم ہے جسے میں برداشت نہیں کر سکتا چنانچہ میں نے اُسی آہنی مارتول سے جو شب و روز میرے مجسّموں کو برباد کرتا رہا ہے، میرتین کے سر کو پاش پاش کر دیا۔

اب میری نظروں کے سامنے میرتین کی بے جان لاش تھی اور میں تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں کب تک کھڑا ہوا اُس لاش کو گھورتا رہا۔ آخر میرے دل میں ایک ٹیس اُٹھی۔ میرے دماغ میں ایک خیال آیا، کیا میرتین کی مرحوم میرتین کی، کوئی یادگار بھی نہ ہونا چاہیئے، بھیگی ہوئی مٹی میرے سامنے پڑی تھی۔ میں میرتین کا مجسمہ بنانے میں مصروف ہو گیا میری روح اُس بُت کے بنانے میں صرف ہونے لگی۔ یہاں تک کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " وہ اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ نمایش کے منصفین اور دیگر معزز لوگ آ پہونچے۔ پہلے ان سب نے ہیری کو دلی مبارکباد پیش کی اس کے بعد مودبانہ تمغہ لگانے کی غرض سے ہیری کی جانب بڑھے مگر ہیری ان کو روکنے کی غرض سے کسی جذبے کے ماتحت اُٹھ کر بیٹھ گیا لیکن فوراً ہی پھر بستر پر گرا اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

دوسرے روز صبح ایک عجیب خبر شہر میں پھیل گئی۔ سُنا گیا کہ نمایش گاہ کے پہرے داروں نے اس شب ایک دھماکا سُنا، اندر جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہیری کا بنایا ہوا مجسمہ پھٹ گیا تھا اور اُسمیں سے میرتین کی لاش نظر آ رہی تھی۔

نوائے سرشار

از جناب جمنی سرشار صاحب

تمہارا جوشِ عشق خنجر و تیغ و سناں تک ہے
ہمارا زور شور نالہ و آہ و فغاں تک ہے

تمہارے حُسن کی شہرت زمیں سے آسماں تک ہے
ہمارے عشق کی وسعت مکاں سے لامکاں تک ہے

عدو کے دل میں الفت آپکی ہے تو کہاں تک ہے
یہ ایسی بات ہے جس کا تعلق امتحاں تک ہے

کہاں پاؤ گے مجھ سا خوگرِ جور و جفا کوئی
یہ مشقِ خنجر و تیغ و سناں میری جاں تک ہے

تمہاری بزم کی شہرت ہماری داستاں سے ہے
تمہاری بزم میں سفلی ہماری داستاں تک ہے

وہی ہے رازِ ہوا [illegible] سے نا واقف
وہ کیسا راز ہے جو راز میرے رازداں تک ہے

رسائی خانۂ صیاد تک [illegible] کی نہیں ہوتی
گرے برقِ تپاں کا ہے یہ آشیاں تک ہے

یہ صرصر [illegible]
پھر اک آفت [illegible]

سوا اس کے [illegible]
مرا [illegible]

خدا کا شکر [illegible]
[illegible]

رازِ مسرّت[1]

(از بابو اکرشن گوپال مغموم بی۔ اے)

۱

زندگی اُس شخص کی ہے کس قدر راحت فزا — غیر کا بن کر نہیں رہتا جو دنیا میں غلام
جس کی ہستی کا سہارا ہے ضمیرِ بے ریا — حق پرستی راست بازی جس کا شیوہ ہے مدام

۲

ہاں! وہی۔ جو نفس کا بندہ نہیں اور جو کہ ہے — مستعد ہر لحظہ مرنے کے لئے سچ بات پر
بادشاہوں سے نہیں جو طالبِ لطف و عطا — کچھ اثر دنیا نہیں رکھتی ہے جس کی ذات پر

۳

اہلِ جاہ و منصب و ثروت کا جو حاسد نہیں — خوبیٔ تقدیر سے جو ہو گئے عالی مقام
وہ بشر بیجا خوشامد جس کی عادت میں نہیں — بندۂ اخلاص ہے جو ہے محبت کا غلام

۴

جس کو شہرت کی تمنا ہے۔ نہ ننگ و نام کی — جس کا ہے سرمایۂ تسکیں۔ ضمیرِ بے ریا
اور مطلب کچھ جسے اہلِ خوشامد سے نہیں — مطلقاً جسکو نہیں سود و زیاں سے وا

۵

طالبِ جاہ و حشم ہوتا نہیں اللہ سے — چاہتا ہے وہ فقط توفیق نیک اعمال کی
اچھی اچھی ہوں کتابیں اچھے اچھے یارِ غار — اُسکی خواہش ہے کہ گذرے یونہیں اُسکی زند

۶

ہو نہیں سکتا یہ زنجیرِ غلامی کا اسیر — لفظ بے معنی ہیں اس کے واسطے اوج و ز
مملکت اِسکی فقط اس کا ضمیرِ پاک ہے — فطرتِ خودداری کی تحصیل ہے اس کا مد

---

[1] سر ہنری واٹن کی مشہور نظم THE CHARACTER OF A HAPPY LIFE کا منظوم ترجمہ

کیا دبیر و ناسخ فارسی نہ جانتے تھے

(از جناب بہار کوٹی)

پچھلے مہینہ "شاعر آگرہ" میں حضرت نیاز فتحپوری کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے حضرت ماہر القادری نے لکھا تھا: "میں اُردو کا طالب علم ہوں۔ میں نے یہ شعر اُردو میں کہا ہے، عربی میں نہیں وغیرہ وغیرہ۔" ان جملوں سے یہ نتیجہ تو نہیں نکالا جا سکتا کہ اُردو میں شعر کہنے کے لئے عربی اور فارسی جاننے کی ضرورت نہیں البتہ یہ ضرور مستنبط ہوتا ہے کہ عربی و فارسی الفاظ اُردو میں آ جانے کے بعد اصل زبان کی "گرامر" کی پابندی سے بے نیاز ہو کر "اُردو گرامر" کے تابع ہو جائیں گے۔ اگر ماہر القادری صاحب کا معہود ذہنی وہی ہے جو میں نے سمجھا ہے تو میرے نزدیک وہ حق بجانب ہیں۔

کچھ عرصہ قبل "نظم سیماب" پر مولوی مہدی حسن صاحب راندیری کے اعتراض پڑھ کر میں نے "مدیر شاعر" کو ایک خط لکھا تھا (جسے اُنھوں نے شائع بھی کر دیا تھا) اس خط میں میں نے اُردو میں استعمال ہونے والے عربی فارسی الفاظ کے قواعد کے سلسلہ میں اسی نوع کے خیال کا اظہار کیا تھا۔ اور اب بھی میرے نزدیک ماہر القادری صاحب کے "بساط کا منتشر ہونا" لکھنے پر حضرت نیاز کا یہ اعتراض کہ چونکہ عربی میں انتشار کے معنی ہیں بچھانا، اس لئے عربی قاعدہ کی رو سے بساط کے منتشر ہونے کے معنی ہوں گے "بساط بچھانا" صحیح نہیں۔

آج کل تنقید کو اظہار علم کا ذریعہ قرار دے لیا گیا ہے لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ غریب شعرا اور وہ بھی محتاط شعرا ہی اس کا ہدف بنائے جائیں۔ مجھے تو آج ایک بھی ایسا ناقد نظر نہیں آتا جس کی نگاہ فنی اغلاط تک پہونچتی ہو اور میں تو یہ سمجھ چکا ہوں کہ کلام کو فن کی حیثیت سے پرکھنے والے بساط ادب سے اُٹھ گئے۔ زبان و محاورہ کی غلطیوں کی گرفت ہر کس و ناکس یہ کہہ کر کر سکتا ہے کہ "محاورہ میں تو اسے اس طرح نہیں کہتے" اگر محاوراتی غلطیوں کی طرفگی دیکھنی ہو تو نواب عزیز یار جنگ بہادر کی تصنیف "نقد سخن" ملاحظہ فرمایئے۔ اس میں فانی مرحوم کے دو سو چار اشعار کو غلط ثابت کرنے کی مضحک کوشش کی گئی ہے۔

ہاں! تو کیا شاعر اُردو کا صرف طالب علم اُردو ہونا کافی ہے یا اُردو میں شعر کہنے کیلئے اسے عربی و فارسی میں بھی تبحر حاصل کرنا چاہیئے۔ یہ ہیں وہ سوالات جو اُردو کے ہر طالب علم کے دل میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ اُردو کے شاعر کو یقیناً عربی اور فارسی جاننا چاہیئے بلکہ اگر ممکن ہو تو انگریزی اور ہندی بھی سیکھنا چاہیئے۔ انگریزی اور ہندی صرف اس لئے کہ ان زبانوں کے اعلیٰ خیالات کو اُردو میں منتقل کیا جا سکے۔ فارسی اس لئے کہ اس کے بغیر اُردو اُردو نہیں رہتی اور عربی اس لئے کہ عربی الفاظ کے [illegible] اور اعراب میں غلطی نہ ہو اور بس۔

یہ سلسلہ بیانیہ میں [illegible] منظر [illegible]

[illegible] ایک مضمون "سرقہ، توارد، ترجمہ" مطبوعہ مخزن بابت اگست ۱۹۱۵ء میں نعمتی اور غالب کے بعض اشعار پر شاعروں کے ذریعہ سرقہ کا الزام عاید کیا تھا۔ اس مضمون کے جواب میں متعدد مضامین لکھے گئے جن میں سے حضرت شوکت میرٹھی مرحوم کا جواب جو مخزن لاہور بابت جنوری ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا تھا قابل ذکر ہے۔ صاحب مضمون نے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے یاس صاحب کے مذہبی اعتقادات کو بھی موضوع بحث بنالیا تھا۔ "باغ فدک" کے قصہ کے ذکر سے مضمون کی اہمیت کو بڑی حد تک صدمہ پہونچا یا تھا۔ حضرت تاجور نجیب آبادی (اب علامہ شمس العلما تاجور نجیب آبادی) نے جو اس زمانہ میں مخزن کے مدیر نگراں تھے اس سلسلہ میں ایک مختصر سا نوٹ دیکر حضرت شوکت کی اس زیادتی کی شکایت کی تھی۔ حضرت شوکت نے غالباً تمام شیعہ شعرا کو کم علم اور جاہل بتایا تھا۔ انھوں نے دبیر اور ناسخ کا شمار ان شعراء میں کیا تھا جو اُن کے زعم کے مطابق فارسی سے نابلد محض تھے۔ "اُن کے نزدیک فارسی دانی کا معیار یہ تھا کہ شاعر فارسی گو بھی ہو، ملاحظہ ہو: "دوم غریب ناسخ کو فارسی سے کیا واسطہ۔ فارسی سے جیسے کورے آتش، آباد، اسیر، رند وغیرہ تھے ویسا ہی ناسخ تھا، انیس و دبیر بھی علیٰ ہذا القیاس۔ دونوں کا کوئی فارسی مرثیہ کیا معنی فارسی شعر ہی دکھائیے جس سے معلوم ہو کہ وہ کامل تھے۔"

اس پر حضرت تاجور نے ایک فٹ نوٹ دیا تھا۔ فرماتے ہیں: "میرے خیال میں تو انیس و دبیر اپنے قلم سے بھی اگر کوئی اس مضمون کا اقرار لکھ جاتے کہ ہم فارسی میں کورے ہیں تو کوئی اعتبار نہ کرتا۔ آپ کے یہاں فارسی دانی کا یہ انوکھا ہی معیار ہے کہ جس نے فارسی میں کوئی شعر کہا ہو وہی فارسی داں کہلا سکتا ہے۔ اسے حضرت انیس کے مراثی ملاحظہ فرمائیے پھر اپنی رائے قائم کیجئے۔"

حضرت شوکت کے مضمون کے جواب میں بہت کچھ لکھا گیا لیکن جہاں تک میرے ناقص معلومات کا تعلق ہے، کسی نے یہ نہ بتایا کہ دبیر و ناسخ فارسی داں تھے یا انھوں نے فارسی میں کوئی شعر کہا ہے۔ ان مضامین میں قابل ذکر مضمون حضرت آزردہ سیتاپوری کا ہے جو مخزن میں بالاقساط شائع ہوتا رہا۔ اس کی پہلی قسط مارچ ۱۹۱۶ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی اس مضمون میں آتش کے کلام اور میرزا یاس کی تحقیق متعلق بہ غالب کو سراہا گیا تھا اور غالب اور عزیز و ثاقب و صفی کی پارٹی کو برا بھلا کہا گیا تھا۔ حضرت شوکت کے اس الزام کے جواب میں کہ ناسخ اور دبیر فارسی میں کورے تھے صرف یہ کہا گیا تھا کہ "شوکت صاحب نے اس کے جواب میں کچھ نہ بن پڑا تو مرزا یاس کے مذہب پر حملہ کیا اور باغ فدک کا قصہ چھیڑ دیا۔ اہل لکھنؤ کی دل آزاری کے لئے تمام اساتذۂ لکھنؤ پر چوٹیں کیں، محض شیعہ کی بحث کرنے لگے جواب نہ بن پڑا گالیاں دینے لگے۔ غالب کو جو لوگ بزعم خود فاضل جید سمجھتے ہیں وہ اپنا دل [illegible] ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ شیخ ناسخ ان کو اردو فارسی عربی میں برسوں سبق دیتے [illegible] حضرت شوکت میرٹھی چمکا اٹھیں اور گھبرا کر یہ کہدیں کہ ناسخ فارسی کب جانتے تھے کیونکہ فارسی دانی [illegible] کہ فارسی

زبان میں شعر بھی کہتا ہو اور جس نے فارسی میں شعر نہ کہے ہوں کیسا ہی فارسی داں کیوں نہ ہو اُنکے نزدیک جاہل ہے؟

محترم بابت جون ۱۹۴۱ء میں حضرت یاس عظیم آبادی کا ایک مضمون بعنوان "مرزا غالب اور میں" شائع ہوا تھا اس میں انھوں نے اپنے مضمون "سرقہ، توارد، ترجمہ" کی وجہ تصنیف بیان کی تھی، یعنی یہ کہ وہ مضمون حضرات عزیز، ثاقب اور صفی کی ضد میں لکھا گیا تھا۔ حضرت شوکت کے مضمون کے جواب میں صرف اس قدر لکھا تھا "جناب شوکت سنہ جو مجھ سے پہلے سے بدظن تھے اس مضمون کا جواب تو نہ دیا محض دل شکن الفاظ سے یاد کیا، سُنّی اور شیعہ کا جھگڑا اور باغ فدک کا ذکر چھیڑ دیا۔ میر انیس و دبیر کے مراثی کو ناول اور افسانوں کا مترادف ٹھہرایا اور آتش و ناسخ و اسیر کی نسبت یہ تحریر فرمایا کہ یہ لوگ فارسی سے بالکل بے بہرہ تھے حالانکہ یہ امر ایسا ہی ہے جیسے کوئی "دن کو رات" کہے:

مندرجہ بالا اقتباسات سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت شوکت، تاجور، آزردہ، اور یاس ہر چہار کے نزدیک ناسخ اور دبیر نے فارسی میں کوئی شعر نہیں کہا، حالانکہ یہ حقیقت کے خلاف ہے، ان دونوں بزرگوں نے فارسی میں شعر کہے ہیں اور ان کا ذکر فارسی گو شعراء کی فہرست میں ملتا ہے۔ تعجب ہے کہ شوکت اور تاجور جیسے اہل نظر کی نظر دبیر و ناسخ کے فارسی اشعار تک نہ پہونچی جیسا کہ میں بار بار لکھ چکا ہوں کہ ہمارے ہاں تحقیق و تفحص سے کم اور خوش خیالیوں سے زیادہ کام لیا جانے لگا ہے۔ آج کل علمی موضوعات پر اول تو لکھا ہی بہت کم جاتا ہے اور جو کچھ لکھا جاتا ہے اُسمیں اپنی برتری کو برقرار رکھنے اور مزعومہ علمیت کا سکہ جمانے کا خیال پیش نظر رہتا ہے۔

فارسی تذکرہ "صبح گلشن" میں جو ۱۲۹۵ھ میں جناب علی حسن صاحب فرزند امیر الملک سید محمد صدیق حسین خاں بھوپالی نے تالیف فرمایا تھا ان دونوں بزرگوں کا نام اور فارسی کلام کا نمونہ موجود ہے، ملاحظہ ہو:-

صفحہ ۱۶۳

"دبیر نامش سلامت علی بود اصل ہندو نژاد بود بعلیب خاطر بشرف اسلام مشرف شدہ مذہب شیعہ اختیار نمود طبعش از اصناف شعر بسکہ مائل بر مرثیہ گوئی بزبان اردو افتادہ در مراثی خود داد شاعری علی وجہ الکمال داد و جز میر بر علی انیس در میں فن نظیر خود نداشت و احیاناً بزبان فارسی بہ مدحت ائمہ آہنگ بر می داشت:

<u>کلام کا نمونہ</u>

السلام اے گلِ البحرین ایمان و یقین　　السلام اے مرجع آیات قرآن مبین
السلام اے نورِ عین طا و ہا و یا و سین　　السلام اے سایۂ آت خورشید رب العالمین

آسمانِ عز و تمکین آفتاب دار و دین [illegible]
[illegible]　　[illegible]

از جبیں مہر مبیں، وز لب مسیحا مستفیض — از عطائے دست فیاض تو دریا مستفیض
وز ریاض نزہت طبع تو رضواں خوشہ چیں الخ

ناسخ۔ شیخ امام بخش لکھنوی از مشاہیر شعرائے اردو بود و بشعر فارسی کمتر توجہ می نمود در علوم ادبیہ دستگاہ کامل داشت۔ جز قطعات تواریخ وتہنیت کہ با پایان دیوان اردویش مطبوع شدہ چیزے بہم نہ رسید۔

کلام کا نمونہ قطعہ۔

چوں شدہ زمن صاحب جود و انصاف — شد بر سر او رنگ مرصع جالس
گردید وزیر اعظمش ضیغم جنگ — کو ہست بمضمونہ فراست فارس
از نصفت شاہ شد قوی ہر مظلوم — وز جود وزیر شد غنی ہر مفلس
سازد قدم شاہ خزف را یاقوت — وز خاک در وزیر زر گردو مس
تاریخ سعید کرد ناسخ تحریر — شد اسکندر وزیر ارسطا طالس

یادِ محبوب

(سانیٹ When to the sessions of sweet silent thought شیکسپیر)

(از جناب ماہر الہ آبادی)

جب تخیل پر برستی ہیں حسیں خاموشیاں — یاد کرتا ہوں وہ سب باتیں جو ہیں گزری ہو
آہ بھرتی ہیں حصولِ شوق کی ناکامیاں — دردِ نو، رنج کہن میں کٹتے ہیں دن قیمتی
کیا میں اُن آنکھوں سے روؤں جو ہوئیں اب تک نہ نم — آہ اُن پر موت سے جو دوست ہم آغوش ہیں
کیا میں اب پھر یادِ رفتہ پر بہاؤں اشکِ غم — رنج پھر اُن کا کروں جو آنکھ سے روپوش ہیں
غم کروں کیا یاد کر کے وہ گزشتہ مشکلات — از سر نو پھر کروں تازہ وہی آہ و [illegible]
یوں بہم کرتا ہوں میں رنج والم کے واقعات — جیسے اس سے قبل میں نے غم نہ کھایا ان کا
لیکن اے محبوب جب کرتا ہوں میں تیرا خیال
سب کمی ہوتی ہے پوری، ختم ہوتے ہیں ملال

تنقید کتب

ہندوستان کی آبادی

ہر ملک کی آبادی کی کمی بیشی کا انحصار اس کے جغرافیائی محل وقوع، اس کی آب وہوا، اس کی زرعی و قدرتی پیداوار، اس کی تہذیب وتمدن اور اس کی طرز معاشرت پر ہوتا ہے۔ زرخیز ممالک میں جہاں تھوڑی سی محنت کے بعد زمین سونا اُگل دیتی ہے، یا گرم ممالک میں جہاں انسان بہت جلد سن بلوغ کو پہونچکر فطرت کے تقاضوں سے مجبور ہو جاتا ہے۔ آبادی عموماً بہت بڑھتی ہے۔ آبادی کی کمی بیشی میں تہذیب وتمدن یعنی ملکی رسم ورواج کو بھی بہت بڑا دخل ہے، ممالک مشرق میں عموماً مگر ہندوستان میں خصوصاً جہاں اولاد سن بلوغ کو پہونچ جاتی ہے والدین کو ان کی شادی بیاہ کی فکر دامنگیر ہو جاتی ہے۔ ہندوؤں میں تو لڑکی والے خود کسی پسندیدہ اور ہونہار بر کو ڈھونڈھتے پھرتے ہیں۔ مسلمانوں میں لڑکی کی بات آتی ہے مگر والدین کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ ابھی لڑکا بیوی بچوں کا خرچ اُٹھانے کے قابل بھی ہوا ہے یا نہیں، بس وہ شادی کر دیتے ہیں چاہے میاں بیوی کا خرچ خود ہی اُٹھانا پڑے۔ اس پر مصیبت یہ ہے کہ اگر چند سال میں کوئی اولاد نہ پیدا ہو تو خاندان میں چہ میگوئیاں ہونے لگتی ہیں گویا ہندوستان میں ہر شخص کے لئے خواہ وہ امیر ہو یا غریب اولاد پیدا کرنا ایک قومی فرض ہے۔

ہندوستان میں ہر دس برس بعد سرکار کی طرف سے مردم شماری کی جاتی ہے۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں ہندوستان کی آبادی تقریباً ۳۵ کروڑ تھی لیکن ۱۹۴۱ء کی مردم شماری بڑھتے بڑھتے تقریباً چالیس کروڑ ہو گئی ہے۔ مفلس ہندوستان کی آبادی میں یہ غیر معمولی اضافہ رحمت کا باعث ہے یا زحمت کا؟ اس کا جواب ناظرین کتاب زیر نظر میں ملاحظہ فرمائیں جو ڈاکٹر انور اقبال قریشی صاحب نے نہایت دماغ سوزی اور تحقیق وتدقیق کے ساتھ لکھی ہے۔

یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے تین بابوں میں نظریۂ آبادی پر قدیم زمانہ سے لیکر تا حال مختلف زاویہ ہائے نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ بقیہ چار ابواب خاص ہندوستان کی آبادی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں مردم شماری کی سرکاری رپورٹوں سے اعداد وشمار لیکر استدلال کیا ہے۔ جگہ جگہ پر از معلومات نقشے بھی دئے گئے ہیں جن کی مدد سے کتاب کا مفہوم بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے۔ الغرض یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت قابل قدر تصنیف بلکہ اردو ادبیات میں ایک خاص اضافہ ہے۔

البتہ کتاب میں جا بجا زبان کی غلطیاں بھی ہیں امید ہے کہ فاضل مصنف دوسرے ایڈیشن میں اس نقص کو دور کر دیں گے۔

رفتار زمانہ

مشرق میں جاپان کے خلاف لڑائی زور شور سے جاری ہے اور یورپ میں جو اتحادی فوجیں جنگ سے فرصت پاچکی ہیں ان میں سے اکثر فوجیں جاپان کے خلاف مشرق کو بھیجی جارہی ہیں۔ برطانوی جنگی بیڑہ کا بھی ایک حصہ بحرالکاہل اور بحر ہند میں پہونچ گیا ہے اور مختلف سمندروں میں نہ صرف خود کام کر رہا ہے بلکہ امریکی جنگی بیڑہ کو بھی مدد دے رہا ہے۔ مشرق کی جنگ کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے (۱) برہما (۲) چین (۳) جزائر بحرالکاہل اور (۴) جاپان خاص۔ ان محاذات کے تفصیلی حالات مندرجۂ ذیل ہیں:۔

برہما شمالی برہما، مغربی برہما اور جنوبی برہما تو جاپانیوں سے اتحادیوں نے آزاد کرالئے ہیں لیکن ابھی جاپانی فوجیں مشرقی برہما اور ریاست ہائے شان میں مقابلہ کر رہی ہیں اور بعض اوقات اتحادی فوجوں پر جوابی حملے بھی کر بیٹھتی ہیں جنھیں نقصان پہونچا کر منتشر کر دیا جاتا ہے۔ بہرحال اتحادی فوجوں کی پیشقدمی مشرقی برہما میں بھی جاری ہے اگرچہ کسی قدر سست ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو جہاں لڑائی ہو رہی ہے وہ علاقہ پہاڑی اور دشوار گزار ہے۔ دوسرے یہ موسم برہما میں سخت برسات کا ہوتا ہے، اور تیسرے جاپانی بھی کسی قدر سختی سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ جاپانیوں کی زیادہ تر مزاحمت کوہستان پیگو یوما، دریائے سیتانگ کے گرد و نواح میں اور تھاراواڈی کے علاقوں میں ہو رہی ہے۔ جاپانیوں کا ارادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی طرح اپنی بقیۃ السیف فوجیں مولمین اور سیام کو لیجاسکیں۔ مگر اتحادی زمینی اور ہوائی فوجیں ان کے ارادوں کو حتی الامکان ناکام بنادیتی ہیں۔

برہما کی گورنمنٹ اب شملہ سے رنگون پہونچگئی ہے لیکن ابھی نظم و نسق فوجی قسم کا ہے۔ بہرحال تسلط ہوتا جارہا ہے۔

جزائر بحرالکاہل بحرالکاہل میں اتحادیوں کی پالیسی یہ ہے کہ وہ ایک جزیرہ سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے اور تیسرے سے چوتھے پر پھاندتے ہوئے خاص سرزمین جاپان کی طرف بڑھتے جارہے ہیں۔ سب سے پہلے امریکی فوجوں نے جزائر سلیمان میں اتر کر جاپانیوں کا مقابلہ کیا تھا۔ ان جزائر کے بہت سے جزیرے دشمنوں سے صاف کئے جاچکے ہیں لیکن فتح ابھی مکمل نہیں ہوئی کیونکہ تازہ اطلاعات سے یہ معلوم ہوا ہے کہ ابھی بوگینویل میں لڑائی کا سلسلہ جاری ہے اور وہاں جاپانی مجنونوں کی طرح مقابلہ کر رہے ہیں۔

جزائر فلپائن کے دارالحکومت منیلا پر تو امریکی قبضہ ہوگیا تھا اور [illegible] امریکی فوجیں اتر گئی تھیں اس وقت سے برابر پیشقدمی جاری ہے آخری خبر یہ ہے کہ [illegible] کو بھی فتح کرلے گئے ہیں۔

بحرالکاہل کے تمام جزیروں میں امریکی فوجوں کو سب سے زیادہ مقابلہ اوکیناوہ میں کرنا پڑا ہے اور ان لڑائیوں
میں سخت نقصان بھی اٹھایا لیکن بالآخر دشمن کو مغلوب کر کے اوکیناوہ کی جنگ ختم کر دی گئی ہے۔

اوکیناوہ میں امریکی فوجیں ۳۱ مارچ ۱۹۴۵ء کو اتاری گئی تھیں۔ یہ مجمع الجزائر ریوکیوس کا ایک اہم جزیرہ ہے
اور جاپان خاص سے بہت قریب ہے فوج اتارنے سے تین ہفتہ تک جدوجہد کر کے امریکی فوجیں تین چوتھائی جزیرہ پر
قابض ہو گئی تھیں مگر اس میں امریکہ کو بہت سخت اتلاف جان و مال اٹھانا پڑا تھا۔ ۴، جون تک امریکی فوجیں شمال کی
طرف سے بڑھتی ہوئیں جزیرہ کے جنوبی سرے تک پہونچ گئی تھیں لیکن وسط جون میں جاپانیوں نے شدید مزاحمت کی
مگر امریکی فوج نے بالآخر قوت مزاحمت توڑ دی اور اوکیناوہ کی جنگ ختم ہو گئی۔ اوکیناوہ کی بہت بڑی اہمیت یہ ہے کہ
یہاں سے امریکی کوہ پیکر ہوائی جہاز خاص جاپان پر خوب حملے کر سکیں گے اوکیناوہ کے سب سے بڑے دو جاپانی کمانڈر جنرلوں
نے خودکشی کر لی ہے۔

اتحادی فوجیں اوکیناوہ کے مغرب میں ۵۰ میل کے فاصلہ پر ایک جزیرہ میں بھی اتر گئی ہیں جس کا نام کیومہ ہے۔
شمالی مغربی بورنیو میں آسٹریلوی فوجیں اتاری گئی تھیں جو نہایت پامردی سے دشمن کا مقابلہ کرتی ہوئی آگے بڑھ
رہی ہیں جزیرہ تاراکان میں بھی جاپانیوں کا صفایا کیا جا رہا ہے۔ بالک پاپان پر جو مشرقی بورنیو میں تیل کا بہت بڑا
مرکز ہے اتحادی بیڑہ نے شدید گولہ باری کر کے تیل کے چشموں میں آگ لگا دی ہے۔ جاپانیوں کا دعویٰ ہے کہ انھوں
نے دو اتحادی کروزر، ایک بڑا تباہ کن جہاز اور ایک تیل بردار جہاز ڈبو دئے ہیں۔

جاپان | جہاں تک خاص جاپان کا تعلق ہے، ابھی اتحادی فوجیں حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہی ہیں لیکن جاپانی شہروں
پر اتحادیوں کے پانچ پانچ سو بڑے ہوائی جہاز بیک وقت اڑ کر شدید بمباری کر رہے ہیں۔ اگر یہی سلسلہ برابر جاری رہا تو
جاپانی انڈسٹری بہت جلد تباہ و برباد ہو جائیگی۔

جاپانیوں کو اپنے ملک پر اتحادی حملہ کا بہت بڑا اندیشہ ہے۔ انھوں نے حملہ روکنے کی تیاریاں مکمل کر لی ہیں خود
شہنشاہ جاپان نے ہوم گارڈ کے نام فرمان جاری کیا ہے کہ وہ لڑتے لڑتے مر جائیں مگر دشمن کے ہاتھ زندہ گرفتار نہ ہوں
بعد کی خبر ہے کہ اتحادی بحری و ہوائی بیڑے جزیرہ ہانشو پر مسلسل بمباری کر رہے ہیں۔ قیاس ہے کہ [illegible] اتحادی
فوجیں جاپان کے جزائر میں اتر جائیں گی۔

چین | اسی اثنا میں چین نے اپنی عسکری طاقت کی بہت زبردست تنظیم کر لی ہے اور اس کام میں [illegible]
جنرلوں نے بہت [illegible] مدد دی ہے۔ چونکہ اوکیناوہ امریکی فوجوں نے مکمل طور پر فتح کر لیا ہے اس لئے جاپانیوں کو
نہ صرف جاپان خاص بلکہ جاپانی [illegible] بھی اتحادی حملہ کا خوف دامنگیر ہو گیا ہے۔ یہی باعث ہے کہ وہ [illegible]

سے واپس لے لیا ہے۔ اب چین کی موجودہ پوزیشن یہ ہے کہ صوبہ کوانگسی میں جنگی سرگرمیاں از سر نو زندہ ہو گئی ہیں۔ چینی فوجیں کویلن کی طرف بڑھ رہی ہیں جہاں پہلے امریکی ہوائی فوج کا بہت بڑا طیارہ خانہ تھا۔ چینی فوجیں اس قدر پیشقدمی کر گئی ہیں کہ اب وہ کویلن اور سیتو چاؤ دونوں مقامات سے صرف گیارہ میل کے فاصلہ پر رہ گئی ہیں۔ چینی فوجوں نے کوانگسی و ہونان ریلوے کو کاٹ دیا ہے جس کی وجہ سے جاپانیوں کا سلسلہ مواصلات منقطع ہو گیا ہے۔ ایک چینی دستہ لالاپو چاؤ کی طرف بھی بڑھ رہا ہے۔ یہاں بھی پہلے امریکن طیارہ خانہ تھا جسے جاپانیوں کے زبردست دباؤ کی وجہ سے چھوڑ دیا گیا تھا اس محاذ پر جاپانی فوجیں شدید مزاحمت کر رہی ہیں۔ ایک تیسرا چینی دستہ جانب مغرب سے بھی لالاپو چاؤ کی طرف یلغار کر رہا ہے اور شہر سے تقریباً چھ میل کے فاصلہ پر رہ گیا ہے۔ صوبہ کوانگسی کے جنوب مغرب سے جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں۔ ان سے ظاہر ہوا ہے کہ اس وقت جاپانی ہائی کمانڈ اپنی فوجیں وہاں سے ہٹا کر کوانٹنگ کے اڈوں کی طرف لے جا رہا ہے اور شہر لوگان پر جو کانٹن سے ۱۳۰ میل جانب شمال مغرب واقع ہے پھر چینیوں کا قبضہ ہونے والا ہے۔

الغرض وہ دن بہت قریب ہے جبکہ اتحادی فوجیں سواحل چین پر اُتر جائیں گی اور جاپانیوں کے لئے نئی مصیبت پیدا ہو جائیگی۔ جاپانی ہائی کمانڈ کو اس بات کا خود احساس ہے چنانچہ ٹوکیو سے ریڈیو پر کہا گیا ہے کہ اتحادی فوجیں بہت جلد سرزمین چین میں اُترنے والی ہیں۔

ہندوستان ہندوستان میں جو قابل ذکر اور اہم ترین صورت حال نمایاں ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ہزاکسلنسی لارڈ ویول وائسرائے ہند تقریباً دس ہفتے حکومت برطانیہ سے صلاح و مشورہ کر کے ہندوستان واپس آ گئے ہیں اور جو جدید پیشکش وہ ہندوستان کے لئے لائے ہیں اس کا مختصر سا خاکہ ہزاکسلنسی نے ریڈیو پر تقریر نشر کرتے ہوئے یوں بتایا۔

(۱) وائسرائے کی موجودہ اگزیکٹو کونسل توڑ کر ایک جدید کونسل وجود میں لائی جائے گی۔ جس کی بنیاد نیشنل لائنوں پر قائم ہو گی۔

(۲) جدید کونسل صرف عارضی ہو گی۔ اور عبوری دور کے لئے ہو گی۔

(۳) باستثنار کمانڈر انچیف کے جو محکمہ جنگ و دفاع کے انچارج ہونگے۔ جدید کونسل کے تمام ممبر ہندوستانی ہوں گے۔

(۴) محکمہ مالیات، امور خارجیہ، امور داخلیہ اور وار ٹرانسپورٹ اب تک انگریز ممبروں کے ہاتھ میں رہا کرتے تھے۔ اب یہ محکمے پہلی دفعہ ہندوستانیوں کو تفویض کر دئے جائیں گے۔

(۵) جدید کونسل میں پانچ ممبر مسلمان، پانچ ہندو (اچھوتوں کے علاوہ) ایک سکھ ایک اچھوت ہوں گے۔

(۶) چونکہ جدید کونسل بھی رائج الوقت قانون حکومت ہند کے ماتحت وجود میں لائی جائے گی اس لئے وہ مرکزی لیجسلیچر کے سامنے ذمہ وار نہ ہو گی۔

(۷) وائسرائے کا اختیارِ استرداد (ویٹو) بدستور قائم و باقی رہے گا۔

(۸) کونسل کا فرض ہو گا کہ ہندوستان کا اندرونی نظم و نسق عمدگی سے چلانے کے علاوہ جاپان کو شکست دینے میں ہر ممکن طریقہ سے مدد دے۔

(۹) ان تجاویز کا تعلق صرف برطانوی ہند سے ہو گا۔

(۱۰) برطانیہ کے تجارتی و دیگر مفادات کی نگرانی کے لئے ہندوستان میں آئندہ ایک برطانوی ہائی کمشنر اسی طرح تعینات ہوا کریگا جیسے برطانیہ کے مقبوضات آزاد میں ہوتا ہے۔

تجاویز کا اعلان کرنے کے بعد ہز ایکسلنسی وائسرائے نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کی رہائی کا حکم دیدیا۔ اور اس کے بعد ممدوح نے فرمایا کہ ان تجاویز پر غور و خوض کرنے کے لئے ۲۵ جون کو شملہ میں ایک کانفرنس طلب کرتے ہیں جس میں حسب ذیل حضرات کو مدعو کیا گیا۔ (۱) مہاتما گاندھی (۲) مسٹر جناح (۳) مولانا ابوالکلام آزاد صدر کانگریس (۴) مرکزی لیجسلیچر کی تمام پارٹیوں کے لیڈر (۵) صوبجات برطانوی ہند کے گیارہ موجودہ و سابق وزراء اعظم (۶) ڈاکٹر سیوراج (اچھوتوں کی طرف سے) (۷) ماسٹر تارا سنگھ، سکھوں کی طرف سے (۸) ایک انگریز۔

اس کے بعد ۲۱ جون کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کا ایک ہنگامی جلسہ بمبئی میں منعقد ہوا جس میں وائسرائے کے دعوت نامے کو منظور کر لیا گیا۔ تمام مدعو شدہ لیڈر شملہ کانفرنس میں مصروف رہے لیکن افسوس ہے کہ مسلم لیگ و کانگریس کے معقول [illegible] دئے جانے کے باوجود کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا اس لئے وائسرائے نے کانفرنس کو ۱۴ جولائی تک ملتوی کر دیا ہے۔ مسلم لیگ و کانگریس کو پھر موقعہ دیا ہے کہ وہ ۶ جولائی تک اپنے اُمیدوار نامزد کر کے ان کی فہرست پیش کر دیں جن میں سے وائسرائے اپنی جدید کونسل کے ارکان کو خود منتخب کر لیں گے جن کے ناموں کا اعلان ۱۴ جولائی کو کانفرنس میں کیا جائیگا۔

ممالک مشرق وسطیٰ سنہ ۱۹۴۰ء میں فرانس کے سقوط کے بعد جب وہاں وشی گورنمنٹ زیر سایہ ہٹلر قائم ہو گئی تو تمام دور افتادہ فرانسیسی مقبوضات اور نو آبادیات پر مرکزی حکومت کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس دوران محوری ایجنٹوں نے ملک شام میں داخل ہونا شروع کر دیا۔ اس وقت اتحادیوں کو اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں وشی گورنمنٹ محوریوں کو شام میں فوجیں اُتارنے اور ہوائی اڈے استعمال کرنے کی اجازت نہ دیدے۔ چنانچہ آزاد فرانسیسی اور برطانوی فوجوں نے مل کر شام و لبنان پر حملہ کر دیا اور ان کو وشی گورنمنٹ سے چھڑا لیا۔ اس کے بعد شام و لبنان میں تحریک آزادی پھر تیز ہو گئی اور مشرق وسطیٰ میں شورش برپا ہونے سے اتحادی مفادات کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ پیدا ہوا تو برطانیہ کے کہنے سے فرانسیسی جنرل کاترو نے سنہ ۱۹۴۱ء میں آ کر شام و لبنان کی آزادی و خود مختاری کا اعلان کر دیا جسے برطانیہ و امریکہ کی حکومتوں نے بھی تسلیم کر لیا چنانچہ دونوں ملکوں میں آئینی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ اب جب جرمنی کو شکست ہو گئی اور امریکہ و برطانیہ کی بدولت فرانس کو پھر دشمنوں سے نجات ملی تو جنرل ڈیگال کی امپریلیسٹ ذہنیت پھر

جوش میں آئی اور اس نے کچھ جنگی جہاز بھیج کر شام میں فرانسیسی فوجیں اتار دیں تاکہ شام ولبنان پر پھر قبضہ کر لیا جائے۔ اسکے بعد حسب ذیل مطالبات پیش کر دیے۔

۱۔ شام ولبنان میں فرانس کے قائم کردہ اسکولوں کی آزادی، ان کے قواعد وضوابط اور ان کا آئینی نظام منظور کیا جائے یا اضافہ دیگر شام ولبنان کے اسکولوں وکالجوں میں فرانسیسی زبان اور قومی تاریخ لازمی طور پر پڑھائی جائے۔

۲۔ شام ولبنان میں فرانس کو مناسب مقامات پر ہوائی اڈے اور فرانسیسی جنگی جہازوں کو لنگر انداز ہونے کے لئے مناسب بندرگاہیں دی جائیں۔

شام ولبنان کی قومی حکومتوں نے فرانسیسی مطالبات کو اپنی قومی آزادی وخود مختاری کے منافی سمجھتے ہوئے انکو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرانسیسی حکام نے تشدد سے کام لینا شروع کیا۔ حلب، حمص، حماہ اور دمشق میں کشت وخون ہوا۔ دمشق کا ایک حصہ فرانسیسی توپوں نے مسمار کر دیا۔ یہی حال حمص میں ہوا لیکن اسی اثنا میں برطانوی حکام نے مداخلت کی تو کشت وخون بند ہو گیا۔ لیکن اب بھی کبھی کبھی اور کہیں کہیں گولیاں چل جاتی ہیں۔

برطانیہ کی طرف سے تجویز پیش کی گئی کہ شام ولبنان کا معاملہ لندن میں ایک کانفرنس طلب کر کے طے کر لیا جائے جس میں فرانس، برطانیہ اور امریکہ کے نمائندے شریک ہوں۔ لیکن فرانس نے یہ بات منظور نہیں کی اور اپنی طرف سے یہ تجویز پیش کی کہ نہ صرف شام ولبنان بلکہ تمام ممالک مشرق وسطیٰ کا معاملہ ایک ایسی کانفرنس میں طے کیا جائے جس میں فرانس، برطانیہ، امریکہ، روس اور چین کے نمائندے شریک ہوں لیکن یہ بات برطانیہ وامریکہ کو منظور نہیں ہے، کیونکہ وہ اس معاملہ میں روس کی مداخلت پسند نہیں کرتے۔ الغرض ابھی تک یہ معاملہ کھٹائی میں پڑا ہوا ہے، دیکھئے کب تک اور کس طرح طے ہوتا ہے۔

ترکی وروس کے درمیان غیر جانبداری ودوستی کا جو بیست سالہ معاہدہ تھا اسے روس نے یہ کہکر فسخ کر دیا ہے کہ دنیا کے حالات اس قدر بدل گئے ہیں کہ اب وہ پرانا معاہدہ کام نہیں دے سکتا۔ اسی دن سے روس وترکی میں ایک جدید معاہدہ کے لئے گفت وشنید ہو رہی ہے، اب معلوم ہوا ہے کہ روس دردانیال وباسفورس کے متعلق معاہدہ مانترو میں تبدیلی چاہتا ہے اور دونوں آبناؤں پر اپنی بھی نگرانی قائم کرنا چاہتا ہے جس کے سلسلہ میں ترکی علاقہ میں فوج رکھنا بھی ضروری ہوگا۔ دوسرے روس کا مطالبہ ہے کہ شمال مشرقی ترکی کے علاقہ جات قارص اور اردہان روس کو دیدیے جائیں۔ معلوم ہوا ہے کہ ترکی نے روس کے مطالبات نامنظور کر دئے ہیں، دیکھئے اس معاملہ میں آئندہ کیا ہوتا ہے اس سلسلہ میں اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ ۱۹۴۱ء میں روس وبرطانیہ دونوں نے وعدہ کیا تھا کہ انھیں دردانیال وآبنائے باسفورس پر کوئی دعویٰ نہیں ہے اور وہ ترکی کی علاقہ جاتی شیرازہ بندی کا بھی سختی سے احترام کریں گے، بلکہ اگر کوئی ترکی پر حملہ کریگا تو وہ ترکی کو مدد دیں گے۔ لیکن یہ وعدہ وعید اس وقت کئے گئے تھے جب ترکی پر جرمن حملہ کا خطرہ تھا۔ اب جبکہ نہ وہ جرمنی باقی ہے نہ وہ خطرہ تو وعدہ کو سیکڑوں قسم کے معنی پہنائے جا سکتے ہیں سیاسیات میں

مروت اور محبت، دوستی، غیر جانبداری مہمل چیزیں ہیں۔

سنہ ۱۹۴۱ء کا زمانہ تھا۔ ایران میں نازی ایجنٹ اپنی سرگرمیاں دکھا رہے جس سے اتحادیوں کے مفادات کو خطرہ تھا اس لئے وقتی طور پر روس و برطانیہ نے ایران پر فوجی قبضہ کر لیا تھا۔ ۲۹ جنوری سنہ ۱۹۴۲ء کو ایران، روس و برطانیہ میں یہ معاہدہ ہوا کہ ایران کی آزادی، خود مختاری اور ملکی استقلال و شیرازہ بندی کا احترام کیا جائیگا اور جنگ ختم ہونے کے چھ ماہ بعد روس و برطانیہ اپنی فوجیں ایران سے ہٹا لیں گے۔

اب ایران نے روس، برطانیہ و امریکہ سے اپنی فوجیں ہٹا لینے کا مطالبہ کیا ہے۔ امریکہ نے تو اپنی کچھ فوج ہٹا لی ہے اور باقی ہٹا رہا ہے۔ برطانیہ نے ایران کے مطالبہ کو ہمدردی کی نظر سے دیکھا ہے اور وہ اس بارہ میں روس و امریکہ سے صلاح و مشورہ کر رہا ہے لیکن روس نے ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا ہے۔ برطانیہ کے سیاسی حلقوں کا خیال ہے کہ ابھی جاپان کی جنگ ختم نہیں ہوئی ہے لہذا فوجیں ہٹا لینے کا وقت نہیں آیا ہے۔ ایران کے نزدیک معاہدہ میں جنگ جرمنی سے مطلب تھا، جاپان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ الغرض دیکھئے ایران کب تک آزاد ہوتا ہے۔

یورپ | جرمنی کے بلا شرط ہتھیار ڈالدینے کے بعد جرمنی کے حصے بخرے کر لئے گئے ہیں۔ شمال مغربی جرمنی برطانیہ کو، مغربی فرانس کو، جنوبی امریکہ کو اور بقیہ روس کے حصہ میں آئے ہیں۔ اگرچہ فرانسیسی حصہ میں وہ تمام حدود شامل نہیں ہیں جن کا مطالبہ فرانس نے کیا تھا لیکن جو کچھ مل گیا ہے فرانس اسی پر مطمئن نظر آتا ہے۔

فرانس و امریکہ نے ملکی نظم و نسق میں جرمنوں کو بالکل بے دخل کر دیا ہے لیکن روس نے تمام اندرونی معاملات کا انتظام غیر نازی جرمنوں کو دیدیا ہے اگرچہ روس کی فوجی نگرانی قائم ہے۔ جرمنی پر اتحادیوں کا تسلط کب تک باقی رہے گا اس کے بارہ میں ابھی کوئی تصفیہ نہیں ہوا ہے۔

روس نے تجویز کیا ہے کہ پانچ ارب ڈالر تاوان جرمنی سے وصول کیا جائے جس میں سے نصف کا حصہ دار روس ہوگا اور بقیہ برطانیہ، فرانس و امریکہ آپس میں بانٹ لیں گے لیکن یہ تاوان بصورت نقد وصول نہیں کیا جائے گا بلکہ اجناس خام، مشینری اور دیگر مصنوعات کی صورت میں لیا جائیگا۔ مگر ابھی اس معاملہ میں کوئی اتفاق نہیں ہوا ہے۔

اگرچہ آسٹریا پر روسی، برطانوی و امریکن فوجیں قابض ہیں لیکن ابھی آسٹریا کے حصے بخرے نہیں کئے گئے ہیں۔ امید ہے کہ اس ملک کو بھی جلد یا بدیر منطقوں میں تقسیم کر لیا جائیگا۔ اس سلسلہ میں یہ بھی واضح ہو کہ آسٹریا کے اس حصہ میں جس پر روس قابض ہے ایک ملکی گورنمنٹ قائم ہو چکی ہے جو روس کے زیر سایہ ہے، مگر برطانیہ و امریکہ نے اس کو تسلیم نہیں کیا ہے اس لئے بہت ممکن ہے کہ آسٹریا کا معاملہ بہت عرصہ تک کھٹائی میں پڑا رہے۔

ترستے کا معاملہ فی الحال عارضی طور سے طے ہو گیا ہے۔ یوگوسلاوی فوجیں مقررہ حدود کے پیچھے ہٹ گئی ہیں لیکن ابھی معاملہ پوری طرح طے ہونا باقی ہے۔

یورپ میں سب سے زیادہ اہم اور پیچیدہ معاملہ حکومت پولینڈ کا تھا جس کی چٹان پر روس، برطانیہ وامریکہ کے اتحاد کی کشتی ٹکرا کر تباہ ہونے سے کئی بار بچ گئی تھی، جب روس نے جرمنوں کو پولینڈ سے نکال دیا تو تقریباً گیارہ مہینے گزرے وہاں اندرونی نظم ونسق کے لئے بمقام لبلن پولستانیوں کی ایک کمیٹی قائم کر دی گئی تھی جو روس کے زیر اثر تھی چونکہ پولینڈ کی شکست خوردہ ومفرور گورنمنٹ لندن میں بیٹھی تھی جسے برطانیہ وامریکہ تسلیم کر چکے تھے، اس لئے برطانیہ وامریکہ نے لبلن گورنمنٹ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ سان فرانسسکو کانفرنس میں پولینڈ کی کسی بھی گورنمنٹ کو مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ بالآخر روس، برطانیہ وامریکہ میں بہت کچھ کہنے سننے کے بعد یہ بات قرار پائی کہ لبلن گورنمنٹ کو جو اب وارسا گورنمنٹ کہلاتی ہے، ڈیموکریٹک عنصر شامل کر کے مزید وسعت دی جائے۔ اس قرارداد کے مطابق روس نے پولستانی لیڈروں کو ماسکو طلب کیا اور بالآخر وارسا گورنمنٹ میں پانچ مزید پول لیڈر شریک کر لئے گئے جن میں وہ ایسے بھی ہیں جو پہلے لندن والی پولستانی گورنمنٹ میں شریک تھے۔ اب یقین ہے کہ برطانیہ وامریکہ بھی جدید گورنمنٹ کو تسلیم کر لیں گے۔ پرانی لندنی گورنمنٹ ہر طرف سے مایوس ہو کر اب لندن کو خیرباد کہنے کی فکر کر رہی ہے، خیال کیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کو آئرلینڈ یا کناڈا میں آباد کرنے کا ارادہ ہے۔ یہ گورنمنٹ ہنوز خود کو پولستان کی قومی حکومت سمجھتی ہے۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اب وہ مالی مدد جو برطانیہ کی طرف سے لندنی گورنمنٹ کو ملتی تھی بند کر دی جائے گی، اس لئے وہ بیچارے چندہ کی آمدنی پر بسر اوقات کے لئے مجبور ہو جائیں گے۔

برطانیہ | برطانیہ میں ۱۵؍جون سے پرانی پارلیمنٹ توڑ دی گئی ہے۔ مسٹر چرچل عارضی پر حکومت کی کشتی چلا رہے ہیں، جدید انتخابات ہو چکے ہیں۔ کنسرویٹو، لیبر اور لبرل پارٹیوں میں بہت سخت مقابلہ ہوا۔ انتخابات کا نتیجہ ۲۶؍جولائی ۴۵ء کو معلوم ہوگا۔ اس کے بعد جس پارٹی کی اکثریت ہوگی اس کی گورنمنٹ قائم ہو جائے گی اور غالباً ۱۴؍اگست کو جدید پارلیمنٹ کی پہلی نشست ہوگی۔ ہر پارٹی کو اپنی اپنی پارٹی کی کامیابی کا یقین ہے۔ لیکن عام خیال یہ ہے کہ اس مرتبہ بھی کنسرویٹو پارٹی کامیاب رہے گی۔

سان فرانسسکو کانفرنس | یلٹہ کانفرنس کی قرارداد کے مطابق ۲۵؍اپریل سے امریکہ کے شہر فرانسسکو میں تقریباً ۵۰ اتحادی اقوام کی ایک کانفرنس شروع ہوئی تھی جو دو مہینے کی بحث وتمحیص اور گفت وشنید کے بعد ۲۶؍جون کو ختم ہو گئی اور تمام مسائل کثرت رائے سے طے ہو گئے۔ کانفرنس میں دنیائے مستقبل کے امن وامان کے قیام وبقا کے لئے ایک چارٹر (سند اعظم) مرتب کیا گیا ہے جو دس ہزار الفاظ پر مشتمل ہے۔ اس چارٹر کی رو سے ایک بین الاقوامی پنچایت (آرگنائزیشن) قائم کی گئی ہے جس کا نام "متحدہ اقوام" (یونائیٹڈ نیشنز) رکھا گیا ہے۔ اس چارٹر سے متحدہ اقوام کے تعلقات کا نئی بنیاد قائم ہوگی، اس میں انیس باب ہیں۔ اس کے مراتب "ابتدائی" میں بتایا گیا ہے کہ متحدہ اقوام [illegible] کر لیا ہے (۱) آنے والی نسلوں کو جنگ کے عذاب سے بچانا۔ (۲) حقوق انسانی پر اپنے اعتقاد کی [illegible]

کے بچوں، عورتوں اور مردوں کے حقوق کامل مساوات پر قائم ہوں گے۔ ایسے حالات روبکار لائے جائیں گے، جن کے ماتحت تمام معاہدات اور بین الاقوامی قانون کا احترام ہو سکے۔ اور ان کو ایمانداری کے ساتھ پورا کیا جا سکے۔ (۴) معاشی آزادی اور زندگی کے معیار کو ترقی دی جائیگی۔

مندرجہ بالا اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے متحدہ اقوام مندرجہ ذیل باتوں پر عملدرآمد کریں گے (۱) رواداری سے کام لے کر نیک ہمسایوں کی طرح پُر امن زندگی بسر کریں گے (۲) بین الاقوامی امن و سلامتی کے قیام و بقا کی غرض سے اپنی طاقت کو یکجا کریں گے (۳) کسی مشترکہ مقصد یا مقاصد کے سوا کسی صورت میں بھی مسلح طاقت کا استعمال نہ ہونے دیں گے۔

چارٹر کا لب لباب یہ ہے کہ "اس آرگنائزیشن کی بنیاد اپنے جملہ ارکان کے فرمانروایانہ مساوات کے اصول پر قائم ہے" اور اس کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہیں:۔ (۱) بین الاقوامی امن و سلامتی کو قائم رکھنا (۲) امن و سلامتی کے قیام و بقا کی خاطر متحدہ اور موثر تدابیر اختیار کرنا (۳) دنیا کے معاشرتی، اقتصادی، ثقافتی (کلچرل) اور بشری مسائل کو حل کرنے میں بین الاقوامی اشتراک عمل حاصل کرنا۔

آرگنائزیشن کے صیغے حسب ذیل ہوں گے:۔

(۱) ایک جنرل اسمبلی جس میں تمام ممبر اقوام کے نمائندے شامل ہوں گے جن کو آپس میں غور و خوض کرکے سفارش کرنیکا اختیار حاصل ہوگا (۲) پانچ بڑی طاقتوں (روس، برطانیہ، فرانس، امریکہ و چین) جو مستقل ممبر ہوں گی اور چھ غیر مستقل ممبروں پر مشتمل ایک "سیکیورٹی کونسل" قائم ہوگی۔ غیر مستقل ممبروں کا انتخاب جنرل اسمبلی کریگی۔ جن باتوں کا ضابطے تعلق نہیں ان کے بارہ میں مستقل ممبروں کو حق استرداد (ویٹو) حاصل ہوگا (۳) اٹھارہ ممبروں پر مشتمل جنہیں جنرل اسمبلی منتخب کریگی ایک اقتصادی و معاشرتی کونسل قائم ہوگی جو ایسے مسائل کے متعلق جن کا تعلق بین الاقوامی اقتصادیات، معاشرت، ثقافت تعلیم و صحت سے ہوگا۔ غور و خوض کرنیکے بعد اپنی سفارشیں جنرل اسمبلی کے سامنے پیش کریگی (۴) ایک مجلس تولیت (ٹرسٹی شپ کونسل) جس میں وہ اقوام جو علاقوں کی متولی ہیں، اور اتنی ہی تعداد میں دوسری اقوام شامل ہونگی۔ یہ کونسل وقتاً فوقتاً زیر تولیت علاقوں کا دورہ کیا کریگی (۵) ایک بین الاقوامی عدالت عدل و انصاف (۶) جنرل سکریٹری کے ماتحت ایک سکریٹریٹ۔ جنرل سکریٹری کا تقرر سیکیورٹی کونسل کی سفارش پر جنرل اسمبلی کریگی۔ سکریٹریٹ کا دفتر کسی خاص گورنمنٹ سے نہیں بلکہ متحدہ اقوام سے احکام حاصل کریگا (۷) مقامی تنازعات کا تصفیہ کرنے کے لئے دنیا کو چند منطقوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے جو متحدہ اقوام اس معاہدہ میں شریک ہیں، وہ تمام مقامی تنازعات کو پُر امن طریقہ سے حل کرنے کی ہر امکانی کوشش کرینگی۔ اس کے بعد سیکیورٹی کونسل کے سامنے متنازع کو پیش کیا جائیگا (۸) جو سلطنتیں ایسے ممالک پر حکومت کر رہی ہیں، جنہیں حکومت خود اختیاری حاصل نہیں ہے وہ اس اصول کو تسلیم کرینگی کہ ایسے ممالک کے باشندوں کے حقوق مستقل ہیں۔ اور یہ بھی تسلیم کریں گی کہ ان باشندوں کی فلاح و بہبود [illegible] "مقدس امانت" ہے۔

کپاس کی
کلی کی کہانی
قدرت کی فیاضی اور انسان کی عقلمندی سے ہم کو زندگی کی بہت سی خوبصورت چیزیں دستیاب ہوئی ہیں وہ بیچاری بیجان سی بہت ہی معمولی چیز کپاس کی کلی انسان کو اپنے واسطے مضبوط بناوٹ کے رنگ برنگے اور ہر طرح کے خواہش کے قابل سوتی کپڑوں کے استعمال کا ذریعہ فراہم کرتی ہے۔ ساڑی سے لیکر تکیے کے غلاف تک اور چادروں سے لیکر ضروریات خانہ داری کے دیگر سوتی کپڑوں کی تیاری میں یہ کپاس کی کلی ہی انسان کے قابل اعتبار نوکر کی طرح اسکی خدمت کیلئے ہمیشہ حاضر رہتی ہے اور وہ اسے اپنی ہیئت کے مطابق سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔
لکشمی رتن کاٹن ملیں سوتی کپڑا وغیرہ تیار کرنے کا بہت ہی مشہور کارخانہ ہے اور اپنے تجربے اور جدید ذریعوں سے نیا اور عمدہ سوتی مال تیار کرنے میں مصروف ہے۔ اس کی پالیسی یہ ہے کہ ایسا مال تیار کیا جائے جو سب لوگوں کی ضروریات پوری کرسکے۔
لکشمی LR مارکہ

زمانہ

بیادگار منشی دیا نرائن نگم صاحب مرحوم

جلد ۸۵ | ستمبر ۱۹۴۵ء | نمبر ۳

فہرست

[illegible] سے شائع ہوا

زمانہ

جلد ۸۵ — ستمبر ۱۹۴۵ء — نمبر ۳

اُردو شاعری اور مسائلِ حیات

(از جناب عبدالرزاق صاحب قریشی)

فنونِ لطیفہ میں شاعری کو خاص اہمیت حاصل ہے اس لئے کہ اس کا تعلق براہ راست زندگی سے ہے۔ یہ ہماری زندگی کے مختلف شعبوں پر جس طرح اور جس حد تک اثر انداز ہوتی ہے دوسرے فنونِ لطیفہ اس سے محروم ہیں۔ شاعری زندگی کے ہر شعبہ کی نہ صرف تصویر کھینچتی بلکہ تنقید بھی کرتی ہے۔ اگر کسی زمانہ کے تمدنی و معاشرتی حالات کا جائزہ لینا ہو تو اُس زمانہ کے ادب اور خصوصاً شاعری کو دیکھنا چاہیئے، اس لئے کہ شاعری ہمیشہ اپنے ماحول کے تابع رہتی ہے بقول شبلی مرحوم "جس قسم کا تمدن ہوتا ہے اُسی قسم کی شاعری بھی ہوتی ہے" ہم کو دیکھنا ہے کہ اُردو شاعری نے نسانی زندگی کے مختلف مسائل کی تصویر کہاں تک اور کس خوبصورتی یا بدصورتی سے کھینچی ہے۔ مختلف ادوار اور مانوں کے تمدنی، معاشرتی اور سماجی حالات کا نقشہ کہاں تک اُردو شاعری میں مل سکتا ہے۔

انسانی زندگی خصوصاً ایشیا کے افراد کی زندگی میں سب سے اہم چیز مذہب ہے اور مذہب کی اساس خدا کے اقرار پر ہے کسی مذہب کو لیجئے خدا کے وجود کا یقین آپ کو اس میں ضرور ملیگا۔ ہم کو اس وقت صرف اُردو زبان سے سروکار ہے۔ اس زبان کے لکھنے، پڑھنے اور بولنے والے تین مذہب کے پیرو ہیں۔ یعنی ہندو، مسلمان اور عیسائی۔ یہ تینوں خدا کے وجود کو کسی نہ کسی شکل میں تسلیم کرتے ہیں۔ دوسری بات جو ہم کو یاد رکھنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ اُردو بان اور شاعری پر ابتدا میں دو زبانوں کا اثر پڑا۔ ہندی اور فارسی۔ اور ان دونوں زبانوں کی شاعری میں خدا اس کے برگزیدہ نبیوں اور رشیوں کی تعریف میں ترانے جس طرح گائے گئے ہیں اُن سے ادب و شاعری کے [illegible] طرح واقف ہیں۔ اُردو شاعری کا مجموعی مطالعہ بھی دلوں میں خدا کی وحدت کا یقین اور نبیوں اور بزرگوں [illegible]ت اور مذہب کی محبت پیدا کرتا ہے۔

صاحب شعرالہند کے بیان کے مطابق "اُردو شاعری کا آغاز مذہبی [illegible] ایک مدت تک [illegible]

یالات شاعری کا جزو غالب رہے" اور غالباً یہی وجہ ہے کہ "اس دور میں مرثیہ کی ابتدا مذہبی جذبات سے ہوئی اور رفتہ رفتہ اُس نے مذہبی صورت اختیار کر لی جو آج تک قائم ہے"

اُردو کے پرانے شاعروں کی فہرست میں سب سے پہلے سلطان قلی قطب شاہ اور محمد قطب شاہ کے نام آتے ہیں۔ اور بقول صاحبِ شعر الہند "ان دونوں کے کلام میں نعت و منقبت کا کافی حصہ ہے۔" ان ہی دو شاعروں پر منحصر نہیں ولی کے زمانہ سے پہلے کے شاعروں نے جو کچھ لکھا اُس کا بیشتر حصہ مناجات، نعت اور مناقب پر مشتمل تھا۔ بعد کے شاعروں نے بھی حمد و نعت اور منقبت میں بہت کچھ لکھا۔ آخری دور میں غلام شہید کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ محسن کاکوروی کا تو سارا کلام نعت پر مشتمل ہے۔ امیر مینائی کا بھی ایک پورا دیوان نعت میں ہے۔ اسی طرح ہندوؤں کے مختلف تہواروں مثلاً ہولی، دوالی، راکھی وغیرہ پر بھی شعرا نے نظمیں لکھیں۔ اساتذہ میں غالباً صرف آتش، ناسخ اور داغ ہی ایسے ہیں جنھوں نے اِس طرف کوئی توجہ نہ کی۔

بہر حال مستثنیات کو چھوڑ کر اُردو شاعری میں ہم کو خدا اور مذہب سے شیفتگی قدم قدم پر ملتی ہے۔ اُردو کی کوئی مثنوی اُٹھا لیجیے (خواہ وہ ہندو کی لکھی ہو یا مسلمان کی) اس کی ابتدا حمد سے ہوتی ہے اور صرف یہی نہیں کہ مثنوی کی ابتدا حمد سے ہوتی ہے بلکہ اکثر شاعروں کے دیوان کے مطلع بھی حمد میں ہوتے ہیں۔ مثلاً ولی کا مطلع دیوان ہے ؎

کیتا ہوں ترے نانوں کو میں وِردِ زباں کا کیتا ہوں تیرے شکر کو عنواں بیاں کا

مومن کے دیوان کی ابتدا اس مطلع سے ہوتی ہے ؎

نہ کیونکر مطلعِ دیواں ہو مطلع مہرِ وحدت کا کہ ہاتھ آیا ہے روشن مصرعہ انگشتِ شہادت کا

اکبر الٰہ آبادی کا پہلا دیوان اس مطلع سے شروع ہوتا ہے ؎

ذہن میں جو گھر گیا لا انتہا کیونکر ہوا جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

مذہب کا اصل مقصد انسان کی بھلائی و بہبودی ہے۔ اس کو غلط راستہ سے ہٹا کر صحیح راستہ پر لگانا۔ توہمات کے تنگ و تاریک کوچہ سے نکال کر حقائق و واقعیت کی روشن دنیا میں لانا، یہ مذہب کا مقصد اور یہی اُس کا کام ہے۔ لیکن بدقسمتی سے مذہب کے نام نہاد پیشواؤں یا ٹھیکہ داروں نے ذاتی اغراض و مقاصد کی بنا پر اس سے ایسا غلط کام لیا اور مذہب کے ناسمجھ پرستاروں کو ایسا گمراہ کیا کہ وہ بجائے روشنی کے ضلالت و تاریکی کی طرف چل پڑے، مذہب، توہمات، ریاکاری اور نمود و نمائش کا دشمن ہے لیکن ان ٹھیکہ داروں نے مذہب کو مکمل ریاکاری، نمود و نمائش اور توہمات کا گورکھ دھندا بنا کے چھوڑا۔ جاہل واعظوں اور ریاکار زاہدوں نے اُس خدا کو جو مجسم رحمت ہے اور جس نے اپنا لقب رحمٰن و رحیم اور ستار و غفار رکھا ہے، قہر و غضب کا مجسمہ بنا کے چھوڑا۔ ایسے ہی ریاکار واعظوں سے حالی اس طرح مخاطب ہوتے ہیں :-

در گزر نہیں کرتا وہ گنہگاروں سے ۔۔۔ تو ترا اور کوئی ہو گا خدا اسے زاہد

اور یہ صرف حالی ہی نہیں بلکہ اردو کے تمام شاعروں نے ریاکار واعظوں اور زاہدوں کی اچھی طرح خبر لی ہے۔ یہ انھیں جھوٹے واعظوں اور فریبی زاہدوں کا طفیل ہے کہ مذہب میں بھی توہمات کی کثرت ہو گئی۔ رسمیں شریعت کے اصول پر غالب آئیں اور حق و صداقت پر ضلالت نے غلبہ پایا۔ اگر ان خرافات کا پردہ کسی نے چاک کیا۔ تو وہ شاعر تھا۔ اردو شاعری بھی اس حیثیت سے کم اہم نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں جوش ملیح آبادی کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے۔ جوش کی نظمیں (متولیان حسین آباد سے خطاب، ذاکر سے خطاب، سوگواران حسین سے خطاب، فتنۂ خانقاہ، شریک زندگی وغیرہ وغیرہ) پڑھئے دیکھئے، کتنے جوش و خروش، کتنی جوانمردی و دلیری اور کتنے جذبۂ خلوص سے کام لیکر شاعر تخریبی پہلوؤں کو نمایاں کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں اقبال کی بعض نظمیں مثلاً پنجابی مسلمان، باغی مرید، دو رکعت کے امام وغیرہ بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

خواجہ درد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مخصوص انداز میں تصوف کے بعض نکات ضرور بتائے، لیکن اقبال مرحوم نے جس خوبی خوش اسلوبی کے ساتھ خدا کی بزرگی و عظمت، مذہب کی اہمیت بتائی وہ بہت اہم درجہ رکھتی ہے، خواجہ درد کی باتیں صرف اہل دل و نظر ہی سمجھ سکتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اُن کی باتوں کو سمجھنے کے لئے پہلے دل اور نظر پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ برخلاف اس کے اقبال کا کلام خود دل و نظر پیدا کرتا اور پھر صاحب دل و نظر پر اپنا اثر چھوڑتا ہے۔ اقبال کا کلام اگر ایک طرف بعض حقائق کی مشکلات کو پڑھنے والے پر حل کرتا ہے تو دوسری طرف اُس کے کردار کی خامی کو پختگی سے بدل دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کا ایک قطعہ 'توحید کی اہمیت' پڑھئے۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی ۔۔۔ آج کیا ہے، فقط اک مسئلۂ علم کلام

روشن اس ضو سے اگر ظلمت کردار نہ ہو ۔۔۔ خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام

میں نے اے میر سپہ تیری سپہ دیکھی ہے ۔۔۔ قل ہو اللہ کی شمشیر سے خالی ہیں نیام

آہ! اس راز سے واقف ہے نہ مُلّا نہ فقیہ ۔۔۔ وحدت افکار کی بے وحدت کردار ہے خام

اسی طرح اقبال نے ہمکو بتایا کہ جب تک عقیدہ میں پختگی نہ ہو ساری کوششیں بیکار ثابت ہونگی عقیدہ کی اہمیت سے متعلق چند اشعار سُنئے:۔

حکمت مشرق و مغرب نے سکھایا ہے مجھے ۔۔۔ ایک نکتہ کہ غلاموں کے لئے ہے اکسیر

دین ہو، فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی ہو ۔۔۔ ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر

حرف اس قوم کا بے سوز، عمل زار و زبوں ۔۔۔ ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر

خدا اور مذہب کے بعد خود انسان کا وجود اور اس کی ہستی معرض بحث میں آ[illegible] اور اس سلسلہ [illegible]

سب سے پہلے جو سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی تخلیق کا مقصد و منشا کیا ہے؟ اس کا جواب اردو شاعری تصوف کا دامن پکڑے بغیر نہیں دے سکتی اور تصوف کا بیان یہ ہے کہ انسان خود خدا کی ہستی کا پرتو ہے۔ شوقِ ظہور انسان اور کائنات کی تخلیق کا باعث ہوا، چنانچہ مصحفی کہتے ہیں:۔

مخلوق ہوں یا خالقِ مخلوق نما ہوں　　معلوم نہیں مجھ کو کہ میں کون ہوں کیا ہوں
ہوں شاہدِ تنزیہ کے رخسار کا پردہ　　یا خود ہی میں شاہد ہوں کہ پردہ میں چھپا ہوں
یہ کیا ہے کہ مجھ پر مرا عقدہ نہیں کھلتا　　ہر چند کہ خود عقدہ و خود عقدہ کشا ہوں
اے مصحفی شانیں ہیں مری جلوہ گری میں　　ہر رنگ میں، میں مظہرِ آثارِ خدا ہوں

سودا کا دعویٰ ہے کہ ؎

میں ہوں خود دریا دلے کو تہ نظر کے سامنے　　ظرف و موج و قطرہ میرے رُخ کا اک پردہ ہوا

شیفتہ کا بیان ہے کہ ؎

جلوے سے ترے ہم ہیں صنم بزمِ جہاں میں　　گر شمع نہ ہووے تو شبِ تار ہے سایا

غالب نے اس خیال کو بڑے حسین اندازِ بیان کے ساتھ پیش کیا ہے ؎

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں　　ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خود بیں!

یہی وجہ ہے کہ اقبال نے خدا کو مخاطب کر کے کہا کہ ؎

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن　　زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

یہ تو انسان کی حقیقت اور اس کے وجود پر تھوڑی سی روشنی پڑی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ انسان کا مرتبہ کیا ہے۔ اس سوال کا جواب بھی اُردو شاعری تصوف کی آڑ پکڑے بغیر نہیں دے سکتی۔ بہر حال صوفیانہ نکات کے سلسلہ میں ہم کو انسانی عظمت و مرتبت کی تصویر اُردو شاعری میں مل جاتی ہے یہاں چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں:۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں　　تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں (میر)
پُتلا ہے یہ جو آدمِ خاکی کا اے فلک　　مت توڑ اسے کہ تجھ سے بنایا نہ جائیگا (درد)
جلوہ تو ہر اک طرح کا ہر شان میں دیکھا　　جو کچھ کہ سنا تجھ میں سو انسان میں دیکھا (〃)
ہے مظہرِ انوارِ صفا میری کدورت　　ہر چند کہ آہن ہوں پہ آئینہ نما ہوں (〃)
انساں کی ذات سے ہیں خدائی کے کھیل یاں　　بازی کہاں بساط پہ گر شاہ ہی نہیں (〃)
نُہ آسمان صفحۂ اول کے نو ورق　　کونین اک دو ورقہ ہے اپنی کتاب کا (آتش)

لیکن اقبال نے انسان کے مرتبہ کو جس حد تک پہنچایا اور جس حُسن و لطافت کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کیا

دوسرے شعرا سے کہیں بڑھ کر ہے۔"

ع ستارے جس کے گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے۔

ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے — کہ خاک زندہ ہے تو تابع ستارہ نہیں

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں — کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

طلسم بود و عدم جس کا نام ہے آدم — خدا کا راز ہے قادر نہیں ہے جس پہ سخن

وہ بحر ہے آدمی کہ جس کا — ہر قطرہ ہے بحر بیکرانہ

اور ذرا بلندی پر آئیے تو انسان کا مرتبہ یہ ہے کہ ؎

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا — یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

لیکن اس کے ساتھ ہی ذرا تصویر کا دوسرا رُخ بھی ملاحظہ فرمائیے، یہی انسان ہے جو باوجود خاک زندہ ہونے کے ہر طرح سے مجبور ہے۔ اقبال نے انسانی زندگی کی مجبوری کو جس حسن و لطافت کے ساتھ بیان کیا ہے ؎ شاید ہی کسی دوسری زبان کی شاعری میں مل سکے۔

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا — یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

اور اسی انسان کی، جس کے عروج کو دیکھ کر انجم سہمے جاتے ہیں جو بحر و بر کا سلطان ہے، جو دامنِ یزداں چاک کرنے پر قدرت رکھتا ہے، بے بصری، عاقبت نااندیشی اور نااہلی بھی ملاحظہ ہو۔

یہی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا — کہوں کیا ماجرا اُس بے بصر کا

نہ خود بیں، نے خدا بیں، نے جہاں بیں — یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر انسان کا معیار کیا ہونا چاہیئے اور حقیقۃً وہ کون سا درجہ ہے جس پر پہونچکر انسان ستاروں کو بھی سہما سکتا ہے اور خاک زندہ بھی بن سکتا ہے۔ یہ معیار بھی ہمارے زمانہ کے شاعر انسانیت اقبال نے ہمکو بتا دیا ہے۔

وہی ہے بندۂ حُر جس کی ضرب ہے کاری — نہ وہ کہ حرب ہے جس کی تمام عیاری

یہ صرف بندۂ حُر ہے جو خاک زندہ بننے کی اہلیت رکھتا ہے، جو دامنِ یزداں چاک کرنے کی جرأت کرسکتا ہے، جس کی ہر تقدیر سے پہلے خدا اس کی رضا طلب کرتا ہے۔

انسان دنیا میں کشاکشِ حیات کے مقابلہ کے لئے پیدا کیا گیا۔ وہ دور سے سمندر کی اٹھتی ہوئی لہروں کا نظارہ کرنے کے لئے نہیں بلکہ طوفان کی صبر آزما اور حوصلہ شکن موجوں کے تھپیڑے کھانے اور سہنے کے لئے پیدا کیا گیا۔ وہ پیر توڑ کر ایک گوشہ میں بیٹھکر ریاضت [illegible] کے واسطے نہیں بنایا گیا بلکہ [illegible]

خزانوں کی تلاش و جستجو کرنے اور صعوبتیں اٹھانے کے لئے بنایا گیا۔ اردو شاعری انسان کی اس کشاکش حیات کو، افسوس ہے کہ، اچھی طرح پیش نہ کر سکی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہو سکتی ہے کہ چونکہ اردو شاعری کا ستارہ بقول مولوی عبدالحق "اُس وقت چمکا جب مغلیہ سلطنت کا آفتاب اقبال گہنا چکا تھا"۔ ہندوستانیوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے جا رہے تھے، خانہ جنگیوں نے لوگوں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ ایسے حالات میں ہندوستانی تقدیر پر بھروسہ کرکے چپ چاپ بیٹھ رہنے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ اس کی ذہنی قوتیں برباد ہو چکی تھیں قوائے عمل شل ہو چکے تھے۔ سینوں میں نہ کوئی عزم تھا اور نہ خون میں گرمی باقی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شعرا کی زبانیں بھی چپ تھیں، وہ صرف اپنے دل کو تسلی دے سکتے تھے اور بس۔

قید حیات و بند غم دونوں اصل میں ایک ہیں ۔۔۔ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
غم ہستی کا اسد کچھ نہیں جز مرگ علاج ۔۔۔ شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

یہ صبر و تحمل کی تعلیم تھی۔ اس میں ضبط تو ضرور پایا جاتا ہے لیکن خودداری کا پتہ نہیں۔ یہ شاعری قنوطیت کی جانب مائل کرتی اور رجائیت سے گریز کرتی ہے لیکن یہ دور مایوسی آخر گزر گیا اور اب ہمکو اردو شاعری یہ سبق دینے لگی کہ

ہر چیز یہاں کی آنی جانی سمجھو ۔۔۔ رو داد جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا ۔۔۔ ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

اب اردو شاعری ہم کو تنبیہ کرنے لگی کہ پیر توڑ کر ایک گوشہ میں بیٹھ رہنے کا نام زندگی نہیں ہے بلکہ

نہیں مقام کی خوگر طبیعت آزاد ۔۔۔ ہوائے سیر مثال نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگ راہ سے پھوٹے ۔۔۔ خودی میں ڈوب کے ضرب کلیم پیدا کر

شاعر نے ہمکو بتایا کہ دیروز و فردا کوئی حقیقت نہیں رکھتے، اصل چیز امروز ہے، فردا کا انحصار امروز پر ہے۔

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا ۔۔۔ جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لایق ہنگامۂ فردا ۔۔۔ جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

انسان کی زندگی میں آس اور یاس دو چیزیں ہیں جو اُسے کامیاب یا ناکام بناتی ہیں۔ اردو شاعری نے جیسا ہم نے بتایا اُس وقت چمکنا شروع کیا جب مغلیہ حکومت کا زوال شروع ہو چکا تھا یعنی یہ وہ زمانہ ہے جب ہندوستان کے مطلع پر ہر طرف سے ادبار و نکبت اور بربادی و تباہی کے بادل منڈلا رہے تھے اور یہ گھٹا چند سال میں ہی ختم نہیں ہو گئی۔ بلکہ اس کا سلسلہ ایک طویل عرصہ تک قائم رہا۔ یعنی سترھویں صدی کی ابتدا سے لیکر انیسویں صدی کے نصف تک۔ یہ صحیح ہے کہ ۱۸۵۷ء میں حکومت انگریزی کے سارے ہندوستان پر مسلط ہو جانے کے بعد

ندوستانیوں کو خانہ جنگیوں سے نجات مل گئی اور اُن کو قدرے سکون حاصل ہو گیا لیکن انقلاب زمانہ سے اُن کو روحانی اذیت ہوئی اور جس کا سلسلہ بدقسمتی سے آج تک جاری ہے۔ وہ ایک ایسی مستقل مصیبت اور کوفت ہے جس کا خاتمہ اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ گردش ایام داستان ماضی کو نہ دہرا دے۔ بہرحال مقصد یہ ہے کہ اُردو شاعری کے ابتدائے عروج سے چونکہ ہندوستانی انتشار و بربادی اور فلاکت و نحوست میں گھرے ہوئے تھے اس لئے ان کے دل و دماغ پر مایوسی چھائی ہوئی تھی اور اب تک ہے۔ شاعری چونکہ ماحول کے تابع ہوتی ہے اسلئے یہ لازمی تھا کہ اردو شاعری بھی اپنے ماحول سے متاثر ہوتی چنانچہ اردو شاعری کا مطالعہ ہم کو اسی نتیجہ پر پہنچاتا ہے لیکن ۱۹۲۱ء کی ترک موالات اور خلافت کی تحریکوں کے بعد ہندوستانیوں میں جو سیاسی بیداری پیدا ہوئی اور جسکی وجہ سے اُن میں قوتِ عمل کا ایک جذبہ پیدا ہوا اس نے ان کے دل و دماغ سے یاس و ناامیدی کی تاریکی کو بڑی حد تک دور کر دیا اور اس سے بھی بڑھکر مسرت افزا یہ ہے کہ یہ تاریکی زمین کی ہر گردش کے ساتھ ہلکی ہوتی جا رہی ہے۔

جہاں تک اُردو شاعری کا تعلق ہے سب سے پہلے حالی مرحوم نے زندگی کے کچھ گُر ہمکو بتائے لیکن ان کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ سوائے آس پاس والوں کے کوئی نہ سُن سکا۔ زندگی کی لہر صحیح معنوں میں سب سے پہلے ہمکو اکبر الٰہ آبادی کے کلام میں ملتی ہے۔ اکبر نے ہنسی ہنسی میں بڑے پتے کی باتیں ہمکو بتائیں اور طنز کے کاری نشتر لگا کر ہمارے دماغ سے بہت سے فاسد مادوں کو خارج کیا۔ اُن کے اشعار آج بھی جبکہ حالات بڑی حد تک بدل چکے ہیں، ذہنیتوں میں انقلاب آ چکا ہے اُسی دلچسپی کے ساتھ پڑھے اور سنے جاتے ہیں اور وہی اثر قائم کرتے ہیں۔ اس کے بعد زندگی کی یہ لہریں بڑھتی ہی گئیں۔ اقبال کے ہاں تو مایوسی بدرجۂ کفر ہے۔ وہ ہر چیز میں زندگی پاتا ہے۔ وہ بلندیٔ فکر و نظر کا قایل ہے۔ وہ کشمکش حیات کو ہی اصل حیات سمجھتا ہے۔ وہ کوشش ناتمام سے ہی زندگی کے ایوان کی تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ وہ خون دل و جگر سے سرمایۂ حیات پیدا کرنا چاہتا ہے۔ وہ اُس جنون کا قائل ہے جو تقدیر کے چاک کو سی سکتا ہو۔ وہ اُس راہی کا مداح ہے جو سختی منزل کو سامان سفر سمجھے۔ اس کا عقیدہ اور تعلیم ہے کہ بربادیوں سے آبادی ہوتی ہے۔ تخریب سے تعمیر کا پہلو نکلتا ہے۔ ہزاروں ستاروں کی موت ہی ایک روشن و درخشاں آفتاب کے طلوع کا باعث ہو سکتی ہے۔

اقبال نے ہم کو ہماری غلطی سے آگاہ کیا کہ ؎

تیرا زمانہ تاثیر تیری — نادان نہیں یہ تاثیر افلاک

اُس نے ہم کو تسلی دی کہ ؎

غمیں نہ ہو کہ بہت دور ہیں ابھی باقی — نئے ستاروں سے خالی نہیں سپہر کبود

اُس نے ہمکو تنبیہ کی کہ ؎

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر	فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اُس نے ہم کو صاف صاف لفظوں میں بتایا کہ ؎

ہے آبِ حیات اسی جہاں میں	شرط اس کے لئے ہے تشنہ کامی

جوشؔ کا کلام بھی ہم میں حرارت پیدا کرتا اور زندگی کی لہر دوڑاتا ہے لیکن اُن کے ہاں صرف تخریب ہے، تعمیر نہیں۔ وہ ہر چیز کو برباد تو کر دینا چاہتے ہیں لیکن بنایا کیا جائے یہ نہیں بتاتے۔

شاعری خصوصیت کے ساتھ جس چیز کی تصویر بہت صاف اور نمایاں طور پر نہیں کر سکتی بلکہ کرتی ہے وہ اُسکا ماحول ہے۔ شاعری اپنے ماحول یا زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ اپنے زمانہ کی تہذیب، تمدن، معاشرت وغیرہ کا صحیح صحیح نقشہ اور سچی تصویر بغیر کسی رو رعایت کے کھینچکر رکھدیتی ہے بلکہ زیادہ صحیح یہ کہنا ہوگا کہ وہ تصویریں خود بخود شاعری کے ذریعہ کھنچ آتی ہیں۔ چنانچہ لکھنؤ اور دہلی کی تہذیب معاشرت کی صحیح تصویر دیکھنی ہو تو تاریخ کا مطالعہ کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ میرؔ، سوداؔ، انیسؔ اور دوسرے شعرا کا کلام دیکھنا چاہیئے۔ ہماری ہندوستانی معاشرت کی بہترین تصویر نظیرؔ اکبرآبادی کے کلام میں ملتی ہے۔ انگریزی تہذیب نے ہندوستانیوں پر جو تسلط جمایا اس کی صحیح اور سچی تصویر حالیؔ مرحوم اور اکبرؔ مرحوم کے کلام میں آپ کو ملیگی اور اس کے بعد کچھ کچھ اقبالؔ کے کلام میں بھی۔ اکبرؔ نے جتنی صحیح تصویر اپنے زمانہ کی معاشرت کی کھینچی اور جیسی بے لاگ تنقید کی ہے، شاید نثر میں دفتر کے دفتر سیاہ کر دینے پر بھی وہ بات پیدا نہ ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اکبرؔ کو ایک بہترین تمدنی نقاد تسلیم کیا گیا ہے۔ اکبرؔ کے اشعار تو اہل ادب کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ بہر حال محض تذکر کی خاطر یہاں چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

آنر کے ساتھ نام گرامی بھی لکھ گیا،	لیکن اُدھر سے خط غلامی بھی لکھ گیا

فلٹ نفیس، سڑک خوشنما، ڈنر ہر شب	یہ لطف چھوڑ کے حج کا سفر یہ خوب کہی

جس روشنی میں لوٹ ہی کی آپکو سوجھی	تہذیب کی میں اُس کو تجلّی نہ کہوں گا

نئی تہذیب میں دقت زیادہ تو نہیں ہوتی	مذاہب رہتے ہیں باقی فقط ایمان جاتا ہے

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا	کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جاکر

پہونچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پرواہ نہ رہی	کیک کو چکھ کے سنویوں کا مزہ بھول گئے

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جاجا کے تھانے میں	کہ اکبرؔ نام لیتا ہے خدا کا اس زمانہ میں

اقبالؔ کے کلام میں تصویر سے زیادہ تنقید ملیگی، مثال کے طور پر ایک دو شعر کا قطعہ پڑھیئے:۔

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب	کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید	ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

مندرجہ ذیل اشعار میں بھی یورپی تمدن پر بہت تیز قسم کا نشتر چلایا گیا ہے۔

مشرق کے خداوند سفیدان فرنگی ۔۔۔ مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات
یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے ۔۔۔ حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائی تعمیر میں رونق میں صفا میں ۔۔۔ گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کے عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے ۔۔۔ سود ایک کا لاکھوں کیلئے مرگ مفاجات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت ۔۔۔ پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس ۔۔۔ کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

انسانی زندگی کے مسائل میں ایک نہایت اہم مسئلہ تعلیم کا ہے۔ ہمارے بہت سے مسائل اور بہت سے کاموں کی اچھائی اور برائی کا دارو مدار اسی مسئلہ تعلیم کی اچھائی یا برائی پر ہے۔ افسوس ہے کہ اس اہم مسئلہ کی طرف اردو شاعری نے کچھ بہت توجہ نہ کی۔ لیکن اکبر نے اپنے مخصوص انداز میں موجودہ طریقۂ تعلیم پر روشنی ڈالی اور تنقید کی ہے۔ اقبال نے بھی موجودہ تعلیم پر بڑی حد تک روشنی ڈالی ہے۔ حالی نے بھی کہیں کہیں اسکی طرف اشارے کئے ہیں۔

آج کل جو نصاب تعلیم ہندوستان میں رائج ہے اس کے متعلق یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ وہ ناقص ہے اور موجودہ تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں باطن کی تربیت بالکل نہیں ہوتی۔ صرف ظاہری ٹیپ ٹاپ تک معاملہ رہ جاتا ہے۔ چنانچہ اکبر کہتے ہیں:۔

رنگ چہرہ کا تو کالج نے بھی رکھا قائم ۔۔۔ رنگ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا
نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے ۔۔۔ جناب ڈاردن کو حضرت آدم سے کیا مطلب
ان مدعیوں کا طرز عمل اکبر یہ شہادت دیتا ہے ۔۔۔ پڑھنے کو کتابیں پڑھ لی ہیں سمجھے یہ مگر کچھ خاک نہیں
نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے ۔۔۔ مگر یوں ہی کہ گویا آب زمزم مے میں داخل ہے
ایسی منطق سے تو دیوانگی بہتر اکبر ۔۔۔ کہ جو خالق کی طرف دل کو جھکا ہی نہ سکے
بہت آسان ہے تشریح منطق کے نتیجوں کی ۔۔۔ بہت مشکل ہے لیکن فرق کرنا حق و باطل میں

مندرجہ ذیل دو شعروں میں بھی موجودہ تعلیم پر نہایت عمدہ تنقید کی گئی ہے۔

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے ۔۔۔ جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے
ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں ۔۔۔ کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

اقبال کے چند اشعار بھی پڑھتے چلئے:۔

یہ مدرسہ، یہ کھیل، یہ غوغائے روارو
اس عیشِ فراواں میں ہے ہر لحظہ غم نو

وہ علم نہیں زہر ہے، احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جو

ناداں ادب و فلسفہ کچھ چیز نہیں ہے
اسباب ہنر کے لئے لازم ہے تگ و دو

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے
مُردہ ہے مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس

وطن سے محبت کرنا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اردو شاعری کا یہ باب، افسوس ہے کہ بہت گراں نہیں۔ جب سے اُردو شاعری کا ستارہ چمکا اُس وقت سے لیکر انیسویں صدی کے نصف تک بیسیوں دل ہلادینے اور جگر ٹکڑے کر دینے والے واقعات رونما ہوئے۔ مثلاً نادرشاہ دُرّانی کے حکم سے دہلی میں قتل عام کا ہونا۔ غلام قادر روہیلہ کی سفاکی کی وجہ سے شاہ عالم کی آنکھوں کا نکلوالیا جانا۔ پھر کچھ دنوں بعد اُسی مظلوم بادشاہ کا بیدردانہ قتل، جنگ پلاسی میں جعفر کی غداری کی وجہ سے سراج الدولہ یا بالفاظ دیگر ہندوستانیوں کی شکست، دکن میں صادق کی نمک حرامی کی وجہ سے ٹیپو کی شکست و موت، دلّی کی تباہی، لکھنؤ کی بربادی، بوڑھے بہادر شاہ کی قید، شہزادوں اور شہزادیوں کی دربدر کی ٹھوکریں کیا ان میں سے کوئی ایسا واقعہ بھی ہمارے شاعروں کو اشکبار کر سکا، حالانکہ ہر واقعہ اور حادثہ کے وقت ایک دو نہیں کئی استاد اور قادرالکلام شاعر موجود تھے۔ میر، سودا، جرأت، مصحفی۔ انشا، ناسخ، آتش۔ دبیر، غالب، امیر، داغ، جلال، یہ سب باکمال کسی کسی حادثہ کے وقت ضرور موجود تھے۔ کیا ان میں سے کسی کا بھی قلم حرکت میں آیا؟ ۱۸۵۷ء کی ناکام پنجہ آزمائی نے ہندوستانیوں کو جن مصائب کے شکنجہ میں کس دیا اُن کو دیکھ کر شاید آسمان بھی تھرا اُٹھا ہو لیکن اگر دل نہ پگھلا تو ہمارے شاعروں کا۔ مغل شہزادوں اور شہزادیوں کے دربدر کی ٹھوکریں کھانے کی داستانیں پڑھکر آب دجگر کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں لیکن ہمارے ان شاعروں کے دلوں پر، جنھوں نے یہ جگر گداز سانحے اپنی آنکھوں سے دیکھے کوئی اثر نہ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ شاعر بڑے حساس دل کا مالک ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے یہ شعرا تنخواہ اور پنشن نہ ملنے پر ضرور حساس ہو جاتے تھے۔ لیکن ملک اور قوم کی بربادی پر ان کے حساس دل کو ٹھیس نہ لگتی تھی۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تک نہ آتے تھے، ان کے قلم کو حرکت نہ ہوتی تھی۔ پنشن بند ہو جانے یا تنخواہ ملنے میں دیر ہونے پر سیکڑوں اشعار کا قصیدہ لکھا جا سکتا ہے لیکن قوم اور وطن کی بربادی پر دو آنسو بھی نہیں بہائے جا سکتے۔ شاید ایسے ہی شاعروں کے لئے افلاطون نے اپنی "ریاست" میں جگہ نہ رکھی ہو۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ صاحب شعر الہند نے یہ کیسے لکھ دیا کہ "ایک محدود پیمانہ پر حب الوطنی کے جذبات قدیم شاعری میں بھی موجود ہیں؛

قدیم شاعری میں وطنی شاعری کا سارا سرمایہ یہ ہے کہ سودا، مجروح، حالی، داغ وغیرہ نے چند نظمیں

دلّی کی تباہی پر لکھیں۔ اس کے سوا اور تو ہمکو کچھ نظر نہیں آتا، اس میں بھی مجروح، حالی اور داغ کو قدما میں شمار کرنا غلطی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اُردو زبان میں ۱۸۷۴ء سے پہلے تک وطنی شاعری کا فقدان تھا اور ہمارے لئے یقیناً یہ امر بڑی شرم اور ندامت کا باعث ہے۔ اُردو زبان میں وطنی شاعری کا آغاز ۱۸۷۴ء سے جب پنجاب میں ایک نئے انداز کے مشاعرے کی بنا ڈالی گئی، ہوتا ہے۔ حالی اور آزاد نے جو اس مشاعرے کے بانی اور کرتا دھرتا تھے، حُب الوطنی سے متعلق اچھی اچھی نظمیں لکھیں جو ملک میں کافی مقبول ہوئیں۔ اس کے بعد یہ سلسلہ کچھ اس طرح پھیلا کہ آج تک بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ چکبست کی بعض وطنی نظمیں بہت قابل قدر ہیں خصوصاً ان کی وہ نظم جس کا عنوان ہے "خاک ہند" بہت مقبول ہوئی۔ اس سلسلہ میں سرور جہاں آبادی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اُنھوں نے وطن کا راگ بڑے میٹھے سروں میں چھیڑا ہے۔ اُن کی نظموں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ دماغ کی نہیں بلکہ دل کی آواز ہے۔ لیکن وطنی شاعری کے گل سر سبد دراصل ڈاکٹر اقبال ہیں۔ اقبال کے ہاں جو خلوص، سوز، تڑپ اور بلند آہنگی پائی جاتی ہے اُس کا عشر عشیر بھی دوسرے شعرا میں نہیں۔ اُن کی شعاع اُمید جو تڑپ اور بے چینی اور اس کے ساتھ ہی اُمید کی کرن رکھتی ہے وہ کس دل کو منور اور کس دماغ کو متاثر نہیں کرسکتی۔ ہاں اگر کوئی دل اپنے اس احساس کا اور کوئی دماغ اپنے اس تاثر کا اظہار نہ کرے تو یہ اور بات ہے۔

موجودہ دور میں اقبال کے علاوہ جوش اور بعض دوسرے شاعروں نے بھی حُب وطن پر بعض اچھی نظمیں لکھی ہیں۔

بعض شعرا نے سلاطین سلف کی یادگاروں سے متعلق نظمیں لکھی ہیں۔ بظاہر تو وہ عمارتوں کی تعریف کرتے ہیں لیکن در پردہ قومیت و وطنیت کا ایک محدود نقطۂ نظر بھی اُن میں پایا جاتا ہے۔ اس قسم کی نظموں کے سلسلہ میں اسمٰعیل میرٹھی اور صفی لکھنوی کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے۔

جب وطن ہی سے محبت نہ ہو تو پھر اس کی اچھائی اور بھلائی، فلاح و بہبود اور خوشحالی سے کیا سروکار ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بقول صاحب "شعر الہند" قدیم اُردو شاعری میں سیاسی عنصر کا بہت کم پتہ چلتا ہے۔ حرف[illegible] کی ایک قطعہ بند غزل ہے جس میں اُنھوں نے ایک فقیر کی زبان سے یہ آئین حکومت بتائے ہیں:

کسی گدا نے یہ ایک شہ سے کہا ۔۔۔ کروں میں عرض، اگر اسکو نہ سرسری جانے
اُمور ملکی میں اول ہے شہ کو یہ لازم ۔۔۔ گدا نوازی و درویش پروری جانے
مقام عدل پہ جس دم سریر آرا ہو ۔۔۔ ہر ایک خرد و کلاں میں برابری جانے

وہی ہو راسئے مبارک میں اُس کے گوشہ نشیں | کہ جس میں عائۂ خلقت کی بہتری جانے
ملازموں سے نہ لاوے یہ اس کو بر سر کار | کہ جس سے کار خلائق کی ابتری جانے
پُس ہے ملک و رعیت ہے گل اُنھوں کے لئے | بسان ابر سر سایہ گستری جانے
ہمیشہ جود و کرم میں سمجھ ہر اک کی قدر | مساوی از امرا تا بہ لشکری جانے
بجا جو طرح سپاہی ہو اس کو سمجھے مرد | نہ یہ کہ مرنے کو بیجا سپہ گری جانے
جو شخص نائب داور کہائے عالم میں | یہ کیا ستم ہے نہ آئین داوری جانے
سوائے اُن سخنوں کے جو تاج زریں کو | خیال اپنے میں سر دھر کے سروری جانے
یہ فخر تاج تو یوں نزد فہم ہے جس طرح | خروس اپنے کو سلطان خاوری جانے

اشارۃً یا کنایۃً کہیں کسی کے کلام میں چند اشعار مل جائیں تو اور بات ہے ورنہ قدما کے یہاں سیاست کا بالکل پتہ نہیں چلتا۔ لیکن جب بیسویں صدی کے آغاز سے ملوکیت کے جادو کا ردعمل ہوا اُترنے لگا اور مدتوں کے سوئے ہوئے ہندوستانی خواب غفلت سے بیدار ہونے لگے تو شاعری بھی اپنے ماحول سے متاثر ہوئی اور اُس میں سیاست کا عنصر داخل ہونے لگا۔ اس سلسلہ میں سرفہرست جس شاعر کا نام لکھا جا سکتا ہے وہ حالی مرحوم ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ صاحب شعرالہند کے اس بیان سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ

"حریت و آزادی کا لفظ آج بچہ بچہ کی زبان پر ہے لیکن اُس زمانہ میں جبکہ یہ لفظ جرم خیال کیا جاتا تھا سب سے پہلے حالی ہی نے ہندوستان کی غلامی کا ماتم کیا۔"

اکبر نے بھی اپنے مخصوص ظرافت آمیز انداز میں سیاسی مسائل پر روشنی ڈالی اور طنز کے بڑے گہرے نشتر چلائے، لیکن سب سے پہلے جس شاعر نے قوم کو شاعرانہ حیثیت سے سیاسی تعلیم دی وہ شبلی ہیں۔ ۱۹۲۱ء کی تحریک ترک موالات کے بعد تو ایک دو نہیں بیسیوں شاعروں نے سیاسی مسائل سے متعلق نظمیں کہیں۔ ان میں ظفر علی خاں اور اقبال مرحوم نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال کے کلام میں جو تڑپ اور انقلابی جذبہ کارفرما ہے اُس کے مقابلہ میں کم نظیریں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان کی شمع و شاعر، خضر راہ، لینن خدا کے حضور میں، فرمان خدا فرشتوں کے نام، مسولینی کا خطاب اپنے مشرقی و مغربی حریفوں سے، وغیرہ قطعاً غیر فانی نظمیں ہیں۔ ظفر علی خاں میں طنز ہے اور کافی تیز طنز، جوش کی بھی بعض نظمیں سیاسی مسائل سے متعلق اچھی ہیں، لیکن اُن کے خیالات چونکہ محدود اور پیرایۂ بیان بھی ندرت سے خالی ہوتا ہے اس لئے دو چار نظمیں پڑھ لینے کے بعد جو اثر ایک بار قائم ہوتا ہے اُس میں پھر کوئی خاص اضافہ نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ان کے ہاں مغلق الفاظ اور غلط ترکیبوں کی ایسی بھرمار ہے کہ پڑھنے والے کو اکثر اُلجھا دیتی اور شاعر کے مقصد سے دور کر دیتی ہے۔

غزل گو شعراء میں حسرت موہانی اور مرحوم محمد علی جوہر کی غزلوں میں کہیں کہیں سیاست کا رنگ آ جاتا ہے۔

قدیم شاعری نے افسوس ہے کہ ملت کی نغمہ سرائی یا نوحہ خوانی سے بھی گریز کیا۔ اس عزیز چیز کی ابتدا کا سہرا بھی حالی ہی کے سر ہے۔ حالی نے سرسید کی فرمائش پر مدوجزر اسلام (مسدس حالی) لکھا۔ اس کے بعد تو پھر یہ سلسلہ کچھ ایسا چلا کہ آج تک چلا جا رہا ہے۔ مسلمان شعراء میں جن کو ملت کی نوحہ خوانی یا مدح سرائی یا وکالت کا فخر حاصل ہے وہ حالی کے علاوہ نذیر، شبلی، اسمٰعیل، صفی، اقبال، ظفر علی خاں اور حفیظ جالندھری ہیں۔ ہندو شعراء میں چکبست اور سرور جہاں آبادی کے نام خاص طور پر لئے جا سکتے ہیں۔

نذیر کا یہ دستور تھا کہ علی گڑھ میں اپنے ہر لکچر سے پہلے ایک نظم سنایا کرتے جس میں قوم کو مختلف طریقوں سے ابھارنے کی کوشش کرتے۔ شبلی کی بعض نظمیں قطعی غیر فانی ہیں۔ ان کی مثنوی صبح اُمید اردو زبان میں ایک نہایت خوشگوار اضافہ ہے۔ اُن کا شہر آشوب آج تک رگوں میں تڑپ اور خون میں حرارت پیدا کرتا ہے۔ ظفر علی خاں سیاسی و ملی شاعری میں شبلی کے نقش قدم پر چلتے ہیں لیکن ان کا جوش و خروش شبلی سے زیادہ ولولہ انگیز ہوتا ہے۔

زندگی کے مسائل بہت ہیں۔ بعض پر انسان خاص توجہ کرتا ہے اور بعض کی طرف بالکل دھیان نہیں دیتا شاعر عموماً انھیں چیزوں کی طرف توجہ کرتا ہے جن کی طرف انسان کا رجحان زیادہ ہوتا ہے ان کی نظموں میں انھیں باتوں کو جگہ ملتی ہے جن سے انسان کو دلچسپی ہوتی ہے۔ ایسے تمام اہم مسائل جن سے انسان کو دلچسپی ہے کم از کم جدید اُردو شاعری میں آ گئے ہیں۔ اب ہماری شاعری زندگی سے نزدیک تر ہوتی جا رہی ہے۔ اب ہمارا شاعر صرف تصور جاناں میں وقت کو رائگاں نہیں کر دینا چاہتا بلکہ زندگی کی حقیقتوں اور تلخیوں کو آشکارا کرنا چاہتا ہے۔ اب وہ صرف زلف پیچاں میں نہیں اُلجھا رہتا ہے بلکہ زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اب اس کی نگاہ میخانہ کی طرف نہیں بلکہ پاگل خانہ کی طرف اُٹھتی ہے اب گل رنگیں نہیں بلکہ گل پژمردہ اُس کو زیادہ متاثر کرتا ہے اب وہ اُمراء اور رُؤسا کی مدح سرائی نہیں کرتا بلکہ مزدوروں، کسانوں، فاقہ زدوں اور بیکسوں کی حمایت و وکالت کرتا ہے۔ مقامی رنگ بھی روز بروز گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ اب وہ بلبل کے نغموں سے نہیں بلکہ پپیہے کی "پی کہاں" اور کوئل کی کوک سے مست ہوتا ہے۔ اب اسے نسرین و نسترن نہیں بلکہ چمپا اور موتیا اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

لیکن ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ ہماری شاعری میں ایک عجیب قسم کی بے راہ روی پیدا ہو گئی ہے فنی حیثیت سے ہماری شاعری کی ترقی، ترقیِ معکوس کا درجہ رکھتی ہے۔ بحور و قوافی کی گرفت سے آزادی کی تڑپ نے ہماری شاعری کو خاص طور پر نقصان پہونچایا ہے۔ اکثر و بیشتر شعراء کے خیالات میں عمق کی بجائے سطحیت

پائی جاتی ہے۔ زندگی کی حقیقتوں اور تلخیوں کو آشکارا کرنے کی کوشش تو سب کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ ان تلخیوں سے گریز بھی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظمیں بہت جلد اپنا اثر کھو بیٹھتی ہیں۔ بہرحال اس کا موجودہ دور کے شاعروں پر انحصار ہے کہ وہ اپنی زبان کی شاعری کو ملک، قوم اور انسانیت کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید و کارآمد بنائیں اور خود اپنے لئے بقائے دوام کے دربار میں جگہ پیدا کریں۔

غزل

از جناب حضرت منور لکھنوی

کفر سا کفر اپنی ہستی ہے	اب تو ایماں فنا پرستی ہے

ہر نفس شعلہ پاش رہتا ہوں	ہر طرف آگ سی برستی ہے

گر کے اُٹھنے کا نام بھی نہ لیا	روح پر کتنے دل کی بستی ہے

اب تو جینے کی ہے یہی صورت	خلق بیکار مجھ پہ ہنستی ہے

جسمیں ویرانیوں کا لطف نہ ہو	ایسی بستی بھی کوئی بستی ہے

چھن گیا زندگی کا سرمایہ	تنگدستی سی تنگدستی ہے

سرد بازار ہے اُمیدوں کا	کس قدر جنس یاس سستی ہے

میں جو آیا ہوں تنگ جینے سے	موت آوازہ مجھ پہ کستی ہے

ہے منور پہ ناز رندوں کو
بادہ مستی سی بادہ مستی ہے

عروسِ شب

(از جناب روش صدیقی صاحب)

عروسِ شب یونہی مہکو، ابھی تو رات بہت ہے

علاجِ غم بھی نہیں کچھ، علاجِ غم بھی نہ ہوگا
یہ زہرِ کم بھی نہیں کچھ، یہ زہر کم بھی نہ ہوگا
مگر یہ لمحۂ شاداں کبھی بہم بھی نہ ہوگا
نشاطِ روح کا اتنا بھی التفات بہت ہے

میں اتنی دیر غمِ این و آں سے دور رہوں گا
جہاں کا ذکر ہے کیا دو جہاں سے دور رہوں گا
زمیں کی بات ہے کیا آسماں سے دور رہوں گا
مرے لئے تو یہی گوشۂ نجات بہت ہے

خود آفتاب کے دل کا لہو بھی زرد ہے اب تک
متاعِ سینۂ مشرق شرار سرد ہے اب تک
رُخِ سحر پہ یہاں ظلمتوں کی گرد ہے اب تک
اگرچہ شور ہجومِ تجلیات بہت ہے

طلوعِ مہر سے بھی دل میں روشنی نہیں ہوتی

شفق بھی ساقیِ صہبائے زندگی نہیں ہوتی
نگارِ صبح کے نغموں میں سرخوشی نہیں ہوتی
مگر یہ رات! یہ آرائشِ حیات بہت ہے

یہ نکہتوں کا جگاتا ہوا، ارم کا فسانہ
خموشیوں کے تعاقب میں زندگی کا ترانہ
یہ آگہی کا تقاضا، یہ بیخودی کا بہانہ
خوشا! کہ آج گل افشاں رُخِ حیات بہت ہے

کسی سحر کا مجھے انتظار ہو بھی تو کیوں ہو
گماں سے ذوقِ یقیں سرشار ہو بھی تو کیوں ہو
کوئی سکوں کے لئے بیقرار ہو بھی تو کیوں ہو
فسونِ گیسوئے لیلائے کائنات بہت ہے

زمانہ کیا ہے؟ ازل سے ابد تک ایک کہانی
بقا کے دل کی صدا ہے شکستِ لمحۂ فانی
غمِ کہن کا فسانہ، نشاطِ نو کی زبانی
وہاں بھی زہر نہیں کم جہاں نبات بہت ہے

کچھ اجتناب نہیں ہے مجھے بہشت بریں سے
مگر وہ خود ہی گریزاں ابھی ہے اہلِ زمیں سے
کہیں قریب اگر ہو تو دیکھ لونگا یہیں سے
کہ گرد و پیش ہجومِ تصورات بہت ہے

کسی نے مجھ کو سنایا تھا صبحِ نو کا فسانہ

وہ صبح جس کی جلالت کا منتظر ہے زمانہ
مگر وہ صبح بھی کب تک حریفِ خوابِ شبانہ
یہ کائنات، اسیرِ تغیرات بہت ہے

مگر یہ کون؟ یہ کس کی صدا سے چونک اُٹھا میں
یہی تو ہے وہ سحر جس سے دور، دور رہا میں
کہیں اُفق سے پکارا، کسی نے، لو وہ چلا میں
مجھے تو لرزشِ آہنگِ کائنات بہت ہے

تغیرات کی بیگانگی، عزیز ہے مجھ کو
نگاہِ ناز کی ہر برہمی، عزیز ہے مجھ کو
یہ صبح، صبحِ قیامت سہی، عزیز ہے مجھ کو
مرے جنون کو بھی پاسِ تغیرات بہت ہے

مری نوا نے ستاروں کو تیز گام کیا ہے
مرے سکوں نے فرشتوں کو ہم کلام کیا ہے
مری وفا نے مشیت کا احترام کیا ہے
نگاہ ہو تو جمالِ تعینات بہت ہے

مری نگاہ سے بچ کر گزر رہا ہے اندھیرا
ہے میری روح میں شاید، نئی سحر کا بسیرا
یہ خونِ دل سرِ مژگاں بنے گا سرخ سویرا
یہ ہو سکا تو مجھے فرصتِ حیات بہت ہے

یہ اسیرِ فراق، مجھے ہجر آشنا نہ سمجھنا

مری وفا کو حجابِ رُخِ وفا نہ سمجھنا
مجھے جُدا نہ سمجھنا، مجھے جُدا نہ سمجھنا
سمجھ سکو تو یہ بہکی ہوئی سی بات بہت ہے
ابھی تو رات بہت ہے
عروسِ شب یونہی مہکو ابھی تو رات بہت ہے

(از جناب سلیمان ادیب صاحب)

پہلی تاریخ کا رو پہلا چاند، دیدنی آب و تاب ہے اس کی
سوچتا ہوں فلک کے دریا میں گر پڑی کس کے کان کی بالی

ماہِ نو آج بن کے آئی ہے دیکھتا ہوں کہ وہ کہاں پہونچی
کل ہی ٹوٹی تھی سامنے میرے ہاتھ کی ان کے اک حسیں چوڑی

زینتِ چرخ ہے، درست مگر کون کہتا ہے چاند ہی ہوگا
دل میں سب کے اترتا جاتا ہے ہے یہ خنجر کسی کے ابرو کا

مسکراتا ہوا بطرزِ نوئی منظرِ عام پر ہلال آیا
ہاتھ ملنے لگا میں حسرت سے کس کے ناخن کا یہ خیال آیا

میں نے دیکھا ہے اپنی آنکھوں سے بدر میں تھی کہاں یہ رعنائی
جانے کس پیکرِ جوانی کی بن گیا ہے ہلال انگڑائی

بزمِ انجم تھی سونی سونی سی آگیا لو، ہلال محفل میں!
بالکل اس طرح جیسے آس کی لو روشنی کردے خانۂ دل میں

نیلے آکاش پر یہ ننھا چاند تارے اطراف اس کے پھیلے ہوئے
شام کے وقت جیسے گوکل میں "بال موہن" ہیں "گوپیوں" میں گھرے

مومن و غالب

(از جناب حبیب احمد صاحب صدیقی کانپور)

چند روز ہوئے میری نظر سے مولانا سید اعجاز احمد معجز سہسوانی منشی فاضل و مولوی فاضل پنجاب کی تصنیف "مومن و غالب" گزری، مومن و غالب دونوں پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ مومن پر کم اور غالب پر زیادہ مگر جو کچھ اس کتاب میں لکھا گیا ہے وہ نہایت ہی حیرت انگیز ہے اور اس پر سنجیدہ تنقید کا اطلاق کھینچ تان کر بھی کرنا دشوار ہے۔ غالب کو اُردو شعراء کی صف سے خارج کرنے میں مصنف سے زیادہ تبصرہ نگار نے جد و جہد فرمائی ہے یہ تبصرہ ثمرۂ خامۂ اعجاز رقم افتخار لوح و قلم دقیقہ سنج حقایق و معانی مولانا محمد شاکر حسین صاحب نکہت سہسوانی دام اللہ فیوضہ و برکاتہ ہے۔ یہ سمجھنے کے لئے کہ کس غرض اور کس نقطۂ نگاہ سے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس "ثمرہ" کے چیدہ چیدہ اقتباس پیش کئے جائیں۔

(۱) "مرزا صاحب ماشاء اللہ ہر حصۂ عمر میں اسی رنگ کے پابند رہے ہیں کہ یا تو اشعار میں کوئی معنی نہ ہوں اور جو با معنی ہوں تو فارسی کی ایسی بھاری ترکیبوں سے جن کا بار اُٹھانا اُردو کو دوبھر ہے اور ایسی تعقیدات بیجا و سستیٔ بندش و عامیانہ مذاق سے خالی نہ رہیں جن کا داخلہ زبان اُردو اپنے حدود کار فرمائی میں اپنے لئے باعث ننگ تصور کرے۔"

(۲) "باقی رہا نصف کلام تقریباً ۷۰۰ ابیات، اس میں ایک ربع ایسے شعر ہیں جو ہر طرح کی تعقیدات اور عامیانہ مذاق و سستیٔ بندش و مضامین پائمال کی قید شدید میں جکڑے ہوئے ہیں اور جن کی حالت بیکسی کا اندازہ بہترین غزل گو کے ملاحظہ سے اچھی طرح ہو سکتا ہے۔ اگر مرزا صاحب کے ساز و برگ شاعری سے ان کو بھی مستثنیٰ کر دیا جائے تو پھر کیا کائنات باقی رہتی ہے۔ صرف ساڑھے پانچ سو ابیات جن کی حالت یہ ہے کہ ان میں اِدھر اُدھر سے مانگے تانگے ہوئے ہیں۔ اور جن کے لکھنے میں مرزا صاحب نے سوائے روشنائی اور کاغذ کے اپنی گرہ سے کچھ خرچ نہیں کیا۔ بلکہ افراسیابی نژاد ہونے کی وجہ سے محض ترکانہ غارتگری پر اکتفا فرمائی ہے۔"

(۳) "استاد ذوق جیسے محاورہ نگار و تمثیل گو اور حکیم مومن خاں جیسے بلند خیال و بلند فکر کے کلام سے مرزا کے اُردو کلام کا موازنہ کرنا جس میں پہلی مشترط موازنہ مفقود ہے کیا معنی رکھتا ہے اور یہ کیا انصاف کی بات ہے کہ مرزا جیسے کو تو ابھی ڈھکیل ڈھکال کے اکھاڑے میں لا کر کھڑا کر دیا جائے اور دو مسلم پہلوانوں سے زبردستی مقابلہ کرا کر پچھڑوا دیا جائے اور تماشائیوں کو تالیاں بجانے کا موقع ہاتھ آئے۔"

مولانا نکہت دام اللہ فیوضہ و برکاتہ نے اس کی توجیہ کی کہ غالب کو اُردو شعر کہنے کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی اس طرح فرمائی ہے۔

(۴) "لوگ ان کو اُردو غزل اور اشعار کی فرمائش سے مجبور کرتے ہوں گے اور وہ چونکہ اس کے لئے پیدا نہیں ہوئے تھے اور فطرتاً خوش مذاق اور دل لگی کے آدمی تھے اس لئے اُنھوں نے اس مہم کو اس طرح انجام دیا کہ سُننے اور دیکھنے والے تمام عمر بھول بھلیاں میں پھنسے رہیں، اور مرزا صاحب کے دبدبۂ قادر الکلامی و سطوت شاعری کی وجہ سے جو ان کو زبانِ فارسی میں حاصل تھی، کھانے کے خوف سے دم نہ مار سکیں۔"

لیکن اس توجیہ میں اس بات کا جواب نہیں ملتا کہ جب مرزا دیدہ و دانستہ بھول بھلیاں میں پھنسانیوالے اشعار فرمائش پوری کرنے اور لوگوں کو ٹالنے کی غرض سے کہتے تھے تو ان مہمل اشعار کو جمع کرکے دیوان مرتب کرنا کیوں ضروری ہوا؟

غالب پر نکتہ چینی کرنے والے حضرات میں ایک عجیب بات دیکھی گئی ہے کہ اگر کوئی صاحب اُردو کلام پر نکتہ چینی کرتے ہیں تو فارسی کلام کے اوصاف بیان کرنے میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ اور اگر فارسی کلام سے منحرف ہوئے تو اُردو شاعری کا اعتراف کرتے ہیں۔ غرضکہ یہ جرأت نہیں ہوتی کہ صاف صاف غالب کی شاعری کے منکر ہو جائیں۔ نواب امداد امام اثر مصنف "کاشف الحقائق" کے نزدیک غالب کا فارسی دیوان حُسنِ مقبولیت سے معرّا ہے مگر اُردو کلام کی یہ کیفیت ہے کہ:۔

"نشتریت تو ایسے غضب کی ہے کہ میر صاحب کے کلام میں بھی اس سے زیادہ نہ ہوگی، پُر تاثیری کا کیا کہنا، دل بے اختیار چلا آتا ہے کہ غزل سرائی اسے کہتے ہیں۔ شوخی کا وہ عالم ہے کہ طبیعت بے چین ہو جاتی ہے عالی مذاقی روح کو عالمِ بالا کی سیر دکھاتی ہے۔ وارداتِ قلبیہ کے مضامین کی خوبی جذباتی معاملات کے تماشے پیش نظر کر دیتی ہے۔ اور مختصر یہ ہے کہ حضرت کے کمالات گوناگوں کا وہی قائل نہ ہوگا جسے قلبی معنو   سے فطرت نے محروم رکھا ہے۔"

ڈر ہے کہ نواب امداد امام کا آخری جملہ پڑھ کر مولانا نکہت دام اللہ فیوضہ و برکاتہ بدمزہ ہوں، مگر میری ذمہ داری صرف اتنی ہے کہ میں نے ان کا قول نقل کر دیا ہے۔

برخلاف امداد امام کے مولانا نکہت کے نزدیک غالب کی اُردو شاعری "اپنی بدمذاقی کی وجہ سے کسی طرح اُردو کے دسترخوان پر چُننے کے لایق نہیں" مگر وہ فارسی میں غالب کے دبدبۂ قادر الکلامی اور سطوت شاعری کے قایل ہیں اور ان کی رائے میں فارسی دیوان اُردو مجموعہ کے مقابلہ میں وہی نسبت رکھتا ہے "جو قلزم کو کوزہ کے ساتھ ہے؟"

ایک ہی شخص کے اردو اور فارسی کلام کے متعلق اس قدر پڑھ کر نہایت حیرت ہوتی ہے، اگر غالب کو شاعرانہ دل و دماغ ملا تھا اور وہ فارسی میں نہایت بلند اور لطیف اشعار کہہ سکتے ہیں تو اُردو میں جو انکی مادری زبان تھی اور جس میں اُنھوں نے وہ دلکش خطوط لکھے ہیں جو اُردو ادب کے لئے مایۂ ناز ہیں۔ شعر نہ کہہ سکتا کیا معنی غالب کے متعلق یہ کہنا کہ اُردو شاعری ہی کیلئے وہ پیدا نہیں ہوئے تھے نہایت ہی بے معنی بات ہے۔

مولٰنا نکہت کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ غالب کے بیشتر اشعار فارسی الفاظ کی بھاری ترکیبوں سے گراں بار ہو گئے ہیں اور اُردو کے نازک کاندھے اس بوجھ کے متحمل نہیں ہو سکتے اس امر کی تحقیق کرنے کے لئے کہ اُردو کس حد تک فارسی اور عربی الفاظ کی متحمل ہو سکتی ہے۔ اردو نثر و نظم کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ میں مولٰنا نکہت کے تبصرہ ہی کی چند سطریں نقل کر کے یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اُردو کے کاندھے اتنے نازک نہیں جتنا مولٰنا سمجھتے ہیں۔

"تبصرہ۔ ثمرہ خانۂ اعجاز رقم، افتخار لوح و قلم، دقیقہ سنج حقایق و معانی۔ مولٰنا محمد شاکر حسین صاحب نکہت سہسوانی دام اللہ فیوضہ، و برکاتہ (اسکے بعد تین سطریں ٹھیٹ عربی کی ہیں اور پھر) نکہت مینوا کی معلومات اگر حقیقت کے خلاف نہیں ہے تو فن ادب اُردو میں موازنۂ کلام کی بنیاد ڈالنے کا شرف اولیت شمس العلماء پروفیسر آزاد دہلوی کو حاصل ہے جنھوں نے تذکرۂ آب حیات میں بعض مواقع پر حسب ضرورت اساتذۂ سخن کے کلام پر یہ پہلو مدنظر رکھتے ہوئے روشنی ڈالی ہے یہ تقابل اگرچہ بہت ہی قلیل ہے اور مختلف نوعیتیں رکھتا ہے لیکن ایک تذکرہ نویس کے ادائے مطلب کے لئے جس کا مقصد ترقی زبان و فن کا اظہار ہو کافی ہے۔ اس کے بعد ناقص بردار کو شبیہ کامل بنانے کے احساس نے شمس العلماء مولانا شبلی مرحوم کی زود و سریع الانتقال طبیعت کو اُبھار کر اس سے ان سے تالیف موازنۂ انیس و دبیر کی صورت میں اُردو فن صحافت و انشائے ادب کے سر پر ایک خاص طریقۂ تصنیف کی رہنمائی تازہ بار امتنان رکھوا دیا۔"

ان چند سطروں میں جتنی اضافتیں اور ثقیل لفظ آئے ہیں ان کو زہر مار کرنے کے بعد غالب کا دیوان کس قدر سہل معلوم ہونے لگتا ہے۔ غالب بیچارہ تو "افراسیابی نژاد" ہونے کے باعث فارسی ترکیبیں اور اضافتیں استعمال کرنے پر مجبور ہوا۔ مگر غیر افراسیابی نژادوں نے یہ غیر متروکہ دولت کہاں سے پائی۔

بیشک غالب کے چالیس پچاس اشعار ضرور ایسے ہیں جو دیوان میں شامل نہ کئے جاتے تو اچھا تھا، مثلاً

نہیں اقلیم اُلفت میں کوئی طومار ناز ایسا ۔۔۔ کہ پشت چشم سے جس کے نہ ہووے مہر عنواں پر

فسردہ باغ حسن سے ہوتی ہے حل مشکل عاشق ۔۔۔ نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے گر نہ خار آتش

جادۂ رہ خور کو وقت شام ہے تار شعاع ۔۔۔ چرخ وا کرتا ہے ماہ نو سے آغوش وداع

برنگ کاغذ آتش زدہ نیرنگ بیتابی ۔۔۔ ہزار آئینہ دل باندھے ہے بال یک تپیدن پر

شعار سجھ مرغوب بت مشکل پسند آیا — تماشائے بہ یک کف بردن صد دل پسند آیا

مگر یہ کہنا کہ اس قسم کے اشعار ان کے دیوان میں پچاس فیصدی ہیں سراسر ناانصافی ہے۔ سیکڑوں اشعار ایسی دلآویز سادگی لئے ہوئے ہیں کہ میر کے یہاں بھی نہیں ملتی اور اس سادگی کے ساتھ تخیل کا امتزاج ایسا ہے کہ اُردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں پایا جاتا۔ میر کے یہاں سادگی ہے تو بلند پروازی نہیں۔ درد ہے مگر بلند حوصلگی نہیں، سوز ہے مگر تڑپ نہیں۔ غالب کے یہاں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو دیگر اساتذہ کی طرۂ امتیاز ہیں مگر ان خوبیوں کے علاوہ بھی کچھ ایسی چیزیں غالب کے یہاں ہیں جو اوروں کے دسترس سے باہر ہیں۔ غالب کے یہاں جو تنوع ہے وہ کسی شاعر میں نہ ملے گا۔ کسی کے یہاں معاملہ بندی ملے گی کسی کے یہاں مضمون آفرینی، کسی کے یہاں سوز و گداز، کسی کے یہاں شوخی، کسی کے یہاں بلند پروازی۔ مگر غالب کا سا ہمہ گیر کلام کسی کا نہیں ہے۔ صرف ایک غزل اس دعوٰی کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہے۔

غزل

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو — نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں — سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو — نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا — تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم — گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ — کہ جب دل میں تمہی تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے — نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے — ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں — عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی — بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب — ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

اس گیارہ شعر کی غزل کو پڑھئے اور ان گیارہ سطروں کو جو میں ہوا ناکٹ کے تبصرے سے اوپر نقل کر آیا ہوں اس کے بعد فیصلہ کیجئے کہ افراسیابیت کس کے حصے میں زیادہ آئی ہے۔ یہ ایک ہی غزل دیوان بھر میں نہیں ہے، جس میں زبان کی سادگی اور مضامین کی لطافت دوش بدوش نظر آتی ہیں۔ اسی قسم کی غزلیں زیادہ تر

دیوان میں ہیں، جن کی نقل کرنا یا ان کی طرف اشارہ کرنا اس لئے غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُردو داں طبقہ میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے دیوان غالب نہ پڑھا ہو۔

مولٰنا نکہت کا دوسرا اعتراض یہ ہے جو کلام فارسی ترکیبوں کے الزام سے بچ جاتا ہے اس میں سے بہت کچھ عامیانہ مذاق اور پامال مضامین پر مشتمل ہے۔ غالب اور عامیانہ مذاق! عامیانہ مذاق کا مشاہدہ منظور ہو تو پرانے اساتذہ کے ضخیم دیوانوں کی ورق گردانی کیجئے جہاں ہر صفحہ پر دس یا پانچ اشعار عامیانہ مذاق کے مل جاویں گے مگر غالب کے تو کل دیوان میں بھی دس پانچ اشعار ایسے نہ نکلیں گے۔ عامیانہ مذاق سے متنفر ہونے کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ غالب کا ابتدائی کلام ایک نامانوس طرز ادا لئے ہوئے ہے۔ پرانے شعرا میں غالب ہی ایک تنہا شاعر ہیں جو عامیانہ مذاق سے کوسوں دور بھاگتے ہیں، اور پامال مضمون کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی گناہ سمجھتے ہیں۔

مولٰنا نکہت کا سب سے اہم اعتراض یہ ہے کہ غالب نے اپنے دیوان کی تزئین اِدھر اُدھر سے مانگے تانگے اشعار سے کی ہے یا ترکانہ غارتگری کر کے۔ غالب ایسے اعلیٰ مرتبہ شاعر پر چوری کا الزام لگانا یقیناً دیدہ دہنی ہے اور اس دریدہ دہنی کے مرتکب صرف مولٰنا نکہت ہی نہیں ہوئے بلکہ اُن سے پہلے بھی کچھ لوگ بھی، الزام عائد کر کے ناموری حاصل کر چکے ہیں۔ اگر یہ الزام صرف گمنامی سے نکلنے اور ناموری حاصل کرنے کے لئے لگایا جاتا ہے تو خیر غالب کے طفیل میں دس بیس لوگ منظرِ عام پر آ جائیں تو کسی کا کیا نقصان ہے۔ لیکن اگر اس الزام سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ غالب اس لومڑی کی سی خاصیت رکھتے تھے جو شیر کے شکار سے بچے ہوئے ٹکڑوں پر گزارہ کرے۔ یا وہ اُن لوگوں میں سے تھے جو رہزنوں کی طرح اِدھر اُدھر مار کر اپنا کام چلائیں تو لازم آتا ہے کہ اس الزام کا جواب مفصل دیا جائے۔ گو بہترین جواب ایک حقارت آمیز بے التفاتی ہی سے دیا جا سکتا ہے۔

جس طرح تمام دنیا کے انسانوں کے جذبات و خواہشات، حرکات و سکنات، عادتیں، خصلتیں اور ضرورتیں قریب قریب یکساں ہوتی ہیں اسی طرح خیالات بھی مماثل و مشترک ہوتے ہیں۔ کالیداس کے چند خیالات شیکسپیر کے کلام میں ملتے ہیں حالانکہ شیکسپیر کو نہ کالیداس کی تصنیفات کا علم تھا اور نہ وہ کالیداس سے واقف تھا کیا اس مشابہت سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ شیکسپیر نے کالیداس کے خیالات چرائے۔ اگر خیالات کی مشابہت سے سرقہ کا الزام لگایا جا سکتا ہے تو شاید ہی دنیا کا کوئی شاعر ایسا ہو گا جس پر یہ الزام عائد نہ ہو سکے سعدی اور حافظ کے کلام میں بہت سے وہ خیالات ملیں گے جو متقدمین ادا کر گئے ہیں۔ میر، سودا، ذوق، مومن، ناسخ، آتش، انشا، مصحفی، غرض کسی شاعر کا کلام پیش نہیں کیا جا سکتا [illegible] متقدمین کے خیالات کا چربہ نہ پایا جاوے۔ البتہ جس طرح باد جود [illegible] مشابہت کے ہر انسان کی [illegible]

غرض ہر چیز دوسرے انسان سے مختلف ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر شاعر کا طرز بیان اور تخیل دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ دو مضمون نگاروں کو ایک ہی مضمون پر لکھنے کو کہا جاوے۔ دو شاعروں کو ایک ہی خیال نظم کرنے کو دیا جائے۔ دو مصوروں سے ایک ہی شخص کی تصویر کھنچوائی جائے، مگر دونوں مضامین، دونوں اشعار، دونوں تصویروں میں ایک نمایاں فرق ہوگا۔ اور یہی فرق ان کی شخصیت اور انفرادیت قائم کرتا ہے۔ مولانا آزاد نے آب حیات میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک مشاعرہ میں ذوق شریک ہوئے، ان کی غزل کا ایک شعر تھا۔ ۵

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات ہنس کر گزار یا اُسے رو کر گزار دے

ان سے پہلے ایک اور شخص نے اسی مضمون کا شعر پڑھا۔ ذوق اس کشش و پنج میں پڑ گئے کہ اپنا شعر پڑھیں یا نہ پڑھیں، اپنے ایک دوست سے رائے لی اُنھوں نے کہا کہ تمہارا شعر بہت بلند ہے ہر چند کہ مضمون وہی ہے مگر تمہارے طرز بیان نے مضمون کو آسمان پر پہونچا دیا ہے، چنانچہ ذوق نے شعر پڑھا اور آج یہ شعر زبان زد خاص و عام ہے لیکن اس دوسرے شعر کا کسی کو علم تک نہیں۔

مولانا نکہت نے غالب کے بارہ اشعار کارکانہ غارتگری کے ثبوت میں پیش کئے ہیں۔ ان بارہ میں سے ۹ کے متعلق ان کا خیال ہے کہ ذوق، مومن اور ناسخ کے یہاں سے چرائے گئے ہیں۔ یہ تینوں شعراء اور غالب ہمعصر تھے۔ اگر دو شاعروں کے یہاں یکساں مضامین پانے سے یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ایک نے دوسرے سے مضمون اُڑایا ہے تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ ذوق، مومن اور ناسخ نے غالب سے یہ مضامین نہیں لئے بلکہ غالب نے ان سے لئے۔

مولنا نکہت کے پیش کردہ ہم معنی اشعار کے طرز ادا میں صاف وہ فرق جھلک رہا ہے جو غالب اور اُن شعراء کے مراتب میں ہے۔

غالب:۔ میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

ذوق:۔ کہتے ہیں مر جائیں گر چھٹ جائیں غم کے ہاتھ سے پر ترے غم سے ہمیں مرنے کی بھی فرصت نہیں

"میں نے چاہا تھا" میں جو اظہار خواہش ہے وہ "کہتے ہیں مر جائیں" میں کہاں اور "اندوہ وفا سے چھوٹوں" اور "چھٹ جائیں غم کے ہاتھ سے" میں تو کوئی نسبت ہی نہیں۔ اندوہِ وفا" کہاں اور "غم کے ہاتھ" کہاں۔ اندوہِ وفا کی ترکیب نہایت دلپذیر ہے اور غالب کے دوسرے مصرعہ میں تو وہ ستم ظریفانہ لطافت ہے کہ حضرت ذوق عمر خضر بھی پاتے تو فراہم نہ کرسکتے۔

غالب:۔ مر گیا صدمۂ یک جنبش لب سے غالب ناتوانی سے حریف دم عیسیٰ نہ ہوا

ذوق:۔ ناتوانی مری مت پوچھ کہوں کیا ہمدم بات کہنے میں مرا دم ہی فنا ہوتا ہے

ان دونوں شعروں کو مولانا نکہت نے خدا جانے ہم معنی کیوں کر سمجھ لیا۔ بیشک دونوں میں ناتوانی ضرور ہے لیکن غالب نے ناتوانی کے خیال کو لیکر کچھ اور ہی کہا ہے۔ یعنی یہ کہ ہر چند مسیحا موجود تھا اور مسیحائی کرنا چاہتا تھا مگر میری ناتوانی کے آگے مسیحائی کارگر نہ ہوئی۔

مومن کے یہاں یہ خیال کہاں ہے۔ غالب نے اپنی ناتوانی سے ایک نادر مضمون اختراع کیا ہے اور مومن نے صرف ناتوانی پر زور دیا ہے۔ اسی قسم کے ہم معنی اشعار فارسی شعرا کے بھی مولانا نکہت نے درج کئے ہیں۔

غالب۔ بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں ... غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یوں

غنی:۔ بوسہ بدہ بہ پیش او بر لب من کہ ایں چنیں ... گرچہ مسیح پُر سدت مُردہ چگونہ زندہ شد

غالب نے بوسہ ملنے کی اُمید میں معشوق سے پوچھا کہ بوسہ کسے کہتے ہیں اس نے دور سے دہن کو غنچۂ ناشگفتہ بناکر دکھا دیا۔ اس پر غالب کہتے ہیں کہ دُور سے بتایا تو کیا منہ سے بتاؤ تو ہم جانیں۔ غنی بھی بوسہ کا خواہشمند ہے مگر وہ غالب کی طرح معشوق کی سادہ لوحی یا معصومیت پر بھروسہ نہیں کرتا کہ شاید بتلانے میں بوسہ ہی دیدے۔ غنی اس کے خودپسندی اور فوقیت کے جذبہ کو اُبھارتا ہے اور کہتا ہے کہ مسیح کے سامنے میرے لب پر بوسہ دو تاکہ وہ بھی دیکھے کہ تم مُردوں کو کیسے جلاتے ہو، یہ دونوں اشعار ہرگز ہم معنی نہیں ہیں۔

ہم کو یہ ماننے میں بالکل تامل نہیں کہ غالب کے کچھ اشعار دوسرے شعرا کے اشعار سے مضمون میں ملتے ہیں مگر اس سے نہ سرقہ کا الزام عائد ہوتا ہے نہ ترکانہ غارتگری کا۔ اس امر کے سمجھنے کے لئے مستند شعرا کے ہم معنی اشعار پر غور کرنا چاہئے کہ انھوں نے کس حد تک مماثل و مشترک مضامین کا اعادہ کرنا جائز رکھا ہے اور کیا اسالیب بیان اختیار کئے ہیں۔ ہم معنی اشعار کی چند مثالیں۔

(۱) عمر خیام۔ جمعے متفکر اند از مذہب و دین ... جمعے متحیر اند در شک و یقین

ناگاہ منادیٔ بر آید ز کمین ... کاے بیخبراں راہ نہ آنست و نہ ایں

عرفی:۔ فقیہا دفترے را می پرستند ... حرم جویاں درے را می پرستند

بر افگن پردہ تا معلوم گردد ... کہ یاراں دیگرے را می پرستند

قریب قریب اس مضمون کو خواجہ حافظ نے یوں ادا کیا ہے:۔

حافظ۔ کس ندانست کہ منزلگہ مقصود کجاست ... ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

(۲) عمر خیام:۔ روزے کہ گزشتہ است ازو یاد مکن ... فردا کہ نیامدہ است فریاد مکن

بر نامدہ و گزشتہ بنیاد مکن ... حالے خوش باش و عمر بر باد مکن

حافظ۔ مطربا مجلس انس است غزلخوان و سرود ... چند گوئی کہ چنیں است و چناں خواہد بود

(۳) خسروؔ۔ مرداں در من و بیہوشی من حیراں اند   من دراں کس کہ ترا بیند و حیراں نشود

جوشؔ۔ اس کی صورت کو بہت غور سے میں نے دیکھا   سرسری طور سے جس نے تری صورت دیکھی

(۴) سعدیؔ۔ گفتہ بودم چو بیائی غم دل با تو بگویم   چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

میرؔ۔ کہتے تھے کہ یوں کہتے یوں کہتے اگر آتا   سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

(۵) سعدیؔ۔ دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم   باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

میرؔ۔ پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ   اُن سے بھی تو پوچھئے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

(۶) سعدیؔ۔ گر دلے داری بہ دلدار سپار   ضائع آں کشور کہ سلطانش نیست

حافظؔ۔ اے دل بکوئے عشق گذارے نمی کنی   اسباب جمع داری و کارے نمی کنی

(۷) خسروؔ۔ لب دہان و رخت ہر یکے بلائے دل اند   یکے دلم چہ کند جانب کدام شود

نظیریؔ۔ ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم   کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

(۸) حافظؔ۔ ترا حیا و مرا آب دیدہ شد غماز   وگرنہ عاشق و معشوق راز دارانند

حالیؔ۔ تم کو ہزار شرم سہی مجھکو لاکھ ضبط   اُلفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

(۹) غالبؔ۔ گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق   پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

مومنؔ۔ شب تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے   کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

(۱۰) سعدیؔ۔ بہ لطف دلبر من در جہاں نہ بینی کس   کہ دشمنی کند و دوستی بیفزاید

حافظؔ۔ دردم از یار است و درماں نیز ہم   دل فدائے او شد جان نیز ہم

(۱۱) حافظؔ۔ در عشق خانقاہ و خرابات شرط نیست   ہر جا کہ ہست پرتو روئے حبیب ہست

عرفیؔ۔ عارف ہم از اسلام خراب است و ہم از کفر   پروانہ چراغ حرم و دیر نداند

(۱۲) فیضیؔ۔ کعبہ را ویراں مکن اے عشق کانجا یک نفس   گہ گہے پس ماندگان راہ منزل می کنند

نظیریؔ۔ حور و جنت جلوہ بر زاہد دہد در راہ دوست   اندک اندک عشق بر راہ آورد بیگانہ را

(۱۳) خسروؔ۔ جاں ز نظارہ خراب و نازِ او زاندازہ بیش   مایہ بوئے مست و ساقی پُر دہد پیمانہ را

نظیریؔ۔ ہرگز عطائے ساقیٔ ما را کرانہ نیست   از تنگ ظرفی است کہ پیمانہ پُر شود

(۱۴) حافظؔ۔ شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل   کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحلہا

نظیریؔ۔ بہ زیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را   نوا گراں نخوردہ گزند را چہ خبر

ان دونوں اشعار کے الفاظ میں کوئی مشابہت نہیں لیکن خیال ایک ہی ہے یعنی [illegible] کیا جانے۔

(۱۵) غالب: آشنا با نہ کشد خارِ رہت دامنِ ما　　گوئی ایں بو وا زیں بیش بہ پیراہنِ ما
جگر: نظر سے ان کی پہلی ہی نظر یوں مل گئی اپنی　　کہ جیسے مدتوں سے تھی کسی سے دوستی اپنی

ان دونوں اشعار میں مضمون مشترک ہے گو طرزِ ادا بہت مختلف ہے۔

(۱۶) غالب: دو فتنہ برق نہفتند در کفِ خاکے　　بلائے جبرے کہ رنجِ اختیار کیے
فانی: فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی　　سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں
(۱۷) غالب: واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ　　مجھ کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر
اصغر: نگہِ ناز کو یہ بھی تو گوارا نہ ہوا　　اک ذرا درد میں ملتی تھی جو راحت مجھ کو
(۱۸) غالب: ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں　　جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر
اصغر: چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے　　اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے
(۱۹) غالب: رہے آزردہ ہم اُس شوخ سے چندے تکلف سے　　تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی
اصغر: کیا کیا ہیں دردِ عشق کی فتنہ طرازیاں　　ہم التفاتِ خاص سے بھی بدگماں رہے
(۲۰) اقبال: بے دھڑک کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق　　عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
اصغر: نگاہِ عشق تو بے پردہ دیکھتی ہے اُسے　　خرد کے سامنے اب تک حجابِ عالم ہے

یہ چند ہم معنی اشعار میں نے محض حافظہ سے لکھ دیے ہیں۔ اگر جستجو کی جائے تو سیکڑوں ہزاروں ایسے اشعار فراہم کئے جا سکتے ہیں۔ پس اگر مولانا نکہت کے اصول کو قاعدہ کلیہ تسلیم کیا جائے تو شاید ہی کوئی شاعر سرقہ اور غارتگری کے الزام سے بری رہ سکے۔

مولانا نکہت کے نزدیک غالب نے اُردو شاعری اِس لئے کی کہ لوگ تمام عمر بھول بھلیاں میں پھنسے رہیں۔ مگر پھر خود ہی مولنا موصوف فرماتے ہیں کہ مرزا کے احباب بھی مرزا کی طرح باکمال اور رمز شناس تھے، ان کی نمایش پر مرزا "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" کہہ کر ٹال دیتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نکہت کی نظر سے غالب کے خطوط کا مجموعہ نہیں گزرا۔ غالب نے اپنے رمز شناس اور باکمال احباب کو اکثر اپنے اُردو کے اشعار لکھ کر بھیجے ہیں۔ اگر تحسین و آفریں کے عوض فہمایش کا ڈر ہوتا تو نہ تو غالب ان بھول بھلیاں میں پھنسانے والے اشعار خطوط میں لکھتے اور نہ دیوان مرتب کرنے اور شائع کرانے کی زحمت گوارا کرتے۔ مولانا نکہت کی یہ ریسرچ (RESERCH) گو بہت اوریجنل (ORIGINEL) ہے، مگر قابلِ پذیرائی نہیں۔

جناب مصنف یعنی حکیم سید اعجاز احمد عجز سہسوانی نے بھی مولانا نکہت کی طرح غالب کو یکسر اُردو شعراء کے زمرے سے خارج نہیں کیا مگر ان کو اس کا ملال ہے کہ غالب کے کلام نے اتنی شہرت کیوں حاصل کی۔ ان کو

بنائے عصر کی کوتاہی نظر پر تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے مرزا غالب کے کلام کا نمونہ اُن کی اُردو شاعری قرار دے کر اُن کے بلند مرتبہ کو پست کرنے کی کوشش کی ہے۔ غنیمت ہے کہ غالب کے بلند مرتبہ کا اقبال تو کیا حکیم معجز صاحب کو یہ امر شاق ہے کہ مومن کا دیوان موجود ہوتے ہوئے لوگ غالب کا اُردو دیوان کیوں پڑھتے ہیں" اسکے جواب میں غالبًا یہ سوال کرنا بیجا نہ ہوگا کہ توریت و انجیل کی موجودگی میں لوگ قرآن کیوں پڑھتے ہیں۔

جناب معجز نے بھی بغیر غارتگری اور سرقہ کے الفاظ استعمال کئے ہوئے) یہ دکھایا ہے کہ غالب کے متعدد اشعار کا ماخذ پُرانے شعراء کے اشعار ہیں۔ اس موضوع پر مفصل بحث اوپر کی جا چکی ہے۔ یہاں صرف دو اشعار غالب کے اور دو اشعار میر کے جو حکیم صاحب نے غالب کی شاعرانہ پستی ثابت کرنے کی غرض سے سپرد قلم فرمائے ہیں مع حکیم صاحب کے نوٹ کے پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

غالب:۔ تھی خبر گرم اُن کے آنے کی   آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
میر:۔ تیز یوں ہی نہ تھی شب آتش شوق   تھی خبر گرم اُن کے آنے کی
غالب:۔ لکھتے رہے جنوں میں حکایاتِ خوں چکاں   ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
میر:۔ رہ گیا اس طرف کا خط لکھنا   ہاتھ جب تک مرا قلم نہ ہوا

حکیم صاحب رقمطراز ہیں "آخری دو شعروں میں مرزا صاحب نے میر کے چراغ سے چراغ جلایا ہے، لیکن افسوس ان سے بجائے نور، ظلمت نمایاں ہے اور بجائے ترقی دینے کے میر کے بلند مضامین کو پستی کا رُخ دکھایا ہے۔ شاید ناحق کوش گروہ اس کو بھی مرزا صاحب کا اعجاز سخن بتائیں۔ اس عبارت کو پڑھ کر بے اختیار مرزا غالب کا یہ مصرعہ یاد آتا ہے۔

ع وائے واژوں روشش دکج نظرے را چہ کند کس

اوّل تو حکیم صاحب نے غالب کے شعر میں یہ اصلاح دی ہے کہ "ہے خبر گرم اُن کے آنے کی" کے بجائے "تھی خبر گرم اُن کے آنے کی" تحریر فرمایا ہے، یہ شعر کسی گزشتہ کیفیت کے بارے میں نہیں کہا گیا جو "تھی" کی ضرورت پیش آتی، بلکہ یہ شعر ان متضاد اور شدید جذبات کی ترجمانی کرتا ہے جو معشوق کے آنے کی خبر اور اپنی بے سروسامانی کی حالت کے احساس سے شاعر کے دل میں پیدا ہو رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میر کا شعر غالب کے اس گرانقدر شعر کے آگے کچھ بھی نہیں ہے۔ میر صرف اتنی سی بات کہتے ہیں کہ چونکہ معشوق آنیوالا تھا اس لئے قدرتًا آتش شوق تیز ہوگئی تھی۔ غالب کے یہاں اس چھوٹے سے شعر میں مختلف جذبات کی ایک دنیا نظر آتی ہے، وہ عاشق جو محبوب کے دیدار کو ترستا ہو۔ دفعتًا سُنتا ہے کہ محبوب اس کے یہاں آنیوالا ہے اس خبر سے جو خوشی عاشق کو ہوئی ہوگی اس کا اندازہ صرف عاشق ہی کماحقہ کر سکتا ہے مگر جب عاشق اپنے

گھر کی بے سروسامانی دیکھتا ہے تو اس کا دل بیٹھ جاتا ہے اور سوچنے لگتا ہے کہ خدایا اس محبوب کو جو میرے لئے تمام دنیا سے زیادہ ہے کہاں بٹھاؤں گا اور کیسے اس کے مرتبہ اور اپنے حوصلہ کے مطابق اس کی خاطر مدارات کروں گا۔ یہ فکر اُس بے انتہا خوشی پر جو معشوق کے آنے کی خبر سے ہوئی تھی غالب آنے لگتی ہے اور عاشق ایک عجیب کشمکش میں پڑجاتا ہے ان تمام مختلف جذبات کو ان تھوڑے سے الفاظ میں ادا کردینا واقعی اعجاز بیان ہے مگر حکیم صاحب کو سوائے پستی کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ دوسروں کو ناحق کوش جانتے ہیں۔ غالب کا دوسرا شعر بھی میر کے شعر سے بڑھا ہوا ہے مگر حکیم صاحب کو کوئی کیسے سمجھائے۔

اسی قسم کی جانب داری سے اُنھوں نے مومن سے مقابلہ کرنے میں بھی کام لیا ہے۔ "عتاب میں" "عذاب میں" والی زمین میں غالب اور مومن دونوں نے دو دو غزلیں کہی ہیں۔ تعداد کے لحاظ سے مومن کے اشعار زیادہ ہیں، مگر غالب کے صرف دو شعر مومن کی دونوں غزلوں پر بھاری ہیں۔

غالب۔ لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا   لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

〃 مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام   ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

ان کے علاوہ متعدد اشعار غالب کے یہاں ایسے ہیں جن کے جواب میں مومن کا کوئی شعر پیش نہیں کیا جاسکتا مثلاً

غالب۔ تا نیند انتظار میں آئے نہ عمر بھر   آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں   میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

میں اور حظِ وصل، خدا ساز بات ہے   جان نذر دینی بھول گیا، اضطراب میں

رَو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھئے تھمے   نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

حکیم صاحب نے جو فیصلہ دیا ہے وہ یہ ہے کہ مومن کے اشعار غالب کے اشعار سے بہت بڑھے ہوئے ہیں، ان کو تو غالب کے یہاں پستی ہی پستی اور مومن کے یہاں بلندی ہی بلندی نظر آتی ہے، پھر انسان کو دخل کیسے دیتے۔ مولانا حالی نے پہلے شعر یعنی "لاکھوں بناؤ، عتاب میں" پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اُردو ادب میں شاید ہی دس پانچ شعر اس مرتبہ کے ملیں، مگر مولانا حالی یا عبدالرحمن بجنوری کی سند بھی کوئی سند ہے۔ مولانا حالی تو غالب کے شاگرد تھے اس لئے انکی شہادت تسلیم نہیں کیجاسکتی۔ رہے ڈاکٹر عبدالرحمن ان کے تو ایمان میں خلل تھا کیونکہ اُنھوں نے تو دیوان کو مقدس اور الہامی کتاب لکھا ہے۔

حکیم منجز صاحب کی جانبدارانہ تنقید کے دو ایک نمونے اور ملاحظہ ہوں:۔

غالب۔ کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ   ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

مومن۔ توبہ کرکے نہیں مجھے نادم ہوں یہ ممکن ہی نہیں   گر وہ ہونگے بھی تو بے وقت پشیماں ہونگے

غالب کے شعر کی خوبی کا اندازہ صرف اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ شعر بچہ بچہ کی زبان پر ہے، اور مومن کا شعر مولنا نکہت اور حکیم معجز کے علاوہ غالبًا کسی کو یاد نہ ہوگا۔ مگر حکیم صاحب کا مغالطہ یہ ہے کہ مومن کے شعر میں غالب کے شعر سے زیادہ بلاغت ہے (اگر بلاغت بلغم کے قسم کی کوئی چیز ہے تو ضرور ہے)

غالب۔ وہ آیا بزم میں، دیکھو، نہ کہنا پھر کہ غافل تھے شکیب و صبر اہل انجمن کی آزمایش ہے

مومن۔ اے ناصحا آ ہی گیا وہ فتنۂ ایام لو مجھ کو کہتے تھے بھلا اب تم تو دل کو تھام لو

حکیم صاحب کو غالب کا شعر سست اور مومن کا شعر حسن بیان کا معجزہ معلوم ہوتا ہے، انکا خیال ہے کہ "ایسے مایۂ ناز اشعار استادوں کو بھی مشکل سے ہاتھ لگتے ہیں"۔ اب اس کے آگے کوئی کیا کہے۔

غالب۔ وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

مومن۔ خلاف وعدۂ فردا کی ہمکو تاب نہیں امید یکشبہ ہے یا ہیں جاوداں کے لئے

حکیم صاحب رقمطراز ہیں کہ "مرزا نے قلم کو اُٹھا کے عمر جاوداں لکھدیا اور خضر کا تخئیل اس کے ساتھ ہی ذہن میں آگیا، مگر مومن خاں نے جو مضمون تغزل کے پابند ہیں اس میں وقتِ نظر سے کام لیا ہے۔" افسوس کہ حکیم صاحب نے غالب کے اس نادر شعر کو بھی قافیہ پیمائی کہہ کے ٹال دیا۔ ایسا انوکھا خیال فراہم کرنے میں شاعر نے کیا کیا عرقریزی نہ کی ہوگی، مگر وہ ہندی کی مثل کیا ہے، بھینس کے آگے .... حکیم صاحب نے کتاب کے اختتام پر غالب کے ساتھ ساتھ میر کی بھی قلعی کھول کر رکھدی، کہتے ہیں "ذوق سلیم سے کام لیا جائے تو شعر اُردو کا اعلیٰ سرمایہ مومن کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا۔

مرزا نے آخر میں کچھ غزلیں میر کے انداز میں لکھی اور زبان کی سلاست کو مدنظر رکھا لیکن کسی نے ان کو میر کا ہم پلہ تسلیم نہیں کیا۔ خود میر کی یہ حالت ہے کہ ان کے چھ دیوانوں میں ٹھکانے کے شعر سوسوا سو سے زیادہ نہیں ہیں۔ باقی تمام ذخیرہ فحش و ہزل اور انتہا درجہ کا پست کلام ہے۔ حکیم صاحب کا مقصد یہ ہے کہ جب میر کے یہاں جن کی پیروی غالب نے کی ہے صرف سوسوا سو شعر ٹھکانے کے ہیں تو غالب کے یہاں دس بیس بھی مشکل سے نکلیں گے۔ اس لئے ان کا قطعی فیصلہ ہے کہ مومن کے علاوہ اچھے اشعار کا سرمایہ کہیں نہیں مل سکتا۔

افسوس کہ اُردوداں طبقہ کا فیصلہ اس کے برعکس ہے۔ کسی شاعر کے مرتبہ کا صحیح اندازہ جانبدارانہ مضامین اور کتابوں سے نہیں ہوا کرتا بلکہ اس کے کلام کی مقبولیت صحیح کسوٹی ہوتی ہے۔ غالب کے اُردو دیوان کے جتنے نسخے اب تک بک چکے ہیں، مومن کے کلیات کے شاید کئی صدیوں میں بھی نہ بکیں۔ اسی کا تو مولنا نکہت و حکیم معجز کو قلق ہے واقعی یہ امر علامات قیامت میں سے ہے۔ جن حضرات کی نظر سے مومن کی مثنویاں گذری ہیں ان سے مخفی نہ ہوگا کہ مومن خاں فحش گوئی میں نہایت بلند پایہ رکھتے ہیں [illegible] خواب و خیال

کے علاوہ اُردو شاعری میں کسی اور کا کلام مومن خاں کی مثنویوں کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ سخت حیرت کی بات ہے ایک مومن خانی کو میر کی نخش گوئی پر حرف گیری کرنے کی کیسے جرأت ہوئی جبکہ بیچارے میر مومن خاں کے آگے ایک طفل مکتب سے زیادہ نہیں۔ یہ جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی غرض صرف اتنی ہے کہ تنقید میں جب جانبداری کی پٹی آنکھ میں باندھ لی جاتی ہے تو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ یہ تو دوسری بات ہے کہ کوئی مومن کے اشعار سے زیادہ محظوظ ہو اور کوئی غالب کے اشعار سے۔ مگر غالب کو مہمل گو، ہرزہ سرا۔ ابتذال پسند، عامیانہ مذاق، کا شیدائی، چور اور قزاق کہنا اپنی بے بضاعتی کا ڈنکا پیٹنا ہے۔ میر و سودا۔ انشا و مصحفی، ناسخ و آتش، ذوق و مومن۔ سب اپنے اپنے زمانہ میں استاد سمجھے گئے ہیں اور اب بھی سمجھے جاتے ہیں۔ مگر غالب کی جو قدر و منزلت ان کی زندگی میں اور اس سے زیادہ اس کے بعد ہوئی، شاید کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوئی یہ غالب ہی تھے جن کا ایک ایک خط ہندوستان کے ہر ہر گوشہ میں ڈھونڈھا گیا اور جہاں کہیں ملا اس کو عجیب نعمت سمجھ کر آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کیا گیا۔ غالب کی عظمت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ اور یہ بے وجہ نہیں۔ "بھول بھلیاں میں پھنسانے والے" اشعار میں یہ قدرت نہیں ہو سکتی کہ جب لوگ ان کو پڑھیں تو وجدانی کیفیت میں چلا اٹھیں کہ یہ تو الہامی کلام ہے۔

مومن خاں اُردو کے بہت بڑے غزل گو شاعر ہیں، مگر غالب سے ان کو شاید وہی مناسبت ہے جو ہمالہ کو آلپس سے۔ بہر حال یہ میری رائے ہے اور میں اپنی رائے اوروں سے منوانے کے لئے دوسروں کی طرح زمین اور آسمان کے قلابے نہیں ملانا چاہتا اور نہ میں غالب کے متعلق کوئی اس قسم کی ریسرچ کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے بھول بھلیاں میں پھنسانے کے لئے اپنے اشعار کا طرز بیان دانستہ پیچیدہ رکھا ہے۔

افکار طالب

از جناب طالب [illegible] بی اے ایل ایل بی

باغ جہاں میں محرم دل بن سکا حیف!	تھے راز گو ہزار کوئی رازداں نہ تھا
باغ وطن کو دیکھ کے ہوتا ہے یہ گماں	اس باغ کا ازل سے کوئی باغباں نہ تھا
اک اک قدم پہ پرسش صیاد و باغباں	گویا چمن میں اپنا کوئی آشیاں نہ تھا
افشائے راز کی بھی نہ حسرت نکل سکی	شایان راز یار کوئی رازداں نہ تھا

عرض نیاز شوق میں ممکن تھی کب کمی
[illegible] تھا

آسام کے دلکشا نظارو

از جناب محمد ہادی حسین، انڈین سول سروس (آسام)

آسام کے دل کُشا نظارو! دریاؤ، پہاڑو، سبزہ زارو!
تم اپنی جگہ بہت حسیں ہو، لیکن پنجاب سے نہیں ہو
با وصفِ ہزار دلربائی، تم میں نہیں بوئے آشنائی،
ہے جس کے بغیر پھول بھی خار اور جس کے طفیل دشت گلزار،
وہ بُو کہ مشامِ جاں میں آکر دیتی ہو کوئی پیام لاکر،
وہ بُو جسے یاد کی ہوائیں ماضی کے بوستاں سے لائیں
کیا جانے وہ ہے کہ کچھ نہیں ہے، خاکِ وطن اُس سے عنبریں ہے
میرے لئے خاک میں وطن کی بُو ہے یوسف کے پیرہن کی
وہ خاک ذرا سی کوئی لادے، آسام کی خاک میں ملادے،
اس دیس میں تاکہ رہ سکوں میں، پردیس کو دیس کہہ سکوں میں

تاج محل کی تشکیل

از جناب ضیاء الدین صاحب برنی، بی۔ اے

شاہ جہاں، صاحب قرآن ثانی۔ ۱۶۳۱ء کی ایک شام کو اپنے آگرہ کے محل میں نہایت رنج و غم کی حالت میں بیٹھا تھا۔ اس کی چہیتی بیوی ارجمند محل کی ملکہ اُس کی جان کا آرام، اُس کے دل کا سرور، اُس کی روحانی مسرتوں کا بہترین ارضی مجسمہ، اُسے داغ مفارقت دے چکی تھی۔ آہ، اے زندگی! تو بھی کس قدر اندھی اور جمہوریت پسند چیز ہے! تو تیمور جیسے آہنی انسان کی اولاد کو بھی رلواسکتی ہے، ہر ایسے مزدور کی طرح جو کھیتوں میں کام کرتا ہو یا بازار میں پھیری کرکے اپنی روزی کماتا ہو، اس کا دل اپنے ادنیٰ سے ادنیٰ غلام کی طرح کچھ اس قسم کے خیالات کی آماجگاہ تھا" میری پیاری بیوی پہلی سی جسمانی صورت میں واپس نہ آئیگی۔ وہ اللہ کی پیاری ہوگئی۔ اس کے ہاں بہشت میں سیر کو چلی گئی، وہاں وہ اس وقت میرا انتظار کریگی، جب تک کہ میں یہ مٹی کا چولا اُتار کر نہ پھینکدوں؛ اس خیال سے مجھے کچھ تسکین ضرور ہوتی ہے کہ میری پیاری عالم بالا میں میرا انتظار کررہی ہے لیکن اس سے پوری پوری تسلی نہیں ہوتی، کیونکہ جب تک جان ہے جہان کے جھگڑوں سے چھوٹنا مشکل ہے اسی جہان سے تعلق رکھنا ہوگا۔ اِس لئے میری آرزو ہے کہ یہیں کوئی چیز ایسی ہونی چاہیئے جو دوام تعلقات پر غالب آکر مجھے اس کی یاد دلاتی رہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب میں اپنے ان خیالات کو جو اس کے بارے میں میرے دل میں موجزن ہیں کوئی مادی شکل دیدوں؛

اس خیال کے آتے ہی تخیلہ نے مودبانہ تاجدار ہند کی بارگاہ میں عرض کیا کہ ایک مقبرہ بننا چاہیئے جو جہاں پناہ کی محبوبہ ناز آفریں کے تن نازک کی امانت کا بار اُٹھا سکے، جو شاہ جہاں، صاحب قرآن ثانی کی شریک حیات کے شایانِ شان ہو۔ وہ محبوبہ ناز آفریں وہ شریک حیات کون تھی؟ ایک ایسی ہستی کی محبوبہ اور شریک حیات، جس کی نظروں میں صناع قدرت کے وہ تمام حسین مجسمات جو اُس وقت تک تماشاگاہ عالم میں جلوہ افروز ہوچکے تھے، کتاب حسن کا محض دیباچہ تھے۔ اس کے باپ اور سوتیلی ماں نے بنی نوع انسان کی ترقی اور "جنت نگاہ" کی تخلیق کے لئے بہت کچھ کام کیا تھا۔ اس طرح اس کے دادا نے بھی جو شریف ترین انسان تھا۔ پھر تیمور نے بھی جو خاندان مغلیہ کا واجب الاحترام بزرگ تھا، سمرقند میں دنیا بھر کی سمیٹی ہوئی دولت سے ایک رشک فردوس محل اور مسجدیں تعمیر کی تھیں۔ لیکن اس کے لطیف ترین مذاق نے اِن میں سے کسی عمارت کو پسند نہ کیا۔ بعض سے زندگی کی لطافتوں کی بجائے سطوت و جبروت کا اظہار ہوتا تھا۔ بعض کچھ خوشنما بھی تھیں لیکن انکی بلندی

سے رفعت آسمان کا احساس نہ پیدا ہوتا تھا اور نہ وہ اپنی شوکت سے سیاروں اور ستاروں کی ضیا باری پر چشمک زن تھیں۔ مغلوں کے علاوہ اور بھی قومیں تھیں۔ مثلاً ایرانی جو ادراک حسن سے بے بہرہ نہ تھے، مگر اس کی طاقت کی بلند پروازیوں کے اظہار سے قاصر تھے۔ یونانی جن پر اس وقت ترک حکمراں تھے، بلا شبہ اس میدان میں بہت کچھ کام کر چکے تھے لیکن انھوں نے اُسے یا تو بھدّے طریقہ سے انجام دیا تھا یا اسے دل سے جو بوڑھا ہو چکا تھا، اس کے علاوہ عرب بھی تھے، بالخصوص بغداد اور اسپین کے عرب۔ انھوں نے حسن اور شوکت دونوں کو سمو دیا تھا۔ لیکن افسوس کہ وہ اکثر اوقات اچھا مسالہ استعمال نہ کر سکے۔ اس کے علاوہ ان کی تعمیر کردہ بہت سی عمارتیں مغربی بربریت اور تعصب کے ہاتھوں تباہ بھی ہو چکی ہیں، بعینہٖ جس طرح قبل از اسلام کے ایران کی بہت سی عمارتیں سکندر اعظم کے وحشیانہ جذبات کے باعث تباہ و برباد ہو گئیں۔

رنگ، اچھا تو میری ارجمند کے مقبرہ کا رنگ کیا ہونا چاہیئے؟ شہنشاہ نے اپنے دل سے سوال کیا، نیلا اور سنہری جسے ایرانی خوب نبھاتے ہیں اور جو آسمان اور آتش پرستوں کے سورج کا مظہر ہے، اور کیا میں الحمرا کے بنانے والوں کی طرح اس میں کچھ سُرخی کی آمیزش بھی کر دوں جو علامت ہے ہمارے گرم خون زندگی کی؟ نہیں، نہیں! رنگ دماغ کی توجہ کو ہٹا دیتا ہے اور خیالات کو خواہ مخواہ الجھن میں ڈال دیتا ہے، اور روح کو اس قابل نہیں رکھتا کہ ذاتِ لامحدود میں داخل ہو سکے تو وہاں وہ عمارت سفید ہو گی، ابدیت کے رنگ کی طرح سفید!

شکل، اس کی شکل کیا ہو؟ عربی یا ایرانی؟ یہ سوال در پیش تھا۔

عین اس وقت گلاب کے عطر کی خوشبو والی ہوا کا ایک جھونکا جو نسیم سحری کی طرح دلآویز و سرد تھا۔ صاحب قرآن ثانی کے دائیں رخسارے کی طرف سے آیا۔ بے اختیار اس کی آنکھیں اُس طرف پھریں جدھر سے وہ جھونکا آیا تھا اور اس نے ایک نہایت خوبصورت نازک اندام پری کو جس کی آنکھیں نہایت مسحور کُن تھیں، اپنے پاس کھڑا پایا۔

"اے کروڑوں انسانوں اور جانوروں کے بادشاہ! میں تجھے ذراسی نصیحت کرنے آئی ہوں، یہ دیکھکر کہ تیرے شاہانہ دماغ میں کیا کیا خیالات آرہے ہیں۔" پری نے کہا۔

"اے حسین ترین مخلوق، بول، بول، میں شہنشاہ عالم، شاہ جہاں، تجھے لب کشائی کا حکم دیتا ہوں۔"

"لامحدود دولت کے مالک! تجھے معلوم ہے کہ اگرچہ پیدائش کے لحاظ سے میں آتش پرست اور ملحد ہوں لیکن ہزار ہا سال ہوئے کہ میں دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکی ہوں اور اس وقت سے میں لاکھوں کروڑوں فرزندانِ آدم سے بہتر مسلمان ہوں، خواہ وہ عرب ہوں یا ایرانی، مغل ہوں یا ترک۔"

"ہاں میں جانتا ہوں، مجھے اس کا علم ہے" شاہ جہاں نے بے صبری کے لہجہ میں کہا "اچھا تو اب نفس معاملہ کی طرف آ اور مجھے بتا کہ تو مجھے کیا نصیحت کرنا چاہتی ہے؟"

پری نے جواب دیا "جو نصیحت میں کرنا چاہتی ہوں وہ اتنی سی ہے کہ تجھے ایسا مقبرہ بنانا چاہیئے جس سے اسلام کی شان و شوکت ہمیشہ کے لئے دنیا میں قائم ہو جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے تجھے عمارت کی شکل و صورت ایسی رکھنی چاہیئے جو اسلام کی روح کے مطابق ہو"

اس سے پہلے کہ شہنشاہ اس سے اصل مسئلہ پر بحث کرے، پری نظروں سے غائب ہو چکی تھی، اس کے بعد کچھ دیر تک خاموشی رہی، پھر اسے کنول کی خوشبو والی ہوا کا ایک جھونکا آیا اور اب کی بار اس کا بایاں گال متاثر ہوا، اس نے بائیں طرف نظر پھیری اور دیکھا کہ ہندو دیوتا راجہ اندر کے دربار کی ایک نازک اندام رقاصہ اپسرا اس کے قریب اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ کھڑی اور یوں گویا ہے:۔

"میں سورگ سے آ رہی ہوں تاکہ تجھ سے کچھ کہوں، تو حسین چیزوں کا شیدائی ہے۔ میں نے وہیں سے بھانپ لیا تھا کہ اس وقت کون کون سے خیالات تیرے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں"

شاہ جہاں نے شفقت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا:۔ "اے اندر کی آنکھوں کی مسرت، تو مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہے؟ اے بہترین اداکار، بول، اس لئے کہ شہنشاہ عالم شاہ جہاں تجھے ترنم ریزی کا حکم دیتا ہے"

اس نے گھٹنے ٹیک کر پہلے تو نہایت دلربائی سے پرنام کیا اور پھر کہا:۔

"میں سدا سے اسی سرزمین میں رہتی آئی ہوں۔ میں اس وقت پیدا ہوئی تھی جبکہ لوگ اپنے گرد و پیش ہر روز عجیب و غریب واقعات دیکھا کرتے تھے اور لوگوں کے خیالات بہت زیادہ سوچنے کی وجہ سے محدود نہیں ہو گئے تھے۔ اگرچہ اس کے بعد سے ملک کی حالت بہت کچھ تبدیل ہو چکی ہے اور نئی نئی قوموں اور مذہبوں کے لوگ یہاں آ گئے ہیں، تاہم مجھے اس ملک سے اتنی ہی محبت ہے جتنی پہلے تھی۔ اور چونکہ مجھے اس سے بہت زیادہ محبت ہے اس لئے میں تیرے پاس آئی ہوں، کیونکہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تو اپنی چہیتی بیوی کے لئے جو اب خدا کے ہاں سدھار گئی ہے ایک شایان شان مقبرہ بنانا چاہتا ہے، لیکن اس کا خاکہ تیار اور اس کی زیبائش کا انتظام کرتے وقت اس کو نہ بھولنا کہ یہ ہندوستان ہے۔ یہ ایران، شام، مصر یا دنیا کا کوئی اور ملک نہیں، تو بلاشبہ ایسی شکل و صورت کی عمارت بنا سکتا ہے جسے خالصۃً اسلامی کہا جا سکے، مگر باوجود اس کے تو ایسی چیز بھی بنا سکتا ہے جو بالکل ہندوستانی ہو، اگر تو نے یہ پہلو نظر انداز کر دیا تو جان لے کہ تیری یادگار میں روح اور زندگی باقی نہ رہیگی اور محض ناکارہ اور بیکار سی چیز ہو کر

رہ جائے گی۔ وہ ایک ناکام کوشش ہو گی خواہ بظاہر کتنی ہی شاندار کیوں نہ ہو؟

جب شاہجہاں اکیلا رہ گیا تو اس نے کھڑکی سے سامنے بہتے ہوئے دریائے جمنا پر نظر ڈالی اور پری اور اپسرا کے الفاظ پر غور کیا وہ دونوں کا ادب کرتا تھا، کیونکہ اس کی تخلیق تاتار و ہند کے آب و گل سے ہوئی تھی، اس کے بعد وہ دیر تک رات کو بیٹھا سوچتا رہا اور اُن دونوں کے خیالات کے پھولوں سے ایک ہار بناتا رہا جو سدا بہار نکلا!

تاج محل کی تعمیر اس طرح سے ہوئی اور اس میں جہاں عربوں کے فن تعمیر کی صفات، لطافت خوش آہنگی اور شاعری پائی جاتی ہیں وہاں ہندوؤں کے فن تعمیر کی صفات، ذہنی نزاکت اور شان و شوکت اور مضبوطی، بھی جلوہ گر ہیں ۔ (ماخوذ از انگریزی)

ضعیفہ :-

از جناب رفعت سروش صاحب

ایک بڑھیا مغموم، پریشاں بیٹھی ہے سنسان کھنڈر میں
لوٹ رہے ہیں خاک پہ جس کے بال پریشاں گھونگر یالے
بوسیدہ کرتے کے چیتھڑے دوش صبا پر ناچ رہے ہیں،
جیسے میخانے میں جھومیں بادۂ رنگیں کے متوالے

جن آنکھوں نے بخشی ہو گی صحن ہستی کو رنگینی
ان آنکھوں سے جھانک رہی ہے پر حسرت معصوم تمنّا
ان ہونٹوں پر خشکی نے اب اپنے ڈیرے ڈالدئے ہیں
کلیوں اور پھولوں نے جن سے ہنسنا اور کھلنا تھا سیکھا

یہ بڑھیا تصویر حسرت حُسن کی دیوی ہو گی لیکن
وقت کے چنگیزی ہاتھوں نے لوٹ ہی لی رنگین جوانی
انساں کیا ہے؟ ایک کھلونا، جیون کیا ہے؟ رنگیں دھوکا
یہ دنیا ہے ایک نمائش، اس کا ہر منظر ہے فانی

نوائے راز

(از ابو الفاضل راز چاندپوری)

یب دورِ طرب دیگی کیا بہار مجھے — کہ اپنے حُسن نظر پر ہے اعتبار مجھے
بنا کے بگاڑا ہزار بار مجھے — مٹا سکا نہ مگر چرخ فتنہ کار مجھے
ی کا نام اگر جبر ہے تو کیا کہنا — بقدر حوصلہ حاصل ہے اختیار مجھے
لیف راہِ محبت کو مژدہ منزل — بنا دیا مری ہمت نے کامگار مجھے
دعی تھے وہ خوش فہم و خوش نظر نکلے — ملا نہ کوئی بھی فطرت کا رازدار مجھے
ط کار سے بہتر مآل کار نہیں — نشاط کار پہ حاصل ہے اختیار مجھے
رظرف اجازت ہے مجھ کو پینے کی — بقدر ذوق بنایا ہے میگسار مجھے
وش نگاہ، یہ حق بیں، یہ پارسا دنیا — خدا کی شان کہ سمجھے گنہگار مجھے
او راس سے زیادہ میں کہہ نہیں سکتا — بنایا ہے مری فطرت نے بادہ خوار مجھے
ں نہیں، یہ حقیقت نہیں، فسانہ ہے — کہ اپنے قلب و نظر پر ہے اختیار مجھے
صلحت تھی کہ پاس ادب، خدا جانے — مگر خزاں کو سمجھنا پڑا بہار مجھے
ن رازِ محبت، امین رازِ حیات — ملا ہے اک دلِ بیتاب و بیقرار مجھے
ں تو بزم جہاں سے میں اٹھ نہیں سکتا — ابھی تو دید کا اس کی ہے انتظار مجھے
ئی تو بات ہے ورنہ یہ بے رُخی کیسی — عزیز رکھتی ہے شاید نگاہِ یار مجھے

شریک محفلِ رندانِ پاکباز ہوں میں
دیا ہے رازؔ خدا نے یہ افتخار مجھے

(از جناب آئل نقوی معتمد انجمن ترقی اُردو بھوپال)

دل سوزشِ فرقت میں جلایا نہ کرو تم ۔۔۔ یہ نازِ محبت کے اُٹھایا نہ کرو تم
بہتر تو یہی ہے کہ جلے گھر نہ کسی کا ۔۔۔ لگ جائے اگر آگ بجھایا نہ کرو تم
بے پردہ اگر سامنے آنا نہیں منظور ۔۔۔ پردہ سے بھی آواز سُنایا نہ کرو تم
نازک دلِ معشوق سے ہے خاطرِ عاشق ۔۔۔ مجبورِ محبت کو ستایا نہ کرو تم
ہونے لگیں جس سے الم و رنج کی باتیں ۔۔۔ ایسی کوئی تمہید اُٹھایا نہ کرو تم
شکوہ بھی ہے دیوانگیِ شوق کا اک نام ۔۔۔ آجائے جو یہ ذکر بڑھایا نہ کرو تم
ممکن ہے کہ ہو جائے کسی دل کو گماں اور ۔۔۔ ہر روٹھنے والے کو منایا نہ کرو تم
کیا ہوگا اگر دوست کے پردہ میں ہو دشمن ۔۔۔ سائے کو بھی ہمراز بنایا نہ کرو تم
کیا فائدہ افشا جو ہوا رازِ محبت ۔۔۔ آنسو غمِ فرقت میں بہایا نہ کرو تم
آجایا کریں یاد اگر میری وفائیں ۔۔۔ رو رو کے بُرا حال بنایا نہ کرو تم
طعنے نہ کہیں جوششِ الفت کے دئے جائیں ۔۔۔ تنہائی میں نظمیں مری گایا نہ کرو تم
محفل میں اگر شعر کے پڑھنے پہ ہو اصرار ۔۔۔ اشعارِ غم انگیز سنایا نہ کرو تم
ہاں سچ ہے سُنے کیوں کوئی تعریف کسی کی ۔۔۔ ہمجولیوں کی بزم میں جایا نہ کرو تم

رنجور و دل افگار و ستم دیدہ ہے آئل
غمگین اسے اور بنایا نہ کرو تم

اعتراف گناہ

کمرے کی چھت سے سبز شیڈ کا لیپ لٹک رہا تھا جس کی تیز روشنی گویا تاریکی میں مخل ہو رہی تھی، جیسے کوئی اجنبی بھٹک کر کسی غیر مانوس مقام پر آگیا ہو۔ لیمپ کی روشنی ایک مثلثی شکل بناتی ہوئی سفید چادر سے ڈھکی ہوئی ایک گول میز پر پڑ رہی تھی جس پر سال نو کی خوشی میں پنچ تیار کرنے کے لئے مختلف اجزا رکھے ہوئے تھے۔ سبز شیڈ کے نصف سایہ میں دو بوڑھے بیٹھے تھے، پیرانہ سالی سے ان کے شانے جھک گئے تھے اور جسم کانپ رہے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں کسی عمارت کے کھنڈر ہیں جس کو ہوا کا خفیف سا جھونکا بھی تنزلزل کر دیتا ہے۔ مرور ایام سے ان کی بینائی کمزور ہو گئی تھی وہ دھندلی نگاہوں سے نیرنگی عالم کا تماشا دیکھ رہے تھے۔

ان میں سے ایک جو بظاہر میزبان تھا پنشن یافتہ فوجی افسر معلوم ہوتا تھا۔ اس کی مونچھیں نکیلی تھیں، اور ابرو کے خم سے بانکپن ٹپکتا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے جھولے دار کرسی کے ہتوں کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ساکت بیٹھا تھا البتہ اس کے جبڑے چبانے میں مصروف تھے۔ دوسرا شخص جو اس کے نزدیک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ دبلا پتلا اور دراز قامت تھا۔ اس کے سر کی ساخت سے عالی دماغی کا پتہ چلتا تھا۔ وہ اپنے لمبے پائپ سے، جو بجھنے کے قریب تھا کبھی کبھی کش لے لیتا تھا۔ اس کے سفید بالوں سے ڈھکے ہوئے چہرے کی بیشمار جھریوں کے درمیان اس کے لبوں پر ایک ہلکی پرسکون مسکراہٹ کھیل رہی تھی جو عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ فقط صبر و شکر سے راضی برضا رہنے پر نصیب ہوتی ہے۔

دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ کمرے کے سناٹے میں لیمپ کے تیل جلنے کی سنسناہٹ پائپ میں تمباکو جلنے کی دھیمی آواز سے مل جل رہی تھی۔ اسی اثنا میں دیوار کی گھڑی نے گیارہ بجائے۔ "یہی وقت ہے جب وہ پنچ بنانا شروع کرتی تھی!" دبلے و دراز قامت شخص نے کہا، اسکی آواز میں خفیف سا ارتعاش تھا۔

"ہاں، یہی وقت ہے!" دوسرے نے دہرایا، اس کی آواز کرخت تھی اور اس میں فوجی تحکمانہ لہجہ کی جھلک ابھی تک پائی جاتی تھی۔

پہلے نے پھر کہا: "مجھے یہ نہ معلوم تھا کہ اس کے بغیر زندگی اتنی بے کیف ہو جائے گی!"

میزبان نے اعتراف میں سر ہلایا۔ اس کے جبڑے اب بھی حرکت کر رہے تھے۔

"اس نے ہم لوگوں کے لئے چالیس سال تک برابر سال نو کا پنچ تیار کیا!" پہلے نے کہا۔

سن رسیدہ فوجی افسر نے جواب دیا "ہاں ہم لوگوں کو برلن آئے اور تمہاری دوستی کا شرف حاصل کئے ہوئے اتنا ہی زمانہ گزرا۔"

"پارسال اس وقت ہم سب کتنے خوش تھے؟" پہلے نے پھر کہا۔ "وہ اس آرام کرسی پر بیٹھی ہوئی پال کے بڑے لڑکے کے لئے موزہ بُن رہی تھی۔ وہ کتنی منہمک تھی، اس نے کہا تھا کہ اُسے بارہ بجے سے قبل موزہ تیار کرنا ہے اور فی الواقعی اس کے پیشتر ہی اُس نے اپنا کام ختم کر لیا تھا۔ اس کے بعد ہلوگول نے پنج کا ایک ایک جام پی کر نہایت سکون سے موت پر گفتگو کی تھی۔ اس کے دو ہی ماہ بعد وہ خدا کی پیاری ہو گئی۔ تم کو تو معلوم ہے کہ میں نے خیالات کے ابدی وجود پر ایک ضخیم کتاب لکھ ڈالی ہے۔ تم نے کبھی اس کے پڑھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ اور اب جبکہ تمہاری بیوی اس عالم فانی میں موجود نہیں مجھے خود اس میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی۔ سارے عالم کا خیال بھی اب میرے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھ

شوہر نے کہا "ہاں وہ ایک نیک خصلت اور فرض شناس بیوی تھی۔ جب مجھے صبح پانچ بجے اپنی نوکری پر جانا پڑتا تو وہ ہمیشہ مجھ سے پہلے اُٹھ کر میرے لئے قہوہ تیار کرتی تھی تاہم اس میں نقص بھی تھے مثلاً جب وہ تمہارے ساتھ فلسفیانہ گفتگو میں معروف ہو جاتی تب ...."

"تم اسے کبھی نہ سمجھ سکے" دوسرے نے جواب دیا اس کے منہ کے گوشے دبی ناراضگی سے کانپ رہے تھے لیکن اس کی نگاہ، جو دیر تک اس کے دوست کے چہرے پر جمی رہی، اس سے التجائے اظہار تاسف مترشح تھا جیسے کہ اس کی روح پر کسی خفیہ گناہ کا بار ہو۔

کچھ دیر چپ رہنے کے بعد اس نے کہا "فرنیز! میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ جو مجھے بہت دنوں سے پریشان کر رہی ہے اور جس کو میں اپنے ساتھ قبر میں نہیں لیجانا چاہتا ہوں۔"

"تو کہہ ڈالو" میزبان نے کرسی کے پاس رکھے ہوئے لمبے پائپ کو اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"تمہاری بیوی اور میرے درمیان کچھ معاملہ تھا۔"

میزبان کے ہاتھ سے پائپ چھوٹ کر گر پڑا اور اس نے حیرت سے اپنے دوست کی طرف کچھ دیر تک تکنے کے بعد کہا "ڈاکٹر، بس مذاق ہو چکا۔"

دوسرے نے جواب دیا "یہ تلخ حقیقت ہے فرنیز، چالیس سال تک میں نے اس راز کو اپنے میں محفوظ رکھا لیکن اب تم سے کہہ دینے کا وقت آگیا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ مرحومہ نے میرے ساتھ بے وفائی کی؟" شوہر نے تیز و تند لہجہ میں پوچھا۔

"تم کو شرم آنی چاہیئے فرنیز!" دوست نے ایک خفیف غمگین مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

ط FRANZ

سن رسیدہ فوجی افسر نے زیر لب بڑبڑا کر اپنا پائپ جلایا۔

دوسرے نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "وہ جنت کے فرشتوں کی سی معصوم تھی۔ اصل مجرم تو ہم لوگ ہیں۔ تینتالیس سال کی بات ہے، برلن میں کپتان کے عہدہ پر تعینات ہوئے تمکو تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا، میں اس وقت یونیورسٹی میں پروفیسر تھا اور تم ایک رند خوش اوقات۔"

"ہوں" میزبان نے ضعف سے کانپتا ہوا ہاتھ مونچھوں پر پھیرتے ہوئے کہا۔

"تمھیں وہ سیاہ نرگسی آنکھوں اور ننھے چمکدار دانتوں والی حسین ایکٹریس یاد ہے؟"

"یاد کی ایک کہی۔ اس کا نام بیاٹکا تھا اور اس کے ننھے چمکدار دانت کاٹ بھی سکتے تھے" میزبان نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ اس کے چہرے سے ٹپکتا تھا کہ اس نے ہمیشہ رنگ رلیوں میں زندگی بسر کی ہے۔

"تم نے اپنی بیوی سے بے وفائی کی اور اس کو یہ بات معلوم ہوگئی تھی لیکن اس نے اُف تک نہ کی اور خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ میری والدہ کی وفات کے بعد وہ پہلی عورت تھی جو میری زندگی پر پوری طور سے چھا گئی تھی۔ وہ ایک روشن ستارے کی طرح میری زندگی کے آسمان پر طلوع ہوئی اور میں روز اول ہی سے اس کی پرستش کرنے لگا تھا۔ اس کو اندر ہی اندر گھلتے دیکھ کر میں نے ایک بار ہمت کرکے اس سے کہا "تمھارا کیا حال ہوگیا ہے" اس نے مسکرا کر جواب دیا کوئی خاص بات تو نہیں صرف یونہی کچھ کمزوری باقی ہے تمھیں یاد ہوگا کہ یہ بات تمھارے لڑکے پال کی پیدائش کے تھوڑے ہی دنوں بعد کی تھی۔ اس کے بعد سال نو کے قبل شام آئی۔ آج سے ٹھیک تینتالیس سال پہلے ـــ میں حسب معمول آٹھ بجے شب کو تمھارے یہاں آیا وہ کشیدہ کا کام کر رہی تھی اور میں اس کو کوئی کتاب پڑھ کر سنا رہا تھا اور ہم دونوں تمھارا انتظار کر رہے تھے۔ گھنٹے پر گھنٹے گزر گئے لیکن تم نہ آئے۔ میں نے دیکھا کہ اس کی بے چینی بڑھ رہی تھی حتیٰ کہ وہ کانپنے لگی، میرے جسم میں بھی تھرتھری آگئی۔ میں جانتا تھا کہ تم اس ایکٹریس کے پاس ہو اور مجھے خوف تھا کہ تم اس کی آغوش میں نصف شب کا وقت (سال نو کی آمد) بھول جاؤگے۔ اس نے کاڑھنا اور میں نے کتاب پڑھنا بند کردیا۔ اور ایک ناگوار خاموشی کمرے میں چھا گئی۔ اس کے بعد آنسو کے ایک قطرے کو اس کے سرخ گال سے ٹپکتے دیکھ کر میں یکدم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوگیا کہ تم کو باہر جاکر تلاش کر لاؤں۔ میں نے تم کو واپس لانے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا خواہ اس کے لئے مجھکو زبردستی ہی کیوں نہ کرنا پڑتی لیکن میرے اُٹھتے ہی وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ٹھیک اس جگہ جہاں میں اس وقت بیٹھا ہوا ہوں۔ اس نے ڈرتے ہوئے پوچھا، تم کہاں جا رہے ہو، میں نے کہا "ڈنر کو لینے جا رہا ہوں [illegible]

مت جاؤ، کم از کم تم تو مجھے اکیلا نہ چھوڑو۔

"اور میرے قریب آکر اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے شانوں پر رکھدئے اور اپنا اشک آلود چہرہ میرے سینہ میں چھپا لیا۔ میرا سارا جسم کانپ اُٹھا۔ اس کے قبل کوئی عورت میرے اتنے قریب نہ آئی تھی۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اس کی تسلی و تشفی کی۔ اس کے بعد ہی تم آگئے لیکن تم میرے جذبہ کو نہ دیکھ پائے۔ تمہارے رخسار تمتائے ہوئے اور آنکھیں رنگ رلیوں کے خمار سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ اُس شب کے بعد میں نے اپنے میں ایک تبدیلی محسوس کی جس کی وجہ سے میں اپنے آپ سے خائف رہنے لگا جب میں نے اس کے نازک بازوؤں کو اپنی گردن کے گرد محسوس کیا اور مجھے اس کے بالوں کی خوشبو آئی اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ روشن ستارہ افق سے زمین پر آگیا ہے اور میرے سامنے ایک آفتاب جمال حسینہ محبت کا پیام لئے کھڑی ہے، میں نے خود اپنے اوپر نفریں بھیجی اور اپنے ضمیر کی تسکین کیلئے تم کو تمہاری معشوقہ سے علیحدہ کرنے کی کوشش کی۔ خوش قسمتی سے میرے پاس کچھ روپیہ موجود تھا جسکو اُس نے بخوشی قبول کرلیا۔

میزبان نے حیرت واستعجاب سے کہا" اے بدمعاش انسان! تو بیا نکا کے پُر درد الوداعی خط کی تہ میں تیرا ہی ہاتھ تھا! اس نے لکھا تھا کہ وہ مجبوراً مجھ سے کنارہ کش ہو رہی ہے حالانکہ غم ہجر سے اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جارہا ہے"!

دوست نے جواب دیا" ہاں، اسکی جدائی کا سبب میں ہی تھا لیکن ابھی مجھ کو تم سے کچھ اور بھی کہنا ہے میں نے روپیہ سے صبر و قرار خریدنے کی کوشش کی لیکن مجھے سکون نہ ملا۔ ہزاروں خواہشیں میرے دماغ میں چکر لگانے لگیں۔ میں نے چاہا کہ شدید مصروفیت میں اپنے آپ کو کھو دوں۔ اس وقت میں اپنی تصنیف 'خیالات کا ابدی وجود' کا خاکہ تیار کر رہا تھا لیکن اس پر بھی مجھے چین نصیب نہ ہوا۔ اسی طرح ایک سال گزر گیا اور سال نو کے قبل کی شام پھر آگئی۔ ہم دونوں پھر نہیں یکجا ہوئے۔ وہ اور میں۔ اس وقت تم مکان ہی میں موجود تھے لیکن دوسرے کمرے میں صوفے پر سو رہے تھے۔ کیسینو کے پر کیف ڈنر اور تفریح نے تم کو تھکا دیا تھا اور جب اُس کے قریب بیٹھا میں اُس کے حسین چہرہ کو تک رہا تھا، گزشتہ سال کی یاد میرے دل و دماغ کو مسحور کر رہی تھی، ایکبار پھر اس کا نازک سر میرے سینہ پر ہوگا۔ ایک بار پھر میں اس کا بوسہ لوں گا۔ اور پھر۔ جو ہونا ہے سو ہوگا، ایک ثانیہ کے لئے ہماری نظریں ملیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اسکی نگاہوں میں ایک پیغام اور میرے سوال کا جواب پوشیدہ ہے۔ میں خود کو نہ سنبھال سکا اور میں نے اس کے قدموں پر گر کر اپنے جلتے ہوئے چہرہ کو اس کے دامن میں چھپا لیا۔

"شاید ثانیہ تک میں اسی طرح بے حس و حرکت رہا ہوں گا کہ میں نے اس کے نازک و ملائم ہاتھ کو اپنے سر پر محسوس کیا اور اس نے اپنے شیریں و نرم لہجہ میں کہا" میرے عزیز دوست! ہمت سے کام لو اور اپنے دوست کو جو اس قدر اعتماد سے دوسرے کمرے میں سو رہا ہے دھوکا نہ دو۔ میں فی الفور اٹھکر کھڑا ہو گیا۔

اور حیرت وانفعال سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اُس نے میز پر سے ایک کتاب اُٹھا کر مجھے دیدی۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا اور کتاب کھول کر بہ آواز بلند پڑھنے لگا۔ الفاظ میری آنکھوں کے سامنے رقص کر رہے تھے اور مجھے یہ احساس نہ تھا کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں۔ لیکن میری روح کی گہرائی میں جو قیامت کا طوفان بپا تھا وہ رفتہ رفتہ کم ہورہا تھا اور جب گھڑی نے بارہ بجائے اور تم نیند کے خمار میں سالِ نو کی مبارکباد دینے کمرے کے اندر آئے تو معلوم ہوتا تھا کہ گناہ کا وہ ایک لمحہ مجھ سے دورہ بہت دور ہوگیا ہے۔ جیسے اس کو گزرے کئی برس ہوگئے ہوں۔

"اس روز سے مجھ کو سکون حاصل ہوگیا اور مجھے معلوم ہوگیا کہ اُسے مجھ سے محبت نہ تھی اور میں اس سے فقط رحم کی امید کرسکتا تھا۔ ایک زمانہ گزر گیا۔ تمھارے بچے بڑے ہولے اوران کی شادیاں بھی ہوگئیں۔ ہم تینوں بھی بوڑھے ہوگئے۔ تم نے ہوسنا کی کو خیرباد کہکر دوسری عورتوں کا خیال اپنے دل سے دور کردیا اور میری طرح اپنے کو صرف ایک عورت کے لئے وقف کردیا۔

"یہ ناممکن تھا کہ میں اس کی محبت اپنے دل سے نکال دوں۔ لیکن میرے جذبہ نے دوسری شکل اختیار کرلی۔ نفسانی خواہشات خود بخود کافور ہوگئیں اور ہم دونوں کے درمیان ایک روحانی ارتباط قائم ہوگیا۔ ہم دونوں کی فلسفیانہ گفتگو پر تم اکثر ہنسا کرتے تھے لیکن اگر تم کو یہ معلوم ہوجاتا کہ ان لمحات میں ہماری روحیں ایک دوسرے سے کتنی قریب ہوجاتی تھیں تو تمھارا جذبۂ رقابت ضرور بیدار ہوجاتا۔ اور اب وہ اس عالم فانی میں موجود نہیں۔ ممکن ہے کہ آئندہ سالِ نو کی شام کے قبل ہی ہم دونوں کی بھی باری آجائے۔ اس لئے مناسب ہے کہ پردۂ راز اُٹھا کر تم سے اپنے گناہ کی معافی مانگ لوں؟"

اس نے ملتجیانہ اپنا ہاتھ اپنے دوست کی جانب بڑھایا لیکن سن رسیدہ کپتان نے جواب دیا "ہشت! معافی کا کیا سوال ہے، تم نے جو کچھ آج مجھے بتایا وہ مجھ کو عرصہ ہوا معلوم ہوگیا تھا، چالیس سال گزرے اس نے خود سب کچھ مجھ سے کہدیا تھا اور اب میں تم کو بتاتا ہوں کہ میں کیوں دوسری عورتوں کے پیچھے پھرتا رہا۔ اس لئے کہ اس نے مجھ سے اس وقت یہی کہا تھا کہ اس نے اپنی ساری زندگی میں تم سے اور فقط تم سے محبت کی۔"

میزبان کا دوست اس کی طرف خاموشی سے دیکھتا رہا اور دیوار کی گھڑی نے بھینی آواز میں نصف شب کا گھنٹہ بجانا شروع کیا۔

صبح کا تارا

(از جناب نازش صاحب پرتاب گڈھی)

یہ سناٹے کا عالم رات کی ماری ہوئی دنیا
یہ خوابیدہ فضا یہ سحر میں ڈوبی ہوئی دنیا
فقط میں جاگتا ہوں اور ہے سوئی ہوئی دنیا
بتا اے صبح کے تارے کہاں جاؤں کدھر جاؤں؟

فضاؤں سے مسلسل بارشِ انوار کا عالم
یہ مدہوشیٔ پیہم، فطرتِ سرشار کا عالم
نہ پوچھو اس گھڑی میرے دلِ بیدار کا عالم
یہی جی چاہتا ہے خود تڑپ کر سب کو تڑپاؤں

لرز! پیہم لرز!! اتنا لرز اے صبح کے تارے
کہ آخر راکھ ہو جائیں مری ہستی کے انگارے
تری اِن لرزشوں سے پھوٹ نکلیں موت کے دھارے
کہ شاید آہ شاید میں اسی صورت سکوں پاؤں

لرزتا جا لرزتا جا کہ مٹ جائے تری کاہش
لرزتا جا اجل کے شہپرِ دل میں آ چلی جنبش
لرز تارے لرز پھر ہے فضا میں موت کی شورش
یہ غفلت تا بکے کب تک فریبِ دہر میں کھاؤں
اجازت دے کہ تیری لرزشوں میں مل کے کھو جاؤں
بتا اے صبح کے تارے کہاں جاؤں کدھر جاؤں

تنقید کتب

یادگار برق

یہ مجموعہ مضامین نظم و نثر منشی مہاراج بہادر سکسینہ برقؔ بی۔اے دہلوی مرحوم کی یادگار ہے جو ان کی "زندہ یادگار" یعنی شاگرد رشید جناب شمیش چندر سکسینہ طالبؔ بی۔اے دہلوی نے بعد تلاش و تجسس اور کوشش و کاوش مضامین جمع کر کے مرتب کیا ہے۔ کتاب میں بہت سے مشاہیر ادیبوں کے وہ مضامین جو انھوں نے برق مرحوم کے حالات زندگی پر لکھے ہیں، یا جن میں ان کے کلام پر تبصرہ سپرد قلم فرمایا ہے، شامل کر دیے ہیں۔ ان مشاہیر ادیبوں میں مہرؔ دہلوی، ساحرؔ دہلوی، رونقؔ دہلوی، نظرؔ سوہانی، رواںؔ ادناوی، اصغرؔ گونڈوی، آغا شاعرؔ قزلباش دہلوی، کیفیؔ دہلوی، خواجہ حسن نظامی دہلوی، ڈاکٹر دیوانہ ایم۔اے۔ پی۔ایچ۔ڈی۔ مسٹر آصف علی بیرسٹر ایٹ لا، خواجہ محمد شفیع دہلوی، تلوک چند محرومؔ بی۔اے، ڈاکٹر سعید بریلوی، جگرؔ بریلوی، منورؔ لکھنوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یادگار برق کے سلسلہ میں جو شاعرے ہوئے، ان کے انتخابات بھی درج ہیں۔ قطعات تاریخ وفات بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔

منشی مہاراج بہادر برقؔ ایک بلند پایہ شاعر بلکہ شاعر گر تھے۔ تخیل میں بلندی، ترکیبوں میں ندرت، بندشوں میں لطافت اور الفاظ میں روانی بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ آپ کی نظمیں نہایت پُرجوش اور غزلیں نہایت پُرتغزل ہوا کرتی تھیں۔ جس کے ثبوت میں وہ تبصرے پیش کیے جا سکتے ہیں جو برقؔ مرحوم کے کلام پر ہندوستان کے مختلف ادبی رسالوں اور اخباروں اور ادیبوں نے کیے تھے اور جو اس مجموعہ میں شامل ہیں۔

برقؔ مرحوم بہت بڑے محب وطن تھے۔ ہندوستان کی آتش عشق ہر وقت سینہ میں موجزن رہتی تھی۔ مسلک صوفیانہ اور مشرب عاشقانہ تھا۔ نمونتاً کچھ کلام پیش کیا جاتا ہے۔ ؎

مائل جلوۂ مجاز نہ ہو — غافل چشم امتیاز نہ ہو
ناشناس نوائے راز نہ ہو — حسن معنی سے بے نیاز نہ ہو

حق رسی مدعا شناسی ہے
خود شناسی خدا شناسی ہے

کس قدر معرفت میں ڈوبا ہوا بند ہے۔

"شاعر" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے۔ اس کا بھی ایک بند ملاحظہ فرمائیے۔

ہمہ تن درد ہے، خوگردۂ رنج وراحت مرتبہ دانِ الم، نبض شناسِ فطرت
چشمِ بینا سے ہے یہ ناظرِ بزمِ قدرت ذرہ ذرہ سے اسے ملتا ہے درسِ عبرت
سبق آموز حقیقت ہے زمانہ کے لئے
خضرِ منزل ہے، رہ راست دکھانے کیلئے

چند اشعار غزلوں کے بھی نذر خدمت کئے جاتے ہیں۔ ؎

دل تری زد پہ نگاہِ فتنہ ساز آ ہی گیا بچتے بچتے بھی تہ شمشیرِ ناز آ ہی گیا
ہوتے ہوتے ہوگئی آخر حقیقت بیں نظر آتے آتے راہ پر عشقِ مجاز آ ہی گیا

کیوں نہ ردادِ محبت ہو سراپا رنگیں خونِ اُمید اگر سرخیِ افسانہ بنے

خستہ حالوں کی خوشی بھی نہیں غم سے خالی خون روئے گا لبِ زخم جو خنداں ہوگا

محبت میں ہتیلی پر جو رکھ کر سر نکلتے ہیں وہی جانباز راہِ عشق میں کچھ کر نکلتے ہیں
چلو پھر برقؔ میخانے چلیں، پھر توڑلیں توبہ ابھی تو اپنے ہی کچھ دام ساقی پر نکلتے ہیں

آئے ہیں وہ کھینچکر مقتل میں تیغ آبدار سر سے اونچا اب نظر آنے لگا پانی مجھے

ہے کاکس کا حصہ بنیر میرے شانے میں یہ باہم فیصلہ پہلے زمین وآسماں کرلیں

بہارِ خندۂ گل دیدنی ہے باغِ عالم میں تماشا ہوگیا غنچہ کا شیرازہ بکھر جانا

پائے قاتل پہ قلم ہو کے گرا سر میرا بعد مردن بھی میں احسان فراموش نہ تھا

آتشِ عشق بہر رنگ ہے جاندادۂ حُسن سرد ہوجائے جو یہ رنگ تو پروانہ ہے

کتاب میں برقؔ مرحوم کا فوٹو شامل ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ معمولی، گردپوش مصور، جلد انگریزی، ضخامت تقریباً پونے پانچسو صفحات، قیمت ساڑھے تین روپیہ۔

لطف سخن

(از حضرت بسمل - الہ آبادی)

اسیری پر نظر ہے اور میں ہوں
خیالِ بال و پر ہے اور میں ہوں

زمانہ کس نظر سے دیکھتا ہے
زمانہ کی نظر ہے اور میں ہوں

کوئی ساتھی نہیں راہِ عدم میں
اکیلے کا سفر ہے اور میں ہوں

کہیں آنا کہیں جانا نہیں اب
کسی کی رہ گذر ہے اور میں ہوں

مجھے ہے زندگی کا لطف حاصل
مرا دردِ جگر ہے اور میں ہوں

نظر کو وہ نظر آتا نہیں ہے
مری حدِ نظر ہے اور میں ہوں

دھڑکتا ہے مرا دل اے شبِ غم
قیامت کی سحر ہے اور میں ہوں

نہیں دم کا کوئی دم بھی بھروسہ
یہ قصہ مختصر ہے اور میں ہوں

لگاوٹ کی نظر نے مار ڈالا
محبت کی نظر ہے اور میں ہوں

زمانے بھر کے ہیں سو عیب بسمل
یہی میرا ہنر ہے اور میں ہوں

(از حضرت ہوش - اکبر آبادی)

یاد آ آ کر مری ہستی پہ چھا جاتا ہے کون ؟
درمیاں سے میری ہستی بھی ہٹا جاتا ہے کون

اک یقینِ بے سبب دل میں جما جاتا ہے کون
ہر گمانِ ماسوا دل سے مٹا جاتا ہے کون

شب کو حسنِ ماہ بنکر دن کو بنکر رنگِ گل
ہر بہانے اک نہ اک جلوہ دکھا جاتا ہے کون

بخش کر ذوقِ نظر کو جستجو کے مستقل
بیخودی کا شوق پر پردہ گرا جاتا ہے کون

بجلیاں سی کوند جاتی ہیں فضائے عشق میں
بن کے سرتاپا تصور مسکرا جاتا ہے کون

بے سبب ہی کچھ امیدیں اور کچھ مایوسیاں
عشق کے عالم میں یہ ہلچل مچا جاتا ہے کون

پھر تمنا مضطرب ہے، پھر نظر ہے بے قرار
شوق کو یہ چٹکیاں لینا سکھا جاتا ہے کون

بن کے دردِ عشق مجھکو کون تڑپاتا ہے ہوش
اس قدر آخر مرے نزدیک آجاتا ہے کون

(از مسٹر پی۔سی۔ شوقؔ۔ بی۔ایس۔سی۔ فرسٹ ایر)

قدم قدم پہ قیامت کا بیچ و تاب ہوا
مری نظر نہ ہوئی، آپ کا شباب ہوا

تمام دورِ حیات اپنا صرفِ خواب ہوا
جو کچھ بچا تھا وہ تعبیر میں خراب ہوا

نظر اوٹھی تو ترا حُسن خود حجاب ہوا
جو اک نقاب اوٹھا دوسرا نقاب ہوا

کچھ اس طرح نظر آتا رہا ہے خوابِ حیات
کہ اصل پر بھی ہمیشہ گمانِ خواب ہوا

نگاہِ عشق مذاقِ خودیِ رُخِ فطرت
کہاں کہاں نہ ترا حسن بے نقاب ہوا

میں وہ جواب کہ ہر اک سوال کا حاصل
تو وہ سوال نہ جس کا کوئی جواب ہوا

مرے گناہوں کی مایوسیاں تھیں قابلِ دید
میں جب شہیدِ کرم ہائے بےحساب ہوا

یہ عشق کیا ہے فقط پرتوِ جمال ترا
مگر یہ کیا کہ تجھے خود سے بھی حجاب ہوا

اُمیدِ لذتِ الطاف کفر ہے اے شوقؔ
وہ عشق عشق نہیں ہے جو کامیاب ہوا

(از حضرت مضطرؔ۔ لکھنوی)

بدنام دل کے ہاتھوں ہماری جبیں ہوئی
لغزش جہاں نہ ہونا تھی آخر وہیں ہوئی

کیا جانے آج کیا تھا کسی کے جمال میں
پہروں میں دیکھتا رہا سیری نہیں ہوئی

جذبہ وہی ہے دل میں جو پیدا ہو خود بخود
ممنونِ سعی ہو تو محبت نہیں ہوئی

یوں انتہائے شوق محبت میں کھو گئے
جیسے کسی سے ہمکو محبت نہیں ہوئی

اُنپر بھی آچکی ہیں محبت کی تہمتیں
الفت وہ چیز ہے جو کسی کی نہیں ہوئی

کچھ ایسے واقعات بھی اُلفت میں ہوگئے
اکثر وہی نگاہ گوارا نہیں ہوئی

تھا دو دلوں کا راز جو کھل جاتا بزم پر
اچھا ہوا نگاہ برابر نہیں ہوئی

کچھ بھی نہیں ہے پھر بھی کھینچا جا رہا ہے دل
مضطرؔ اگرچہ اُن کو محبت کہیں ہوئی

(از سیدہ سردار بیگم اخترؔ حیدرآبادی)

مجھے کیا پڑی ہے جو عشق کو میں ہلاک ننگِ وفا کروں
مجھے دردِ دل سے ہے بیر کیا کہ جو دردِ دل کی دوا کروں

مرے ہر نفس میں سمائے ہیں مری زندگی پہ وہ چھائے ہیں
وہ جہاں بٹھائیں نہ اُٹھ سکوں وہ جدھر چلائیں چلا کروں

مجھے دی ہیں غم کی امانتیں یہ نوازشیں یہ عنایتیں
ٹھہر اضطراب وفا ٹھہر کہ میں شکریہ تو ادا کروں

ارے نامہ بر تو ٹھہر ذرا ہے مری خدا سے یہ التجا
کبھی خطِ شوق نہ ختم ہو جو میں لکھ رہی ہوں لکھا کروں

ترا نغمہ اخترؔ خوش نوا، مرے ٹوٹے دل کی ہے اک صدا
مری تجھ سے ہے یہی التجا تو غزل پڑھے میں سنا کروں

بیادگار منشی دیانراین صاحب نگم مرحوم

جلد ۸۵	اکتوبر ۱۹۴۵ء	نمبر ۴

فہرست

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

جلد ۸۵ اکتوبر ۱۹۴۵ء نمبر ۴

اردو غزل میں خیالات کی بے ربطی

(از محمد مرغوب احمد نقوی - ایم - اے)

مغربی تمدن کا وہ زبردست سیلاب جو انیسویں صدی کے اختتام میں ہندوستان کی مسمار شدہ تہذیب کے کھنڈرات سے آ کر ٹکرایا۔ مشرقی تمدن کی خاکستر میں چھپی ہوئی آخری چنگاریوں کو بھی بہا کر لے گیا۔ ان سمندر پار سے آئے ہوئے خیالات نے اردو ادب پر بھی بہت گہرا اثر کیا اور ادبی ناقدین نے مغربی مفکرین کی پیروی میں تنقید کے نئے زاویے اختیار کیے۔ چنانچہ اس نئے دور میں اردو غزل پر تنقید کرتے وقت جو چیز ناقدین کے سامنے رہی وہ انگریزی شعراء ورڈسورتھ اور شیلی کی موسیقانہ شاعری (Lyric Poetry) تھی۔ جہانتک تخئیل کی بے ضبط پرواز اور رومانی تاثرات کا تعلق ہے۔ انگریزی شاعری کی یہ صنف اردو غزل سے بہت مشابہ تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ غزل میں خیالات کا وہ تسلسل نہیں ہوتا تھا جو اسکی ہم پلہ انگریزی شاعری میں موجود تھا۔ اس لحاظ سے انگریزی کی موسیقانہ شاعری کو مربوط غزل کہا جاسکتا تھا۔ انگریزی اور اردو شاعری کا یہ فرق ناقدین کی نظروں میں بری طرح کھٹکا اور انھوں نے اردو کے غزل گو شعراء پر زور دیا کہ وہ غزل کے تمام شعروں میں خیالات کے لحاظ سے ہم آہنگی پیدا کریں۔ ناقدین کا یہ اقدام بالکل جذباتی تھا۔ کیونکہ انھوں نے انگریزی اور اردو شاعری کی اندرونی کیفیات کا موازنہ کئے بغیر دونوں میں بیرونی مشابہت پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اگر وہ انگریزی کی موسیقانہ شاعری کے اندرونی کوائف کا تجزیہ کرتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ جہاں کہیں بھی انگریزی شعراء نے داخلی تغزل (Subjective Lyricism)

پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہاں خیالات کا شیرازہ بکھر گیا ہے اور مضمون میں بے ربطی پیدا ہو گئی ہے۔
مثال کے طور پر ہم ورڈسورتھ کی شاہکار نظم "ٹنٹرن ایبے" کو لے سکتے ہیں۔ شاعر ٹنٹرن ایبے کے منظر کو ایک طویل عرصہ کے بعد دوبارہ دیکھتا ہے۔ سب سے پہلے وہ دریا کی روانی، آبشاروں، باغیچوں اور جنگلوں کا ذکر کرتا ہے۔ پھر یکایک خارجی مناظر اُسکی نظروں کے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں۔ اُس پر ایک تغزلی حالت (Lyric Mood) طاری ہوجاتی ہے۔ جس کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے:-

"وہ پاکیزہ کیفیت جس میں مخفی رازوں کا بوجھ ہلکا ہوجاتا ہے اور اس تمام بعید از فہم دنیا کی شدید اور خستگی آمیز گرانی کم ہوجاتی ہے۔ وہ سکوت اور متبرک کیفیت جس میں لطیف احساسات ہمیں آگے بڑھاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس جسمانی قفس کا تنفس رک جاتا ہے اور ہمارے انسانی خون کی روانی تک بند ہوجاتی ہے۔ ہماری مادی زندگی کا اختتام ہوجاتا ہے اور ہم ایک جیتی جاگتی روح بن جاتے ہیں"

اس کے بعد ساری نظم بے ربط خیالات کا مجموعہ نظر آتی ہے۔ مگر داخلی پہلو پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر خیالات میں ہم آہنگی نہیں تو احساسات میں ہم آہنگی ضرور موجود ہے اور جو جذبہ شاعر پر طاری ہوا ہے وہ آخری وقت تک اُسکا ساتھ دیتا ہے۔

ورڈسورتھ کی ٹنٹرن ایبے کی طرح اُردو غزلوں میں بھی گو خیالات میں اکثر تسلسل نہیں ہوتا۔ مگر جذبات ہمیشہ مسلسل ہوتے ہیں لیکن مغربی اصول کے ناقدین صرف خیالات کی بے ربطی پر نظر ڈالتے ہیں اور غزل کی داخلی یکرنگی کی طرف کبھی رجوع نہیں ہوتے۔ چنانچہ کلیم الدین احمد اپنی کتاب "اُردو شاعری پر ایک نظر" میں غالب کے زمانہ سے لیکر دور حاضرہ تک کی تمام غزلوں کو غیر مربوط ثابت کرتے چلے گئے ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے غالب کی اس غزل کو لیا ہے۔

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے	ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے
خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ	ہتھکنڈے ہیں چرخ نیلی فام کے
خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو	ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے
رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم	دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے
دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر	یہ بھی حلقے ہیں تمھارے دام کے
شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر	دیکھئے کب دن پھریں حمّام کے

عشق نے غالب نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

کلیم الدین احمد نے ہر شعر کا مطلب علیحدہ علیحدہ بیان کیا ہے اور دکھلایا ہے کہ غزل بالکل غیر مربوط ہے اور ایک شعر کا دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور آخر میں لکھتے ہیں۔ اس مختصر تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ خیالات میں اصلیت کہاں کوئی ربط بھی نہیں۔ ذہن اوراک پر کسی مکمل تجربہ کی تصویر نقش نہیں ہوتی۔ بلکہ چند پراگندہ نقوش مرتسم ہوجاتے ہیں۔ رقیبوں کی کامیاب قسمت، شاعر کی خستگی، خط لکھنے کا ارادہ، زمزم پر میکشی، دل کا آنکھوں میں جا چھپنا، شاہ کے غسل صحت کی خبر، شاعر کا نکما ہونا۔ ان نقوش میں کوئی معقول مناسبت نہیں" حقیقت یہ ہے کہ کلیم الدین احمد نے غالب کے اُس جذبہ کو مدنظر نہیں رکھا جس کے ماتحت غزل وجود میں آئی۔ ورنہ انکو پوری غزل وجود میں آئی۔ ورنہ اُن کو پوری غزل مربوط معلوم ہوتی اور اُن کے دماغ پر پراگندہ نقوش مرتسم ہوتے۔ واقعہ یہ ہے کہ بادشاہ کا غسلِ صحت ہونیوالا تھا۔ غالب اپنی خستگی کا اپنے رقیبوں کی خوش حالی سے مقابلہ کرکے غسل صحت کی خوشی میں بادشاہ سے انعام کا طالب ہوتا ہے۔ اب ہر شعر کا مطلب صاف ہوجاتا ہے اور ایک شعر دوسرے سے بالکل منسلک نظر آتا ہے۔ غالب کے اغیار کی قسمت پر رشک کرتا ہے کہ ان کی بادشاہ کی بارگاہ تک رسائی ہے۔ مگر اوسکو کبھی حاضری کا پیغام تک نہیں پہونچتا ؎

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

مگر وہ اپنی اس بدقسمتی کا سبب بادشاہ کو نہیں ٹھہراتا۔ بلکہ اس کا موجب چرخ کجرفتار کو قرار دیتا ہے۔ ؎

خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ ہتھکنڈے ہیں چرخ نیلی فام کے

لیکن اگرچہ اسکی تقدیر اُس کے خلاف ہے اور بادشاہ کو اُسکی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی۔ مگر وہ بادشاہ کی کی خدمت میں خط ضرور بھیجے گا۔ خواہ بادشاہ اُسکی طرف التفات کرے یا نہ کرے۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

وہ بادشاہ کا نام لیوا ضرور ہے۔ مگر بادشاہ اُسکی طرف التفات نہیں کرتا۔ لہذا اُسے زمزم (کرم خسروانہ) دل سیر ہوکر نہیں ملی اور اُس نے اپنی سیری کے لیے زمزم پر معمولی شراب پی لی۔ مگر صبح کو جب ہوش آیا تب سوچا کہ بادشاہ کے زیر سایہ رہ کر ذلت کے ساتھ شکم سیری سے کرم خسروانہ کے نام پر دھبہ آتا ہے۔ لہذا اس نے اپنے درباری لباس پر سے شراب کے دھبے دھوڈالے۔ ؎

رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم دھوئے دھبے جامہ احرام کے

مگر اس نے جان بوجھکر شراب کیوں پی؟ بات یہ بھی کہ شراب ارغوانی اسکی آنکھوں کو بھاگئی اور آنکھیں بادشاہ پر فریفتہ ہیں۔ لہذا آنکھوں کے ذریعہ جتنے جال بچھائے جاتے ہیں وہ سب بادشاہ کی طرف سے ہوتے ہیں اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں۔ مگر وہ صاف الفاظ میں بادشاہ پر الزام رکھنا نہیں چاہتا اور خود بادشاہ ہی سے

دریافت کرتا ہے۔ ؎

دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر یہ بھی حلقے ہیں تمھارے دام کے

خیر اب ایسی نازیبا باتیں عمل میں نہیں آئیں گی۔ کیونکہ بادشاہ کا غسلِ صحت ہونیوالا ہے اور حمّام کے ساتھ ساتھ اُس کے بھی دن پھریں گے۔

شاہ کے ہے غسل صحت کی خبر دیکھئے کب دن پھریں حمّام کے

غسل صحت کا وہ نکموں کی طرح انتظار کرتا رہیگا۔ اس میں بھی اُسکا کوئی قصور نہیں ہے۔ پہلے وہ روزی کمانے کے اور ذرایع اختیار کر سکتا تھا۔ مگر اب بادشاہ کا عشق اجازت نہیں دیتا کہ وہ کوئی دوسرا در تلاش کرے

عشق نے غالب نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

صاف ظاہر ہے کہ ناقدین تنقید نگاری کے شوق میں غزلوں کا مکمل طور سے جائزہ نہیں لیتے اور اس پر غور کرنے کی بالکل کوشش نہیں کرتے کہ وہ کیوں اور کس موقعہ پر لکھی گئیں۔ اسی طرح یہاں پر بھی حکیم الدین احمد ہر شعر کا مطلب عشقیہ اشعار کے متوازی نکالتے چلے گئے۔ اور جب بادشاہ کے غسل صحت کے مضمون پر آئے تو یکایک چونک پڑے اور سراسیمہ ہو کر لکھنے لگے :-

" اب دماغ دامِ تحیّر میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ یہ غیر متوقع طور پر شاہ، غسلِ صحت اور حمّام کا ذکر اس قدر بے ربطی پیدا کرتا ہے کہ اگر ادر اشعار میں سلسلہ دار خیالات کا اظہار ہوتا بھی تو وہ سلسلہ مثلِ تارِ عنکبوت ٹوٹ جاتا "۔

کاش غزل پر تنقید کرنے سے پہلے ناقدین غزل کے بنیادی جذبہ پر غور کر لیا کرتے۔ کلیم الدین احمد آگے چلکر اسی غزل کے سلسلہ میں لکھتے ہیں " ان (پراگندہ نقوش) سے دماغ یا تخئیل مسرور نہیں ہوتا ربط، اتفاق، تکمیل یہی تہذیب کا سنگِ بنیاد ہیں۔ ان سے غزل مبرا ہے اور کیوں نہو؟ غزل نیم وحشی صنف شاعری ہے۔ اسلیے اس میں غیر مربوط اور نامکمل خیالات اور محسوسات کا اظہار لازمی ہے۔ ناقد کا سب سے بڑا سہو یہ ہے کہ اسمیں خیالات اور محسوسات میں کوئی امتیاز نہیں کیا غزل میں خیالات اکثر نامکمل ہوتے ہیں۔ مگر محسوسات کبھی نامکمل نہیں ہوتے۔ شاعر کو ادبی شائستگی (Literary Decorum) مجبور کر دیتی ہے کہ وہ خیالات میں عُریانی پیدا نہونے دے اور ان کو نامکمل رکھے۔ کیونکہ اگر کسی چیز کا بیان بہت زیادہ وضاحت کے ساتھ کیا جاتا ہے تو شاعری کی لطافت ختم ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے انگریزی ناقدین نے ملٹن اور اسپنسر کو ادبی شائستگی کے اصول کی خلاف ورزی کرنے پر بہت زیادہ لعنت وملامت کی ہے۔ ملٹن نے "گم شدہ فردوس" میں جذباتی الفاظ میں ازدواجی محبت کی تعریف کی ہے اور جب آدم و حوا سب سے پہلے ہمارے سامنے آتے ہیں اُس نے کچھ جملے برہنگی کی تعریف میں سپردِ قلم کئے ہیں۔ ان دونوں موقعوں پر ناقدین

نے ملٹن کو مورد الزام قرار دیا ہے۔ کیونکہ ملٹن کو جو بات زیرِ لب کہنا چاہیئے تھی وہ اُس نے باآواز بلند کہدی۔ شاعری ملٹن کی اس بلند آہنگی کی متحمل نہ ہوسکی اور اُسکی لطافت ختم ہوگئی۔ اسی طرح اسپنسر نے اپنی نظم "اپی تھیلمیئم" میں عروس کے حسن پر سرسری نگاہ نہیں ڈالی۔ بلکہ آنکھ ناک۔ کان۔ دانت۔ گردن۔ شانے اور کمر کی خوبصورتی کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا۔ جس کی وجہ سے یہاں عریانی پیدا ہوگئی۔ اُردو کے بلند پایہ غزلگو شعرا نے ادبی شایستگی کے اصول کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ انھوں نے کبھی کوئی بات کھل کر نہیں کہی ہے۔ اور اسی وجہ سے اکثر اُن پر خیالات کے نامکمل رکھنے کا الزام لگایا جاتا ہے۔ لہذا غزل نیم وحشی صنف شاعری نہیں ہے۔ بلکہ اُس نے اُردو ادب میں تہذیب کا ایک اعلیٰ نصب العین قائم کیا ہے۔ مثال کی طور پر ہم جگر مراد آبادی کے اس شعر کو لیتے ہیں۔ ؎

تیری نظروں کے تصدق تیری آنکھوں کے نثار انھیں پیمانوں سے ساقی انھیں میخانوں کی

دوسرا مصرعہ بہت زیادہ لطیف اور مزیدار ہے۔ کیونکہ شاعر نے اپنا مطلب کھل کر نہیں واضح کیا ہے بلکہ صرف اشارتاً ساقی کی مست آنکھوں سے مینوشی کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اگر شاعر نظروں اور آنکھوں کو بالترتیب پیمانہ اور میخانہ سے تشبیہہ دیتا اور پھر اپنے مطلب کو اور زیادہ تشریح کے ساتھ بیان کرتا تو تغزل کے ساتھ ساتھ شاعرانہ نزاکت بھی ختم ہوجاتی۔ اور یہ ادبی شایستگی کے اصول کے بھی خلاف ہوتا۔ کلیم الدین احمد کا یہ خیال بھی حقیقت پر مبنی نہیں ہے کہ ان نامکمل نقوش سے دماغ یا تخیل مسرور نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی خیال کو نمایاں طور سے بیان کرنے سے اتنا لطف نہیں آتا جتنا کہ اشاروں اشاروں میں بیان کرنے سے آتا ہے۔ جیسا کہ متذکرہ بالا شعر سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دماغ میں تجزیہ (Analysis) کرنے کی طاقت موجود ہے وہ ایک شعر کو شش کر اپنے تجزیاتی عمل کے ذریعہ الفاظ کے رسمی پیرہن میں بنیادی جذبہ (Elemental Feeling) کو اخذ کرسکتا ہے اور شاعری سے کافی ربط رہنے کے بعد اُس میں یہ طاقت بھی پیدا ہوجاتی ہے کہ لفظی اظہار کے نامکمل ہونے کے باوجود بنیادی جذبے کو پوری طرح سمجھ سکے۔ لہذا جب کسی شعر میں کسی جذبہ کا نامکمل اظہار ہوتا ہے۔ تو وہ اُسے خود مکمل کرلیتا ہے اور اس تخلیقی عمل (Cre. tive Action) میں کامیابی پر اُسے بہت حظ و سرور حاصل ہوتا ہے جسے ارباب ذوق لطف شعر سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غزل جس میں بظاہر نامکمل اور غیر مربوط خیالات کا اظہار ہوتا ہے دوسرے اصناف شعر کے مقابلہ میں زیادہ لطف و سرور کا باعث ہوتی

مداری

(از حضرت احسان دانش)

ڈھل گیا سورج تپش کم ہو گئی لیکن ابھی
خاک کے سینوں میں سوزاں ہے مسلسل آگ سی
دوپہر ڈھل کر یہ عالم ہے در و دیوار کا
موت پر ہو آسرا جیسے کسی بیمار کا
یہ محلہ جس میں نوّے فیصدی مزدور ہیں
سرخوشوں کو جانتے ہیں سرخوشی سے دور ہیں
آگے ملتا ہے جہاں دو تنگ کوچوں کا سرا
اور وہیں سے ایک ہو کر بڑھ گیا ہے راستا
اک مداری اس طرح دکھلا رہا ہے اپنا کھیل
پڑ رہی ہے دل میں بچّوں کے خوشی کی داغ بیل
اُن کے بچّوں کے کہ جن کی زندگی کی شاہراہ
کوئی سرمایہ نہیں رکھتی بجز فریاد و آہ
بیکلی نے صبر کے رستہ پہ ڈالا ہے جنھیں
بے بسی نے ضبط کے سانچے میں ڈھالا ہے جنھیں
جن کے حصّے کا کہیں خوفِ خدا باقی نہیں
منصفی میں جن کے حق کا فیصلہ باقی نہیں
جن کی مایوسی نہیں رکھتی خوشی کی آرزو
بے طرح ارزاں ہے جن کے دست و بازو کا لہو
اے مداری گائے جا ڈفلی بجا کر گائے جا
ان غریبوں کے جگر پاروں کے دل بہلائے جا
جانے پھر ان کو کشاکش یہ تبسم دے نہ دے

ڈگڈگی کی تال بھی کا ترنم دے نہ دے

ان کے ہونٹوں پر نہ جانے پھر ہنسی آئے نہ آئے
زندگی پر آب و رنگِ زندگی آئے نہ آئے

جانے اِن کو وقت کوئی قہقہہ دے یا نہ دے
خود غرض قانون محنت کا صلہ دے یا نہ دے

ان کی فہرستِ پریشانی میں راحت ہو، نہ ہو
عمر بھر پھر ان کو یوں ہنسنے کی فرصت ہو، نہ ہو

ان کی ظلمت میں فرشتے روشنی سے لکھتے نہیں
بھول کر فردِ جوانی میں خوشی لکھتے نہیں

غزل

(از حضرت شکیل بدایونی۔ بی۔ اے)

آمدِ فصلِ خزاں کا جو نہ امکاں ہوتا
کسقدر حسن پہ مغرور گلستاں ہوتا

ابد آثار جو رنگِ شبِ ہجراں ہوتا
کیوں کوئی صبح کے تاروں سے پشیماں ہوتا

ہر نفس یوں نہ مسرت سے گریزاں ہوتا
دل اگر واقفِ رازِ غمِ جاناں ہوتا

کفر و ایماں کی سیاست سے ہے ناکارۂ وجود
آدمی کام کا ہوتا، اگر انساں ہوتا

کھل گیا تجزیۂ غم سے ہر اک رازِ حیات
زیست مبہم بھی اگر دل نہ پریشاں ہوتا

داغہائے دلِ سوزاں کو دعائے ظالم
ورنہ کیونکر تری محفل میں چراغاں ہوتا

تونے سوچا کبھی دامن کو بچانیوالے
کچھ سکت ہاتھ میں ہوتی تو یہ داماں ہوتا

عزمِ انساں ہے کہ بنجائے فرشتہ لیکن
ہر فرشتے کو یہ حسرت ہے کہ انساں ہوتا

میری فطرت کو کہاں تاب جمود ساحل
وہی کشتی وہی دریا۔ وہی طوفاں ہوتا

حسنِ احساس بھی ہے تلخیٔ ماحول میں گم
دل گلستاں تھا تو عالم بھی گلستاں ہوتا

سرد ہے انجمنِ شعر شکیل اُن کے بغیر
وہ مرے سامنے آتے میں غزلخواں ہوتا

پیمانِ وفا

(از حضرت بہار کوٹی)

خرامِ موجۂ آبِ رواں سے کھیل چکا
قمر سے کھیل چکا کہکشاں سے کھیل چکا

تصورِ رخِ زہرہ وشاں سے کھیل چکا
جبیں سے کھیل چکا آستاں سے کھیل چکا

خیالِ ابرو و مژگاں میں سینہ کاوی کی
کسی کے تیر کسی کی کماں سے کھیل چکا

غمِ فراق میں شغلِ فغاں رہا برسوں
جگر کی آگ نظر کے دھواں سے کھیل چکا

کوئی دعا نہ ہوئی باریابِ بابِ اثر
فغاں سے کوششِ ضبطِ فغاں سے کھیل چکا

چھڑا سکیں نہ تذبذب سے کوششِ دامن
تعینات یقین و گماں سے کھیل چکا

تلاشِ خضر میں چھانی زمانہ بھر کی خاک
غبارِ رہگزرِ کارواں سے کھیل چکا

اب اپنے زخمِ رگِ جاں سے کھیلنا ہے مجھے
جنونِ زلزلہ ساماں سے کھیلنا ہے مجھے

نظامِ امن و اماں کے قیام کی خاطر
نظامِ گردشِ دوراں سے کھیلنا ہے مجھے

بقائے عظمتِ دیرینۂ وطن کے لئے
جلال و سطوتِ انساں سے کھیلنا ہے مجھے

ضیائے دیدۂ وقفِ سرشک کی خاطر
نگاہِ قہر بداماں سے کھیلنا ہے مجھے

فروغِ نغمہ و ہنگامۂ چمن کے لئے
سکوتِ شامِ غریباں سے کھیلنا ہے مجھے

تبسمِ لبِ فریاد آشنا کے لئے
شرارِ آہِ یتیماں سے کھیلنا ہے مجھے

گلوں کی آبِ چمن کے نکھار کی خاطر
بہارِ خونِ شہیداں سے کھیلنا ہے مجھے

سفینہ پار لگانا ہے ملک و ملت کا
بھنور سے موج سے طوفاں سے کھیلنا ہے مجھے

بلائے محبس و زنداں کا سر کچلنا ہے
بلائے محبس و زنداں سے کھیلنا ہے مجھے

جذباتِ کوثر

گلستاں میں بہار آتے ہی اپنا رنگ لے آئی
ترے دیوانے کا پڑنے لگا پھر ہاتھ دامن پر

ہوئی جاتی ہے کیوں بیتاب کسی مجھ سے چار آنکھیں
کہیں ایسا نہ ہو رازِ نہاں کھل جائے دشمن پر

ترے ہر شعر میں ہے مطلعِ انوار کا عالم
تجھے پھر ناز ہو کیونکر نہ کوثر طبعِ روشن پر

بسمل خیرآبادی

(از جناب مسٹر سلیم جعفر صاحب)

شاعر کی رفعت خیال دکھانے کے لئے ہندی میں ایک ضرب المثل ہے "جہاں نہ پہونچے رَوِ (रवि سورج) وہاں پہونچے کَو (कवि شاعر)۔ اس کا تخیل عجیب و غریب مظاہر قدرت کو بے نقاب کیا کرتا اور وہ وہ مجسمات حسن تراش کر رکھ دیتا ہے کہ نظارگیان جمال فطرت دیکھ دیکھ کر غرق بحر حیرت ہو جاتے ہیں۔ اس کی فکر رسا عالم محسوسات سے گزر کر عالم خیال میں پہونچ جاتی اور ان شاہدان مستور کو جلباب خفا سے لاکر منصہ شہود پر جلوہ گر کر دیتی ہے کہ "ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے" شعرائے متقدمین و متاخرین کے دیوان دیکھئے وہ آپ کو گنجینہ ہائے حقایق اور بت خانہائے اصنام خیالی نظر آئیں گے۔

چنانچہ یہی ودیعت فطرت گرے (GRAY) کے زبان و قلم سے اس حقیقت کے انکشاف کا باعث ہوئی۔ ؎

بہت سے گوہر شہوار باقی رہ گئے ہوں گے   کہ جن کی خوبیاں سب مٹ گئیں تہ میں سمندر کی
ہزاروں پھول دشت و در میں ایسے بھی کھلے ہوں گے   کہ جن کے مسکرانے میں تھی خوشبو مشک اذفر کی

(ترجمہ از نظم طباطبائی مرحوم)

ہر ملک میں بے انتہا ایسے اہل کمال گزرے ہیں کہ جن پر گرے کا یہ قول صادق آتا ہے۔ انھیں میں سے ایک سید محمد حسین صاحب بسمل خیرآبادی مرحوم ہیں جو کسی زمانے میں آبو پر بحیثیت وکیل دربار ٹونک مقیم تھے۔ آپ کے مفصل حالات یا سوانح عمری لکھنے کا بار تو ہم اپنے دوش نازک پر نہیں لے سکتے کیونکہ وہ مفاد و مصالح جمع نہیں کر سکتے جو اس خدمت کے لئے ضروری ہے۔ آبو پر رہنے والوں میں سے جنھوں نے ان کا زمانہ دیکھا اور ان کی صحبتیں اٹھائیں تھیں وہ سب نہیں تو قریب قریب سب اب ہمارے تہذیب و اخلاق سے طالب ہیں کہ ان کا نام زبان پر آئے تو ہم فوراً ہی "غفر اللہ ذنوبہ"، خدا غریق رحمت کرے، یا اسی قسم کا کوئی اور دعائیہ فقرہ ضرور کہیں اس لئے بشرطیکہ وہ اس کو مناسب تصور فرمائیں تو یہ کام ہم جناب جاں نثار حسین صاحب اختر کے حوالہ کرتے ہیں، جو مرحوم کے برادر خورد افتخار الشعرا سید افتخار حسین صاحب مضطر خیرآبادی مرحوم کے فرزند ارجمند اور ایک مشہور خاندان علما و فضلا کے چشم و چراغ ہیں اور ناظرین کی توجہ "دروغ بر گردن راوی" کے مشہور مقولے کی طرف مبذول اور چند سنی سنائی باتوں کا ذکر کر کے انھیں مرحوم کے دو فارسی کے شاہکاروں سے روشناس کرتے ہیں۔

برطانیہ کا پرچم اقبال جب اس وسیع ملک پر لہرا چکا جسے اصطلاح موجودہ میں برٹش انڈیا کہتے ہیں اور تقاضائے سیاست نے رؤسائے ہند کی طرف دست مروت یا حالات موجودہ کو مد نظر رکھا جائے تو دست شفقت بڑھایا اور رشتۂ مراسلت کی نزاکت

کے خیال سے نائبان نائب السلطنت برطانیہ متعینہ ہند سے، جو تعلقات و مفادات برطانیہ کی استواری و استحکام کے ذمہ دار تھے ہر ریاست کا ایک معتمد بھی وابستہ کر دیا۔ ریاستوں نے اپنے اس معتمد کو لقب وکیل سے ملقب کیا۔ بسمل مرحوم دربار ٹونک کی طرف سے اس منصب جلیلہ پر فائز تھے، مگر رسم زمانہ کے مطابق کہ "ہر بڑے کام کی ابتدا معمولی ہوتی ہے" آپ پہلے یہاں بعہدۂ نائب وکیل تشریف لائے۔ جو کلام فارسی پیش کیا جانے والا ہے وہ اسی زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ خود بتاتا ہے کہ کون سے اسباب اسے عرصۂ وجود میں لائے۔

جس شخص نے گہوارۂ علم و فضل میں پرورش پائی ہو اس کی نسبت یہ فرض کر لینا کہ وہ اپنے زمانے کے علوم مروجہ سے بہرۂ کامل رکھتا تھا، خوش اعتقادی پر محمول نہ کیا جائیگا بالخصوص جب کہ اس کے مخلوقات فکر اس مفروضے کی تائید کرتے ہوں اس لئے یہ تسلیم کر کے کہ آپ عربی و فارسی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے، چند لطائف سپرد قلم کئے جاتے ہیں جو آپکے اخلاق و عادات پر روشنی ڈالتے ہیں۔

بسمل مغفور و مرحوم کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب گھر گھر شعر و شاعری کے چرچے تھے۔ یہی محفل احباب کی گرمی کے باعث تھے اور یہی شخصی قابلیت اور ذاتی جوہر کے محک امتحان۔ آبو وکالت ہاؤس میں اس وقت وہ شمع ضیا بار تھے کہ علم کے پروانے اکثر شام کو سمٹ کر آ جاتے۔ چنانچہ وکلا میں سے جنھیں شاعری کا ذوق تھا یہاں آ کر اس آفتاب کمال سے کسب فیض کیا کرتے تھے۔ ایک دن اسی طرح کی ایک محفل میں کسی ریاست کے ایک معتمد صاحب (غالباً عاشق حسین صاحب متخلص بہ عاشق) رونق افروز تھے جنھیں اپنی صفائی کلام اور مضمون آفرینی پر ناز تھا۔ خوش گپیاں ہو رہی تھیں کہ بسمل مرحوم نے فرمایا "وکیل صاحب کلام تازہ سے محظوظ فرمائیے"۔ وکیل صاحب نے ازرہ انکسار یا معذرت جواب دیا "آج کل پریشان سا رہتا ہوں، کچھ کہنے کو جی نہیں چاہتا، کسی وقت طبیعت حاضر ہوئی تو کچھ بک لیا، ورنہ اللہ اللہ خیر صلاح"۔ بسمل صاحب نے اس عذر پر کچھ زیادہ توجہ نہ کی اور فرمایا "شاعر کی طبیعت کو حادثات زمانہ نہیں روک سکتے، اشعار میں زندہ دلی نہ ہو گی افسردگی ہو گی لیکن وہ کچھ نہ کہے یہ نہیں ہو سکتا"۔ اس اصرار پر وکیل صاحب فرمانے لگے "ایک دن کچھ یوں ہی سا اطمینان تھا دو چار شعر غالب کی اس غزل کی بحر و قوافی میں ہو گئے جس کا مطلع ہے ؎

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے   ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اتنا کہنا تھا کہ مرحوم کے اصرار نے وہ صورت اختیار کی کہ وکیل صاحب غزل سنانے کے لئے مجبور ہو گئے۔ دو ایک شعر سنانے کے بعد مصرع پڑھا۔ ع پیچھے بھی ہو ایسا کہ ہے جیسا مرے آگے۔

مصرع سنتے ہی واہ واہ، کمال کر دیا کے شور سے بنگلہ سر پر اٹھا لیا اور فرمایش کی "پھر ارشاد ہو"۔ شاعر کی سقم کلام تک نہ جب پہنچی تھی اور نہ اب پہنچی بلکہ اس داد نے اس مضمون آفرین سخن سنج کے نشے میں چور کر دیا۔ وہ کھڑے ہو گئے مؤدبانہ سلام کیا، اور جھوم جھوم کر مصرع [illegible] مرحوم نے داد کی [illegible]

کے تمام محاورات قدیم صرف کرکے پھر پڑھنے کی فرمائش کا اعادہ کر دیا۔ فرطِ سرور نے شاعر کے دماغ کو صلاحیتِ غور و فکر سے محروم کر دیا۔ اس نے سلام کرتے اور تشکر آمیز لفظ کہتے ہوئے ایک خاص انداز و لہجہ میں مصرع سنایا۔ مصرع کا ختم ہونا تھا کہ مرحوم نے خلافِ عادت ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ اب شاعر کی آنکھیں کھلیں اور سمجھا کہ بسمل سا متین شخص کیوں بے تحاشا داد دئے جا رہا تھا وہ اس مصرع کا مصداق ہو کر رہ گیا۔ ع کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ اہلِ محفل پر جو ابھی تک اس راز کو نہ سمجھے تھے سناٹا سا چھا گیا۔ لیکن اس باکمال نے محض تمسخر و استہزا ہی پر قناعت نہ کی۔ ذرا اصلاحِ دیگر ستم کو ایسا دور کیا کہ باید و شاید۔ فرمایا: وکیل صاحب، آپ کی "سادگی" تعریف و توصیف سے مستغنی ہے لیکن فکر کرتے وقت ذرا ذم کے پہلو کا بھی خیال رکھا کیجئے۔ اگر یوں کہتے ع ہو بعد بھی ایسا کہ ہے جیسا رہے آگے۔ تو مصرع بے عیب ہوتا۔

آپ کے برادرِ خورد افتخار الشعراء سید افتخار حسین صاحب مضطر، اپنی شاعری کی نو مشقی کے زمانے میں آپ ہی سے مشورہ سخن کیا کرتے تھے مگر طبیعتوں میں آگ اور پانی کا سا فرق تھا۔ بسمل صاحب کے کلام کا طرۂ امتیاز صوفیانہ رنگ کا سوز و گداز اور مضطر صاحب غزل کی معاملہ بندی کے دلدل میں پھنسے ہوئے، اصلاح دیتے ہوئے کئی بار فرما چکے تھے کہ غزل چھنالا نہیں معاملہ بندی پر اگر رنگِ ابتذال چھا گیا تو پھر وہ غزل نہیں رہتی بھٹیاریوں کی لڑائی ہو جاتی ہے۔ لطیف ابہام و اشارات اس کی جان ہیں، مگر مضطر اپنی افتادِ طبیعت سے مجبور تھے، جب کبھی غزل لیکر گئے اصلاح کے ساتھ گھرکیوں جھڑکیوں سے محروم نہ رہے۔ ایک دن ایک غزل دکھائی جس کے مقطع کا مصرع دوم ہے۔

بڑے جلاد ہیں ماں باپ بھائی دیکھنے والے

ابتدا میں خدا جانے کیا کچھ کہا، مگر جب اس مصرع پر پہونچے تو طبعِ نازک تابِ غضب نہ لا سکی، کاغذ کے پرزے پرزے کر ڈالے اور فرمایا: خبردار! آج سے میرے سامنے غزل لیکر نہ آنا۔ مضطر صاحب پر جو کچھ گزری ہوگی اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس واقعے کے بعد شاید پھر کبھی کلام دکھانے کی جرأت نہ ہوئی۔

"بڑے صاحب" یعنی "جناب نواب مستطاب ایجنٹ گورنر جنرل صاحب بہادر، راجپوتانہ" جب دورہ کرنے نکلتے تھے تو سب ریاستوں کے معتمد مع حشم و خدم ہمراہِ رکاب ہوتے تھے اور وہ اس "لشکرِ ظفر پیکر" کو ساتھ لئے لئے باجاہ و جلال خسروانہ رؤسائے راجپوتانہ کے دلوں پر تاجِ برطانیہ کی صولت و سطوت کا سکہ جماتے اور سیاسی گتھیاں سلجھاتے چھتریوں کے دعاوی و طول و عرض میں مباحث کرتے تھے۔ صرف اس ریاست کا معتمد اس "لشکرِ ظفر پیکر" سے چند روز کے لئے جدا ہو جاتا تھا جس کی طرف "جناب نواب مستطاب" متعطف فرما ہونے والے ہوتے تھے لیکن بسمل مرحوم اس قید سے آزاد تھے۔ آپ صرف اسی وقت ٹونک تشریف لے جاتے جب وہاں "نزولِ رایاتِ اجلال" ہوتا۔ لشکرِ ظفر پیکر نے حدودِ ریاست سے قدم نکالا اور یہ اجمیر واپس۔ جہاں آپ برسات اور جاڑوں میں رہا کرتے تھے، درگاہ خواجہ صاحب کے بلند دروازے کے سامنے جو بازار ہے وہ "گاؤ بازار" کے نام سے مشہور ہے اس میں ایک بالاخانہ کرایہ پر لے رکھا تھا۔ ایک قوال کا [illegible] بے ناہل پہ

ملازم تھا۔ ہر روز شام کو حاضر ہوتا۔ کبھی اوروں کی کبھی خود اُنہیں کی غزلیں سُنا کر چلا جاتا۔ ایک دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔
آپ کے ایک عزیز جو کسی رشتے سے ماموں ہوتے تھے اجمیر میں قیام کر چکے تھے اور ان کا ایک "حُسن فروش بازاری" سے تعلق تھا
یہ ہر جمعرات کو درگاہ میں حاضری دیا کرتی تھی۔ اور واپسی میں اکثر ملنے آ جاتی۔ بسمل مرحوم اُس زمانے کی یادگار تھے کہ جب
تعلقات کا احترام اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ لوگ اپنے بزرگوں کے ملنے والوں کے ساتھ خواہ وضیع ہوں یا شریف، اسی قدر
و منزلت سے پیش آتے تھے جس سے اپنے حقیقی رشتہ داروں سے — وہ اسے "ممانی" کہہ کر خطاب کیا کرتے تھے اور وہ انھیں
"بھیّا" کہتی تھی۔ وہ اجاتی تو خود مسند چھوڑ کر کنارہ ہو بیٹھتے۔ مرحوم کو موسیقی کا بہت شوق تھا۔ کہیں سے ایک بہت عمدہ جوڑی
طبلوں کی منگائی تھی اور وہ نشست ہی میں رکھی تھی۔ حسب معمول "ممانی" آئیں۔ باتیں کرتے کرتے جوڑی پر نظر پڑی۔
بولیں۔ "بھیّا۔ یہ جوڑی کب منگائی؟"
بسمل۔ تھوڑے ہی دن ہوئے۔
ممانی۔ بھیّا۔ ذرا میں بھی دیکھوں کیسی ہے؟
بسمل۔ شوق سے۔ ارے فلانے جوڑی اوتار کر آپ کو دکھا۔
نوکر نے تعمیل ارشاد کی۔ "ممانی" نے دو ایک گتیں بجا کر کہا۔ بھیّا۔ "جوڑی تو بڑی اچھی ہے"۔

بسمل۔ ذرا مجھے تو دیجئے۔
ممانی نے جوڑی ان کی طرف سرکا دی اور انھوں نے اسے نیچے سڑک پر پھینک دیا۔ گرتے ہی چکنا چور ہو گئی۔ "ممانی"
اس حرکت پر سنّاٹا۔ آخر انھوں نے کہا۔ "بھیّا یہ کیا غضب کیا؟" مرحوم نے جواب دیا۔ یہ میرے اور آپ کے درمیان رنج
باعث ہو جاتی۔ اس لیے میں نے فساد کی جڑ ہی کو کاٹ دیا۔ اس کی قیمت ہی کیا۔ یہی آٹھ دس روپے۔ آپکو پسند آ جاتے،
میں نہ دوں یہ ہو نہیں سکتا۔ اگر آپ کی نذر نہ کرتا تو آپ کو خیال ہوتا کہ بسمل نے ذرا سی چیز کیلئے آنکھ چرائی اور دے دیتا تو
تو مجھے خیال ہوتا کہ "ممانی" "میرے شوق کی چیز لے گئیں۔ اس لیے نہ رہے بانس نہ باجے بانسری" ممانی بہت شرمندہ ہوئیں
اور کہنے لگیں "بھیّا۔ میرا ہرگز یہ منشا نہ تھا کہ اسے آپ مجھے دیدیں۔ میں نے تو رسمی طور سے یونہیں اسکی تعریف کر
اسی طرح کے دو اور واقعات ہیں جو ان کے مزاج کے اسی پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اجمیر میں تھے۔ صد روپے
نوٹ اپنے والدہ کی خدمت میں روانہ کئے۔ نوکر ڈاکخانہ جا کر بیمہ کرا آیا اور رسید لا کر دیدی۔ کچھ دیر بعد خیال آیا کہ
ان میں کوئی نوٹ جعلی ہوا تو پولیس مقدمہ چلا دے گی۔ پھر کیا تھا۔ اللہ دے اور بندہ لے احباب سے جو حاضر تھے
کیوں صاحب یہ رجسٹری واپس مل سکتی ہے؟ ایک صاحب جو ڈاکخانے کے قاعدوں سے واقف تھے، بولے۔

"کیوں نہیں"۔
بسمل۔ اچھا بھائی۔ تو اسے واپس لے آؤ۔

دوست۔ خیریت۔ آخر کیوں ؟
بسمل۔" فرض کیجئے کہ ان نوٹوں میں سے کوئی جعلی ہوا۔ اور اماں نے اسے بازار بھنانے بھیجدیا۔ وہ پکڑا گیا اور پولیس نے مقدمہ چلایا تو وہ عدالت اور پولیس میں کھینچی کھینچی پھریں گی !! بسمل کی ماں اور یہ بے عزتی !!! خدا کی قسم زندہ درگور ہوجانے کا مقام ہے "!
دوستوں نے سمجھایا کہ یہ محض آپ کا خیال ہی خیال ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ اتفاق سے وہ صاحب بھی موجود تھے جن کی معرفت یہ نوٹ آئے تھے انھوں نے بھی یقین دلانے کی کوشش کی کہ نوٹ سب اصلی ہیں کوئی جعلی نہیں۔ مگر سنتا کون ہے۔ وہ برابر کہے جارہے ہیں "۔ میری والدہ تو عورت ذات ہیں۔ مردوں کو بھی اپنے پاس ایسی مخدوش چیز نہ رکھنی چاہیئے۔ بھائی تم لادو۔ میں تو انھیں جلاؤں گا "
دوستوں نے جب یہ دیکھا کہ کسی طرح ماننے ہی نہیں تو ایک صاحب جاکر جنتری لے آئے۔ ایک اور دوست نے ان کے آتے ہی لفافہ جھپٹ لیا اور کہا " مجھ سے ضمارروپے لے لیجئے میں ان نوٹوں سے نپٹ لوں گا " مگر وہ بولے " مجھ میں آپ میں فرق ہی کیا ہے۔ جیسے میں جیل گیا۔ ویسے آپ گئے۔ بھائی میں تمھیں یہ نوٹ نہیں دوں گا۔ جیسے میری عزت ویسی تمھاری "۔ وہ لفافہ نہ دیتے تھے اور یہ اسے لینے اور جلانے پر تلے ہوئے تھے۔ کچھ دیر کے انکار اور اصرار کے بعد اونھوں نے ہتھیار ڈالدیے۔ لفافہ حوالہ کردیا۔ آپ نے خدا کا شکر کیا کہ خاندان واحباب سب ذلت سے بچ گئے انگیٹھی دہک رہی تھی۔ لفافہ نذر آتش کردیا۔ جبتک جلکر خاک سیاہ نہ ہوگیا بغور دیکھتے رہے۔ اس کے جل چکنے کے بعد ایسے خوش تھے جیسے دین ودنیا کی ساری دولت مل گئی ہو۔
عرصے کے بعد ایک دوست ملنے آئے۔ ہمدم دیرینہ تھے خاطر و مدارات کی انتہا نہ تھی۔ رات کو دیر تک عہد کہن کی یاد تازہ کی جاتی رہی۔ بارہ بجے کے قریب بسمل صاحب اپنے کمرے میں سونے چلے گئے اور وہ ان کے کمرے سے ملے ہوئے کمرے میں غفلت میں زور زور سے خراٹے لینے لگے۔ آپ کی آنکھ کھل گئی۔ فوراً نوکر کو آواز دی۔ وہ حاضر آیا۔ آپ نے حکم دیا۔ "میاں۔ انھیں اسی وقت بزرگ سرائے میں پہونچادو۔ یہ مجھے سونے نہیں دیتے " نوکر نے بہت کچھ مودبانہ عرض کیا۔ یہانتک کہا کہ اس میں حضور کی سخت بدنامی ہے۔ مگر مرغے کی ایک ہی ٹانگ۔ نہ مانے اور انھیں بھجوا کر دم لیا۔ وہ بیچارہ ایسے شرمندہ ہوئے کہ صبح سویرے ہی چل دیئے۔
مزاج کا یہ رنگ اپنی جلوہ آرائی میں فرق مراتب سے بالاتر تھا۔ آپ والیٔ ٹونک کے اوستاد بھی تھے اور اس سلسلہ میں وہ سو روپے ماہوار دیتے تھے۔ ایک دفعہ کسی بات پر بگڑ کر وطن چلے گئے۔ نواب قدرشناس و مزاجداں تھے حکم دیا کہ نذرانہ جاری رہے اور جہاں ہو بھیجدیا جائے۔ مہینہ ختم ہوا تو تعمیل حکم میں منی آرڈر خیرآباد بھیجا گیا۔ آپ نے واپس کردیا۔ نواب مرحوم کو منانے کے لیے سال بھر کوشش کرنی پڑی۔

مرحوم اردو کے شاعر تھے مجھے ان کے اسی قسم کے کلام کے نمونے پیش کرنے چاہئیں۔ لیکن یہ میرے دسترس سے باہر ہے۔ میں نے تو سنی سنائی غزلوں ہی کے چند شعر جو یاد رہ گئے ہیں ہدیۂ ناظرین کر سکتا ہوں۔ روایت یہ ضرور ہے کہ ایک مکمل دیوان مرتب کیا تھا جو جناب مضطر صاحب کے پاس تھا۔ اگر روایت حقیقت پر مبنی ہے تو پھر یہ جناب جان نثار حسین صبا اختری کا کام ہے کہ قدر دانان و شایقان کمال کی دیدہ افروزی کے لیے اسے شایع فرمائیں۔ مرحوم کی ایک مشہور غزل کے، جو دریوزہ گران اجمیر کا کاسۂ گدائی بھرتی رہتی ہے۔ تین شعر یہ ہیں۔ ؎

دلدادگانِ حُسن سے پردہ نہ چاہیئے — دل لے کے چھپ گئے تمہیں ایسا نہ چاہیئے
زاہد تو بخشے جائیں گنہگار منہہ تکیں — اے رحمتِ خدا تجھے ایسا نہ چاہیئے
بسمل مزارِ حضرتِ خواجہ نہ چھوڑیئے — اجمیر کے دیار سے جانا نہ چاہیئے

ایک اور غزل کے، جو محفل رقص و سرود کی گرمی کا باعث ہے، چند شعر یہ ہیں ؎

تم تو کرتے ہو دل لگی دل کی — کیا بتاؤ گے بیکلی دل کی
عہد تھا ان کے گھر نہ جانے کا — ہائے بیتابی لے چلی دل کی
بے خودی میں بتا دیا میں نے — بات ظالم نے پوچھ لی دل کی
شمع رو دیکھ حالِ پروانہ — بُری ہوتی ہے لو لگی دل کی

ان کی باتوں میں آگیا بسمل
تو نے مٹی خراب کی دل کی

اب وہ قصیدے تبرکاً و تیمناً ہدیۂ ناظرین ہیں جو اس باکمال کے کلک گوہر بار سے بہ تقلید رسم زمانہ یا بہ تقاضائے گردشِ ایام، ٹپک پڑے ہیں۔ سلاست و روانی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ دوسرا قصیدہ قاآنی کے اس مشہور قصیدے کی ردیف و قافیہ میں ہے۔

نسیم خلد می وزد مگر ز جویبارہا — کہ بوئے مشک می دہد ہوائے مرغزارہا
فراز خاک و خشتہا دمیدہ سبزہ کشتہا — چہ کشتہا بہشتہا نہ دہ نہ صد ہزارہا
ز خاک رستہ لالہا چو بسدیں پیالہا — بہ برگ لالہ ژالہا چو در شفق ستارہا

(۱)

گلبانگ نوائے عندلیب خامہ مدحت تقریر بہ چشم روشنی نزدل موکب اقبال وا دولیست کہ صیت معدلتش از کرانا تا کراں رسیدہ وصریر کلک ارادت تغیرہ تہنیت رونق فروزی وادا دائر فریست کہ آوازۂ بلند نامیش از ماہ تا بماہ مشتہرہ۔ عادلے فرمانروائے کہ داد گدہ عدلش رفرفام بر خلاف را امتیازے درمیان باقی نیست و باذل حاتم سخائے

نہ لب تشنہ زلال جام رحمتش بیک جرعۂ نوشی صہبائے جود احسانش محتاج رحیق بذل ساقی نے ــ بہ اہتزاز نسیم مکرمتش از اہیر ریاض راجستان سرشار شگفتگی فرخندہ فشانی است و بہ لمعات مہر سیمائے ہمتش ذرات کم فروستان ناکامی جہاں سیمیا نمائے تابانی - جناب معلی القاب حضور فیض معمور ستی - آئی مسٹر الفرڈ کومن لائل صاحب بادر رزیڈنٹ راجستان - دام اقبالہم -

تا حضرت لائل شد فرماندہ راجستاں　　گوئی کہ دریں گلشن یک بارہ بہار آمد
آں صاحب عالیشاں مرہم ہر دلریشاں　　ملجائے صفا کیشاں با عز و وقار آمد
چوں رفت سوئے لندن آمد دگر از موطن　　در نخل امید من برگ و گل بار آمد
گلشن ہمہ آبو شد ایں غلغلہ ہر سو شد　　یک آمدن او شد بہتر ز ہزار آمد
دست من و دامانش چشم و رخ تابانش　　ہم دست بجائے شد ہم دیدہ لکار آمد
از نعرۂ پر شورش شد پیل سیہ مورش　　ذر پنجۂ پر زورش ضیغم بہ شکار آمد
دشمن کہ دم جنگش آورد فرا چنگش　　شد عرصہ بجاں تنگش زیں سان آفشار آمد
آں غیرت خورشید چوں از منزل خود بیروں　　اختر ز سر گردوں از بہر نثار آمد
ساغر بہ کف دستش مخمور طرب ہستش　　در چشم سیہ مستش نے کیف خمار آمد
ہستند سفیرانش در سایۂ دامانش　　نے بذل نہ احسانش در حد شمار آمد
بسمل چہ ز غم نالی دامن نہ بری خالی　　دریاب خوش اقبالی مہرش بہ تو یار آمد

(۲۳ - مئی ۱۸۷۷ء)

(۲)

قصیدہ در مدح جناب ہلال رکاب ثریا جاہ، انجم سپاہ خاقان زمان، کیوان ایوان، سکندر بخت، گردوں تخت جناب حشمت مآب صاحب ریذیڈنٹ بہادر راجستان دام حشمتہم و اقبالہم -

ھو المستعان

اے بہ فروغ روئے تو در تن خور شرارہا　　وے ز بہار حسن تو خوں ہمہ لالہ زارہا
نعرۂ طرہ ات ستد باج ز صد تتارہا　　در دل گل فرو شکست رنگ رخ تو خارہا

ہست سریر جاہ را با تو صد افتخارہا

یافتہ ام ز اوج بخت چوں تو امیر ارجمند　　بے مکنم ز جور چرخ زحمت و رنج چند چند

آمدہ ام بہ درگہت خستہ و رنجہ دردمند   ہست بہ عرصۂ جہاں بانگ سخائے تو بلند
گردِ تو خلق زاں شدہ است چوں گُل ہزارہا

ناز بہ بخت زیبدم راہ نیاز پوئمیا   گل ز دہن چہ ریزدم مدحت شاہ گوئمیا
روئے نیاز دم بہ کس با تو پناہ جوئمیا   پائے فرو شکستہ خود دست ز آز شوئمیا
تا بدر تو غنی شدم گشت مرا قرار ہا

زردی روئے خور چرا لرزہ بے سبب ہست   می تپدش بہ ہر زماں ترس چہ ہست اوچہ بہ ہست
کس نکشود گیں ہمہ سوزش تابِ تب چہ ہست   دبدبۂ تو کار کرد خلق دریں عجب چہ ہست
مہر ز رعب سوختہ ہست در اضطرار ہا

مہر تو لی چہ تیرہ ہست ایں ہمہ روزگار من   رفت بہ غارت خزاں رنگ من و بہار من
سازندہ دار ما بہ ہیں حالت زار زار من   از سر لطف یار شو زود درآ بہ کار من
بستۂ دست جود تو ہست کشود کار ہا

ہم چو فزاید از بہار نزہت و رنگ و چمن   رونق تازہ یافتہ است از تو زمین ہم زمن
تن ہمہ ملک جاں تو ئی در سبا د جان تن   زیر نگیں شود ترا خلق بر ب ذو المنن
باد فزوں ترا از ہمہ بہر تو اختیار ہا

ہست بہ بزم دل گشت عیش و سرور نائے و نوش   مطرب خوش نوا ہم زمزمہ سنج دمی بہ جوش
بانگ ندِ سرود چنگ کرد پئے خوش دلی کوش   مست نشاط ہر یکے غیر ز من کس بہ ہوش
اے عجبا کہ می کشم زحمت صد خمار ہا

بسمل جاں فدا کہ ہست از غم و غصہ در شکنج   سفتہ بہ سلک نظم خویش مدح تو با چہ فکر و رنج
ایں گہر گراں بہا در نظرت سبک سنج   خود ز کرم در آ بدہ داد سخن بگنج گنج
کس نتواند آورد جود تو در شمار ہا

۱۱ جون ۱۹۰۷ء

رباعیات

(۱) پیتے ہیں شراب اور پیے جاتے ہیں   یوں ان کے قریب تر کھنچے جاتے ہیں
آنکھوں میں جھلک رہی ہے روح بادہ   مرتے جو نہیں تو یوں جیے جاتے ہیں

(۲) دن رات مئے ناب پیے جاتے ہیں   آواز دف و چنگ سنے جاتے ہیں
مرنا مرنا پکارتی ہے دنیا   ہم ہیں کہ یہ سال جیے جاتے ہیں

شیام سلونے

(از سید اقبال عظیم ایم۔ اے۔ اسسٹنٹ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول سلطانپور)

گوکل والے کنجبہاری
برج کے کنہیا کرشن بہاری
بانسری والے وہ بنواری
شیام سلونے گِروردھاری

کاندھے پہ کالے کیش سجائے
آنکھوں میں ست کی جوت جگائے
رنگ رچائے، دھوم مچائے
سامنے دیکھو، گردھر آئے — گوکل والے......

لب پہ تبسم، ہلکا ہلکا
نور کا ساگر، چھلکا چھلکا
بانا کِرپا ڈھلکا ڈھلکا
تیج سے مکھڑا، دمکا دمکا — گوکل والے....

تخت پہ راجہ، رَن میں سپاہی
بھیس فقیری، شان میں شاہی
پریت کی کیسی ریت نباہی
چاند ستارے ان کے گواہی — گوکل والے...

رادھکا کی آنکھوں کے تارے
گوپیوں کو بھی جان سے پیارے
متھرا نواسی، راج دولارے
پریم کی نیا ان کے سہارے
گوکل والے .....

پورب چھائے، پچھم چھائے
اوتر، دکھن، سب اپنائے
بنسی کی ایسی تان سنائے
سوتی ہوئی بستی کو جگائے
گوکل والے ....

یُدھ میں یودھا، بن میں کھلاڑی
پھاگ بھی کھیلا، جنگ بھی چھیڑی
مَن کے بھی کومل، بات بھی تیکھی
لیلا تمھاری ایک پہیلی
گوکل والے ....

ہند کے باسی کان لگا کے
سُن تو تجھے یہ کون پُکارے
پاپ سے تو نے جوڑے ہیں ناتے
بھول گیا تو ان کے سندیسے
گوکل والے ... ...

غزل

اک خون کا دریا ہر منظر سے پھوٹ بہا ہے جانے کیوں
اللہ! تری دُنیا میں آج اک حشر بپا ہے جانے کیوں

ہر لہر فضا میں مضطر ہے، ہر موج ہوا کی بے کل ہے
ہر دل میں طلب کا جانے کیا، ہر لب پہ دعا ہے جانے کیوں

گنگا کے ماتھے پر بل ہے، دجلہ کی جبیں پر شکنیں ہیں
کچھ بھولی باتوں کو مشرق پھر سوچ رہا ہے جانے کیوں

ہر صبح کو کلیاں ہنستی ہیں، شاخوں پر چڑیاں گاتی ہیں
شبنم کی قسمت میں رونا اُف! ایسے خدا ہے جانے کیوں

اب سیر چمن کو کیا جائیں، دریا کے کنارے کیا دیکھیں!
اک پھول سا کھلا آنکھوں میں پھر نظروں میں جلتا ہے جانے کیوں

گلگشتِ مصلّٰی

افراد

ثریّا — صدرِ محفل

خورشید
ناہید — فریقِ اول

زہرہ
پروین — فریقِ ثانی

دیگر خواتین جو شریکِ محفل ہیں

مشرقی طرز پر آراستہ ایک ایوان

مسندِ صدارت پر ثریّا جلوہ افروز ہیں۔ ایک ایرانی قالین پر خورشید و ناہید متمکن ہیں
مقابل میں دوسرے قالین پر زہرہ اور پروین۔
سامنے متعدد خواتین تشریف فرما ہیں۔

ثریّا (تقریرِ صدارت کا آغاز کرتے ہوئے)

محترم خواتین!

گلگشتِ مصلّٰی کے نام سے بیت طرازی کی جو محفل منعقد ہو رہی ہے وہ ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔ بیت طرازی کے سلسلے میں اب تک یہی پابندی ضروری تھی کہ فریقِ اوّل کا شعر جس ردیف پر ختم ہو فریقِ ثانی کا شعر اسی حرف سے شروع ہو۔ آج کی محفل میں ایک نئی پابندی بھی شامل ہے جس نے اس مقابلہ کا حسن کچھ اور بڑھا دیا ہے۔ اس نئے دستور کے مطابق فریقِ اول کا پہلا شعر "ا" سے شروع ہو کر الف پر ختم ہوگا۔ اس کے جواب میں ایسا شعر پڑھا جائیگا جو "ا" سے شروع ہو کر "ب" پر ختم

اسی ترتیب کے ساتھ تہی [illegible] تک پہنچ جائے گا۔
بعض فن کاروں نے بہت سی لطیف پابندیوں سے آزاد ہونے ہی میں فن کی عظمت محسوس کی ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کرنا چاہئے کہ حسن کا کوئی تصور نقوش و خطوط کی پابندیوں سے آزاد نہیں ہو سکتا۔
وقت کم ہے اور آپ کے ساتھ میں بھی اس خواہش میں شریک ہوں کہ جلد ہی اس دلچسپ تقریب کا آغاز ہو سکے۔ ایک طرف محترمہ خورشید صاحبہ اور ناہید صاحبہ ہیں۔ مقابلہ میں دوسری طرف زہرہ صاحبہ اور محترمہ پروین ہیں۔ میں خورشید صاحبہ سے درخواست کروں گی کہ وہ اپنے شعر سے بزم کا افتتاح فرمائیں۔ اس حقیقت کا اظہار دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ آج کی محفل میں جس قدر اشعار پڑھے جائیں گے وہ سب جدید اور غیر مطبوعہ ہوں گے۔ ہاں! خورشید صاحبہ بسم اللہ

خورشید آسرا وہ بھی شامِ فرقت کا خواب تو دیکھئے! محبت کا

مختلف آوازیں

سبحان اللہ! کیا حسن خیال ہے

سیاست و تمدن کی پیاست وہ ازہاں اور فروغ انسانیت کی امیدیں؟
خاتمۂ جنگ اور اس سے وابستہ توقعات پر اس سے زیادہ معنی خیز تبصرہ ممکن نہیں!
جناب! یہ تغزل کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ سیاست اور جنگ سے اس شعر کو کیوں تباہ کیا جا رہا ہے۔

زہرہ: اس حسن تنقید سے تو سیاست اور تغزل دونوں کے حواس گم ہو جائیں گے۔ لیجئے شعر سنئے۔

اٹھ رہا ہے روئے جاناں سے نقاب سر بسجدہ ہیں سکون و اضطراب

مختلف آوازیں

بہت ہی خوب شعر ہے۔ مگر سیاسی اشارات کے لئے یہاں بھی بہت کچھ امکانات ہیں۔
بجا فرمایا! شاید مطلب یہ ہے آپ کا کہ چہرۂ جنگ جناب بے نقاب ہوتا جاتا ہے
مشرق کا سکون اور مغرب کا اضطراب دونوں سر جھکاتے جاتے ہیں۔
خدا آپکو اس تنقید عالیہ کا اجر عظیم عطا فرمائے مگر شاید غزل آپ کی اس نوازش کی تاب نہیں لا سکے گی۔

ناہید: شعر و تنقید کے خدمتگزاروں سے میں صرف یہ عرض کروں گی۔

بہت نازک ہے احساسِ محبت ذرا اے چارہ گر پاسِ محبت

مختلف آوازیں

صد ہزار آفریں! کیا شعر فرمایا ہے آپ نے! کاش تنقید جدید کے علمبردار اس پاکیزہ مشورہ کا احترام کر سکیں
سبحان اللہ! کس قدر لطیف شعر ہے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]! مگر [illegible] نہیں سکی [illegible]

کرد ار شاد ہو!

سبحان اللہ سبحان اللہ، شعر نہیں اک دیوان ہے۔

دیوان یا دیوانوں کا انتخاب" کیا حسن مبالغہ ہے۔

پرویں مگر آئینہ تنقید کے بغیر شعر کا حسن نمایاں نہیں ہو سکتا۔ آخر اس نزاکت شعری سے فائدہ ہی کیا جو تنقید کی شوخ نگاہی بھی برداشت نہ کر سکے۔ لیجئے شعر سنئے!

تابِ غم لا نہ سکے جو وہ مسرت ہے عبث درد بنیاد نہ ہو جس کی وہ راحت ہے عبث

مختلف آوازیں

کاش قصر جمہوریت کے دروازے پر یہ شعر لکھ دیا جائے۔

سبحان اللہ! اسے کہتے ہیں شعر فہمی"

سچ تو کہا ہے جناب! اس میں نافہمی کی بات ہی کیا ہے، اس ایوان کی بنیاد درد انسانیت کی جگہ نشاط تمدن کی کمزور سطح پر رکھی جا رہی ہے۔

کاش پہلے سے معلوم ہوتا کہ یہ محفل شعر و ادب نہیں۔ رزمگاہ محبت و سیاست ہے۔

شکر ہے اب تو آپکو معلوم ہوا۔

خورشید:۔ کیا ادب برائے زندگی کا نظریہ اس قدر وحشت ناک ہے کہ ہم زندگی کے حقائق سے بھی بیزار ہو جائیں دلوں کی یہ ناپختگی حسن خیال کے حجاب میں نہیں چھپ سکے گی، شعر سنئے۔

ثبوتِ عشق ہے معروف رونمائی آج اُڑا اڑا سا ہے کچھ رنگ دلربائی آج

مختلف آوازیں

مبارک ہو۔ زندگی کے حقائق رنگ دلربائی کی طرح اُڑے اُڑے سے نظر آتے ہیں۔

معلوم نہیں یہ ثبوت عشق ہے ۔۔۔ یا رونمائی کی معروفیت

شعر اس قدر دلچسپ نہیں۔ جس قدر دلکش تبصرہ اس پر صرف کیا جا رہا ہے۔

رہے نہ دو کا مزید ہو کر یہ تنگ خیالی۔

زہرہ۔ کیا میں آپکو یاد دلاؤں کہ یہ کوئی تقریری مقابلہ نہیں۔ شعر و ادب کی ایک جلوہ گاہ ہے۔ بجئے میں پھر آپکو حسن تغزل کیطرف متوجہ کروں گی۔

جھلک رہی ہے صباحت میں وہ ملاحتِ طبع روش: نثار ہو جس پہ حیاتِ خضر و مسیح

یہ ہے حسن تغزل:

دہی صباحت و ملاحت کی فرسودہ کہانی!

[illegible]

زندہ باد غزل، اور حسن غزل
اور تخلص بھی۔

ناھید :۔ جب تک عشق ہے، غزل بھی ہے۔
کوئی مانے نہ مانے اپنا عقیدہ تو یہی ہے

حقیقت تلخ، کیف آگہی تلخ بغیر عشق، حباب زندگی تلخ

مختلف آوازیں

بجا ارشاد ہوا۔ اس کے سوا مراد زندگی ہی کیا ہے۔ غزل سنئے اور سر دھنئے!
آپ سر نہ دھنیں۔ لیکن غزل سے یہ سرکشی بھی تو اچھی نہیں معلوم ہوتی۔
شاید اس لئے کہ بعض طبائع کو تلخیاں ہی پسند ہوتی ہیں۔
جی ہاں! صبر تلخ است ولیکن بر شیریں دارد

پروین :۔ تکلف برطرف ایک سادہ شعر سنئے!

خلوت دل میں ہے وہ جان تمنا آباد آفریں جذب محبت، تری دنیا آباد

مختلف آوازیں

خوب اسے کہتے ہیں سادگی و پُرکاری
یہ شعر غالباً اس وقت پڑھا جائے گا جب کامریڈ اسٹالین لندن تشریف لے جائیں گے۔
گزشتہ ملاقاتوں کی بازگشت کا تقاضہ تو یہی ہے۔
اچھے شعر کی مصیبت یہی ہوتی ہے کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔

خورشید :۔ اب ایک ایسا شعر سنئے جس سے شاید آپ کی مصیبت ٹل جائے۔

دردِ دل جس سے فزوں ہو وہ سکوں پیدا کر عشق خوددار ہو جس سے وہ جنوں پیدا کر

مختلف آوازیں

بیشک یہ شعر نہیں حل مشکلات ہے۔
غریب ہندوستانی اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں۔
تحمل برا نہیں۔ لیکن سکون و جنون کی آفرینش کیا کوئی کھیل ہے۔
ہندوستان کی آبادی یونہی کیا کم ہے۔
شعر سنئے؛ تعیشِ خاموش نگاہوں سے بھی ہو سکتی ہے۔

زہرہ :۔ شوخی تنقید مبارک! آپ شعر سنئے

رسیدہ مجھ سے نہ ہو جائے بہار گلشن ناز نسیم شوق سے خدمت ہے حفاظت پروانہ

مختلف آوازیں

یہ ہے غزل کی سحر آفرینی، کس قدر پیارا شعر ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مشرق اپنی فرسودہ قدامت سے جدا ہونا نہیں چاہتا۔

یہ فرسودہ قدامت ہے کہ حیات نو کا آغاز

غزل میں سب کچھ کہہ لیجئے، عمل میں کچھ بھی نہیں۔

ناہید:- کوئی رسیدہ ہو یا کشیدہ آپ شعر سنتے جائیے!

ایک آواز ع "ہر حسن کی ادا ہے شعر شریفانہ"

ناہید:- شکریہ اس شریفانہ احساس کے لئے، اس اشعر سنئے!

زندگی ہے کشمکشِ امید و یاس کھو نہ جانا اے دلِ فرداشناس

مختلف آوازیں

یہ ہے شعر، تیغِ کشیدہ سے زیادہ حسین۔

سبحان اللہ! داد دینا بھی ختم ہے کسی پر۔ یہ شعر ہے یا زندگی کی بے نقاب تصویر،

ایسی تصویر جس کی نقاب کشائی شاید فرشتوں کے ہاتھوں ہوئی ہو۔

یہ عرفان تو شاید فرشتوں کو بھی میسر نہیں۔

تصوف کے ہزاروں مقامات اسی شعر میں پوشیدہ ہیں۔

شاید اسی لئے آپ غزل کو "وحدہٗ لاشریک" سے ملاقات کی تقریب بنانا چاہتے ہیں۔

غنیمت ہے کسی "مرہونِ ہزار شیوہ ہرجائی" کی اتنی غزل پسندی کا بھی بہت ہے۔

پردیں:- تنقید کی دلکشی نے اشعار کو بھی دل سے بھلا دیا۔ مجھے شعر یاد نہیں آرہا۔

(ایک آواز) یاد کیجئے ہچے اور معنی

پردیں:- شکریہ! آپ کے آموختہ سے شعر یاد آگیا۔

سلامت اجتنابِ حسنِ روپوش ہوا جاتا ہے عالم خود فراموش

مختلف آوازیں

سبحان اللہ! کیا شعر پڑھ دیا ہے آپ نے۔ ایسا شعر برسوں میں بھی یاد آئے تو غنیمت ہے۔

جی بجا ارشاد ہوا۔ "اس کو بھولا نہ چاہئے کہنا"

دوسرا معرعہ نہ پڑھئے، اس کی فصاحت میں بہت سوں کو شک ہے۔

سمجھ جائیے اور آئندہ پڑھئے تو "[illegible] معرعہ" پھر فصیح کیوں ہونے لگا۔

[illegible] نے اس بحث کو [illegible] واہ واہ آپ پردیں صاحب!

کیا شعر ارشاد ہوا ہے۔ خود فراموشیٔ عالم اور لقصا باجن مد ہوش ، کیا برابر کے ٹکڑے ہیں۔
کیا نکتہ ہے۔ ایک صبح مشرق ہے تو دوسرا شام مغرب،

پھر وہی مشرق و مغرب،

جو کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔

خورشید:۔ مشرق ہو یا مغرب، شمع ہو یا پروانہ، جلوہ گاہ سحر میں سب کا حال یکساں ہے۔ یہ شعر سنئے!

شعلۂ شمع ہے صورت کشِ سوزِ اخلاص خاکِ پروانہ ہے تصویرِ فروزِ اخلاص

مختلف آوازیں۔

شعر بہت اچھا ہے۔ ش اور س کا تلازمہ تھا بھی بہت مشکل، پھر بھی شعر برا نہیں۔

تلازمہ مشکل ضرور تھا۔ لیکن دنیا میں ملوکیت و اشتراکیت کے اتحاد سے زیادہ مشکل مراحل طے ہو جاتے ہیں۔

پھر وہی سیاسی کھچڑی۔

شمع و پروانہ کی داستان سن کر اگر گلہائے آتشیں یاد آجائیں تو تعجب ہی کیا۔

کاش اس گفتگو میں اخلاص بھی شامل ہو۔

جس کے بغیر شعر کا سمجھنا ہی محال ہے۔

زہرہ:۔ یہ شعر آپ کے خلوص کی نذر ہے۔

صبحِ الم سے واسطہ، شامِ بلا سے کیا غرض اہلِ وفا کو گردشِ ارض و سما سے کیا غرض

مختلف آوازیں

یہ شعر نہیں وطن پرستی کا مرقع ہے۔

آپ شاید یہ فرمائیں کہ جنگ ہو یا صلح، مشرق ہو یا مغرب، ہندوستان والا اہلیانِ ہندوستان سب سے ممتاز ہیں۔

ذوقِ وفا کی داد خوب مرحمت ہوئی۔

خوب! کیا آپ بھی اہلِ وفا کے قافلے میں شریک ہیں۔ مبارک!

یہی ذوقِ تنقید ہے تو گردشِ ارض و سما بھی کب تک۔

ناصر:۔ کاش ہندوستان اسی طرح اپنی خودداری کا ساتھ دے سکتا۔ مگر مجھے تو فی الحال آپ کو ایک شعر سنانا ہے۔

ضرور ہے کہ ہوا دل کو اشتباہ، غلط اس انجمن میں ہے خودداریٔ نگاہ غلط

مختلف آوازیں

یہ اعتراف جرم ہے، یا جرمِ اعتراف

آپ ابھی تک مبتلائے اشتباہ ہیں۔

مغالطہ بھی تو زندگی کی ایک بڑی حقیقت ہے۔
خدا کرے کوئی صاحب تصحیح کا ثواب حاصل کرنے پر مجبور نہ ہو جائیں۔
تاکہ آپ کا مغالطہ قائم رہے۔
شکریہ! مغالطہ زندہ باد

پردیپ :- معلوم نہیں ہماری انجمن میں ناصحانِ مشفق اکثریت میں ہیں یا رفیقانِ سادہ دل،
ہاں —— یہ تو معلوم ہو ہی جائے گا۔ شعر تو سنئے :

طریقِ چارہ گرِ عشق کا خدا حافظ ۔۔۔ کہ دردِ دل نے سکوں سے کہا خدا حافظ

مختلف آوازیں

لطافتِ شعریت کا خدا حافظ! کس قدر غیر دلچسپ شعر ہے۔
"ط" اور "ظ" کا تلازمہ کچھ آسان بھی نہیں تھا۔
تو جناب! شعر گفتن چہ ضرور، شعر تو یوں بھی ہو جاتا "طور اچھے نہیں خدا حافظ
دل اندوہگیں! خدا حافظ"

آپ شاید ناصح مشفق معلوم ہوتے ہیں؟
اس سادگی کے لئے شکریہ!

خورشید :- اب ایک اور غیر دلچسپ شعر آپ سنیں گے!

ظلمتِ غم میں ہوا کم نہ فروغِ امید ۔۔۔ بادلوں میں بھی فروزاں رہی تنویرِ شعاع

مختلف آوازیں

یہ انکسار تھا یا اظہارِ واقعہ
معلوم ہوتا ہے کہ کوئی سیاسی پیشوا روحانی الجھنوں کو سلجھانے کے لئے "اندرونی" روشنی کے نسخے سجھا رہا ہے!
شعر اس قدر دلچسپی کا تو مستحق نہ تھا۔
آپ کے تبصرہ نے مزید دلچسپ بنا دیا۔

زہرہ :- شاید یہ شعر کسی قدر (زیادہ) پسند آئے۔

عشق نے بخشا دو عالم سے فراغ ۔۔۔ صبح ہوتے بجھ گئے سارے چراغ

مختلف آوازیں

یہ شعر نہیں معمہ ہے۔
اس میں "تصنگی" بھی ہے اور "گیان" بھی
عشق و معرفت کی منزلوں سے بھی آگے ہے یہ شعر،

ایشیا کی روحِ لطیف اسی شعر میں درخشاں ہے۔
مشرق کی عظمت کا بیانہ ہے یہ شعر،
شکریہ! یہ قصیدہ اب مختصر ہونا چاہئے! شعر بہت اچھا ہے اور بس
ناہید:۔ زہرہ صاحبہ کا شعر اس قدر پُرکیف تھا کہ مجھے اپنا شعر یاد نہیں آتا ... — ہاں! یاد آیا، سنئے!

غور سے دیکھا جو روئے کفر و ایماں کی طرف — یہ بھی یزداں کی طرف تھا وہ بھی یزداں کی طرف

مختلف آوازیں
یہ شعر ہے یا شیخ کبیر کی تعلیم کا خلاصہ
ہندو مسلم اتحاد کی تبلیغ کے لئے یہ شعر "آشرم بھجاولی" میں شامل ہونا چاہئے!
"آشرم بھجاولی" گویا "زبورِ ہند" کا ترجمہ ہے۔
مجید خوش مذاقی ہے، اچھے شعر کو آشرم میں لیجانا کیا بہت ضروری ہے۔
آشرم میں تو شعر سے زیادہ نازک اور لطیف چہرے بھی ہوتے ہیں۔
درست ہے۔ "دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیر ما"
پروین:۔ آشرم ہوں یا خانقاہیں، مدرسے ہوں یا عجائب خانے"
— — — یہ سب سازِ ہستی کی عارضی منزلیں ہیں۔
(ایک آواز) "شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما — اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما"
پروین:۔ اب اس شعر کی تفسیر سنئے!

فنا ہلاکِ محبت، بقا نشانۂ عشق — تمام عالمِ امکاں ہے اک بہانۂ عشق

مختلف آوازیں۔
تمام مذاہب یہی کہتے ہیں۔
اس حقیقت سے انکار کفر ہے، گلگشتِ مصلّیٰ بھی تو بہانۂ عشق میں شامل ہے۔
یہ شعر جس قدر حسین ہے اسی قدر صداقت افروز بھی ہے۔
حسن اور صداقت ایک ہی شئے کے دو نام ہیں۔
"حُسن" کو آپ شئے کہتے ہیں۔ حالانکہ اس کی الوہیت اس تعین سے بلند ہے۔
سبحان اللہ! بہت اچھا شعر پڑھا آپ نے۔ "عشق زندہ باد"
خورشید:۔ گلگشتِ مصلّیٰ کا قافلہ اب اس مقام پر پہنچ چکا ہے کہ یہ شعر آپ کے سامنے پڑھا جائے۔

بتولِ پاک نگاہاں ہے وہ دلِ بیباک — جنوں سے جس کے گریبانِ کائنات ہو چاک

مختلف آوازیں۔

کیا بات ہے چاک گریباں کی تلقین اور اس دلکش انداز میں۔
آپ نے کائنات کی نمائندگی فرمائی ہے یا پاک نگاہوں کی۔

دل بیباک کے لئے نکتہ چیں ہونا ضروری نہیں۔

اچھا شعر سن کر چپ بھی تو نہیں رہا جاتا۔

خاموشی جرم ہے اظہار صداقت کے لئے۔

"خموشی معنیٔ دارد کہ درگفتن نمی آید"

مگر ــــــــــ غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

زہرہ ــــــــــ تنقید کا دلکش سلسلہ اس قدر خیال افروز ہوتا جا رہا ہے کہ شعر پڑھنے کی ہمت

جواب دے رہی ہے۔

(ایک آواز) ــــــــــ بجا ارشاد ہوا، شد پریشاں خواب ما از کثرت تعبیرہا

دوسری آواز ــــــــــ کچھ تو پڑھئے کہ ہم بھی کہتے ہیں۔

زہرہ ــــــــــ تعمیل ارشاد کے لئے حاضر ہوں، سنئے!

کچھ ہوش ہے تو بادۂ عشرت نہ کر قبول جس میں نہ سوز غم ہو وہ جنت نہ کر قبول

مختلف آوازیں

شعر بھی اچھا ہے، اور پڑھا بھی آپ نے بہت اچھا!

یہ ہوش کی تعریف ہے یا بادۂ عشرت کی

آپ شاید سوز غم کے بہانے سے جنت کی طرف عازم ہیں۔

اور آنجناب جنت کی یاد میں سوز غم کی طرف

بھئی، اس شعر میں سیاست کے بھی لطیف نکات پنہاں ہیں۔

گویا پاکستان کے بغیر ہندوستان کی آزادی بے کار ہے۔

یا آزادی کے بغیر پاکستان،

پھر وہی سوز غم اور جنت کی تقسیم،

تقسیم، یا امتزاج لطیف۔

ناصید:- شاید یہ شعر قابل التفات ہو۔

لطف میں رہا پنہاں اجتناب کا عالم پاس سے وہ یوں گزرے جیسے خواب کا عالم

مختلف آوازیں

تغزل میں شعر کے حسن کو محدود نہ کیجئے۔ اس میں کچھ اور حقائق بھی شامل ہیں۔

مشتاق ــــــ

اتحادی قائدین مشرقی سیاحت کے سلسلہ میں ایران تک زحمت گوارا فرمائیں اور ہندوستان منتظر ہی ہے۔

شعر فہمی بہ عالم بالا معلوم شد

عالم بالا سے "ارض روسیہ" تو مراد نہیں

یہ خواب ہے یا بیداری

کچھ بھی نہیں "لطف اجتناب"

پرویں ــــــ تنقید کے حجاب میں جو چہرے فروزاں نظر آتے ہیں۔ کاش ہمیں یہ معلوم ہوتا۔

ایک آواز ــــــ وہ شاعرہ کی آواز ہے معلوم نہیں کیوں

ایک اور آواز ــــــ مطرب ہے۔ خوش انداز ہے معلوم نہیں کیوں

ــــــ الامان والحفیظ اسلئے تو دیکھئے۔ ہاں! پرویں صاحبہ، ارشاد

پرویں ــــــ اب کیا کہا جائے۔ خیر شعر سنئے۔

محبت کی دہکتی آگ میں جلنا نہیں آساں ٹھہر! اے بوالہوس اس راہ میں چلنا نہیں آساں

مختلف آوازیں

کیا شعر پڑھ دیا ہے آپ نے۔ آتشکدہ ہے آتشکدہ

گویا پرویں صاحبہ پریشاں ہیں۔

یہ سدرۃ المنتہیٰ ہے۔ آگے نہ بڑھیئے۔

سدرۃ المنتہیٰ، یہاں سے تو عرش بھی دور نہیں۔

سچ کہا ہے آپ نے سے حریم شوق ہو یا خلوت ناز جہاں تم ہو وہیں عرش بریں ہے

بہ عرش آفرینی چھوڑئیے! محبت کی دہکتی ہوئی آگ بھی نزدیک ہے۔

خورشید :- جنت دوزخ کے بعد اب ایک اور عالم آپ کا منتظر ہے۔

نہ کوئی آرزو ہے اور نہ حسرت ہے جہاں تم ہو ہر عالم محبت ہی محبت ہے جہاں تم ہو

مختلف آوازیں

اچھا شعر ہے جہاں محبت ہے۔ وہاں کیا نہیں!

ــــــ سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں

ــــــ بے ہمہ و باہمہ

معمولی شعر ہے اس کے لئے اس قدر کاوش ستائش بے کار

معمولی اشیاء بھی ہماری نگاہ محبت کی منتظر رہتی ہیں۔

یہ وعظ تو سرِ منبر اچھا معلوم ہوتا

وہ اب بھی بہت بلند ہیں۔

یا پھر آپ کی نگاہیں

شکریہ!

زہرہ ——— ایک اور معمولی شعر سنئے!

وادیٔ شوق ہے ویرانۂ خیال آوارہ   ہم کہاں اور کہاں جلوہ گہِ نظارہ

مختلف آوازیں

یہ شعر تو معمولی نہیں ——— بہت اچھا شعر ہے۔

الفاظ کے بغیر لطف شاعری ہی کہاں،

کیا یہ انجمن جلوہ گہہ نظارہ سے کم ہے۔

مگر ویرانیٔ شوق اور آوارگیٔ خیال کا علاج

صرف صداقت عشق

ع اے طبیب جملہ علت ہائے ما

ناہید

اچھا تو ایک ایسا شعر سنئے جو نہ معمولی ہے نہ غیر معمولی

ایک آواز ——— شاید آپ مقام اعراف سے نشر فرما رہی ہیں۔

ایک اور آواز ——— ہم اہل جنت۔ آپ کو کہاں سمجھیں

——— آپ کے ساتھ شریک ہونا کہیں حماقت نہو!

ناہید- اس ملک میں جس طرح رہنا زیادہ ہیں اور رہرو کم، اس طرح اچھے اشعار سے "تنقیدی اشارات" اکثریت میں ہیں۔ آپ بیت کے حقوق کا کچھ تو خیال فرمائیے! مختصر یہ ہے کہ شعر سنئے۔

ہوائے دامنِ محبوب لطف بار ہوئی   حیاتِ عشق ز سر تا قدم بہار ہوئی

مختلف آوازیں

بہار آفریں شعر، بہار جاوداں

کیا خزاں جاوداں نہیں ہوتی

ہوش گم ہوں تو کیا نہیں ہوتا"

حیات عشق چاک گریباں سے مراد ہے یا دامن محبوب سے

[illegible]

شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی
خود کھل جائے گی زنجیر روایات کہن

پردیں ــــ لیجئے! اب اس سلسلے کا آخری شعر سنئے!

ــــــ حرف آخر

ــــــ تو آپ ہیں خاتم الاشعار

پردیں :- حسن خاتمہ کی امید رکھئے اور شعر سنئے!

یا رب اس نرگس مخمور کی محفل آباد　　آج زاہد بھی خراباتنشیں ہوتا ہے۔

مختلف آوازیں

کاش یہ شعر بھی مطلع ہوتا۔

وہ بنا بہ امید قائم

لیجئے مطلع حاضر ہے

یہ بھی اے نرگس مخمور کہیں ہوتا ہے
آج زاہد بھی خراباتنشیں ہوتا ہے

شکریہ! برجستہ مطلع ہے

ناصح مشفق تو نہیں ہیں آپ!

زاہد کبھی تنہا نہیں ہوتا۔

اچھا تو دونوں موجود ہیں۔ "قران السعدین"

ــــــ رخصت

ثریا

خواتین محترم!

دلی شکریہ! کہ آپ نے شوق اور دلچسپی کے ساتھ اس محفل کو اختتام تک پہنچایا۔ اشعار کی خوبی کا اندازہ اس دلکش اور لطیف تنقید سے ہو سکتا ہے۔ جو آپ کے ذوق سلیم کی ترجمانی کرتی رہی۔

اس انجمن کی خوش بختی سے کون انکار کریگا۔ آسمان کے ستارے جس کی کشش سے زمین پر اتر آئے۔ امید ہے کہ خورشید و ناہید اور زہرہ و پردیں اپنا آسمانی مخلوق میں بھی کچھ نہ بھولیں گی آ؟ دیکھئے حضرت زاہد غالباً ناصح مشفق سے خفا ہو کر خراباتنشین ہوتے جا رہے ہیں۔ بہتر ہے کہ ہم بھی نرگس مخمور کا شکریہ ادا کرتے ہوئے آپ سے رخصت ہوں۔

[illegible]

برشگال

(از جناب سروش صاحب)

مژدہ باد اے ہمنشیں پھر آیا دورِ برشگال — پھر ہوا بزمِ زمانہ کا فزوں حسن و جمال
آتشِ نمرودِ گرما کے شرارے بجھ گئے — پھر نظر آنے خدا کی رحمتوں کے نیک فال
پھر ہوا کے سرد جھونکے لائے عشرت کی نوید — پھر مٹا نامِ عذاب و کلفت و رنج و ملال
جوششِ مستی میں پھر کالی گھٹائیں چھا گئیں — پھر مسلط ہو گیا عالم پہ سحرِ برشگال
عطر بو گھلتی ہوئی مستانہ وش آئی نسیم — ہو گئی زہاد کو بھی پھر قدح خواری حلال
پھر محبت کی رگوں میں کوئی نشتر زن ہوا — پھر پپیہے کی صدا کرنے لگی جی کو نڈھال
پھر لبِ قمری سے نکلا نعرۂ حق سرّہٗ — "کوہو کوہو" بولا کوئی طائرِ شیریں مقال
چرخ پر بادل خرامِ ناز دکھلانے لگے — کی زمیں طاؤس نے رقصِ طرب سے پائمال
میکدوں میں پھر مئے گلرنگ کے ساغر چلے — پھر بنا پیغمبرِ جشنِ مسرت برشگال
کوزۂ ہستی سے بادہ پھوٹ کر بہنے لگا — آگیا رندانِ دریا نوش کی روحوں کو حال
آسماں سے ننھی ننھی بوندیاں گرنے لگیں — بوستاں میں ڈالیوں سے آم ٹپکے لال لال
پھر نقابِ ابر سے جھانکا سرِ بامِ فلک — برق بن کر اک نگارِ شوخ و آزادہ خیال
جابجا جھولوں میں جھولیں نازنیناں شباب — پھر بہارِ حسن کا ہر سمت سے ٹپکا کمال
کنجِ تنہائی میں حسن و عشق پھر باہم ملے — ہو گیا پھر حل ممات و زندگانی کا سوال
پھر ہوئی عرشِ بریں سے بارشِ آبِ حیات — پھر ہوا شاداب و تازہ دہرِ افسردہ مال
ندیوں کی گود میں طوفان لہرانے لگے — خضر پیراہن ہوئے میدان و کوہسار و جبال
قالبِ گوہر میں پھر باراں کا ہر قطرہ ڈھلا — خاک کا دامن ہوا پھر فیضِ حق سے مالا مال
کیفیت ساماں ہوئے رنگیں مزاجِ انساں سروش — بن گیا پھر خطۂ پاکِ وطن جنت مثال

قطعات

از جناب اختر رضوانی صاحب ساگر ہوٹل لاہور

(۱)

وقت پر دوست بھی ہوئے دشمن گردشیں دیکھئے زمانے کی
اشکِ غم، ضربِ دل، خمِ فرقت سُرخیاں ہیں مرے فسانے کی

(۲)

چاک یوں غم میں دل کو سیتا ہوں دھجیاں کھینچکر گریباں سے
دامنِ موج پر سفینہ ہے کھیلتا جا رہا ہوں طوفاں سے

(۳)

ابر، ساغر، بہار، مے، نغمہ مختلف نام ہیں جوانی کے
اب بھی اِن سے گئی بہاروں میں رنگ بھرتا ہوں زندگانی کے

(۴)

آج مغرب زدہ زمانے میں ہم سے مانوس کون ہوتا ہے
اہلِ زر عقل پر ہوئے حاوی بےکسوں کا نصیب سوتا ہے

(۵)

بھر دے اے ساقیِ چمن افروز زیست کی کامرانیاں بھر دے
وہ بہار آئی، وہ ہوا سنکی جام میں ارغوانیاں بھر دے

(۶)

مجھ سے پُوچھو مآلِ بزمِ طرب رنگ افسردہ زندگی کا ہے
دوست جب سے لہو میں جوش نہیں شمع مدھم ہے، جام پھیکا ہے

ایٹم بم

از جناب مسیح الدین صاحب لکھنؤ

۶ اگست ۱۹۴۵ء نے دنیا کی تاریخ میں ایک نہایت اہم (دنیا کے تمام واقعات سے اہم) باب کھولا۔ جو ہروشیما جاپانی وقت سے ۹ بجکر ۵ امنٹ پر بم کا نشانہ بنا جس نے آن کی آن میں شہر کی دو تہائی آبادی اور شہر کا وجود صفحۂ ہستی سے نابود کر دیا۔ چند ہی منٹ پہلے تک ہروشیما جاپان کا ایک مشہور شہر تھا۔ فوجی لحاظ سے بھی اس کی اہمیت بہت تھی۔ جس کی آبادی تقریبًا ۳۵۰۰۰۰ تھی۔ جس میں سڑکیں تھیں۔ نہریں تھیں۔ فوجی چھاؤنیاں تھیں، کارخانے تھے۔ مگر چند ہی منٹ میں شہر کا بیشتر حصہ تودۂ خاک ہو گیا۔ ہوا میں ایک روشنی ہوئی جس سے آنکھیں خیرہ ہو گئیں، پھر زلزلہ خیز دھماکا۔ چند ہی سکنڈ میں تمام شہر جس میں زندگی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ ہوا میں دھوئیں کے بادلوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ دھوئیں پہاڑ کی طرح ۴۰۰۰۰ فیٹ کی بلندی تک اٹھ رہے تھے۔ ہزاروں فیٹ اونچی تو محض گرد تھی۔ اور ۴۸ گھنٹے تک فضا میں دھوئیں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کے بعد کچھ شعلے بھی نمودار ہونے لگے۔ جو اتنے طاقتور تھے کہ تمام مشینیں جو آگ بجھانے کے لئے استعمال کی جا سکتی تھیں اس کے آگے بالکل بیکار ثابت ہوئیں۔ پانی کے چشمے اور نہریں بھی اس آگ کے لئے سدِّ راہ نہ بن سکیں۔ شعلوں کی نکلی ہوئی زبانوں کی پیاس نہ بجھا سکیں۔ زندگی کے تمام احساسات سلب ہو گئے۔ اور تمام کا تمام شہر موت کی نیند سو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کوئی عذابِ الٰہی نازل ہوا، یا کوئی شیطانی آلہ کارفرما ہوا جس نے ایک بہت بڑے سڑک کوٹنے والے انجن کی طرح سارے شہر کو کچل کر برابر کر دیا۔ سیمنٹ اور کنکریٹ کی کچھ چھوٹی چھوٹی زمین دوز عمارتیں جو خاص طور پر ہوائی حملے کے لئے بنائی گئی تھیں اور ایک کارخانہ کی چمنی کے سوا اور کچھ صحیح و سالم نہ رہا۔ شاید یہ چیزیں بھی اپنی بربادی کا حال کہنے کے لئے باقی رہ گئی ہیں۔

یہ حملہ ایک امریکہ کے ہوائی جہاز سے ہوا۔ جو ہزارہا فیٹ کی بلندی پر اڑ رہا تھا۔ اس ہوائی جہاز کا افسر کرنل پال ڈبلو۔ بی۔ ٹی بٹس تھا۔ بم کا لے جانا اور گرانا بھی ایک خطرناک کام تھا۔ اسی لئے اس پہلے بم گرانے والے کو واپسی پر فورًا تمغہ سے سرفراز کیا گیا۔

اس کا وزن ۴۰۰ پونڈ ہے۔ یہ بلاک بسٹر کا ۱/۲۰ ہوتا ہے مگر اس کی طاقت ۲۲۰۰۰ پونڈ والے انگریزی بموں کے ۲ گنا سے بھی زیادہ ہے۔

ہروشیما کی تمام بربادی کا ذمہ دار محض ایک بم ہے جس کو ایٹم بم کے نام سے موسوم کرتے ہیں اس کا استعمال لڑائی کو جلد از جلد ختم کرنے کے لئے کیا گیا۔ ایٹم "جزو لایتجزیٰ" کو کہتے ہیں مادی نظریہ کے مطابق کائنات عالم

تمام مادہ ہے اور مادہ کا آخری جزو جو غیر منقسم ہوتا ہے اُسے "جوہر فرد" یا "ایٹم" کے نام سے موسوم کرتے ہیں موخرین نے اس میں کچھ اور تحقیقاتیں کیں اور "جوہر فرد" کے دو ٹکڑے بنائے۔ "بعض" برقیہ ([illegible]) اور مرکز سالمات ([illegible]) کہتے ہیں "برقیہ" مرکز سالمہ کے گرد اس طرح چکر لگاتا ہے جیسے "سورج کے گرد نظام شمسی"۔ برقیہ اور مرکز سالمہ کے مختلف تناسب ملنے سے دنیا کی مختلف چیزیں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ مگر فی الحال اس سے کچھ خاص مقصد حل نہیں ہوتا۔ کیونکہ جو طاقت پورے جوہر فرد میں پائی گئی ہے۔ وہ برقیہ یا مرکز سالمہ میں نہیں ملتی۔

"جوہر فرد" کی طاقت کا احساس ابتک کسی کو نہ تھا۔ اس کے بارے میں تحقیقاتیں جاری تھیں۔ دنیا میں ابتک برقی، حراری یا کیمیاوی طاقتوں کا علم تھا۔ اور اس سے جہانتک ممکن ہے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں کام بھی لیا جاتا ہے۔ "جوہر فرد" ([illegible]) کی طاقت نے تمام دنیا میں ہلچل پیدا کر دی۔ سائنسداں انگشت بدنداں ہو گئے۔ اس کے انکشاف سے ایک انقلاب رونما ہوتا ہے۔ اور اب اس سے کیا کیا ممکن ہے؟ صحیح طور پر سونچا بھی نہیں جا سکتا۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے "جوہر فرد" کی طاقت پر دوسروں کی دقت رفع کرنے کے لئے یوں اظہار خیال کرتے ہوئے بتایا کہ سورج میں کوئلہ نہیں جلتا۔ ستاروں کی روشنی میں کوئی چیز نہیں۔ اسی طرح جوہر فرد کی طاقت کے لئے کسی جلنے والی شئے کی حاجت نہیں، "ایٹم بم" کا اصلی جزو "یورانیم" ہے۔ "یورانیم" زیادہ تر ([illegible]) میں ہوتا ہے۔ "یورانیم" دو طرح کا ہوتا ہے۔ یعنی یورانیم نمبر ۲۳۸ اور یورانیم نمبر ۲۳۵۔ مگر "ایٹم بم" کے لئے یورانیم اسوٹاپ نمبر ۲۳۵ ([illegible]) کی ضرورت ہے۔ یہ اصلی دھات سے محض ۱/۱۴۰ حصہ نکلتا ہے۔ بقیہ ... حصے بے کار ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ ایک بہت قیمتی دھات ہو جاتی اور اپنی اہمیت کے لحاظ سے تو شاید دنیا کی تمام دھاتوں میں سب سے اہم ہو گی۔ یورانیم نمبر ۲۳۵ کو اصلی دھات سے علیحدہ کرنے میں بہت سا وقت، بہت سے آدمی اور بہت بڑی بڑی فیکٹریاں درکار ہیں۔ چنانچہ ۱۹۴۲ء تک امریکہ کے سائنسدانوں نے محض ... اگرین یورانیم نمبر ۲۳۵ نکال پایا تھا۔

یورانیم کے جوہر فرد کو اگر پھاڑ دیا جائے تو زبردست طاقت بنتی ہے۔ اس کے پھاڑنے کے طریق عمل کو ایٹم بمباری کہتے ہیں۔ یورانیم کے جوہر فرد کی ایٹم بمباری میں بھاری پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ایٹم بمباری میں کچھ سست رفتاری پیدا کرتا ہے۔ ۱۹۴۰ء میں ۴۰ پونڈ بھاری پانی فرانس سے انگلینڈ پہنچا دیا گیا۔ ایٹم بم کی تیاری میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

ایٹم بم کے خاص اجزائے ترکیبی یورانیم نمبر ۲۳۵ ریڈیم [illegible] [illegible] اور تھوڑی سی [illegible] ہے۔ جب ریڈیم کی شعاعیں [illegible] سے ملتی ہیں تو ان میں ایک خاص طاقت پیدا ہو جاتی ہے جو یورانیم کے جوہر فرد کے ٹکڑے کر سکتی ہیں۔ بہت سے جوہر فرد کے ایک ساتھ ٹوٹنے کے ڈر سے [illegible]

استعمال ہوتا ہے۔ یورانیم کے ٹکڑے جب پھٹتے ہیں تو ان میں بہت سے Neutrons پیدا ہوتے ہیں۔ نیوٹرون میں بجلی نہیں پائی جاتی۔ نیوٹرون کے جدا ہونے اور ان کے تبادلے نوع سے ان میں پھٹنے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ یورانیم کے جوہر فرد کے پھٹنے سے جو نیوٹرون پیدا ہوتے ہیں وہ اپنے طریق عمل کو جاری رکھتے ہیں اور اس کو دہراتے جاتے ہیں۔ اس طرح وہ جتنی دور تک اپنے اثرات پھیلا سکتے ہیں ان تمام ایٹموں میں پھٹنے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور چند لمحوں میں یہ طاقت اپنا غیظ و غضب سطح ارضی پر پوری طرح ظاہر کر دیتی ہے۔

جوہر فرد کی طاقت کا سب سے پہلے انیسویں صدی کے آخر سے پتہ لگایا جا رہا ہے ۱۸۹۶ء میں فرانس کے سائنسداں نے یورانیم اور اس کی شعاع فشانی Radiation پر اظہار خیال کیا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں میری Marie اور پیری کیوری Pierre Curie نے ۴۰ اور اجزائے ترکیبی بتائے۔ جن کی خصوصیات تقریباً یکساں تھیں، اس میں ریڈیم کی ضو فشانی اصلی یورانیم سے ۱۰ لاکھ گنا زیادہ ثابت ہوئی اور اس کے بعد کچھ اور تحقیقات سے یہ پتہ چلا کہ یہ شعاعیں ایٹم کی ہیں۔ اور ایک کروڑ وولٹ تک طاقت پیدا کر سکتی ہے یہ چالیسوں عناصر شعاعی عناصر کہلائے۔

پہلی ہمہ گیر جنگ میں Radioactivity عمل شعاعی کے متعلق معلومات بہم پہنچنے لگیں اور ان عناصر کی طاقتوں کا الگ الگ احساس بھی ہوا۔ چنانچہ جوہر فرد بذات خود ایک پورے نظام شمسی کی سی چیز محسوس ہوئی۔ جس کا اندرونی حصہ سورج کی طرح اور برقیے Electrons جو اس کے گرد ہیں وہ پورے نظام شمسی کی طرح اس کے گرد چکر لگاتے ہیں۔

سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد یورانیم کی طاقت کے متعلق معلومات اور زیادہ ہمہ گیری سے شروع ہوئیں، یورانیم کے جوہر فرد کو پھاڑنے کے تجربات شروع ہوئے اور نیوٹرون میں ہر فرد کی تقسیم ممکن ہو گئی۔ اس کا Radioactivity شعاع زن ہونا بھی آسان معلوم ہونے لگا۔ ان میں شعاع ریزی پیدا کی گئی۔ اب جوہر فرد کی شعاعوں کی تحقیقات ہوئی۔ اس تحقیقات نے طبیعاتی دنیا میں ایک اور نئے باب کا اضافہ کر دیا۔

نیوٹرون سے بمباری کی تحقیقات میں دو جرمن سائنسدانوں کا خاص حصہ ہے۔ شروع سنہ ۱۹۳۹ء ہان Hahn اور سٹرس مین Strassmann نے ایک مضمون شائع کیا۔ جس میں انھوں نے جوہر فرد کے تقریباً دو برابر حصوں میں پھٹنے کے متعلق بحث کی، فوراً ہی اس کے تجربات دنیا کے دیگر حصوں میں ہوئے اور ان کے تجربات صحیح پائے گئے۔ لڑائی شروع ہونے کے قریب ایک جرمن یہودی ریاضی داں عورت Lise Meitner لیزا مائنر کے جوہر فرد کے پھٹنے کے متعلق روشنی ڈالی اپنی تحقیقات کے کچھ ہی دنوں بعد وہ جرمنی سے نکال دی گئی۔ مگر اس کی تحقیقات پر ہر جگہ زور شور سے کام ہونے لگا۔ ہٹلر نے بھی تمام مشہور جرمن سائنسدانوں کو قیصر ولیم کالج میں جمع کیا اور جو ...

کی طاقت پر ہر جگہ کے دار التجارب میں کام شروع ہو گیا۔ اور جب اس کی طاقت کا اندازہ ہوا تو دنیا کی تمام پرانی ایجادات اس کے سامنے بچوں کا کھیل نظر آنے لگیں۔ ابتک جتنی طاقتیں بھی تھیں، حراری، کیمیاوی یا کیمیاوی جو کارفرما تھیں ان کا مقابلہ جوہر فرد کی طاقت سے کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے آفتاب کو چراغ دکھانا ان طاقتوں سے جو ہر فرد کی طاقت کا کچھ استعمال ہوا ہے تو وہ دہائی دولٹ میں ہے۔ مگر جوہر فرد کی طاقت بذات خود وہ طاقت ہے جو بجائے دہائی میں۔ لاکھ گنا دولٹ دینے لگتی ہے۔ گویا اب ایک ایسی طاقت انسان کے ہاتھ آئی جو ابھی تک محض سورج اور دیگر سیاروں میں خیال کی جاتی تھی۔ اس طرح جوہر فرد کی طاقت جس بم میں استعمال کی جائے اس کا دھماکہ اور اثر اب تک کے بموں سے لاکھوں گنا بھی زیادہ ہونا کوئی تعجب انگیز چیز ہو گی۔

۱۹۳۹ء تک اس کی ایجادات کے متعلق تمام اتحادی و محوری طاقتوں میں تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ مگر جنگ شروع ہو جانے سے اس کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اب ہر ملک اپنی جگہ اس کو جلد از جلد ایجاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا گویا اس ایجاد کی حالت ایک دوڑ کی سی تھی اور سوال یہ تھا کہ اس میں کون بازی لے جائے۔ مسٹر چرچل نے بیان دیتے ہوئے یہ بتایا کہ برطانوی سائنسدان بھی ۱۹۳۹ء سے کام کر رہے تھے۔ سر جان تھامسن جنھیں "نوبل پرائز" مل چکا ہے وہ اس کے صدر بنائے گئے۔ بعد میں اور کمیٹی نے کام شروع کیا جس کی صدارت W. A. Acke نے کی اور جس میں جیمس چیڈوک "James Chadwick" اور [illegible] وغیرہ تھے۔ شروع میں دول متحدہ اور امریکہ کے سائنسدانوں میں تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ مگر بعد میں یہ بہتر سمجھا گیا کہ ان کی کوششیں اکٹھا کر دی جائیں۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء میں یہ اسکیم پریسیڈنٹ روز ویلٹ کی صلاح سے عمل میں لائی گئی۔ اور تمام سامان جس کی ضرورت تھی سب امریکہ پہنچا دیا گیا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ پہلی چیز یہ کہ اس کے تجربات کے لئے ایک بہت بڑا میدان چاہیے۔ تاکہ اگر کوئی حادثہ پیش آئے تو اس سے شہریوں کا نقصان نہ ہو۔ انگلینڈ ایک چھوٹا ملک ہے اور بم پھٹنے میں بہت زیادہ نقصانات کے امکان تھے۔

(۲) انگلینڈ بالکل جرمن حملہ کی زد میں تھا۔ اس لئے وہاں کسی بھی فیکٹری پر گولہ گر جانا کوئی ناممکن بات نہ تھی جس سے تحقیقات کے نامکمل رہ جانے کا ڈر تھا۔

(۳) تیسری چیز یہ کہ ایک ہی قسم کے تجربات دو جگہ ہو جانے کا خدشہ تھا۔ برخلاف اس کے امریکہ ان چیزوں سے بچا ہوا تھا۔ اور سائنسدانوں کی متحدہ کوشش ہو تو جلد کام ہو جانے کے زیادہ امکانات تھے۔

ان وجوہات کی بنا پر تمام لوگ امریکہ میں اکٹھا کر دئے گئے اور تحقیقات کا سارا خرچ امریکہ نے برداشت کیا۔

لڑائی کے شروع میں کچھ تحقیقات کا علم پریسیڈنٹ روز ویلٹ کو ہوا اور دوسرے سائنسدانوں کی کوشش سے پریسیڈنٹ نے اس کو بڑھایا۔ شروع میں یہ کام بحری محکمہ کے ماتحت تھا۔ پھر Brzonwee B[illegible]

کے ماتحت یہ کام کیا گیا۔

سنہ ۱۹۴۲ء میں اس گروپ نے اسے بہت بڑھانے کے لئے سفارش کی چنانچہ وہ بڑھایا گیا اور R. Jones [illegible] اس کے سکریٹری مقرر کئے گئے۔ اس کے بعد پریسیڈنٹ روزویلٹ نے ایک دوسری کمیٹی بنائی جس کے چیرمین Dr. Conant مقرر ہوئے اور اس چیز کی کوشش شروع ہوئی کہ جوہر فرد کی طاقت کا استعمال لڑائی ہی میں کیا جائے۔ وقت کی تنگی سے سنہ ۱۹۴۳ء میں واشنگٹن ٹنیسی میں دو فیکٹریاں قائم کی گئیں۔ تقریباً ۵۹۰۰۰ ایکڑ زمین خالی کرائی گئی۔ تاکہ شہری آبادی اس کے خطرے سے محفوظ رہے۔ اس شہر کا نام Oak Ridge ہوا۔ اس شہر میں محض وہ لوگ رکھے گئے جو اس میں کام کرتے ہیں ان کی تعداد تقریباً ۷۵۰۰۰ ہے۔ ان کے لئے کلب، چرچ اور کھیل کود وغیرہ کے سامان مہیا کئے گئے ہیں

دوسرا شہر واشنگٹن کے قریب ہے۔ اس کا نام Hanford رکھا گیا۔ جہاں کا رقبہ ۴۳۰۰۰۰ ایکڑ ہے اور آبادی ۱۷۰۰۰ ہے۔ اس میں کام کرنے والے اور ان کے گھر والے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ چھوٹی چھوٹی بہت سی لیبرٹری کناڈا، شکاگو اور کیلی فورنیا وغیرہ میں کام کر رہی تھیں جنہوں نے اس کی ترقی میں بہت ہاتھ بٹایا۔

میکسیکو کے ایک ڈاکٹر [illegible] نے بہت مدد کی اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جوہر فرد کی طاقت کی معلومات میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔ جوہر فرد کی تحقیقات ڈنمارک میں Dr. Niels Henrik Bohr ڈاکٹر نائل ہنرک بوہر کر رہا تھا۔ اور جب جرمنوں نے اس پر قبضہ کر لیا تو وہ اس کی تحقیقات میں بہت خاموش مطالعہ کرنے لگا۔ مگر اس کی تمام کوششیں بے کار رہیں۔ اور وہ اپنے تمام تحقیقاتی کاغذات وغیرہ انگلینڈ بھیجنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور بعد میں خود بھی وہاں چلا گیا۔ ان تمام لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ آج ایٹم بم کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔

جون سنہ ۱۹۴۵ء تک اس کی تحقیقات و تیاری میں ۱۹۵۰۰۰۰۰۰ شلنگ خرچ ہوئے۔ تحقیقاتی کوشش پریسیڈنٹ روزویلٹ کے حکم کے مطابق انتہائی راز میں رکھی گئی۔ کانگریس کے لوگوں کو خاص تاکید تھی کہ وہ جب دوسروں سے ملیں یا لوگ کچھ اس کے متعلق سوالات کریں تو ایٹم کی تحقیقات کے راز کا خیال رکھیں اور کوئی چیز ایسی زبان تک نہ آنے دیں جس سے کوئی بات ان لوگوں سے باہر ہو جائے جن کا خاص تعلق جنگ سے ہے۔ چنانچہ ریڈیو اور پریس نے بھی وہی رویہ اختیار کیا اور آخر وقت تک کسی کو کسی چیز کی بھی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ چیزیں اتنا صیغۂ راز میں رکھی گئیں کہ فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو بھی محض اتنی ہی اطلاع ہوتی تھی جتنے کا بتلا دینا انہیں لازمی تھا۔ سارے راز کو سوا ان لوگوں کے جو اوپر تھے کوئی نہ جان سکا۔ یہ ایک جنگی راز تھا اور اسی طرح نباہا گیا۔

جب ایٹم بم کے اجزا کا انکشاف ہو چکا تو سب سے پہلے ۱۶ جولائی سنہ ۱۹۴۵ء کو اس کا تجربہ کیا گیا

ایک آہنی ستون بنایا گیا اور ایٹم بم کے تمام اجزائے ترکیبی وہاں الگ الگ رکھ کر ملائے گئے، دو دن اس کی تیاری میں لگے۔ یہ تجربہ انتہائی خطرناک تھا۔ اور ہر لمحہ پر ساری تحقیقات اور اس کے رازداروں کے اُڑ جانے کا ڈر تھا۔ اور سارا کیا دھرا کام مٹی میں مل جاتا۔ مگر تمام خطرات بچ گئے اور تجربہ کامیاب ہوا۔ بم وقت معینہ پر پھٹا جس سے ایک روشنی ہوئی، پھر دھاکہ، آہنی ستون ہوا میں اڑ گیا۔ چند ہی منٹ میں یہ کرشمہ ہو گیا۔

اس تجربہ کی کامیابی کے بعد بنے ہوئے ایٹم بم کا پہلا تجربہ Almogordo کے ایک جنگل میں ہوا۔ ایک چمکدار گنبد ہوا میں اچھلی جس کی روشنی روز روشن سے کئی گنا زیادہ تھی۔ اس کے بعد ایک زبردست دھماکہ ہوا جس نے ۲۵۰ میل سے زیادہ دور تک کھڑکیاں ہلا دیں، البوقرق کا شہر جو آلموگورڈو سے ایکسو بیس میل کے فاصلے پر ہے۔ وہاں ایک اندھی لڑکی یک بیک چیخ اٹھی "ارے کیا ہے؟" یہ ایٹم بم کا پہلا تجربہ تھا اور حملے کے صرف ۲۰ دن پہلے کیا گیا۔

ایٹم بم نے سائنس کی دنیا میں ایک نئی روح پھونک دی۔ مادی نظریہ کے مطابق دنیا مادہ اور طاقت کی بنی ہوئی ہے۔ مگر مادہ کے جوہر خالص سے طاقت پیدا کرنا اور وہ بھی ایسی طاقت جو سورج اور سیاروں میں ہے سائنس کا ایک حیرت انگیز کرشمہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آئندہ یہ کس کام کے لئے استعمال ہوگی۔ اگر اس کا استعمال محض تخریبی کاموں کے لئے ہے تو وہ دن دور نہیں جب ساری تہذیب و تمدن، انسانیت کی ترقی و نظام یکدم جل بجھے گا۔ اگر اس کا استعمال آئندہ لڑائیوں میں مختلف اقوام سے ہوا تو معصوم شہری اور تمام حیوانی و نباتاتی زندگی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے گا اس لئے اس خطرہ کی روک تھام بھی بہت ضروری ہے۔ اگر اس کا باقاعدہ انتظام نہ کیا گیا تو ساری دنیا ایک دوامی ہول میں رہے گی۔ اسی ڈر سے امریکہ میں ان دنوں ایٹم بم کے تمام اجزائے ترکیبی پر سخت پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں مگر اس کے برخلاف اگر یہ طاقت تعمیری کاموں میں لگائی گئی تو انسانی ترقی کے افق پر گویا ایک نیا روشن ستارہ چمکے گا۔ جس کی رہنمائی سے انسان نہ معلوم کتنی منزلیں آگے جا سکے گا۔ اس طاقت سے ... اگھنٹہ تک موٹر چلانا۔ درختوں کے خانہ حیاتی [illegible] میں انجکشن دینے سے برسوں میں بڑھنے والے درخت کی باڑھ چند دنوں میں پوری ہو جائے گی اگر اس کی طاقت کا استعمال ہونے لگا اور جوہر فرد کی طاقت کچھ اور ارزاں ہو گئی تو کوئلہ پٹرول اور بجلی وغیرہ کی طاقتیں اس کے آگے بالکل بے کار ثابت ہوں گی۔ اب تک یہ طاقت چشم انسانی سے پوشیدہ تھی مگر اب اس کی حقیقت افشا ہو چکی ہے اور اس سے جتنے انقلاب رونما ہوں گے۔ اس کا اندازہ فی الحال مشکل ہے۔

نجمِ سحر

(از حکیم سید محمد خورشید حسین مضطر رضوی)

اے نجمِ سحر کس کی طرف تو نگراں ہے وہ ساقی کہاں ہیں وہ تری بزم کہاں ہے
نیرنگیٔ عالم نہیں اک رازِ نہاں ہے ہر لمحہ تغیر ہو، یہ آئینِ جہاں ہے

تو اپنا وہ گم گشتہ ارم ڈھونڈھ رہا ہے
یا ساتھیوں کے نقش قدم ڈھونڈھ رہا ہے

ہر وصل جدائی کا سبب ہوتا ہے ناداں ہر بزم کو لازم ہے کہ ہو جائے پریشاں
ہر نقشہ بدل دیتی ہے یہ گردشِ دوراں گو لاکھ بہار آئے اُجڑتا ہے گلستاں

ہے آج تو کل تازگیٔ گل نہیں رہتی
وہ پھول نہیں رہتے وہ بلبل نہیں رہتی

ہر نغمہ بدلتا ہے سدا نوحۂ غم سے تبدیل مسرت ہوا کرتی ہے الم سے
مٹ جاتے ہیں ہستی کے نشاں دستِ ستم سے نیرنگیٔ عالم کو تو پوچھے کوئی ہم سے

تو تنہا ہے بے یار و مددگار ہیں ہم بھی
زندانِ جدائی میں گرفتار ہیں ہم بھی

وہ ہم سے جدا تجھ سے جدا ہو گئے تارے لرزاں ہیں تری طرح سے تنہائی کے مارے
ہیں زندہ اس اُمید دل افزا کے سہارے شاید کہ تلطف کند آں شوخ نگارے

اُمید بجز خواب حسیں کچھ بھی نہیں ہے
وہ رحم پہ مائل ہے نہیں کچھ بھی نہیں ہے

کیا دن تھے کرتے تھے بجز سوزِ نہانی اک سانس محبت تھی تو اک سانس جوانی
دانست میں تھی نقش حجر ہستیٔ فانی نظروں میں تھی دھر کی تعمیر پرانی

ہم بستے تھے مستِ مئے گلفام محبت
گردش میں شب و روز رہا جامِ محبت

ہاں، اپنی محبت کا بھی انجام وہی تھا ہاں اپنی وفا کوشی کا انعام وہی تھا

انجام سکوں حاصلِ آرام وہی تھا — کیوں ہوتا نہ انجام وہی کام وہی تھا
یعنی کہ گرفتارِ بلا ہو گئے آخر
وہ ہم سے تو ہم اُن سے جدا ہو گئے آخر
اے نجمِ سحر تیرا خدا حافظ و ناصر — لے مہر کے آثار اُفق سے ہوئے ظاہر
مژدہ ہے کہ اب وہ نہ رہی قیدِ عناصر — مائل ہے ترے حال پہ کیا قدرتِ قادر
اُن کی نظرِ مہر اگر پائیں گے ہم بھی
اے نجم یقیں مان کہ مٹ جائینگے ہم بھی

غزل

(از جناب علی اشرف اڈیٹر منتظم حیدر آباد)

نہ جانے کیوں آج اپنے دامانِ آرزو کو سجا رہا ہوں
کہ پھر تخیل کی وادیوں کو دیارِ جنت بنا رہا ہوں

نہ جانے کیوں آج وحشتِ دل ہے پردہ دارِ سکونِ رحمت
خرد کی شمعیں بجھا بجھا کر جنوں کی مشعل جلا رہا ہوں

کچھ ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ مدعا غم نصیب ہے پھر
کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ نبضِ تسکین پا رہا ہوں

نفس کی یہ تیز آمد و شد خوشا پیامِ اجل ہی ٹھیرے
کہ ہمنشیں اب قریبِ منزل کھچا کھچا ہوں کہ آ رہا ہوں

وہ اُن کی نظروں کی دلفریبی، وہ اُن کے جلوؤں کی دلنوازی
یہ حال ہے آج تک بھی ہمدم فریبِ اُمید کھا رہا ہوں

ہے جس میں فرداد دی کی تصویر دل کی دھڑکن کیساتھ رقصاں
وہ نقشِ امروز نذر دینے کو جانِ اشرف میں لا رہا ہوں

یاد

جو دل ملائے رکھتی تھی وہ رات اب کہاں — تاروں کی چاندنی میں بھی رات اب کہاں
کالی گھٹا کے جاتے ہی ہم خود بھی کھو گئے — ساون کی گودیوں میں ملاقات اب کہاں

"محمد حسین"

رفتارِ زمانہ

یورپ کی جنگ تو ختم ہو چکی تھی، اب مشرق بعید کی جنگ بھی اچانک غیر متوقع طور پر ۱۵ اگست ۱۹۴۵ء کو ختم ہو گئی ہے۔ اس جنگ کے ختم ہونے کا سبب اجمالاً یہ ہے کہ اتحادی ہوائی جہازوں نے شب و روز کی مسلسل بمباریاں کر کے جاپان کی تمام انڈسٹری کو خاک میں ملا دیا تھا اور بیشمار جاپانی بحری جہازوں کے غرق ہو جانے سے اس کی اقتصادی حالت حد درجہ خراب ہو گئی تھی۔ اس پر فوری وجہ یہ ہوئی کہ ۶ اگست ۱۹۴۵ء کو جاپان کی اہم بندرگاہ ہیروشیما پر جو جاپان کا زبردست بحری مستقر بھی تھی۔ امریکن ہوائی جہاز نے سب سے پہلا ایٹم بم پھینکا۔ جس سے تقریباً تمام بندرگاہ نیست و نابود ہو گئی۔ اور لاکھوں آدمی موت کا شکار ہو گئے۔ اس کے بعد ۸ اگست کو شہر ناگاساکی پر دوسرا ایٹم بم پھینکا گیا۔ اس کا بھی حشر وہی ہوا۔ جو ہیروشیما کا ہوا تھا۔ اس کے بعد بقول شخصے کہ "مرتے کو ماریں شاہ مدار" روس نے بھی ۹ اگست کو جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر کے کوریا، منچوریا اور اندرونی منگولیا پر چڑھائی کر دی۔ ان تمام باتوں سے متاثر ہو کر بالآخر جاپان نے اعلان کر دیا کہ وہ امریکہ، برطانیہ اور چین کا اعلان منظور کرنے پر آمادہ ہے جو انھوں نے پاٹسڈم کانفرنس کے موقع پر کیا تھا۔ بشرطیکہ شہنشاہ جاپان کے اقتدار فرمانروائی پر کوئی حرف نہ آئے۔ اتحادیوں نے یہ شرط منظور کر لی اور جاپان نے بلا شرط ہار مان لی، امریکن جنگی جہاز "میسوری" پر جاپانی نمائندوں نے شکست نامہ پر دستخط کر دئے، اس کے بعد چین، برما، سنگاپور وغیرہ میں بھی جاپانی افسروں نے شکست نامہ پر دستخط کر دئے۔ اور رفتہ رفتہ اتحادی فوجوں نے نہ صرف جاپان کے جدید مفتوحہ علاقوں پر بلکہ اس کے پرانے علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ اور اب امریکن فوجیں جاپان کے اہم مقامات پر قابض و متسلط ہیں۔ امریکن جنرل میک آرتھر اتحادیوں کی جانب سے سپہ سالار اعلیٰ مقرر کر دئے گئے ہیں جنھوں نے ٹوکیو میں اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کر لیا ہے۔ اور جو حکم وہ دیتے ہیں اس کی جاپانی بے کم و کاست اور بلا پس و پیش تعمیل کرتے ہیں، منچوریا اور کوریا میں روس نے، چین اور ہند چینی کے شمالی حصہ میں چین نے اور برما، ملایا، سنگاپور اور ہانگ کانگ، بورنیو، سماٹرا، جاوہ جنوبی ہند چینی میں انگریزوں نے اور جزائر بحرالکاہل میں امریکنوں نے جاپانی فوجوں کو غیر مسلح کیا۔ منچوریا، جنوبی سیخالین اور مجمع الجزائر کیورائل پر روس نے قبضہ کر لیا ہے۔ جزیرہ فارموسا چین کو دوبارہ مل گیا ہے۔ الغرض "جاپانی ایمپائر" کا ہمیشہ کے لئے مکمل طور پر خاتمہ کر دیا گیا ہے۔

اتحادیوں کا مقصد یہ ہے کہ جاپان کو اس طرح شکنجہ میں جکڑا جائے کہ وہ فوجی، حرفتی، اقتصادی بلکہ نفسیاتی طور پر بھی کبھی سر اٹھانے کے قابل نہ رہے۔ خاص جاپان پر اتحادیوں کا قبضہ و تسلط کب تک رہیگا اس کا جواب فی الحال کوئی نہیں دیا جاسکتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جاپان ابھی مدتوں غلام بنا رہیگا

چین و روس

خیال تھا کہ روس نے منچوریا اور کوریا پر اس لئے حملہ کیا تھا کہ وہاں وہ جاپان کے خلاف اپنا اثر و اقتدار قائم کرے اور چین کو ان ملکوں سے محروم کر دے۔ لیکن اب چین و روس کے درمیان جو نیا معاہدہ ہوا ہے اس نے اس اندیشہ کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ جدید معاہدۂ روس و چین کی دفعات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ روس اور چین اخلاقی و مساوی طور پر اشتراک عمل کریں گے تاکہ جاپانی خطرہ کا پھر اعادہ نہو

۲۔ روس اپنی فوجی اور دیگر قسم کی امداد صرف چین کی قومی مرکزی گورنمنٹ کو دیگا

۳۔ مشرقی چین کے تینوں صوبوں میں چین کے اقتدار فرمانروائی اور بالادستی کا پورا احترام کیا جائے گا۔

۴ جنوبی منچوریا اور چینی مشرقی دونوں ریلوے لائنوں کو ملا کر ایک کر دیا جائیگا اس کا نام چینی چانگچوان ریلوے رکھا جائے گا۔ یہ انتظام ۳۰ برس کے لئے ہو جائیگا جس کے بعد بلا معاوضہ چین کو دیدی جائیگی۔

۵۔ چین کی بندرگاہ ڈیرین کو سب اقوام کی تجارت کے لئے کھول دیا جائیگا انتظام چین کا ہوگا۔

۶۔ پورٹ آرتھر کو ۳۰ برس کے لئے چین اور روس کا مشترکہ بحری مستقر بنا دیا جائیگا۔ جس میں روس اور چین دونوں کے جنگی و تجارتی جہاز لنگر انداز ہوں گے۔ البتہ ڈیفنس کے انتظامات روس کے ہاتھ میں رہیں گے۔

۷۔ منچوریا پر چین کی بالادستی قائم رہے گی اور جاپان کے ہتھیار ڈال دینے کے تین ماہ بعد روس اپنی فوجیں منچوریا سے ہٹائے گا۔

۸۔ چین بیرونی منگولیا کی آزادی و خود مختاری کو تسلیم کرے گا۔ اگر وہ استصواب عامہ کے بعد اپنی آزادی کا اعلان کرے۔

۹۔ صوبہ مشرقی ترکستان کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا روس کوئی خیال اور کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔

خیال تھا کہ روس چینی کمونسٹوں کی حمایت کرے گا۔ جس کی وجہ سے چین میں خانہ جنگی کا خطرہ رہیگا۔ لیکن معاہدہ میں روس نے کمونسٹوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اس لئے اب چین میں خانہ جنگی کا خطرہ

بھی معدوم ہو گیا ہے۔
معاہدہ میں کوریا کا کوئی ذکر نہیں آیا ہے۔ جس پر روس اور امریکہ دونوں کا قبضہ ہے۔ لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ روس نے اپنے منطقہ میں آزاد اور خود مختار سلطنت قائم کر دی ہے۔

جنوب مشرقی ایشیا جاپان کی جنگ ختم ہو جانے سے جنوب مشرقی ایشیا کے معاملات اور زیادہ پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ شمالی ہند چینی پر چینی فوجیں اور جنوبی حصہ پر انگریزی فوجیں قابض ہیں، اہل ملک نے اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا ہے اور وہ فرانس کی غلامی میں رہنا نہیں چاہتے۔ چنانچہ ہند چینی میں قوم پرستوں سے جابجا لڑائیاں ہو رہی ہیں وہ فرانسیسیوں کو چن چن کر ان پر گولیاں چلاتے ہیں۔

اسی طرح سماترا، جاوا اور ملایا پر اگرچہ انگریزی فوجیں قابض ہیں لیکن وہاں بھی قومی آزادی کی تحریک شروع ہو گئی ہے۔ اہل جاوا نے اپنی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر دیا ہے اور وہ ہالینڈ کی غلامی میں رہنا نہیں چاہتے۔ اب دیکھئے کہ برطانیہ ہالینڈ اور چین میں کیا کیا معاملہ طے ہوتا ہے۔ یہ امر قابل افسوس ہے کہ قومی آزادی کی تحریک کو دبانے کے لئے ہندوستانی فوجوں سے کام لیا جا رہا ہے۔ آسٹریلیا کے مزدوروں نے تحریک کی حمایت میں ہڑتال کر دی تھی۔

جزائر بحر الکاہل امریکہ نے فلپائن اور خاص جاپان و کوریا کے ایک حصہ پر تو قبضہ کر ہی لیا ہے مگر ابھی تک اس کے جذبات ملک گیری کی تسکین نہیں ہوئی ہے۔ چنانچہ امریکن محکمہ بحریات نے اعلان کیا ہے کہ وہ مندرجہ ذیل مقامات پر اپنا قبضہ رکھیں گے۔

۱۔ بحر الکاہل میں:- (۱) پرل ہاربر (۲) گوام (۳) سائپان (۴) فلپائن (۵) جزائر ایڈمرلٹی (۶) جزائر بونین (۷) جزائر ریوکیو (۸) جزائر کیتے (۹) جزائر سامار (۱۰) پلاؤ (۱۱) پیورٹو (۱۲) جانسٹن (۱۳) مڈوے (۱۴) ویک (۱۵) سمدہ (۱۶) کواجالین (۱۷) تروک (۱۸) ڈچ ہاربر (۱۹) جزیرہ کانٹن (۲۰) پالمیرا۔

۲۔ بحر اٹلانٹک میں:- (۱) پیورٹو ریکو (۲) جزیرہ ورجن (۳) جزائر برمودہ (۴) ٹرینیداد (۵) کرکوس (۶) سینٹ طامس (۷) جارج ٹاؤن (۸) جمیکا (۹) سانتا لیوسیہ۔

واضح ہو کہ ان میں بہت سے برطانوی مقبوضات ہیں مثلاً جمیکا، برمودہ، ٹرینیداد وغیرہ، کیا برطانیہ ان سے دستبردار ہو جائیگا۔؟ دیکھنا چاہئے۔

سبھاش چندر بوس ۲۳ راگست ۱۹۴۵ء کو جاپانی خبر رساں ایجنسی نے اعلان کیا کہ مسٹر سبھاش چندر بوس ۱۶ راگست ۱۹۴۵ء کو بسواری ہوائی جہاز سنگاپور سے ٹوکیو حکومت جاپان سے کچھ صلاح و مشورہ کرنے جا رہے تھے۔ ۱۸ راگست کو بمقام

تائیوکے ہوائی اڈے پر ان کا جہاز تباہ ہو کر گرا۔ اس حادثۂ ناگہانی میں مسٹر بوس شدید زخمی ہوئے۔ مرہم پٹی اور علاج معالجہ کے لئے ان کو ایک جاپانی اسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں وہ آدھی رات کو فوت ہو گئے۔ ان کے ساتھیوں میں سے ایک جاپانی لفٹنٹ جنرل بھی ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ کرنل حبیب الرحمن اور چار جاپانی افسر بھی زخمی ہوئے تھے۔ مسٹر بوس کی ہلاکت کی خبر کو تمام ہندوستان میں حیرت و افسوس اور شک و شبہ کے ساتھ سنا گیا۔ اگرچہ تمام ہندوستان میں جگہ جگہ ان کا ماتم کیا گیا۔ لیکن ہندوستان کے بعض حلقوں میں ابھی تک اس خبر کا یقین نہیں ہوا۔ کیونکہ ایک مرتبہ سنہ ۱۹۴۲ء میں بھی جب سر اسٹیفورڈ کرپس پیشکش لیکر ہندوستان آئے تھے۔ مسٹر بوس کے انتقال کی خبر اڑی تھی۔ جو غلط ثابت ہوئی تھی۔ اس مرتبہ بھی لوگوں کے نزدیک ان کی خبر وفات قابل یقین نہیں ہے۔

مشرق وسطیٰ

مشرق وسطیٰ میں ٹرکی کے سوا کوئی ایسا ملک نہیں ہے جو صحیح معنوں میں آزاد اور خود مختار ہو ورنہ یا تو تمام ممالک پر یورپین سلطنتوں کا قبضہ ہے یا وہ ان کے حلقۂ اثر و اقتدار میں ہیں۔ مگر تمام ممالک اپنی آزادی اور خود مختاری کے لئے بے قرار ہیں، اپنے مقبوضات شام و لبنان کی آزادی کی طرف سب سے پہلے فرانس نے قدم اٹھایا۔ یعنی فوجیں جو مقامی طور پر بھرتی کی گئی تھیں مگر جو فرانسیسی افسروں کے کمان میں تھیں شام و لبنان کی حکومت کو دیدیں۔ اور اصلی فرانسیسی فوجیں بھی جو مختلف مقامات پر تعینات تھیں سمیٹ کر مناسب مقامات میں لا ڈالیں۔ اس کے بعد روس اور برطانیہ نے ایران کے پایۂ تخت طہران کو خالی کر دیا۔ مگر ملک ایران پر ابھی تک قابض ہیں۔ شمالی ایران روس کے قبضہ میں ہے اور جنوبی ایران پر انگریزی فوجیں قابض ہیں، البتہ امریکن فوجیں جو ایران کی ریلوے لائن اور شاہراہوں پر قابض تھیں ہٹالی گئی ہیں، انگریز اپنی فوجیں ایران سے ہٹا لینے پر آمادہ نظر آتے ہیں مگر روس خاموش ہے بلکہ اس کا ارادہ کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ روس نے شمالی ایران میں نہ صرف اپنے زیر اثر مدارس قائم کر رکھے ہیں بلکہ وہ کسی ایرانی فوج، پولیس یا ایرانی عہدیدار کو بغیر اجازت اپنے مقبوضہ علاقہ میں داخل ہونے نہیں دیتا۔ پچھلے دنوں شمال مشرقی ایران کے صوبۂ خراسان میں ایرانی فوج کے ایک دستہ نے شورش برپا کر دی تھی، جسے فرو کرنے کے لئے حکومت ایران نے مسلح پولیس کے دو سو جوان بھیجنا چاہے۔ مگر روسیوں نے اجازت نہیں دی۔ بہر حال حکومت ایران اپنے ملک کے خالی کئے جانے پر برابر زور دے رہی ہے۔

ترکی سے روس نے درۂ دانیال اور آبنائے باسفورس کے سواحل پر اڈے طلب کئے ہیں اور مشرقی ترکی کے صوبجات قارص و اردھان کی حوالگی کا مطالبہ کیا ہے۔ ترکی اس بات کے لئے تو آمادہ نہیں ہے کہ صرف روس کو اڈے دیدے البتہ وہ اس بات کے لئے رضا مند ہے کہ ترکی روس برطانیہ، امریکہ و فرانس سب ملکر درۂ دانیال اور باسفورس کے سواحل پر اپنے مشترکہ اڈے قائم کر لیں

بشرطیکہ سب کی طاقت مساوی ہو۔ تاوقتیکہ اندرونی معاملات کے متعلق گفتگو کرنے کے لئے ہرگز ترکی تیار نہیں ہے۔ الغرض یہ معاملہ بھی ابھی کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ دیکھئے کس طرح طے ہوتا ہے۔

فلسطین کی فضا میں فتنہ و فساد کی گھنگھور گھٹائیں پھر چھانا شروع ہوگئی ہیں۔ لندن میں یہودی کانفرنس ہوئی جس میں فلسطین کے اندر یہودیوں کے لا محدود داخلہ کا مطالبہ کیا گیا اور حکومت برطانیہ کو آنکھیں بھی دکھائی گئیں، اس کے بعد امریکہ کے پریسیڈنٹ ٹرومین نے وزیر اعظم برطانیہ مسٹر اٹیلی کو ایک خط لکھا جس میں فلسطین کے اندر ایک لاکھ یہودیوں کے داخلہ کی سفارش کی گئی، ان واقعات نے فلسطین کے جھگڑے کو پھر زندہ کر دیا ہے۔ مسٹر چرچل کی گورنمنٹ کی پالیسی یہ تھی کہ عربوں کو اک کر تمام عرب ریاستوں کا ایک فیڈریشن یا وفاق قائم کرا دینا چاہئے۔ اور اس کے ذریعہ مشرق وسطیٰ میں روس کے روز افزوں اثر و اقتدار کا مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ ایک عرب لیگ کا قیام بھی اسی برطانوی پالیسی کا نتیجہ تھا۔ مگر لیبر پارٹی کی گورنمنٹ مختلف پالیسی کی حامل ہے۔ وہ کہتی ہے کہ ہمیں عربوں کی حمایت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جو آج تو شام و لبنان سے فرانس کو بے دخل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کل برطانیہ کے اثر و اقتدار کو مٹانے کی کوشش کرنے لگیں گے۔ لیبر گورنمنٹ کی پالیسی یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ کے تمام سیاسی و اقتصادی معاملات کو اس طرح حل کیا جائے کہ وہ نہ صرف عربوں اور یہودیوں کے لئے بلکہ روس، امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے لئے قابل قبول ہو۔ گویا ممالک وسطیٰ سے سب مل کر نفع اندوز ہوتے رہیں۔

وزیر اعظم مصر نقراشی پاشا نے بھی مطالبہ کیا ہے کہ مصر و برطانیہ کے پرانے معاہدہ پر نظر ثانی کی جائے۔ حدود مصر سے انگریزی فوجیں ہٹالی جائیں اور سوڈان کا ملک مصر کے حوالہ کیا جائے انگریزی سیاسی حلقوں میں مصر کے اس مطالبہ کا جواب بھی عجیب و غریب دیا گیا ہے۔ یعنی دولت برطانیہ مصر کے مطالبہ کو ہمدردی کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اور وہ مصری معاہدہ پر نظر ثانی کرنے کو تیار ہے۔ لیکن یہ کام اسی وقت ہو سکتا ہے۔ جب مصر کی گورنمنٹ ملک کی نمائندہ گورنمنٹ ہو گویا نقراشی پاشا کی گورنمنٹ مصر کی نمائندہ گورنمنٹ نہیں ہے۔ یہی عیب مصر کی ہر گورنمنٹ میں نکالا جا سکتا ہے۔ الغرض برطانیہ اس کے لئے تو تیار ہے کہ روس ایران سے اور فرانس شام و لبنان سے اپنی اپنی فوجیں ہٹالیں، لیکن خود اپنی فوجیں مصر سے ہٹا لینے پر آمادہ نہیں ہے۔

شام و لبنان بھی اپنی موجودہ حالت سے مطمئن نہیں ہیں، وہ اپنے لئے ایک مستقل فیصلہ کا مطالبہ کر رہے ہیں، عراق بھی اپنی موجودہ حالت پر قانع نہیں ہے، وہ بھی پرانے معاہدہ عراق و برطانیہ پر نظر ثانی کرا کے کامل طور پر آزاد و خود مختار ہونا چاہتا ہے۔ الغرض آج کل مشرق وسطیٰ کے تمام ملکوں میں زبردست سیاسی [illegible] پیدا ہے۔ برطانیہ [illegible] فلسطین میں اور [illegible] سلطان ابن سعود

کا قول ہے کہ اگر فلسطین میں یہودی ریاست قائم ہو گئی تو وہ جہاد کریں گے اور اس وقت تک لڑتے رہیں گے جب تک وہ خود اور ان کے لڑکے زندہ رہیں گے۔

الغرض فلسطین کا معاملہ پیچیدہ ہو گیا ہے جسے برطانیہ کی لیبر گورنمنٹ خود حل کرنے سے قاصر ہے۔ اگرچہ برطانی حکمران حلقوں میں پریسیڈنٹ ٹرومین کے دخل در معقولات کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا ہے لیکن چونکہ برطانیہ کی لیبر گورنمنٹ اس گتھی کو خود سلجھانے سے قاصر ہے اس لئے اس نے یہ طے کیا ہے کہ فلسطین کا حل اتحادی اقوام کی کونسل خود کرے۔

یورپ

اگرچہ یورپ کی جنگ ختم ہو گئی ہے لیکن جس چیز کو امن و امان اور سکون و اطمینان کہتے ہیں وہ ابھی مفقود ہے اس میں شک نہیں کہ پاٹسڈام کانفرنس میں روس، برطانیہ اور امریکہ نے جرمنی و آسٹریلیا کے حصے بخرے کر کے اپنے اپنے منطقے قائم کر لئے ہیں جہاں ہر طاقت اپنے اپنے نظریہ کے مطابق حکومت کر رہی ہے لیکن حکومت کے طور و طریق میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ مثلاً روس خود جرمنوں سے کام لے رہا ہے مگر برطانیہ، امریکہ اور فرانس نے جرمنوں کو بالکل بیدخل کر دیا ہے۔

آسٹریا میں موسیو کرینر کی حکومت ہے جسے روس کی سرپرستی حاصل ہے۔ برطانیہ و امریکہ بھی بادل ناخواستہ حکومت مذکور پر صاد کر چکے ہیں۔ آسٹریا میں روس نے ایک چالاکی یہ کی ہے کہ امریکہ و برطانیہ سے صلاح و مشورہ کئے بغیر اسی گورنمنٹ سے مٹی کے تیل کے بارہ میں معاہدہ کر لیا ہے۔ جس سے برطانیہ اور امریکہ کو اختلاف ہے۔ جرمنی سے تاوان بھی طلب کیا جا رہا ہے۔ روس کی تجویز یہ ہے کہ جرمنی سے ۵ ارب پونڈ تاوان بصورت اجناس و مشینری وغیرہ لیا جائے۔ جس میں سے نصف روس کا اور بقیہ دوسرے اتحادیوں کا ہو گا۔

کرزن لائن تک مشرقی پولینڈ کا جو حصہ روس نے لے لیا ہے اس کی تلافی جرمن علاقہ میں سے دیکر کر دی گئی ہے۔ مشرقی پروشیا کے نصف شمالی حصہ کا الحاق خود روس نے کر لیا ہے اور نصف جنوبی حصہ مع بندرگاہ ڈانزگ پولینڈ کو دیدیا گیا ہے۔ اب پولینڈ کی مغربی سرحد دریائے آڈر رہے۔

چیکوسلواکیہ کو کوہستان سوڈیٹن کا علاقہ دیدیا گیا ہے۔ لیکن دوسری طرف روس نے مشرقی چیکوسلواکیہ کے علاقہ سو تھینیا کا الحاق خود کر لیا ہے۔

پولینڈ اپنی موجودہ حالت سے مطمئن نظر آتا ہے۔ حکومت پولینڈ نے تمام جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کی جائدادیں ضبط کر کے انھیں کسانوں میں اس طرح تقسیم کر دیا ہے کہ ہر کسان کے حصے میں کم سے کم بارہ ایکڑ آراضی آگئی ہے جو اس کی بسر اوقات کے لئے ضروری سمجھی گئی ہے۔

سرحدی شہر تریسچن پر چیکوسلواکیہ اور پولینڈ میں جھگڑا چل رہا ہے دونوں شہر مذکور کے دعویدار رہیں۔ غالباً یہ معاملہ بھی روس ہی کی ثالثی سے طے ہو گا۔

بحیرہ ایڈریاٹک کے شمال میں بندرگاہ تریسٹہ اور اس سے ملحقہ علاقوں کا دعویدار یوگوسلافیہ ہے۔ روس بھی یوگوسلافیہ کا حامی نظر آتا ہے۔ اتحادیوں نے بندرگاہ تریسٹہ کے بارے میں یہ طے کیا ہے کہ اسے بین الاقوامی انتظام

میں رکھا جائے۔ بقیہ علاقوں کا ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا ہے یوگوسلافیہ اٹلی سے بہت بڑا ہے تاوان کا بھی مطالبہ کر رہا ہے کیونکہ یوگوسلافیہ پر اطالوی قبضہ کے وقت ملک کو خوب لوٹا گیا تھا۔

البانیہ آزادی و خودمختاری کا مطالبہ کر رہا ہے جس کا ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا ہے ادھر یونان یہ چاہتا ہے کہ جنوبی البانیہ کا کچھ حصہ اسے دیدیا جائے۔ بلقان میں برطانیہ اور روس کے درمیان حصول اثر و اقتدار کی رسہ کشی ہو رہی ہے۔ یونان میں جو حکومت زیر سایۂ برطانیہ قائم ہے اسے روس تسلیم نہیں کرتا اور بلغاریہ و رومانیہ کی حکومتوں کو برطانیہ و امریکہ تسلیم نہیں کرتے۔ روس کے نزدیک یہ حکومتیں بالکل ٹھیک ہیں البتہ ہنگری میں جو گورنمنٹ قائم ہے اسے برطانیہ و امریکہ نے بادل ناخواستہ تسلیم کر لینا طے کر لیا ہے۔

شمالی اٹلی میں فرانس سرحد کی تجدید کا مطالبہ کر رہا ہے یعنی کچھ اطالوی علاقہ مانگ رہا ہے۔ اتحادی اقوام اسپین اور وہاں کے جنرل فرانکو کی گورنمنٹ سے مطمئن نہیں ہیں۔ روس تو کھلے بندوں مطالبہ کر رہا ہے کہ جنرل فرانکو کی حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے۔ جنرل فرانکو کے خلاف میکسیکو میں ایک آزاد قومی گورنمنٹ بھی جمہوری لائنوں پر قائم کر لی گئی ہے جسے غالباً امریکہ کی تائید و حمایت حاصل ہے۔ شمالی افریقہ کی بندرگاہ طنجہ کو بین الاقوامی کر دیا گیا ہے۔ جس میں روس اور امریکہ بھی حصہ دار بنائے گئے ہیں۔ اگرچہ طنجہ پر سلطان مراکش کی حکومت تسلیم کر لی گئی ہے لیکن نظم و نسق اتحادیوں کے ہاتھ میں رہیگا اس بندرگاہ پر اسپین نے مکمل قبضہ کر لیا تھا لیکن اب خالی کر دینا پڑا۔

وزرائے خارجہ کی کانفرنس پاٹسڈم کی کانفرنس میں جن امور کا فیصلہ برطانیہ، روس و امریکہ کے وزرائے اعظم نے نہیں کیا تھا۔ ان کو حل کرنے کے لئے لندن میں روس، برطانیہ، امریکہ، فرانس اور چین کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس ہوئی۔ کانفرنس سے بڑی بڑی توقعات وابستہ تھیں مگر کوئی معاملہ حل نہ کر سکی۔ کانفرنس میں جب یہ مسئلہ پیش آیا کہ اٹلی کی نوآبادیوں کا کیا فیصلہ کیا جائے تو امریکہ کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی کہ تمام اطالوی مقبوضات کو بین الاقوامی ٹرسٹی شپ میں رکھا جائے۔ یہ بات روس نے نامنظور کر دی اور دعویٰ کیا کہ اس کو بھی بحیرۂ روم اور بحیرۂ احمر میں دخل ملنا چاہیے سابق اطالیہ کی مختلف نوآبادیوں پر مختلف اقوام کی ٹرسٹی شپ قائم کی جائے۔ سواحل ٹرکی کے سامنے جو جزائر ددانددکانہ (ڈوڈیکانیز) ہیں ان پر نیز طرابلس الغرب اور اریٹیریا (مصوّع) پر روس کی واحد ٹرسٹی شپ قائم کی جائے۔

روس نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ جاپان پر صرف امریکہ کا قبضہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ اتحادی اقوام کا مشترکہ قبضہ و تصرف اسی طرح ہونا چاہیے جیسے جرمنی پر کیا گیا ہے۔ روس نے یہ بھی کہا کہ بلقان کی ریاستوں سے فرانس و چین کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہذا ان کو اس فیصلہ میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

اسی سلسلہ میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ شہنشاہ حبش نے بھی اریٹیریا پر اپنا دعویٰ پیش کیا ہے جسے اٹلی نے حبش سے چھین لیا تھا۔

ہندوستان پہلی مرتبہ لندن جاکر ہز ایکسیلنسی لارڈ ویول وائسرائے ہند جو نیا تحفہ ہندوستان لائے تھے وہ یہ تھا۔ کہ اپنی اگزیکٹو کونسل کی جدید تشکیل اس شکل میں لائی جائے کہ [illegible]

ایک عیسائی یا پارسی ہو اور اس کے لئے انھوں نے شملہ میں ایک کانفرنس طلب کی مختلف لیڈروں سے ملاقاتیں کیں اور مختلف پارٹیوں سے ان کے ناموں کی فہرست طلب کی جن میں وائسرائے خود انتخاب کر لیتے۔ کانگریس اور دوسری پارٹیوں نے وائسرائے سے کوآپریشن کیا اور اپنے ناموں کی فہرست بھی داخل کر دی۔ لیکن مسٹر جناح اور مسلم لیگ نے کوئی نام پیش نہیں کئے۔ اور کچھ ایسی ہٹ دھرمی کی کہ شملہ کانفرنس فیل ہو گئی۔

دوسری مرتبہ وائسرائے پھر لندن مدعو کئے گئے جنھوں نے وہاں لیبر گورنمنٹ کے ممبروں سے تبادلۂ خیالات کیا اور ہندوستان واپس آ کر جو اسکیم پیش کی وہ حسب ذیل ہے۔

(۱) لیبر گورنمنٹ ہندوستان کے لئے جلد سے جلد ایک مجلسِ آئین ساز طلب کرنے کا ارادہ رکھتی ہے جو اسمبلیوں کے انتخابات کا نتیجہ معلوم ہونے کے بعد وجود میں لائی جائے گی۔

(۲) انتخابات ہونے کے بعد وائسرائے اسمبلیوں کے نمائندوں سے صلاح و مشورہ کر کے معلوم کریں گے کہ جن تجاویز کا [illegible] میں اعلان کیا گیا تھا کرپس تجاویز) وہ قابل قبول ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں ہیں تو کوئی دوسری ترمیم شدہ اسکیم پیش کی جائے۔

(۳) ہز ایکسیلنسی ریاستوں کے نمائندوں سے بھی صلاح و مشورہ کریں گے کہ وہ مجلسِ آئین ساز میں کن شرائط سے شریک ہونا پسند کریں گے۔

(۴) صوبجاتی اسمبلیوں کے نتائج معلوم کر کے ہز ایکسیلنسی اپنی جدید اگزیکٹو کونسل وجود میں لائیں گے اور یہ ایسی ہو گی جسے ملک کی بڑی بڑی پارٹیوں کی تائید و حمایت حاصل ہو گی۔

اگرچہ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے نزدیک مندرجہ بالا تجاویز قابل قبول نہیں ہیں لیکن انھوں نے الکشن لڑنا منظور کر لیا ہے۔ چنانچہ کانگریس مسلم لیگ اور مہا سبھا تینوں پارٹیاں الکشن کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی ہیں۔ مہا سبھا ہر جگہ کانگریس کا اور کانگریس ہر جگہ مسلم لیگ کا مقابلہ کرے گی۔ مسلم لیگ کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک نیشلسٹ مسلم پارٹی بھی وجود میں آ گئی ہے۔ جس میں جمعیۃ العلماء، احرار، مومن کانفرنس مسلم مجلس سب شامل ہیں۔ پنجاب میں یونینسٹ مسلمان اور سرحد میں خدائی خدمتگار مسلم لیگ کا مقابلہ کریں گے۔

الغرض تمام پارٹیاں شد و مد کے ساتھ الکشنوں کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ دیکھئے فتح و کامرانی کا سہرا کس کے سر رہتا ہے۔ مرکزی اسمبلی کا الکشن غالباً دسمبر ۱۹۴۵ء تک اور صوبجاتی اسمبلیوں کا الکشن غالباً مارچ تک ختم ہو جائیں گے۔ اس کے بعد اکثریت والی پارٹیوں کی وزارتیں صوبہ جات میں قائم ہو کر دفعہ ۹۳ یعنی گورنر راج کا خاتمہ ہو جائے گا۔ گمان غالب ہے کہ اپنی اگزیکٹو کونسل کے لئے وائسرائے صوبوں کی [illegible] سے نام طلب کر کے انتخاب کریں گے۔

زمانہ

بیادگار منشی دیا نرائن صاحب نگم مرحوم

جلد ۸۵	نومبر ۱۹۴۵ء	نمبر

فہرست

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

زمانہ
جلد ... نمبر ۵
نومبر سنہ ۱۹۴۵ء

اُردو کے فرنگی شعراء

(از جناب مولانا مائل نقوی معتمد انجمن ترقی ادب بھوپال)

ابتدائی تاریخ ہندوستان میں اہل مغرب کی آمد پندرھویں صدی عیسوی سے شروع ہوئی۔ سب سے پہلے اہل پرتگال نے اس طرف قدم بڑھایا۔ سنہ ۱۴۹۸ء میں واسکوڈے گاما نامی ایک پرتگالی سیاح نے کالی کٹ کے قریب اپنے جہاز کا لنگر ڈالا اور اُس علاقہ کے راجہ زمورن کے دربار میں حاضر ہو کر تجارت کے لئے اجازت نامہ حاصل کیا۔ یہ لوگ اس نواح میں رفتہ رفتہ اپنا اثر بڑھاتے رہے۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۵۱۰ء میں بعض ساحلی مقامات پر قبضہ جما کر "گوا" کو اپنی تحریکات کا مرکز بنا لیا۔ آلبقرق اور اُس کے بعد کے پرتگالی گورنروں کی سیاست پر مذہب کا رنگ چڑھا ہوا تھا اور اس رنگ میں تعصب کی سیاہی بہت تیز تھی لہٰذا ان سے ایسے افعال سرزد ہوئے کہ تھوڑی ہی مدت کے بعد تنزل کا دور شروع ہو گیا اور بجز چند ساحلی مقامات کے انکے قبضہ میں کچھ بھی نہ رہا۔

ہندوستان میں اہل پرتگال کے تجارتی فروغ کا شہرہ سنکر یورپ کے دوسرے تاجروں نے بھی ادھر آنے کا ارادہ کیا۔ انگلستان، فرانس، ہالینڈ، سویڈن اور ڈنمارک کے سوداگروں نے اپنی اپنی کمپنیاں بنائیں اور سترھویں صدی کے آغاز میں ہندوستان آکر تجارت کی داغ بیل ڈالی۔ تجارت میں رقابت شروع ہوئی اور رقابت نے جنگ کا نقشہ تیار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کے سوا دوسرے ممالک کی کمپنیاں ایک ایک کر کے ہندوستان سے رخصت ہو گئیں۔ اب انگریزوں اور فرانسیسیوں میں مقابلہ کا بازار گرم ہوا۔ جب تجارت کی منڈیوں میں ایک حریف اپنے مدمقابل کو شکست نہ دے سکا تو اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ان کے دماغوں میں ایک نیا خیال پیدا ہوا۔ جب یہ لوگ اس ملک میں وارد ہوئے تھے مغلیہ سلطنت کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ ملک و حکومت کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی کسی کو مجال تھی، لیکن اٹھارھویں صدی میں حکومت کا شیرازہ بکھرنا شروع ہوا اور صوبیدار خود مختار ہو کر باہمی جنگ و جدال میں مصروف ہو گئے۔ اب ان تاجروں نے اپنے دیرینہ خیال کو عملی صورت میں لانے کی کوشش کی۔ وہ خیال یہ تھا کہ دیسی رئیسوں کی لڑائیوں میں شریک ہو کر انکی ہمدردی حاصل کی جائے اور پھر ان کی امداد سے فریق مخالف کو نہ صرف تجارت کی منڈیوں بلکہ ہندوستان ہی سے خارج کر دیا جائے

ملک کی ابتر حالت کے پیش نظر اور اپنی کارروائیوں میں کامیابی دیکھ کر ہر فریق کے سر میں حکومت کا سودا سمایا۔ تجارتی کاروبار کے حلقے وسیع کئے گئے۔ رئیسوں سے سازشیں کی گئیں۔ ان کی خانہ جنگیوں سے فائدہ اٹھا کر اپنی طاقت کو مستحکم کیا گیا۔ نتیجہ ان سب باتوں کا یہ ہوا کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں میں کئی لڑائیاں ہوئیں۔ آخر کار انگریز غالب آئے اور اہل فرانس نے ہندوستان میں حکومت قائم کرنے کا خیال ہمیشہ کے لئے ترک کر دیا۔ اب یہ لوگ دیسی ریاستوں میں داخل ہو کر فوجی اور مالی عہدے، حاصل کرنے لگے۔ میدان کے مالک تنہا انگریز تھے۔ ان کی تجارت حکومت کی منزلیں طے کرنے لگی۔ آخر ۱۸۵۷ء کے بعد تمام ہندوستان پر انگریزی حکومت کا پرچم لہرانے لگا۔

اہل مغرب میں اُردو کا رواج | مغلیہ حکومت کے زوال پر ملک کے ہر حصہ میں نام نہاد خود مختار حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ ہر دربار میں اپنے علاقے یا قومی زبان کا رواج تھا۔ دفتر اور مراسلت کا زیادہ تر کام اپنی ہی زبان میں کیا جاتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سیاسی اور تجارتی تعلقات ان درباروں بلکہ ہندوستان کے تمام علاقوں سے تھے۔ کمپنی کے دفاتر میں تمام طور سے انگریز کلرک تھے۔ ان کے لئے ایک ہی زبان کا سمجھ لینا مشکل تھا، نہ کہ اس ملک کی زبانوں میں نوشت وخواند کی مہلت بہم پہونچانا۔ اس مشکل کا حل ایک امر دشوار ثابت ہو رہا تھا۔

اسی زمانہ میں ہندوستان کے سیاسی مرکز دہلی میں اُردو کا چونچال اپنی شوخیوں سے دلوں کو لبھا رہا تھا۔ یہاں ملک ملک اور صوبے صوبے کے لوگ موجود تھے، سب اسے گو دیوں میں کھلاتے تھے، اس سے پیار کی باتیں کرتے تھے، یہ بھی سب کے ملے جُلے الفاظ اور سیدھے سادے انداز میں ہر ایک کو اپنا مطلب سمجھا دیتا تھا۔ اس کے جو کچھ اثرات آئندہ مترتب ہوتے اُن کی تفصیل کا تو یہ موقع نہیں۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی نگاہ انتخاب نے اس زبان کو اپنے لئے مفید اور آسان تصور کیا۔ رفتہ رفتہ دوسری زبانوں سے قطع نظر کر کے اس کی تحصیل و ترقی میں اپنی کوشش صرف کر دی۔ یہ عجیب بات ہے کہ مغرب کی دوسری قومیں جو ہندوستان میں مقیم تھیں باوجود شدید باہمی اختلافات کے وہ بھی اس زبان کی تدوین و ترقی کی طرف متوجہ ہو گئیں، چنانچہ ڈچ قوم کا نامور فاضل جان شورکٹلڈ پہلا شخص تھا جس نے ۱۷۱۵ء میں بعہد جہاندار شاہ اُردو زبان کی صرف و نحو پر ایک مستقل کتاب تالیف کی۔ اس کے بعد ۱۷۲۲ء میں مسٹر ہیڈلے اور ۱۷۴۴ء میں فادر شیز پادری نے اسی موضوع پر کتابیں لکھ کر شائع کیں، اسی زمانہ میں مسٹر فرگوسن نے اُردو زبان کی ایک لغت تیار کی۔ ۱۷۸۷ء میں ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کی تالیفات کا سلسلہ شروع ہوا اور ۱۸۴۶ء میں اقتدار حکومت حاصل ہوتے ہی "ایسٹ انڈیا کمپنی" نے سرکاری دفاتر کو فارسی سے اُردو میں منتقل کر دیا۔

اب وہ فرانسیسی جنھوں نے اقتدار حکومت سے ہاتھ اُٹھا کر دیسی ریاستوں کی ملازمت اختیار کی تھی اُنھوں نے بھی اُردو کو اپنایا اور اس میں اس درجہ مہارت پیدا کی کہ اہل زبان کی طرح اُردو میں بات چیت اور تصنیف و تالیف کرنے لگے۔ اس امر کا یاد دلا دینا یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان بادشاہوں خصوصاً مغل شہنشاہوں کے آئین حکومت اور

ہندو مسلمانوں کے صدہا سال کے شگفتہ تعلقات نے ایک ایسی متحدہ قومیت پیدا کر دی تھی جس کی نظیر دنیا کے کسی ملک کی تاریخ میں تلاش کر لینا غیر ممکن ہے۔ مذہبی عبادت گاہوں کی حدود سے باہر نکل کر مجلسی زندگی میں رنگ و نسل اور قوم و ملت کا سوال ہی نہ تھا۔ لباس، زبان، فکر و خیال، رسوم و عادات میں ایک عجیب خوشگوار ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی۔ باہر سے آنیوالے بھی اس دلفریب رنگ میں رنگ جاتے تھے، وضع و قطع، رفتار و گفتار غرضکہ بود و باند کا ہر پہلو وہ چاہتے تھے کہ اہل ہند کی خوشبو میں بس جائے۔

اُنیسویں صدی میں اُردو شاعری کا شباب پورے جوش پر تھا۔ شاہی دربار سے لیکر امراء کے ایوانوں تک اور شرفا کی محفلوں سے بازاروں تک ہر جگہ اسی کا طوطی بولتا تھا۔ مغربی خاندانوں کے افراد جو ان شرفا و امرا کی مجلسوں میں اپنا وقت صرف کرتے تھے کس طرح ممکن تھا کہ اس ذوق سے اثر پذیر نہ ہوتے، اُن پر بھی اس کا اثر ہوا اور خوب ہی ہوا، یہ سب لوگ صاحب وجاہت و اقتدار تھے اور ان کی شاعری تفنن طبع کا ایک ذریعہ تھی، ان کا خیال اس مصرعہ کے مصداق تھا کہ ع "اپنی بہار اپنی طبیعت کی سیر ہے" اور حقیقت بھی یہی ہے کہ شاعری کی اصلی روح اور فطری حُسن ہمیشہ اسی خیال میں مضمر نظر آئے گا۔ اس کو عہد حاضر کی اصطلاح میں "ادب برائے ادب" کہا جاتا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ حضرات زبان و اصول کے ضوابط سے بے نیاز ہو گئے ہوں بلکہ ان لوگوں نے اس شوق کو بھی فن کی حیثیت سے بہت بلند درجہ پر پہونچا دیا۔ لطف زبان اور انداز بیان میں وہ مہارت بہم پہونچائی جو اہل زبان کا حصہ ہے۔ ان کے کلام میں زبان کی شستگی، محاوروں کی برجستگی، بندش کی چستی، مضمون آفرینی، روزمرہ کی صفائی غرضکہ ہر وہ چیز پائی جاتی ہے جسے شعر و ادب کا حُسن سمجھا جاتا ہے۔ اصناف نظم میں کوئی صنف ایسی نہیں ہے جس میں انھوں نے زور طبیعت نہ دکھایا ہو۔ سنگلاخ زمینوں میں بھی گلزار کھلائے ہیں، ادب اُردو کی تاریخ لکھنے والوں نے اس زبان کی تہذیب و ترقی کے ضمن میں صرف ہندو اور مسلمانوں کا ذکر کیا ہے، شاہد اُردو کے گیسو سنوارنے والے ان فرنگی نژاد شعراء کی کوششوں کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے لیکن "تلاش و تحقیق کا دامن اگر وسیع کیا جائے گا تو گلاب و کوکا بیلی کے ساتھ یاسمن کے یہ پھول بھی دامن کا ایک گوشہ بھر دیں گے۔ اس خیال کے ماتحت ذیل میں چند فرنگی شعراء کا ذکر کیا جاتا ہے اور اس کی ابتدا فرانسیسی شعراء سے کی جاتی ہے۔

اُردو کے فرانسیسی شعراء جارج پرنس پیش شور۔ ان کے دادا مہاراجہ سیندھیا کی فوج میں کپتان تھے۔ والد نے علی گڈھ میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور رئیسانہ زندگی بسر کرنے لگے۔ یہیں یکم دسمبر ۱۸۲۳ء کو شور صاحب کی ولادت ہوئی۔ اپنے فرانسیسی نژاد اور عالیخاندان ہونے کا ذکر اُنھوں نے ایک نظم میں کیا ہے جو والدین کی وفات پر لکھی تھی، نظم مذکور کے چند شعر یہ ہیں:۔

فیض ان سے ہر اک بشر کو تھا　　مرجع صد جہان تھے یہ لوگ
تھے بزرگ ان کے خاص اہل فرانس　　صاحب خاندان تھے یہ لوگ
اک زمانہ انیس تھا ان کا　　فخر ہندوستان تھے یہ لوگ

شور صاحب کے بزرگوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنالیا تھا اس لئے ان کی تعلیم و تربیت مشرقی اصول پر ہوئی درسیات فارسی کی تکمیل کے بعد کچھ ابتدائی عربی کتابیں بھی دیکھی تھیں۔ مکتب کی چار دیواری سے قدم باہر نکالا ہی تھا کہ شعر و شاعری کی آواز کانوں میں آنے لگی۔ شہر کے جن رئیس زادوں سے ان کی ملاقاتیں تھیں اُن کے یہاں رات دن یہی چرچے رہتے تھے۔ ایک تو جوانی کی اُمنگ، دوسرے یہ رنگین صحبتیں، طبیعت متاثر ہو کر رہی۔ شعر گوئی کا شوق ہوا شور تخلص رکھ کر مرزا رحیم بیگ رئیس میرٹھ کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے۔ اسی زمانہ میں ایک صاحب منشی کریم الدین نے دہلی میں ایک مشاعرہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ منشا اس سے یہ تھا کہ اپنے مطبع میں شعرائے عصر کے حالات اور کلام پر مشتمل ایک تذکرہ طبع کریں۔ منشی صاحب اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اور "تذکرۃ الشعراء" مرتب کر لیا۔ اسی تذکرہ میں شور صاحب کی بابت رقمطراز ہیں:۔

"جب میں اپنے مکان پر مشاعرہ کرتا تھا تو وہ اکثر اپنی غزلیں خطوط میں رکھکر مشاعرہ میں پڑھنے کے لئے بھیجتا تھا۔ اس کے خطوط اس کی دماغی اور علمی قابلیت پر دال ہیں۔ اس کا فارسی کلام بھی خوبیوں سے خالی نہیں، دین عیسوی کا پیرو تھا۔ مندرجہ ذیل غزل اُس نے مجھے ۱۲۶۰ھ میں بھیجی تھی۔

اصل تذکرہ میں تو پوری غزل درج ہے، ہم یہاں صرف چند شعر نقل کرتے ہیں۔

دیر و حرم میں دے نہیں ترجیح زاہدا — سر جس طرف جھکایا وہی سجدہ گاہ تھی

عاجز تھا اپنی جان سے ایسا ترا مریض — دیکھے سے جس کے حالتِ عیسیٰ تباہ تھی

بل بے یہ بیخودی کہ خودی سے بھلا دیا — ورنہ یہ زیست مرگ کی اپنے گواہ تھی

جوان ہو کر شور صاحب نے "ایسٹ انڈیا کمپنی" کی ملازمت اختیار کی اور تھانیداری کے عہدہ پر مامور کئے گئے تحصیلداری پر ترقی ہونے والی تھی کہ ۱۸۵۷ء کا قیامت خیز ہنگامہ پیش آگیا۔ شورش فرو ہو جانے پر شور صاحب اپنے نانا فراسو کونس کے پاس موضع ہرچند پور تحصیل میرٹھ میں چلے گئے جو ان کی ملکیت میں تھا۔ نانا کے انتقال پر انھیں اتنا مل گیا کہ بقیہ زندگی فارغ البالی کے ساتھ بسر کرتے رہے۔ آخر ۱۸۹۱ء میں بعمر ۸۱ سال اس دار فانی سے رحلت اختیار کی شور صاحب اگرچہ مغربی النسل تھے مگر اُنھوں نے ہندوستانی معاشرت اختیار کر لی تھی اور ہزار جان سے اس کے دلدادہ تھے۔ ان کا لباس از سرتاپا ہندوستانی ہوتا تھا۔ سر پر دوپلی ٹوپی، عمامہ یا مرہٹی وضع کی پگڑی، گلے میں نفیس ململ کا کرتہ، اُس پر اچکن، شانوں پر ریشمی دوشالہ۔ سفید رنگ بہت مرغوب تھا۔ اکثر کل لباس اسی رنگ کا ہوتا تھا۔ ... کی سواری پسند تھی۔ شرفاء ہند کے اخلاق کا نمونہ تھے، خندہ روئی، شگفتہ مزاجی، خوش خلقی طبیعت کا خاصہ تھا۔ اراکین و عمائدین شہر سے برادرانہ برتاؤ رکھتے تھے، صاحبان ہنود اور اہل اسلام سے گہرے مراسم تھے۔

شور صاحب نے آغاز شباب سے آخر عمر تک شعر و سخن کو اپنا انیس و ہمدم بنائے رکھا۔ ایک مثنوی اور چھ دیوان

یادگار چھوڑے۔ مثنوی میں اپنے واقعات زندگی نظم کئے ہیں۔ اس سلسلے میں بعض ایسے اہم واقعات نظر کے سامنے آجاتے ہیں جو اُس عہد کی تاریخوں میں نہیں ملتے۔ مثنوی کا وہ حصّہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے جہاں شورؔ صاحب نے اپنے سفر کے حالات اور قلبی تاثرات کو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ سفر کیا پورے شمالی ہند کی سیاحت کا مرقع پیش کیا ہے۔

سب سے پہلے "حال پُر ملال شہر شاہجہاں آباد خلد آباد" ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں دلّی کی بربادی ایسا دلدوز سانحہ تھا جس پر مسلمان جس قدر اظہار ملال کرتے کم تھا۔ لیکن یہی واقعہ یوروپین اصحاب کے لئے انتہائی مسرت کا سبب تھا اس لئے کہ ان کا کامل اقتدار ہندوستان جیسے وسیع ملک پر مسلّم ہوگیا۔ مگر شورؔ صاحب نے اس بدنصیب ملک کو اپنا وطن بنالیا تھا۔ اُنھوں نے اس واقعہ پر ہندوستانی نقطۂ نگاہ سے روشنی ڈالی۔ ہنگامۂ غدر کے بعد جب وہ دہلی گئے تو قلعہ کی بربادی پر پورا ایک مرثیہ تصنیف کر ڈالا۔ دہلی کے ایک ایک بازار، محل، شاہی عمارت کی تباہی پر خون کے آنسو بہائے ہیں۔ کس حسرت سے لکھتے ہیں۔ نہ رونق نہ وہ لطف ہے سیر کا

بقیۃ السیف عمائدین و کاملین کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے اور اُن کے لئے یہ دعا کی ہے:۔

جو قائم ہیں یا رب وہ قائم رہیں

اور مرحومین کے لئے دعا کرتے ہیں۔

وہ جنت میں داخل ہوں جو مر گئے

الہ آباد کے سرکاری کالج میں علوم و فنون کی ترقی دیکھ کر اس لئے خوش ہوتے ہیں کہ وہ اسے اہل ہند کی آئندہ ترقی کا پیش خیمہ تصور کرتے ہیں، لیکن ہندوستانی نوجوانوں کو مغربی پوشاک میں دیکھ کر اُن کے دل پر چوٹ لگتی ہے، تبدیل لباس کا جو اثر کسی قوم کی خصوصیات پر نامعلوم طریقہ سے مرتب ہوتا رہتا ہے اس راز سے وہ بخوبی آگاہ ہیں، اس لئے ان نوجوانوں کے تبدیل لباس پر اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

گئے اپنی موروثی پوشاک بھول

اپنے اسی احساس کی تصویر اُنھوں نے اپنی غزل کے ایک شعر میں بھی کھینچی ہے:۔

پتلون کوٹ کا یہ چلن گھر بہ گھر ہوا

اب اہل ہند صاحب لندن سے جا ملے

دلّی کے بعد لکھنؤ کا نمبر آتا ہے۔ آخری شاہ اودھ کی غفلت شعاری اور بیجا فیاضی پر افسوس کرتے ہیں:۔

لُٹایا تمام عمر وہ سیم و زر ۔۔۔ گیا سر سے پدموں کا پانی گزر

جواہر کو پتھر سے بدتر کیا ۔۔۔ کروڑوں کا یوں گھر برابر کیا

[illegible] ۔۔۔ خوشی کا شب و روز چرچا رہا

ان باتوں سے جب سلطنت ہاتھ سے نکل گئی تو بجائے اس کے کہ معزول بادشاہ کو نشانۂ ملامت بنائے لکھنؤ کی تباہی پر اشک افشانی کی ہے۔ کس درد بھرے دل سے کہتے ہیں۔

گلستانِ خوبی ملا خاک میں کیا اُس کو برباد افلاک نے
ہوا ایک سکتہ کا عالم تمام کیا گردشِ چرخ نے اپنا کام
غرض ایک دم کا تھا سارا ظہور اُٹھا اس کے جاتے ہی شورِ نشور

اس طرح جس شہر اور ریاست سے گزرے ہیں وہاں کا تفصیلی حال لکھا ہے۔ ہر شہر کی قابلِ ذکر عمارتوں، بازاروں، گھاٹ، پل، تالاب ہر ایک کی تصویر کھینچکر رکھدی ہے۔ اسی ذیل میں وہاں کے اہلِ کمال، ماہرینِ فن، اُمراء، شرفاء اور پیشہ وروں کے حالات اور ان سے اپنی ملاقاتیں پوری تفصیل کے ساتھ لکھی ہیں۔ دیکھنے کے قابل بات یہ ہے کہ اس سفر میں شور صاحب بکثرت انگریزوں اور فرانسیسیوں سے ملے لیکن یہ سب وہی لوگ تھے جنھوں نے ہندوستانی معاشرت اختیار کر لی تھی اور کسی ہندوستانی فن میں مہارت کامل بھی رکھتے تھے۔ اس موقع پر بالطبع ایک خیال پیدا ہوتا ہے جو یہ ہے کہ چاہیئے تو یہ تھا کہ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا فرنگی قوموں اور اہلِ ہند میں اس قسم کا ارتباط بڑھتا جاتا لیکن آج حالت اس کے بالکل برعکس نظر آتی ہے۔ ہندوستان کے پُورے طول و عرض میں ایک بھی فرنگی خاندان ایسا نہ ملے گا جو اُردو نظم تو ایک طرف، نثر سے بھی قطع نظر کیجئے اُردو کے دو چار صحیح جملوں ہی کے ذریعہ اپنا مافی الضمیر ادا کر سکتا ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا اربابِ فرنگ سے کسی دوسری زبان کے سیکھنے کی صلاحیت ہی سلب ہو گئی ہے؟ یا یہ حاکم و محکوم ہونیکا امتیازی نشان ہے؟ لیکن دونوں سوالوں کا جواب مشاہدہ و تاریخ نفی میں رہتے ہیں۔ ہندوستان پر ہمیشہ بیرونی اقوام کا تسلط رہا مگر ان میں سے ایک قوم بھی ایسی نہیں ہوئی جس نے اس ملک کی زبان کو اپنی زبان نہ بنالیا ہو اور اس زبان میں تصنیف و تالیف کے دریا نہ بہائے ہوں۔ لیکن موجودہ عہد میں اس حیرت انگیز بیگانگی کا سبب شاید یہ مقولہ ہو کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور یہ دونوں کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔

بہرحال سفر مذکور میں شور صاحب جن ریاستوں میں گئے ہیں وہاں کے رؤسا کے مشاغل پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرقہ روزِ ازل سے اب تک ایک ہی ڈھرے پر چل رہا ہے، مثلاً رئیس الور کے حالات میں لکھتے ہیں کہ جب اُنھیں گھوڑوں کا شوق ہوا تو یہ عالم تھا کہ:-

بھرے اصطبل روز ہی جاتے تھے کہ عربی و ترکی چلے آتے تھے
وہ مُشکی نہ رنگ ایسا دیکھا کوئی یہی زلفِ مشکیں کو حسرت رہی
وہ سبزہ کہ فیروزہ شرما گیا وہ گلدار، لالہ بھی گُل کھا گیا
وہ سُرخہ کہ سُرخی جب اُس سے نہ پائے تو رنگِ حنا رشک سے کٹ ہی جائے

وہ نقرہ کہ زر برسے اُس پر مدام سراپا ہے وہ نقرئی لاکلام

غرض گھوڑوں کی کثرت اور اُن کے بیشمار اقسام اور رئیس کی زرپاشی کی کیفیت بیان کرتے چلے گئے ہیں۔ پھر کچھ عرصہ بعد لال پالنے کا شوق ہوا، اس فن کے استاد جمع کئے گئے۔ ہزاروں کی بازیاں لگائی گئیں اور بیشمار دولت صرف کی گئی۔

اسی طرح لالوں سے جب دل لگا ہزاروں ہوئے لعل اُن پر فدا

چند روز کے بعد اس سے بھی طبیعت ہٹ گئی اب پتنگ بازی کا خیال ہوا۔ لکھنؤ اور دہلی کے پتنگ باز طلب کئے گئے اس کے لئے ایک کارخانہ الگ قائم کیا گیا اور اس پر بھی ہزاروں خرچ ہوئے، پھر اُس طرف سے بھی دل اُچاٹ ہوگیا تو شیر کے شکار کا مشغلہ ہاتھ آیا۔ ایک ایجاد اس شوق میں یہ کی گئی کہ جب راجہ صاحب کوئی شیر شکار کر کے لاتے تھے تو اہلکاروں سے نذریں وصول کرتے تھے۔

کہ نذریں دیا کرتے سب اہلکار کیا راجہ صاحب نے ہے یہ شعار

اسی طرح جو شوق پیدا ہوا اُسے حد تلک خوب پہونچا دیا

اس سلسلہ میں راجہ صاحب کے پری خانہ کا ذکر کیا ہے اور یہ سب پر بھاری ہے۔ اِن پری تمثالوں کا حسن و جمال، ناز و انداز، وضع اور لباس، رئیس کی شیفتگی اور دریا دلی بیان کی ہے۔

ہزاروں کی تنخواہیں وہ پاتی تھیں ہزاروں ہی اُوپر اُڑا جاتی تھیں

مثنوی اور اس سفر کے حالات بہت طولانی ہیں لہٰذا ہم اسی قدر بیان پر اکتفا کر کے اُن کے اُردو کلام کے چند نمونے پیش کرتے ہیں جیسا کہ اُوپر لکھا جا چکا ہے۔ شورؔ صاحب چھ دیوانوں کے مالک ہیں۔ یہ سب طبع ہو گئے تھے مگر اب مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں۔ ان میں حمد، نعت حضرت مسیح علیہ السلام، مناجات، غزلیں، قصے، قطعات تاریخ وغیرہ سبھی کچھ ہے۔ سب سے پہلے حمد کے اشعار قابل ملاحظہ ہیں۔

لب پر ہے گو خیال سے عصیاں کے خامشی

ہے درد دل میں پر اُسی نکتہ نواز کا

ارض و سما کی فکر میں اک عمر صرف کی

عقدہ کھلا نہ اُس کے نشیب و فراز کا

نعت رسول کریم صلعم میں داغؔ دہلوی کا یہ مطلع بہت مشہور ہے۔

تو جو اللہ کا محبوب ہوا خوب ہوا

یا نبی خوب ہوا، خوب ہوا، خوب ہوا

شوؔر صاحب نے اسی زمین میں نعت مسیح علیہ السلام کے زمزمے گائے ہیں، دو شعر حسب ذیل ہیں:-

حشر میں فخر نہ کیوں کر ہو تری اُمت کو | جان دینا تجھے مرغوب ہوا، خوب ہوا
جان دینے میں بجز شکر نہ نکلا منہ سے | صبر میں ہادی ایوب ہوا، خوب ہوا

مرزا غالبؔ کی غزل پر جس کا مطلع یہ ہے:-

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہمسا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

شوؔر صاحب نے ایک معرکہ کی غزل لکھی ہے۔ایک مطلع اور چار شعر نقل کئے جاتے ہیں۔کلام کا زور قابل داد ہے۔

عشق میں قابلِ حسرت کوئی مجھ سا نہ ہوا | فرد کامل ہوں کہ مجھ سا کوئی پیدا نہ ہوا
وہ مصیبت مری خادم، جو کسی جا پہ نہیں | پاؤں دابے ہے وہ فتنہ کہ جو برپا نہ ہوا
وہ اذیت مری ہمدم کہ ہے شاگردِ اجل | غم وہ غمخوار کہ جس غم کا مداوا نہ ہوا
حسرت اُس دل پہ، کہ جس دل کی نہ حسرت نکلی | گریہ اُس لب پہ، جو مشتاق ہنسی کا نہ ہوا
چھٹ گئے درد سے، سوزش سے قلق سے ہم بھی | فائدہ جان کے نقصان سے کیا کیا نہ ہوا

رنج و مصیبت کے عالم کو کس عبرتناک طریقہ سے لکھا ہے۔

کون ہے جس کو مرے حال پہ افسوس نہیں
دوست کیا، غیر بھی آئے گا تو رو جائے گا

اشعار ذیل میں زبان کی صفائی قابل ملاحظہ ہے۔

کانٹوں کی اُنگلیوں سے جو داماں نکل گیا | دامن کے ساتھ ساتھ گریباں نکل گیا
اللہ ری بیخودی کہ بدن کا نہیں ہے ہوش | دامن نکل گیا کہ گریباں نکل گیا
پھر کاوشوں پہ کیوں ہے مژہ گر نہیں ہے لاگ | پھر کیوں کھٹک ہے دل میں جو پیکاں نکل گیا

ایک غزل کا صرف مطلع اور ایک شعر لکھا جاتا ہے:-

دل گزرگاہِ جہاں میں نہیں شاداں میرا | دل ہے مہماں، بدن خانۂ مہماں میرا
جسمیں سوزش نہ ہو وہ طرز ستانے کی نکال | خوگرِ شعلۂ غم ہے دلِ سوزاں میرا

مولانا حالیؔ کی ایک مشہور غزل کا مشہور مطلع ہے:-

اُس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

شوؔر صاحب نے اس کے مصرع ثانی پر کس قدر چست مصرع لگایا ہے:۔

گڑی اشکوں سے یہاں تک مرے گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے، نہ در کی صورت

غالبؔ کا ایک شعر ہے:۔

وہ بدخو اور میری داستانِ عشق طولانی
عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

شوؔر صاحب نے اسی مضمون کو دوسرے پیرایہ میں نظم کیا ہے:۔

طولانیِ سخن سے تنفر اُنھیں وہاں
یاں شوق یہ کہ بات کوئی مختصر نہ ہو

شوؔر صاحب کا کلام اس قدر کثیر تعداد میں ہے کہ اُس کا مختصر انتخاب بھی طویل ہو جائے گا اور مضمون میں اتنی گنجایش نہیں لہذا آخر میں دو شعر اور لکھے جاتے ہیں:۔

اپنی عادت میں تو تا رگ وفا ہے داخل — پر یہ ڈر ہے کہ جفا کی نہ تمھیں خو ہو جائے
کیا کام ہے صیاد اسیروں کا قفس میں — یہ ظلم ہے ان کی تو سزا اور ہی کچھ ہے

رُباعیات

اظہار ملیح آبادی

(۱)

ہے زہر عجب فکر کے پیمانے میں
محشر سا بپا ہے دل کے ویرانے میں
کل تک جو حقیقت تھی وہی آج ندیم
تحلیل ہوئی جاتی ہے افسانے میں

(۲)

بدمست گھٹا اور جوانی، یہ کیا؟
ساون میں برستا ہوا پانی، یہ کیا؟
عرفان کا مد و جزر، الٰہی توبہ
اک موج ہزار بدگمانی، یہ کیا؟

(۳)

ہر راز کو بے نقاب کرنا ہے مجھے
ہر ذرّے کو آفتاب کرنا ہے مجھے
جس بزم میں کا نپتے ہیں جبریل وہاں
انسان کو باریاب کرنا ہے مجھے

(۴)

کیا لطف جو پانی سے اَمر ہو جائے
جب خوف ہی زندگی کا جوہر ہو جائے
جنت کی غلامی سے ہے خوشتر اظہارؔ
آزادیِ دوزخ جو میسر ہو جائے

تاج

(از جناب رادھا رمن سکسینہ شوق بی-اے)

اے تاج اے سمن بر اے مہوشِ چمن زا اے یادگار ماضی اے نقشِ حسنِ زیبا
اے شاہدِ زماں اے دوشیزۂ خود آرا اے عظمتِ مجسم اے حسرتِ سراپا

کیا یاد ہے تجھے وہ گذرا ہوا زمانہ
دورِ شہنشہی کا بھولا ہوا فسانہ

عظمت فروش تھا جب عہد بہار تیرا قدرت کا مستقر تھا رنگیں دیار تیرا
دن کو وہ تیری رونق شب کو نکھار تیرا کرتے تھے چاند سورج کیا کیا سنگھار تیرا

وہ نیم شب کا عالم جمنا کی دل نوازی
وہ چاند کا نکھرنا موجوں کی ترک تازی

سیلاب نور میں وہ ڈوبے ہوئے ستارے موجوں پہ رقص کرتے صد ہا وہ ماہ پارے
مژگانِ ترکی صورت بھیگے ہوئے کنارے موجِ ہوا کی چھیڑیں پھولوں کے وہ اشارے

وہ چاندنی کا منظر وہ جلوۂ شبانہ
تیری ادا میں تھا اک اندازِ ساحرانہ

وہ گنبدِ سمن بر وہ برجہائے سیمیں وہ خط و خالِ دلکش وہ کفشہائے رنگیں
خاموشیٔ فضا میں وہ نغمہ ہائے شیریں اور اس پہ آہ تیرا وہ سکوت حسرت آگیں

اک "خوابِ[1] مرمریں" تھا حسن و جمال تیرا
پیغام درد و حسرت دل کو خیال تیرا

پر آہ اب کہاں ہے وہ عہد وہ زمانہ وہ داستانِ الفت وہ حسن کا فسانہ
وہ شان وہ جزالت وہ جاہ خسروانہ وہ بزم عیش و عشرت وہ محفل شبانہ

[2] قصے کہانیاں ہیں باتیں وہ اب کہاں ہیں
اے حسن و عشق تیری گھاتیں وہ اب کہاں ہیں

---

[1] "A dream in marble" Tagore.

[2] یہ شعر حضرت سرور جہاں آبادی کی نظم "حسرتِ دیدار" سے ماخوذ ہے۔

نیرنگیٔ فلک سے ڈوبا ترا ستارا — وہ دورِ جاہ و حشمت بھی کر گیا کنارا
گردش میں وقت آخر کچھ بن پڑا نہ چارا — قسمت نے آہ لوٹا شان و شکوہ سارا

اس دستِ بُرد نے پھر تیرا بھی حال بدلا
صورت تری بدل دی حسن و جمال بدلا

گو اب بھی نغمہ سنجی کرتا ہے سازِ ہستی — لازم ہے ہر بشر پر فرضِ نمازِ ہستی
وُہی جوشِ آرزو ہے وہی طرزِ نازِ ہستی — بدلا نہیں زمانے نے سازِ بازِ ہستی

وہی رنگِ گلستاں ہے جوشِ نمو وہی ہے
شاخوں میں گل وہی ہیں پھولوں میں بُو وہی ہے

وہی طرزِ دلکشی ہے وہی رونقِ چمن ہے — وہی رنگ ہے کلی میں وہی گل ہی پھبن ہے
وہی داستانِ الفت وہی ذکرِ سیمتن ہے — وہی حسن کی ادا ہے وہی عشق کا چلن ہے

سب کچھ وہی ہے لیکن انداز دوسرے ہیں
نغمہ سرا وہی ہیں اب ساز دوسرے ہیں

اگلے سے بلبلوں میں طورِ فغاں نہیں ہیں — گرمی ہے دل میں لیکن بیتابیاں نہیں ہیں
وہ حسن اب نہیں ہے وہ شوخیاں نہیں ہیں — بزمِ سرور میں وہ رنگینیاں نہیں ہیں

اے تاج منقلب پھر ہونے کو ہے زمانہ
لکھے گا وقت پھر سے اب اک نیا فسانہ

شمس و قمر فلک پر پھر جلوہ ساز ہونگے — مرغانِ خوشنوا پھر نغمہ طراز ہوں گے
بلبل میں اور گلوں میں ناز و نیاز ہونگے — گرمیٔ عشق ہوگی سوز و گداز ہوں گے

آئے گا پھر سے واپس گذرا ہوا زمانہ
جنت نشاں بنے گا تیرا نگار خانہ

غزل

مجھکو ملامتوں کا کسی سے گلہ نہیں — تیری نظر سے کوئی اُسے دیکھتا نہیں
او بھول جانیوالے تری یاد کے نثار — اتنا بتا دے کیوں مجھے دل بھولتا نہیں
اللہ کیا کروں کہ بھرا آ رہا ہے جی — اور چشم شعلہ بار میں آنسو رہا نہیں
کیوں میرے آنسوؤں کا خموشی جواب ہے — اسطرح بھی کسی سے کوئی روٹھتا نہیں
تم بھی دعا کرو کہ خدا صبر دے مجھے — یا موت آ دے کہ صبر کا اب حوصلہ نہیں
[illegible] — [illegible]

مسولینی کی موت

(از فیاض الدین احمد خاں فیاضؔ گوالیاری)

۱۔ تھی عظمتِ آغاز کا انجام تری موت
عبرت کا مرقع ہے ترا نام تری موت!

تھا جس سے دمِ عظمت روما کبھی تازہ
روندا گیا پیروں کے تلے اسکا جنازہ!

کیا آگ لگائے تری تقریریں اب
رونے کو ترے گریۂ شبنم بھی نہیں اب!!

۲۔ وہ اوج وہ فوج اور وہ جوش، اور عزائم
کس برتے پہ سمجھا تھا انھیں قایم و دائم!

چھوڑا گیا جب گیس تو مظلوم حبش پر
تہذیب نے اُف تک بھی نہ کی تیری ڈھٹ پر!

بیٹھی تھی تری دھاک زمانے پہ یہ مانا
دُنیا کا بھی مالک ہے کوئی تو نے نہ جانا!

مظلوم کا مانا کوئی دمساز نہیں ہے
لاٹھی میں خدا کی مگر آواز نہیں ہے!!

۳۔ شَل ہو کے جھکا فرانس کا جب جنگ میں شانہ
تب تو نے اچانک ہی چھُرا گھونپ دیا نہ!

بے وجہ مظالم کا نتیجہ نکل آیا
جس نے بھی ترا ساتھ دیا، مُنہ کے بل آیا!

یوں مستی و خود رائی تری دور ہوئی تھی
سب شانِ حکومت تری کافور ہوئی تھی!

ہٹلر کی محبت تھی کہ پھانسی تھی گلے کی
نکلی چلی جاتی تھی زمیں پاؤں تلے کی!!

۴۔ باغی تھی تری قوم، فلک تھا ترا دشمن
تھی شومیِ قسمت بھی تمناؤں کی رہزن!

جس قوم کا ہر فرد کہا جاتا تھا سینزر
وہ قوم بنی بزدل و باغی و بداختر!

تو جن کے لیے بھول گیا نیک و بد اپنا
اُس قوم نے دکھلائی دیا مکر و کد اپنا!

گولی سے اُڑا کر بھی تجھے چین نہ پایا
ذلت کا نشانہ ترے لاشے کو بنایا!!

۵۔ مانا کہ سرِ جنگ غلط تیرا قدم تھا
اٹلی کسی قابل ہوئی تیرا ہی تو دم تھا!

وہ جوش بڑھایا تھا ترے حبِّ وطن نے
اُلٹے تھے ورق پھر دہی تاریخ کہن نے!

مانا کہ غلط تیری روش تیرا چلن تھا
اسمیں تو کوئی شک نہیں جانبازِ وطن تھا!

جانبازِ وطن کا ہو یہ انجام صد افسوس
ذلت سے لکھا جائے ترا نام صد افسوس!!

۶۔ دشمن سے پسِ مرگ بھی دل صاف نہیں ہے
انصاف کی پوچھو تو یہ انصاف نہیں ہے!

فیسزم کی لعنت سے بھی بدتر ہے تعصب
ہے امنِ جہاں شیشہ تو پتھر ہے تعصب!

اب اہل جہاں عبرت انجام بھی دیکھیں
اٹلی کی نئی صبح، نئی شام بھی دیکھیں!!

وؔلی گوالیاری

(ولادت سنہ ۱۹۰۵ء، وفات سنہ ۱۹۴۴ء)

(از جناب فیاض الدین احمد خان بی اے فیاضؔ گوالیاری)

(۱)

بڑی بڑی آنکھیں، گندمی رنگ، سنجیدہ و متین چہرہ بنائے ہوئے غالب شاہی فرغل میں ملبوس، ایک صاحبزادے مولوی امین الدین مرحوم کے پاس ساقی باقی کی مسجد میں آتے جاتے نظر آیا کرتے تھے، کچھ دن بعد دیکھا کہ موصوف اپنے شستہ ترنم اور پاکیزہ اشعار سے بزم اردو گوالیار کی رونق بڑھا رہے ہیں اور حضرت مضطر خیر آبادی جیسے باکمال اور مفتی مقبول حسین جیسے اہل ذوق اور ذی علم حضرات سے خراج تحسین حاصل کر رہے ہیں۔

پر پرواز پر بھی نارسائی ہے گلستاں تک
ہماری کوششوں کی وسعتیں ہیں حدِ امکاں تک

یہ کل کی بات ہے مجھ خستۂ مشقِ تصور کی
قفس سے آن واحد میں پہونچتا تھا گلستاں تک

ہمیں تو اے وؔلی برقِ نظر ہی نے جلا ڈالا
بڑی ہمت تھی پروانوں کی پہنچے شمعِ سوزاں تک

بزم اردو گوالیار نے جن ہونہار شعراء کی فطری صلاحیتوں کو ابھارا اور تربیت ذوق میں مخصوص حصہ لیا اُن میں وؔلی کا نام بدرِ کامل کی طرح چمکتا ہے جس کی روشنی آنکھوں کو خیرہ کرنیوالی تو نہیں مگر سنہری، سبک اور سہانی ہے اور دل کو کیف و درد کی ملی جلی کیفیتوں سے بھر دیتی ہے۔

وہ نالہ کب تھا جو نکلا تھا لب سے دیکھ کر اُن کو
وہ اِک نغمہ تھا جو لب پر باندازِ فغاں آیا

ٹھہرو کہ اور میں تمھیں جی بھر کے دیکھ لوں
کیا جانے پھر نصیب ہو کب دیکھنا مجھے!

پھر ذرا حد سے زیادہ بڑھ چلا ہے شوقِ دید
پھر سہی اِک وعدۂ صبر آزما میرے لئے

یہ ماہِ کامل جب ہلال ہی تھا، تبھی ہلالِ عید کی طرح دلنواز و نظر نواز تھا۔ جیسے جیسے نور بڑھا، روشنی پھیلی، نگاہیں اُٹھنے لگیں۔ مگر آہ چار دن کی چاندنی کے بعد ہی مصائب کی اندھیری راتیں شروع ہوگئیں۔ وؔلی کی زندگی خودداری، عظمت و شرافت، وضعداری، ناقابل شکست اُمید و عزائم اور حوصلہ شکن افلاس و روح فرسا مصائب کا ایک حیرت انگیز و المناک مجموعہ تھی، چنانچہ یہ شعر نہ تھے اُن کی فطرت کی آواز تھی:-

حاصل ہے محبت میں یہ زندہ دلی مجھ کو
ہونٹوں پہ تبسم ہے، دل میں غم پنہاں ہے!

دینے والا خوش ہے اپنے دل میں تم دیکھو مجھے
اس سے بڑھ کر کیا خوشی ہوگی وؔلی میرے

یہی فطرت تھی جس نے بستر مرگ پر اُن سے یہ شعر کہلوایا:۔

میں تو خوش تھا یوں بھی لیکن میرا ہمدم تھا اُداس
مجھ کو محروم سکوں، مایوس درماں دیکھ کر

ہر آنے جانے والے سے مُسکرا کر فرمایا کرتے تھے۔ یہ شعر کہتے وقت میری نگاہ میں فیاض صاحب تھے آہ۔ آخر کار اُسی فیاض کے ہاتھوں بارہ سال کی طویل اور جانگسل بیماری اُٹھانے کے بعد ۲؍جون ۱۹۴۳ء کو قبر میں اُتارے گئے!

یہ ایک صبر آزما اتفاق تھا کہ اُسی تاریخ میں میری یتیم چچازاد بہن کی شادی تھی جس کا سرپرست میں ہی تھا، جلسۂ شادی میں اچانک یہ خبر جانکاہ سُنی اور کچھ دیر بعد یہ خبر آئی کہ مرحوم کی والدہ بضد ہیں کہ جب تک فیاض اور انعام نہ آجائیں گے جنازہ نہ اُٹھنے دونگی: میں بے چین ہو کر جلسۂ شادی سے صفِ ماتم کی طرف دوڑ پڑا۔ چنانچہ اِدھر جنازہ کی نماز ہو رہی تھی اُدھر ہمشیرہ کا نکاح، اِدھر بچپن کے ساتھی کو قبر میں اُتارا جا رہا تھا، اُدھر بہن کی رخصت ہو رہی تھی!

کچھ اپنے حالات کے تحت، کچھ فطری گدازِ قلب کے زیر اثر، مرحوم کے مختصر سے مجموعۂ کلام میں، بیمار، نزع اور مرگِ غم کے متعلق اشعار غیر معمولی درد۔ اثر میں ڈوبے ہوئے ملتے ہیں اور ارباب ذوق و اہلِ نظر دیکھ لیں گے کہ ان مضامین میں وؔلی، عزیز لکھنوی کے دوش بدوش ہندوستان کے کسی شاعر سے پیچھے نہیں۔

تا سحر آتی تھی ہر دم آہ و شیون کی صدا
آج کیا ہے ناتوانِ ہجر کیوں خاموش ہے

دمِ آخر یہ تماشا بھی رہا تھا کچھ دیر
وہ ذرا ہاتھ رکھیں، نبض نمایاں ہو جائے!

اچھا ہوا جو آپ دمِ نزع آ گئے!
تھا انتظار اور بڑا انتظار تھا!

آنا تھا جس کو میری عیادت کو آ چکا
اَب ہے دعا یہی کہ اُٹھا لے خدا مجھے!

اِدھر بیمار کو پیغام پر پیغام آتے ہیں
اُدھر وہ ہیں جنھیں تاخیر پر تاخیر ہوتی ہے!

اور تھوڑی مدد اُسے تابِ تکلم کرنا
کہ ادھوری ہی رہی جاتی ہے بیمار کی بات!

کیا مُنہ دکھا سکیں گے کفن منہ پہ ڈال دو
شرمارہے ہیں آج خود اپنی وفا سے ہم!

وؔلی کی پُر اُمید فطرت حُزن و یاس میں بھی جھلکتی ہے اور ایک خاص کیفیت و اثر پیدا کرتی ہے جسکی نظیر کمتر ملیگی!

تمناؤں کی اک دنیا لئے محشر میں آیا ہے
کہاں تک ہائے اِس دل کو یقینِ عہد و پیماں تھا

وعدہ کسی کا لاکھ تبسم کے ساتھ ہو
جی چاہتا نہیں کہ بھروسا نہ کیجئے!

نہیں، نہیں، یہ ستم ہیں ستم دکھانے کے
کہ دشمنی کی نگاہیں چھپی نہیں رہتیں!

اُس پہ کیا جانئے کیا حادثہ گزرا ہوگا　　ورنہ دل اور محبت میں ہراساں ہوتا!

نااُمیدی میں سکونِ دل تو حاصل ہے مگر　　وہ اُمیدوں کی بھی کیا تھی زندگی میرے لئے!

اُمیدوارِ حصولِ کرم رہا پھر بھی　　جو بدنصیب کبھی کامیاب ہو نہ سکا!

وہ تو کہ رہ نہ سکا اُستوار عہد ترا　　وہ میں کہ مجھ میں کوئی انقلاب ہو نہ سکا

موتیوں سے دامنِ اُمید بھرلوں گا ولی　　رُخ مری جانب اگر امواجِ ساحل نے کیا

ولی کے کلام میں شیریں فرہاد، وامق وعذرا، یوسف زلیخا، ڈھونڈھے نہیں ملتے، البتہ طور و موسیٰ کے قصۂ پارینہ کو ولی نے معناً وضمناً اپنے مخصوص انداز میں تازہ کیا ہے:۔

اِس لئے طور کو جَلا ڈالا　　تاکہ موسیٰ پھر آرزو نہ کریں!

اپنے جلوے کے کرشموں سے وہ ناواقف نہیں　　لَنْ تَرَانِیْ کی صدا ہے خواہش دیدار پر

ہر ایک کو کلیم ہی سمجھا نہ کیجئے　　پردہ اُلٹ کے سامنے آیا نہ کیجئے!

بلبل وگلشن، برق ونشیمن، صیاد وقفس کے پردے میں ولی کی پُر درد اور گلکار طبیعت نے جو گل کترے ہیں وہ بھی اپنے رنگ میں نرالے ہیں:۔

پَر و بازو مرے کیوں بھاری ہوئے جاتے ہیں　　خیر ہو یہ اثر آمدِ صیاد نہ ہو

ایک آہ سرد کھینچ کے بلبل ہوئی خموش!　　یعنی یہ ہم قفس کو پیام بہار تھا!

کیا کچھ گزر گئی دلِ آشفتہ حال پر　　صیاد نے چمن سے کیا جب جُدا مجھے

کہوں کیا قصۂ برق ونشیمن ہم قفس تجھ سے　　کہ میرے ساتھ آفت میں گلستاں کا گلستاں تھا

کچھ تو آلامِ اسیری کی تلافی ہوتی　　آشیاں خیر نہ ہوتا تو گلستاں ہوتا

میں نے خود شہرِ اسیری کے منافی سمجھا　　ورنہ دل کو تو قفس میں بھی گلستاں ہوتا

خبر مرگِ قفس گر نہ چھپائی جاتی　　میرے ماتم میں گلستاں کا گلستاں ہوتا

ہم آشنا کنج قفس میں فغاں بھی کر دیکھیں　　سکوت سے تو کوئی انقلاب ہو نہ سکا!

مؤخرالذکر شعر پر مجھے گوالیار کا وہ عظیم الشان ادبی اجتماع (۱۹۳۴ء) یاد آتا ہے جس میں جناب صدر حضرت علامہ احسن مارہروی کے علاوہ حضرات بیخود موہانی و آسی لکھنوی نے تو حضرت ضیائی بدایونی معتمد بزم سے ایک وجد کیف کی حالت میں یہاں تک فرمایا تھا کہ "جب یہاں ایسا شعر کہنے والے موجود تھے تو ہمیں بلانے کی کیا ضرورت تھی"!
جذبات و واردات قلب اپنی مخصوص سادگی و پُرکاری کے ساتھ ادا کرنے میں وؔلی جس ندرت و قدرت سے کام لیتے تھے اور اس میں جو کیف و اثر بھر دیتے تھے وہ اُن ہی کا حصہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بزمِ اُردو کی جگمگاتی محفل وؔلی کا دم نہ ہونے سے سوگوار نظر آتی ہے؛ مزید نمونہ کلام ملاحظہ ہو:۔

تیرے رُخِ صبیح کی یاد اور بڑھ گئی، سو حسرتیں ہیں وقتِ طلوعِ سحر ہمیں
وہ اور اپنی چشمِ تمنا پہ یہ کرم دھوکا نہ دے رہی ہو ہماری نظر ہمیں

کیا کہا اے قیس یہ "دیوانۂ لیلےٰ ہوں میں" وائے دیوانے کہ تجھ کو امتیازِ ہوش ہے!

تیری شرکت کے عقیدے کا کرشمہ کیا خوب رونقِ انجمنِ عالمِ امکاں ہو جائے

گریزپا ہے ہر اک ذرہ کوئے جاناں کا وؔلی طلب کی نگاہیں چھپی نہیں رہتیں!

قدرتِ اظہارِ اُلفت اب کہاں حاصل مجھے وقت تھا وہ بھی کہ سب کچھ کہہ دیا تھا جوش میں
یہ وفورِ خستگیٔ قلب، یہ جوشِ جنوں ڈال دی ہلچل وؔلی نے بزمِ اہلِ ہوش میں

یوں محوِ انتظار تھا میں شامِ انتظار وہ آ گئے تو اُن کو مرا انتظار تھا!

لاکھوں نگاہیں پڑ گئیں میری نگاہ پر کمبخت شوقِ دید نے رُسوا کیا مجھے

وہاں دن سے زیادہ رات روشن تھی جہاں تم تھے یہاں اک داغِ دل تھا جو چراغِ شامِ ہجراں تھا

کمال جب ہے ترے حُسنِ بے محابا کا کہ میری تابِ نظر برقرار رہنے دے

پھر وہی تجدیدِ وعدہ اور حصولِ اعتبار کب تک آخر یہ فریبِ زندگی میرے لئے
کس قدر ہونے لگا ہے تم کو اب مجھ سے گریز کتنے بنتے جا رہے ہو اجنبی میرے لئے
آس اک دل میں لگی تھی وہ بھی تو نے توڑ دی اب بتا کیا ہو گی مشکل زندگی میرے لئے

زاہدوں کی بزم پر بھی ایک مستانہ نگاہ انگلیاں اُٹھنے لگیں ساقی ترے میخوار پر

آخر گزر گیا وہ محبت کا دَور بھی		اب دل میں آرزو ہی کسی بات کی نہیں

اُلفت میں بدگمان ہیں سارے جہاں سے ہم		ڈرتے ہیں بات کرتے ہوئے رازداں سے ہم
تھے کارواں کے ساتھ تو منزل نہ مل سکی		منزل ملی تو دُور ہیں اب کارواں سے ہم

موقع ہے کہ دے لیجے طعنے اسے جی بھر کے		دل اپنی وفاؤں پر ایسے میں پشیماں ہے!
اُلفت کی یہ تحقیر یں اللہ رے بے دردی		دنیا ابھی اُلفت سے ناواقف و ناداں ہے!

ڈوبتے دیکھا تو فوراً چل دئے مُنہ موڑ کر		کس قدر مجھ سے کنارہ اہلِ ساحل نے کیا!

بری وفائے محبت پہ طعنہ زن ہو کر		بری خطائے محبت جتائی جاتی ہے!

اثر مجھ پر تو ہوتا ہے اگر اُن پر نہیں ہوتا		نہیں ہوتی تو ہے کچھ آہ میں تاثیر ہوتی ہے
نگاہِ اوّلیں آغاز ہے انجامِ اُلفت کا		محبت کی اسی بنیاد پر تعمیر ہوتی ہے

غمِ فرقت نہ ہو جانکاہ جو ملنے کی صورت ہو		مصیبت کب مصیبت ہے اگر اُمید راحت ہو

ہوگئی بات پرائی جو زباں سے نکلی،		ایک سے دّو کی ہوئی دّو سے ہوئی چاؔر کی بات

مشکلیں زندگیِ عشق کی اللہ اللہ!		مر چکے ہوتے جو مرنا ہمیں آساں ہوتا

قائل ہیں حسن برہمیِ بے سبب کے ہم		لیکن ہر ایک بات پہ بگڑا نہ کیجئے!
اب تک بُرائیاں تو ولؔی کی بہت سُنیں		اِک روز مِل کے دیکھئے ایسا نہ کیجئے!

ہوشیار اے محوِ دیدِ جلوۂ برقِ نظر		بجلیاں منڈلا رہی ہیں خرمنِ جاں دیکھکر
اپنے ہی داغوں سے روشن کرکے اپنا دل تو ولی		آپ ہی خوش ہولئے گھر میں چراغاں دیکھکر

آخری دو شعر مرحوم کی آخری غزل کے ہیں۔

(۳)

جناب ولؔی غزل کی دنیا سے نکل کر نظم کے میدان میں اپنی تگ و دو کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں:-

"تغزل کے دَور کا روز افزوں زوال اور اس کی ناقابلِ برداشت ناقدریاں دیکھ کر اکثر میرے اصفیاض صاحب کے

درمیان ملکی قومی اور اصلاحی نظموں کے متعلق تبادلۂ خیال ہوتا رہتا تھا، چنانچہ پہلی صحبتِ مناظمہ کا انعقاد ۱۴؍اپریل ۱۹۲۸ء کو ہوا، اور عنوان نظم "اتحاد" قائم کیا گیا۔ یہ نظم موضوع مذکور کے تحت میرے قومی خیالات کے نقشِ اوّل کی حیثیت ہے۔ اور قوم سے مراد میرے مسلک میں نوع بشر یا جنسِ انسانی سے ہے؟
اس نقشِ اوّل کے چند بند ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں، جس سے مرحوم کے زورِ قلم، وسیع الخیالی اور دردِ طبیعت کا اندازہ ہوگا:-

اتحاد

کس قدر ہوتی ہے اُن الفاظ سے حسرت عیاں — جن کے معنی کا نہ دنیائے عمل میں ہو نشاں
مغز کچھ باقی نہ ہو، رہ جائیں خالی استخواں — ماجرائے بے کسی پر جن کے شرمائے زباں
ہے اُن ہی الفاظ میں سے ایک لفظ "اتحاد"
جو رہا اپنے مطالب میں ہمیشہ نامراد

باہمی تفریق سے نازل ہوئے کیا کیا وبال — دَورِ سابق میں ملیں گی سینکڑوں اسکی مثال
ہے نظر کے سامنے دنیا کی قوموں کا زوال — لیکن انساں کو نہیں انجام کا پھر بھی خیال
لے رہا ہے زہر کے گھونٹوں میں شربت کے مزے
شامِ غم میں ڈھونڈھتا ہے صبحِ عشرت کے مزے

دوسری جنگ عظیم کا خطرہ ظاہر کرتے ہیں:-

دَورِ حاضر بھی ہے اِک دورِ نفاق و اضطراب، — طمع نفسانی کا دنیا پر مسلط ہے عذاب
قوموں قوموں میں تصادم کا ہے عزمِ ناصواب — بھائی اپنے بھائی سے رکھتا ہے دلمیں اجتناب
یہ ہمارے حضرتِ انساں کی صبح و شام ہے
اِن کو امن و آشتی و صلح سے کیا کام ہے

سان فرنسسکو کانفرنس کے تصور کی پیشینگوئی فرماتے ہیں:-

ہاں مگر اس دَور سے دنیا جو پائے گی نجات — کیا عجب ہے جنسِ انساں کو ادھر ہو التفات
آشتی و صلح سے کی جائے تنظیمِ حیات — جنتِ امن و سکوں بن جائے ساری کائنات
نفرتیں جتنی دلوں میں ہوں وہ یکسر دُور ہوں
تفرقے آپس کے جتنے ہوں وہ سب کافور ہوں
سب سے بڑھ کر ہے معلم وقت ہی انسان کا — ذرہ ذرہ پر اثر ہے جس کے ہر فرمان کا

سر کچلتا ہے یہ ہر سرکش کا، ہر نادان کا
رُخ بدل دیتا ہے ظلم و جہل کے طوفان کا

وقت ہی اک روز دے گا مل کے رہنے کا سبق
لوٹ دیگا دَم میں تفریق و عداوت کے وَرَق

ایک حالت پر نہیں رہتا زمانے کا قیام
ہے اِسی صورت سے کچھ قانونِ قدرت کا نظام

روشنیٔ صبح کی حامل ہے تاریکیٔ شام
عہدِ وحشت کو بھی ہونا ہے بہرصورت تمام

دَورِ حیوانی کا قصّہ پاک ہوگا ایک دن
طبعِ نفسانی کا پردہ چاک ہوگا ایک دن

بعد کی نظموں میں سے دو نظمیں ایک "تجدیدِ محبت" ایک "صحیفۂ خونیں" مرحوم کی آخری یادگار ہیں۔ نظم "تجدیدِ محبت" میں دنیا کے مادّی رجحانات کے خلاف فریاد کی گئی ہے:-

جہاں مذہب بحدِ رسم باقی ہو زمانے میں
اندھیرا ہی اندھیرا ہو دلوں کے جلوہ خانے میں

مذاقِ روح سے بیگانگی پھیلی ہو عالم میں
ہوا و حرص کی دیوانگی پھیلی ہو عالم میں

جہاں روحیں ترستی ہوں سکونِ امن و راحت کو
جہاں دنیا بھلا بیٹھی ہو پیغامِ محبت کو

اس دنیا میں "دلی" ستیہ، پریم اور اہنسا کی تعلیم ان الفاظ میں دیتا ہے:-

پیامِ حق سے پھر بیداریاں پیدا ہوں عالم میں
جنونِ عشق سے ہشیاریاں پیدا ہوں عالم میں

طوافِ تختۂ خونیں ہو شیوہ ہر فدائی کا
تبسم سے ہو استقبال ہر تیغ آزمائی کا

تڑپ جتنی بڑھے اُتنا مزہ آنے لگے دل کو
دہانِ زخم سے نکلے مبارک باد قاتل کو

ہمیں گرتی ہوئی انسانیت کو تھام لینا ہے
ہمیں اب قوتِ بازو سے اپنی، کام لینا ہے

زمانہ کو تباہی سے بچانا کام ہو اپنا
یہی آغاز تھا اپنا، یہی انجام ہو اپنا

قومی اور مذہبی نظموں میں انسانی رواداری کی اتنی اعلےٰ تعلیم دینا دلی کا ہی کام تھا۔ دوسری بلند پایہ نظم "صحیفۂ خونیں" میں 'دورِ یزیدی' کی تصویر کس اچھوتے انداز سے کھینچتے ہیں:-

دل میں غرور آنکھ میں دولت کی مستیاں
جوشِ خودی میں آکے فرشتوں پہ پھبتیاں

دستِ ہوس دراز تھا بیعت کے نام پر
دوزخ دکھایا جاتا تھا جنّت کے نام پر

دنیا کو اپنے کر میں لانے کی کوششیں
ہر ہر قدم پہ دام بچھانے کی کوششیں

قدرت کی نعمتیں بھی حکومت کے ہاتھ میں
عجز و نیاز سارے رعونت کے ہاتھ میں

آب و طعام پر بھی نہیں آدمی کا حق! دولت ہے جس کے پاس ہے سب پہ اسی کا حق

اس کے مقابلہ میں حق و صداقت پر مرمٹنے والے حسینؓ کی شانِ ایثار کا ذکر جن روشن الفاظ میں کیا گیا ہے وہ دنیا کی مُردہ قوموں میں ایثار و عمل کی رُوح پھونکنے والا ہے اور مقطع کے طنزیہ اشعار میں ہمارے لئے درس عبرت و غیرت ہے،

تاریکیوں کے اَبر سے نکلا ایک آفتاب — عالم کو روشنی سے کیا جس نے فیضیاب
جرأت کو جس کی ہمت و جرأت پہ ناز ہے — صدق و صفا کو جس کی صداقت پہ ناز ہے
کٹ کٹ کے گر رہے تھے عزیز و قریب سب — رِل مِل کے جا رہے تھے محب و حبیب سب
نکلی نہ فرطِ درد و اَلم سے کراہ تک — اللہ رے ضبطِ غم کہ نہ کی ایک آہ تک
میدان کارزار میں بچے بھی جاتے تھے — زخموں پہ زخم کھاتے تھے اور مُسکراتے تھے
باطل کا خوف گھر نہ دلوں میں بنا سکا — دنیا کو درس جرأت و صدق و صفا ملا
رہبر تھے حرّیت کے اسیرانِ کربلا — درس خموشی رکھتا ہے میدانِ کربلا

ہم بھی ولی ہیں ماننے والے حسینؓ کے
خالی ہیں ہر عمل سے بجز شور و شین کے
ہمت نہیں کہ ظلم کے آگے ٹھہر سکیں
جرأت نہیں کہ حق و صداقت پہ مر سکیں

(۳)

ولی کی غزلوں میں نازک جذباتِ انسانی اور وارداتِ قلب کی صحیح و کامیاب ترجمانی ہے تو نظموں میں اہلِ وطن اور عالمِ انسانیت کے لئے ایک ضروری درسِ عمل ہے۔ ولی کا پیغام اتحاد و عمل، صداقت و ایثار کا پیغام تھا اور مذہب انسانیت کی طرف انسانوں کے رجحان کی ایک خوش آیند نوید، وہ جس طرح کورانہ قدامت پرستی، تنگ خیالی اور محدود نظری کا دشمن تھا اُسی طرح قوم کے اُن خود نمار ہنماؤں کے خلاف تھا جو پروردۂ ناز و نعم اور نفس پرست ہوتے ہوئے اور غریبوں کی دنیا سے بے خبر رہتے ہوئے اُن کی فلاح و بہبود کے مدّعی بنتے ہیں۔ مگر جنھیں غریبوں کے کلبۂ احزاں تک پہونچنے کا دماغ ہے نہ فرصت۔ ان مقاصد کو لیکر مضامین نثر میں پُر اثر الفاظ کے انتخاب، اور اپنی انوکھی طنزیہ طرز نثر نگاری میں ولی جس قدر کامیاب ہیں اُس کے اندازہ کے لئے ہم بطور نمونہ اُن کے ایک اصلاحی افسانہ "بیداری" کے کچھ حصے نقل کرتے ہیں۔ یہ افسانہ ایک قدامت پرست مسلم گھرانے کی داستان ہے جو ان الفاظ سے شروع کی گئی ہے۔

"جس وقت کہ ہمارے دولت مند، عیش پرست، تعلیمیافتہ حضرات، وقتی اور ملکی ضروریات کا احساس جتاتے

ہوئے اپنی عشرت گاہوں سے نکل کر عالیشان پنڈالوں میں مخملی کرسیوں کے اردگرد جمع ہو رہے تھے، جس وقت کہ بھیڑ بکریوں کے گلّے کو اُن کے گلّہ بان جدھر چاہتے تھے اُدھر ہانکے ہوئے لئے جا رہے تھے؛ جس وقت کہ غریب ملک کے فاقہ کشوں کے جم غفیر کو روٹیوں کے نام پر جمع کیا جا رہا تھا۔ جس وقت کہ دھواں دھار تقریر کے کمالات اور جوش کے کھوکھلے مظاہرے ہو رہے تھے، جس وقت کہ دنیا کے سامنے کمزوروں اور غریبوں کو عزت کے ساتھ زندہ رہنے کا سوال درپیش تھا؛ جس وقت کہ قوم کی ابتری کا نقشہ پوری لفظی صناعیوں کے ساتھ کھینچا جا رہا تھا، اور اس کی حالتِ زار سے ہمدردیوں کے جذبات کا طوفان زبان کے چشموں سے اُبل رہا تھا، خوشنما لفظوں اور سنہرے خیالات سے لوگوں کو متاثر کیا جا رہا تھا، جس وقت کہ شہر کی اس بالائی فضا میں بیداری و تنظیم کا صور پھونکا جا رہا تھا، اُس وقت اس فضا کی تہ میں ان ہنگاموں کے زیر سایہ، دُکھ، درد، اور کرب و اضطراب، غم و الم اور بے چینی کی ایک خاموش و بے زبان بستی بھی تھی جو ان مقبروں میں دفن تھی جسے عرف عام میں گھر کی چار دیواری کہتے ہیں!!

اِس تمہید کے بعد اصل قصّہ کا آغاز ایسے الفاظ سے ہوتا ہے جن میں مجبور و معذور صنفِ نسواں اور بالخصوص بیکس و بے پر، پردہ نشیں خواتین کے لئے ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے۔ جنھیں پڑھکر سخت سے سخت، اور قدامت پرست سے قدامت پرست قلوب، کامیاب مضمون نگار کی طنزِ لطیف کی گہرائیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

"وحیدہ ایک خوشحال اور قدامت پرست خاندان کی لڑکی تھی، جہاں عورت نام تھا ایک ایسے بے بال و پر مُرغ اسیر کا جسے ایک مرتبہ قفس میں ٹھونس دینے کے بعد دوسری مرتبہ اُس وقت نکالا جاتا ہے جبکہ ایک قالب بے جان کو بند قفس سے کنج لحد میں منتقل کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے! پھر اِس قید قفس کے آئین بھی ہیں جن کی پابندی ہر اسیر پر لازم قرار دیگئی ہے، کسی اسیر کا قفس کی تیلیوں سے سر مار کر قفس کو کمزور کرنا، صیاد کے مظالم کے خلاف فریاد کرنا، جانداری کے دعوے کرنا، یا چہچے کرنا، یا گلو خلاصی کی کوشش کرنا وغیرہ وغیرہ، یہ سب آئین شکنی کی صورتیں ہیں جن پر عذاب و عقاب کا نازل ہونا واجب و برحق!!

قدامت پرستی اور رسم و رواج کی اندھا دھند تقلید کے تحت آئے دن جو تباہیاں دیکھنے میں آتی ہیں اور جنکی بدولت ہماری آئندہ نسلیں پیٹ بھر کھانا یا تعلیم پانے کے قابل نہ رہ کر ملک و قوم کے مستقبل پر مہر لگا رہی ہیں اُنکے متعلق اپنے مخصوص طنزیہ مگر درد بھرے الفاظ میں توجہ دلاتے ہیں۔

"وحیدہ کا خاندان جہاں عورتوں کے حق میں رواجی قدامتوں کا حامی تھا، وہاں مردوں کے حق میں ساہی و مغرابیوں کی قربانگاہ پر مُصرفی کی بیدردانہ بھینٹ چڑھانے کا عادی تھا، اور رفتہ رفتہ یہ خاندان رسم و رواج کی شان و شوکت برقرار رکھنے کی دُھن میں خدا جانے کن کن بے اعتدالیوں میں پڑکر لڑکی کے جوان ہوتے ہوتے مفلسی کے گھاٹ اُتر چکا تھا، مگر فقط اتنی مدت میں کہ وحیدہ اب دو بچوں کی ماں تھی وہ تمام مدارج طے ہو گئے جو ایک گھر کو بے اصولیوں اور بے اعتدالیوں کیساتھ

تباہی کے غار میں اُتار دیتے ہیں، تفصیلات لاحاصل ہیں۔ بے اصولیوں اور بے اعتدالیوں کے عنوان میں وہ سب تقاریب شامل ہیں جو مبالغہ کے ساتھ منائی جاتی ہیں۔ وہ تمام تہوار ہیں جو آثارِ قدیمہ کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ عجلہ سواریاں ہیں جو قدم قدم پر محض پردے کی وجہ سے استعمال میں آتی ہیں۔ وہ تمام رسمیات ہیں جو سابق کی خوشحالیوں فارغ البالیوں کی یادگار ہیں، وہ تمام زیورات و ملبوسات اور قدیم اقسام غذا ہیں جو اب تہذیب و کلچر میں داخل ہو کر اپنی بقاو تحفظ کے دعویدار ہیں۔"

افسانے کی ہیروئن وحیدہ کے اچانک بیوہ ہو جانے کے بعد اس کے ایام بیوگی کی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

" دنیا میں ایسے افراد بلکہ ایسی جماعتوں کی کمی نہیں جن کا مطمحِ نظر کمزوروں سے فائدہ اُٹھانا، بگڑے ہوئے اوقات کے منتظر رہنا، اپنے اغراض و مقاصد مصیبت زدوں سے پورے کرنا، دوسروں کے رنج و غم کی بنیاد پر اپنی مسرتوں کی عمارت بنانا، ہوتا ہے۔ اس قسم کے بیدرد، کمینہ لوگ جب اپنے شکار کو ڈھونڈھتے ہیں تو ہمدردیوں کا مجسمہ بنکر، رحم و انسانیت کا سراپا بنکر، اور اپنے حرص و آز کے تیر و تفنگ کو شرافت کے جامے میں چھپا کر۔"

"وحیدہ اپنی معمولی ضروریاتِ زندگی کو بھی کس طرح پوری کر رہی تھی اور اُسے اِن ضروریات کے پورا کرنے میں کیا کیا رسمی رواجی دقتیں پیش آرہی تھیں، کن کن باتوں کے لئے کس کس طرح مجبور رہنا پڑتا تھا اور اُن کے لئے کیا کیا دُکھ درد اُٹھانا پڑتے تھے، یہ کچھ ایسی تشریحات ہیں جن کا تصور دردمندولوں کے لئے بیحد روح فرسا اور اُن لوگوں کے لئے درسِ عبرت ہے جو عورتوں کو مردوں کے سہارے کے بغیر زندگی بسر کرنے کے قابل نہیں رکھتے۔"

اِس سلسلے میں حد سے بڑھے ہوئے رواجی پردہ کے خلاف قابل افسانہ نگار کا زاویۂ نظر، صنفِ نازک کی بہبود اور قومی ترقیوں سے دلچسپی رکھنے والے افراد کے لئے "یک لمحہ غور و فکر" پیش کرتا ہے:

" دراصل ہماری قومی و ملکی زندگی کا موجودہ دَور یکسر طیاری ہے۔ ہمارے سامنے ہر قسمی خطرات ہیں اور ہمیں اُن کا مقابلہ کرنا ہے؛ موجودہ رواجی پردہ ہمارے دورِ عشرت و سکون و مسرت کے زمانہ کی ایک یادگار رسم ہے، موجودہ دَور ایک دَورِ اضطراب ہے جس میں سکون و اطمینان عنقا اور ناپید ہیں۔ عورتیں ہمارے قومی جسم کا نصف حصہ ہیں۔ نصف حصہ بیکار و معطل ہونا، دوسرے حصہ کو بھی مفلوج بنا رہا ہے! جن عورتوں نے مردوں کو قومی جد و جہد میں حصہ لینے اور ہر قسمی ایثار و قربانی کے لئے ہنس ہنس کر آمادہ کیا ہے، وہ ہمارے تالوں میں بند رہنے والی دنیا سے بیخبر اور جاہل عورتیں نہیں تھیں۔"

انجمن اسلام گوالیار کی بلند بانگ، جلوسی و اجلاسی مساعی اور اُس میں بے عملی و خود غرضانہ عناصر کی شرکت کے خلاف وؔلی نے ایک مختصر سا صحیفہ "احتجاج" کے نام سے شائع کیا ہے جو بہر معنی اُن کے دُکھے ہوئے دل کی پکار

ہے۔ بخوفِ طوالت اُس میں سے صرف تلقینِ عمل کا حصّہ ہم اِس جگہ نقل کرتے ہیں:۔

"اگر قومی خدمت کا صحیح جذبہ ہے، ملّت کے اضطراب و انتشار کا سچّا درد ہے، ملک و قوم کی سچّی محبت ہے تو لوگوں کو اپنی شاندار کوٹھیوں کی طرف نہ بلاؤ، پلیٹ فارم کی طرف آنے کی دعوت نہ دو، عالیشان پنڈالوں میں عوام کو جمع کرنے کی جھوٹی نمائیش نہ کرو بلکہ تم خود اپنی کوٹھیوں اور آرامگاہوں کی سیڑھیوں سے نیچے اُترو اور چوبیس گھنٹے کی مصروفیات میں سے چند لمحے ایسے بھی نکالو جن میں تم غریبوں کی تاریک جھونپڑیوں میں بیٹھے ہوتے ہو۔ بجلی کے قمقوں سے خیرہ ہونے والی نظریں کچھ دیر تک مٹّی کے چراغوں کی لَو کو ہوا کی لہروں سے تھرتھراتے ہوئے بھی دیکھتی ہوں، تمھاری نگاہیں اُن نظاروں کو حقیقی روپ میں دیکھ سکیں اور تمھارے دلوں میں صحیح تاثرات کی صلاحیت پیدا ہو سکے تمھیں معلوم ہو کہ سینکڑوں بیمارانِ جھونپڑوں میں ٹمٹماتے ہوئے چراغوں کے سہارے بے علاج و بے دوا کس طرح دم توڑ رہے ہیں، ہزاروں مظلوم انسان انصاف کی قیمت ادا نہ کر سکنے کے باعث ظلم و حرص کا کیونکر شکار بنے ہوئے ہیں" باعمل جماعتیں پیدا کرو، ہنگاموں اور شورشوں سے دور رہ کر، خاموش، تعمیری اور عملی کاموں سے دلچسپی لینا سیکھو، چھوٹی سے چھوٹی شکایت کو، ادنےٰ سے ادنےٰ واقعہ کو نظر انداز نہ کرو، قومی تہذیب اور اخلاق کو سنوارو، ایسے تمام رسم و رواج اور اسباب ترک کرو اور کراؤ جن سے قومی نقصان متصور ہو۔ قوم کی کمزوریوں اور بُرائیوں کے اسباب کو تلاش کرو، بُرائیوں سے نفرت کرو لیکن بُرائی کرنے والوں سے نفرت نہ کرو، افراد کے افعال و اعمال پر نگرانی رکھو تاکہ انھیں خرابیوں اور تباہیوں کے زیادہ مواقع حاصل نہ رہیں۔ لوگوں کے گھروں پر فرداً فرداً جاؤ اُن کے دُکھ سُکھ سنو اُن کی مشکلات کو ہلکا اور آسان بنانے کے لئے اُنھیں مناسب مشورے دو، اہلِ مقدرت ہو تو ایک محفوظ سرمایہ متعین کر کے اُن کو قرض خواہی کی لعنت اور سود در سود کے چنگل سے بچاؤ، زمانہ کی رفتار اور وقت کی ضرورت سے لوگوں کو آگاہ کرو، نیک کام کا صلہ نیک کام ہی کو سمجھو، خدمت کو خدمت ہی کے لئے کرو نہ کہ شہرت اور لیڈری کے خیال سے! مختصر یہ کہ جبتک بالائی ہنگاموں کی تہ میں آکر، شہرت کے مینارہ سے کچھ نیچے اُتر کر صحیح طور پر رابطۂ عوام پیدا نہ کروگے عوام کے رہنما نہیں بن سکتے، نہ اُن کی طاقت کو اپنے ساتھ منظم و متحد کر سکتے ہو"

کیا اِس تلقینِ عمل سے آج ملک کی ہر جماعت فائدہ نہیں اُٹھا سکتی؟ کیا کانگریس جیسی ملک کی عظیم سیاسی جماعت اپنے نئے تعمیری پروگرام میں اِسی سے ملتا جلتا لائحۂ عمل مُرتب کرنے پر مجبور نہیں ہوئی؟ حقیقت یہ ہے کہ دلّی کی یہ آواز زمانے کی آواز تھی اور غریب ملک کی ایک صحیح نباضی کرنیوالے کے دُکھے ہوئے دل سے نکلی تھی، آج بھی اگر ہمارے لیڈر خدمتِ قوم کے سچّے جذبہ کے ساتھ اِس احتجاج کے لئے گوشِ شنوا پیدا کریں تو ملک کا بکھرا ہوا شیرازہ منظم ہو کر بگڑی بن سکتی ہے؟

دلّی ملک کے غریب طبقے کے جذبات کی نمایندگی اور اُن کے خیالات کی ترجمانی کا کیا حق رکھتے تھے یہ جاننے

کے لئے آئیے، اُن کی زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں۔

ولی اللہ خاں وَلی گوالیاری کے آبا و اجداد گنج مرادآباد شریف کے ایک خوشحال اور مشہور شریف گھرانے سے متعلق تھے۔ آپ کے دادا عظیم اللہ خاں صاحب نے ایک بزرگ عزیز کی دعوت پر جو گوالیار میں کسی اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے، وطن عزیز کو خیرباد کہا۔ وَلی نے اپنے والد بزرگوار حافظ عزیز اللہ خاں صاحب کی آغوشِ تربیت میں جب آنکھ کھولی تو امتدادِ زمانہ سے حالات ناسازگار دیکھے پھر والد کے نابینا ہو جانے سے خاندان کی پرورش کا بار کمسنی ہی میں وَلی کے کاندھوں پر آپڑا، چنانچہ اوائل عمر ہی میں آپ کو تلاش روزگار کی صعوبتوں اور افکار سے دوچار ہونا پڑا۔ ابتداءً آپ جسٹس لیاقت اللہ قریشی بار ایٹ لا کے زمانۂ وکالت میں اُن کے محرر اور بعد ازاں نقل نویس عدالت ہائیکورٹ گوالیار کے عہدہ پر فائز رہے، اپنی مختصر سی تنخواہ میں جس خوش اسلوبی، وضعداری اور عزت کے ساتھ آپ نے زندگی بسر کی وہ شرافت و ہمت، عقل و ذہانت کا ایک اعلیٰ معیار پیش کرتی ہے۔ شہر کے رؤسا اور اعلیٰ عہدہ داروں میں سے جسے بھی وَلی کے ساتھ ذرا بھی رابطہ کا اتفاق ہوا وہی اُنکی تعظیم و تکریم اور احترام پر مجبور نظر آیا۔ کم سخنی و کم آمیزی کے باوصف ہر طبقہ میں اُن کی غیر معمولی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا راز، اُن کی مہذب بول چال، شگفتہ اوضاع و اطوار اور دردمند طبیعت میں مضمر تھا۔

عین جوانی کے عالم میں اوائل سنہ ۱۹۳۲ء ہی سے علالت (ریڑھ کی ہڈی کی دِق) کا ایک صبر آزما سلسلہ شروع ہو گیا جو وَلی کی اس مختصر سی معاش پر بھی اثر انداز ہوا۔ علالت اور تنگیٔ حالات کی جسمانی و ذہنی تکالیف کے علاوہ، غریب وَلی کو "درگلویم شستنِ پیغمبر است" والی روحانی اذیت سے بھی دوچار ہونا پڑا جس کی تلخیاں مرض کی سختیوں کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئیں اور آخر کار وہ شخص جس نے کبھی قرضخواہ ہونا یا کسی کا احسان لینا گوارا نہ کیا تھا، اپنی دو بیوہ بہنوں اور ضعیف والدہ کے ساتھ اپنے قلیل البضاعت چھوٹے بھائی کی امداد کا محتاج ہو کر بہ عالم بیکاری و بیروزگاری صاحبِ فراش ہو گیا اور آخری دَور جن حالات میں گزرا اُس کا اندازہ ذیل کے المناک واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

مرحوم نے وفات سے تقریباً ایک ماہ قبل ایک مختصر سے خط میں میرے پاس پہونچنے اور میرے ساتھ کچھ دن بسر کرنے کی آرزو ظاہر کی۔ میں جانتا تھا کہ وَلی صاحب ازراہِ محبت و کرم اور مراسم قدیم مجھے محبتِ خصوصی کا درجہ دیتے ہیں مگر میں نے لشکر سے لمار تک کے سفر کی صعوبتیں گِنا کر لکھ دیا کہ میں خود ہی عنقریب حاضرِ خدمت ہوا جاتا ہوں"۔ چنانچہ کچھ دن بعد جب میں لشکر پہونچا تو مرحوم کو چشم براہ پایا، مگر اس حالت میں کہ فرطِ نقاہت سے کروٹ تک نہیں لے سکتے تھے اور جسم کی ہڈیاں تک گھُل چکی تھیں، میں نے آنسو ضبط کر کے بات ٹالنے کے لئے مسکرا کر کہا کہ "مولانا آپ نے بڑی ہمت کی تھی، لمار تک دھاوا مارنے کا قصد کیا تھا"۔ اس کے جواب میں عمر میں پہلی مرتبہ مرحوم نے تبسم کا جواب تبسم سے نہ دیتے ہوئے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا اور غایت درجہ سنجیدگی سے فرمایا۔ "ارے نہیں بھائی،

یہ بات نہیں تھی! سوال روٹی کا تھا"۔ میرا دل ہل گیا، آگے بات کرنے کی نہ ہمت تھی، نہ موقع!۔
غریب فلاکت زدہ بیمار ہندوستان اور اُس کی روٹی کا سوال کتنا اہم ہے کوئی وَلی کے دل سے پوچھتا، اِسے وہ رہنما نہیں بتا سکتے جنھوں نے مدّۃ العمر افلاس سے آنکھیں چار نہیں کیں۔" غریبوں کی دنیا میں رہکر غریبوں کو دیکھو، آسمان سے زمین پر اُتر کر اُن کے دل کا درد اور اُن کی مشکلات سمجھنے کی کوشش کرو" یہی وَلی کی تعلیم تھی یہی اُس کا پیغام!

(۴)

وَلی کا درو مند دل ہی ایک صحیفۂ آسمانی تھا۔ ورنہ اُن کی درس و تدریس کی حدود، اپنے والد ماجد کے دامنِ تربیت سے آگے وسیع نہ تھیں! چنانچہ اُن کے والد بزرگوار وَلی صاحب ہی کے الفاظ میں "نہایت رعب و سخت گیری کے ساتھ اپنے ساتھ رکھ کر خود ہی تعلیم دیتے تھے"۔ مگر اِس تعلیم و تعلّم کی بنیادیں اتنی استوار تھیں کہ ہونہار صاحبزادے کا شوق مطالعہ و حصول علم اُبھرا۔ کم عمری ہی میں بیحد علمی انہماک پیدا ہو گیا۔ مذہبی کتابوں کی لائبریری میں شب و روز گزرتے تھے۔ علماء و فضلا کی صحبتوں سے استفادہ حاصل کرنے میں بیحد دلچسپی تھی، مرحوم نے اپنے بچپن کے علمی انہماک کا ایک دلچسپ واقعہ ان الفاظ میں قلمبند کیا ہے:۔

"ایک مرتبہ ایک ضخیم کتاب ہاتھ لگی، مطالعہ کا اشتیاق پیدا ہوا۔ لوگوں کے مخل ہونے کے اندیشہ سے گھر سے باہر نکل کھڑا ہوا۔ جنگل کی طرف جانے والی سنسان بے ضرر سڑک پسند آئی، چنانچہ اُسی طرف رُخ کیا اور کتاب شروع کر دی گئی۔ اِس انہماک نے راستے کا کچھ پتہ نہ چلنے دیا۔ البتہ جس وقت کتاب ختم ہوئی اور نظر مطالعہ سے ہٹ کر دوسری جانب پڑی تو گیارھواں میل ختم ہو چکا تھا، قریب ریلوے اسٹیشن تھا اور سامنے نہر بہ رہی تھی!"

اِسی ذوقِ مطالعہ نے اکیڈیمیکل تعلیم نہ ہونے کے باوجود وَلی کو ایک بالغ نظر اور روشن خیال ادیب بنا دیا۔ مذاقِ سخن فطرت ہی سے ودیعت ہوا تھا۔ یہ فطری جوہر چھپا نہ رہا اور سخت گیر مربّی نے بھی اِس جوہر کی قدر و قیمت محسوس کرتے ہوئے بطیب خاطر اُنھیں اُن کے ماموں حافظ غنی محمد صاحب غنؔی گوالیاری کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ مرحوم کی ابتدائی شاعری غنؔی صاحب ہی کی نظر اصلاح و توجہ کی رہینِ منت ہے اور تربیتِ ذوقِ مابعد میں بزمِ اُردو گوالیار نے نمایاں حصّہ لیا ہے۔ اگرچہ فطرتاً تو آپ بحیثیت تلمیذ الرحمٰن کسی رہنمائے ادب کی امداد کے محتاج نہ تھے، تاہم تکمیل فن کی خاطر کچھ عرصہ تک حضرت نوؔح ناروی اور بعد کے ایام میں حضرت علامہ تقوی لکھنوی کے دامن سے وابستہ رہے مگر ان بزرگان کا نمونۂ اصلاح مرحوم کے کلام میں الشاذ کالمعدوم ہے۔

وَلی نے گوالیار میں رہکر زبان اُردو کی والہانہ خدمات، جس شغف و انہماک سے انجام دیں اُس کا ایک نمونہ گوالیار میں انجمن ترقی اُردو کی شاخ کا قیام تھا۔ (ملاحظہ ہو اخبار "ہماری زبان" دہلی تاریخ [illegible]) اُن کی بے لاث

اور وسیع النظرانہ مساعی اور اپیل سے متاثر ہو کر پنڈت رام ناتھ شرما بی۔ اے ایڈمنسٹریٹو آفیسر فاریسٹ صدر ہندی ساہتیہ سبھا گوالیار اور منشی کرشن بہادر صاحب ایڈوکیٹ سابق وکیل سرکار گوالیار جیسے قابل اور ذی علم حضرات نے انجمن مذکور کی رکنیت قبول فرمائی۔ اول الذکر بزرگ نے جن الفاظ کے ساتھ اپنی دلی شرکت و امداد کا اعلان کیا ہے وہ ملک کی موجودہ مسموم فضا میں ہر محب وطن کے لئے قابل غور و قابل عمل ہے:۔

"ملک کی سیاسی ترقی کے لئے ایک زبان کا ہونا ضروری ہے اور وہ زبان یقیناً ایسی ہوگی جس میں ہندی، فارسی وغیرہ کے عام الفاظ شامل ہوں گے۔ اُردو اگر اُس میں مشکل، غیر مانوس الفاظ باہر کی زبانوں کے شامل نہوئے تو بلاشبہ ملک کی زبان ہو سکتی ہے۔ وہ اُردو جو اس مقصد کو پورا کرے اس کی ترقی میں، میں بخوشی حصہ لینے اور اُس کی اشاعت کی تدابیر میں امداد دینے کو تیار ہوں۔"

اس انجمن کے اولین اجلاس میں (۱۹) اپریل ۱۹۴۱ء ولی مرحوم نے اپنی افتتاحیہ تقریر میں کم و بیش ان ہی خیالات کا اظہار فرمایا ہے جس سے زبان کے معاملہ میں اُن کی قلبی گنجایشوں اور وسیع النظرانہ زاویۂ نظر کا اندازہ ہوتا ہے، مرحوم کی یہ تقریر ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے:۔

"دعا فرمائیے کہ چھوٹے چھوٹے فرقہ دارانہ تعصبات کی پٹی ہماری آنکھوں سے دور ہو کر ہمیں وسیع النظری کے ساتھ ملک کی مشترکہ زبان اُردو کی تبلیغ و ترویج کی توفیق نصیب ہو اور اس طرح ہم ملک میں اتحاد و آزادی کی طرف ایک کامیاب قدم بڑھا سکیں۔" اس انجمن کے ایک اجلاس منعقدہ ۱۰ مئی ۱۹۴۱ء میں بزرگانِ مذکور کے علاوہ دیگر معزز اراکین وکیل سید اصغر علی صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ وکیل سید محبوب علی صاحب، وکیل سید اشتیاق علی صاحب بی۔ اے ایل۔ ایل۔ بی وغیرہ حضرات کی موجودگی میں رزولیوشن بالاتفاق رائے پاس ہوا کہ "اس انجمن کا ایک مقصد یہ بھی ہونا چاہیے کہ ہندی، اُردو دونوں زبانوں کے ادب کو نزدیک تر لایا جائے اور اس طریقہ سے ملک کی فضا میں ایک موافقت پیدا کی جائے جس کی سخت ضرورت ہے۔"

اس سلسلہ میں جناب ولی صاحب نے مقامی اخبارات میں جو اپیل ۱۸ شعبان ۱۳۶۰ھ کو شایع کیا تھا اُس کا خلاصہ یہ ہے:۔

"ملک میں ہندی اُردو کا کچھ تصادم ہونا ظاہر ہوتا ہے جو ملک کی بڑی بدقسمتی ہے، ہندی کے دلکش ادب سے اُردو والوں کو محبت نہیں ہے۔ اور اُردو کو ہندی والے اپنانا نہیں چاہتے۔ ہماری بزم کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اُردو و ہندی کے ادیب ایک دوسرے کی ادبی کتابوں کو شوق اور غور سے پڑھیں اور باہمی تبادلۂ خیالات سے یک جہتی پیدا کریں۔ اس غرض کے حاصل کرنے کے لئے پنڈت رام ناتھ صاحب شرما نے اپنی صدارتی تقریر میں جن اُمور کی طرف توجہ دلائی ہے وہ یہ ہیں:۔

(۱) اُردو زبان کے مستند لغت فرہنگ آصفیہ میں ۵۴۰۰۰ الفاظ ہیں۔ جن میں سے ۳۹۰۰۰ ہندی کے ۱۹۰۰

شبد عربی کے، ... ۴۴ فارسی کے ، ... ۵ سنسکرت کے اور ۵۰ سو انگریزی پرتگیز وغیرہ زبانوں کے ہیں، گویا کہ ہندی زبان کے سب سے زیادہ الفاظ اُردو میں ہیں۔ (۲) شاعری میں ہندی الفاظ کے استعمال میں پس و پیش نہ کیا جاوے (۳) اُردو بھاشا کا جو موجودہ رجحان عربی فارسی کے الفاظ زیادہ استعمال کرنے کی طرف ہے اُس کو کم کیا جاوے (۴) مروجہ الفاظ کی جگہ سنسکرت کے نئے الفاظ بنائے جا کر کام میں نہ لائے جائیں جیسے دیا سلائی کی جگہ دھوم شلاکا (धूम्र शलाका) (۵) اسٹڈی سرکلس قائم کئے جائیں جن میں دونوں ادبوں کی مستند کتابوں کے پڑھنے کا سلسلہ قائم کیا جائے" اگر کسی صاحب کے ذہن میں مزید تجاویز ہوں تو براہ مہربانی اُن سے مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ اُن پر غور کرکے عملی قدم بڑھایا جا سکے؛

افسوس کہ جواں مرگ دلی کی مُہلک ، روح فرسا علالت اور ناوقت موت نے اس مقصد کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہونچنے دیا ورنہ کیا عجب تھا جو دلی کی انتھک کوششوں کی بدولت یہ خواب بھی ایک دن شرمندۂ تعبیر ہو رہتا!

مجھے یہ لکھنے میں فخر محسوس ہوتا ہے کہ ایسی قابل قدر ہستی کی زندگی، میرے ناچیز مجاہدانہ مشوروں سے کسی نہ کسی حد تک متاثر تھی۔ اِن مشوروں نے مرحوم کی غیور مگر شریف طبیعت میں وقتاً فوقتاً و بتدریج جو ہیجان پیدا کیا وہ اشعار ذیل سے ظاہر ہوگا:۔

سنہ ۱۹۳۱ء دلی اُلفت میں وہ احباب دشمن ہیں جو ناصح ہیں اُسے اپنا سمجھئے جو شریکِ رنج و راحت ہو

سنہ ۱۹۳۲ء لوگ سمجھانے میں کیا کیا حد سے گزر جاتے ہیں دل تو خود اپنی خطاؤں پہ پشیماں ہوتا

سنہ ۱۹۳۳ء لاکھ مجبورِ عمل ہوں مگر اتنا بھی نہیں سر جھکا کر نہ سُنوں ناصحِ غمخوار کی بات

سنہ ۱۹۳۴ء تیری دل سوزی کی ناصح میرے دل میں قدر ہے تو نے اپنا دل جلایا ہے سدا میرے لئے

دلی مرحوم ایک فرشتہ صفت ، مرنجان مرنج ، بے لوث اور سادہ مزاج اِسم با مسمیٰ انسان تھے، اہل نظر کو اُن کے رہن سہن ، مشرب و مسلک ، منکسر المزاجی ، حلم و تحمل اور غیور طبعی کا اندازہ کرانے کے لئے بالترتیب حسب ذیل اشعار کافی ہیں۔

یہ شکل یہ لباس ، یہ دعوائے اتقا معلوم ہو رہے ہیں بہت پارسا سے ہم

کیا مسلکِ دلی پہ کوئی رائے دیجئے ، وہ تھا نہ بادہ خوار ، نہ پرہیزگار تھا

مسلکِ عشق میں ہم سب سے رہے دور دلی دشمنی ہم نے کبھی کافر و دیندار کی بات

اربابِ ذوق ، بزمِ سخن ، اور میں دلی ششدر ہوا ہے آج مرا حوصلہ مجھا

مصیبت تم دنیا ہے اور ہم ہیں دلی اُٹھائے جاتے ہیں جب تک اُٹھائی جاتی ہے!

جب ہنسی میں پڑ گیا ، افسانۂ مہر و وفا ہم تو اُٹھ آئے یہ رنگِ بزمِ جاناں دیکھ کر

موخرالذکر شعر مرحوم کی آخری غزل کا پہلا شعر ہے۔

وّلی کی مختصر زندگی کاوش و کاہش، سعی و عمل، اُمید و عزائم اور روح فرسا مصائب کے مقابلہ میں صبر و استقلال کی ایک قابل نمونہ زندگی تھی۔ وہ علم و ادب، قوم و ملک کے ایک ایسے خاموش خادم تھے جو جیتے جی کبھی حصولِ شہرت کے متمنی نہیں ہوئے، اُنھوں نے قوم کی خدمت، خدمت ہی کے لئے کی، اور نیک کام کا صلہ نیک کام ہی کو سمجھا۔ ایسی بے لوث و بے نفس، غریبوں کا درد رکھنے والی ہستیاں جس قوم و ملک میں پیدا ہوں نہ صرف اُن کے لئے بلکہ کل عالم انسانیت کے لئے باعثِ فخر ہو سکتی ہیں۔ خدا مرحوم کے اکلوتے بچے قمر عزیز کو اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے آمین!

کیا کہوں اور کیا نہ کہوں کا انتخاب میرے لئے سخت مشکل ہے اِس لئے کہ مرحوم کا ہر شعبۂ زندگی میری نظر کے سامنے ہے اور عالم یہ ہے کہ "کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجا است" ذکرِ حبیب کو اتنا طول دینے سے ناظرین مجھے معاف فرمائیں گے مگر میرا جی نہیں چاہتا تھا کہ مرحوم کے قیمتی ارشادات کے جواہر ریزوں سے دنیائے ادب کو محروم رکھوں یا یوں سمجھ لیجئے کہ "من از شوقِ حضوری طول دادم داستانے را۔"

مرحوم کے دل شکستہ چھوٹے بھائی ماشاء اللہ خاں کی فرمایش پر لوحِ مزار پر کندہ کرنے کے لئے جو اشعار میں نے کہے تھے وہ میرے قلب و روح کی آواز سمجھئے!:-

قطعہ تاریخ

تامّل کن دلے اے مردِ مومن	ولی اللہ است اینجا آرمیدہ
شنیدہ باشی از مرگِ جوانش	شنیدہ کے بود مانند دیدہ
چہ مہر و لطف و قلب صافی داشت	چہ اخلاق و چہ اوصافِ حمیدہ
وّلی اسم است اسمِ بامسمّیٰ	تو گوئی بود روحِ برگزیدہ
کلامش ز آبِ زمزم شستہ بینی	شعورِ شعر، بر شاعر رسیدہ
محبّ دلنواز و مخلص و پاک	عدیلِ اُو نہ دیدہ نے شنیدہ
پئے تاریخِ رحلت گفت فیّاض	سنِ عیسیٰ ز ہجرت باز چیدہ
طلب ما سر گرفتہ بے تعقب	وّلی در باغِ جنت راہ دیدہ

۱۹۲۵ - ۹۰۰ ۵۶۲ - ۱۹۲۵ = ۱۳۶۳ھ

و شمسہ [illegible] کی تدوین کے لئے میں مرحوم کے چھوٹے بھائی ماشاء اللہ خاں [illegible] کا رہینِ منت ہوں۔ فیاض

"ورڈس ورتھ"

بچپن کی یاد سے اَبدی زندگانی کا احساس[۱]

(از جناب سید مقبول حسین احمد پوری)

(۱)

مَیدان، پَربَت ڈھال پہاڑی
بہتے چشمے، جنگل جھاڑی
ندّی، نالے، جھیلیں پیاری
جیسے پگھلی چاندی جاری
لئے تھے پہلے، ہلکی ہلکی
جنّت کے سے نور کی جھلکی
اَب نہ رہی اُن میں وہ شوبھا
دِکھیں وہ جیسے خواب کی دُنیا

(۲)

دَھنک سُہانی آئے جائے
چاند بھی اپنا روپ دکھائے
ہیں تالاب سپہلے اب بھی
تارے اُن میں جھلکتے اب بھی
سُورج بھی سونا برسائے
پَر میرا دل بیٹھا جائے
برس رہی سب پر ویرانی
دنیا جیسے ہوئی پُرانی

(۳)

کئے ہوئے پیڑوں پَر دَنگل
چڑیاں گائیں سُکھ کا مَنگل
مینا ڈھولک تال پہ اُچھلے
پَر میرے دل سے دُکھ اُبلے
لیکن سَنبھل رہا ہوں جلدی
دُکھ کی چھایا آئی چلدی
چشمے اوپر اُبل رہے ہیں
نیچے گر کے اُچھل رہے ہیں
جیسے کوئی چاندی کو کھینچے
چمک رہے ہیں اونچے نیچے
جیسے بجتا دور، رہا نا
گا رہے پَربَت سے نیچے گانا

---

[۱] یہ نظم ترجمہ ہے "ورڈس ورتھ" کی نظم — "Ode on Intimation of Imortality from Recollections of Early childhood." کا

بجا رہا ہے بنسی گوالا
گونج رہی دُھن بالا بالا
یہ سب گانے سُنتا ہوں میں
مست بنا سر دُھنتا ہوں میں
متوالے سب بستی بن ہیں
دھرتی اور آکاش مگن ہیں
ہے آباد مری محفل بھی
مست بنا ہے میرا دل بھی
کھیل رہے ہیں چھوٹے بچے
ہیں جو اپنے من کے سچے
دیکھ رہا جیون کا اُجالا
گود میں جھکی لے کر بالا
ننھے ننھے پودے پیارے
بنے ہوئے جیون کے سہارے
جیسے مجھ سے اب یہ کہتے
دُکھی دُکھی ہم بھی اب رہتے
دِکھتی اب یہ سب گل کاری
سپنے کی سی مایا ساری

(۵)

اس جیون میں پیدا ہوتا
ہے پہلے جیون کا کھوتا
آتا روپ بدلتی ایسے
ڈوبے نکلے سورج جیسے
پہلے کہیں یہ ڈوبی ہوگی
جب تو اس جیون میں اُبھری
اِس جیون میں جب آئی
کچھ کچھ یاد وہاں کی لائی
بچپن میں اُس دیس کے سائے
رہتے ہیں جیون پر چھائے
وہاں کی روشنی ہلکی ہلکی
کبھی کبھی دکھلاتی جھلکی
جب آجاتی یہاں جوانی
سو جاتی وہ یاد پرانی
بجھ جاتا وہ "نور ادھورا"
جب ہو جاتا آدمی پورا

(۶)

یہ دُنیا اپنا کر لیتی
اپنے سُکھ دُکھ سے بھر لیتی
اپنی گود میں پال پوس کر
بہلا لیتی ہے یہ مادر
اُڑا کے اُس جیون کی چھایا
بھر دیتی ہے اپنی مایا
بھلا کے اصلی راج بھون کو
بھرما لیتی ہے جیون کو

× × × × × ×

دیکھو وہ بالک البیلا
دیکھ رہا جیون کا میلا
بونا سا چھ سال کا پیارا
مات پتا کی آنکھ کا تارا
دیکھ رہا جیون کا سپنا

کھیل رہا ہے کھیل وہ اپنا
گاتا ہے اپنا سُن مانا
اس جیون کا گیت سُہانا
کھیل رہا ہے جگ کا ناٹک
کھول رہا ہے دُکھ کا پھاٹک

(۸)

آتما کے پرکاش کا پالک
بڑا فلسفی ننھا بالک
اندھوں میں وہ آنکھ ہے روشن
صاف ہے جس کے دل کا درپن
ایک نمونہ اچھائی کا
وہ اوتار ہے سچائی کا
جس کی کھوج میں ہم سب بھٹکے
دیکھ رہا ہے وہ بے کھٹکے
کیوں رے بالک بھولے بھولے
کھول رہا کیوں ہولے ہولے
دروازے جیون کے دکھ کے
سدا سے بیری ہیں جو سُکھ کے
جال میں اپنے سماج پھنسا کر
کرے گا تیری جان بھی دوبھر

(۹)

ہم کو اس جیون کے کرتب
سُکھ سے رہنے دیتے ہیں کب
کبھی کبھی سُکھ کی چنگاری
دکھلاتی ہے جھلکن پیاری
جب سوچو ''ون بیتے کیسے؟''
کھل جاتی ہیں آنکھیں جیسے
بال پنے کی مدھر کہانی
سُنتی ہے، دل کی ویرانی
سامنے آتی سکھ کی چھایا
ہوئی جواب سپنے کی مایا

××× ● ×××

اب یہ دُنیا کے دُکھ اپنے
دیکھ رہے نروان کے سپنے
کھوج رہے سُکھ کی خاموشی
بڑی منوہر وہ بے ہوشی
بالک ہو یا آدمی پورا
کرے نہ اُسکو کوئی ادھورا
امر ہے وہ پرکاش ہمارا
امٹ ہے اوس کا بہتا دھارا
اُس ساگر کے ٹھیک کنارے
کھیل رہے ہیں بالک پیارے
کس کو اُس کی چاہ نہیں ہے
جس کی کوئی تھاہ نہیں ہے

(۱۰)

چڑیو گاؤ سُکھ کا منگل
کرتے رہو پیڑوں پر دنگل
میمنہ ڈھولک تال پہ اُچھلے
دُکھ نہ کبھی اب دل سے اُبلے
یہ مانا جو گیا، ہم آیا

پھر دل نہ میں بھی اب بھر مایا
ہے جو کچھ سب اُس کے بل پر
دل آشاؤں سے کیوں دو بھر؟
موت کے پردے بھی جو چیریں
کھینچیں اُس کے پار لکیریں
کچھ نہیں، کچھ نہیں دکھ کی چھایا
دکھ بھی ہے سپنے کی مایا (۱۱)
ہاں اے چشمو، اے میدانو
مجھ کو سکھ سے دور نہ جانو
یہ مانا اب رہا نہ بچپن
صاف ہے لیکن دل کا درپن
دیکھ رہا ہوں اس درپن میں
پھدک رہے ہیں پنچھی بن میں
بہتے ہیں نالے البیلے
لگے ہوئے ہیں سکھ کے میلے
دیکھ رہا ہوں میں وہ سویرا
اُٹھے گا جب اس جگ سے ڈیرا
ڈوبتے سورج میں بھی دیکھا
ایک نئے پربھات کی ریکھا
دیکھ رہا وہ شفق سہانی
کہہ رہی جو پرلے کی کہانی
شکر کی جا ہے، دکھ بھی ہے سایا
بیج کے اوپر جیسے چھلکا
بیج سمویا ہے اُس رس میں
نئے ہے جس کو آتما بس میں

اب دیتے ہیں سکھ کے دلاسے
پھول پات اور پودے بن کے
یہ سب اس کا بھید بتائیں!
آنسو جس کی تھاہ نہ پائیں

غزل

(از مصورِ غم جناب حافظ محمد صدیق صاحب صدیق کانپوری)

اے جوشِ گریہ لب پہ نہ آہ و فغاں رہے
جتنا بھی دل میں درد ہو دل میں نہاں رہے
آنکلے ہو ادھر تو ذرا دیر بیٹھ لو
ممکن ہے پھر لحد کا نہ میری نشاں رہے
کیا سرگذشت اپنی سنائیں ہم اہلِ حشر
جب تک رہے زمیں پہ تہِ آسماں رہے
شاید وہ ڈھونڈھنے مجھے آئیں پسِ فنا
کچھ تو فلک مزار کا باقی نشاں رہے
صیاد و باغباں میں ہیں کچھ آج مشورے
مشکل ہے اب چمن میں مرا آشیاں رہے
جب اپنا آشیانہ چمن سے اُجڑ گیا
فصلِ بہار آئے کہ دورِ خزاں رہے
جس جس چمن میں میں نے بنایا تھا آشیاں
حکمِ قضا ہوا کہ ہمیشہ خزاں رہے
جنکی خوشی کے واسطے صدیق مر مٹا
کمبخت کا نصیب۔ وہی بدگماں رہے
جب تم ہی اپنے ہو کے روا رکھتے ہو ستم
صدیق دل شکستہ، بتاؤ کہاں رہے

افسانہ۔

چراغِ سحری

(از روشن پٹیالوی، بی، اے)

وہ دونوں حقیقی بھائی تھے۔ لوگ اُسے دانو اور مانو کہا کرتے تھے۔ دانو بڑا اور مانو چھوٹا۔ بڑے کی عمر کوئی نو اور چھوٹے کی کوئی سات کی تھی۔

وہ دونوں قسمت کے مد و جزر کے شکار تھے۔ طوفانِ حوادث نے انکی کشتیِ حیات کو گرداب میں لاگرایا تھا۔ مصیبتیں جھیلنے اور غم کھانے کے لئے ؟

وہ دونوں بیحد معصوم تھے اُنھیں احساس ہی نہ تھا کہ وہ یتیم ہو چکے ہیں۔ دنیوی آرزوؤں اور حسرتوں کے دروازے ان کے لئے بند ہو چکے ہیں۔ چرخِ کجرفتار نے انھیں بے یار و مددگار اس وسیع دنیا میں چھوڑ دیا ہے۔ مطلبی، خودغرض انسانوں کے سہارے پر۔

وہ دونوں خوشنما پھول تھے جو بادِ سموم کے تھپیڑوں سے شگفتہ ہونے سے پہلے ہی مُرجھائے جا رہے تھے، ان کی شمعِ حیات چراغِ سحری کی طرح ٹمٹما رہی تھی، ان کی زندگی شیریں زمزموں اور نشاط آگیں قہقہوں کی گونج سے ناآشنا تھی۔ اس میں مسلسل اضطراب اور پیہم کرب و تعب آنسوؤں کے دریا تھے اور سرد آہوں کا دھواں۔

وہ ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں پڑے رہتے تھے دو نہیں بلکہ ایک ہی جھلنگی کھٹیا پر۔ کمرے میں جگہ جگہ مکڑیوں نے جالے تن رکھے تھے۔ گرد و غبار کے انبار لگے ہوئے تھے۔ دھوئیں کی سیاہی دیواروں پر پھیلی ہوئی تھی، مٹی کے ٹوٹے پھوٹے برتن بے ترتیبی سے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے اُن کا کوئی پُرساں حال نہ تھا۔ طلوعِ آفتاب سے لیکر جب تک رات رُخِ عالم پر نقاب تاریکی ڈالتی وہ خالی پیٹ پڑے رہتے اور جب صبح ہونے پر کارخانۂ عالم میں زندگی کے آثار نظر آنے لگتے، سینکڑوں موٹریں، گاڑیاں، سائیکل، ان کی جھونپڑی کے آگے سے گزر جاتیں، درجنوں بالو ہیٹ بوٹ پہنے تیزی سے ان کے دروازے کے آگے سے نکل جاتے، مگر کون تھا جو اس رنج و اندوہ کی آماجگاہ کیطرف ایک سرسری نگاہ اٹھا کر بھی دیکھتا کہ دونوں دمیدہ کلیاں خزاں کا شکار ہو رہی ہیں۔ ظالم گلچیں انھیں شاخِ حیات سے توڑ کر مسلنے والا ہے۔

موسم کے موافق یا ناموافق ہونے کا ان پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ طوفان ہو یا بارش وہ اُٹھتے اور گلیوں بازاروں میں کچھ کھانے کے لئے، پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے گھومنے لگتے۔ افلاس۔ ہاں افلاس نے ان کے تمام احساسات خودداری

زائل کر دئے تھے۔

وہ امیر والدین کی اولاد تھے، کبھی ان کے ہاں بھی ہر طرح کا سامانِ آسائش موجود تھا، پُر لطف محفلیں ہو کرتی تھیں، ہر دن عید تھا اور ہر رات شب برات، ہر وقت ہنگامۂ تفریح، شور و شغب اور انتہائی گھما گھمی کا عالم، اور عیش و عشرت کے انتظامات میں مشغول دوست احباب کی رونق۔

ان کے والد لاکھوں کے مالک تھے مگر قسمت پہیئے کی طرح گردش کرتی رہتی ہے، کاروبار میں خسارہ ہو جانے کی وجہ سے انھیں پیٹ کے لالے پڑ گئے، مگر پھر بھی کسی نہ کسی طرح گزر بسر ہو ہی جاتی تھی۔ ان کی موجودگی میں زیور فروخت کر کے جائداد گروی رکھ کر کام چلتا ہی رہتا تھا مگر اب روکھی سوکھی روٹی کھانے کے لئے بھی ان کے پاس پیسے نہ تھے۔ باقیماندہ جائداد پر دور کے رشتہ دار قابض ہو چکے تھے۔ وہ اپنے حقوق کے تصفیہ کے لئے مقدمہ بازی کرتے تو کس طرح؟ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے یا قانونی چارہ جوئی کرنے کا انھیں طریقہ معلوم نہ تھا۔

وہ یہ بھی نہ جانتے تھے کہ دنیا میں زندہ رہنے کے لئے کھانا ضروری ہے یا کھانے کے لئے زندہ رہنا، وہ تو بھوک لگنے پر پیٹ بھر لینا جانتے تھے۔ دنیا اور ان کی اُلجھنوں سے انھیں قطعی کوئی واسطہ نہ تھا، کتنے پاک تھے وہ دنیوی آلائشوں سے؟

آخر کئی سال کے ہمت شکن مصائب کے بعد حقیقی معنوں میں ایک خدا ترس انسان نے ان کے سر پر دستِ شفقت پھیرا۔ اس دن انھیں معلوم ہوا کہ دنیا میں پدرانہ محبت بھی کوئی چیز ہے، وہ اس سے پہلے کبھی نہ ہنستے تھے۔ ان کے دل میں ایسا کرنے کی تحریک ہی نہ ہوتی تھی۔ ہاں لوگوں کو ہنستا دیکھ کر وہ حیران ضرور ہوتے تھے، مگر اب بوڑھے سوامی رامانند سے جب وہ صبح و شام ان کے لئے دودھ اور مٹھائی لاتا ہنس ہنس کر باتیں کرتے تھے، پہلے وہ جانتے ہی نہ تھے کہ بازار سے چیزیں کس طرح خریدی جائیں۔ دوکاندار خالی ہاتھ انھیں اپنے پاس تک کھڑا نہ ہونے دیتے تھے مگر اب سوامی رامانند ان کی تمام مشکلات آسان کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ ان کی جملہ ضروریات کی طرف پورا پورا دھیان دیتے تھے۔ وہ دونوں اپنے سب سے بڑے محسن کے احسانات کا اعتراف کس زبان سے کرتے، انھیں ایسا کرنا ہی نہ آتا تھا۔

سوامی رامانند شریف النفس بزرگ تھے، پُر جلال چہرہ، سادہ زندگی، بال برف کی مانند سفید۔ وہ ان دونوں بچوں کو شہر سے باہر اپنے مکان پر لے گئے، جہاں ہوادار کھلے کمروں کے علاوہ ملحقہ باغ میں ہر طرح کے پھل پھول موجود تھے۔ جب وہ پھل توڑ کر کھاتے تو سوامی جی کے عضو عضو میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی۔ ان دو معصوم روحوں کی ہنسی مذاق اور اطمینان آمیز مسکراہٹوں سے انھیں روحانی انبساط کا احساس ہونے لگا تھا۔ سوامی جی اپنے مقاصد کی تکمیل سے بے حد مطمئن تھے۔

سوامی جی دونوں بچوں کی خورد و نوش کے انتظام کے علاوہ تعلیم پر بھی زور دینے لگے تھے، دانو کو چند سال ہی میں اچھی انگریزی آگئی تھی۔ مانو بھی پڑھنے لگا تھا، انھوں نے دونوں کی تعلیم کا معقول انتظام کر رکھا تھا۔ نو تمام تعلیمی مدارج بڑی کامیابی سے طے کرنے لگا اور آخر اس نے بی۔اے پاس کر لیا مگر مانو کند ذہن ثابت ا تعلیم کی طرف اس کا کوئی رجحان نہ تھا۔

سوامی جی کی کوششوں سے دانو ای۔اے۔سی کے انتخاب میں آگیا۔ مقابلہ کا امتحان بھی اس نے ت اعلیٰ نمبروں میں پاس کیا اور بہت جلد سب جج کے عہدہ پر فائز ہوگیا۔

دانو کے ملازم ہو جانے کے بعد سوامی جی نے اپنی تمام تر توجہ مانو کے لئے وقف کر دی مگر ان تلوں تیل ہی نہ تھا۔ ار کوششوں کے باوجود بھی وہ اس کے اطوار میں اصلاح نہ کر سکے، آخر انھوں نے مایوس ہو کر بحال خود چھوڑ دیا۔ رخاموش ہو گئے۔

دانو اب مسٹر ڈی۔ ڈی کپور کے نام نامی سے مشہور ہو چکا تھا۔ اس کا سازِ حیات حسرت کے دلکش نغمے نا رہا تھا۔ ہر لمحہ عیش جاوداں کا پیام لاتا تھا۔ بساط اطمینان بچھی ہوئی تھی کوئی تردد اور فکر نہ تھا۔ دنیا کے طوفانی مندر میں اس کی کشتی عمر نہایت آرام اور سکون سے بہی چلی جا رہی تھی کہ ایک مقام پر ٹھہر کر اسے اپنا آئندہ لائحہ ل سوچنا پڑا۔ انسان فطرتاً خلوص و محبت کے لئے بیتاب رہتا ہے، وہ شادی کے سخت خلاف تھا، مگر اب بغیر رادہ و خواہش وہ مس مارگرٹ کی طرف کھنچا چلا جا رہا تھا اور وہ اپنے لازوال آفتاب حسن سے اس کے تاریک بلۂ دل کو منور کر رہی تھی۔ اس کے پردہ ہائے چشم پر محبت کی رنگین قلم سے نت نیا رنگ بھر رہی تھی یا سکے احساسات بری طرح چھائی جا رہی تھی اور مسٹر کپور اپنے آپ کو ایک اسیر قفس پرندے کی طرح مجبور و بے بس پاتا تھا۔ سرکس کے مقید شیر کی طرح جو اپنے محافظ کے ہر ادنے اشارے پر ناچنے لگتا ہے۔

مسٹر کپور کی اقلیم دل پر مس مارگرٹ کے حسن و جمال کی پوری پوری حکومت ہوگئی اور جس کام سے اسے سخت نفرت تھی وہی کرنا پڑا، یعنی وہ مس مارگرٹ سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگیا اور ان دسخت چٹانوں سے محبت کے دو چشمے ابل پڑے۔

اپنی بیوی کی بیجا فرمائشوں کو پورا کرنے کے لئے مسٹر کپور دریائے معصیت میں پوری طرح ڈوب گیا، رشوت کے رنگین جال میں گرفتار ہو کر اس نے اپنے ضمیر کی آواز اور صداقت کی صحیح رہبری کو کچل دیا۔

اسے سوامی رامانند کی سخت علالت کی خبر ملی مگر ان کی مزاج پرسی کے لئے وہ وقت نہ نکال سکا یا اس نے س کی ضرورت ہی نہ سمجھی وہ نا ؤ و نوش میں دن رات مشغول تھا، سازِ طرب کے دلکش گیت سننے میں مصروف۔ پھر اُسے سوامی جی کے انتقال پُر ملال کی خبر ملی، مگر بے مروت آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپکا، سینہ

سے آہ تک نہ نکلی نہ زبان پر تاسف و افسوس کا کوئی کلمہ نہ آیا، وہ اسی طرح جام پر جام چڑھانے اور ساقی ہوشربا کی کیف آگیں اداؤں کا مزہ لوٹنے میں منہمک تھا۔

اسے مانو، اپنے حقیقی بھائی کا بھی کوئی خیال نہ رہا تھا، مانو بالکل بے یار و مددگار تھا۔ سوامی جی کے انتقال کے بعد اب اسکی خبرگیری کرنے والا کوئی نہ تھا وہ مجبور ہو کر اپنے بھائی کے پاس اپنے گناہوں کا کفارہ کرنے کیلئے آیا، مگر وہاں اس کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ مسٹر کپور نے اس سے ملنے تک کی پرواہ نہ کی، اس کا دل نہ تڑپا، رگِ حمیت نہ پھڑکی، برادرانہ محبت نے جوش نہ مارا، اور مانو دنیا میں غم و اندوہ کی خوفناک و پرہول آندھیوں سے مقابلہ کرنے کے لئے مایوس لوٹا۔

مسٹر کپور اپنے فرائض منصبی ادا کرنے میں بھی کوتاہی کرنے لگا تھا۔ کئی بار افسران بالا نے اسے اپنے اطوار درست کرنے کے لئے حکم دیا مگر اس پر مطلق کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر مجبور ہو کر انھوں نے اس کے خلاف گورنمنٹ کو رپورٹ کی اور وہ ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اب وہ مس مارگرٹ کے اخراجات کو کس طرح پورا کر سکتا تھا۔ اس لئے چند روز بعد ہی اس نے طلاق حاصل کر کے ایک اور نوجوان سے شادی رچالی۔ مسٹر کپور اب پھر پہلے کی طرح دانو بن چکا تھا۔ ماضی کے افسانے درد بن کر اس کے دل میں اُٹھتے اور اسے مضمحل و پریشان کر دیتے۔ عارضی عیش و عشرت کے ایام جنھوں نے اس کی انسانیت اور آدمیت کو ذبح کر دیا تھا اب بھی اس کے سینے میں چھریاں چلا رہے تھے۔ مس مارگرٹ کی تصنع آمیز محبت اب اُسے پہروں رُلاتی تھی۔ وہ پُرمسرت دن جب وہ فکر فردا سے بے نیاز سوامی جی کے ساتھ رہتا تھا اب رہ رہ کر اُسے ستاتے تھے۔ سوامی جی کی بے غرضانہ و بے پناہ محبت اور اس کی احسان فراموشی اس کے دماغ میں ہلچل مچا رہے تھے، اپنے حقیقی بھائی کی طرف سے بے اعتنائی اس کے ذہنی انتشار کا موجب بن رہی تھی، اور سب سے بڑھکر اس دنیا کی مکاری، عیش و عشرت کی ناپائداری اور اپنی جاہلانہ و طفلانہ حرکتیں اسے چین نہ لینے دیتی تھیں۔ وہ سوچتا تھا اور روتا تھا۔ روتا تھا اور سوچتا تھا۔ دل پر قابو پانے کی کوشش کرتا مگر وہ بے اختیار ہو جاتا، کبھی سسکیاں بھرتا۔ کبھی چیخیں مارتا، کبھی دیواروں سے سر ٹکراتا۔ کبھی مجذوبوں کی طرح بکنے لگتا۔ لوگ اسکی قابل رحم حالات کو دیکھتے اور خاموش ہو جاتے۔ پہلے اس کے در دولت پر سینکڑوں آدمیوں کا اجتماع ہوتا تھا مگر اب بھول کر بھی کوئی اس طرف منہ نہ کرتا تھا۔ پہلے اس کی کوٹھی تفریحی ہنگاموں کا مرکز تھی، مگر اب در و دیوار سے حسرت برستی تھی۔ پہلے اس کے لئے دنیا بہشت سے بھی زیادہ آرام دہ تھی مگر اب نار دوزخ سے بھی زیادہ تکلیف دینے والی۔ پہلے ہر شے اس کے لئے کشش اور دلفریبی کا پیام دلاتی تھی مگر اب تمام چیزیں گویا نشتر بن کر اس کے دل کے نازک جذبات کو مجروح کر رہی تھیں۔ افواج حوادث نے اس کے حقیر دل کو محصور کر لیا تھا اور اسے کوئی راہ فرار نظر نہ آتی تھی۔

چند روز کے بعد شہر کے باہر ایک تالاب میں دو نوجوانوں کی لاشیں تیرتی ہوئی پائی گئیں۔ دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر تھے۔ لاشوں کو باہر نکالا گیا۔ لوگوں نے پہچانا، یہ دانو اور مانو تھے۔ "چراغ سحری" ٹمٹما کر بجھ چکے تھے +

صبح سویرے

از جناب جوہر صاحب

ستارے جھلملائے چاند کی کرنیں پڑیں پھیکی — گگن کے آنسوؤں سے رات کی ساری قبا بھیگی
تڑپ اُٹھا فضائے حُسن میں احساس بیداری — ستاروں نے وفورِ شوق میں ہنسکر پلک ماری
ثُریّا نے تو آنکھیں موند لیں اپنے تصور میں — مگر اک کہکشاں ڈوبی ہوئی سی ہے تفکر میں
وہ اک جادو سا جو چھایا ہوا تھا بزم امکاں پر — فسونِ نور و ظلمت جو مسلط تھا شبستاں پر
وہ اب تحلیل ہوتا جا رہا ہے صبح کے ضَو سے — ابھی ہیں عارضِ گلشن پہ تاباں رات کے بوسے
سمندر کے کنارے ہے شبابِ نور کا پرتو — یہ ڈھلتی چھاؤں ہے تاروں کی یا اک حور کا پرتو
افق سے یوں اُجالا سا ہویدا ہو رہا ہے کیوں — کہ جیسے کوثر و تسنیم کی موجیں چمکتی ہوں
ہزاروں سال کی روندی ہوئی خاموش پگڈنڈی — بساطِ کہکشاں ہے یا پہاڑی ہے کوئی ندّی
فسانے سے نظر آتے ہیں غلطاں سنگریزوں میں — پہیلی سی ہیں رو ماتی کہ جُنباں ہیں درختوں میں
یہ عفریتِ فنا ہیں یا چٹانوں کے کرارے ہیں — بھیانک آندھیوں نے جن کے سینے یوں اُبھارے ہیں

یہ منظر اور دنیا محوِ خوابِ ناز ہے جوہر
مگر میں گنگناتا ہوں سمندر کے کناروں پر

وہ مندر جس کی چوٹی آسمانوں سے اکڑتی ہے — ہوا سے کھیلتی ہے اور طوفانوں سے لڑتی ہے
کنارے پر ہے یوں اک شانِ رعنائی سے جلوہ گر — کہ جیسے نیکیاں سایہ کریں روحِ مقدس پر
یہ جنبش یہ کھنک یہ پتیوں کی سرسراہٹ کیوں — یہ اک ٹوٹے ہوئے سے ساز کی لے او یہ آہٹ کیوں
یہ آہٹ کیسی آہٹ ہے کہ فطرت چونک جاتی ہے — یہ جنبش کیسی جنبش ہے کہ دل کو گدگداتی ہے

پلٹ کر دیکھتا ہوں کیا کہ اپنے دھیان میں ڈوبی
چلی آتی ہے دھیرے دھیرے کوئی رُوپ کی دیوی

سنبھل جا اے دلِ شاعر کی دھڑکن تیز تر ہو جا
اے چوکنی نظر ان آہٹوں کی سمت میں کھو جا

مگر یہ روپ ہے یا اک سسکتا سادہ نغمہ ہے
جسے تخلیقِ آدم پر فرشتوں نے الاپا ہے

نہ شوخی ہے، نہ چنچلتا، نہ شیریں مسکراہٹ ہے
نہ غمزے ہیں نہ عشوے ہیں نہ رُخ پر تمتماہٹ ہے

نہ آنچل خود بخود سر سے ڈھلک جاتا ہے شانوں پر
نہ اک زندہ تبسم کھیلتا ہے نرم ہونٹوں پر

نہ بانہوں کے دو تارے سے رسیلے سُر نکلتے ہیں
نہ گردن کی لچک میں گنگناتے شعر ڈھلتے ہیں

سمٹتی، ہچکچاتی، چونکتی، ڈرتی سی آتی ہے
چھپی نظروں سے اُوپر دیکھتی ہے اور لجاتی ہے

یہ بیوہ ہے کہ اسکی مانگ ہے سیندور سے خالی
یہ بیوہ ہے یہ بیوہ اس کے ماتھے پر نہیں بندی

یہ تصویرِ وفا ہے اپنے سوامی کی پجارن ہے
محبت کی یہ دیوی ہے محبت کی بھکارن ہے

جبیں پر چاندنی چھٹکی ہوئی ہے نور چہرے پر
کہ دل میں اسکے لہریں مارتا ہے پریم کا ساگر

تجلّے کامناؤں کو مرادوں کو لٹایا ہے
محبت کی بلی دیدی یہ اس نے دل چڑھایا ہے

یہ اس مندر میں جاکر دو گھڑی آنسو بہائے گی
کریگی جی کو ہلکا خود ہی اپنا غم مٹائے گی

ابھی تک یاد ہے اس کو وہ انکی آخری ہچکی
کہ جس نے استوارئ محبت کی قسم لی تھی

وہ پیمانِ وفا اپنا سمایا ہے ابھی من میں
نگاہوں سے کیا جاتا ہے جو اکبار جیون میں

ابھی تک اس کے رخساروں پہ وہ بوسے برستے ہیں
سہاگن عورتوں کے جنکی خاطر دل ترستے ہیں

وہ شعلے کی سی نوکیلی نگاہیں ساتھ رہتی ہیں
جو گردن سے لپٹتی تھیں وہ بانہیں ساتھ رہتی ہیں

ابھی منڈلا رہی ہیں روح پر وہ پیار کی باتیں
ابھی تک یاد ہیں وہ کیف پرور چاندنی راتیں

جنونِ فتنہ ساماں کو جو بڑھ کر روک دیتی ہیں
جو ہر بہکے ہوئے دل کو یکایک ٹوک دیتی ہیں

بحث و مباحثہ

مغالطۂ سخن فہمی

قمر نعمانی سہسرامی

"زمانہ" اگست ۱۹۳۲ء میں جناب شوکت اعظمی کا ایک مقالہ مولانا سیماب کی تالیف "دستور الاصلاح" سے متعلق شائع ہوا ہے۔ جس کا عنوان ہے "سیماب صاحب اور شعرائے متقدمین" اس کے بعد اس تنقیدی مقالہ کی دوسری اور تیسری قسطیں کچھ وقفہ کے بعد شائع ہوئیں۔ اگر یہ مقالہ "زمانہ" جیسے موقر رسالہ میں شائع نہ ہوتا تو قابل التفات نہ تھا۔ کیونکہ ایسے سطحی مقالے مولانا سیماب کے خلاف اکثر تیسرے درجہ کے رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ جناب شوکت نے لب و لہجہ میں بازاری انداز اختیار کیا ہے جس میں زیادہ تر طعن سے کام لیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

" اردو شاعری کو مصحفی، آتش اور آسیر پر ختم ہوئے بھی نازہو۔ کم ہے۔ زمانہ ہو گیا اس وقت کی اردو اور آج کی اردو میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔ دنیا بدل گئی خیالات بدل گئے۔ بلکہ اردو شاعری کا رنگ ہی دوسرا ہو گیا ہے اب ان کے کلام پر اصلاح دینا یا۔ ان کے کلام میں نقص نکال کر اپنی اصلاح پیش کرنا حماقت ہے"۔

اس لفظ "حماقت" پر مقالہ نگار کو جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ شوکت صاحب جس کو "حماقت" سے تعبیر فرما رہے ہیں اس کو متعدد اہل نظر نے قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ جن میں حضرات فانی بدایونی، خان بہادر رضا علی وحشت، حکیم آزاد انصاری کے اسمائے گرامی شامل ہیں، تبصرے بخیال طوالت نظر انداز کئے جاتے ہیں۔ البتہ ان کے اقتباسات درج ذیل ہیں۔

"یہ اساتذہ کے لئے رہنما اور شاگردوں کے لئے راہبر نما ہے"۔ (فانی)

"طالبانِ حق کے لئے شمعِ ہدایت" (وحشت)

"پنجاب اور ممالک متحدہ کی یونیورسٹیاں اس کو اپنے نصاب میں داخل کر لیں"۔ (آزاد انصاری)

"یہ کتاب شائع کر کے ہماری شاعری پر احسان کیا ہے"۔ (دتاتریہ کیفی)

خیر شوکت صاحب کے اعتراضات بھی ملاحظہ ہوں۔

آتش — داغِ دل، خونِ جگر سے نعمت الوانِ عشق — سیر اپنی جان سے ہو جاتے ہیں مہمانِ عشق

اصلاح مصحفی — داغِ دل زخمِ جگر ہے نعمت الوانِ عشق — سیر اپنی جان سے ہو جاتے ہیں مہمانِ عشق

سیماب خواجہ آتش کا دوسرا مصرعہ قابلِ ترمیم تھا۔ جس میں "جاتے" دبتا ہے۔ مگر استاد نے اس پر قلم نہیں لگایا۔ یہ عیب ذرا سی توجہ سے دور ہو سکتا تھا۔ یعنی مصرع یوں بنا دیا جاتا "سیر ہو جاتے ہیں اپنی جان سے مہمانِ عشق"

اب وہ دبنے گرنے کا عیب تو جاتا رہا۔ مگر میری رائے میں اب بھی مصرع بے عیب نہیں ہے۔ اگر یہ مصرع یوں ہوتا تو کوئی عیب نہ رہتا۔ "سیر ہو جاتا ہے اپنی جان سے مہمانِ عشق"

ارشاد شوکت :۔ "سیماب صاحب کے دونوں اعتراض اپنی نوعیت کے لحاظ سے انوکھے ہیں۔ لیجیے ذیل کے خط کشیدہ دبتے ہوئے الفاظ ملاحظہ فرمائیے!

میر سرہانے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

غالب ہائے اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

سیماب صاحب اپنی اصلاح پر غور فرمائیں:

کیفی پھر زندگی میں آنے کو ہے تازہ انقلاب پھر جب حال گردشِ دوراں ہے آجکل

اصلاح سیماب پھر زندگی میں آنے کو ہے تازہ انقلاب پھر سازگار گردشِ دوراں ہے آجکل

گزارش :۔ شوکت صاحب کا یہ فرمانا کہ "یہ اعتراض اپنی نوعیت کے اعتبار سے انوکھے ہیں" یہ خود ایک انوکھی بات ہے۔ حرف "ے" کا گرنا دبنا یقینی معیوب ہے۔ اگر یہ ثابت کرتے کہ "ے" کا گرنا دبنا معیوب نہیں تو بیشک آپ قابلِ مبارکباد تھے۔ ان مثالوں میں میر تقی میر کا شعر پیش کرنا ادبی لطیفہ سے کم نہیں ہے۔ کیا "روتے روتے" کو اشباع کے ساتھ پڑھا جائے۔ ایک جگہ "ے" کا دبنا ہی فصاحت کا تقاضہ ہے۔

اور لفظ "مہمان" کے متعلق مولانا سیماب نے یہ کہا ہے کہ گو معناً غلط نہیں لیکن احتیاطاً مصرع یوں ہوتا۔ پھر اس پر دلیل لانا بھی عقلمندی سے خالی نہیں اور حضرت آرزو کا شعر آپ نے پیش کر کے اور بھی دنیائے ادب پر احسان فرمایا ہے۔ "ٹپکے ہوئے آنسو کو پلکوں سے اٹھانا ہے" کیا "ٹپکے" کو آپ نے جمع سمجھ لیا ہے۔ اور آپ کے خیال میں مصرع اس طرح ہونا چاہیے تھا۔

"ٹپکا ہوا آنسو کو پلکوں سے اٹھانا ہے" قربان جائیے! اس ادبی موشگافی کے۔

مولانا سیماب کا پیش کردہ مصرعہ بیشک حضرت مصحفی کے اصلاح دیئے ہوئے مصرعے سے اچھا ہے۔

ع "سیر ہو جاتا ہے اپنی جان سے مہمان عشق"

جہاں سے یہ عیب دور ہو سکتا تھا وہاں اس کا پایا جانا یا تو عجز کہا جا سکتا ہے یا غفلت اور آپ نے جتنی مثالیں پیش کی ہیں، ایک تو الزامی ہیں دوسرے وہاں سے وہ عیب دور کر کے نہیں بتایا، پھر یہ جواب یا اعتراض قابلِ قبول نہیں، کیفی کے شعر میں اگر آنے کی "ے" کو دبنے سے بچایا جائے تو تعقید پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر مصرع یوں بنا دیا جائے۔

ع ـ آنے کو زندگی میں ہے پھر تازہ انقلاب " یہ اس سے زیادہ معیوب ہے۔

صبا لکھنوی جانب وحشت جو میں چاکِ گریباں نکلا کوہ فرہاد سے مجنوں سے بیاباں نکلا

اصلاح آتش ـ گھر سے وحشت میں جو میں چاکِ گریباں نکلا کوہ فرہاد سے مجنوں سے بیاباں نکلا

سیماب :- اصلاح سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ آتش لفظ "وحشت" کسی نہ کسی طرح شعر میں لانا چاہتے تھے مگر اس کے ساتھ "گھر سے" ایک اور زائد فقرہ بھی چلا آیا جس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اگر یہ مصرع یوں ہوتا تو کیا برا تھا۔

جوشِ وحشت میں جو میں چاکِ گریباں نکلا

شوکت "اصلاح اچھی ہے لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ سیماب صاحب اصلاح دیتے وقت اپنے شاگردوں کے اشعار حشو و زوائد سے کیوں پاک نہیں فرماتے۔ جیسے آغاز صاحب کے شعر پر سیماب صاحب کی اصلاح ہے۔

آغاز زندگی بھی موت بھی اب غم کرے ماتم کرے اس قدر انجام عبرتناک ہے آغاز کا

اصلاح سیماب زندگی بھی موت بھی ہے آج اس کی سوگوار کسقدر انجام عبرتناک ہے آغاز کا

سمجھ میں نہیں آتا کہ "زندگی بھی موت بھی ہے" کے فقرے میں ایک "بھی" کیا تصور کیا جائے۔ ذرا شوق سندیلوی کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو جس کی اصلاح پر سیماب صاحب کو ناز ہے اور جو بطور موازنہ "دستور الاصلاح" کے صفحہ آخر پر دی گئی ہے۔

شوق سندیلوی چمن کی سیر سے کیا خاک اپنا جی بہلے کہ ہم یہاں ہیں مگر دل تو کوئے یار میں ہے

اصلاح سیماب چمن کی سیر سے کیا خاک اپنا جی بہلے یہاں وہ بات کہاں ہے جو کوئے یار میں ہے

خدا معلوم سیماب صاحب کے بنائے ہوئے دوسرے مصرع کا پہلا "ہے" کیا سمجھا جائے؟

گزارش :- صبا مرحوم کے مصرعہ پر؟ اصلاح مولانا سیماب صاحب نے دی ہے اس کے متعلق شوکت صاحب کو اعتراف ہے کہ اچھی ہے۔ لیکن آگے چل کر وہی الزامی جواب دینے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اگر آغاز مرحوم کا مصرع یوں بنایا جائے کہ

(ع) زندگی و موت بھی اب غم کرے ماتم کرے

یا اس طرح بنا دیا جائے :- "زندگی اور موت بھی اب غم کرے ماتم کرے۔

تو مصرع میں نہ وہ زور باقی رہتا ہے اور نہ سلاست و روانی، لیکن جو الفاظ کے محل استعمال کو نہ سمجھے وہ یہ باریکیاں کیا سمجھے؟

اسی طرح شوق سندیلوی کے مصرع میں ایک "ہے" بیکار نہیں ہے۔ بلکہ اس سے زور پیدا ہوگیا ہے۔ اس کے علاوہ جب مصرع میں "اپنا" موجود ہے تو دوسرے مصرع میں ہم بے ضرورت تھا۔ سیماب صاحب کی اصلاح سے "دل" اور "جی" کی خرابی بھی دور ہوگئی۔ یہاں "جی" "دل" ہی کے معنے میں استعمال ہوا ہے "جان اور روح" کے معنی میں نہیں

اصلاح آتش نہ جیب کا ہے نہ دامن کا تار باقی ہے جنوں کا جوش ہے فصل بہار باقی ہے۔
سیماب میں ہوتا تو خواجہ صاحب سے کہتا کہ حضرت! اس شعر کو یوں بنا دیجئے۔

نہ جیب میں نہ گریباں میں تار باقی ہے ہنوز شورش فصل بہار باقی ہے

ارشاد شوکت :- سیماب صاحب جو جی چاہے فرمائیں لیکن جیب اور گریباں ہم معنی لفظ ہیں ثبوت میں لغت حاضر ہے۔
گزارش :- خدا جانے اعظمی صاحب نے پہلے مصرعہ پر یہ اعتراض کیوں نہیں کیا کہ دو جگہ "میں" آیا ہے۔ ممکن ہے یہ وجہ ہو کہ صبا کا مصرع علی حالہ ہے اور آتش کے مصرعہ میں بھی دو جگہ "کا" موجود ہے۔ بہرحال اب داستان جیب و گریباں سنئے! بہت پر لطف ہے اگر شوکت صاحب لغت کا نام بھی تحریر فرما دیتے تو میں اُسکی طرف رجوع کرتا۔
شوکت صاحب سے پہلے حضرت عندلیب شادانی نے رسالہ "ساقی" (دہلی) میں حضرت اصغر، فانی اور جگر پر اعتراض کیا تھا کہ "یہ حضرات جیب و گریبان کو دو چیز سمجھتے ہیں حالانکہ جس کو عربی میں "جیب" کہتے ہیں۔ اسکی فارسی میں "گریبان" کہتے ہیں۔ مثلاً جناب جگر مراد آبادی فرماتے ہیں۔

حال وحشت میں ہوا یہ ترے دیوانوں کا جیب چھوٹی تو گریبان لئے بیٹھے ہیں
جنوں میں سینے کو بیٹھے ہیں جیب کے ٹکڑے خبر نہیں کہ گریباں بھی تار تار ہوا

حضرت اصغر گونڈوی کا ارشاد ہے۔

نہ میں دیوانہ ہوں اصغر نہ مجھ میں ذوق عریانی کوئی کھینچے لئے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو

جیب پھاڑنے تک بھی خیریت تھی مگر یہ جیب کھینچنے کی ایک ہی رہی۔
حضرت اصغر کے جس شعر پر پروفیسر عندلیب نے اعتراض کیا ہے۔ اسی شعر پر حضرت وحشی شاہجہان پوری نے اپریل ۱۹۲۶ء میں اپنے رسالہ "تجلی" میں یہی اعتراض کیا تھا۔ فرماتے ہیں کہ
"اصغر صاحب اور اُن کے مقلدوں کو خبر نہیں کہ جیب و گریباں ایک ہی مسمیٰ کے دو نام ہیں "جیب" عربی "گریبان" فارسی۔
حضرت وحشی کے جواب میں حضرت نیاز فتحپوری نے لفظ "جیب" پر تفصیلی بحث اسی زمانے میں کی تھی۔ اس سے اس لفظ کے استعمال پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اسے یہاں میں نقل کر دیتا ہوں اور ساتھ ہی ساتھ جناب شوکت اور پروفیسر عندلیب شادانی کو دعوت فکر دیتا ہوں کہ غور فرمائیں ان کا اعتراض کتنا وزنی ہے۔
"یہ درست ہے کہ جیب کا مفہوم عربی میں وہی ہے جو گریبان کا فارسی میں ہے۔ لیکن فاضل نکتہ چین کو شاید اس حقیقت سے بھی انکار نہ ہوگا کہ مجازاً لفظ "جیب" کیسہ کے معنی میں مستعمل ہے اور اس کا وہی مفہوم ہوتا ہے جو پاکٹ کا ہے۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اردو میں کسی لفظ کے غلط مفہوم کا رائج ہو جانا سند پیش نہیں ہو سکتا تو میں کہوں گا کہ لفظ "جیب" نہ صرف اردو بلکہ خود عربی زبان میں بھی پاکٹ کے معنوں میں کثرت سے رائج ہے۔

حال ہی میں مصر کے ایک مشہور فاضل نے عربی کا ایک پاکٹ سائز لغت مرتب کیا ہے اور اس کا نام قاموس الجیب رکھا ہے۔ اسی طرح قاموس العصری میں لفظ جیب کے معنی پاکٹ کے لکھے ہیں۔ اور مثلاً "وضع فی الجیب" کا فقرہ درج کیا ہے۔ پھر جب اصل زبان میں اس لفظ کے معنی مجازاً یہ لئے جاتے ہیں تو اردو میں جہاں عموماً لفظ جیب کے معنی صرف کیسہ کے لئے جاتے ہیں کیونکر ناجائز و ممنوع قرار دیا جا سکتا ہے"۔ (ملاحظات نگار صفحہ ۳۲)

یہ ہے جیب کی داستان، پھر یہ کہنا کہ اردو میں "جیب" بمعنی کیسہ غلط ہے۔ کیسے درست ہو سکتا ہے؟ اور جناب شوکت نے کس لغت میں ملاحظہ فرمایا ہے۔ میں نے کئی لغات میں دیکھا سب میں یہی لکھا ہے کہ مجازاً کیسہ کے معنی میں مستعمل ہے۔ صاحب فرہنگ آصفیہ فرماتے ہیں۔

جیب (ع) اسم مذکر (۱) گریبان، سینہ، پیراہن (۲) اسم مونث۔ وہ تھیلی جو جاہل عرب گریبان کے نیچے لگاتے ہیں لیکن اردو میں اس تھیلی پر اطلاق ہوتا ہے جو دامن کے چاک میں لگاتے ہیں اور اسے عوام الناس بکسر جیم بولتے ہیں۔ کیسہ، دامن، گوجا۔ ڈھب۔ جیسے "جیب میں نہیں کھلی کی ڈلی چھیلا پھرے گلی گلی"۔ (۳) قبضہ۔ دخل، قابو۔ تحت۔ جیسے "ان کا مال تو ہماری جیب میں ہے"۔ جیب خرچ۔ جیب کترا جیب کترے کا

جو نظر باز اس کا چترا ہے   جب دیکھا تو جیب کترا ہے۔

اب میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے فاضل معترض جناب اعظمی ایک بار پھر لغت ملاحظہ فرمانے کی زحمت فرمائیں گے پھر ان کو یہ ضرور نظر آ جائے گا کہ "جیب" کے معنی مجازاً کیسہ ہیں۔ صاحب فرہنگ آصفیہ نے دامن بھی اس کے معنی لکھے ہیں۔ اس لئے پروفیسر عندلیب شادانی کا اعتراض جو حضرت اصغر و جگر کے شعروں پر ہے وہ مہمل ہو جاتا ہے۔ اور اگر جیب کے معنی گریبان ہی لئے جائیں تو بھی جیسے حضرت اصغر نے لکھا ہے اس میں کوئی مضائقہ نہیں جیسے رنج و غم وغیرہ کہتے ہیں اسی طرح جیب و گریباں بھی کہنا صحیح ہے۔

امیر مینائی   غضب داغ تو نے دئے اے فلک   کلیجہ گل نیلوفر ہو گیا

اصلاح امیر   غضب چٹکیاں ہیں تری اے فلک   کلیجہ گل نیلوفر ہو گیا

سیماب "میرے خیال میں "ہیں" کی جگہ "تھیں" ہونا چاہئے۔ ردیف بھی یہی چاہتی ہے۔ مگر یہ بہت نازک بات ہے مصرع یوں ہو سکتا تھا۔ "غضب چٹکیاں تو نے لیں اے فلک"!

ارشاد شوکت:۔ یہ ضروری نہیں کہ جو چیز سیماب صاحب کے خیال میں غلط ہو اس کو اساتذہ بھی تسلیم کریں۔ اہل فن اس عیب کو عیب نہیں سمجھتے اور کلیہ ہمیشہ حال ہی میں نظم کرتے ہیں۔ ذیل کے اشعار میں زمانوں کا فرق ملاحظہ ہو۔

آثر   دل ہی آثر کا تاب نہ لایا   ورنہ محبت زہر نہیں ہے

اثر   پیش نظر ہوا دھا جو کچھ یقیں کیا   دنیا تمام دام گہ اعتبار ہے

مقتاد بے مثال حضرت نوح ناروی کی اصلاح ملاحظہ ہو

[illegible]

اصلاح بیخود کچھ خبر ہے تیرے فریادی نے رکھتے ہی قدم وہ ہوا باندھی کہ مقسم میدانِ محشر ہو گیا

حضرت شفق کی اصلاح ملاحظہ ہو!

شوق اب کہاں ہے وہ جوانی کا طلسم دلفریب اک تماشہ تھا کہ جو لے شوق دم بھر ہو گیا

اصلاح شفق صبح پیری خواب ہے گویا جوانی کا خیال شوق چونکو اک تماشا تھا جو دم بھر ہو گیا

گزارش:۔ حضرت آثر کا پہلا شعر اپنی جگہ درست ہے۔ اس کا انداز بیان یہی ہونا چاہیئے تھا۔ اس سے آپ کی تائید اور سیماب صاحب کی تردید نہیں ہوتی۔ "آثر کا دل تاب نہ لا سکا برباد ہو گیا۔ ورنہ محبت زہر نہیں ہے جو ہلاک کر دے۔

اور حضرت آثر کا دوسرا شعر بھی اس سے مختلف ہے۔ اس کے علاوہ "پیش نظر ہوا" کی ترکیب میں مجھے کلام ہے اس طرح زبان و محاورہ نہیں ہے یہاں یا تو "پیش نظر" ہے۔ یا "پیش آیا" "آگے آیا" "سامنے آیا" لکھتے بولتے ہیں۔ اور اگر حضرت آثر کا مفہوم برقرار رکھا جائے تو بھی مصرع اس طرح ہونا چاہیئے۔ "آنا ہے سامنے وہی جس کا یقین ہو" اور حضرت بیخود کی اصلاح میں جو کلیہ ہے وہ تسلیم شدہ ہے جس بات کا یقین ہوتا ہے اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے گویا ہو گئی۔ اسی طرح چونکہ "حشر" کا یقین ہے اس لئے یہ کہدیا جاتا ہے جیسے "من قتل قتیلاً فلہٗ سلبہٗ" جس نے کسی قتیل کو قتل کیا اس کے لئے اس کا سامان ہے۔ دیکھئے! یہاں قتل ہونے کے پہلے ہی قتیل کہا گیا ہے مگر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ نقاد بے مثال نے "میدان محشر" کی ترکیب پر کچھ نہیں کہا حالانکہ اکثر اساتذہ نے اس ٹکڑے پر نوٹ دیا ہے ملاحظہ ہو "اصلاح سخن" اور حضرت شفق کی اصلاح میں بھی وہ بات نہیں جو بیخود نے پیش کی ہے۔ "پیری میں جوانی کا خیال خواب ہے۔ جوانی کیا اک تماشا تھا جو ختم ہو گیا۔ ان تمام مباحث کے بعد بھی حضرت آمیر کے شعر میں میرے خیال میں ابھی تک نقص باقی ہے "غضب کی ہیں" یا "غضب کی ہیں" کہنا چاہیئے اور مصرع بھی لفظ "فلک" پر ختم ہوا ہے جو بہت سختی سے ادا ہوتا ہے۔ محتاط حضرات اس کا بھی خیال رکھتے ہیں لیکن یہ انتہائی احتیاط ہے اگر مصرع یوں ہوتا تو کیا برا تھا؟

ع فلک ہیں غضب کی تری چٹکیاں

یا اس طرح۔ ع غضب کی فلک ہیں تری چٹکیاں

باقی رہ جاتا ہے دوسرا مصرع۔ میرا خیال ہے "نیل ڈالنا" "نیل پڑنا" محاورہ ہے۔ "گل نیلوفر" ہونا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ممکن ہے بطور محاورہ استعمال نہ کیا گیا ہو بلکہ بطور تشبیہ لکھا ہو۔

شہیر مچھلی شہری شوخیِ رفتار ناز اے فتنہ قامت دیکھنا ٹھوکریں کھاتی ہے اٹھنے پر قیامت دیکھنا

اصلاح منیر رتبۂ حسن خرام اے فتنہ قامت دیکھنا دیتی ہے تعظیم اٹھ اٹھ کر قیامت دیکھنا

سیماب پہلے مصرع سے اے نکل جاتا تو مصرع اور زیادہ چست ہو جاتا اور مخاطبۂ غیر ضروری کا مرہون نہ رہتا۔ "رتبۂ حسن خرام فتنہ قامت دیکھنا۔

ارشاد شوکت :- مگر اس کو کیا کیجئے کہ زبان یوں ہی ہے "اے جانے والے دیکھ کے چل!" "اے فتنۂ قامت اپنا رفتۂ حسن خرام دیکھ" اب "اے" نکل جانے کے بعد نہ صرف اضافتیں غیر ضروری ہو گئیں بلکہ یہ نہیں واضح ہوتا کہ رفتۂ حسن خرام فتنۂ قامت کون دیکھے۔

گزارش :- مولانا سیماب کی رائے کے بعد مصرع واقعی چست ہو گیا۔ شوکت صاحب کا یہ کہنا کہ "یہ واضح نہیں ہوتا کہ "رفتۂ حسن خرام" کون دیکھے۔ غلط ہے۔ ان مواقع پر ضمیر خطاب حذف کر دی جاتی ہے۔ یہ کوئی نقص نہیں ہے اور حضرت منیر کی اصلاح میں "اے" بے لگا ہے۔ یہ عامیانہ انداز خطاب ہے اور یہ ایک قسم کی پھبتی ہو جاتی ہے۔ خود اپنا انداز خرام فتنۂ قامت کیا دیکھے؟ دوسرے دیکھنے والے دیکھ سکتے ہیں اور آپ کے پیش کردہ عبارت کے ٹکڑے جس محل کے لئے ہیں وہیں موزوں ہیں لیکن آپ کو اپنے آخری فقرے میں "اے" کے بعد "اپنا" اضافہ کرنا ہی پڑا۔ کیونکہ زبان اسی طرح ہے۔ لیکن مصرع میں "اپنا" موجود نہیں جس کا ہونا ضروری ہے۔

شہیر — وہ محبت سے کسی کا وقت رخصت دیکھنا — وہ مرا گھبرا کے منہ با چشم حسرت دیکھنا

اصلاح منیر — وہ لگاوٹ سے کسی کا وقت رخصت دیکھنا — وہ مرا آنسو فلک سے چشم حسرت دیکھنا

سیماب :- اس میں بھی مخاطبۂ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ پورا مصرعہ یوں بدل دیا جاتا تو بہتر تھا۔

آسماں کی سمت وہ میرا بحسرت دیکھنا

ارشاد شوکت :- افسوس سیماب صاحب کو اصلاح کی دھن میں ہر استاد کے شعر کا ہر ضروری لفظ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ چشم حسرت کو مخاطب کر کے دیکھنے میں جو لطف ہے اس کا تعلق ذوق سلیم سے ہے۔

گزارش :- اس اصلاح کے متعلق شوکت صاحب نے جو اعتراض فرمایا ہے اس کا مرتبہ گزشتہ اعتراضات سے بلند ہے۔ آپ ذوق سلیم کو دعوت دے رہے ہیں اور "چشم حسرت" کو مخاطب بنانے میں خاص بات محسوس کر رہے ہیں۔ حالانکہ چشم حسرت کو مخاطب کرنا غلط ہی نہیں بلکہ اغلط ہے۔ حضرت منیر کی اصلاح نے شعر کو معیوب کر دیا۔ "چشم حسرت" یا "حسرت" سے دیکھا جاتا ہے "چشم حسرت" سے کہا نہیں جاتا "اے" یہاں غیر ضروری ہی نہیں بلکہ غلط ہے۔ مولانا سیماب کا اصلاحی مصرع بے شک و ریب ان دونوں مصرعوں سے اچھا ہے۔

آپ سیماب صاحب کو فرما رہے ہیں کہ ان کو اصلاح کی دھن میں ہر استاد کے شعر کا ہر ضروری لفظ غیر ضروری معلوم ہو رہا ہے۔ انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ سیماب صاحب نے کسی مخالفت کی بنا پر یہ کتاب نہیں لکھی جس طرح آپ جذبۂ مذموم کے تحت اعتراض فرما رہے ہیں۔

جلیل مانکپوری — رنگینیٔ رخ کی اور یہ عالم نقاب کا — دامن میں کوئی پھول لئے ہے گلاب کا

اصلاح امیر — رنگینیٔ رخ کی اور یہ عالم نقاب کا — دامن میں تم تو پھول لئے ہو گلاب کا

رمشا "رنگینیٔ" نہیں بجائے "رنگت" ہے "ق"

سیماب :- دوسرے مصرعہ میں دامن اب بھی بے جوڑ سا ہے۔ "رنگ رخ" اور "عالم نقاب" دامن میں نظر نہیں آتا۔

ارشاد شوکت :- سیماب صاحب کو دامن میں جو کچھ نظر نہ آئے وہ کم ہے۔ "عالم" کے صحیح معنے تو نظر انداز نہیں ہوسکتے۔ ممکن ہے کہ پہلے مصرعہ کے ہر دو "یہ" کو زور دیکر پڑھنے سے "عالم" کے معنی صاف ہوجائیں اور "عالم نقاب" دامن میں نظر آئے۔

گزارش :- اگر شوکت صاحب کو سیماب کے دامن کی وسعت کا اندازہ لگانے کی صلاحیت ہوتی تو اتنی بے باکی سے کبھی یہ نہ لکھتے کہ "سیماب صاحب کو دامن میں جو کچھ نظر نہ آئے وہ کم ہے"۔ یہاں عالم حالت کے معنے دے رہا ہے "دامن" کی بے ربطی سے کوئی مذاق صحیح انکار نہیں کرسکتا۔ مجھے خیال آتا ہے کہ حضرت جلیل کے دیوان میں "دامن" کی جگہ "آنچل" ہے اور غالباً مصرع اس طرح ہے۔ (ع) "آنچل میں کوئی پھول لئے ہے گلاب کا"
یہ پہلی صورت سے بہر طور افضل ہے۔ اسی مفہوم کا ایک مصرع ایک غیر معروف شاعر کا سنئے!

زلفوں میں یہ نہیں گل عارض شباب کا — سنبل کی لٹ میں پھول کھلا ہے گلاب کا (شبیہ اصغر مرحوم)

شوکت حیدرآبادی: کہا جو ان سے عنایت کبھی کبھی ہوگی — بگڑ کے بولے اگر جان پہ بنی ہوگی

اصلاح آسیر: کہا جو ان سے عنایت کبھی کبھی ہوگی — تو ہنس کے بولے کہ جب جان پہ بنی ہوگی

سیماب :- پہلے مصرع میں "کبھی" کی تکرار خلاف مفہوم ہے۔ پوچھنا یوں چاہئے تھا کہ "مجھ پر کبھی عنایت ہوگی؟" یا "مجھ پر کب عنایت ہوگی؟" مصرعہ اس طرح بدل دیا جاتا تو یہ عیب نکل جاتا "کہا جو اُن سے عنایت کب آپ کی ہوگی"؟

شوکت :- تکرار خلاف مفہوم کی ایک ہی رہی۔ کیا پوچھنے کا یہ طریقہ نہیں ہوسکتا۔ کہ "مجھ پر کبھی کبھی تو آپ کی عنایت ہوگی"۔ لکھنوی اساتذہ اس کی تکرار خلاف مفہوم جائز رکھتے ہیں۔

گزارش :- اس خلاف مفہوم جائز رکھنے کی ایک ہی رہی۔ شوکت صاحب کی یہ سادہ لوحی قابل رحم ہے جب "خلاف مفہوم" ہی فرما رہے ہیں تو کیا اعتراض کیا جائے۔

اختر امروہوی :- یا ان کی جستجو میں ہے یا آرزو میں ہے — دو حال سے نہیں کوئی خالی زمانے میں

اصلاح شوق قدوائی: یا ان کی جستجو میں ہے یا ان کی یاد میں — دو حال سے نہیں کوئی خالی زمانے میں

سیماب :- شعر میں تقابل ردیفین کا عیب جو اصلاح کے بعد پیدا ہوگیا اس کی اصلاح کون کرے۔

شوکت :- وہی جو عیب جوئی میں کامل ہو۔ لیکن سیماب صاحب اس مطلع کو ایک بار پھر گنگنا کر اصلاح دیں۔

اپنی حیات چند نفس ہے زمانے میں — گزرے قفس کے گوشے میں یا آشیانے میں

ہاں! کیا اچھا ہو کہ سیماب صاحب ذیل کے تقابل ردیفین بھی دور فرما کر اس ناچیز کو بذریعہ رسالہ مطلع فرمائیں!

اثر: ہستی کا داغ دھو جو تلاش حیات ہے — نقش خودی مٹا جو تمنا نشاں کی ہے

آسیر: پٹ کے تم سے تصور میں کوئی سوتا ہے — کدھر خیال تمہارا ہے کچھ خبر بھی ہے

احسن: سب سمجھتا ہوں نصیحت کے کنائے حضرت! — مجھکو ناداں نہ سمجھے کوئی نادانوں میں

گھر سے بڑھاتے ہیں ناسور ہمارے دل کا — [illegible]

مشفق دہلوی: خود اپنے حال پر رونا کے اب افسوس ہوتا ہے — الٰہی کیا سے کیا اب حالتِ دل ہوتی جاتی ہے

اصلاح سیماب: خود اپنے حال پر اب تو مجھے افسوس آتا ہے — الٰہی کیا یہ میرے دل کی حالت ہوتی جاتی ہے

کیا اچھا ہو کہ سیماب صاحب خود اپنی اصلاح ملاحظہ فرمائیں جو بطور موازنہ "دستور الاصلاح" کے آخری صفحہ پر درج ہے

شوق سندیلوی: ہماری خاک اڑاتی ہے پیچ دے کے ہوا — ہنوز رنگ اثر عشق زلفِ یار میں ہے

اصلاح سیماب: دھواں بھی شمع لحد کا مری پریشاں ہے — ہنوز رنگ اثر عشق زلفِ یار میں ہے

گزارش:- ہمارے ناقدِ اعظم نے تقابل ردیفین کی مثال میں الزامی جواب دیتے ہوئے مولانا سیماب کا مطلع پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں سیماب صاحب اس غزل کے مطلع کو پھر ایک بار گنگنائیں بمطلع میں اور تقابل ردیفین! شوکت صاحب کا یہ تاریخی اعتراض ہے۔ ناظرینِ "زمانہ" کی دلچسپی کے لئے ایک لطیفہ لکھتا ہوں۔ ایک شاعر صاحب جو کسی سے غزلیں لکھوا کر پڑھنے کے عادی تھے اور اُن کے اس راز سے بعض احباب واقف بھی تھے۔ ایک مرتبہ غزل سنانے لگے تو کسی ستم ظریف نے چلا کر کہا "اجی حضرت اس شعر میں ایطائے جلی ہے" وہ بیچارے یہ جانتے ہی نہ تھے کہ ایطا کس جانور کا نام ہے۔ بہت خفیف ہوئے۔ دوسرے وقت اپنے دوست سے شکایت کرنے لگے کہ آپ نے غزل لکھ کر دی لیکن ایسی غلطی جان بوجھ کر رکھ دی کہ مجھے سب کے سامنے شرمندگی اُٹھانی پڑی۔ شاعر نے پوچھا آخر وہ کون شعر ہے۔ آپ نے شعر سنایا۔ شاعر نے غور کرنے کے بعد کہا۔ بھائی مجھے اس میں کوئی غلطی نہیں معلوم ہوتی۔ اس وقت نام نہاد شاعر صاحب نے بگڑ کے کہا ابھی تک آپ مذاق کئے جا رہے ہیں۔ اس میں صاف ایطائے جلی ہے اور آپ کو کوئی غلطی معلوم ہی نہیں ہوتی۔ اس وقت شاعر کی ہنسی کا جو عالم ہوا ہوگا۔ وہ ظاہر ہے پھر ان کو نہایت سنجیدگی سے سمجھایا کہ بھائی ایطا، شعر میں نہیں مطلع میں ہوتا ہے اور آپ نے جو شعر سنایا وہ مطلع نہیں۔" بالکل یہی حال ہمارے اعظمی صاحب کا ہے کہ تقابل ردیفین کے عیب کے لئے سیماب صاحب کو مطلع گنگنانے کی دعوت دے رہے ہیں۔ اور جتنے اشعار اس ضمن میں پیش کئے گئے ہیں علاوہ احسن صاحب کے شعر کے جس پر مرزا داغ کی اصلاح ہے کسی میں تقابل ردیفین نہیں۔ مگر اعظمی صاحب صرف مضمون بڑھانے کی دھن میں مثالیں پیش کرتے گئے۔ اور یہ نہیں بتایا کہ تقابل ردیفین معیوب نہیں۔ اس لئے سیماب صاحب کا اعتراض غلط ہے۔ خواہ مخواہ رسائل کے صفحات سیاہ کرنے سے کیا فائدہ! اور مضمون کی اشاعت کا مقصد کیا ہے؟

نوٹ:- جناب شوکت کی دوسری قسط "زمانہ" نومبر و دسمبر ۱۹۳۱ء کے مشترک نمبر اور تیسری مارچ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی تھی چونکہ یہ پرچے مجھے بہت تاخیر سے ملے ہیں اس لئے بتاخیر تبصرہ کیا گیا۔ باقی دو قسطوں پر آئندہ اشاعتوں میں تبصرہ ملاحظہ فرمائیے۔ — "ق"

زمانہ

بیادگار منشی دیا نرائن صاحب نگم مرحوم

جلد ۸۵	دسمبر ۱۹۴۵ء	نمبر ۶

فہرست

زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا

[illegible]

(از جناب مولانا مائل نقوی معتمد انجمن ترقی ادب بھوپال)

الگزینڈر ہیڈر لی آزاد۔ ان کا پورا نام مع عہدہ کے کپتان الگزینڈر ہیڈر لی تھا۔ ان کے والد موشیو جیمس ہیڈر لی فرانسیسی کو دار السلطنت دہلی کی رنگین صحبتوں نے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ ترک وطن کر کے یہیں کے ہو رہے اور ایک مسلمان شریف زادی سے عقد کر لیا۔ الگزینڈر ہیڈر لی اسی خاتون کے بطن سے تھے، دہلی میں بس جانے اور ہندوستانی خاتون سے عقد کر لینے کے باعث ان کے والد نے یہیں کی معاشرت اختیار کر لی تھی۔ الگزینڈر ہیڈر لی کی تعلیم و تربیت شرفائے دہلی کے بچوں کی طرح ہوئی۔ جس وقت انھوں نے ہوش سنبھالا دہلی شعر و ادب کا گہوارہ ہو رہی تھی یہاں کی ادبی محفلوں نے ان میں شعر و سخن کا مذاق پیدا کیا اور سترہ۔ اٹھارہ برس کے سن میں اچھے شعر کہنے لگے نواب زین العابدین خاں عارف کے شاگرد ہوئے طبیعت میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ لطیفہ گوئی رنگین کلامی اور حاضر جوابی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ ان خداداد اوصاف کا رنگ ان کے کلام میں جھلکتا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ان کے اشعار مقبولیت عام حاصل کرنے لگے۔

ابتدائے شباب میں دلی سے آگرہ چلے گئے، رئیسانہ طبیعت رکھتے تھے۔ داد و دہش کا بازار گرم تھا فن طب میں خاص مہارت تھی۔ مریضوں کو دوا مفت دیتے تھے۔ ان گوناگوں اوصاف کی وجہ سے ان کی ذات مرجع خاص و عام بن گئی تھی۔ آگرہ میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد ریاست الور چلے گئے۔ وہاں کے راجہ نے انھیں اپنی فوج کا کپتان بنا دیا یہیں ۹ر جولائی ۱۸۶۱ء کو بتیس سال کی عمر میں رہگرائے عالم باقی ہوئے۔ ان کے بڑے بھائی طامس ہیڈر لی ریاست بھرت پور میں ڈپٹی تھے۔ انھوں نے مرحوم کے دوست میر شوکت علی فتحپوری کی مدد سے ان کا متفرق کلام جمع کیا۔ یہ مجموعہ [illegible] میں مطبع احمدی آگرہ میں طبع ہوا تھا اب کمیاب ہے۔

کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت میں شاعری کا جوہر فطری تھا۔ ہر جگہ آمد کی کثرت ہے، روانی اور مضمون آفرینی ان کی فکر کا خاصہ ہے۔ الفاظ و محاورات کے استعمال پر کافی دسترس ہے۔ مشکل زمینوں میں زبان کی صفائی اور بیان کی دلکشی کو جس طرح قائم رکھا ہے اُسے دیکھ کر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ انکا کلام اپنے ہمعصر و ہم عمر شعراء سے کسی طرح کم نہیں۔ دیوان کی ابتدا قصائد سے ہوتی ہے۔ متعدد قصیدے حمد باری تعالیٰ نعت مسیح علیہ السلام، اپنے بزرگوں اور بعض رؤسا کی مدح میں لکھے ہیں۔ ان قصیدوں میں فن قصیدہ گوئی کا حق ادا کیا ہے مثلاً ایک قصیدہ اپنے ماموں خانصاحب حیات محمد خاں کی مدح میں لکھا ہے اسکی تشبیب کس دھوم کی ہے۔

زہے نصیب ازل سے ہوں بے تردد دیم　　نہ آرزوے بہشت بریں نہ خوف جحیم
بری ہوں مدح و مذمت سے میرے مذہب میں　　نہ بتکدہ کی حقارت، نہ کعبہ کی تعظیم

ایک قصیدہ علی محمد خاں فرزند نواب فیض محمد خاں کی تعریف میں کہا ہے، اُس کا مطلع ہے:۔

عروج پر ہے مری آہ کی شرر باری
کرے ہے خرمن گردوں پہ صاعقہ باری

مہاراجہ پردھان سنگھ والی آلور کے مدحیہ قصیدے کا مطلع ہے۔

جاؤں اب دشت سے وحشت میں پہاڑوں کو نکل　　سر شوریدہ ہے مخصوص پئے تیغ جبل

ان کی پُر زور طبیعت نے قصیدوں کے لئے مشکل زمینوں کا انتخاب کیا ہے، اس ذیل میں مہاراجہ سیندھیا کی تعریف میں ایک قصیدہ کا مطلع لکھا جاتا ہے۔

کس لئے ہے تجھ کو اے دل انتظار فصل گل　　ہے مہاراجہ کی محفل میں بہار فصل گل

اسی طرح نظام الدین خاں کی تعریف میں قصیدہ کو اس مطلع سے شروع کرتے ہیں:۔

ہو کے خاک، عالم میں تیرے کشتگاں پھرنے لگے
مصر میں جیسے غبار کارواں پھرنے لگے

ایک اور قصیدہ اسی قسم کا اپنے بڑے بھائی طامس ہیڈرلی کی شان میں کہا ہے اس کا مطلع ہے۔

پھر سینہ تپ غم میں ہے مجمر سے زیادہ
جو سخت ہے دل کا سو ہے اخگر سے زیادہ

قصیدوں کے بعد غزلوں کا نمبر ہے۔ اس صنف میں بھی انکی دشوار پسند طبیعت نے اپنی تیزی کے جوہر دکھائے ہیں۔ نمونتاً چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

جب مصیبت آپڑے جز صبر بن آتا نہیں　　نو گرفتار قفس پھڑکا پھڑک کر رہ گیا

کچھ سمجھ کر دل میں اپنے پھر گیا شاید رقیب — شب جو دروازہ ترا کھٹ کا کھٹک کر رہ گیا

نئی نئی ردیفوں کے انتخاب میں شاہ ظفر کی طبیعت کا رنگ دکھایا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس رنگ کو نبھایا بھی خوب ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں:۔

مری شامت تھی جو زلفوں میں کسی کی پھنسا — آپڑی ہیں یہ بلائیں مرے سر آپ سے آپ

یہ بزم پیر مغاں ہے ادب سے بیٹھ اے شیخ — جو ناچتا ہے تو جا کر کسی مزار پہ ناچ

یہ درد لا دوا ہے نہ مجھ کو دوا پہ چھوڑ — ہمدم مریضِ عشق ہوں مجھکو خدا پہ چھوڑ

کب سے ہیں زنداں میں ہم، دیکھو تو گھس گھس کر تمام — طوق آدھا رہگیا، زنجیر آدھی رہ گئی

بکثرت غزلیں مصحفی و انشاء کی طرح مشکل ردیف و قافیوں میں لکھی ہیں اور انھیں نہایت خوبی کے ساتھ ربط دیا ہے، کچھ شعر یہاں لکھے جاتے ہیں:۔

لکھوں جو احوال سوزِ دل کا، تو خط وہ بھیجوں تو کیونکر بھیجوں
کہ جل کے کاغذ عجب نہیں ہے، لگے کبوتر کے پر میں آتش

رفتہ پردازیٔ اغیار کو پوچھو ہم سے — سینکڑوں دل میں، ہزاروں ہیں جگر میں سوراخ

وہ ہیں واقع میں ایڑی تک، مگر ہیں پیچ و خم اتنے — کہ رہتے ہیں سمٹ کر گیسوئے خمدار گردن تک

بلاؤں تم کو کیا اُس گھر میں جس گھر کی یہ حالت ہو — کہ جو اُونچی سے ہے اُونچی وہ ہے دیوار گردن تک

تیرہ روزی میں نہ کیوں آہ غنیمت ہووے
ہے یہ خلوت کدۂ عاشقِ مایوس میں شمع
سارے عالم میں ہو کیونکر نہ مرا غم روشن
چرخ فانوس ہے اور آہ ہے فانوس میں شمع

مذکورہ بالا اشعار سے اندازہ کرنا چاہیئے کہ جس شاعر نے ایسی خارزار زمینوں کو چمن بنا دیا ہو اُسکی فکر رسا نے شگفتہ زمینوں میں کیسے گل کترے ہوں گے، بطور نمونہ چند شعر درج ہیں:۔

ہم نے دکھا دکھا تری تصویر جا بجا — ہر اک کو اپنی جان کا دشمن بنا لیا

ہے مجھ کو وہم ہر ہی غیر راہ سے — چھوٹے بڑے ہیں نقش تری رہگزار میں

پھاہا پھنکے نہ جن سے مرہم جلے نہ جن سے — اُن میں جلن نہ ہوگی وہ داغِ غم نہ ہوں گے

اہلِ جنّت کے لئے ہیں نہ وہ رضواں کے لئے — جو مزے آج ہیں حاصل ترے دیواں کیلئے

سر کو وحشت میں پہاڑوں سے بچا کر لایا — درو دیوار سرِ کوچۂ جاناں کے لئے

ہے جو ہر رنگ مے تو بِن تیرے
خونِ دل بھی پیا نہیں جاتا

آزاد نے ذوقؔ، مومنؔ اور غالبؔ کی غزلوں پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ مومنؔ کی ایک مشہور غزل ہے جس کا مطلع ہے:۔

اب اور سے دل لگائیں گے ہم
جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم

اسی زمین میں آزاد نے بھی غزل کہی ہے، چند شعر یہ ہیں:۔

محفل سے بری اُٹھائیں گے ہم — یوں غیر کا دل بٹھائیں گے ہم

کوچہ سے تمھارے لیں گے رستہ — جب راہ کوئی نہ پائیں گے ہم

گر اب کے بچے تو پھر کسی سے — زنہار نہ دل لگائیں گے ہم

صحرا میں رُلا نہ جوششِ وحشت — پھر خاک کہاں اُڑائیں گے ہم

ہیں دردِ طلب تو زخمِ دل پہ — مرہم نہ کبھی لگائیں گے ہم

ساماں ہوا ہے کچھ اکٹھا — اب گھر تجھے پھر بلائیں گے ہم

پابندِ غمِ بتاں ہیں آزاد
کیا قید سے جی چھڑائیں گے ہم

بہت سی غزلیں غالبؔ کی زمینوں میں ہیں مثلاً:۔

فتنۂ اُٹھے ہے کس نمط؟ اُٹھ کے ذرا دکھا کہ یوں — حشر بپا ہو کس طرح؟ چل کے ذرا بتا کہ یوں

"سیمتن کے پاؤں"، "گلبدن کے پاؤں"۔ اس زمین میں غالبؔ کی غزل بہت مشہور ہے۔ آزاد کا رنگ بھی ملاحظہ ہو:۔

یوسف کا منہ نہ دیکھے زلیخا تمام عمر — دیکھے جو ایک بار مرے سیمتن کے پاؤں

اُس بُت کی راہ میں جو مجھے ساتھ لے چلے — دھو دھو کے بار بار پیوں برہمن کے پاؤں

رنگِ حنا کے بوجھ سے اُٹھنا محال ہیں نازک ہیں کس قدر مرے نازکبدن کے پاؤں

غالب کی ایک دوسری غزل میں آزاد کی فکر قابلِ داد ہے۔

عشق میں تیرے مرنا عمر جاودانی ہے یہ جو زندگانی ہے خاک زندگانی ہے

مجھ پہ گو مصیبت ہے یاد تو ہوں مگر اُن کو وہ جو ظلم کرتے ہیں اُن کی مہربانی ہے

اک اُمید رہتی ہے ہم کو نااُمیدی میں موت کی توقع پر اپنی زندگانی ہے

اس طرح ایک دوسری غزل کا ایک شعر درج کیا جاتا ہے:۔

نہ دے جو بوسہ ابرو نہ دے جواب تو دے

بلا سے جو تجھے دینا ہو دے شتاب تو دے

ذیل کے اشعار میں اپنی طبیعت کا اصلی رنگ دکھایا ہے، کلام کی شوخی ہر شعر سے ظاہر ہے:۔

غم میں جمعیتِ خاطر کسے ہوتی ہے نصیب ہوں پریشاں تیری زلفِ پریشاں کی قسم

سر سے پا تک شبِ ہجراں میں جلا کرتا ہوں آ جا سوزاں کی قسم، شمعِ فروزاں کی قسم

اشعار ذیل میں چلبلے پن اور چوچلے کی داد دینا پڑتی ہے:۔

عزت سے مجھے پاس جو بٹھلاؤ تو آؤں کیوں آپ سے آؤں، مجھے لے جاؤ تو آؤں

تم دل کو بٹھاتے ہو مرے، پاس بٹھا کر دل کو نہ بٹھاؤ مجھے بٹھلاؤ تو آؤں

کیا گھر میں تمھارے در و دیوار کو دیکھوں تم اپنی جو صورت مجھے دکھلاؤ تو آؤں

گر کوئی بلاتا ہے تو کہتے ہیں وہ ضد سے آزاد کو محفل میں نہ بلواؤ تو آؤں

آزاد مذاقِ تصوف سے بھی آشنا تھے۔ دیوان میں اس رنگ کے متعدد اشعار ہیں۔ دو ایک یہاں نقل کئے جاتے ہیں اور انھیں پر ان کا تذکرہ ختم کیا جاتا ہے۔

ہم نے جس راہ میں دیکھا اُسے دیکھا آزاد اور کیا راہ بتائیں گے طریقت والے

ہے سجدہ اُدھر فرض جدھر رُخ ہے ہمارا کاشانہ ترا قبلہ ہے اور قبلہ نما ہم

بوربون خاندان کے شعرا۔

اس خاندان کی بابت جنت مکانی نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ سابق فرمانروائے بھوپال اپنی ایک تالیف "حیاتِ قدسی" میں اس طرح رقمطراز ہیں:۔

"شہنشاہ اکبر کے عہدِ سلطنت میں ایک یورپین مسمیٰ جین ڈی بوربون ہندوستان آیا اور شاہی فوج میں

ملازم ہو گیا، پھر بہت جلد توپ خانہ کا افسر مقرر کر دیا گیا۔ اکبر کے دربار میں اس کو بڑا رسوخ اور اعزاز نصیب ہوا۔ اس کے محل شاہی کی ایک کنیز کے بطن سے جو جارجیا کی رہنے والی تھی بڑا بیٹا الگزنڈر بوربون یا سکندر بوربون شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں محل کے عہدۂ گورنری پر مامور کیا گیا۔ اور علاقۂ مالوہ میں شیر گڈھ اس کی جاگیر میں دیا گیا۔ یہ عہد نادر شاہ کے حملہ تک اسکی اولاد میں رہا۔ آخری گورنر فرادی بوربون تھا۔ اس کا بیٹا سالوے ڈور ملازمت ترک کر کے شیر گڈھ چلا آیا اور نوابی کا خطاب اختیار کیا۔ سنہ ۱۷۹۴ء میں اس کے جانشیں بھوبا بوربون کو جو نواب لوسورہ راگو خاں کے نام سے مشہور تھا ایک فرانسیسی کپتان فنیٹم نامی نے جو ریاست سیندھیا کا ملازم تھا مسند سے اُتار دیا۔ اپنی ریاست چھن جانے کے تھوڑے عرصہ بعد بھوبا بوربون راجہ مارواڑ کے دربار میں قتل کر دیا گیا۔ اس کے بیٹے عنایت مسیح یا جوہر بوربون نے مع اپنے اہل و عیال کے میاں وزیر محمد خاں کے عہد میں بھوپال آکر پناہ لی۔ میاں وزیر محمد خاں نے ان کو عہدۂ قلعداری پر سرفراز فرمایا اور پھر خیر خواہیوں کے صلہ میں ایک بڑی جاگیر عطا کی۔“

عنایت مسیح بوربون | یہ مستقل طور سے بھوپال میں آباد ہو گئے۔ بوربون خاندان ہندوستان آتے ہی شاہی ملازمت میں داخل ہو گیا تھا اور جہانگیر کے عہد سے گورنری محلات کا عہدہ موروثی ہو گیا۔ رات دن فارسی سے کام پڑتا تھا اس لئے فارسی گویا ان کی مادری زبان ہو گئی تھی۔ شعر و ادب کا ذوق بھی پیدا ہو گیا تھا خاندانی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ عنایت مسیح شعر و سخن کے بڑے قدرداں تھے۔ یہ زمانہ بھوپال کے لئے بہت پُر آشوب تھا ہمسایہ طاقتیں مسلسل سترہ سال تک اس سے برسرپیکار رہیں۔ اگر تائید غیبی ریاست کے شامل حال نہ ہوتی تو دشمنوں کی دستبرد سے اس کا محفوظ رہ جانا قطعی غیر ممکن تھا۔ عنایت مسیح کے کارناموں اور ریاست میں اُن کی زندگی کا یہی زمانہ تھا۔ ان مشکلات میں گھر کر اطمینان اور داد سخن دینے کا موقع اُنھیں بہت کم نصیب ہوا، تاہم کبھی کبھی طبیعت کا جوش اشعا کی صورت اختیار کر لیتا تھا لیکن جو کچھ کہتے تھے فارسی میں کہتے تھے اور ایک بات یہ بھی تھی کہ ماحول کے اعتبار سے موضوع سخن اکثر رزمیہ ہوتا تھا۔ بیاض کوئی موجود نہیں۔ ہاں ان کے خاندان میں کچھ شعر ان کے نام سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ اُردو کلام کا نمونہ یہ ہے:۔

کھینچکر تیغ جو وہ میرے برابر آیا
راہ پر میں نے یہ جانا کہ مقدر آیا

شہزاد مسیح بوربون | عنایت مسیح کے نامور فرزند اور جانشین کا نام شہزاد مسیح تھا۔ یہ نواب نظر محمد خاں والی بھوپال کے وزیر خاص تھے۔ ان لوگوں نے ہندوستان میں رہکر نہ صرف ہندوستانی وضع و معاشرت اختیار کی تھی بلکہ اس میں ایک بات دلچسپ ایجاد بھی کی تھی، یعنی اس خاندان کے ہر فرد کے دو نام ہوتے تھے ایک قومی۔ دوسرا اسم عرفی۔ قومی نام تو محض برائے نام اور محض یادگار کے طور پر ہوتا تھا اور باقی تمام کاروبار اور معاملات میں عرفی نام سے کام چلتا تھا شہزاد مسیح

صاحب کا قومی نام بالتھراز تھا۔ یہ میر و سودا کے ہمعصر تھے۔ معلوم نہیں اُس عہد کے کس اُستاد سے شرف تلمذ حاصل کیا تھا۔ کلام زیادہ تر اُردو میں تھا اور خاصہ اچھا تھا۔ ۱۸۲۹ء میں بعمر بیالیس سال درد اعضاء میں مبتلا ہو کر انتقال کیا۔ اپنا کوئی دیوان مرتب نہیں کیا۔ لیکن بیاضوں اور یادداشتوں میں بہت کچھ کلام محفوظ تھا لیکن وہ بھی اب اہل خاندان کے قبضہ میں نہیں ہے۔ عرصہ ہوا کہ رام بابو سکسینہ مؤلف "تاریخ ادب اُردو" جو انگریزی زبان میں لکھی گئی ہے۔ بھوپال تشریف لائے تھے۔ اُنھیں اہل فرنگ کے اُردو کلام کی جستجو تھی۔ اس سلسلہ میں اس خاندان میں بھی موصوف نے تفتیش حال کیا اور کل ادبی سرمایہ امانتاً ان کے سپرد کر دیا گیا۔ موصوف کو اسکی واپسی کا یا تو خیال نہیں رہا یا یہ کہ ہجوم مشاغل نے اُنھیں اب تک اس بات کی فرصت نہیں دی، تاہم کاغذ کے کچھ کرم خوردہ پُرزے بزرگوں کی نشانی کے طور پر باقی رہ گئے ہیں اُنھیں سے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں:-

کلام کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس طرف کافی توجہ کا موقع ملتا تو ان کا کلام اپنے ہمعصر شعراء کے کلام سے بہت زیادہ قریب ہوتا۔ زبان کی صفائی اور کلام کی روانی دیکھ کر تعجب ہوتا ہے، چند شعر ملاحظہ ہوں:-

صحنِ چمن سے دور، بت و برہمن سے دور　　　حسرت نصیب دل ہے ہر اک انجمن سے دور
گھیرے ہوئے تھیں عشق میں ناکامیاں مجھے　　　تھی حدِ ممکنات مری انجمن سے دور
شکوہ نہ باغبان کا، نہ صیاد کا گلہ　　　رکھا مرے نصیب نے مجھ کو چمن سے دور

ایک غزل کے دو مطلعے لکھے جاتے ہیں:-

کھڑے پہ ترے زلف بکھر کر اگر آئے،　　　یک جا سحر و شام کا نقشہ نظر آئے
کیا پوچھنا دیوانے سے اپنے کدھر آئے　　　وحشت ہی تو ہوگی جدھر آئے اُدھر آئے

میر تقی میر کی ایک مقبول غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے:-

ہنگامہ گرم کُن جو دلِ ناصبور تھا
پیدا ہر ایک ذرّہ سے شورِ نشور تھا

شہزادو مسیح صاحب نے بھی اس زمین میں سیراب غزل لکھی ہے، چند شعر یہ ہیں:-

جلوہ فگن جو سامنے وہ اشک حور تھا　　　جو ذرّہ تھا وہ جوشش تجلی سے طور تھا
طالب تھا تیرا راہ میں تیری یہ گرم رو　　　دوزخ ہو یا کہ خلد ہر اک سے نفور تھا
کعبہ ہی میں فقط نہ تجلّی تھی یار کی　　　دیکھا تو دیر میں بھی اُسی کا ظہور تھا

ایک ناتمام غزل "نظر ایسی" "کر ایسی" کی زمین میں ہے، اس غزل کا مطلع کہا ہے:-

طبیعت میری کیوں آتی نہ تجھ پر فتنہ گر ایسی
قد ایسا، چال ایسی، زلف ایسی اور کمر ایسی

باقی اشعار کچھ نظموں کے ہیں جو خاندانی یا شاہی تقریبات کے موقع پر لکھی گئی تھیں یہاں ان کے درج کرنے کی چنداں ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

دلھن صاحبہ | اس خاندان کی خواتین میں بھی شعر و ادب کا چرچا تھا چنانچہ شہزاد مسیح صاحب کی بانوئے محترم دُلھن صاحبہ شعر و سخن سے کافی دلچسپی رکھتی تھیں۔ یہ اپنے شوہر کے بعد عرصۂ دراز تک بقید حیات رہیں اور انکی زندگی کا بیشتر حصہ نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کے عہد حکومت میں گزرا۔ اس زرّین عہد میں بھوپال علوم مشرقی کا گہوارہ ہو رہا تھا بیگم صاحبہ کے شوہر نواب صدیق حسن خاں عالم متبحر اور عربی، فارسی و اُردو میں تقریباً چار سو کتابوں کے مصنف تھے۔ بیگم صاحبہ خود شاعرہ اور شعراء کی قدر داں تھیں۔ شیریں اور تاجور تخلّص کرتی تھیں۔ دو ضخیم دیوان ان سے یادگار ہیں۔ ایک دیوان میں شیریں اور دوسرے میں تاجور تخلص اختیار کیا ہے۔ سرکار کے رہائشی محل "تاج محل" میں شاعرے ہوتے تھے۔ ان مشاعروں میں نواب صدیق حسن خاں صاحب خود شرکت کرتے تھے، بیگم صاحبہ کی غزل بھی آتی تھی۔ اس ادبی ماحول نے مردوں کے علاوہ عورتوں میں بھی ذوقِ سخن پیدا کر دیا تھا۔ خاندان شاہی اور معزز خاندانوں کی کئی مخدرات عالیہ صاحب دیوان تھیں۔ ان کے دیوان طبع ہو چکے ہیں اور ہندوستان کے مختلف کتبخانوں میں موجود ہیں۔ ان مخدرات کا تذکرہ بشرط فرصت کبھی ایک مضمون کی صورت میں قلمبند کیا جائے گا۔ بہرحال دُلھن صاحبہ بھی محل شاہی کی ادبی تفریحوں میں حصہ لیتی تھیں۔ ان کا مجموعۂ کلام ایک بیاض کی شکل میں مرتب تھا جو اب ناپید ہے۔ زبانی طور پر جو اشعار یادگار رہ گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو شعرگوئی میں کافی مشق بہم پہونچائی تھی۔ کلام کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے ہو سکتا ہے:۔

آئینہ ہے وہ آئینہ سیما لئے ہوئے   دریا ہے اپنی گود میں دریا لئے ہوئے
بازار حشر میں بھی وہ آیا ہے طور سے   پھرتا ہے اُس کو ذوق تماشا لئے ہوئے

ذیل کے دو شعر بھی قابل توجہ ہیں:۔

اللہ اللہ رے رتبہ ترے سودائی کا   حوریں آئی ہیں دم بازپسیں ایک سے ایک
آتے جاتے میں فقیروں کی دعا لیتا جا   تیرے کوچے کے ہیں یہ خاک نشیں ایک سے ایک

ایک مطلع حضرت مسیح علیہ السلام کی مدح میں ہے اور خوب ہے:۔

رُتبہ نہ کیوں بلند ہو اُس کے کلام کا
واصف ہو جو مسیح علیہ السلام کا

ممتاز مسیح بوربون | ولمن صاحب کے ساتھ ان کے گھرانے سے شعروادب کا چرچا بھی اُٹھ گیا اور عرصہ تک کوئی فرد ایسا نہیں ہوا جسے شعراء کے ذیل میں پیش کیا جا سکے۔ اب اس خاندان کے چشم و چراغ سالویڈ ور بوربون عرف ممتاز مسیح نے اس رسم کہن کو پھر تازہ کیا ہے۔ ان کی ولادت ۱۹۱۷ء میں ہوئی۔ اس حساب سے ریاض عمر میں اکتالیسویں بہار آئی ہوئی ہے۔ اُردو فارسی کی ضروری تعلیم اپنے محل میں حاصل کر کے اجمیر بورڈ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اپنے بزرگوں کی طرح ریاست کے محکمۂ فوج میں داخل ہوئے۔ آج کل ملیٹری ہیڈ کوارٹر میں معزز خدمت پر مامور ہیں۔ شاعری کا شوق زمانۂ طالب علمی ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ شہر کے طرحی مشاعروں پر غزلیں لکھتے تھے، اپنے خاندانی تقریبات کے موقعوں پر نظمیں بھی کہتے تھے، لیکن ان کی اشاعت ہم سبق دوستوں کی محفلوں تک محدود رہتی تھی۔ ملازمت اختیار کرنے کے بعد یہ دبی چنگاری چمک اُٹھی۔ مشق سخن میں کافی وقت صرف ہونے لگا۔ اصلاح کلام کے لئے راقم الحروف کا انتخاب عمل میں لایا گیا اور اپنے نام ہی کو تخلص قرار دیا بقول حضرت امیر مینائی مرحوم۔

نام کا نام تخلص کا تخلص ہے امیر
یہ بڑا حُسن خدا داد مرے نام میں ہے

ممتاز صاحب کو اپنے بزرگوں کا انداز کلام بہت پسند ہے اور اُنھیں کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں، تاہم عہد حاضر کے ادبی رجحانات سے بھی باخبر ہیں۔ کلام میں اس رنگ کی جھلک جا بجا نظر آجاتی ہے۔ ابتدائی کلام کے چند نمونے درج ذیل ہیں:۔

اُٹھا فتنہ کوئی کوئے بتاں سے | بپا ہے حشر شورِ الاماں سے
نہ دو آنسو بھی نکلے اُن کے لیکن | فلک تھرا گیا میرے بیاں سے
اِسی کو رحم کچھ آجائے شاید | لپٹ جائیں پائے سارباں سے

ستم ہو رہے ہیں جفا ہو رہی ہے | دوائے دلِ مبتلا ہو رہی ہے
جھکائے ہے سر اُن کے قدموں پہ ممتاز | نمازِ محبت ادا ہو رہی ہے

مجھے حشر میں کون ملتا گواہ | جدھر وہ تھے دنیا اُدھر ہو گئی
دمِ نزع کچھ آکے سُن لیجئے | مری داستاں مختصر ہو گئی

تھوڑے ہی عرصہ بعد طبیعت نے اپنا اصلی رنگ دکھانا شروع کیا۔ زبان میں صفائی اور کلام میں خاص روانی پیدا ہو گئی۔ خواجہ آتش نے سچ کہا ہے:۔

مشق کر مشق کہ تا لطفِ سخن پیدا ہو | خود بخود شعر میں بیساختہ پن پیدا ہو

ان کی بعض طرحی غزلوں کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:۔

دل نے مٹ کر وفا میں نام کیا　　تجھ سے دشمن کو شاد کام کیا
اب نہ دل ہے نہ دل کے ارماں ہیں　　تم نے قصہ ہی وہ تمام کیا

ممتاز صاحب اگرچہ مذہباً عیسائی ہیں لیکن اسلامی تخیلات سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں، اسی غزل کے شعر میں معراج کے مضمون کو کس خوبی سے نظم کیا ہے:۔

کس کی اک شب کے واسطے یارب　　مدتوں تو نے اہتمام کیا

ایک غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں:۔

جفائے یار ہر رنگِ وفا معلوم ہوتی ہے　　محبت ہو تو دلکش ہر ادا معلوم ہوتی ہے
تجھے ہر سانس میں آتا ہے لطف زندگی ناداں　　مجھے ہر سانس اک بانگ درا معلوم ہوتی ہے

ایک مشاعرہ میں ان کی غزل کے یہ اشعار بہت پسند کئے گئے تھے۔

شکایت تیری کا فردا ورِ محشر سے کیا کرتے　　یہ ہو سکتا تھا ہم سے کشتۂ تیغِ وفا ہو کر
خدا کی شان جس کو دیکھنا ہو وہ تمھیں دیکھے　　کہ اتنے بے وفا بے مہر ایسے مہ لقا ہو کر

جوانی کی شوخ طبیعت ہی ایسے شعر نکال سکتی ہے جیسا کہ ذیل کا شعر ہے:۔

دکھا کر اک جھلک مجھ کو نہ تم روپوش ہو جانا　　وہ موسیٰ تھے، یہاں آتا نہیں بیہوش ہو جانا

حضرت ممتاز نظمیں بھی خوب کہتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ یہ نظمیں باوجود طویل ہونے کے اپنی دلآویزی قائم رکھتی ہیں۔ بخوف طوالت ان کا اندراج یہاں ترک کیا جاتا ہے۔ آپ کو نثر نگاری کا بھی شوق ہے اور اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔ آپ نے خاندان بوربون کی ایک ضخیم تاریخ بزبان انگریزی لکھی ہے جو بڑے اہتمام کے ساتھ عنقریب شائع ہو رہی ہے۔ اُمید ہے کہ دنیائے اُردو میں بھی آپکی تالیفات سے مفید اضافہ ہوگا۔

مانوک اور بیپٹسٹ خاندان کے شعراء | ان کے بزرگوں کا اصلی وطن آرمینیا تھا۔ کسی انقلاب کے بعد یہ لوگ مختلف ملکوں میں منتشر ہو گئے۔ ان کا ایک خاندان جو بیپٹسٹ کے نام سے موسوم تھا، قسطنطنیہ پہونچا اور سلاطین عثمانیہ کی فوجی ملازمت میں داخل ہو گیا۔ دوسرے خاندان مانوک نے افغانستان میں فوجی ملازمت اور سکونت اختیار کر لی۔ نواب سکندر بیگم صاحبہ کے عہد میں یہ دونوں خاندان بھوپال میں منتقل ہوئے اور مناسب عہدوں پر فائز کئے گئے۔ یہاں انکی رشتہ داریاں فرانسیسی خاندانوں میں ہو گئیں۔ اس کے بعد یہ لوگ ارمنی فرانسیسی کہلانے لگے۔ بھوپال میں رہکر انکی اولاد نے مختلف علوم و فنون میں کمال حاصل کیا۔ بعض افراد شعر و سخن میں صاحب نام و نمود ہوئے۔ ان میں سے پہلے ہم مانوک خاندان کا ذکر کریں گے۔

کپتان موسیس مانوک | پہلے کابل میں بعہدۂ کپتان مامور تھے پھر بھوپال آکر یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ کابل میں عرصہ تک قیام رہنے کی وجہ سے فارسی گویا ان کی مادری زبان بن گئی تھی۔ طبیعت میں شاعری کا ذوق فطری تھا، کچھ اساتذہ کے فیض صحبت سے، کچھ کُتب عروض کے مطالعہ سے اور کچھ ذاتی مشق سے ادب میں اس قدر مہارت بہم پہونچائی تھی کہ شاگردوں کو عروض کی تعلیم اور اُن کے کلام پر اصلاح دینے لگے، اُنھوں نے بیشتر قصیدے اور کمتر غزلیں لکھیں۔ یہ سرمایہ فارسی میں تھا، اُردو میں بھی فکر کرتے تھے اور زور طبیعت سے اچھے اچھے شعر نکالتے تھے، لیکن یہ امر قابل عبرت ہے کہ آج ان کا ذکر اور کلام نہ کسی تذکرہ میں ملتا ہے نہ کسی کی زبان پر ہے، بڑی جستجو سے فارسی کے دو شعر دستیاب ہوئے ہیں، وہی لکھے جاتے ہیں:۔

کرم بر واعظِ فرزانہ کردی خرابِ نرگس مستانہ کردی

بہ کردی بامنِ مشتاق اے دوست مرید ساغر و پیمانہ کردی

جوزف مانوک متخلص بہ عاشق | کپتان موسیس مانوک کے تین بیٹے تھے۔ باٹین مانوک، آیزک مانوک اور جوزف مانوک باٹین مانوک بعد میں مسلمان ہوگئے تھے اور ان کا نام عبدالباطن رکھا گیا تھا۔ آیزک مانوک عرف عوض صاحب نے فن موسیقی خصوصاً ستار نوازی میں، وہ کمال حاصل کیا تھا کہ اس فن کے اچھے اچھے اُستاد ان کے آگے کان پکڑتے تھے۔ افسوس ہے کہ گزشتہ سال ان کا انتقال ہوگیا۔ جوزف مانوک نے شعر و سخن کی طرف توجہ کی اور خوب نام پیدا کیا۔ بھوپال کے ایک قدیم شاعر منشی عبدالعزیز صاحب نے شعراء بھوپال کے حالات میں ایک تذکرہ مرتب کیا تھا اس میں جوزف صاحب کی بابت لکھتے ہیں:۔

"عاشق تخلص یوسف صاحب عرف ڈُلارے صاحب، فرزند کپتان مانوک معزز صاحب فرانسیسی ارمنی متوطن شہر کابل مقیم حال بھوپال، ملازم محکمۂ سناصب، ریاست بھوپال، کتب درسی فارسی مولوی عبداللہ مرحوم سے پڑھیں اور فن شعر و سخن اپنے والد ماجد صاحب سے حاصل کیا۔ اکثر اُردو اور گاہے فارسی میں غزلیں و قصائد لکھتے ہیں" آثار الشعراء صفحہ ۱۵۵

اس کے بعد عاشق صاحب کی ایک غزل درج کی ہے جو شاہ ظفر کی اس زمین میں ہے:۔

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

عاشق صاحب نے بھوپال میں وہ زمانہ پایا تھا جب گھر گھر شاعری کا چرچا تھا۔ ہر ماہ کئی کئی مشاعرے ہوجاتے تھے۔ یہ ان مشاعروں میں شرکت کرتے تھے، طرحی اور غیر طرحی غزلیں پڑھتے تھے۔ اگر صرف مشاعروں کی غزلوں اور شاہی تقریبات کے قصیدوں کو یکجا کیا جاتا تو ایک ضخیم دیوان موجود ہوتا لیکن کس دل سے لکھا جائے کہ ان کا تمام و کمال سرمایۂ شاعری تباہ ہوچکا ہے اور وہی ایک غزل باقی رہ گئی ہے جو تذکرہ آثار الشعراء میں درج ہے اللہ خود آثار الشعر

کی یہ حالت ہے کہ کمیاب ہوتے ہوتے اس کے نایاب ہونے کی نوبت آنیوالی ہے۔ فراہمی کلام کی ہر کوشش ناکام ہونے کے بعد مجبوراً وہی ایک غزل ذیل میں آثار الشعراء سے نقل کی جاتی ہے:۔

آنکھ لڑتی تری قاتل کبھی ایسی تو نہ تھی — یہ قضا میرے مقابل کبھی ایسی تو نہ تھی
بدلے مہندی کے ملا ہے مرا خوں قاتل نے — شوخی رنگ انامل کبھی ایسی تو نہ تھی
خانۂ یار ہے اب ضعف سے اک عمر کی راہ — مجھکو دشوار یہ منزل کبھی ایسی تو نہ تھی
خاک لیلےٰ بھی بگولوں میں اُڑی پھرتی ہے — نجد میں صورتِ محمل کبھی ایسی تو نہ تھی
آہ سے اب مری کہتا ہے فلک تھرّا کر — تجھ کو تاثیر یہ حاصل کبھی ایسی تو نہ تھی
کوئی وحشی کوئی دیوانہ ہے کوئی مجذوب — مست قاتل تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی
شاید اُس ماہ کے رُخ سے اُسے حاصل ہے فروغ — روشنیِ مہ کامل کبھی ایسی تو نہ تھی
آج زنداں سے نکلتا ہے ترا دیوانہ — آتی آوازِ سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی
ہے مرا رشکِ چمن باغ میں دل کہتا ہے — گل یہ آوازِ عنادل کبھی ایسی تو نہ تھی
بے طرح عشق کے پھندے میں پھنسے ہو عاشق — یہ بلا جان پہ نازل کبھی ایسی تو نہ تھی

بیپٹسٹ خاندان اس خاندان میں صرف ایک صاحب نامور شاعر ہوئے ہیں، ان کا کلام (جس کا اندازہ آئندہ اقتباسات سے ہوگا) بجز الگزنڈر ہیڈر لی المتخلص بہ آزاد کے اُن تمام فرنگی شعراء پر فوقیت رکھتا ہے جن کا کلام اس وقت تک شائع ہوکر منظرِ عام پر آچکا ہے۔ بحمداللہ آپ ابھی بقید حیات ہیں اس لئے آپ کے حالات آپ ہی سے دریافت کرکے کسی قدر تفصیل سے لکھے جاتے ہیں:۔

مامس جیمز نفیس آپ کے والد مسٹر آئزک بیپٹسٹ سلطان عبدالعزیز کے عہد حکومت میں قسطنطنیہ سے بھوپال آکے اور ریاست کے دامن سے وابستہ ہوگئے۔ ان کے خاندان کی لیڈیوں کو بھی محل شاہی میں مناسب خدمات عطا کیگئیں ہیں سنہ ۱۸۶۰ء کے قریب جیمز صاحب کی ولادت ہوئی، نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ نے جن متوسلین کی اولاد کو تا زمانہ محل میں رکھ کر اپنی زیر نگرانی ان کی تعلیم و تربیت کرائی تھی اُن میں ایک آپ بھی تھے، علوم مروجہ کی تکمیل کے بعد سرکار نے انھیں اپنے اجلاس پر کاغذات پیش کرنے کی خدمت سپرد فرمائی۔ کچھ عرصہ بعد افواج ریاست میں بعہدہ کمانڈنگ افسر مقرر ہوئے۔ شاہی مہمان خانہ کا اہتمام بھی انھیں کی نگرانی میں دیا گیا۔ ان خدمات کی تنخواہ پر منصب اور ایک معقول جاگیر کا اضافہ کیا گیا جس پر آپ قابض ہیں۔

قبول اسلام ۔ اکیس سال کی عمر میں جیمز صاحب حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے، چونکہ آپ کی آئندہ زندگی اور شاعری پر اس واقعہ کا بہت گہرا اثر پڑا لہذا اس کی نہایت مختصر کیفیت آپ ہی کی زبانی لکھی جاتی ہے، فرماتے

ہیں کہ حضرت خلد مکان کو پردہ کا بڑا خیال تھا۔ تاج محل کا وہ حصہ جہاں سرکار کا قیام تھا مجال نہ تھی کہ غیر محرم قدم رکھ سکے۔
ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ ایوان خاص کی طرف کچھ لوگ بے تکلف چلے آرہے ہیں، میں نہایت تیزی کے ساتھ انکی طرف بڑھا کہ روکوں اور اندر آنے کا سبب دریافت کروں مگر جونہی قریب پہونچا دل پر ایک ہیبت سی طاری ہوگئی تاہم میں نے پوچھا کہ آپ صاحبان کون ہیں اور قدم رنجہ فرمانے کا کیا سبب ہے ان میں سے ایک صاحب نے آگے بڑھکر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ایک بزرگ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ تم انھیں نہیں جانتے، آپ پیغمبر اسلام ہیں، میں نہایت ادب سے دست بوس ہوا۔ اس کے بعد انھیں صاحب نے دوسرے صاحبان کا تعارف کرایا۔ خیر اس خواب کا کوئی خاص اثر دل پر نہیں ہوا اور یہ بات خواب وخیال ہوگئی۔

قدرت کا دستور ہے کہ جب کسی امر کو معرض ظہور میں لانا چاہتی ہے تو اس کے لئے مختلف کڑیاں اس طرح ملاتی رہتی ہے کہ انجام کار ایک نتیجہ خیز واقعہ مترتب ہو جاتا ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا، تاج محل میں ایک خاتون کا انتقال ہوگیا، میت کے ہمراہ ایک انبوہ کثیر تھا لوگ جوق جوق کندھا دینے کے لئے آگے بڑھ رہے تھے میں بھی اس خیال کے ساتھ بڑھا قریب تھا کہ دوسرے شخص سے کندھا بدلوں کہ مولوی محمد ایوب صاحب قاضی ریاست نے ہاتھ پکڑ کر مجھے پیچھے کھینچ لیا اور کہا کہ یہ مسلمانوں کی میت ہے نماز جنازہ ہو چکی ہے آپ ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ جوانی کا جوش، خاندانی اعزاز کا نشہ، پھر اتنے بڑے مجمع میں یہ توہین، سخت طیش آیا۔ ضرور اس وقت کوئی نہایت ناگوار واقعہ پیش آجاتا مگر لوگ درمیان آگئے، بہرحال قاضی صاحب کی طرف سے طبیعت میں انتہائی نفرت پیدا ہوگئی، اسی زمانہ میں پھر آنحضرت صلعم کو دوسرے انبیا کیساتھ خواب میں دیکھا اس مرتبہ عالم خواب میں مجھے آنجناب کے ساتھ غیر معمولی شیفتگی پیدا ہوگئی۔ آنکھ کھلنے کے بعد یہ بیقراری بڑھتی گئی، ہر لحظہ یہ خیال تھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو اپنے آپ کو آپ کے دامن سے وابستہ کرلوں۔ خدا خدا کرکے صبح ہوئی، اب فکر یہ ہوئی کہ کس بزرگ کے ہاتھ پر اسلام قبول کروں۔ معاً خیال آیا کہ مولوی محمد ایوب صاحب سے بڑھکر بزرگ کون ملیگا جنھوں نے حق بات کہنے میں کسی بات کی پروا نہ کی، چنانچہ انکی خدمت میں حاضر ہوکر مشرف باسلام ہوگیا۔ محمد سلیمان نام اور اچھے صاحب عرف رکھا گیا۔ سرکار میں اس واقعہ کی رپورٹ ہوئی، جب میں پیشی میں حاضر ہوا، تعجب سے فرمایا کہ رات تو انھوں نے ہمارے دسترخوان پر کھانا کھایا ہے اُس وقت اس خیال کا اظہار نہیں کیا، میں نے عرض کیا کہ حضور عالیہ یہ صرف ایک روحانی جذبہ تھا جو فی الوقت عمل میں آگیا، فرماتے ہیں کہ اس کے بعد سے مخلوق کا خوف دل سے بالکل نکل گیا اور طبیعت میں ایک عجیب استغنا کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ سلسلۂ اسلام میں داخل ہونے کے بعد نفیسؔ صاحب نے حمد و نعت کے وہ نغمے سنائے ہیں کہ اس صنف میں بڑے بڑے شعرا کو ان کا لوہا ماننا پڑا۔

ترک شراب۔ ریاضؔ مرحوم کی طرح نفیسؔ صاحب نے بھی شراب کے بکثرت اور خوب خوب مضمون لکھے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ریاضؔ نے تو اس کا ذکر کبھی منہ نہیں لگایا مگر نفیسؔ صاحب نے دختر رز کو مونس وہمدم بنا کر اسکی فتنہ کاریاں نظم کیں، پھر طلاق تک

دی تو اس طرح کہ اس سے بات کرنا تو ایک طرف اسکی باتوں سے دلی نفرت ہوگئی۔ یہ خانہ خراب ان کے خاندان میں لازمۂ حیات کے طور پر داخل ہوگئی تھی اس پر مزید طرہ انکا یہ خیال تھا کہ "شوق جو پیدا کرے بے انتہا پیدا کرے" پرتگال، فرانس، لندن سے پارسلوں کی ڈاک بندھی رہتی تھی۔ طعام شب کے بعد یاران ہم مشرب کی محفل میں اس کے دور چلتے تھے، فرماتے ہیں کہ جس دن میں مسلمان ہوا ہوں حسب معمول الماری سے بوتل نکالی۔ اُسی دم خیال آیا کہ سلیمان! جس مذہب کو اختیار کیا ہے اُس کے احکام کی پابندی بھی کرنا چاہیئے۔ بوتل لیکر کمرہ کے باہر گیا، دوست کاگ ٹوٹنے کے منتظر ہی تھے میں نے پتھر سے مار کر بوتل ہی توڑ ڈالی اس وقت اکیس سو روپیہ کی شراب محافظ خانہ میں موجود تھی تمام بوتلیں توڑ ڈالیں اور ہمیشہ کے لئے توبہ کرلی۔ ترک شراب کے بعد شراب کے مضمون سے بھی نفرت ہوگئی۔

حقہ بھی ترک کردیا۔ شراب تو اس طرح چھوٹ گئی مگر حقہ کا شغل جاری رہا یہاں بھی شوق اور طبیعت کی نفاست اپنا کام کر رہی تھی، اُس وقت لکھنؤ میں زمانہ کی دکان کا خمیرہ بہت مشہور تھا۔ ہر ماہ ایک پیپہ صرف اس کے یہاں سے آتا تھا اس کے علاوہ ہر مشہور مقام کی تمباکو منگائی جاتی تھی۔ حقے اور پیچوان بھی طرح طرح کی صنعت کے تھے۔ ایک حقہ کی نے پر اس ہنرمندی سے گلکاری کیگئی تھی کہ ہر کش کے بعد پوری نَے پر ایک چمن کھل جاتا تھا۔ قسطنطنیہ سے بنکر ایک پیچوان ایسا آیا تھا جو ہاتھ کی ایک اُنگلی پر لپٹ جاتا تھا مگر جب سجا کر محفل میں رکھا جاتا تھا تو چالیس فٹ گرد کے لوگ اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے باسانی پی سکتے تھے، غرض تھوڑے ہی دنوں کے بعد رمضان کا مہینہ آیا، روزے رکھنے شروع کئے مگر پہلے ہی روز پر حقہ پینے سے طبیعت مکدر ہوگئی اُسی وقت حقہ پینا بھی چھوڑ دیا اور اس کے تمام لوازمات دوستوں میں تقسیم کر دئے۔

شاعری کا شوق:۔ سطور بالا میں کہیں ذکر کیا جاچکا ہے کہ نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کا عہد بھوپال میں علوم مشرقی کی نشأۃ ثانیہ کا زمانہ تھا شعر و ادب کا چرچا بھی پورے شباب پر تھا۔ سرکار خود شاعرہ تھیں۔ تاج محل میں شاہی اہتمام سے مشاعرے ہوتے تھے اس ادبی ماحول نے سلیمان صاحب کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا۔ حافظ خان محمد خاں شہیر تلمیذ رشید غالب دہلوی شاہی خاندان کے اُستاد تھے۔ سلیمان صاحب پہلے انھیں کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے مگر شہیر صاحب اپنے اُستاد کے اس مسلک پر گامزن تھے کہ:۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اُردو کہ آں ننگ من است

لہذا کچھ روز بعد سرکار کے درباری شاعر منشی جمیل احمد صاحب جمیل کی شاگردی اختیار کی جو تمیز شکوہ آبادی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور نفیس اپنا تخلص رکھا۔

انداز کلام:۔ ان کا کلام جیسا کہ اسی مضمون میں لکھا جاچکا ہے بجز الگزنڈر ہیڈرلی المتخلص آزاد کے باقی تمام فرنگی شعرا کے کلام پر بدرجہا فوقیت رکھتا ہے۔ آزاد اور نفیس میں فرق یہ ہے کہ آزاد کی عمر نے تو وفا نہ کی ورنہ کلام کا رنگ اور

نکھرتا۔ برخلاف اس کے نفیس صاحب کو مشق سخن کا بہت زیادہ موقع ملا اس کے علاوہ اس عہد کے بیشتر شعرائے لکھنؤ و دہلی دربار بھوپال سے توسل رکھتے تھے، نفیس صاحب کو ان سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملتا تھا۔ ان کا کلام دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ زبان پر انھیں پوری قدرت حاصل ہے۔ زبان کا لوچ، بیان کی شگفتگی، محاوروں کا برجستہ استعمال ان کے کلام کی خاص خصوصیات ہیں۔ چونکہ عیش و تنعم میں عمر بسر کی ہے۔ زندگی کی اور تلخکامیوں سے طبیعت کبھی آشنا نہیں ہوئی۔ اسی لئے داغ کی طرح زندگی کے صرف تابناک اور مسرت آگیں پہلو پر نظر ڈالی ہے۔ رنج والم اور حسرت و عبرت کے مضامین ان کے یہاں بہت کم ہیں۔

زبان اور روزمرہ کی صفائی :۔ اس لحاظ سے ان کا کلام داغ کا عکس معلوم ہوتا ہے زبان کی اس دلآویزی اور روزمرہ کی صفائی کا ایک خاص سبب یہ ہے کہ سرکار خلد مکان نے اپنی مصاحبت اور محل کی خدمات پر جن خواتین کو مامور فرمایا تھا انکی تعداد کئی سو تھی، ان میں زیادہ تر حصہ بیگمات دہلی کا تھا۔ ان میں خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کے گھرانے کی مخدرات بھی تھیں فرماتے ہیں کہ باتیں کرنے میں ان کے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ میں ان کے بیان کی شیرینی، لب ولہجہ کی دلآویزی، محاوروں اور ضرب الامثال کا برجستہ استعمال دیکھ کر محو حیرت رہ جاتا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ گفتگو میں انھیں کی نقل کروں۔ تاج محل میں رہنے کی وجہ سے میری زبان صاف ہوگئی اور دہلی کا رنگ آگیا۔

پڑھنے کا انداز :۔ نفیس صاحب اپنا کلام تحت اللفظ پڑھتے ہیں۔ ایک عرصہ سے مشاعروں میں ترنم اور اس کے بعد اب توموسیقی کا رواج ہوگیا ہے۔ اکثر مشاعروں میں یہ بات دیکھی گئی کہ کہنہ مشق شعراء جو ترنم کے ساتھ نہیں پڑھ سکتے انکی مرصع غزلیں ناکامیاب رہیں اور نو مشق لڑکے جن کے کلام میں کوئی بات نہ تھی محض گلے بازی کی وجہ سے حاصل مشاعرہ لوٹ کر لیگئے، یہی وجہ ہے کہ آجکل جو شعراء تحت اللفظ پڑھنے کے عادی ہیں وہ اپنا کلام یا توکسی خوش گلو سے پڑھوا دیتے ہیں یا مشاعروں کی شرکت سے کنارہ کش ہوگئے ہیں مگر نفیس صاحب کی غیرت نے ان امور کو کبھی گوارا نہیں کیا۔ آپ اپنا کلام خود پڑھتے ہیں اور ہمیشہ دیکھا گیا کہ ان کے تحت اللفظ کے سامنے ترنم اور موسیقی کے سارے کلام ہیچ نظر آنے لگے۔ اس حسن بیان کی ایک وجہ یہی ہے، فرماتے ہیں کہ میرا ہمیشہ یہ خیال رہا کہ غزل جس طرح اچھی لکھی جائے اُسی طرح پڑھی بھی جائے۔ اس ذاتی خیال میں ایک اضافہ یہ ہوا کہ اُستاد مرحوم نے جب سرکار عالیہ کے حضور میں میرے شوق شاعری کی بابت عرض کیا تو سرکار نے کچھ سُنانے کے لئے ارشاد فرمایا۔ میں نے ایک مختصر غزل عرض کی میرا پڑھنا سرکار کو پسند آیا اور حکم دیا کہ آئندہ مشاعرہ میں ہماری غزل بھی پڑھا کریں اُس وقت سے میں نے غزل پڑھنے کی طرف بطور خاص توجہ کی اور خدا نے اس کوشش میں کامیابی عطا فرمائی۔

دیوان :۔ نفیس صاحب کا دیوان ردیف وار بائے بسم اللہ سے تائے تمت تک مکمل موجود ہے، اسمیں غزلیں قصیدے، مخمس، مثنوی، سہرے اور رباعیاں سبھی کچھ ہیں۔ کسی ماہر فن خوشنویس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، آپکی طبیعت

کی نفاست نے اس کا نام "دیوان نفیس" تجویز کیا ہے جو سرورق پر نہایت دیدہ زیب جلی حروف میں لکھا ہوا ہے، طبیعت کا استغنا یہاں بھی کام کر رہا ہے، خود آپ نے کبھی اپنے کلام کی طباعت و اشاعت کیطرف توجہ نہیں کی، اپنی سیج و دلکشا کوٹھی میں جولب تالاب واقع ہے کبھی کبھی مختصر سی محفل شعر خوانی منعقد فرماتے ہیں اور یہیں اپنا کلام سناتے ہیں۔ اب آپکی عمر طبعی حد کی منزلیں طے کر رہی ہے، آپ کے دو صاحبزادے ہیں۔ بڑے جاگیر کا انتظام سنبھالے ہوئے ہیں۔ چھوٹے صاحبزادے نے اپنے نام سے "عرفان اسٹوڈیو" قائم کیا ہے اور اسے کامیابی سے چلا رہے ہیں، خاندان میں شعر و ادب کا کسی کو ذوق نہیں ہے اس لئے اندیشہ نہیں بلکہ یقین ہے کہ جس طرح فرنگی شعرا کا تمام کلام اہل خاندان کی بے پروائی یا ادبی دنیا کی بے اعتنائی کے باعث نایاب اور تباہ و برباد ہو چکا ہے وہی حشر اس کا بھی ہوگا۔ ابھی وقت ہے کہ کوئی انجمن یا دارالاشاعت اس دیوان کو مفت حاصل کر کے اسے دنیائے علم و ادب کے سامنے لے آئے، یہ کام ادب اُردو کی تاریخ میں گرانقدر اضافہ کا باعث ہوگا ورنہ وقت گزر جانے کے بعد یہ جواہر کسی قیمت پر بھی ہاتھ نہ آئیں گے۔

اب ذیل میں کلام نفیس کا جستہ جستہ انتخاب درج کیا جاتا ہے، سب سے پہلے حمد کے کچھ شعر لکھے جاتے ہیں، دیوان کی ابتدا اسی غزل سے ہوئی ہے، داغ صاحب نے بڑے دھوم دھام کی ایک حمد لکھی ہے جو گلزار داغ کے عنوان میں درج ہے، کس شان کا مطلع کہا ہے۔

عدوئے سامری فن دیکھے اعجازِ رقم میرا
عصائے موسوی ہے حمد خالق میں قلم میرا

نفیس صاحب نے بھی اسی زمین میں طبع آزمائی کی ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔-

اُٹھے راہِ طلب میں تیری مستانہ قدم میرا ۔۔۔ لگائے قہقہے عیش و خوشی پر رنج و غم میرا
گناہوں کو مرے ڈھانکے ہوئے ہے تیری ستاری ۔۔۔ جو یہ حامی نہ ہو میری تو کھُل جائے بھرم میرا
رہے دم بھر نہ تیری یاد و تیرے ذکر سے غافل ۔۔۔ مرے پہلو میں دل میرا، مرے سینے میں دم میرا
نفیس اللہ کی جب حمد لکھنے بیٹھ جاتا ہوں ۔۔۔ خوشی میں آ کے کیا کیا وجد کرتا ہے قلم میرا

نعت میں نفیس صاحب نے خوب ہی زور طبع دکھایا ہے۔ ذیل میں صرف اُس غزل کے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں جو دیوان میں اس حمد کے بعد ہی درج ہے:۔

کیا کرے اِس کے سوا وصف ثنا گر تیرا ۔۔۔ مرتبہ بعد خدا کے ہے فزوں تر تیرا
چشم بد دور ہے وہ تو کہ بیاں کرتا ہے ۔۔۔ صفت خُلق تری خالق اکبر تیرا
مجھ گنہگار کی بھی یاد ہے حشر کے دن ۔۔۔ کلمہ پڑھتا ہوں اے شافع محشر تیرا

کھل چلا تیرے تصور میں سراپائے نفیس — کاش ہو خواب میں دیدار میسر تیرا

حمد و نعت کے بعد اب عاشقانہ کلام پیش کیا جاتا ہے، جناب نفیس کے دیوان میں زیادہ تر غزلیں امیر و داغ، جلال و تسلیم کی زمینوں میں ہیں، بات یہ ہے کہ جناب نفیس کے شباب شاعری کا وہ زمانہ تھا جب ان حضرات کی نوا سنجیوں سے ریاض سخن گونج رہا تھا۔ رامپور، لکھنؤ اور حیدرآباد سے مشاعروں کی طرحیں بھوپال میں آتی تھیں اور یہاں سے غزلیں بھیجی جاتی تھیں۔ آنا دل کا، زمانہ دل کا، اس زمین میں اساتذۂ وقت نے معرکے کی غزلیں لکھی تھیں نفیس صاحب کا رنگ ملاحظہ ہو:۔

ہو گیا دشمن جاں سارا زمانہ دل کا — قہر تھا اس بت عیار پہ آنا دل کا

کبھی کہتا ہوں کہ دل انکو دیا خوب کیا — کبھی کہتا ہوں کہا ہائے نہ ماننا دل کا

قلق لکھنوی کا مشہور مطلع ہے:۔

ادا سے دیکھ لو جاتا رہے گلہ دل کا — بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

اس طرح میں نفیس صاحب نے خوب داد سخن دی ہے:۔

بگڑ کے کہتے ہیں سنتے ہیں جب گلہ دل کا — کریں گے تیغ سے اک روز فیصلہ دل کا

خدا کے سامنے کہتا ہوا یہ جاؤں گا — بتوں نے راہ میں لوٹا ہے قافلہ دل کا

ذیل کے اشعار میں لطف زبان قابل ملاحظہ ہے:۔

تو نہ آیا تو بڑا خوف ہے رسوائی کا — دیکھ یارا نہیں اب مجھکو شکیبائی کا

لاش پہ کشتۂ حسرت کی کھڑے ہو خاموش — آج دعوے نہیں کرتے ہو مسیحائی کا

مندرجۂ ذیل زمین میں غالب اور ان کے بعد تمام متاخرین شعرا نے جوش طبیعت کے کمال دکھائے ہیں نفیس صاحب کی غزل بھی بہت رنگین ہے۔ ان اشعار سے اس بات کا اندازہ ہوگا۔

بت بہ قدوش سے ناصح تو اگر دوچار ہوتا — تجھے ہم سلام کرتے جو نہ بیقرار ہوتا

یہ گلہ ہے تم سے ہم کو کہ نظر ہوئے عدو کی — ہمیں اس کے مستحق تھے یہ ہمیں پہ وار ہوتا

شب وعدہ حضرت دل ہے عبث گلہ کسی کا — نہ تم انتظار کرتے نہ کچھ انتظار ہوتا

غالب کی ایک مشہور غزل کا بہت مشہور شعر ہے، "زنداں" کے قافیہ میں عجیب مضمون لکھا ہے۔

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے واں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

نفیس صاحب نے اس زمین میں اپنا رنگ جدا قائم کیا ہے اور زنداں کا قافیہ بھی لکھا ہے۔

جو وہ قائم نہیں ہے آج اپنے عہد و پیماں پر — ہنسی اتراتی پھرتی ہے لبِ گلرنگ جاناں پر
زلیخا دید سے محروم پھر جاتی ہے آ آ کر — کوئی تصویر یوسف کھینچ دے دیوار زنداں پر

غرض اسی طرح پورا دیوان رنگین و سیراب کلام کا گلدستہ ہے۔ مشکل قافیوں میں بھی غزلیں لکھی ہیں، اور لطف یہ ہے کہ لطف سخن یہاں بھی قائم ہے، اس ذیل میں دو شعروں پر کفایت کیجاتی ہے۔

کرتے نہیں نگاہ غریبوں کے حال پر — کتنا ہے اپنے حسن پہ سرکار کو گھمنڈ
طپش دل نے نہ دی فرصتِ تحریر مجھے — اتفاقاً جو کبھی ہاتھ بھی آیا کاغذ

گزرنے والے، مرنے والے کی طرح میں کئی غزلیں لکھی ہیں۔ ذیل میں ایک غزل کا صرف ایک مطلع لکھا جاتا ہے، کنایہ کیا خوب ہے:۔

کہتے ہیں مرقدِ عاشق پہ گزرنے والے — ہائے کس چین سے سوتے ہیں یہ مرنے والے

سنگین زمینوں میں غزلیں لکھنا اس زمانہ میں شاعر کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ نفیس صاحب کی کئی غزلیں اس قسم کی ہیں اور ہر غزل شگفتہ ہے، کچھ شعر یہ ہیں:۔

دل کے لئے حکم قتل دیا یک نشد دو شد — اچھی رہی جفا پہ جفا یک نشد دو شد
تلوار کھینچکر وہ چلا میرے قتل کو — اور ساتھ غیر کو بھی لیا یک نشد دو شد
خواہانِ جان زار ترے رخ کو دیکھ کر — دل مانگتی ہے زلف رسا یک نشد دو شد

وہ تو کشیدہ تھے ہی کئی دن سے اے نفیس
اب ہم سے دل بھی کچھ ہے رکا یک نشد دو شد

جناب نفیس صاحب کی متعدد غزلیں واقعات و حالات عصر پر بھی مبنی ہیں۔ ایک مرتبہ سرکار خلد مکاں نے بسنت کے موقع پر جشن منایا۔ ایوان اور کمرے زرد رنگے گئے۔ گیندے اور دوسرے زرد رنگ کے پھول گملوں میں سجائے گئے۔ سامنے پائیں باغ کے چمن میں سرسوں پھول رہی تھی بیگمات کا زعفرانی لباس، زعفرانی چوڑیاں، ہاتھ میں طلائی انگوٹھیاں اور ان میں زرد رنگ کے نگینے، اس جشن میں زعفرانی رنگ کے خلعت بھی تقسیم کئے گئے، شعراء نے غزلیں لکھیں، قصیدے پیش کئے، انھیں بسنتی اور پیلے دوشالے عنایت کئے گئے، نفیس صاحب نے بھی اس موقع پر غزل لکھی اور مورد انعام و اکرام ہوئے۔ کچھ شعر یہ ہیں۔

رنگ اِن دنوں جما ہے کچھ ایسا بسنت کا — دل میں خوشی، نظر میں ہے جلوا بسنت کا
دستارِ محتسب نے بھی باندھی ہے چمپئی — اب کے برس ہے جوش کچھ ایسا بسنت کا
اسے بے خبر بسنت کی تجھ کو خبر بھی ہے — ہے میرے رنگِ زرد پہ دھوکا بسنت کا

سرکار نے بسنت منائی ہے اے نفیس　　قسمت بسنت کی، یہ نصیبا بسنت کا

مخمسے:۔ غزلوں کے بعد مخمسوں کا نمبر آتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ مخمسے غزلوں سے بہتر کہے ہیں، میر و سودا سے لیکر دور آخر کے شعراء تک ہر اُستاد کی مقبول غزل کو تخمیس کیا ہے جو اصحاب شعر و ادب کا صحیح ذوق رکھتے ہیں وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اپنے ہی مصرع پر چسپت مصرع بہم پہونچانے میں شاعر کو کس قدر کاہش کی ضرورت ہوتی ہے، بقول مولانا حالی۔

خشک سیروں تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعِ تر کی صورت

نہ کہ کسی اور کے مصرع پر مصرع لگانا اور اس پر مزید یہ کہ پوری غزل کو تخمیس کرنا۔ شعراء نے جب کبھی طرحی مصرعوں پر چسپت مصرعے لگا دئے ہیں تو یہ واقعات تذکروں میں یادگار کے طور پر نقل کئے گئے ہیں، شعراء ایران نے غزلوں کو تخمیس کرنے کی طرف بہت کم توجہ کی۔ بعض متاخرین نے بیشک اس صنفِ سخن میں زورِ فکر دکھایا ہے مگر ان میں ایک عارف خراسانی ہی ایسے ہیں کہ حافظ علیہ الرحمۃ کی غزلوں پر جو انھوں نے مخمسے کہے ہیں ان کی بابت نقادانِ فن کی یہ رائے ہے کہ "ابیاتِ حافظ محتاج مصاریعش بودہ"[1]

مگر اُردو شاعروں کے یہاں یہ صنف ضروری قرار دیگئی۔ شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہوگا جس نے اس میدان میں چلنے کی کوشش نہ کی ہو لیکن بجز خاص خاص مخمسوں کے زیادہ تر کے دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محض تفریحاً یا شاعرانہ قدرت کے اظہار کی غرض سے لکھے گئے ہیں۔

نفیس صاحب کی طبیعت کو مخمسوں سے خاص لگاؤ ہے۔ فرماتے ہیں کہ مجھے ابتدا سے یہ شوق رہا ہے کہ جو غزل مرغوب طبیعت ہو اُس پر مصرعے لگائے جائیں۔ اس طرف جب کبھی کوشش کی طبیعت نے خوب راہ دی۔ رفتہ رفتہ کثیر تعداد مخمسوں کی ہوگئی۔ جب حسن اتفاق سے آپ کسی مشاعرہ میں شرکت کرتے ہیں تو آپ سے کوئی نہ کوئی مخمسہ سُنانے پر ضرور اصرار کیا جاتا ہے، ذیل میں کچھ نمونے دئے جاتے ہیں، سب سے پہلے آپ نے اپنے آقائے ولی نعمت سرکار خلد مکاں المتخلص بہ تاجور کی غزلوں پر جو مصرعے لگائے ہیں اُن میں سے ایک غزل کے چند شعروں کی تخمیس نقل کرتا ہوں۔

عمر بھر اُلفت میں حزن سا غم رہا　　اشک ریزاں دیدۂ پُرنم رہا
آہ کب میں شادماں اک دم رہا　　وصل میں بھی غم مرا ہمدم رہا
ہجر کا پیشِ نظر عالم رہا

---

[1] شعر العجم صفحہ ۳۲۹

قسمت سے ہے عشق بتانِ بے وفا ذکر کیا ہے عیش اور آرام کا
اک بلا پر دوسری آئی بلا دل کو روکر پیٹنا دم کا پڑا
گھر میں عاشق کے سدا ماتم رہا

یہ تو کہہ سکتے نہیں ہیں اے صنم بھول ہی دل کو گئے یک لخت ہم
ہاں یہ کہدیں لاکھ میں کھا کر قسم تم کو پا کر دل کے کھو جانے کا غم
گو رہا لیکن نہایت کم رہا

دے خدا ایسی ہی توفیق تکو آپ کے خادم نفیس خار کو
عرض ہے گو ہے خلاف داب گو یادِ حق سے تا تو ر غافل نہ ہو
وقت فرصت کا بہت ہی کم رہا

غالب کی غزل پر کیا خوب خمسہ کہا ہے۔

کوئی بات اپنی کھو کر مفت رسوائے جہاں کیوں ہو عدو ضبط محبت کا نصیب دشمناں کیوں ہو
کسی پہلو سے لوگوں پر عیاں رازِ نہاں کیوں ہو کسی کو دیکے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

کشیدہ دل سے ہو کس واسطے اس کی خطا کیا ہے اثر اپنی کشش کا اُس نے تنگ آکر دکھایا ہے
قصور اس کا ہے جس نے آپ کو خود دور کھینچا ہے غلط ہے جذب دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو آپ کو گر تم کشاکش درمیاں کیوں ہو

ذیل کے یہ مصرعے تو بہت ہی اچھے ہیں۔

نشیمن باغ میں ہوتے ہیں ہر اک شاخ پر ہمدم کہیں طوطی، کہیں قمری پہ کی ہو گی نظر ہمدم
بو کنا ہو وہ کہ چمک اور نہ مجھکو دیکھ کر ہمدم قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

داغ دہلوی کی ایک شوخ غزل پر بہت تیز مصرعے لگائے ہیں، داغ کی غزل اور نفیس کے مصرعے حقیقت یہ ہے کہ سونے پر سہاگہ کا صحیح مصداق ہیں، ذرا ملاحظہ ہوں ۔۔ وہی رنگ وہی باتیں،

مرنے کا میرے سوگ کوئی مہ لقا کرے یا شاد ہو کے طاق بھرے رتجگا کرے
دشنام میرے نام پہ دے یا دعا کرے دنیا میں کوئی لطف کرے یا جفا کرے
جب میں نہیں بلا سے مری کچھ ہوا کرے

دل تجھ پہ میں نثار کروں تو جفا کرے   سمجھوں میں اپنے حق میں بھلا گر بُرا کرے
جا کر ملے رقیب سے مجھ سے دغا کرے   اس جور پر وفا نہ کرے یا وفا کرے
میری جگہ نصیب سے تو ہو تو کیا کرے

میں کیوں کہوں کسی کی جوانی بلا ہوئی   مجھ سے ہوا قصور، یہ مجھ سے خطا ہوئی
میرے ہی حق میں زہر مری التجا ہوئی   آتے ہی اُن کو ہوش قیامت بپا ہوئی
مانگی تھیں کیوں دعائیں کہ یہ دن خدا کرے

امیرؔ مینائی کی متعدد غزلوں کی تخمیس کی ہے، یہاں صرف تین شعروں کے مصرعے لکھے جاتے ہیں۔

دے وہ شے زیبا ہو جو جن کیلئے   تونے رکھ چھوڑی ہے کس دن کیلئے
خیر ہے لایا ہے کیا، کن کیلئے   تند ہے اور ایسے کمسن کیلئے
ساقیا ہلکی سی لا ان کے لئے

طبع نازک میں ہے اتنی نازکی   ناپسند اُس کو ہے رنگ شوخ بھی
دے نہ دینا پھول سوسن کے کبھی   باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی
بھیجنا ہے ایک کمسن کے لئے

بے وفا ہیں، بے وفا ہیں، بے وفا   پُر جفا ہیں، پُر جفا ہیں پُر جفا
کیا کوئی ایسوں سے رکھے واسطا   ساری دنیا کے ہیں وہ میرے سوا
میں نے دنیا چھوڑ دی جن کے لئے

اسی سلسلہ میں خواجہ آتشؔ کے دو شعروں کی تخمیس بھی قابل ملاحظہ ہے:۔

رحمت حق کا ادا کیا ہو سکے شکرانہ آج   پھر اُٹھا ابر بہاری جھومتا مستانہ آج
شیخ صاحب پیجئے جی بھر کے پیمانہ آج   فصل گل ہے لوٹئے لطف مئے میخانہ آج
دولت ساقی سے مالا مال ہے پیمانہ آج

غیر دم بھرتا ہے تیرے عشق کا پچھتائیگا   وہ کلیجہ سنگ و آہن کا کہاں سے لائیگا
دیکھنا اس دعوئے باطل پہ منہ کی کھائیگا   کل ہمارا اور اُس کا امتحاں ہو جائیگا
آشنائی کا ترے دم تو بھرے بیگانہ آج

غرض مخمسوں کی تعداد بہت ہے۔ اسی طرح سہرے، قصیدے اور مثنویاں بھی ہیں جن کا انتخاب بھی [illegible]
طوالت کا سبب ہوگا جس قدر کلام نقل کیا گیا یہ بھی بہت تھا لیکن اسے محض اس خیال سے نقل کیا گیا [illegible]

تھیں کلام نفیس کا کیا حشر ہو، پھر یہ اشعار بھی کسی کو نہیں ملیں گے، کاغذ پر لکھی ہوئی بات باقی رہ جاتی ہے، شیخ سعدیؒ نے کیا خوب کہا ہے:۔

"نوشتہ بماند سیہ بر سفید"

فرنگی شعراء کے باب میں یہ جو کچھ لکھا گیا "مشتے نمونہ از خروارے" ہے۔ سر راس مسعود مغفور کے ایماء سے میں نے عرصہ تک ان صاحبان کے حالات اور کلام کی جستجو کی۔ ہندوستان کے جن خاندانوں اور کتب خانوں میں ان شعراء کے مطبوعہ یا غیر مطبوعہ کلام کا پتہ چلا اُن کے اقتباسات حاصل کئے۔ علاوہ ازیں میرے احباب جو یورپ کے سفر پر گئے میری درخواست پر وہ بھی کچھ نہ کچھ اپنے ہمراہ لائے، اس طرح رفتہ رفتہ کافی مواد جمع ہو گیا لیکن "بیاض سحر" کی روشنائی ابھی خشک بھی نہ ہونے پائی تھی کہ مرحوم نے سفر آخرت اختیار کیا اور "ساقی" کے ساتھ "قدح بشکست" کا مضمون پورا ہو گیا۔ اب ایک مدت کے بعد میرے مرحوم کرمفرما منشی دیا نراین صاحب نگم کے لائق و نادر فرزند سری نراین صاحب نگم ایم۔ اے آنریری اڈیٹر "زمانہ کانپور" نے اس سلسلہ کے اشاعت کی خواہش فرمائی، موصوف کی خاطر عزیز کیوجہ سے میں نے چند فرنگی شعراء کے حالات جن میں زیادہ تر مقامی ہیں قلمبند کر دئے۔ مضمون طویل ہو گیا ہے اور یہ سلسلہ بہت طولانی ہے۔ ابھی ایک بڑی تعداد انھیں فرانسیسی شعراء کی ہے اس کے بعد انگریز شاعر ہیں، پھر پرتگالی اور ولندیزی ہیں۔ ان کے علاوہ ان ملکوں کی وہ خواتین بھی ہیں جنھوں نے اُردو میں داد سخن دی ہے ان کا جس قدر کلام ابتک دستبرد زمانہ سے بچا ہوا ہے اس قابل ہے کہ اہل نظر کیسامنے لایا جائے، ان میں سے کسی کو نظر انداز کرنا نہ صرف انکی ریاضتوں کا خون کرنا بلکہ تاریخ ادب اُردو کی ایک شاخ کو قطع کرنا ہے۔ اگر اُردو دنیا نے اس سلسلہ کو پسند کیا تو ممکن ہے کہ اُسے برائے آئندہ جاری رکھا جا سکے ورنہ ناظرین اسی کو انتہا تصور فرمالیں اس لئے کہ:۔

رسم است کہ مالکانِ تحریر
آزاد کنند بندۂ پیر

حُسنِ تغزل

(از جناب ذرخشن دہلوی)

بہا کے اشک کہر تاب شرمسار نہ کر
کسی کو یاد نہ کر، اب کسی کو پیار نہ کر

کسی کے آنے کا اے چشم انتظار نہ کر
پھرے جو وعدہ سے، ایسے کا اعتبار نہ کر

صبا سے کہدو گلستاں کو مشکبار نہ کر
خزاں خزاں ہی بھلی ہے، اسے بہار نہ کر

ہزار بار مجھے تو نے سرفراز کیا
نگاہ لطف سے شرمندہ بار بار نہ کر

پیام آتا ہے اب جلد ہی رہائی کا
جنوں سے کہدو کہ دامن کو تار تار نہ کر

گناہگار پہ پروردگار کی رحمت
جبین شوق کے سجدوں کا کچھ شمار نہ کر

بڑھا ہے دست طلب عاصیوں کا پھر درخشن
اُمیدواروں کو یارب ذلیل و خوار نہ کر

ایک مغربی سیاح سے

(از جناب بہار کوٹی صاحب)

ان لہکتے لہلہاتے مرغزاروں پر نہ جا
اپنے مستقبل سے بے پروا بہاروں پر نہ جا

راوی و گنگا کے خوش منظر کناروں پر نہ جا
نرم رو شفاف نرمل جوئباروں پر نہ جا

غنچہ لب، گُل پیرہن، لالہ عذاروں پر نہ جا
مختصر سی زندگی والے شراروں پر نہ جا

مغربی غازے میں کفنائی ہوئی نعشیں نہ دیکھ
نیم عریاں، برہنہ سر، ماہ پاروں پر نہ جا

نازشِ عفت سے مستغنی اداؤں کو نہ دیکھ
نو بہارِ حُسن کے کافر اشاروں پر نہ جا

بے حقیقت کھوکھلی، بے بود عشرت کو نہ دیکھ
عکس خانوں کے درخشندہ ستاروں پر نہ جا

میکدوں کے میکدہ بردوش ہنگامے نہ دیکھ
بے خبر، بے فکر، غافل میگساروں پر نہ جا

قمقموں سے جگمگاتی رقص گاہوں کو نہ دیکھ
چند اُونچی کوٹھیوں گنتی کی کاروں پر نہ جا

مسجدیں، آتشکدے، بتخانے، گردوارے نہ دیکھ
عظمتِ دیرینہ کے اِن شاہکاروں پر نہ جا

پیروں، سجادہ نشینوں کے تموّل کو نہ دیکھ
سونے چاندی کے کٹہروں کے مزاروں پر نہ جا

زمینداروں کے وظیفہ خواروں کے دفتر نہ دیکھ
عارضی ہیں یہ سہارے اِن سہاروں پر نہ جا

راؤں، دیوانوں، سروں، خانوں کی فہرستیں نہ دیکھ
نام کے بھوکوں پر اِن شہرت کے ماروں پر نہ جا

کھیلتا ہے خاک و خوں سے دیکھ وہ مزدور دیکھ
دیکھ میرے جسم کا رِستا ہوا ناسور دیکھ
نکبت و افلاس کی تصویر ہے میرا وطن
اِک بھیانک خانۂ زنجیر ہے میرا وطن

ریاضِ راز

(از جناب بابو شیام نرائن سریر بی۔ ایس سی، رائے بریلوی، دہلوی)

ایسی چڑھا مئے خودی، دہر کرشمہ ساز میں
مستِ مئے الست ہو، خمکدۂ مجاز میں

جتنے بھی ولولے اٹھے، عشقِ فسوں طراز میں
جذب تمام ہو گئے، حسنِ سکوں نواز میں

دامنِ کوہسار پر، چشمۂ آبشار پر
گلشنِ نوبہار پر، نغمۂ نے نواز میں

عشق کی عنفوانیاں، حسن کی نوجوانیاں
بن گئیں کچھ کہانیاں، سوز میں اور ساز میں

اُجڑے ہوئے دیار پر، ٹوٹے ہوئے مزار پر
صورتِ سوگوار پر، نالۂ شب گداز میں

حسنِ رخِ کلیم میں، آبِ دُرِ یتیم میں
رنگِ رگِ شمیم میں، حیرتِ آئینہ ساز میں

نخوتِ حسن کچھ نہیں، کلفتِ عشق کچھ نہیں
مٹ گئے سارے تفرقے، نگہِ امتیاز میں

رنگِ خزاں سے دور دور، حسنِ بہار سے الگ
کون و مکاں کو پھونک دے، ہستیِ بے نیاز میں

دل ہو اگر بجھا ہوا، سست ہے بزمِ کائنات
نغمۂ جاں نواز کیا، سوزِ شکستہ ساز میں

جی کے نہ کوئی جی سکا، مر کے نہ کوئی مر سکا
ہستی و نیستی کہاں، عالمِ بے نیاز میں

یہ ہی مآلِ عشق ہے، یہ ہی کمالِ عشق ہے
ہاتھ میں جام مشکبو، سر ہو جھکا نماز میں

ہست میں نیست کا ظہور، نیست میں ہست کا ظہور
سر بسجود ہو کے دیکھ، جلوہ گہِ نیاز میں

سمجھے کوئی تو ہو کیا، کیا ہے بقا ہے کیا فنا
خود ہی میں راز بن گیا، کھل کے ریاضِ راز میں

کاشت کاری

(از مرزا فدا علی خنجر لکھنوی)

ٹھاکر امید علی کے قلعہ میں مرمت لگی تھی، صدہا راج مزدور کام کر رہے تھے۔ آفتاب بلند ہوتے ہوتے فلک کی اُس منزل پہ جا پہنچا تھا جہاں سے زوال کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ قلعہ کی چھت پر مختلف سن و سال اور قد و قامت کی عورتیں ہاتھوں میں چوبی تھاپیاں لئے بڑی مستعدی سے زمین کوٹنے میں مشغول تھیں۔ اُن سے کسی قدر فاصلے پر دو نوعمر مزدور اینٹیں جمع کر رہے تھے، اُنکی پیشانیاں دھوپ کی تمازت اور شدید مشقت کے باعث عرق آلود ہو رہی تھیں جس وقت ٹھاکر اور ان کے عیش نصیب اہالی موالی کھا پی اور شکم سیر ہو کر آرام کی بنسی بجانے یا قیلولہ کرنے میں مصروف تھے، نرم و گداز بستر اُن کے راحت طلب جسموں کو استراحت پہنچا رہے تھے، خدام کی پنکھا کشی موسم گرم ہونے کے باوجود اُنھیں ہلکی دُلائی اوڑھنے اور خنکی محسوس کرنے پر مجبور کر رہی تھی، ٹھیک اسی وقت یہ بدبخت مزدور چلچلاتی دھوپ میں فولادی مشین کی طرح اپنا فرض ادا کرنے میں منہمک تھے۔ چھ بجے صبح سے یہ وقت آگیا تھا کہ بیچاروں کے منہ تک ایک کھیل بھی اُڑ کر نہیں پہونچی تھی۔

بخشی نے سر سے اینٹوں کا بوجھ اُتار کے دو انگلیوں سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا " رحمو بھیا! مجھے تو بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے "۔

" تمھارے پیٹ میں تو جو اسل اُتر آئی ہے " رحمو نے جواب دیا " جب سنو بھوک کی شکایت! جب دیکھو کھانے کی فکر! آخر سویرے ہی کیوں نہیں کچھ کھا لیا کرتے ؟ "

" کیسے کھاؤں بھیا؟ " بخشی بولا " تمھارے پاس تو پکانے کی بڑی سی ہنڈیا موجود ہے، اُس میں اکٹھا بہت سے چاول اُبال لیتے ہو۔ رات کو بھی بھر پیٹ کھاتے ہو اور جو بچ رہتا ہے اُسے سویرے کے لئے اُٹھا رکھتے ہو، میرے پاس تو بڑا برتن ہے ہی نہیں۔ پکانے بیٹھتا ہوں تو ایک وقت بھی پورا نہیں پڑتا۔ پھر میں بھات بناتا ہی کب ہوں مہینے میں بیس بائیس دن تو ستو ہی پر کٹ جاتے ہیں "۔

" خیر، کچھ سہی " رحمو نے کہا " چھٹی تو بغیر گھنٹہ بجے نہیں ہو سکتی، بھوک لگے یا آنتیں اینٹھیں "۔

" اسی لئے تو میں مزدوری کو پسند نہیں کرتا " بخشی نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

" تو پھر کوئی نوکری کیوں نہیں کر لیتے " رحمو نے طنزاً کہا " اس میں اتنی محنت بھی نہیں پڑے گی "۔

" مجھے نوکری بھی اچھی نہیں لگتی " بخشی نے بتایا " نہ بھر نیند سو سکتے ہیں نہ من بھاتا کھانا ملتا ہے "۔

" پھر تمھیں پسند کیا ہے؟ " رحمو نے دریافت کیا " ذرا وہ بھی تو سُنیں "۔

" کوئی روزگار " بخشی نے کہا " یا کھیتی باڑی "۔

"تب تو تمھارے پاگل پن میں کوئی شبہ نہیں،" رحموا بولا "بھلا یہ تو بتاؤ روزگار کرکے کہاں کہاں دوڑتے پھروگے، اتنی دوڑ دھوپ پر بھاؤ تاؤ ٹھیک لگا تو تھوڑا بہت مل بھی رہے گا نہیں تو گھر کی پونجی بھی گنوانا پڑیگی، رہی کھیتی باڑی؛ اس میں اس سے زیادہ جھنجھٹ کرنا پڑتا ہے، بیج بو، دیکھ ریکھ رکھو۔ اس پر بھی برکھا نہ ہوئی تو ساری کی کرائی محنت برباد ہوگئی اور وہی مثل ہوئی کہ "آؤ پیرو! گھر سے لے جاؤ"۔ اس کے علاوہ بھی نہ جانے کتنے جھگڑے بکھیڑے ہیں۔ دن رات انھیں میں گزرتی ہے، اور مزدور کا کیا کہنا۔ جہاں کمانا وہیں کھانا۔ دن بھر کام کرو شام کو پیسے لیکر بال بچوں میں موج اڑاؤ، نوکری کا بھی یہی حال ہے مہینہ ختم ہوا اور تنخواہ تیار ہے"

"بھیا! تم نے سامنے کی تو سب باتیں دیکھ لیں،" بخشی نے کہا "مگر اصل چیز پر دھیان نہیں دیا۔ مزدوری اور نوکری میں دوسرے کا حکم چلتا ہے جیسے نکیل لگی ہوئی ہے، اونٹ کے بھانت انگلی کے سہارے ناچتے رہو، ذرا چوکے نہیں کہ مار دھاڑ گالی گفتہ شروع ہوگیا اور کھیتی اور روزگار میں من مانی کرو، کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں، سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ نوکری میں لوگ بھاگ نصیب کو بیچ ڈالتے ہیں لیکن کھیتی اور روزگار میں بھاگ کے ساتھ کھیلا جاتا ہے"

ایکاایکی دوپہر کا چبنیا چابنے کا گھنٹہ بجنے لگا۔ سب مزدور کام چھوڑ کے جل پان کرنے دوڑے بخشو اور رحموا بھی گفتگو موقوف کرکے پیٹ کا گڑھا پاٹنے روانہ ہوگئے۔

ٹھاکر امید علی خاں رنگ رلیاں منانے میں تو لاکھوں کی پروا نہیں کرتے تھے۔ جی حضوریوں کیواسطے ان کا دسترخوان بہت وسیع تھا لیکن قسمت زدہ مزدوروں پر ہمیشہ تخفیف کی چھری تیز رکھنے کے عادی تھے۔ انھیں حاشیہ نشینوں کے گلچھرے سے جب فراغ حاصل ہوتا تھا تو ساری توجہ اجرت گھٹانے کی معقول وجہ تلاش کرنے میں صرف کردیتے تھے، کوئی شبہ نہیں کہ اس سعی و کوشش میں سو فیصدی کامیابی بھی ہوتی تھی۔ آج بھی انھیں روزمرہ کے شغلوں سے فرصت تھی اور اجرت میں کتر بیونت کرنیکا مسئلہ سامنے تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد انھوں نے پُر دبدبہ آواز سے پکارا "رحموا! او رحموا!"

"حاضر سرکار!" کہتا ہوا رحموا دوڑا اور ٹھاکر صاحب کے سامنے پہنچ کر حکم کا انتظار کرنے لگا۔"

"رحموا!" ٹھاکر صاحب نے کہا "اس وقت تمھیں ایک خاص کام کیواسطے بلایا ہے"

"سرکار مائی باپ ہیں" رحموا نے عرض کی "جو حکم دیں گے وہی ہوگا۔

"اب کی بعض ضروری کاموں میں بہت سا روپیہ صرف ہوگیا ہے" ٹھاکر صاحب نے سمجھایا "جب تک مصارف میں کمی نہ کی جائے گی حالات کا سدھرنا دشوار ہے"

"جو حکم ہو" رحموا نے کہا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ" ٹھاکر صاحب نے سمجھایا "مزدوروں کی مزدوری کچھ گھٹا دوں لیکن یہ بھی اندیشہ ہے کہ کام میں کچھ گڑبڑی نہ ہو جائے، تم سمجھدار آدمی ہو اس واسطے تم سے کہتا ہوں۔ آج سے تمھیں چار آنے کے بدلے چھ آنے روزینہ ملا کرے گا۔ تم مزدوروں کو سمجھا بجھا کر تین آنے یومیہ پر راضی کردو، صرف چار پیسے فی مزدور کم ہو جائیں گے ــــ ہاں عورتوں کو تین آنے کے عوض

نو پیسے روز دیے جائیں گے، چوتھائی مزدوری کٹ جانے سے کچھ زیادہ نقصان بھی نہیں ہے اور سب تو رضامند ہو جائیں گے صرف چند بدمعاشوں کا ڈر ہے۔"

"یہ کون بڑی بات ہے سرکار!" رحمو نے اطمینان دلایا۔ "میں ابھی سب کام ٹھیک کئے دیتا ہوں فقط تین سپاہیوں کو میرے ساتھ جانے کا حکم مل جائے۔"

ٹھاکر امید علی خاں نے تین سپاہیوں کو رحمو کے ساتھ کر دیا۔ رحمو نے قلعہ کے سامنے والے میدان میں سب مزدور اور مزدورنیوں کو جمع کر کے کہا۔ "بھائیو اور بہنو! میں نے آپ لوگوں کو جس مطلب کے واسطے اکٹھا کیا ہے وہ یہ ہے کہ اب تک جس سرکار کی سیوا کر کے سکھ چین کا بھوگ کرتے رہے ہیں وہ کئی کارنوں سے خرچ میں کمی کرنا چاہتی ہے اور خوب سوچ بچار کے یہ تدبیر پاس کی ہے ہم میں سے مردوں کو تین آنے اور عورتوں کو نو پیسے روز دیا کرے، یعنی ایک چوتھائی مزدوری گھٹا دی جائے، یہ کمی سدا کے لئے نہیں بلکہ تھوڑے دنوں کیواسطے ہوگی۔ ٹھاکر صاحب کا کہنا ہے کہ اس نقصان کے بدلے میں آپکو کام سے کبھی نہیں ہٹائیں گے۔ جب تک قلعہ میں مدد لگی رہیگی آپ ہی یہیں کام کریں گے۔ اگر ہم کو اپنی بھلائی منظور ہے تو فوراً اس تجویز کو مان لینا چاہیئے۔ نہ ماننے سے ہوسکتا ہے کہ ہمارے جانے کے بعد اسی کم مزدوری پر دوسرے مزدور قلعہ میں کام کرنے لگیں اور ہمکو بیکار رہنا پڑے۔ آج کل کام پر جو آفت آئی ہوئی ہے وہ آپ لوگوں سے چھپی نہیں ہے۔"

رحمو نے خاموش ہو کر مجمع پر تجسسانہ نگاہ ڈالی، ہر طرف مستقل سکوت وجمود طاری تھا۔ روزی کا سوال اتنا معمولی سوال نہ تھا کہ فی الفور جواب دینے کی جرأت کی جاتی، نہ معلوم کتنے بے روزگار قلعہ میں کام کرنے کو آمادہ ہوں گے، جگہ خالی ہوتے ہی وہ سب قبضہ جما لیں گے اور کام چھوڑنے والوں کو بھوکوں مرنا پڑے گا۔

یہ خیالات تھے جنھوں نے مزدوروں کے ہونٹ سی دئے تھے، ہر مزدور ایک نئی فکر میں اُلجھا ہوا تھا، البتہ بخشی ہی ایک ایسا تھا جس میں ارادے کی طاقت کام کر رہی تھی اُس نے قلیل عرصہ میں ایک رائے قائم کر لی اور رحمو کو متوجہ کرتے ہوئے بولا۔ "بھیا! تم نے جو اونچ نیچ دکھائی ہے اس کو ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ ہمیں روز روز کام کرنے سے تجربہ ہو چکا ہے کہ چار آنے مزدوری میں اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ نہیں پال سکتے۔ یہی کارن ہے کہ ہم لوگ ایک ساتھ مل کر ٹھاکر صاحب سے مزدوری بڑھوانے والے تھے مگر معلوم ہوتا ہے وہ چار آنے میں بھی ایک آنہ کاٹنے والے ہیں اس لئے صاف صاف کہہ دینا اچھا ہے کہ ہم اتنی تھوڑی مزدوری پر کام نہیں کر سکتے۔"

بخشی کا سبھا سے اُٹھ کر چلنا تھا کہ مزدوروں کی ایک بھیڑ اس کے پیچھے ہولی صرف گنتی ہی کے چند نفر وہاں رہ گئے لیکن تکلیفوں کا مقابلہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔ بخشی کے ساتھ سبھا سے اُٹھ آنیوالوں میں ایک ہی دو ایسے تھے جو اپنی بات پر اڑے رہے باقی سب دو، دو چار، چار دن پچھتا پچھتا کر کام پر واپس گئے اور تین آنے روز پر مزدوری کرنے لگے مگر بخشی ایسا گیا پھر کبھی کام پر نہیں آیا۔

بخشی کو گاؤں والوں کی آنکھوں سے اوجھل ہوئے سالہا سال گزر گئے حتیٰ کہ اس کے ساتھیوں نے اسکی یاد تک فراموش کر دی۔ زمانے نے بہت سے پلٹے کھائے، بچے جوان ہو گئے، جوانوں نے شباب کو شیب سے تبدیل کر لیا۔ اتنے عرصہ میں نہ معلوم کتنے زمیندار اپنی ناعاقبت اندیشی کی بدولت لٹ پٹ کر دانے دانے کو محتاج ہو گئے اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنے مفلس، فطری جفاکشی اور کامیاب کوشش کے بل بوتے پر ترقی کی سنہری منزلیں طے کرتے ہوئے عروج کی اس بلند چوٹی تک جا پہونچے جہاں سے عام شخصیتیں بہت ہی پست دکھائی دیتی ہیں۔

انھیں خوش نصیب ہستیوں میں شیخ الٰہی بخش کا بھی شمار تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے صرف ایک بیگھہ زمین جوت کر تدریجی ترقی کی اور انتھک کوششوں سے آہستہ آہستہ اتنا عروج حاصل کر لیا کہ ٹھاکر امید علی خاں بھی دب کر رہ گئے۔ قرب و جوار کے تمام گاؤں یکے بعد دیگرے انکی ملکیت میں داخل ہو گئے۔ زراعت کو اتنا بڑھایا کہ ہزاروں بیگھے زمین پر ہرے بھرے کھیتوں کا سمندر لہرانے لگا۔

شیخ الٰہی بخش بڑے نیک اور کریم النفس واقع ہوئے ہیں۔ آسامیوں کے ساتھ انکا سلوک اتنا بہتر ہے کہ اسکی نظیر ملنا دشوار ہے۔ مزدوروں پر ہمیشہ مہربانیوں کی بارش ہوا کرتی ہے۔ ان کی خداداد دولت کا بڑا حصہ بنی نوع انسان کی بھلائی اور کسانوں کی فلاح و بہبود پر صرف ہوتا ہے۔ انھوں نے دہقانوں کے بچوں کے واسطے زراعتی اور پرائمری اسکول کھول رکھے ہیں جو سرکاری امدادی رقم کے بعد تمام تر اُن کے روپے سے چلتے ہیں۔

صرف یہی نہیں کہ اسکولوں میں دیہاتی طلبا کو مفت تعلیم دیجاتی ہے بلکہ جو لوگ ناداری کیوجہ سے خرچ نہیں اُٹھا سکتے ان کے واسطے شیخ صاحب کا خزانہ وقف ہو جاتا ہے۔

ایک دن شیخ الٰہی بخش صاحب معمولاً زراعتی اسکول کا معائنہ کرنے آئے ہوئے تھے۔ استادوں کے ساتھ نمونے کے کھیتوں کی دیکھ بھال ہو رہی تھی کہ ایک مزدور دو چھوٹے بچوں کی انگلی پکڑے ان کے سامنے آکھڑا ہوا، یہ رحموا تھا جو متاہل زندگی شروع کرنے کے بعد سے اب دو بچوں کا باپ بن چکا تھا اس نے پڑوسیوں کی زبان سے اسکول کے فائدے سُنے تھے اور چاہتا تھا کہ اپنے دونوں بچوں کو بھرتی کر اکے انکا مستقبل روشن کرنے کی سعی کرے مگر قلیل آمدنی میں پیٹ بھر کے کھلانا ہی مشکل تھا، مصارف میں اضافہ کی گنجایش کیسے نکلتی، لوگوں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ شیخ الٰہی بخش کے حضور میں حاضر ہو کر التجا پیش کرے، وہ رحم دل آدمی ہیں مایوس پھیرنا گوارا نہ کریں گے اور ضرور کوئی نہ کوئی انتظام کر دیں گے یہی مشورہ ہمت بندھا کر اسے یہاں تک لایا تھا۔

شیخ الٰہی بخش رحموا کو ساتھ لئے اپنی پختہ حویلی میں آئے اور بڑی مہربانی سے بٹھا کر آنے کا سبب دریافت کیا، رحموا نے پہلے اپنی عسرت و نکبت کا دکھڑا رویا اور جب ان کے کریمانہ جذبات کو اُبھار چکا تو مطلب عرض کیا، شیخ الٰہی بخش نے بچوں کی تعلیم کے مصارف برداشت کرنا منظور کرتے ہوئے اسکول میں داخلہ کرا دینے کا وعدہ کر لیا اور جب رحموا کی خاطر جمعی ہو لی تو کہا

"رحموا بھیا! کیا تم مجھے پہچانتے ہو؟"

غور سے صورت تاکتے ہوئے رحمو نے جواب دیا۔ "جی نہیں۔"

"تعجب ہے کہ تم اپنے قدیم سنگھی کو بھول گئے۔" شیخ الٰہی بخش نے گزرے ہوئے دنوں کی طرف توجہ پھیرتے ہوئے کہا "حالانکہ ہم نے اور تم نے ٹھاکر اُمید علی کے یہاں مہینوں ایک ساتھ کام کیا ہے۔"

اس بیان پر رحمو اس طرح چونک پڑا جیسے کوئی عجیب و غریب خواب دیکھ کر آنکھ کھلی ہو۔ اُس نے پھٹی پھٹی حیرتناک آنکھوں سے شیخ الٰہی بخش کو تاکتے ہوئے کہا۔ "تو کیا آپ وہی بخشی ہے؟"

"ہاں ہاں" شیخ الٰہی بخش بولے۔ "میں وہی بخشی مزدور ہوں۔ مگر اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟"

"مگر — یہ سب؟" رحمو نے ہچکچاتے ہوئے سوال کیا۔

"خدائے رحیم و کریم کا عطیہ" شیخ الٰہی بخش نے جواب دیا۔ "اور محنت و سعی کا اجورہ ہے۔"

اس کے بعد اُنھوں نے بتایا کہ مزدوری چھوڑنے کے بعد اُنھوں نے کس طرح ایک بیگھہ زمین حاصل کرکے اسے بنایا جوتا اور زراعت کا کام شروع کیا۔ ترقی کرنے میں کیسی کیسی عرق ریزی کرنا پڑی اور پیداوار بڑھانے میں کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا ہوا مگر انھوں نے لمحہ بھر کے واسطے بھی ہمت نہیں ہاری۔ سرمایہ کی کمی کے باوجود زراعتی نمائش میں شریک ہوکر جدید آلات کا معائنہ کیا۔ ان کے فائدے معلوم کئے اور انھیں حاصل کرنے کو روپیہ فراہم کیا پھر جدید اصول پر کھیتی باڑی شروع کردی، کیونکہ انھوں نے زراعتی ترقی کے لئے سرکاری امداد حاصل کی، اور دیسروں سے مدد لی۔ بالآخر کیسے ہزاروں بیگھے زمین کے مالک بنے اور اتنی وسیع زراعت کا انتظام اور انصرام کیا۔

اُنھوں نے اس رمز پر بھی روشنی ڈالی کہ قرب و جوار میں جو ہزاروں بیگھے زمین جوتی جاتی ہے وہ اناج پیدا کرنے میں اتنی کامیاب کیوں نہیں ہوتی۔ جتنی انکی محلوکہ زمین فصل دیتی ہے۔ حقیقت میں یہ فرق اچھی کھاد، جدید آلات اور عمدہ قسم کے بیج وغیرہ سے نمودار ہو جاتا ہے، وہ اپنی زراعت میں نئے اصولوں کی پابندی فرض جانتے ہیں۔ قدیم اور فرسودہ طریقوں کو بالکل ترک کرچکے ہیں۔ چونکہ اُنھوں نے ان وسائل پر قابو پالیا ہے جن کے ذریعہ سے خدائے تعالےٰ اپنے بندوں کو محنت کا پھل عطا کرتا ہے اسی لئے وہ روز بروز ترقی کی منزلیں طے کر رہے ہیں۔

رحمو گم صم تصویر بنا بیٹھا تھا۔ شیخ الٰہی بخش کے الفاظ افسوں ہوکر سامعہ میں داخل ہو رہے تھے، یکایک اس کے دل سے ایک آواز پیدا ہوئی۔ "نوکری میں لوگ باگ نصیب کو بیچ ڈالتے ہیں لیکن کھیتی اور روزگار میں بھاگ کے ساتھ کھیلا جاتا ہے۔" یہ وہی الفاظ تھے جو بہت عرصہ ہوا شیخ الٰہی بخش نے رحمو کے گوش گزار کئے تھے اور اس نے انھیں مجذوب کی بڑ سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ آج اس جملے کا صحیح مفہوم آفتاب کی طرح درخشاں تھا اور اس کی سنہری شعاعیں آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھیں۔

سکائی لارک

(از جناب بابو کرشن گوپال مغموم بی۔اے)

انگریزی کے سحر نگار شاعر پی۔ بی شیلے کی شہرۂ آفاق نظم "(TO A SKYLARK)" کا منظوم ترجمہ:-

(۱)

حبذا! اے روحِ راحت! اے پرندِ خوشنوا! تو پرندہ ہی نہیں، کہتی ہے یہ عقلِ رسا
گنجِ فردوسِ بریں سے نغمے برساتا ہے تو غیرِ فانی، دلنشیں انداز میں گاتا ہے تو

(۲)

رفعتوں پر تو مثالِ شعلۂ آوازہے سوئے چرخِ نیلگوں تو مائلِ پرواز ہے
ہو کے سرمستِ مئے نغمہ اُڑا جاتا ہے تو دل نشیں انداز میں اُڑتے ہوئے گاتا ہے تو

(۳)

تیرتا ہے صبح کے رنگیں شفق زاروں میں تو وہ، جہاں ہیں بادلوں کے ٹکڑے ہائے شعلہ پوش
روحِ عشرت سرخوشی میں جیسے ہو گرمِ سفر یونہی ہے تیری پرافشانی ہوا کے دوش پر

(۴)

تابشِ اختر ہو جیسے محوِ مہرِ ضو فشاں دُور نظروں سے شفق کے رنگ میں تو ہے نہاں
دیدۂ نظارہ جُو سے گرچہ تو رُو پوش ہے اب بھی لذت کش ترے نغموں سے میرا گوش ہے

(۵)

مشعلِ نورِ قمر کی وہ سرور آگیں ضیا کب سرور افزا ہے اتنی جس قدر تیری صدا
روشنیٔ صبحِ صادق میں ہو جیسے گُم قمر یونہی تو بھی ہے نہاں آنکھوں سے میری سر بسر

(۶)

مُرتعش ہے تیرے نغموں سے فضائے آسماں کیف افشاں ہیں زمیں پر تیری نغمہ سنجیاں
ابر سے چھنتا ہو نورِ ماہ جیسے رات کو تیرے نغمے گدگداتے ہیں یونہی جذبات کو

(۱۵)

تیرے اِس جذبے کی تحریکوں کا مخزن ہے کہاں — وہ بیاباں کس طرف کو ہے، وہ گلشن ہے کہاں
چرخِ نیلی کے کوئی طبقات ہیں پیشِ نظر — لوٹ ہے یا روح تیری مزرعۂ نوخیز پر؟

(۱۶)

شائبہ غم کا نہیں جذباتِ عشرت میں ترے — رنج کی ظلمت میں کُنجِ مسرت میں ترے
تو مگر لذت کشِ صہبائے اُلفت ہی رہا — دل ترا ناآشنائے رنجِ فرقت ہی رہا

(۱۷)

رات دن ہم فانیوں کو موت سے ہے خوفِ جاں — جاگتے سوتے ہے اک اندیشۂ سود و زیاں
زندگانی کے حقایق ہیں ترے پیشِ نظر — ورنہ کب ہوتے ترے نغمے یہاں تک باثر

(۱۸)

اپنی تو مستقبل و ماضی پہ رہتی ہے نگاہ — توسنِ حرص و ہوا پر ہیں رواں شام و پگاہ
قہقہوں میں بھی ہے اپنے پہلوئے سوزِ نہاں — شادمانی کے ترانوں میں ہے تاثیرِ فغاں

(۱۹)

گر تکبر اور نفرت کی ہمیں عادت نہ ہو — بزدلی سے اشک برسانے کی گر فطرت نہ ہو
راز تیری شادمانی کا ہو ہم پر آشکار — زندگی کے باغِ ویراں میں ہو رنگِ نو بہار

(۲۰)

سارے نغموں سے ہے اک نغمہ جُداگانہ ترا — فطرتاً شاعر کا دل ہوتا ہے دیوانہ ترا
کب تصانیفِ ادب میں ہے یہ لطفِ بیکراں — سحر ہے، جادو ہے، افسوں ہے یہ اندازِ بیاں

(۲۱)

شادمانی کا تری مجھ پر کھُلے گر نصف راز — تیرے نغموں کی طرح ہوں میرے نغمے جاں نواز
جیسے میں بدمست و بیخود ہوں صداؤں سے تری — کل جہاں مسحور ہو جائے نواؤں سے مری

(۷)

کون ہے تو؟ آج تک یہ راز میں سمجھا نہیں
کس سے دوں تشبیہ تجھکو؟ ذہن میں آتا نہیں
کب ہیں رنگیں اِس قدر قطراتِ ابرِ لالہ رنگ؟
جس قدر رنگین و دلکش ہے ترے نغموں کا چنگ

(۸)

ایک شاعر کی طرح تیرا جہاں میں ہے وجود
جو تخیل کے جہاں میں چھپ کے ہو وقفِ سرود
ایک وہ شاعر کہ ہو بس نغمہ سنجی جس کا کام
اور جو ہو بے نیازِ عظمت و توقیر و نام

(۹)

جیسے اک دوشیزۂ والا نسب، فرقت نصیب
قصر کے مینار میں وقفِ ترنم ہو غریب
اور اُس کا قصر ہو پُر از صدائے جانگداز
کیفیت تیری وہی ہے مطربِ نغمہ نواز

(۱۰)

یا وہ جگنو شب کی تاریکی میں ہو جو ضوفشاں
شبنمستاں میں ہوں پیدا جسکی ضو سے بجلیاں
چھپ کے دلکش روشنی پھولوں پہ برساتا ہو جو
گھاس اور پتوں کی شبنم کو ہنساجاتا ہو جو

(۱۱)

یا وہ گل، ہو پتیوں کا جس کے ہر جانب حصار
صدمۂ صرصر سے ہو یک لخت جس کا انتشار
پتیوں سے اُس کی نکلے وہ شمیمِ دل کشا
تتلیاں ہو جائیں سرمستِ مئے راحت فزا

(۱۲)

فصلِ جوشِ گل میں وہ ابرِ بہاراں کی پھوار
مینہ کے تھم تھم کر برسنے کی صدائے خوشگوار
وہ شگوفہ ہائے رنگیں کے چٹکنے کی صدا
سب صداؤں سے ہے بڑھکر مجھکو اِک تیری نوا

(۱۳)

کچھ تو سمجھا روحِ عشرت! طائرِ رنگیں نوا!
کون سے جذباتِ پنہانی ہیں تیرے رہنما؟
یہ کرشمہ عشق اور صہبا دکھا سکتے نہیں
تیرے نغموں کا سرور و کیف لا سکتے نہیں

(۱۴)

نالہ ہائے ماتمی ہوں یا نواہائے نشاط
دل پہ داغِ غم ہو جن سے یا ہو نقشِ انبساط
تیرے نغموں کے مقابل انکی کچھ وقعت نہیں
یہ کشش، یہ جاذبیت، یہ شباہت نہیں

محرومیِ خلوص

(از جناب فرحت کانپوری بی۔اے، ایل۔ایل۔بی کانپور)

لطفِ خضر سے چشمۂ حیواں نہیں ملا — پریاں ملیں تو بختِ سلیماں نہیں ملا
دوراں میں کوئی فتنۂ دوراں نہیں ملا — کنعاں میں رہ کے یوسفِ کنعاں نہیں ملا
کوئی مزاجِ عشق کا پرساں نہیں ملا — بختِ سیاہ کو مہِ تاباں نہیں ملا
مجھ سے گدائے راہ کو سلطاں نہیں ملا — اِس قطرۂ حقیر کو طوفاں نہیں ملا
میرے جنونِ شوق و خلوصِ نیاز کو — تسکینِ قلب و پہلوئے جاناں نہیں ملا
خود روح کو ہے فاقۂ بسیار و بے پناہ — جذبِ خلیلِ عشق کو مہماں نہیں ملا
کی ہی نہیں کسی نے جنون پرسیِ نیاز — یعنی جمالِ سلسلہ جنباں نہیں ملا
ہاں! ہاں! مثالِ زہر ملا عشوۂ حسیں — تریاق ہو کے غمزۂ خوباں نہیں ملا
کیوں پیچ و تاب کھائے نہ روحِ نیازِ عشق — جب پیچ و تابِ کاکلِ پیچاں نہیں ملا
بھولا ہوا جنوں ہے تو بھٹکا ہوا نیاز — کوئی خضر سا رہبرِ دوراں نہیں ملا
میرے دلِ غریب پہ کب ہے نگاہِ یار — پایِس گدا ہو جس کو وہ سلطاں نہیں ملا
روشن کرے جو ہجر کی شب ہائے قیرگوں — ایسا تو کوئی مہرِ درخشاں نہیں ملا
کیسے کٹیں گی زیست کی راتیں پہاڑ سی — شمعِ حیات و روحِ شبستاں نہیں ملا
یوں تو ہوا میں خلوتیِ کاکل و جمال — لیکن چراغِ چشمۂ حیواں نہیں ملا
یوں تو ہوئی زیارتِ صد مصحفِ جمیل — لیکن حدیثِ شوق کا قرآں نہیں ملا
عرصے سے مجھ پہ تنگ ہے کل عرصۂ حیات — خوش کامیوں کو صحنِ گلستاں نہیں ملا
اللہ رے کفر کاکلِ کافر کی کلفتیں — اب تک چراغِ جادۂ ایماں نہیں ملا
ایسا کہ جو ہو دلبرِ شیریں و دلربا — میرے سخن کا بھی ہو سخنداں نہیں ملا
جو زیب و زینِ کلبۂ احزاں بھی ہو سکے — ایسا چراغِ کلبۂ احزاں نہیں ملا

جس میں ہو خود بھی فرحتِ مخلص کا سا خلوص
ایسے خلوص کا کوئی انساں نہیں ملا

اُردو فارسی کے یوروپین اور انڈو یوروپین شعراء

رائے بہادر رام بابو سکسینہ ایم، اے، ایل، ایل، بی، ایف، آر، ایس، اے (لندن) ایم، اے، ایس، بی، ممبر ہندوستانی اکیڈیمی یو، پی، ڈپٹی کلکٹر یو پی کے نام نامی اسم گرامی سے دنیائے علم و ادب کا کون شخص واقف نہیں ہے، آپ متعدد علمی و ادبی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں "ہسٹری آف اُردو لٹریچر" (تاریخ ادب اُردو) خاص شہرت کی مالک ہے۔ اب آپ کا ایک جدید شاہکار بزبان انگریزی "یوروپین اینڈ انڈو یوروپین پوئٹس آف اُردو اینڈ پرشین" (تذکرہ یوروپین و انڈو یوروپین شعرائے اُردو فارسی) کے نام سے بصیرت افروز چشم علم و ادب ہوا ہے، جہاں تک تلاش و تجسس اور تحقیق و تدقیق کا تعلق ہے، فاضل مصنف کا یہ گرانقدر کارنامہ آپ کی پہلی تصنیف "تاریخ ادب اُردو" پر بھی فوقیت لیگیا ہے۔

فاضل مصنف کا جدید شاہکار ان کی پانزدہ سالہ مسلسل جد و جہد، چھان بین اور تلاش و تجسس کا نتیجہ ہے، آپکی یہ تمام مساعی جمیلہ مشکور ہوئیں اور پورے ایک سو ایسے شعراء گوشۂ گمنامی سے نکل کر منظر عام پر آگئے جو مغربی نژاد تھے، اور جو اقالیم اُردو فارسی میں داد سخنوری دیا کرتے تھے، ان شعراء کرام میں نہ صرف خالص یوروپین تھے بلکہ انڈین، ہندی یورپین، ہندی پرتگالی، ہندی جرمن ہندی فرانسیسی، ہندی اطالوی اور ارمن اقوام کے شعراء بھی تھے ان میں بعض صاحب دیوان بھی تھے، بعض دیوان اب بھی ملتے ہیں اور بعض نایاب ہوگئے ہیں۔

فاضل مصنف نے پندرہ سال لگاتار ان شاعروں کے حالات اور نمونۂ کلام کی تلاش میں صرف کئے، ان کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ دیوان اور ان کے کلاموں کی قلمی بیاضیں بہم پہنچائیں، پرانے رسالے اور پرانے اخبار ٹٹولے، نہ صرف ہندوستان کے سرکاری و پرائیویٹ یا ریاستوں کے کتب خانوں کی چھان بین کی بلکہ انگلستان کے پبلک اور پرائیویٹ کتبخانوں کو بھی نہیں چھوڑا، آپ گرجاؤں میں گئے، وہاں کے متعلقہ قبرستانوں میں قبروں کے کتبے پڑھے اور اپنے مطلب کی باتیں اخذ کرلیں، دریافت حال کے لئے ہزارہا خطوط مختلف حضرات کو ارسال کئے اور مطلب کی باتیں معلوم کیں، فاضل مصنف کی جد و جہد کا اندازہ اسی بات سے کیا جاسکتا ہے کہ جن مطبوعہ و غیر مطبوعہ دواوین، بیاضوں، مخطوطات، رسالوں، اخباروں، تذکروں، لغات، سفرناموں، کتب تواریخ، لائبریریوں، قبرستانوں وغیرہ سے آپنے اپنے جدید شاہکار کی تدوین میں استفادہ فرمایا ہے، ان کی ایک مفصل فہرست کتاب کے شروع میں دی گئی ہے، جو فل اسکیپ سائز کے ۹ صفحوں میں ختم ہوئی ہے۔

عام تذکروں میں مختلف شعراء کے مختصر سوانح حیات اور ان کے کلام کا مختصر نمونہ درج ہوتا ہے، لیکن فاضل مصنف نے اپنے اس تذکرہ میں ایک خاص بات کا اضافہ کیا ہے یعنی شعراء کے حالات قلمبند کرنے کے علاوہ ان کے شجرہائے حسب ونسب پر بھی بہت کافی روشنی ڈالی ہے، اور کتاب کی تدوین کے بعد جو مزید حالات دستیاب ہوسکے ان کا بطور ضمیمہ اضافہ کرکے اس تذکرہ کی بوجہ احسن تکمیل فرمادی ہے۔

عام نظریہ یہ ہے کہ ہر شاعر کے کلام اور ہر ادیب کی تحریر سے اس کے زمانہ کی سوسائٹی کے خط وخال نمایاں ہوجاتے ہیں، چنانچہ اس تذکرہ کا مطالعہ کرکے ناظرین پر خود روشن ہوجائیگا کہ ان یوروپین اور اینگلو انڈین شاعروں کی زبان، ان کے محاورات، نیز ان کا طرز معاشرت کیا تھا۔ فاضل مصنف نے خود ان شاعروں کے طرز معاشرت یعنی سوشل حالات پر پُر از معلومات روشنی ڈالی ہے، آپ یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ ان غیر ہندی نژاد شاعروں کا کلام کس قدر سلیس، کس قدر برجستہ، کس قدر مرصع اور کس قدر دلپذیر ہوتا تھا۔ انھیں اپنے زمانہ کے روزمرہ پر خوب عبور حاصل تھا، وہ محاورات نہایت برجستگی سے استعمال کرتے تھے، صنائع بدائع سے بخوبی کام لیتے تھے، ان کے کلام میں ضلع جگت، تلازمہ اور ایہام کی افراط پائی جاتی ہے، نمونہ کے طور پر چند اشعار ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ ھ

نہ وہ ہمدم نہ وہ جلسا رہا ہے — تپ دوری سے دل جل سا رہا ہے
جنوں کی فوج کی سن آمد آمد — خرد کا پاؤں کچھ چل سا رہا ہے
کسی عاشق کا نعرہ چرخ زن ہے — جو خیمہ چرخ کا ہل سا رہا ہے
مجھے اس واسطے ہے تلملاہٹ — کہ غم سینے میں دل مل سا رہا ہے

اشکوں سے بہا جاتا ہے اپنا دلِ پُر غم — برسات میں گرتا ہے یہ گھر کوئی خبر لے
(ڈاکٹر لوئی)

بہارِ چمن پہ نہ اِترا اے بلبل — تماشا یہ دو روز کا ہو رہا ہے
ذرا مسکرا کر چھڑک دو نمک تم — کہ منھ زخم کا بے مزا ہو رہا ہے

خبر اس کی نہیں کیا ہوگیا دل — مگر یہ یاد ہے پہلو میں تھا دل
نہ چھوٹی حشر میں بھی آنکھ ان کی — خدا کے سامنے بھی لے لیا دل

وہ اپنے عکس سے آئینہ میں آنکھیں لڑاتے ہیں — الٰہی خیر کرنا دونوں چوٹیں ہیں مقابل کی
شکستہ خاطری ہے رفعتِ ساقی میں کچھ ایسی — بہت ملتی ہے ٹوٹے جام سے صورت مرے دل کی
(آر، لنا یکب فرحت)

سودا ہے زلف یوسف ثانی کا اس قدر — روئے ہیں ہم کھڑے سر بازار زار زار

(الگزینڈر طامس طوماس)

زہے وحدت وہی دیر و حرم میں جلوہ آرا ہے — ازل سے محو ہوں جن کے جمال حیرت افزا کا

جوشش وحشت ہے کہیں زیر زمیں بھی یارب — خاک سے گل جو ہر اک چاک گریباں نکلا

جب کعبہ سے بتخانہ میں آیا ہوں میں آزاد — جلوے مجھے واللہ نظر آئے ہیں کیا کیا

جب مصیبت آ پڑی جز صبر بن آنا نہیں، — تو گرفتار قفس پھڑکا پھڑک کر رہ گیا

سوزش دل نے الٰہی کون سی کی تھی کمی — جو جلانے کو مرے دردِ جگر پیدا ہوا

(الگزینڈر ہیڈلی آزاد)

چھپا ہم سے مگر چھپنا نہ جانا — بتا ہم نے تجھے کس جا نہ پایا

دل میں پنہاں رکھا بتوں کا عشق — ہم نے اللہ کا بھی ڈر نہ کیا

ہم نے راہِ الفت میں کیا کہیں کہ کیا پایا — آپ کو مٹا بیٹھے جب ترا پتہ پایا

جب حقیقت کھلی تری دل پر — دیر و کعبہ سے مدعا نہ رہا

کیا بھروسہ ہے ایک دم کا فتا — کوئی دم ہے، رہا رہا نہ رہا

جبہ سائی کی ہوئی ہے مجھے عادت ایسی — جھک ہی جاتا ہے دریا پہ سر آپ سے آپ

تمھاری بے وفائی بھی وفا ہے — تمھیں زیبا ہیں سب طرزیں جفا کی

اس حیا کا بھی ٹھکانا ہے کہ اللہ اللہ — تو خانۂ دل میں بھی وہ شوخ نہاں رہے

(جرنل جوزف فسلی فتا)

اگر کیف اندوز ہونا ہے تو ناظرین اصل کتاب ملاحظہ فرمائیں جو انگریزی میں ہے، جگہ جگہ شعرا کے فوٹو بھی دئے گئے ہیں جس سے کتاب میں صوری و معنوی دونوں حسن پیدا ہو گئے ہیں۔

کتاب کے شروع میں سر تیج بہادر سپرو کے فاضلانہ قلم سے نکلا ہوا دیباچہ مع ان کی تصویر شامل ہے، فاضل مصنف کی تصویر بھی ہے، اصلی تذکرہ بزبان انگریزی ۱۰۱ صفحات تک چلا گیا ہے، اس کے بعد شعرا کے کلام کا انتخاب درج کیا گیا ہے جو ۲۰۰ صفحات میں پھیلا ہوا ہے، فاضل مصنف نے ان شاعروں کے کلام کا انتخاب ہی درج نہیں فرمایا ہے، بلکہ بعض بعض حضرات کی نثر کا نمونہ بھی درج کیا ہے جس سے یہ کتاب بوجہ احسن مکمل ہو گئی ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ شعرا کے کلام میں کہیں کہیں کتابت کی غلطی رہ گئی ہے جو امید ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں دور ہو جائیگی، یہ کتاب یونیورسٹیوں کے کورس اور تمام پبلک اور پرائیویٹ کتب خانوں میں جگہ پانے کی مستحق ہے۔

قیمت [illegible] روپیہ — ملنے کا پتہ: [illegible] پریس لکھنؤ

معاہدہ ہند و برطانیہ

اس کتاب کا مطلب یہ ہے کہ اگر برطانیہ ہندوستان کو آزاد و خودمختار کردے تب بھی ہندوستان ایک مدت تک اپنے پاؤں پر آپ کھڑا نہیں ہوسکتا، اس لئے اسے مجبوراً برطانیہ سے دوستانہ معاہدہ کرکے بہت دنوں برطانیہ ہی کے زیر سایہ اپنی حالت درست اور مضبوط کرنی پڑیگی۔ یہ کتاب اس خاص موضوع پر آنریبل سر سلطان احمد کے، سی ایس آئی، ڈی ایل، بار ایٹ لا ممبر محکمہ اطلاعات و ریڈیو حکومت ہند نے نہایت فاضلانہ اور بہت کچھ سوچ سمجھ کر لکھی ہے جو یقیناً اردو ادب میں ایک خاص اضافہ ہے۔

ہندوستان کی آزادی و خودمختاری کے لئے ہر طرف سے مطالبہ کیا جارہا ہے۔ اگر ہندوستان کی یہ خواہش پوری ہوجائے یعنی وہ برطانیہ کے سیاسی چنگل سے مخلصی پاجائے، پھر بھی دو اہم سوالات سامنے آتے ہیں یعنی (۱) اب تک ہندوستان کو بیرونی حملہ کا خطرہ شمال مغربی سرحد کی طرف سے تھا جس کی روک تھام کیلئے ہندوستان کافی قلعہ بندیاں کرچکا تھا اور ایک خاص فوج بھی سرحد پر تعینات رکھتا تھا لیکن اپھل پر جاپانیوں کے حملہ نے یہ ثابت کردیا ہے کہ ہندوستان کی شمالی مشرقی سرحد بھی محفوظ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ظاہر ہوچکا ہے کہ ہندوستان ہوائی اور سمندروں حملوں سے بھی محفوظ نہیں ہے لہذا اپنی ڈیفنس کو مکمل کرنے کے لئے ہندوستان کو اپنی بری، بحری اور ہوائی طاقت بڑھانی پڑیگی جو معمولی اور آسان کام نہیں ہے (۲) ہندوستان کی مشرقی سرحد آسام سے نہیں بلکہ برہما کی ریاستہائے شان سے اور جنوب مشرق میں ہند چینی سے شروع ہوتی ہے اسی طرح جنگ میں جرمنوں نے ایران، عراق اور شام میں جو ریشہ دوانیاں کی تھیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کی مغربی سرحد افغانستان یا بلوچستان سے نہیں بلکہ ممالک مشرق وسطیٰ سے شروع ہوتی ہے (۲) آزاد و خودمختار ہونے کے بعد ہندوستان اپنے خاص اور اہم جغرافیائی محل وقوع کے باعث نہر سوئز سے لیکر ہند چینی تک تمام جنوبی ایشیا میں قیام امن و امان کا ذمہ دار ہوگا ایسی صورت میں ہندوستان کے تعلقات دنیا کے دوسرے ملکوں سے کیا ہوں گے؟ ان دونوں مسائل پر فاضل مصنف نے اس کتاب میں خوب سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کتاب کا وہ حصہ خاص طور پر قابل مطالعہ ہے جس میں فاضل مصنف نے "ہندو مسلم تعلقات" اور "پاکستان" پر بحث کی ہے۔

جو حضرات ہندوستان کے مستقبل اور اسکی آئندہ ضرورتوں سے خاص تعلق خاطر رکھتے ہیں وہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ فرمائیں۔

لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ، فاضل مصنف کا فوٹو شامل۔ جلد انگریزی، ضخامت ڈیڑھ سو صفحات، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ)

ملنے کا پتہ:۔ نگارستان ایجنسی اردو بازار دہلی۔

اسرار حیات

حیات انسانی کے متعلق اندھرا دیش کے صوفی ویما صاحب کے جو تخیلات تھے وہ اس کتاب میں مسٹر ایشور داس پانڈے کامل جامعہ عثمانیہ حیدرآباد نے یکجائی صورت میں پیش کردئے ہیں۔ ویما شاعر تھا اور جو کچھ کہتا تھا وہ کبیر صاحب یا گرو نانک وغیرہ

کی طرح اشعار میں کہتا تھا۔ انھیں اشعار سے جو اندھرا ولیش میں بچہ بچہ کی زبان پر ہیں فاضل مؤلف نے حقایق زندگی کے متعلق اخذ کرلیا ہے، ویما صوفی اور ایک خدا پرست بزرگ تھے۔ مذہب کے بارہ میں ان کے مندرجہ ذیل خیالات سے استفادہ لیا جاسکتا ہے،۔

تہذیب انسانی میں مذہب کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اگر انسان میں مذہبی تہذیب کا فقدان ہو تو وہ کبھی درجۂ کمال کو نہیں پہونچ سکتا کیونکہ انسانیت مذہب کے بغیر نشو و نما نہیں پا سکتی۔ مذہب اور انسانیت لازم و ملزوم چیزیں ہیں، لیکن فرقہ وارانہ زندگی اور فرقہ وارانہ طرز تخیل کا نام مذہب نہیں ہے۔ مذہب ایک عالمگیر طاقت ہے جو انسانوں کی ہم جنسیت اور ان کی یکتائی پر، بالحاظ ملک، نسل، فرقہ، ذات یا قبیلہ اثر انداز ہوتی ہے اور سب انسانوں کو ایک رشتہ میں جوڑتی ہے، کیونکہ بقول حضرت سعدی شیرازیؒ ؎

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند
کہ در آفرینش ز یک جوہر اند

انسان کی تہذیب مذہب ہے اور مذہب کا اہم ترین اصول خدا پرستی ہے جو انسانوں کو انسان بناتی ہے تمام مذاہب کا بنیادی اصول ایک ہے جس کا تعلق خدا کی ذات اور اس کی پرستش سے ہے، مذاہب عالم میں جو فرق ہے وہ بنیادی یا اساسی نہیں ہے۔ عوام نے مذہب کے مفہوم کو اس کے ظاہری روپ میں سمجھا اور اسی ظاہری مذہب کو مذہب پرستی یا مذہبیت کے نام سے موسوم کیا۔ اسی ظاہر پرستی نے آپس میں نفرت و نفاق کی خلیجیں حائل کر دیں لیکن جو لوگ جاننے اور سمجھنے والے ہیں ان کے نزدیک ہر مذہب میں روح ایک ہی ہے۔

ویما ترک دنیا یا رہبانیت کا قائل نہیں ہے، وہ کہتا ہے:۔

• لوگ نجات حاصل کرنا نہیں جانتے، وہ ریاضتہائے شاقہ کی آگ میں اپنے جسم کو جھونکتے ہیں، وہ واقعی حقیقت سے بے خبر ہیں۔

ویما کے نزدیک انسان رسم پرستی میں پھنس کر اسی کو خدا پرستی اور مذہب سمجھنے لگتا ہے، حالانکہ رسم پرستی اور خدا پرستی میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کہ دن اور رات میں ہے۔

ویما کے نزدیک تیرتھ جاترا کرنے سے انسان کے گناہ نہیں دھلتے بلکہ فضول کی تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے ویما مورتی پوجن کا بھی قائل نہیں ہے۔

مزید استفادہ کے لئے پوری کتاب کا مطالعہ فرمایئے۔

لکھائی چھپائی، کاغذ سب عمدہ، ضخامت ۷۰ صفحات، قیمت کتاب پر درج نہیں ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ حیدرآباد دکن اکاڈمی۔

شب تاب

یہ کتاب جناب مسٹر اسرار الحق مجاز بی۔اے کی بلند پایہ نظموں، رنگین غزلوں اور دلچسپ قطعات کا ایک قابل قدر مجموعہ ہے، اقلیم سخن میں مجاز کسی تعریف و تعارف کے محتاج نہیں ہیں، ان کا پہلا مجموعۂ کلام "آہنگ" منظر عام پر آتے ہی دلدادگان شعر و شاعری اور نقادانِ سخن و سخنوری سے بہت کافی خراج تحسین و داد لے چکا تھا۔ نوجوان مجاز کے کلام میں عموماً تین چیزوں کا امتزاج پایا جاتا ہے، نغمہ، مئے و شمشیر۔ ان کے نغمات کے زیر و بم نہایت خوش آہنگ اور خوش آیند ہوتے ہیں، انکی شراب تند بھی ہے اور رنگین بھی، لیکن انکی شمشیر ابھی کند بھی ہے اور بیکار بھی، ممکن ہے کہ آگے چل کر اس شمشیر پر نئی باڑھ چڑھ جائے، نئی صیقل ہو اور وہ لچک لچک کے میدان عمل میں کام دینے لگے، لیکن ابھی ؎

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

بہر حال ہمارے نوجوان شاعر کا نغمہ نہایت روح پرور اور اس کی شراب نہایت نشاط آور ہے، اور ان دونوں چیزوں کو انھوں نے اپنے کلام میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ سمو دیا ہے، اور واقعی مجاز کی یہ بات صحیح ہے کہ ؎

موجزن ہے مئے عشرت مرے پیمانوں میں
یاس کا درد ہے کثرت مرے افسانوں میں
کامرانی ہے پرافشاں مرے رومانوں میں
یاس کی سعیِ جنوں خیز پہ خنداں ہوں میں

مرے افکار میں مہتاب کی طلعت غلطاں
میری گفتار میں ہے صبح کی نزہت غلطاں
میرے اشعار میں ہے پھولوں کی نکہت غلطاں
روح گلزار ہوں میں، جانِ گلستاں ہوں میں

کسی گل نورس کے رنگ و بو، نفاست و صباحت، دلکشی و لطافت کا تجزیہ کرنا اس پھول کی توہین و تذلیل ہے اسی طرح اچھے کلام کی اوبیانہ وضاحت و تشریح کرنے بیٹھنا بھی گویا اس کلام پر عمل جراحی کرنا ہے اس لئے اگر ناظرین مجاز کے کلام سے بخوبی لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں تو "شب تاب" کا مطالعہ فرمائیں، کتاب کے شروع میں فیض احمد صاحب فیض اور سید سجاد ظہیر صاحب کے تبصرہ شامل ہیں، مجاز صاحب کے حلیہ کا ایک قلمی خاکہ بھی کتاب کی زیب و زینت ہے۔

لکھائی، چھپائی، کاغذ عمدہ، گرد پوش رنگین و مصور، جلد انگریزی، ضخامت ۲۱۴ صفحات۔

قیمت سوا روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔

ادارۂ ہندوستانی پبلشرز دہلی

دُکھیا دیس

یہ اسم با مسمیٰ کتاب مسٹر موٹلا رام کوٹی کے اٹھارہ نہایت دلچسپ، سبق آموز، نصیحت آمیز و عبرت انگیز افسانوں کا ایک دلپذیر مجموعہ ہے، جس کا ہر افسانہ ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر دلچسپ، جگر گداز اور عبرت آفریں ہے، موٹلا رام کوٹی نے یہ افسانے ریاست کشمیر کے حالات و واقعات دیکھ کر لکھے ہیں۔ افسانے نہیں ہیں خون کے آنسو ہیں، جن میں دکھایا گیا ہے کہ ریاست کے ملازم (عموماً سب انسپکٹر، ڈاکٹر، تحصیلدار، رینجر اور ابریشم افسران) نیز وہاں کے زمیندار، جاگیردار، ذیلدار، چوکیدار وغیرہ دیہات کی بھولی بھالی اور غریب رعایا پر کس قدر بے پناہ مظالم توڑتے ہیں حتیٰ کہ اپنے بے پناہ اختیارات کے زعم میں دیہات کی عورتوں اور لڑکیوں کی عصمت دری کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ فاضل مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ اسقدر مؤثر ہے کہ آنکھوں کی راہ سے فوراً دل میں اُتر جاتا ہے اور دل کو گھنٹوں بیقرار و پریشان رکھتا ہے، صرف ایک افسانہ "انتظار" کے سوا تمام افسانے چھوٹے چھوٹے ہیں جن کے پڑھنے سے دل نہیں گھبراتا۔ کاش حکومت کشمیر بھی ان افسانوں کا مطالعہ کرے اور ان بے پناہ مظالم کی انسداد پر آمادہ ہو جائے جو ریاست کے عہدیدار غریب دیہاتیوں پر توڑتے ہیں، ہمارے نزدیک یہ تمام افسانے "ٹکسالی" ہیں، مگر افسوس کہ ان کی زبان "ٹکسال باہر" ہے، کاتب صاحب نے بھی بہت کچھ عنایت فرمائی ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ رسمی، جلد انگریزی، ضخامت ۱۷۰ صفحات، قیمت دو روپیہ، ملنے کا پتہ۔ گیان چند مالک مکتبۂ چاند جموں۔

رہنمائے تعلیم لاہور تپ دق نمبر

رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور ملک کا پرانا اور مشہور رسالہ ہے جو ملک و قوم کی بہترین تعلیمی، علمی و ادبی خدمات انجام دے رہا ہے، زیر نظر پرچہ رسالہ مذکور کا سالانہ نمبر ہے جس میں تپ دق و سل جیسے مہلک اور تقریباً لا علاج امراض کے انسداد و معالجہ پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے۔ یہ ضخیم نمبر، مضامین نظم و نثر کا حامل ہے، جو اچھے اچھے اہل قلم کی دماغی کاوشوں کے رہین منت ہیں جن میں دق و سل کی نوعیت، علامات، اسباب، تدریجی ترقی، انسداد، تدابیر، تقدم بالحفظ اور معالجات پر نظم و نثر میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے، اگر رسالہ کی مندرجہ ہدایات، تدابیر و تجاویز پر عمل درآمد کیا جا سکے تو یہ مہلک امراض بڑی حد تک دور ہو سکتے ہیں۔ تنوع کے لئے جگہ جگہ افسانے بھی شامل کر دیئے گئے ہیں اور موقعہ بموقعہ تصاویر بھی دی گئی ہیں جن سے رسالہ کی صوری و معنوی خوبیوں میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس نمبر کا مطالعہ ہر شخص کے لئے ضروری ہے۔ یہ خاص نمبر شائع کر کے واقعی ادارہ رہنمائے تعلیم نے ملک و قوم کی اچھی خدمت انجام دی ہے۔

اس نمبر کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف انھیں امراض دق و سل کے متعلق روشنی ڈالنے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے جو انسانوں کو لاحق ہوتے ہیں، بلکہ ان مہلک اور جان لیوا امراض کی ان قسموں پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے جو ہمارے مویشیوں کو لاحق ہوتی ہیں اس خاص موضوع پر محکمہ اطلاعات پنجاب کا شائع کردہ مضمون بہت مفید اور قابل قدر ہے۔

لکھائی چھپائی کاغذ پسندیدہ، ضخامت ۳۵۲ صفحات، تصاویر فوٹو بلاک کی اور اکثر رنگین ہیں۔ قیمت دو روپیہ ۔۔۔ ملنے کا پتہ۔ مینیجر رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور

رفتارِ زمانہ

زمانہ اس قدر تیز رفتاری کے ساتھ گزر رہا ہے کہ دنیا دو دن میں کہیں سے کہیں پہونچ جاتی ہے۔ کل جو طاقتیں ایک دوسرے کی حلیف و مددگار تھیں اور سب مل کر محوری طاقتوں کو شکست دینے کے لیے مصروف پیکار تھیں آج وہی طاقتیں ایک دوسرے کی رقیب بن گئی ہیں۔ کل جو طاقتیں دنیا کی آزادی اور امن و صلح کے لئے کبھی اٹلانٹک چارٹر کا اعلان کرتی تھیں، کبھی سان فرانسسکو میں بیٹھکر عالمگیر امن و صلح کی کوششوں کا ڈھونگ رچا رہی تھیں آج وہی طاقتیں اپنے تمام وعدوں اور اپنے تمام اعلان کردہ ارادوں کو پس پشت ڈال کر اپنی اپنی سلطنتوں کی توسیع و استحکام کی کوششوں میں مصروف ہیں، اپنے اپنے حلقہ ہائے اثر و اقتدار قائم کئے جا رہے ہیں، توازن قوت کے لئے چالیں چلی جا رہی ہیں، الغرض دنیا جنگ کی بھڑکتی ہوئی آگ سے نکل کر "پاور پالٹکس" کے دہکتے ہوئے تنور میں جا پڑی ہے۔ ذیل میں جو واقعات ہم درج کریں گے، ان کے مطالعہ سے ناظرین زمانہ پر "پاور پالٹکس" کی تمام چالیں اور گھاتیں خود بخود آئینہ ہو جائیں گی۔

جاپان | جاپان کے ہار مانتے ہی تمام جاپان پر امریکہ نے بلا شرکت غیرے قبضہ کر لیا ہے اور اب اس کا یہ دعویٰ ہے کہ بحرالکاہل کے جزیروں (باستثناء انڈونیشیا) اور جاپان کی طرف کوئی نظر اٹھا کر نہ دیکھے کیونکہ بحرالکاہل کے تمام جزیرے اور جاپان امریکہ کے حلقۂ اثر و اقتدار میں داخل ہیں۔ امریکنوں نے جاپان کی تمام سیاسی و اقتصادی زندگی خاک میں ملا دی ہے، تمام بڑی بڑی جاپانی حرفتوں کا خاتمہ کر دیا ہے، جاپانی لیڈروں کو بحیثیت مجرمین جنگ گرفتار کر کے مقدمات چلائے جا رہے ہیں اور سزائیں دے کر انتقام لیا جا رہا ہے، حتیٰ کہ اب اس بات کی بھی کوشش ہو رہی ہے کہ شہنشاہ جاپان ہیرو ہیتو پر دباؤ ڈالکر اسے تخت و تاج سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا جائے اور اس کے بجائے اس کے کمسن ولیعہد کو کٹھ پتلی بنا کر تخت پر بٹھا دیا جائے۔

روس کا مطالبہ ہے کہ جاپان پر تن تنہا امریکہ کا قبضہ نہیں ہونا چاہیے، بلکہ ایک اتحادی کمیشن کے سپرد جاپان کا انتظام کیا جائے۔ اب سُنا گیا ہے کہ روس کو بھی اپنی کچھ فوج جاپان میں رکھنے کی اجازت دیدی گئی ہے۔

شمالی چین | جب امریکہ نے بلا شرکت غیرے تمام جاپان پر قبضہ کر لیا تو اس کا جواب روس نے یہ دیا کہ اس نے کوریا اور شمالی چین پر قبضہ کر لیا اور چین کی مرکزی گورنمنٹ سے معاہدہ کر کے بیرونی منگولیا کو آزاد کرا لیا، جسے درحقیقت اب روس میں ہی داخل سمجھنا چاہیئے۔

روس نے چین سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ جاپان کے ہتھیار ڈال دینے سے تین مہینہ بعد منچوریا خالی کر دیگا، لیکن جب روس نے دیکھا کہ چین میں اینگلو سیکسن یعنی برطانیہ و امریکہ کے منصوبے کچھ اور ہی ہیں اور وہ چین میں خانہ جنگی کی آگ بھڑکا کر اسے اتنا کمزور اور بے بس کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ بلا مزاحمت برطانیہ و امریکہ کی جہانگیریت پرستیوں کا مرکز یعنی نو آبادی بن جائے

اور روس نے یہ بھی دیکھا کہ امریکہ جنرل چیانگ کائی شیک کو مدد دیکر چینی کمیونسٹوں سے لڑا رہا ہے اور امریکہ کی کافی فوج شمالی چین میں پہونچ گئی ہے تو روس نے فوراً کروٹ بدلی اور چین سے مطالبہ کر دیا کہ

(۱) منچوریا کے علاوہ انشان میں جو لوہے اور کوئلے کی کانیں ہیں، انھیں روس و چین کی مشترکہ ملکیت قرار دیا جائے، انھیں دونوں مل کر چلائیں۔

(۲) دریائے شونگری میں روس کو جہاز رانی کے پورے حقوق دئے جائیں۔

(۳) منچوریا کے جن کارخانوں میں بزمانۂ جنگ اسلحہ اور سامان جنگ تیار ہوتا تھا وہ روس و چین کی مشترکہ ملکیت قرار دیئے جائیں۔

(۴) منچوریا میں وہاں کی کٹھ پتلی گورنمنٹ یا جاپانیوں نے جو برقی کارخانے قائم کئے تھے وہ روس و چین کی مشترکہ ملکیت قرار دئے جائیں اور دونوں مل کر انھیں چلائیں۔

ان مطالبات میں "مشترکہ ملکیت" کا جملہ خاص اہمیت رکھتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ منچوریا پر روس کا قبضہ و تسلط ہمیشہ قائم رہے گا۔

اسی سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ شمالی چین پر کمیونسٹ چینیوں کا اثر و اقتدار ہے جنھیں امریکہ روس کا آلۂ کار سمجھ کر مٹا دینا چاہتا ہے۔ اور اسی وجہ سے امریکہ کمیونسٹوں کے خلاف چیانگ کی مدد کر رہا ہے اور اسی واسطے شمالی چین میں کچھ امریکن فوج بھی موجود ہے، الغرض چین کی خانہ جنگی اینگلو سیکسن امپریلزم کا ایک کرشمہ نظر آتا ہے۔

<u>جنوب مشرقی ایشیا</u> جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک خصوصاً ہند چینی اور انڈونیشیا میں حریت و آزادی کی تحریک شد و مد سے جاری ہے، جب جاپانیوں نے اتحادیوں کے سامنے ہار مان کر ہتھیار ڈالے تو ہند چینی اور انڈونیشیا کے وطن دوستوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور اتحادیوں کا قبضہ ہونے سے پہلے ہی حکومت کے تمام شعبوں اور تمام اداروں پر قبضہ کر کے اپنی قومی حکومت قائم کر لی۔ ایک بہت بڑی قومی فوج بھرتی کی اور جو اسلحہ اور سامان جنگ انھیں جاپانیوں سے ملا تھا اس سے اپنی قومی فوج کو مسلح کر لیا، ہند چینی میں انامیوں اور انڈونیشیا میں اہل جاوا نے فرانسیسیوں اور ولندیزیوں کے قبضہ و تسلط کی مزاحمت کی چنانچہ آج تک جنوب مشرقی ایشیا میں یہ جنگ آزادی جاری ہے، چونکہ فرانس اور ہالینڈ میں جرمنوں کے ہاتھوں شکست کھانے اور تباہ و برباد ہونے کے بعد اتنی کافی طاقت نہیں تھی کہ وہ اپنی سابق نوآبادیوں (ہند چینی اور انڈونیشیا) پر از سر نو اپنا قبضہ و تسلط جما سکتے۔ اس لئے دولت برطانیہ نے جو خود سب سے بڑی امپیریلسٹ ہے اپنے دوسرے امپیریلسٹ حلیفوں (فرانس و ہالینڈ) کی حمایت کی اور اپنی فوجوں سے جن میں زیادہ تر ہندوستانی ہیں ہند چینی اور انڈونیشیا کے قوم پرستوں کو خاک و خون میں ملانا شروع کر دیا جس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے اور باوجود تمام دنیا اس بر طانوی حرکت کی مذمت کر رہی ہے لیکن برطانیہ نے ابھی تک کوئی پروا نہیں کی اور جنگ کا سلسلہ ہنوز

رہی ہے، ممکن ہے کہ برطانیہ نے کوئی خفیہ سمجھوتہ کرلیا ہو، لیکن بظاہر فرانس و ہالینڈ کا ساتھ اس غرض سے دیا جارہا ہے کہ وہ
لی یوروپ میں روس کے خلاف بلاک میں شامل ہیں۔

دستان| ہندوستان میں لارڈ ویول کے اعلان کے بعد الکشن لڑے جارہے ہیں۔ مرکزی اسمبلی کے الکشن ختم ہوگئے
۔ اس اسمبلی میں ۱۴۲ نشستیں ہیں، جن میں سے ۱۰۲ منتخب اور ۴۰ نامزد شدہ ممبروں کی ہیں۔ اب تک منجملہ ۱۰۲ نشستوں
۱۰ کا نتیجہ معلوم ہوگیا ہے، جن میں ۳۰ مسلم لیگ، آٹھ یوروپین، دو اکالی سکھ اور پانچ انڈیپینڈنٹ (پانچوں زمیندار) اور
بلسب کانگریسی ہیں۔ ۴۰ ممبر سرکاری وغیر سرکاری حکومت کے نامزد کردہ ہوں گے، جن میں آٹھ یوروپینوں کو بھی شامل کیا جاسکتا
۔ اس طرح مرکزی اسمبلی میں گورنمنٹ کی طاقت زیادہ سے زیادہ ۸۴ ہوگی جس کے مقابلہ میں اپوزیشن یعنی کانگریس کی طاقت
قریباً ۶۰ ہوگی۔ اس طرح حکومت کو ہمیشہ شکستوں کا سامنا رہیگا۔ اور اگر مسلم لیگ نے بھی پیشتر کی طرح کانگریس کا ساتھ دیا تو ان
دونوں کا مقابلہ ناممکن ہوگا۔

صوبجاتی اسمبلیوں کے الکشنوں کی ابھی تیاریاں ہورہی ہیں، کانگریسی، مہا سبھائی، مسلم لیگی اور نیشلسٹ مسلم اُمیدواروں
ابلہ ہوگا، دیکھئے میدان کس کے ہاتھ رہتا ہے، عام خیال یہ ہے کہ مرکزی اسمبلی کے الکشن کی طرح صوبجاتی اسمبلیوں میں بھی
ریسی اور مسلم لیگی امیدواروں کی اکثریت رہیگی۔

ہندوستان کے واقعات میں ایک بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اوائل ماہ دسمبر ۱۹۴۵ء میں بمقام کلکتہ گورنر بنگال مسٹر کیسی
ور بڑے بڑے کانگریسی لیڈروں، نیز لارڈ ویول اور مہاتما گاندھی میں خوب ملاقاتیں ہوئیں، باتیں خوشگوار اور ماحول ساز گار تھا۔
ن لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ کانگریس اور نمایندگان تاج برطانیہ میں سمجھوتہ یا "التوائے جنگ" ہوگیا ہے، کانگریس نے وعدہ
لیا ہے کہ وہ فی الحال یعنی الکشنوں کے ختم ہونے تک کوئی تخریبی تحریک نہیں چلائیگی۔ اسی کے ساتھ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی
نے اہنسا کے ریزولیوشن کا پھر اعادہ کردیا ہے۔

ہندوستان کے متعلق ایک بیان وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس نے دارالامراء میں اور اس کے بعد ۱۰ دسمبر کو لارڈ ویول نے
ئی اینڈ چیمبر آف کامرس کلکتہ کے سالانہ اجلاس میں دیا جس میں اس بات کا اعادہ کیا گیا کہ حکومت برطانیہ اور برطانوی قوم نیک
، اور سچے دل سے یہ چاہتی ہیں کہ ہندوستان کو سلف گورنمنٹ مل جائے اور اہل ہند اپنے ملک میں اپنی مرضی کے مطابق حکومت
کومتیں" قائم کرلیں، اس کام کو مشکل بتایا گیا اور ہندوستانی لیڈروں سے تعاون کی اپیل کی گئی، اس کے علاوہ طاقتان سرکار کی تھی کی
حکومت ان کا ساتھ دیگی۔

الغرض ان بیانات میں کوئی نئی بات نہیں تھی، وہی پرانی باتیں تھیں جو بار بار کہی جاچکی ہیں لیکن آج تک پوری نہیں
ئی، البتہ ایک بات ضرور نئی تھی، یعنی لارڈ ویول نے اپنی تقریر میں یہ الفاظ استعمال کئے تھے کہ "حکومت برطانیہ اور برطانوی
نیک نیتی اور سچے دل سے یہ چاہتی ہیں کہ اہل ہند اپنے ملک میں اپنی مرضی کے مطابق حکومت یا حکومتیں قائم کرلیں" نیشلسٹ

خیال کے ہندوستانیوں کو یہ اندیشہ ہے کہ اس " حکومتیں " میں وائسرائے نے پاکستان کی طرف اشارہ کیا ہے اور اسکی تصدیق اس بیان سے ہوتی ہے جو مسٹر جناح نے وائسرائے کے بیان پر دیا تھا۔

سیام سیام کے بارہ میں جو ہند چینی اور برما کے درمیان ایک آزاد و خود مختار ملک ہے، ابھی تک بیرونی دنیا کو کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے لیکن اب یونائیٹڈ پریس آف امریکہ کے نامہ نگار خصوصی مقیم بنکاک، پایۂ تخت سیام کے ایک مراسلہ سے معلوم ہوا ہے کہ برطانیہ سیام کو کھاجانا چاہتا ہے۔ نامہ نگار مذکور نے لکھا ہے کہ جاپانیوں کے ہتھیار ڈال دینے کے بعد برطانیہ نے سیام کے سامنے اکیس ۲۱ مطالبات اس قدر سخت، اس قدر فوری اور اس قدر جابرانہ پیش کئے ہیں کہ اگر سیام کے ارباب حل و عقد ان مطالبات کو قبول و منظور کرلیں گے تو سیام پر برطانیہ کی پروٹکٹوریٹ (حمایت و حفاظت) قائم ہوجائیگی اور سیام کی تمام آزادی و خود مختاری سلب ہو کر وہ ہمیشہ کے لئے برطانیہ کا غلام بن جائیگا۔ نامہ نگار لکھتا ہے کہ برطانوی مطالبات میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

(۱) جب تک سیام کو متحدہ اقوام میں شامل کیا جائے اس وقت تک سیام پر برطانوی حکومت رہیگی۔

(۲) سیام کے تمام بنکوں، کاروبار، غیر ملکی تبادلہ اور تجارتی معاملات پر برطانوی کنٹرول رہیگا۔

(۳) جب تک دنیا میں غلّہ کی قلت ہے سیام اپنا تمام فاضل چاول برطانیہ کو دیگا۔

(۴) سیام کے پریس ریڈیو، تار اور ٹیلیفون پر برطانوی کنٹرول رہیگا۔

(۵) جب تک اتحادی فوجیں سرزمین سیام میں رہیں گی ان کے تمام مصارف سیام کو ادا کرنے پڑیں گے۔

(۶) جنگ کے زمانہ میں تمام اتحادی مال و جائداد جو تباہ و برباد کی گئی ہے اس کا تاوان و معاوضہ سیام کو دینا پڑیگا۔

(۷) ۷ دسمبر ۱۹۴۱ء سے پیشتر جتنے معاہدے برطانیہ اور دوسری اقوام میں ہوئے تھے خواہ ان میں سیام براہ راست شریک رہا ہو یا نہ رہا ہو ان سب کا پابند سیام کو رہنا پڑے گا۔

ظاہر ہے کہ اگر یہ مطالبات منظور کرلئے گئے تو سیام کے پاس باقی ہی کیا رہ جائیگا مگر اب معلوم ہوا ہے کہ امریکہ برطانوی مطالبات کے خلاف ہے اور وہ سیام کی آزادی و خود مختاری سلب کرنا نہیں چاہتا۔ چنانچہ امریکہ کے دفتر خارجیہ نے برطانیہ و سیام دونوں کو ایک نوٹ بھیجکر تنبیہ کر دی ہے کہ ابھی سیام کا معاملہ امریکہ کے زیر غور ہے اس لئے ابھی کسی معاہدہ پر دستخط نہ کئے جائیں۔ دیکھئے سیام کی جان بچتی ہے کہ نہیں۔

مصر مصر میں آزادی و خود مختاری کی تحریک خوب زور شور سے جاری ہے، نہ صرف مصر کی پبلک بلکہ گورنمنٹ نے بھی برطانیہ سے درخواست کی ہے کہ ۱۹۳۶ء میں مصر اور برطانیہ کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس پر نظر ثانی کی جائے، برطانوی فوجیں جلد مصر سے ہٹالی جائیں۔ اور سوڈان مصر کے حوالہ کیا جائے۔ ان مطالبات کے ساتھ مصر میں آئے دن عام مظاہرے ہوتے رہتے ہیں، لیکن حکومت برطانیہ نے ابھی تک خاموشی سے کام لیا ہے اور مصری مطالبات کا کوئی جواب نہیں دیا ہے، مصطفےٰ نحاس

پاشا پر جو مصر کے سب سے بڑے اور ہر دلعزیز لیڈر ہیں، بعض دشمنوں نے بم پھینکا تھا مگر وہ اس سے بال بال بچ گئے چند عورتیں جو اس وقت وہاں سے گزر رہی تھیں، البتہ زخمی ہوئی تھیں۔

فلسطین | فلسطین کا معاملہ ہنوز کھٹائی میں پڑا ہوا ہے، یہودی فتنہ پرداز روز کچھ نہ کچھ گڑبڑ کرتے رہتے ہیں، اگرچہ سرکاری اجازت سے فلسطین میں یہودیوں کا داخلہ ابھی بند ہے لیکن یہودی چھپ چھپا کر ناجائز طور سے داخل ہوتے رہتے ہیں اور جب پولیس یا فوج ان ناجائز طور سے آنیوالے یہودیوں کی گرفتاری کے لئے جاتی ہے تو یہودی نوجوان مسلح ہو کر مقابلہ کرتے ہیں۔ امریکہ یہودیوں کے داخلہ فلسطین کا کھلم کھلا حامی ہے چنانچہ پچھلے دنوں پریسیڈنٹ ٹرومین نے اپنے ایک خط کے ذریعہ حکومت برطانیہ سے درخواست کی تھی کہ وہ فلسطین میں ایک لاکھ یہودیوں کو داخل ہونے کی اجازت دیدے، اس کے علاوہ امریکن سینیٹ نے ریزولیوشن پاس کر کے مطالبہ کیا ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کو داخل ہونیکی پوری آزادی حاصل ہونا چاہیئے، فلسطین کے بارہ میں اب یہ طے ہوا ہے کہ اس کے مسئلہ کا فیصلہ امریکہ و برطانیہ دونوں مل کر کریں گے، اس مقصد کے لئے چھ انگریزوں اور چھ امریکنوں پر مشتمل ایک کمیٹی، جنوری ۱۹۴۶ء سے فلسطین کے معاملہ کی تحقیقات کر کے اپنی رپورٹ پیش کریگی، برطانیہ و امریکہ کی حکومتیں اس رپورٹ پر غور و خوض کر کے آخری فیصلہ کریں گی، بہرحال یہ صاف ظاہر ہے کہ آخری فیصلہ یہودیوں کے موافق ہوگا۔ اسی خیال سے عرب لیگ نے مایوس ہو کر یہ عملی قدم اٹھایا ہے کہ فلسطین کے یہودیوں کا بائیکاٹ کر دیا ہے اور فلسطین کے یہودیوں پر یکم جنوری ۱۹۴۶ء سے حسب ذیل پابندیاں عائد کر دی ہیں:۔

(۱) کسی عرب ریاست کا جو عرب لیگ میں شریک ہے کوئی شخص یکم جنوری ۱۹۴۶ء سے فلسطین کے یہودی کارخانوں کا کوئی مال درآمد نہیں کریگا اور نہ اس کام کے لئے کسی شخص کو حکومت کی طرف سے لائسنس دیا جائیگا۔ اس حکم کی خلاف ورزی کرنے والے کو عبرتناک سزا دی جائے گی۔

(۲) یکم جنوری ۱۹۴۶ء سے فلسطین کے کسی یہودی کو جس میں مرد، عورتیں، بچے سبھی شامل ہیں کسی عرب ریاست میں داخل ہونے یا سفر کرنے کی اجازت نہیں دی جائیگی۔ اور نہ اس مقصد کیلئے کسی یہودی کو پاسپورٹ (پروانہ راہداری) دیا جائیگا۔

(۳) عرب کارخانوں کی امداد و اعانت کے لئے ایک مشترکہ فنڈ کھول دیا گیا ہے جس کی مدد سے عرب کارخانے یہودی کارخانوں کا مقابلہ کریں گے۔

شام و لبنان | شام و لبنان کے بارہ میں برطانیہ و فرانس کے درمیان ایک نیا معاہدہ ہوا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشرق وسطیٰ کی ان چھوٹی چھوٹی اور کمزور ریاستوں کے سر پر ایک کے بجائے دو دو یعنی برطانوی و فرانسیسی امپیریلزم مسلط رہا کریں گے۔ اس معاہدہ کی شرطیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) یہ بات آپس میں صلاح و مشورہ کر کے طے کی جائیگی کہ شام و لبنان میں فوجیں کہاں کہاں رکھی جائیں اور کہاں کہاں سے ہٹالی جائیں۔

(۳) مشرق [illegible] بارہ میں برطانوی و فرانسیسی پالیسیوں میں گہری یکسانیت وہم آہنگی رہیگی اور ان اختلافات کو مٹا دیا جائیگا جن سے فریقین کے مفاد کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو۔

(۳) شام ولبنان سے فوجیں ہٹائے جانے کی تاریخ ووقت مقرر کر دیا جائیگا تاکہ فریقین کی فوجیں ایک ہی تاریخ کو ایک وقت ہٹ جائیں۔

(۴) شام ولبنان سے فوجیں کس طرح ہٹائی جائیں گی اس کا فیصلہ برطانوی و فرانسیسی حکام مل کر کریں گے۔

(۵) مشرق وسطیٰ میں (جس میں عراق، شام، لبنان، فلسطین، شرق اردن، سعودی عرب اور مصر داخل ہیں) برطانیہ وفرانس ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

(۶) فریقین وعدہ کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے مستقل مفادات میں کوئی مداخلت نہیں کریں گے۔

اس معاہدہ سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ برطانیہ وفرانس دونوں مل کر شام ولبنان کا خون چوسیں گے اور جس چیز کو حقیقی آزادی وخود مختاری کہتے ہیں وہ ان بدقسمت ملکوں کو کبھی نصیب نہیں ہوگی۔

ترکی: ترکی وروس کے بارہ میں ابھی تک تو صرف اتنا معلوم تھا کہ روس دردانیال اور آبنائے باسفورس کے بارہ میں معاہدہ مانترو میں ترمیم کرانا اور سواحل پر اپنے اڈے قائم کرنا چاہتا ہے، دوسرا مطالبہ روس کا یہ تھا کہ قارص، اردہان اور ارتوین کے علاقے جو شمال مشرقی ترکی میں واقع ہیں روس کے حوالہ کر دیے جائیں تاکہ پورا آرمینیا روس میں شامل ہو جائے لیکن اب یہ معلوم ہوا ہے کہ روس ترکی سے جارجیہ (گرجستان) کا وہ علاقہ جو روسی بندرگاہ باطوم کے جنوب میں واقع ہے اور جس میں بندرگاہ طرابزون داخل ہے مقام التوئی تک جو ترکی علاقہ میں ساٹھ میل اندر ہے طلب کر رہا ہے جس سے نہ صرف ترکی بلکہ برطانوی امریکی حلقوں میں بھی سخت تشویش کا اظہار کیا جا رہا ہے، ترک معاہدہ مانترو میں ترمیم کرنے پر تو رضامند ہیں مگر آبناؤں کے سواحل پر صرف روس کو اڈے دینا نہیں چاہتے۔ بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ ترکی، روس، برطانیہ، فرانس وامریکہ سب مل کر مشترکہ اڈے قائم کریں جن میں سب کی فوج برابر رہے اور جہاں تک علاقہ کی حوالگی کا تعلق ہے، ترک کسی صورت سے بھی ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے علاقہ کو بچانے کے لئے لڑنے مرنے تک پر آمادہ ہیں اور اس کے لئے پندرہ بیس لاکھ ترک فوج کیل کانٹے سے درست بروقت تیار ہے دیکھئے ترکی وروس کا معاملہ کس طرح سے طے ہوتا ہے، برطانیہ وامریکہ اس معاملہ میں ترکی کے حامی و مددگار ہیں۔

ایران: اس وقت سب سے زیادہ اہم مسئلہ ایران کا ہے جہاں بقول حکومت ایران صوبہ آذربائیجان نے جو اسی نام کی روسی جمہوریت سے ملا ہوا ہے اپنی اندرونی [illegible] وخود مختاری کا اعلان کر کے اپنی پارلیمنٹ اور اپنی گورنمنٹ جداگانہ بنالی ہے اور یہ تمام کارروائی روسیوں کے کہنے سے عمل میں لائی گئی ہے جو ایرانی فوجوں کو آذربائیجان میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے، آذربائیجانیوں نے اپنے بارہ میں حسب ذیل اعلان کیا ہے۔

(۱) چونکہ آذربائیجانیوں کی قومیت، زبان، کلچر، طرز ماندبود، روایات عرصہ ایرانیوں سے بالکل علیحدہ ہیں اس لئے آذربائیجان اندرونی طور پر آزاد و خود مختار رہیگا۔

(۲) آذربائیجان کی قومی زبان ترکی ہے اور یہی زبان آئندہ سے فارسی کے بجائے آذربائیجان کے مدرسوں میں پڑھائی جایا کریگی اور یہی دفتری زبان ہوگی۔

(۳) آذربائیجان صرف اندرونی طور پر آزاد و خود مختار رہیگا ورنہ وہ حدود سلطنت ایران میں شامل حکومت ایران کے ساتھ رہے گا۔

(۴) آذربائیجان کا کابینۂ وزارت جداگانہ ہوگا اور وہ اپنے وزیروں کو خود منتخب کریگا۔

(۵) آذربائیجان اپنا ٹیکس خود وصول کریگا مگر اس میں سے کچھ فیصدی رقم مرکزی حکومت ایران کو بھی ادا کیا کریگا۔

(۶) چونکہ آذربائیجان ... اور حکومت ایران کے ساتھ رہیگا اس لئے وزیر جنگ اور وزیر خارجہ کے منتخب و مقرر کرنے کا اختیار مرکزی حکومت ایران کو حاصل رہیگا۔

اس قسم کی آزادی و خود مختاری کو جس کا اعلان اہل آذربائیجان نے کیا ہے کسی صورت بھی لفظ "بغاوت" سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ اگر روس نے آذربائیجانیوں کی اس کام میں حمایت کی تو کیا برا کیا؟ لیکن یہ معاملہ برطانیہ، روس و امریکہ کے درمیان "پاور پالیٹکس" کا ہے۔

عام خیال یہ تھا کہ ایران و ٹرکی کا معاملہ ماسکو کانفرنس میں پیش ہو کر طے ہوگا۔ کانفرنس مذکور میں ۱۶ دسمبر ۱۹۴۵ء سے ۲۶ دسمبر ۱۹۴۵ء تک روس، برطانیہ و امریکہ کے وزرائے خارجہ نے بیٹھ کر یوروپین ممالک اور مشرق بعید کے مسائل کا تو فیصلہ کیا بلکہ ایران و ٹرکی کے معاملات پیش ہونے کی نوبت ہی نہ آئی۔ اور یہ سب روس کی کارروائی تھی کیونکہ ایران کے وزیر اعظم اور وزیر خارجہ نے ماسکو کانفرنس میں جاکر ایران کا مسئلہ پیش کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر ان کے لئے طہران سے ماسکو سفر کرنے کی سہولتیں روسیوں نے مہیا نہیں کیں اس لئے وہ ماسکو جا بھی نہیں سکے۔

ایران کی خبروں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اگرچہ ایران کو برطانیہ و امریکہ سے بہت بڑی اُمید تھی کہ وہ ایران کی حمایت کرینگے مگر اب وہ مایوس ہوگیا ہے اور عام رجحان یہ پایا جاتا ہے کہ ایران سوویٹ روس سے خود سمجھوتہ کرلیگا جس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ جو گورنمنٹ ایران میں قائم ہوگی وہ کٹھ پتلی کی طرح روسیوں کے اشارہ پر ناچیگی۔ اس طرح ایران میں اثر و اقتدار کا خاتمہ ہو کر روس کی بالادستی قائم ہو جائیگی۔ کیا اس معاملہ میں برطانیہ روس کی مزاحمت کریگا یا لڑائی مول لیگا؟ اس کا جواب آئندہ کے واقعات دیں گے۔ بظاہر تو یہ خیال ہے کہ گزشتہ جنگ نے برطانیہ میں اتنی فوجی اور مادی طاقت نہیں چھوڑی کہ وہ تن تنہا روس سے لڑ سکیگا۔ البتہ اگر امریکہ نے برطانیہ کی مدد کی تو بہت ممکن ہے لڑائی چھڑ جائے مگر ایسا ہوتا نظر نہیں آتا کیونکہ امریکہ نے یکم جنوری ۱۹۴۶ء سے قبل ہی اپنی تمام فوجیں ایران سے ہٹالی ہیں۔